۴۲

الناظر

نمبر ۶۷ جلد ۱۲ | یکم جنوری سنہ ۱۹۱۵ء

الناظر

نمبر ۶۷ جلد ۱۲ — یکم جنوری سنہ ۱۹۱۵ء

مِل کی منطق

(نمبر ۲)

مِل نے جس اسلوب پر نظامِ مغالطات قائم کیا تھا، اور جس طرز پر انکی تقسیم کی تھی، اُسے ہم پڑھ چکے ہیں، بہتر ہوگا یہاں ایک مرتبہ پھر اس پر ایک سرسری نظر ڈال لیں۔ اُس نے کہا تھا کہ بعض مغالطات، کلیات مسلّم و معلوم نما، قضایا کی شکل میں ہوتے ہیں، جن کا نام اُس نے مغالطات متعلق بہ بداہت رکھا تھا، اور جن کی ماہیت و نظائر سے ہم واقف ہو چکے ہیں۔ اور بعض مغالطات ایسے قضایا کی شکل میں ہوتے ہیں، جو نتیجہ ہوتے ہیں دیگر قضایا کا۔ اور گویا اپنی صحت کے لیے خارجی شہادت کے محتاج ہوتے ہیں۔ انکے لیے اُس نے مغالطات متعلق بانتاج کا عنوان تجویز کیا تھا۔ پھر چونکہ یہ ظاہر تھا کہ انتاج میں غلطی کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ نتیجہ نکالتے وقت شواہد کا تصور ہی ہمارے ذہن میں صحیح طور پر نہیں رہتا، اس لیے اس طرح کی غلطیوں کو، اُس نے ان کا ایک مستقل طبقہ قرار دے کر، متعلق بہ ابہام کے زیر عنوان کیا تھا، انکی ماہیت و تمثیلات بھی ہم مِل کی زبان سے سُن چکے ہیں۔ انکے بعد اُن مغالطات کا نمبر آتا ہے، جن میں مفہوم مقدمات کا تصور تو صحیح رہتا ہے مگر وہ مقدمات بجائے خود ایسے ہوتے ہیں، کہ ان سے انتاج صحیح نہیں ہو سکتا۔ اب اسکی بھی دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو یہ کہ مقدمات کی ترتیب

صحیح نہ ہو، جو غلطی متعلق بہ قیاس ہے۔ اور ثانیاً یہ کہ اُن مقدمات میں کوئی استقرائی غلطی ہو لیکن مغالطات استقرائی کی ابھی دو تقسیمیں ہوسکتی ہیں۔ یعنی ایک یہ کہ مشاہدۂ جزئیات میں غلطی ہوئی ہو، دوسرے یہ کہ انکے مشاہدہ سے جو کلیات و تعمیمات قائم کیے جاتے ہیں، اُن میں کوئی فروگذاشت ہوگئی ہو۔ پس آج کی صحبت میں جن مغالطات پر گفتگو کرنا ہے، وہ حسب جدول ذیل عنواناتِ ثلٰثہ کے تحت میں آتے ہیں۔

مغالطات متعلق بہ نتائج، جو مقدمات کی غلطی پر مبنی ہوتے ہیں

مغالطات متعلق بہ استقراء

(۱) مغالطات متعلق بہ قیاس — (۲) مغالطات متعلق بہ مشاہدہ — (۳) مغالطات متعلق بہ تعمیم

---

(۳) مغالطۂ قیاسی کی تعریف صاف ہے۔ یعنی اس طبقہ میں وہ تمام نتائج شامل ہیں، جن سے اصول و ضوابط قیاس کی آئین شکنی ہوتی ہو۔ پس لازماً اس صنف کے مغالطات کی تعداد اُسی قدر ہوسکتی ہے، جتنی اصول و ضوابطِ قیاس کی ہے۔ لیکن مل نے اس میں سے صرف اُن مغالطات کو منتخب کرلیا ہے، جو کثیر الوقوع ہونے کے باعث ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح کے مغالطات اسکے استقصاء میں حسب ذیل ہیں:-

(الف) ہماری روزانہ زندگی میں اس مغالطہ کی جو شکل سب سے زیادہ کثرت کے ساتھ واقع ہوتی رہتی ہے، وہ ہمارا یہ خیال ہے، کہ قضیۂ موجبۂ کلیہ کا عکس بالکل اسی قالب میں صحیح و درست ہوگا، مثلاً اس دعوٰی سے کہ "کل انسان، حیوان ہیں" ہم اکثر اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ "کل حیوان، انسان ہیں"۔ یہ بے شبہ سچ ہے، کہ اس خاص مثال میں نتیجہ کی غلطی اتنی واضح ہے، کہ ہر عامی شخص کو بھی نظر آجاتی ہے، لیکن اسی کے مثل صدہا نتائج ہم اپنے

عالمِ خیال میں نکالا کرتے ہیں، جو صحیح نہیں ہوتے، مگر ہم اُسوقت اُنھیں صحیح سمجھتے رہتے ہیں۔

"کُل آئینی حکومتیں عدل شعار ہوتی ہیں" لہذا "ہر عدل شعار حکومت لازماً آئینی ہوگی"

"کُل فلسفی خشک مزاج ہوتے ہیں" لہذا "جو خشک مزاج ہوگا فلسفی بھی ہوگا"

"کُل ہندوستانی عورتیں شوہرپرست و وفا سرشت ہوتی ہیں" لہذا "جو عورت شوہرپرست و وفا سرشت ہوگی، ہندوستانی ہی ہوگی"

"کُل راجپوت، پٹھان، گورکھے اور سکھ شجاع سپاہی ہوتے ہیں" لہذا "جو سپاہی شجاع ہوگا، ضرور ہے کہ انھیں قوموں میں سے ہو"

یہ چند اس نوعیت کی غلطیاں ہیں، جو ہم میں سے اچھے خاصے پڑھے لکھے سمجھدار لوگ روزمرّہ، کم از کم اپنے ذہن میں کرتے رہتے ہیں۔

(ب) اس سے ملتی جلتی ایک غلطی یہ ہے، کہ قضیۂ شرطیہ کا عکس ہر حالت میں صحیح سمجھ لیا جاتا ہے۔ قضیۂ شرطیہ کا عکس اس معنی کرکے تو بالکل صحیح ہے کہ "اگر جزا غلط ہے، تو شرط لامحالہ غلط ہوگی"۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح درست نہیں، کہ "اگر جزا صحیح ہے، تو ضرور ہے کہ شرط بھی صحیح ہو"۔

"جب پانی برسے گا تو زمین ضرور نم ہوگی" لہذا "جب زمین نم ہوگی، تو ضرور ہے کہ پانی برس چکا ہو"

"اگر دلائل صحیح ہیں تو نتیجہ قابلِ تسلیم ہوگا" لہذا "اگر دعوے (نتیجہ) قابلِ تسلیم ہے تو لازمی ہے کہ اُسکے دلائل بھی صحیح ہوں"

"اگر متکلم نیک نیت ہے، تو کلام موثر ہوگا" لہذا "اگر کلام موثر ہے تو ضرور ہے کہ متکلم نیک نیت ہو"

ہم میں سے کتنے ایسے ہیں، جو اپنے تئیں اس طرح کی غلطیوں اور غلط فہمیوں سے محفوظ کہ سکتے ہیں؟

(ج) اسی کی ایک شاخ یہ بھی ہے، کہ بعض اوقات اپنے ذہن میں ارتفاعِ نقیضین تو انسان ممکن سمجھنے لگتا ہے، لیکن یہ ایک ایسی موٹی غلطی ہے، کہ عامی سا عامی شخص بھی جب اپنے ما فی الضمیر کا اظہار بذریعۂ الفاظ کرنے لگتا ہے، تو اُسے فوراً اپنی غلطی محسوس ہوجاتی ہے۔

(د) پھر ایسی غلطیاں بھی ہم سے متواتر ہوتی رہتی ہیں، کہ کہیں دو قضایائے سالبہ سے کوئی نتیجہ نکالنے لگتے ہیں؛ کہیں حدِ اوسط سرے سے قائم ہی نہیں کرتے، اور کہیں دو دو حدِ اوسط قائم کر لیتے ہیں: یا پھر کہیں قضایاے جزئیہ سے نتائج کلیہ پر پہنچنا چاہتے ہیں، وقس علی ہذا۔ لیکن یہ تمام غلطیاں ایسی ہیں، جو عموماً عالمِ نظر ہی میں محدود رہتی ہیں، الفاظ کے ذریعہ سے انکا جب کبھی اظہار ہونے لگتا ہے، تو یہ از خود محسوس ہونے لگتی ہیں۔

(ھ) مگر اس سلسلے میں جو مغالطہ سب سے زیادہ خطرناک اور عامۃ الورود ہے، اُسکی صورت یہ ہوتی ہے، کہ انسان اپنے سلسلۂ استدلال میں مقدمات، نادانستہ بدل دیتا ہے۔ وہ کسی استدلال کو شروع کرتا ہے، تو اُسکی بنیاد ایک ایسے مقدمہ پر رکھتا ہے، جسکی صحت مسلّم ہے، لیکن آگے چل کر جب اُس سے استشہاد کا موقع آتا ہے، تو اسکے بجاے وہ ایسے قضیہ کو پیش کر دیتا ہے جو قضیۂ سابق الذکر سے مختلف ہوتا ہے، گو اُس سے اس قدر مشابہ ہوتا ہے، کہ دونوں کے درمیان جو نازک فرق ہوتا ہے، وہ نظروں سے مخفی رہتا ہے۔ اس مغالطہ کی مثالیں بڑے بڑے علما کی تصانیف میں بکثرت ملتی ہیں۔ جن لوگوں نے فن اقتصادیات کا مطالعہ کیا ہے، وہ واقف ہوں گے، کہ اس فن کی کتابوں میں جا بجا نظریۂ تجارتی (Merchantile Theory) کا ذکر آتا ہے۔ اس مشہور نظریہ کی تحلیل مقدماتِ ذیل میں ہو سکتی ہے:-

(۱) دولت کا معیار روپیہ ہے،

(۲) جس شۓ سے روپے کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے، دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۳) جس تجارت سے مُلک میں روپے کی تعداد زیادہ رہتی ہے، وہ مُلک کے لیے دولت افزا ہے۔

(۴) جس تجارت سے مُلک کا روپیہ باہر چلا جاتا ہے، وہ مُلک کے لیے افلاس افزا ہے،

(۵) لہذا مُلکی دولت سندی کے لیے روپے کو باہر نہ جانا چاہیے، اور

(۶) ایسے قوانین، گورنمنٹ کی طرف سے نافذ ہو جانا چاہیے، کہ مُلک کا روپیہ مُلک کے اندر ہی رہے۔

تمثیل ہذا میں مقدمۂ اوّل کا مفہوم یہ ہرگز نہیں، کہ روپیہ فی نفسہٖ کوئی معیارِ دولت ہے، یا

یہ کہ کسی کے سامنے اگر کچھ روپیہ، بغیر اُسکے اختیارِ تصرف کے، ڈھیر لگا ہو، تو وہ دولتمند کہا جائے گا۔ بلکہ اس کا صاف منشا یہ ہے، کہ روپیہ، صَرف کرنے کا ایک آلہ ہے، گویا جس شخص کے پاس جتنا زیادہ روپیہ ہوگا، اُسی قدر آزادی سے وہ اُسے اپنے صَرف میں لاسکے گا۔ اور اسی بنا پر وہ دولتمند قرار دیا جائے گا۔ لیکن قضیۂ (۵) و (۶) میں جو نتیجہ نکالا گیا ہے، اُس میں مقدمۂ اول کا یہ جزوِ اہم بالکل فوت ہوگیا ہے، اور اسکے بالکل خلافِ منشا معنی لیے گئے ہیں۔ قانوناً بیرونی تجارت کو ممنوع قرار دینے کے یہ معنی ہیں، کہ افراد، روپیہ کے صرف کرنے میں آزاد نہیں رہے اور انکی حالت اُس شخص کی سی ہوگئی، جس کے سامنے روپے کے انبار لگے ہوے ہیں، مگر اُسکے خرچ کرنے کا اسے اختیار نہیں دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو دولتمند کہنا الفاظ کے ایک بالکل نئے معنے لینا ہیں۔

کہاوتیں، نقلیں، یا حکیمانہ مقولے، جو زبان زدِ عام رہتے ہیں، عموماً ایک اصولی یا کلی حیثیت سے صحیح ہوتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں، کہ بلا لحاظِ اختلافِ حالات، وہ ہر موقع پر ہر وقت اور ہر جگہ یکساں طور پر چسپاں ہوں۔ چنانچہ اکثر اشخاص، جو انھیں عام مسلّمات و مشہورات سے سند پکڑ کر ہر نئے سوال کو، انھیں کی مطابقت میں ڈھال کر، حل کرنا چاہتے ہیں، وہ اسی قبیل کے مغالطہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایسے عام دعاوی اپنی صحت و واقعیت کے لیے ہمیشہ اپنے اندر کچھ نہ کچھ شرائط رکھتے ہیں، جن کا ذکر گو تصریح کے ساتھ نہ کیا جاتا ہو، مگر موجود ضرور رہتے ہیں۔ اب عام اشخاص سند تو ان مسلّمات سے لاتے ہیں، لیکن اس حقیقت کو نظرانداز کر جاتے ہیں، کہ جن خاص حالات کے درمیان یہ دعاوی صحیح اُترتے ہیں، وہ پیشِ نظر موقع میں کس حد تک موجود ہیں۔ اور یہی وہ شے ہے، جسے مِل کے الفاظ میں، تحریفِ مقدمات سے تعبیر کرنا چاہیے، یعنی آغازِ بیان میں جس مقدمہ کو بناءِ استدلال قرار دیا تھا، اُسی پر آخر تک قائم نہ رہنا۔

(۴) مغالطاتِ استقرائی میں پہلا نمبر اُن غلطیوں کا آتا ہے، جو مشاہدہ سے متعلق ہیں۔ لیکن مشاہدہ کی غلطی کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک ایجابی، دوسرے سلبی۔ یعنی یا تو آدمی سرے سے بعض چیزوں پر اپنی قوت مشاہدہ کو صرف ہی نہیں کرتا، اور یا کرتا ہے، مگر غلط کرتا ہے۔ ان میں سے اول الذکر کی دو شقیں ممکن ہیں:۔

(الف) پہلی صورت یہ ہے کہ انسان پیشتر سے کوئی خاص عقیدہ یا رائے قائم کر لیتا ہے اور اسکے بعد جتنی نظیریں اسکے خلاف ملتی ہیں، اُن پر وہ نظر ہی نہیں کرتا۔ وہ سامنے موجود ہوتی ہیں، مگر پھر بھی اُن پر اُسکی نگاہ نہیں پڑتی۔ ایک شے نہایت واضح و نمایاں صورت میں اسکے آگے ہوتی ہے، مگر چونکہ اتفاق سے وہ اسکے مخالف کوئی رائے پیشتر سے قائم کرچکا ہوتا ہے۔ اس لیے کبھی اُسکا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ اپنی پیش پا افتادہ شے کو آزمائش و تجربہ ہی کی غرض سے مشاہدہ کرے۔ کوپرنیکس نے جب اوّل اوّل حرکتِ ارض کا دعویٰ کیا، تو مخالفین کے پاس بطلانِ حرکتِ ارض پر جو سب سے زیادہ زبردست استدلال تھا، وہ یہ تھا، کہ "جس طرح جب کسی متحرک جہاز میں اسکے مستول کی چوٹی سے کوئی گیند پھینکا جاتا ہے، تو مستول کی ٹھیک جڑ میں نہیں گرتا، بلکہ اُس سے کسی قدر پیچھے ہٹ کر گرتا ہے، بالکل اسی طرح سطح ارض پر جب کسی بلند منارہ سے کوئی کنکری نیچے کو پھینکی جاتی ہے، تو اُسے ٹھیک منارہ کی جڑ میں نہ گرنا چاہیے، بلکہ اُس سے کسی قدر فاصلہ پر حرکتِ ارض کے مخالف رُخ کی جانب گرنا چاہیے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے"۔ حامیانِ کوپرنیکس کی طرف سے اسکا یہ جواب دیا جاتا تھا، کہ "اول تو گیند، جزوِ جہاز نہیں حالانکہ کنکری جزوِ ارض ہے، اس لیے اسکی طبعی حرکت بھی وہی ہے، جو زمین کی ہے، اس لیے ہم رفتاری کی بنا پر، اُسے ٹھیک وہیں گرنا چاہیے، جہاں کے قصد سے وہ پھینکی گئی تھی"۔ لیکن مناظرہ کے انہماک میں، مخالفین و موافقین میں سے کسی کو اس دعویٰ کی صحت کی آزمائش کا خیال تک نہیں آیا، کہ کیا واقعی، جب مستول کی چوٹی سے گیند پھینکا جاتا ہے، تو ٹھیک اُس کی جڑ میں

نہیں گرما؟ آج اسکی عملاً آزمایش کرکے ہر شخص اپنا اطمینان کرسکتا ہے کہ مخالفین کو پرنگیں کا دعویٰ تمامتر غلط تھا، تاہم اُسوقت کسی کو ایک ایسی موٹی بات کی تصدیق وتکذیب کو مشاہدہ کے سیار پر جانچنے کا خیال تک نہیں گزرا۔

بعض وحشی قبائل میں دستور ہے، کہ وہ لوگ مرجان کے تعویذ گلے میں پہنے رہتے ہیں، اور اُنکا پختہ یقین ہے، کہ انکی صحت میں تغیر و تبدل کے ساتھ اس تعویذ کے رنگ میں بھی تغیر ہوتا رہتا ہے، مثلاً جب وہ بیمار ہوں گے، تو اُسکا رنگ زردی مائل ہو جائے گا۔ مرجان کا رنگ، ظاہر ہے کہ ہمیشہ وہی رہتا ہے، لیکن اعتقاد کی طاقت دیکھو، کہ اُسکے سامنے قوتِ مشاہدہ کتنی بےبس رہتی ہے۔ اسی قبیل سے یہ عقائد، کہ اگر کوئی شے، دوسری شے کے مقابلہ میں، بلحاظِ وزن دس گُنی ہے، تو اُسی دس گُنی سرعت کے ساتھ زمین پر گرے گی؛ یا یہ کہ مقناطیس میں ایک عام زبردست قوتِ کشش ہوتی ہے؛ اور یا یہ کہ سطح آب کی نیچے کی چیزیں اپنی جسامت میں ہمیشہ بہت بڑی معلوم ہوتی ہیں؛ اور دیگر توہمات ہیں، جو عموماً قوموں اور اور جماعتوں میں شایع رہتے ہیں۔ ان توہمات کی تردید، عالمِ کائنات میں ہر ہر لحظہ ہوتی رہتی ہے، مگر جو لوگ کسی عقیدہ کے نشہ میں سرشار ہوتے ہیں، اُنھیں محسوس نہیں ہوتی۔ یہ چند مثالیں مادّیات کی تھیں، جنکی تصدیق وتکذیب، مشاہدہ آسانی سے کرسکتا تھا، اس سے یہ بجائے خود اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ الہیات، سیاسیات، اخلاقیات، وغیرہ اُن مباحث میں، جنمیں مشاہدہ صحیح یوں بھی دشوار ہے، لوگ کس کثرت سے، اس طرح کے مغالطات میں مبتلا ہوں گے۔

اسی کے قریب قریب اس مغالطہ کی ایک صورت یہ ہے، کہ کسی عام دعوے کے صرف یک طرفہ شواہد پر نظر پڑتی ہے، اور اسکے مخالف پہلو کی نظیریں یکسر نظرانداز کردی جاتی ہیں اسکے لیے ذہن میں پیشتر سے کسی خاص عقیدہ، یا توہم کے موجود ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اسکا عام سبب یہ ہوتا ہے، کہ نفس بشری طبعاً، بجاے منفی کے مثبت شواہد پر زیادہ متوجہ ہوتا ہے۔ اور ہر واقعہ کے ایجابی پہلو سے، بہ نسبت اُسکے سلبی پہلو کے، زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ آج

جو اپنے گرد و پیش ہم اس قدر وہم پرستیاں دیکھتے ہیں، اُن میں سے اکثر فطرتِ بشری کے اس خاصہ کا نتیجہ ہیں۔ ایک منجم ابتدائے سال میں بہت سی پیشین گوئیاں کرتا ہے، اس بڑی تعداد میں سے چند، اتفاقاً صحیح بھی اُترتی ہیں، پس انھیں چند کے صحیح اُترنے سے، ہمیں اُس سے اعتقاد پیدا ہو جاتا ہے، اور جتنی پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوتی ہیں، اُنکی طرف ہمارا ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا۔ اسی طرح تقریباً ہر قوم میں یہ خیال شایع ہے، کہ آسمان اہلِ کمال کا دشمن ہے، یا یہ کہ صرف نالایقوں کو عروج ہوتا ہے۔ اس وہم پرستی کی بنیاد اسی قدر ہے کہ لائق و نالائق، باکمال و بے کمال، ترقی دونوں کرتے ہیں۔ لیکن باکمالوں کی ترقی ایک طبعی واقعہ خیال کرکے کسی کی اُسپر نظر نہیں پڑتی۔ البتہ بے کمالوں میں سے اگر دو چار کو بھی عروج حاصل ہو جاتا ہے، تو ہر شخص کی نگاہیں اُٹھ جاتی ہیں۔

(ب) اس مغالطہ کی شق دوم اُن تمام صورتوں پر مشتمل ہے، جن میں یہ نہیں ہوتا، کہ شواہدِ مخالف سرے سے غیر محسوس و غیر مرئی رہتے ہیں، وہ بحیثیتِ مجموعی تو محسوس ہوتے ہیں، البتہ وہ مخصوص حالات یا اسباب، جن سے وہ نتائج پیدا ہوئے ہیں، نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ ایک زمانہ میں سر کینلم ڈگبی نے ایک خاص سفوفِ جراحت ایجاد کیا تھا جسکے عجیب و غریب خواص کی شہرت نے دنیا کو مدتوں متحیر رکھا۔ اسکا طریقِ استعمال یہ تھا، کہ جس آلہ سے کوئی شخص زخمی ہوتا، اُس پر یہ سفوف مع ایک مرہم کے لگا دیا جاتا، اور خود زخم پر فوراً پٹی باندھ دی جاتی، جو ایک ہفتہ کے بعد کھولی جاتی، اور اُسوقت تک زخم اچھا ہو جاتا۔ لوگ اس طرح کے بہت سے شواہد پیش کرتے، لیکن اپنے دَوران مشاہدہ میں وہ اُس جزو کو نظر انداز کر جاتے، کہ زخم کی فوری بندش، بجائے خود، اصولِ طب کے لحاظ سے کس قدر موثر و نفع بخش ہے۔ زخم کے لیے نہایت مضر شے ہَوا ہے، پس اگر فوراً ہی ایسا انتظام کر دیا گیا، کہ زخم کو ہَوا نہ لگنے پائے، تو یہ خود ہی شفا بخشی کے لیے کافی ہے۔ اس میں اس سفوف کے خواص کو دخل کی کیا ضرورت تھی؟

عام خیال یہ ہے، کہ مجرموں کو سزا دینے سے اصل غرض دوسروں کو عبرت دلانا ہے۔ ایک فلاسفر وکٹر کزن اسکی تردید میں کہتا ہے کہ اس غرض کے حصول کے لیے مجرم کی کیا تخصیص ہے؟ اگر دوسروں کو عبرت ہی دلانا ہے، تو عبرت تو مجرم و غیر مجرم دونوں کو سزا دہی سے یکساں پیدا ہو سکتی ہے؟ لیکن فلاسفر موصوف نے استدلال کے اس جزوِ اہم کو نظر انداز کر دیا ہے، کہ اگر مجرموں اور بیگناہوں کو یکساں سزا دی گئی، تو اس سے کس کو عبرت حاصل ہوگی؟ عبرت سے مقصود تو یہ ہے، کہ مجرموں کی سزاؤں کو دیکھکر لوگ جرائم سے بچیں، اور اپنی جگہ پر یہ یقین کریں کہ اگر انھوں نے کوئی جرم کیا تو انکا بھی وہی حشر ہوگا۔ لیکن جب وہ دیکھ لیں گے، بے قصور رہنے پر بھی انکو وہی سزائیں بھگتنی پڑتی ہیں، تو پھر وہ کس خیال سے جرائم سے اجتناب کریں گے؟ فلاسفر مسبوق الذکر کا استدلال، مغالطۂ زیر نظر کی ایک دلچسپ مثال ہے۔

(ج) یہاں تک اُن مغالطات کا ذکر تھا، جن میں قوتِ مشاہدہ گویا معطل رہتی ہے، اور دیکھنے والے پر گویا نابینائی چھائی رہتی ہے۔ انکے بعد، دوسری صنف یہ ہے، کہ نابینی کی جگہ غلط بینی پیدا ہو جاتی ہے انسان ایک شے کو دیکھتا ہے، مگر اُسکی اصلی حالت میں نہیں دیکھتا، وہ ہوتی کچھ ہے، اور یہ سمجھتا کچھ ہے۔ اس مغالطہ کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ اصل مشاہدہ اور قیاس میں خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ اکثر اشخاص جب کوئی واقعہ بیان کرنے لگتے ہیں۔ تو صرف اسی پر قناعت نہیں کرتے، کہ حقیقتاً اُنھوں نے اپنے حواس سے محسوس کیا ہے۔ بلکہ بلا قصد اُس میں اپنے قیاسات و نتائج کی بھی آمیزش کر دیتے ہیں، جس سے صورتِ واقعہ بالکل متغیر ہو جاتی ہے، اور اصلیت کی بالکل غلط تعبیر ہونے لگتی ہے۔ شروع شروع میں جب حرکتِ ارض کا دعوے کیا گیا تو مخالفین کی طرف سے نہایت پر زور صدا یہ اُٹھتی تھی کہ گردشِ زمین تو بداہت کے مخالف ہے۔ ہم بچشم خود روز مشاہدہ کرتے ہیں، کہ آفتاب طلوع ہوتا ہے، اور پھر غروب ہوتا ہے۔ پس ہم اپنی چشم دید شہادت کے خلاف یہ کیونکر باور کر لیں، کہ آفتاب کے بجائے زمین گردش کر رہی ہے۔" لیکن انکا یہ بیان اصلیت پر مبنی تھا؟ کیا واقعی ہم خود آفتاب کو "طلوع و غروب ہوتا ہوا دیکھتے ہیں"؟ زمانہ نے اس سوال کا خود جواب دیدیا۔ یہاں اس تمثیل سے یہ دکھانا مقصود ہے، کہ دنیا کی دنیا، عرصہ تک، مشاہدہ کی فاش غلطی میں مبتلا رہ سکتی ہے۔　　　عبد الماجد

جرمنی پر
ایک مختصر تاریخی مضمون

جب دنیائے قدیم کی پرغرور ملکہ رومۃ الکبریٰ کا آخری سنگار رہنگری کے ڈاکوؤں لٹیروں نے لوٹ لیا اور اُسکی جلیل الشان سلطنت منقسم ہوکر ٹوٹ گئی تو خاص اٹلی میں طوائف الملوکی کا دَور دورہ ہوگیا اور ہر قابوچی رئیس یا چودھری اپنے اپنے علاقے کا خودمختار راجہ بن بیٹھا۔ رومہ کی سیاسی قوت ختم ہوگئی اور دکھائی دینے لگا کہ اسکا پُرشوکت نام بھی آخرکار تاریخ کے گردآلود مُتّھوں میں محو ہُوا چاہتا ہے۔ لیکن اس حال میں مذہب کو سیاست کی ضرورت پیش آئی۔ مسیحی رہبانیت نے تیغ وتاج کے ساتھ رشتہ جوڑا اور پاپائے رومہ کو سب سے کارگر تدبیر اپنا اقتدار قائم رکھنے کی یہی سوجھی کہ شارلمین کے سرپر چترِ شاہی پھرائے۔

شارلمین جرمنی نسل کا ایک لئیق اور طاقتور بادشاہ تھا۔ جسکا سکہ دریائے ڈینیوب سے لگاکر دریائے سپین تک چلتا تھا اور موجودہ فرانس۔ جرمنی۔ آسٹریا۔ ہالینڈ۔ اور بلجیم سب اُسکے زیرِ حکومت تھے۔ دو صدی پہلے اسکی قوم ایک خانہ بدوش اور خرافات پرست قوم تھی جو قرنہا قرن سے رومیوں کے ساتھ مصروف پیکار رہی اور اپنی بدویت کے باوجود رومی جرنیلوں سے اسطرح مغلوب نہ ہوگئی تھی جس طرح کہ قدیم غالیہ (فرانس) یا ہسپانیہ یا برطانیہ کے علاقے۔ ساتویں صدی عیسوی میں اُنکے سردار نے اپنی مسیحیہ بیوی کے اثر سے دینِ مسیحی اختیار کرلیا تھا اور اسی عیسائی دادا کا شارلمین (جسے جرمن چارلس کہتے ہیں) پوتا تھا۔ جسکی "عارضی" (یعنی دنیاوی) حکومت کو عیسائی دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے مغرور پیشوا نے اپنا سرپرست اور مددگار مانا اور اس نرالی قسم کی سلطنت کی بنیاد قائم کی جسے اہل یورپ دی ہولی رومن امپائر (مقدس سلطنتِ رومہ) کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور بعض مورخین نے یہ بھی لکھدیا ہے کہ یہ نظام حکمرانی

کہ مذہب ایک دنیوی تاجدار کے ذریعے حکومت چلائے اسلامی خلافت سے مشابہ ہے۔ اور اگرچہ ہم بالفعل اس لمبی اور پیچیدہ بحث میں پڑنا نہیں چاہتے تاہم یہ قیاس کرنے کے قرائن ہیں کہ آٹھویں صدی عیسوی کے اختتام پر پاپائے روم کو یہ خیال آیا تو مسلمانوں کے طرز حکومت ہی کو دیکھکر آیا جو اسوقت مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ سے گزر کر ہسپانیہ میں پہنچ چکے تھے اور جنکے آئین یورپ کے پادریوں میں غیر متعارف چیز نہ تھے۔ بہرحال ۷۹۹ء کے آخری مہینے میں جب شہر رومہ میں دور دور کے لوگ آئے ہوے تھے کہ بعثت مسیح کے آٹھ سو برس گزر جانے پر خوشیاں منائیں اور قصر دے ٹی کن میں جو بطرس ولی کے جانشینوں کا پرانا مسکن تھا اور جہاں پاپائے رومہ کا پرشوکت دربار لگتا تھا۔ پاپا کی دعائیں لیں۔ شارلمین بھی اس دربار میں موجود تھا کہ اچانک پاپائے رومہ نے تاج شاہی اسکے سر پر رکھدیا اور اپنے زرین ممبر کے قریب ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ نقیب چلائے کہ صاحبو آج کے دن سے ہر سچا عیسائی جو پاپائے رومہ کو مذہبی مقتدا جانتا ہے شہنشاہ شارلمین کو اپنا دنیوی سردار مانے!

یہی وہ انقلاب آور تاریخی واقعہ ہے جس نے شارلمین اور اسکے جرمن جانشینوں کی عظمت اور وقعت کو چار چاند لگا دیے۔ لیکن اسی کے ساتھ جرمنی کو ایسا نقصان پہنچایا کہ اسکی تلافی انیسویں صدی تک نہ ہو سکی[ا]۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شاہنشاہ شارلمین کی زندگی ہی میں اسکے نوجوان بیٹوں میں نزاع پیدا ہوئی اور بہت سے کشت و خون کے بعد آخر عہدنامہ وردون کے بموجب تقسیم سلطنت عمل میں آئی اور فرانس کا علاقہ ایک علحدہ مملکت قرار پایا۔ یہ وردون وہی مقام ہے جہاں آج کل جرمنی کی جنوبی فوجیں فرانسیسیوں پر جگر تشگاف چیخوں کے ساتھ شعلوں کا مینھ برسا رہی ہیں۔ انھیں کے اجداد ہزار برس پہلے اسی سرسبز میدان میں مصالحت کرنے جمع ہوے تھے۔ اور یہیں سب سے پہلے ایک نئی بولی کو سرکاری زبان تسلیم کیا گیا تھا جو بعد میں زندۂ جاوید والٹیر

ا دیکھو دی ڈیز آف دی ہولی امپائر۔ اور ہسٹوری آف دی نیشن کی کتاب "جرمنی" شارلمین کے بیان میں۔١٢

اور ہیوگو اور روسیو کی زبان بنی۔

شارلیمین کے بعد اسکی سلطنت شخص واحد کے زیر فرمان کبھی نہ آئی۔ ہاں ایک حد تک یہ فخر حاصل ہوا تو اسکے پوتے چارلس کو جو تاریخ میں موٹے (چارلس) کے تمسخر آمیز لقب سے مشہور ہے گروہ شارلیمین اعظم کا وراثتاً جانشین تھا۔ نہ کہ از روے لیاقت۔ چنانچہ اسکے زمانے میں ڈنمارک کے لٹیرے جن کی ابتدائی یورشیں بڑھاپے میں خود شارلیمین کے واسطے سامانِ تردد بنگئی تھیں اس قدر زور پکڑ گئے تھے کہ فرانس و جرمنی کا شمالی علاقہ باقاعدہ اُنکی تاخت گاہ بن گیا۔ اُن کے جنگلی گھوڑوں نے قبر شارلیمین کی گھاس چرئی* اور جرمنی کا یہ کاہل بادشاہ جسکے نزدیک رشوتیں دے دے کر ٹالنے کے سوائے ان ڈاکوؤں کی روک تھام کا کوئی طریقہ قابل عمل نہ تھا، اپنے فرض میں پیٹا سکیشی کرتا رہا۔

موٹے چارلس کے بعد جرمنی کے تخت پر یکے بعد دیگرے دو طاقتور بادشاہ بیٹھے یہ ہنری اول اور اسکا بیٹا آٹو اول ہیں۔

فرانس ان دنوں مستقل طور پر علٰحدہ بادشاہت بنگیا تھا اور اگرچہ بعد میں کچھ دن کے لیے وہاں کے بادشاہوں کا دربار وآرسلز میں جمنے لگا تھا۔ تاہم دسویں صدی کی ابتدا سے اُنکا پایۂ تخت پیرس ہی قرار دے لیا گیا تھا۔ اسکی سرحدیں اُسوقت تقریباً یہی تھیں جو اب ہیں۔ الساس اور لورین کے صوبے بھی ہنری اول نے جرمنی کے ماتحت کر لیے تھے۔ اگرچہ وہ دو تین صدیوں کے بعد فرانس ہی میں ضم ہوگئے اور بسمارک نے ۱۸۷۱ء کی جنگ کے بعد جاکر کہیں انھیں اُگلوایا۔ تاہم وہ اب تک زبان اور قومی ہمدردی کے لحاظ سے فرانسیسی ہیں۔

ہنری کے عہد میں جرمنی کو ایک نئے دشمن، گمیار قوم سے لڑائیاں پیش آئیں۔ یہ جنگجو بھی خانہ بدوش تھے اور وسط ایشیا کے تاتاریوں کی طرح جدال و قتال انکا شغلۂ زندگی تھا۔ ہنری نے ان کو کئی شکستیں دیں۔ لیکن صحیح معنوں میں اُنکا استیصال اسکے بیٹے کے حصہ میں آیا تھا۔ جسنے نہ صرف

* انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا نویں ایڈیشن، جرمنی کے ذکر میں (اسکی تاریخ کا حصہ) ۱۲۔

اُنکی قوت کو توڑ دیا بلکہ ایک طرح مجبور کردیا کہ وہ آدمیت کی جُون اختیار کریں اور باقاعدہ آباد ہو کر شہریت کے لطف سے آشنا ہوں۔ چنانچہ اُنکی نسلیں اب تک کراکو یہ، جنوب گلیشیا، اور مشرقی ہنگری کے علاقوں میں آباد ہیں جہاں آج کل روسیوں کو دعوے ہے کہ ہمنے اہل آسٹریا کو بالکل کچل ڈالا ہے حالانکہ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ان مقامات میں جو لوگ آباد ہیں اُن میں سارے یورپ سے زیادہ قرون مظلمہ کی خونخواری باقی ہے اور اُنھوں نے بعد میں حضریت کا اثر قبول کیا ہے

لیکن ہرچند آٹو ایک لایق باپ کا لایق بیٹا تھا تاہم جرمنی میں طوائف الملوکی کی بنیاد اسی کے عہد میں پڑی۔ کم سے کم آثار ایسے پیدا ہوگئے تھے کہ ایک بالغ النظر مورخ کے لیے یہ پیشین گوئی کر دینا کچھ مشکل نہ ہوتا کہ اقبال مند آٹو کے دنیا سے اُٹھتے ہی کشور جرمن خود مختار جاگیرداروں کی میراث بنجائے گی۔

اس نا مبارک تبدیلی کے دو سبب تھے:-

شارلین اپنے زمانے میں "فیوڈل سسٹم" کو قائم کرچکا تھا۔ یہ وہ طرز حکمرانی ہے جسکا جلوہ ہمارے ہاں مغلیہ منصبداری میں نظر آتا ہے۔ یعنی تعلقداروں کی ایک جماعت براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتی تھی جو اپنے علاقے یا جاگیر میں نظم ونسق کے ذمے دار ہوتے تھے۔ اور ان معقول زمینوں کے عوض ضرورت کے وقت پابند تھے کہ بادشاہی فوجوں میں ایک معیّن تعداد سپاہیوں کی حاضر کردیں۔ انکے ماتحت اسی اصول پر چھوٹے زمیندار ہوتے تھے۔ جو دس دس بارہ بارہ پیادہ یا سوار، منصب دار کے پیش کردیتے۔ ازمنۂ متوسطہ کا یہ سب سے کارگر طریقۂ بادشاہت تھا۔ لیکن اسمیں خرابی اُسوقت پیدا ہوتی تھی جبکہ بڑی بڑی منصبداریاں موروثی ہو جاتیں۔ خود بادشاہ کاہل او بے پروا ہوتا، یا اُس کا پایۂ تخت دُور ہوتا۔ ایسے موقعوں پر اکثر جاہ طلب خودسری اختیار کرتے اور اگر اسکا بروقت انسداد نہ ہوتا تو پھر بالکل سلطنت کے قابو میں نہ رہتے تھے۔

انتشار مملکت کی دوسری وجہ "دی ہولی رومن امپائر" کا وجود ہے۔ شاہان جرمنی کو اس منصب پر بڑا ناز تھا۔ وہ پہلے جرمنی میں تخت نشین ہوتے اور پھر رومہ میں پاپا کے ہاتھوں

تاج پہنتے - اور دنیاے مسیحیت میں بے شبہہ انھیں ایک خاص علو مرتبت حاصل تھی۔ خود جرمنی کی رعایا اپنے کو فرانس کے لوگوں سے ممتاز سمجھتی - اور کہتی کہ "ہم ایک شاہنشاہی قوم ہیں"۔ یہ سب تھا مگر ان مفاخر و عظم کی قیمت جرمنی کو بہت مہنگی دینی پڑی - عین اُسوقت کہ فرانس قومیت اور اتحادِ ملکی کے میدان میں قدم فرسا تھا اور وہاں کے وطن پسند بادشاہ اندرونی اصلاحوں میں متوجہ تھے جرمنی کا بادشاہ پاپا کے ساتھ شریک مشورہ تھا کہ کسی طرح کلیساے یونانی کے طرفداروں کو نیچا دکھایا جائے یا فلاں اطالوی نواب کی سرکوبی کیجائے جس نے پاپا کے مقرر کردہ پادری کو تعظیم نہیں دی تھی[1]- یہ بنیادی کمزوری آتو کے بعد اُسوقت نمایاں ہوگئی جب آتو ثانی کا زمانہ آیا اور اپنے جرمنی اُمرا کی سرکشی اسکے لیے خطرناک حد تک پہنچ گئی۔ ساتھ ہی پاپاے رومہ کے تقاضے پورے کرنے دشوار نظر آئے جسے اصرار تھا کہ اطالیہ کے جنوبی یونانیوں کا ہمیشہ کے لیے قصہ پاک کر دیا جائے۔

یہ غیر ملکی سیکڑوں برس پہلے سقلیہ اور اطالیہ کے ساحلوں پر آن بسے تھے - رومی اقتدار اپنے عروج کے زمانے میں بھی اُنکے تمدن کے سامنے فروغ نہ پا سکا تھا اور اب پاپاے رومہ کو ایک کد پیدا ہوگئی تھی کہ انکی شہری آزادی اور مذہبی لاپروائی کا خاتمہ کر دے - اس مہم پر آتو متعین کیا گیا تھا اور بے شبہہ یونانیوں کی تجارت پیشہ جماعت اسکا مقابلہ نہ کر سکتی اگر صقلیہ کے عربی نژاد شہسوار دستِ اعانت نہ بڑھاتے کہ انھیں کی بدولت شاہ جرمنی کی فوجوں کو کامل ہزیمت نصیب ہوئی اور اسکی جرار سپاہ قریب قریب بالکل تباہ ہوگئی[2]۔

آتو کے بعد تین بادشاہ جرمنی کے تخت پر بیٹھے جن کا سارا وقت اندرونی سازشوں کے دبانے میں گزرا۔ لیکن اِن مفسدوں سے بدتر اور کہیں بڑھکر تازہ خرابی یہ پیدا ہوئی کہ ان میں اور پاپاے رومہ میں کئی مرتبہ ناچاقی کی صورت پیش آئی اور تین پاپا اپنی دینی سرداری سے بحکم شاہی معزول کیے گئے - یہاں تک کہ قصر وی ٹی کن میں گرگوری ہفتم کی جانشینی عمل میں آئی جو اول نہایت تند مزاج اور جوشیلا پادری تھا اور جسے جرمنی کے بادشاہوں کی غلامی کرنا کسی طرح گوارا نہ تھا۔ اِدھر

---

[1] "دی ہولی رومن امپائر" آتو کے بیان میں ۱۲ [2] انسائیکلوپیڈیا بریٹانکا ۱۲

جرمنی کے تحت پر ایک ننہا دار زم طبیعت کا حکمراں اُنھیں دنوں بٹھایا گیا تھا۔ گریگوری کو موقع ملا کہ ایک طرف تو اسکے سرداروں کو اُبھارے اور دوسری طرف اپنے ماتحت پادریوں کو گرمائے پھر اُسنے ایک فرمان شایع کیا کہ آیندہ سے تمام اُن زمینوں کا محاصل جو بادشاہ کی طرف سے پادریوں کو ملیں، خاص پاپا کی نگرانی اور دخل میں رہے گا۔ ہنری چہارم اول اول ان چیرہ دستیوں کو نظر انداز کرتا رہا۔ مگر جب گریگوری کی زیادتیاں حد سے گزر گئیں اور اسکی سازش بعض نوابوں کے ساتھ پایۂ ثبوت کو پہنچی تو شاہی میرمنشی نے عاملان پاپائی سے جواب طلب کیے۔ جب ان رسمی خط کتابتوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو بادشاہ نے خاص پاپا کو ایک طویل مراسلہ بھیجا۔ جسکا مختصر جواب یہ ملا کہ "بادشاہ کو مذہبی امور میں دست اندازی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔"

ان باتوں نے ہنری کو نہایت غضبناک کیا اور اُسنے اپنے ملک سے بیٹھے ہی بیٹھے گریگوری کی معزولی کا فرمان بھیجدیا۔ گریگوری نے اُس فرمان کو تو آتش دان کے سپرد کیا اور خود ایک پرزور اعلان میں بادشاہ کو کلیسائے عیسوی سے خارج کردیا [تاریخ جرمنی (ایکس کمیونی کیٹ) کا یہ عجیب واقعہ ہے۔ تین صدی سے وہاں کے بادشاہ اپنے تئیں سارے عیسائی فرمانرواؤں کا افسر اعلیٰ سمجھتے تھے۔ انھیں رومہ کی تخت نشینی کا بڑا زعم تھا۔ اسی اعزاز کی خاطر انھوں نے اپنے ملکی نظم و نسق سے بے پروائی کی تھی۔ لیکن آج وہ طلسم ٹوٹ گیا اور ثابت ہوگیا کہ وہ جس شئے پر بیقدر نازاں تھے محض دھوکا تھا۔

ہنری کے اخراج نے اسکے بدخواہ اُمرا کو اور سرکش بنادیا۔ انھوں نے پاپا کے ایما سے متحد ہوکر ہنری سے بغاوت کی اور ایک اورشخص رڈولف کو اسکی جگہ اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ اُس مخالفت کے طوفان میں ہنری کو چارۂ کار اسی میں نظر آیا کہ گریگوری سے معافی مانگے اور جب اسپر بھی التفات نہ ہوئی تو ایک ذلیل ملزم کی طرح خود اسکے حضور میں حاضر ہو۔ پاپا سے رومہ شہر کنوسا میں مقیم تھا کہ ہنری کے آنے کی خبر ملی۔ شارلین کا جانشین، ہنری ثالث کا بیٹا (جسنے بلا وقت تین پاپاؤں کو معزول کردیا تھا) ایک دادخواہ بنکر چند ہوا خواہوں کو ہمراہ لیکر بارگاہ پاپائی میں امیدوار باریابی

تھا ـــــ گر گریگوری نے حکم دیا کہ قلعہ کے دروازے بند کر دیے جائیں۔ کئی گھنٹے تک ہنری باہر کھڑا ٹھٹھرتا رہا اور اسکا پروردۂ آسایش جسم اُن ہواؤں نے جو کوہ الپس Alps کی برف پوش چوٹیوں سے آ رہی تھیں نیلگوں کر دیا لیکن بیرحم گریگوری نے مطلق پروا نہ کی اور ہنری اُس قلعے پر ایک نگاہ ڈالکر جسمیں ہزاروں زخم خوردہ شیروں کی غضبناکی اور لاکھوں دل شکستوں کی مایوسی بھری تھی واپس پلٹ پڑا۔[1]

اسکے بعد ایک لڑائی شروع ہوئی جسکے شعلے بیسیوں سال تک بھڑکتے رہے۔ پاپا کے طرفدار اور جرمنی کے سرکش نواب ایک جانب تھے اور ہنری ایک جانب۔ اور گو فتح کامل جیتے جی ہنری کو نصیب نہ ہوئی پھر بھی اُسکا حریف چین سے نہ بیٹھ سکا بلکہ رومہ سے باہر ایک مغرور غریب الوطن کی موت مرا۔ اُسکے پاس آخری حربۂ دشمنی صرف یہ رہ گیا تھا کہ اپنے جانشینوں کو جنگ قائم رکھنے کی وصیت کر جائے۔

آخر ایسی خوں ریزیوں کے بعد جنکی مثال تکبر و تغلب کی خانہ جنگیوں کے سوائے تاریخ میں ملنی مشکل ہے، ۱۱۲۲ء میں ایک امن نامہ ہوا اور فریڈرک باربروسہ نے دوبارہ اُس شاہنشاہی کی بنیاد مستحکم کی جو آٹو (ثانی) کے عہد میں متزلزل ہو چکی تھی۔

باربروسہ ایک مستعد اور شریف بادشاہ تھا اور اسکی بڑی تعریف یہ تھی کہ جرمنی کے اُمرا میں اپنا گیا ہوا رسوخ از سر نو قائم کیا اور پاپاے رومہ کی جنگی قوت اس خوبی کے ساتھ توڑ دی کہ اُسے بجز مصالحت کرنے کے کوئی چارہ نہ رہا۔ اپنے سیاسی اقتدار کے لیے وہ بھی شاہنشاہِ جرمنی کا اسی طرح دست نگر ہو گیا جس طرح اُسکا وہ پیش رَو کہ جسے شارلمین کو تاج پہنانے کی ضرورت پیش آئی تھی۔

فریڈرک باربروسہ کی وفات پر اُسکا بیٹا فریڈرک ثانی وارثِ سلطنت ہوا اور شجاعت و اقبال مندی میں اپنے باپ سے بھی بڑھا چڑھا نکلا۔ اُسکے دَور میں نہ صرف جرمنی و اطالیہ

[1] انسائیکلو پیڈیا ـــ ۱۲

زیر فرمان رہے بلکہ جنگ صلیبی میں بھی اُسے خاطر خواہ کامیابیاں نصیب ہوئیں اور مسلمانوں سے حل کردہ فلسطین میں بھی بادشاہ تسلیم کیا جانے لگا۔ اسی خلا ملا کی وجہ سے بعض متعصب عیسائی اُسے مسلمان سمجھنے لگے تھے[1]۔ اگرچہ اسمیں بھی شک نہیں کہ اسلام کے اصول اور مسلمانوں کی پاکیزہ زندگی دیکھکر اُسے عیسائیت اور عیسائیوں سے ایک خاص قسم کی نفرت ہوگئی۔

فریڈرک کی عدم موجودگی میں اسکا بڑا بیٹا جرمنی میں فرائضِ بادشاہی انجام دیتا تھا۔ باپ کے مسلمان ہوجانے کی افواہیں سُن کر اس ہوس ناک قابو چی خلف نارشید کو یہ جسارت ہوئی کہ طاعت فرزندانہ کو بالائے طاق رکھا۔ اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور ڈرا دھمکا کے امرائے شاہی کو اپنا موافق بنالیا۔ مگر یہ ساری تدبیریں فریڈرک کے ملک میں داخل ہوتے ہی طفلانہ نظر آنے لگیں۔ اپنے اصلی اور نام آور بادشاہ کی آمد نے بہتری کے اچھے سے اچھے طرفداروں کو مذبذب کردیا اور تمام سردار فریڈرک کے گرد آن کر جمع ہوگئے۔ ایک انجمن مشاورۃ منعقد ہوئی، ہنری معزول کیا گیا اور جرمنی کی ولیعہدی بھی اُسکے چھوٹے بھائی کن کرڈ بنام منسوب ہوئی۔

فریڈرک ثانی کے زمانہ میں جرمنی شاہنشاہی پھر اپنے نصف النہار پر پہنچ گئی تھی۔ لیکن وہ عہد شاید سب سے زیادہ اسلیے یادگار رہے کہ انھیں دنوں (۱۲۳۰ء) شجاعانِ صلیبی (Christian Knights) کے ہاتھوں ایک نیا علاقہ آغوشِ مسیحیت اور جرمن بادشاہت میں داخل ہوا جو بعد میں نہ صرف وہاں کی بلکہ سارے عالم کی تاریخ میں ایک ایسا انقلاب پیدا کرنے والا تھا، جسکی نظیر نہیں ملتی۔ یہ پرشیا تھا۔ اسی ریاست کا وارث قیصر ولیم ثانی ہے۔ بسمارک یہیں کا وزیر تھا۔ کینٹ اسی ملک میں پیدا ہوا۔ گیٹی نے اسی جگہ بیٹھکر اپنی فلسفیانہ شاعری دنیا کو سنائی۔ اُس وقت یہ کچھ بھی نہ تھا مگر وحشیوں کا مسکن، بت پرستوں کا گھر، غلاموں کی کمان کہ جسکا نام بھی سترہویں صدی تک تاریخوں میں نظر نہیں آتا۔

لیکن فریڈرک یا اُسکے جانشینوں کی قسمت میں زیادہ عرصے جرمنی کی بادشاہی دیکھنی نہ تھی

---

[1] انسائیکلوپیڈیا حسب حوالۂ ماسبق۔

اور جب اُسکا بیٹا کن رڈ مرا تو گھرانے بھر میں کوئی وارثِ صحیح نہ تھا کہ منصبِ شاہی کا سزاوار ہوتا۔ چنانچہ کن رڈ کے ساتھ ہی حکمرانی اِس خاندان کی جسے "اوہان اسٹوفان" (Hohenstaphen) کہتے ہیں، ختم ہوگئی اور آیندہ وراثت کی بجاے انتخاب، جرمنی میں ذریعہ شاہنشاہی کے حصول کا رہ گیا۔

اس میں تو شک نہیں کہ بحیثیت مجموعی خاندان اوہان اسٹوفان کا دَورِ حکومت قرونِ متوسطہ کے بہترین زمانوں میں شمار ہونے کے لایق ہے کہ علمی اور تجارتی اور دماغی ترقیوں کی بنیاد اسی عہد میں پڑی۔ وہ غازیانِ روزگار جنگی اولوالعزمانہ شجاعت کے افسانے یورپ میں آجتک فخر و مباہات کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ اسی زمانے کے پروردہ تھے۔ لیکن اتحادِ ملکی کے اعتبار سے تیرہویں اور چودھویں صدی جرمنی کا بدترین وقت ہے کہ ہر صوبہ دار مستقل بادشاہ بنا اور شاہنشاہ کی حیثیت محض ایک نگراں کار کی رہ گئی جسکی فوجوں کا خوف مقامی رئیسوں کو برائے نام اسکا اطاعت گزار رکھتا اور نہ صرف بڑے بڑے صوبے بلکہ بڑے بڑے شہر بھی اپنے تئیں بالکل خود مختار سمجھتے تھے۔ وجود و شہرت کے میدان میں آئے ہوئے ان شہروں کو زیادہ مدت نہ ہوئی تھی مگر خوش حالی اور افزایش تجارت کے ہمقدم انکی سیاسی قوت بڑھی اور اُنھوں نے باہمی عہد و پیمان کے وسیلے سے نہایت مضبوط سٹی لیگیں (احزاب الامصار) قائم کرلیں جن سے اچھے اچھے مقتدر رؤسا اور نواب لڑائی مول لیتے ہچکچاتے تھے بلکہ روپے پیسے کے معاملہ میں اُلٹے اُنھیں کے دستِ نگر اور مقروض رہتے اور انکے اندرونی انتظامات میں دخل دینے سے احتراز کرتے تھے۔

لیکن کن رڈ کی وفات پر جب ایک عرصے تک طوائف الملوکی رہی اور کوئی برائے نام بھی شاہنشاہِ جرمنی نہ ہوا تو پاپاے روما کو بڑا اندیشہ پیدا ہوگیا کہ مبادا مقدس سلطنتِ روما بالکل ٹوٹ جائے اور خود پاپائی اقتدار میں، جو اُن دنوں دنیاے مسیحیت پر چھایا ہوا تھا، فرق پڑ جائے۔ نیز وہ مالی امداد جس کا ذمہ دار شاہنشاہ جرمنی ہوتا تھا آیندہ نہ مل سکے۔ پس اُس نے جرمنی کے

چھوٹے چھوٹے خود مختاروں کو دھمکانا شروع کیا کہ اگر تم اپنا شاہنشاہ جلدی منتخب نہیں کروگے تو میں خود کسی کو نامزد کردوں گا۔ اور اپنے اثر اور لشکروں کے زور سے اُسے جرمنی پر مسلط کرادونگا۔

اس وقت شاہان جرمنی نے اپنی باہمی رقابتوں کے ڈر سے پاپائے رومہ کی بات کو ان لینا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن انتخاب کرتے وقت اُنھوں نے ایک پُرزور اعلان یہ بھی کر دیا کہ ہمارے معاملات میں آیندہ سے پاپا کو کوئی دخل نہ ہوگا نہ ہم اسکے احکام کے پابند ہوں گے۔ (۱۳۳۸ء) بہر حال اس پیچ سے دوبارہ جرمن شاہنشاہی کی بنیاد پڑگئی اور لوئیس چہارم اس منصب جلیلہ پر منتخب کیا گیا امرلے جرمنی نے بھی اب اپنی پچھلی سرکشی کو خیرباد کہہ دیا تھا اور نہ فی الواقع انھیں کوئی وجہ ایسے بادشاہ سے جھگڑنے کی تھی جسے خود وہ انتخاب کرچکے تھے اور جو انکے مقامی معاملات میں مطلق دست اندازی نہ کرتا۔ البتہ عام مُلکی نظم ونسق میں وہ اُمرا کی رائے کا پابند نہ تھا چنانچہ جب لوئیس کے عہد میں آزاد شہروں سے منازعات شروع ہوے تو اُس نے شہروں کا ساتھ دیا اور امرا کی غیظ آلود درخواستوں کے باوجود اِن ننھّی ننھّی جمہوریتوں کی آزادی سلب کرلینے سے پرہیز کرتا رہا۔

بہ حیثیت مجموعی اگلی دونوں صدیاں (چودھویں اور پندرھویں) جرمنی پر بہت خاموش گزریں۔ اس تمام مدت میں کوئی ایسی علی تبدیلی عالم وقوع میں نہیں آئی جسکا تذکرہ ضروری سمجھا جائے۔ جب ایک بادشاہ مرتا دوسرا اُسکی جگہ منتخب کرلیا جاتا۔ کوئی خود مختار رئیس امیر فوت ہوتا تو اُسکے وارث جانشین ہوجاتے۔ غرض بہ احوالِ ظاہر زندگی اپنی معمولی سنجیدگی کے ساتھ گزری جاتی تھی۔ ہاں مگر اس سناٹے کے پیچھے ایک طوفان کے آثار پندرھویں صدی ہی میں نظر آنے لگے تھے۔ چھاپے کی ایجاد نے کتابوں کو عام کر دیا تھا۔ تصنیف و تراجم اور مطالعہ کا شوق برابر بڑھ رہا تھا، علوم و فنون میں ہر جگہ نئی جان پڑتی دکھائی دیتی تھی۔ امریکہ کی دریافت نے لوگوں کے حوصلوں میں حیرت انگیز جوش و علویت پیدا کردی تھی۔ اِدھر فلسفۂ یونان کا احیا مذہب مسیحی سے دل برداشتگی بڑھا رہا تھا۔ پاپائے رومہ کی زرپرستی اور بدعنوانی پر گانوں گانوں

میں سرگوشیاں ہوتی تھیں - پادریوں کی بدچلنی کا راز آشکارا کی طرح، ہر گھر میں چرچا تھا - معصوم کنواریوں کی خانقاہیں (ننریز) نیپلز اور وینس کے چکلوں کو شرماتی تھیں اور مقدس راہبوں کے اعمال میں شیطانی جدتوں کا جلوہ تھا -

اسی حال میں لوتھر پیدا ہوتا ہے - چارلس شاہ اسپین شاہنشاہ جرمنی منتخب کیا جاتا ہے اور پندرھویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ ہم آہستہ آہستہ قرونِ متوسطہ کے آخری مراحل سے گزر کر زمانۂ جدید کی منزل میں قدم دھرتے ہیں -

(۲)

شارلین کا ہسپانوی ہمنام، چارلس، جو اب جرمنی میں بذریعۂ انتخاب اسکا جانشین ہوا، قرونِ متوسطہ کا سب سے بڑا یورپی بادشاہ ہے کہ اسکے مقبوضات میں فرانس کے علاوہ تمام مغربی اور وسطی برِ اعظم داخل تھا - لیکن نہ تو اسکی ذمہ داریاں اپنے پیشرو جیسی تھیں اور نہ انکی ادائگی میں اُس نے وہ لیاقت دکھائی جس نے شارلین کو لقب اعظم سے ممتاز کیا تھا -

سب سے بڑی پیچیدگی چارلس کے عہد میں یہ آپڑی کہ تمام سیاسی معاملات میں اختلافِ مذہبی کا رنگ جھلکنے لگا - یعنی وہ نئی تحریک، جسکا عملی طور پر بانی مبانی لوتھر ہے، افکار و الفاظ کی منزل طے کرکے افعال میں آ دخیل ہوئی - عیسائی دنیا کے نئے فرقے پر وٹسٹنٹ کو، جو ایک طرح ہمارے ہاں کے معتزلی گروہ سے ملتا جلتا ہے، رومن کیتھولک پادریوں نے نشانہ اعتراض بنانا شروع کیا اور بحث و مناظرے سے ہوتے ہوتے نوبت جبر و تشدد تک پہنچی - اس میں شک نہیں کہ اوّل اوّل چارلس، لوتھر کے معتقدین کو مرعوب و مغلوب کرنے میں کامیاب ہوگیا اور نہایت سنگین احکام کے ذریعے سے اس مذہبی آزاد خیالی کا اُس نے گلا گھونٹ دیا - لیکن جہاں خوف ہو وہاں محبت نہیں ہوسکتی اور عداوت ایک حقیر سے حقیر شے کی بھی خطرناک ہے کجا کہ ایک مظلوم گروہ کثیر کی جسے استحصالِ حق کی بھی دُھن لگی ہوئی ہو - چنانچہ اس موقع پر بھی یہی ہُوا کہ جوں ہی چارلس اپنی بیرونی مہمات میں اُلجھا، اندرونی شورشیں اُبھرنے لگیں - عین اُسوقت کہ ترکی تیغزن وی آنا

کا محاصرہ کر رہے تھے اور چارلس اس نہ رکنے والے سیلاب کی روک تھام میں مصروف تھا، جرمنی میں خانہ جنگی کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اور چارلس لوٹ کر آیا تو لوتھر کے پُرجوش مریدوں نے ایک ہی حملے میں اسکی تھکی ہاری فوج کو ڈھکیل کر منتشر کر دیا اور چارلس کو مجبور کر دیا کہ جرمن شاہنشاہی اپنے بھائیوں کے حوالے کرکے خود اس عہدۂ جلیلہ سے دست بردار ہو جائے۔ یہی واقعہ گویا تقدس سلطنتِ رومہ کا خاتمہ ہے۔ کیونکہ چارلس کے بعد جتنے بادشاہ جرمنی کے تخت پر بیٹھے اُنکی تاجپوشی پاپاے رومہ کے ہاتھوں نہ ہوئی بلکہ اور ملکوں کے بادشاہوں کی مثل صرف اپنے مُلکی پایۂ تخت کے اندر عمل میں آئی۔ ساتھ ہی جرمن شاہنشاہی کا پاپا سے رشتۂ اختصاص بھی ٹوٹ گیا۔

اسکے بعد جرمنی میں دو صدی تک پھر کُشت و خون اور خانہ جنگیاں ہوتی رہیں جنمیں جنگِ سی سالہ سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے کہ لاکھوں انسانوں کا خون، پانی بن کے بہ گیا[1]۔ اور مذہبی جوش میں بھائی کا بھائی نے گلا کاٹ ڈالا۔ بادشاہوں کے رُجحان عام طور پر رومن کیتھولک فریق کی طرف تھے لہذا اس قدیم فرقے کی قوت زیادہ تھی اور اگر آخر میں اگستاوش اڈولفس شاہ سویڈن مظلوم پروٹسٹنٹوں کی مدد کو جرّار فوج لےکر نہ آجاتا، تو شاید جرمنی میں انکا کوئی نام لیوا باقی نہ رہتا۔

اس تمام عرصے میں اُسوقت تک کہ فریڈرک اعظم پرشیا کے تخت پر جلوس کرے، جرمنی کی تاریخ نہایت بے مزہ اور نگاہ کو تھکا دینے والی ہے جس میں خون ریزی و خون خواری، مظالم و مصائب، شکستہ حالی و پریشانی کے ماسوا کچھ پڑھنے میں نہیں آتا۔ زراعت و تجارت، صنعت و حرفت کی راہیں بند ہیں، منڈیاں سونی پڑی ہیں، کھیتوں میں خاک اُڑتی ہے، فاقہ کش مخلوق کو بجز قزاقی کے کوئی پیشہ شکم پُری کا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مشغولیت کا، نظر نہیں آتا۔ اور باقاعدہ لڑائیاں ختم ہو جانے پر بھی جب فریقین معاند تھک تھک کے بیٹھ رہتے ہیں، قومی زندگی کی رفتار نہایت سُست اور مری ہوئی

[1] اندازہ لگایا گیا ہے کہ ممالک جرمنی کی آبادی جنگ سی سالہ سے پیشتر دو کرور نفوس تھی اور اسکے ختم ہونے پر ۱۶۴۸ء میں آدھی ہوکر بچانوے چھیانوے لاکھ پر اُتر آئی تھی۔ ۱۲

دکھائی دیتی ہے۔ جرمن شاہنشاہی جس میں عرصے سے کچھ اَنس باقی نہ تھا، بالکل اسمِ فرضی رہ گئی ہے اور چھوٹے چھوٹے خود مختار سلاطین یا رئیس اپنے علاقوں میں فرعونیت کے تماشے دکھاتے ہیں۔ ترقی یافتہ فرانس، تکلفات اور فضول خرچیاں سکھانے میں اُنکا اُستاد بنتا ہے اور اسی کی تربیت گاہ سے وہ عیاشیوں کے نئے نئے سبق پڑھکر آتے ہیں اور شاہانِ فرانس کی تقلید میں اپنے درباروں کو راجہ اندر کا اکھاڑا بنا دینا چاہتے ہیں۔ جب محدود آمدنیاں اس بیہودہ اسراف میں حارج اور مانع ہوتی ہیں تو غریب رعایا کا گلا گھونٹا جاتا ہے اور طرح طرح کی ناپاک شرارت اور زیادتیوں سے اُنکی کمائیاں غصب کیجاتی ہیں۔ ایک ایک رئیس جبر و استبداد کا پُتلا، بیحیائی کی برہنہ تصویر ہے عُجب و نخوت اُسکی سرشت میں داخل ہے بدکاری اُسکی گھُٹی میں پڑی ہے۔ دُنیا اور دُنیا کے پیدا کرنے والے کی نگاہ میں وہ انسانیت کے مرتبے سے گر چکا لیکن شاید ایسی بھی کوئی طاقت نہیں جو اُسے بتا سکے کہ تو انسان ہے!

بادشاہتِ فرانس کی قوّت اندنوں بڑی ترقی پر تھی۔ وہاں کے مسیحی تاجدار اپنے ہمسائے کی خرابیوں کو ہمیشہ کن انکھیوں سے دیکھتے رہتے تھے۔ اور جب موقع ملتا فائدہ اُٹھاتے تھے۔ جرمنی کے کمزور بادشاہوں سے وہ اضلاع اور شہر چھین لینا تو کوئی مشکل بات نہ تھی جو فرانس کی سرحد سے متصل تھے اور کثیر التعداد فرانسیسی آبادکاروں سے پوری طرح متأثر ہو چکے تھے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ عیّاری فرانس والوں نے یہ کی کہ چارلس ششم کو (جو درحقیقت آسٹریا کا مگر برائے نام تختِ جرمنی کا مالک تھا) مجبور کیا کہ وہ صوبہ جات السّاس و لورین کا نواب ایک فرانسیسی آوردے کو تسلیم کرلے۔ اس شخص کا مشکل تلفّظ نام "لیس زی زنس کی" (Leszezyens Ki) تھا اور اسی کے توسّط سے بالآخر یہ زرخیز علاقہ حکومتِ فرانس نے ہتھیا لیا۔

اسی کے قریب زمانے میں چارلس ششم نے وفات پائی اور اولادِ نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی طویل و عریض مملکت اکلوتی اور لاڈلی بیٹی میریا تھیریسا کے نام وصیت کر گیا (۱۷۴۰ء) یہ وسطِ یورپ کی وہ مشہور ملکہ ہے جس کا، الزبتھ کی طرح، نام آتے ہی اہلِ تاریخ کے دماغ میں بیسیوں دلچسپ افسانے

چکّر لگانے لگتے ہیں - وہ بڑی ذہین اور حوصلہ مند عورت تھی در اُس نے تخت نشیں ہوتے ہی اپنے اپنے مقبوضات اصلی، فرضی کی پڑتال شروع کی - یعنی آسٹریا ہنگری پر انتظام جمانے کے علاوہ جرمن ریاستوں سے مطالبہ کیا کہ اُسے باضابطہ شاہنشاہِ جرمنی تسلیم کریں - یہی پیام فریڈرک اعظم شاہ پرشیا کے پاس بھی بھیجا گیا -

نامور فریڈرک جیسا کہ ہم اشارۃً لکھ آئے ہیں، غیر معمولی قابلیت کا آدمی تھا - اسکی ریاست تو شاید رقبہ میں اتنی بھی نہ ہوگی جتنی کہ ہمارے ہاں بڑودہ کی ہے البتہ اسکی رعایا پچھلی خانہ جنگیوں سے نسبتاً محفوظ رہی تھی اور فریڈرک کی خوش نظمی نے ان کو اپنی علمی اور دماغی ترقیوں میں ایسا سہارا مے دیا تھا کہ شیلر اور گیٹی جیسے اربابِ فکر پیدا ہونے لگے تھے - خود پرشیا اندرونی انتظامات میں دوسری جرمن ریاستوں سے کم آزاد بھی نہ تھی فرق تھا تو یہی کہ جس وقت اور جگہ کے رئیس اپنی خود مختاری کا بہترین مصرف عیاشی اور بیہودگی کو سمجھتے تھے - خوش نصیب پرشیا کی حکومت فریضہ شناس سرداروں کے ہاتھ میں تھی اور اسکی خوشحالی اور جنگی قوت دن دونی اور رات چوگنی ہوتی جاتی تھی -

میریا تھریسیا کو جو کچھ فریڈرک نے جواب دیا وہ آسکندر فیلقوس کی جھڑک سے ملتا جلتا تھا جس نے دارائے عجم کی طلبِ خراج سن کے کہلا بھیجا تھا کہ

زمانہ دگر گونہ آئیں نہاد　　شد آں مرغ کو خایۂ زریں نہاد

نتیجہ اس جواب سوال کا ایک طولانی جنگ کی شکل میں رونما ہوا - ہر سال موسم سرما کے ختم ہوتے ہی آسٹروی فوجیں پرشوی سرحدوں پر حملہ کرتیں اور ہر سال وہاں کے قلعے محصور ہو کر انکی یورشوں کے آگے ٹیاں لگا دیتے - مدت تک یہی سلسلہ جاری رہا - کبھی کبھی ایسا ہوا کہ آسٹریا کو دوسری طرف لڑائیوں میں مصروفیت رہی اور فریڈرک کی فوجیں اپنی سرحدیں عبور کر کے نواحی علاقوں کو تاراج کر آتیں باقی روک تھام کا جہاں تک تعلق ہے پرشیا نے شجاعانہ مدافعت کا حق ادا کر دیا - اس معاملے میں بالواسطہ انھیں روسیوں سے بھی بہت سہارا ملا جو ترکوں سے لڑتے لڑتے آسٹریا کے وقتاً فوقتاً دروازے کھٹکھٹاتے تھے اور اُن دنوں سیلابِ آتش کی طرح یورپ وایشیا میں

پھیلتے جاتے تھے۔ انھیں کو روکنے کے واسطے تیریا نے فریڈرک سے، گو تھوڑے دن کے لیے، مصالحت کرلینی مناسب سمجھی اور امن نامہ ایکس لاشاپل پر ۱۷۴۸ء میں دستخط کردیے۔ جسکی رُو سے سلیشیہ کا زرخیز صوبہ پرشیا میں شامل ہوگیا۔ کیونکہ روسیوں کے چڑھاؤ کا رُخ یہی تھا اور اسکے جنوب میں آسٹروی سرحدیں قدرتی پہاڑوں سے محفوظ و مصئون تھیں۔ بہ الفاظِ دیگر سلیشیہ کو علیحدہ کرنے سے روس و آسٹریا کے درمیان ایک دیوار کھنچ گئی اور پرشیا کا بھی مُنہ بند ہو گیا۔ اور اب میریا تھریسیا کو، جس کی حکمتِ عملی تریا چرتر کہلائے تو زیبا ہے، ایک اور سازش کی دُھن لگی جو اپنی گہرائی میں نسوانی جذبۂ انتقام کی تمام خصوصیتیں چھپائے ہوئے تھی۔ نہیں، وہ ایک جال تھا موت کا، جس میں پرشیا کو پھانسنا منظور تھا، اس بے رحمی کے ساتھ کہ پانی نہ مانگ سکے ——— اور مجھے تو اس جوڑ توڑ کی سرگزشت پڑھکر ہمیشہ یہ خیال آیا کرتا ہے کہ شاید میریا تھریسیا ہی موجودہ یورپین ڈپلومیسی کی ماں ہے۔ اور ماں نہیں تو معلمۂ اوّل تو ضرور ہے۔ واقعی عین اُسوقت کہ ایکس لاشاپل کے معاہدے پر وہ دستخط کر رہی تھی، اسکے دو معتمد علیہ ماسکو اور پیرس جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ شاہانِ روس و فرانس سے پرشیا کی تکا بوٹی کر لینے کے متعلق گفتگو کریں !!

یہی نہیں: میریا نے اپنی سازباز کا ڈورا سویڈن و سیکسنی تک پھیلایا تھا۔ سویڈن اُن دنوں یورپ کی دَولِ عظمیٰ میں تھا اور ناروے اس سے جدا ہوکے الگ سلطنت نہ بنا تھا۔ بلکہ خود شمالی جرمنی کے بعض علاقے (پرشیا سے متصل) اسکے قبضے میں آ گئے تھے لہذا اُسے فریڈرک سے حسد ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ اودھر سیکسنی جرمنی کی ایک بڑی اور خود مختار ریاست تھی۔ وہاں کا بادشاہ میریا تھریسیا کا نیازمندِ باختصاص تھا، اور شکار، اُس عالم گیر فرومائگی کا، جسکی بدولت آدمی اپنے ہمسروں کی ذلت دیکھ دیکھ کے خوش ہُوا کرتا ہے۔

غرض طرح طرح کی ریشہ دوانیوں سے اِن تینوں چاروں سلطنتوں کو ملاکر میریا تھریسیا نے پرشیا کے خلاف اشتہارِ جنگ دے دیا۔ (۱۷۵۶ء) اور شمال، جنوب، مشرق، تین سمت سے اس

چھوٹی سی ریاست پر فوجیں ہُول دیں - اسوقت برّاعظم بھر میں فریڈرک کا ہمسر، دانگلستان کے سوا کوئی ملک نہ تھا - لیکن لڑائی جب بقا اور زندہ رہنے کے واسطے لڑنی پڑتی ہے تو ناگزیر ہوتی ہے اور تمام اربابِ فکر اس بات کو طے کر چکے ہیں کہ محکوم بنکر جینا توحیاتِ انسانی نہیں[۱]۔

یورپ کی اسی لڑائی کا نام جنگِ ہفت سالہ ہے - ہم اسکے تفصیلی واقعات کو چھوڑتے ہیں کہ یہ مضمون بہت طویل ہُوا جاتا ہے البتہ یہ لکھنا ضروری ہے کہ جب آخر میں فریڈرک فتحیاب ہوا تو ساری جرمنی میں ایک بڑا بھاری انقلاب پیدا ہو گیا -

یہ تو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ عرصے سے جرمنی ایک قدیم جغرافیائی اصطلاح رہ گئی تھی اور سیاسی طور پر اسمیں بیسیوں خود مختار سلطنتیں الگ الگ تھیں جنکے آئین و قوانین بالکل جدا گانہ تھے برائے نام اُنپر شاہ آسٹریا شہنشاہی کرتا تھا اور انکی اپنی اندرونی حالت ، اختلافاتِ کثیرہ کے اعتبار سے ، قریب قریب ایسی تھی جیسی کہ آج کل فی المثل ہمارے وطن ہندوستان کی ہے - تاہم انمیں ایک قدرتی علامتِ قومیت کچھ بچی کچھی باقی تھی - یعنی تمام ممالک میں جرمن زبان بولی یا کم سے کم سمجھی جاتی تھی - دور دراز صوبوں کے عوام الناس تو ضرور مقامی بولیاں بولتے اور ایک دوسرے کی بات ذرا مشکل سے سمجھتے تھے باقی خواندہ یا اعلیٰ طبقے کے لوگ اس سرے سے اُس سرے تک ایک زبان میں کلمۂ و کلام کر سکتے تھے - اور یہ خدا کی عنایت تھی کہ وہاں کے اربابِ رسوخ نے سب عیب کیے مگر ایسی کوئی کوشش کبھی نہیں کی کہ مقامی بولیوں کو علٰحدہ علٰحدہ مستقل زبانیں قرار دے لیتے اور

[۱] اکثر یونانی مفکر خصوصاً مشہور فصیح البیان ڈمستھن (یا ڈماس تھے نیز) اس بات کو اچھی طرح ثابت کر چکے ہیں کہ مجبورانہ تقلید یا محکومی جوہر انسانیت کو غارت کر دیتی ہے - کیوں کہ اگر محکوم ہو جانے کے یہی معنے ہیں کہ آدمی اپنے افعال میں کسی دوسرے کا تابع ہو جائے اور اپنی عقل و فکر سے کام نہ لے سکے تو وہ یقیناً آدمیت سے خارج ہو جائیگا اسلیے کہ بغیر اس آزادی کے وہ کوئی ترقی یا بہتر تغیر اپنے حالات میں نہیں کر سکتا حالانکہ اسمیں اور حیوان میں یہی شئے بالامتیاز ہے - ایک اور شخص کا قول ہے کہ کسی محکوم کا اپنے تئیں آدمی سمجھنا ایسا ہے جیسا ایک اندھے کا خواب میں اپنے کو بینا دیکھنا اور سادگی سے اُسپر یقین لے آنا - ۱۲

سچی قومیت کو ایسا شیطانی دھکا ایک کھڈ میں دیتے کہ جس سے نکلنے کی کوئی امید باقی نہ رہتی۔ یہی (زبان) وہ چیز ہے، اور اہل نظر کو اصرار ہے کہ فقط یہی، وہ یکسانیت ہے کہ جس نے تکمیل پاکر جرمنی کو جرمنی بنایا ہے جسکی بدولت وہ دنیا کی قوموں میں آخرکار معزز و سربلند ہوئی۔ اور عجب نہیں وہ کم نگاہ، جو اس ہمزبانی (یا ایک علم ادب ہونے) کے ۔ آبانی اثرات سے واقف نہیں، یہ سن کر متعجب ہوں کہ جب پرشیا نے آسٹریا پر فتح پائی (۱۷۶۳ء) تو جرمنی کی مختلف ریاستوں کے لوگوں نے اسکی اتنے ہی جوش کے ساتھ خوشیاں منائیں جتنی کہ خاص اہل پرشیا نے۔ اور صرف ہمزبانی تھی جس کی بدولت یکایک وہاں کے لوگوں کو یہ بھولی بھلائی بات یاد آگئی کہ "پرشیا والے وہی تو ہیں جو ہم ہیں!"[1]

قانونی طور پر دیکھو تو تیریا تھیریسیا اس امر کی مستحق تھی کہ اہل جرمنی اسکے ساتھ ہمدردی کرتے لیکن قدرت انجام کار تصنع اور بناوٹ پر ہمیشہ غالب آجاتی ہے اور جرمنی کے لوگ ابھی انسانی قانون اور زبردستی کے ضابطوں سے اس قدر نہیں دب گئے تھے کہ اُنکے فطری جذبات بالکل نیست و نابود ہو جاتے۔ وہ تیریا کی شکستوں پر بہت خوش ہوے اور فریڈرک انکا قومی ہیرو بنگیا۔ خود وہ بھی اپنے ہموطنوں کے ان خیالات سے بے خبر نہ تھا اور جنگ ہفت سالہ کے بیس بائیس برس بعد جب جوزف ثانی شاہِ آسٹریا نے بعض قدیم حقوق شاہنشاہی کے مطالبے میں دباؤ ڈالنا چاہا تو پرشوی سفیر نے اسکو اور جتا دیا کہ وہ ہمارے ہمقوم ہیں!

اس دخل دِہی کا بڑا عمدہ اثر پڑا۔ اور جب اہل جرمنی کی پُرشوق صدائیں زیادہ بلند ہوئیں تو فریڈرک نے بھی لبیک کہا اور ایک انجمنِ ممالک (لیگ) کی بنیاد ڈالی جس میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے شرکت منظور کی اور بے شبہہ یہی انجمن عملی طور پر اس جدید متحدہ جرمنی کی

---

[1] اس بات کے بخوبی سمجھنے کے لیے اور اس زبردست اثر کا اندازہ لگانے کے لیے جو ایک علم ادب ہونے کی وجہ سے شیلر، کینٹ، اور گیٹی نے جرمن قومیت پر اثر ڈالا ان سائیکلوپیڈیا کے حوالہ زدہ مضمون اور دی ڈیولپمنٹ آف جرمنی کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔ ۱۲۔

بنیاد ہوتی جس نے آج کل یورپ میں اس قدر تہلکہ ڈال رکھا ہے اگر اُنھیں دنوں فرانس میں وہ سیاسی بھونچال نہ آجاتا جسے فرنچ ریوولیوشن (انقلابِ فرانس) کہتے ہیں۔ (۱۷۸۹ء)

باقی آیندہ

۱۲، دسمبر، فریدآباد بقلم - سیّد ہاشمی

سُکونِ جذبات

مدت میں ایک دوست سے کل سامنا ہُوا ۔۔۔ پہلے تو خوب شکوے ہوے اور گِلا ہُوا
پھر بولے - ہمکو بھول گئے - خیر، کچھ نہیں ۔۔۔ لیکن یہ کہیے وہ دلِ پُرشور کیا ہُوا
رونق فزا تھا جس میں تمناؤں کا ہجوم ۔۔۔ ارمانوں سے جو رہتا تھا ہردَم بھرا ہُوا
اُٹھتی تھیں جس کی وجہ سے لاکھوں قیامتیں ۔۔۔ جسکے سبب سے بارہا محشر بپا ہُوا

میں نے کہا کہ سوداہی وہ اب نہیں رہا
وہ شور و شر وہ جہلِ مرکب نہیں رہا

مدت ہوئی ہے ترکِ محبت کیے ہوے ۔۔۔ بیٹھا ہوں حسن و عشق سے فرصت کیے ہوے
وہ جوشِ آرزو ہی نہیں جو کہ تھا کبھی ۔۔۔ مجھکو غریقِ لُجّۂ الفت کیے ہوے
وارفتگی مزاج میں باقی نہیں رہی ۔۔۔ سنجیدگی ہے بندہ منت کیے ہوے
ہے شورشِ خیال بھی اب دور - کیونکہ ہے ۔۔۔ اندازۂ سکون طبیعت کیے ہوے

انسان خواہ کتنا ہی جذبات کوش ہو
فطرت کا اقتضا ہے کہ آخر خموش ہو

ارشد تھانوی

دربار برلن کے اندرونی حالات

(دی سیکرٹ ہسٹری آف دی کورٹ آف برلن)

آٹھ برس ہوئے اس نام کی ایک کتاب انگریزی میں شایع کی گئی تھی، اور اب اُسی کا پانچواں نسخہ (یا اڈیشن) ہے جس پر ہم ریویو لکھ رہے ہیں: مصنف اسکی ایک انگریز خاتون ہے جس نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا لیکن دیباچے میں یہ بات کھول دی ہے کہ اُسے قیصر جرمنی اور قیصرہ کی درباری اور اندرونی زندگی دیکھنے کا کس طرح موقعہ ملا: اس کا دعوے ہے کہ میں کئی سال خاص قیصرہ کی سہیلیوں میں رہی اور اس اثنا میں " جرمنی کے اس شاہی جوڑے" کے بیچ کے حالات اچھی طرح دیکھنے میں آئے۔ اور انھیں مشاہدات کی بنا پر یہ کتاب پبلک میں پیش کی گئی۔

مگر واقف ماننے کے ساتھ ہمیں یہ کہدینے میں بھی تامل نہیں کہ مصنفہ کے طرز بیان سے اسکا تعصب ٹپکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ پہلے سے قیصر اور قیصرہ کی نسبت نہایت بُری حقارت اور بُری رائے رکھتی ہے اور اُسے ان دونوں کی معمولی سے معمولی عادتیں بھی خطرناک عیوب نظر آتی ہیں۔ اس نقص کے باوجود کتاب دلچسپ ہے اور اِندنوں اس کی مانگ بہت زیادہ اس لیے بڑھ گئی ہے کہ موجودہ جنگِ یورپ کا مہیب ہیرو اور محور ولیم ثانی قیصر جرمنی ہی کو مانا جاتا ہے اور اسی پر ساری دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ لہذا جہاں کہیں اسکے متعلق حالات دستیاب ہوں لوگ خوشی خوشی اُنھیں پڑھتے ہیں کہ اپنے عہد کے اس زلزلہ افگن شخص سے زیادہ واقفیت اور تعارُف حاصل کر سکیں۔

لیکن اگر مصنفہ کا بیان صحیح ہے تو بااین ہمہ جاہ وجلالِ دُنیوی قیصر ایک نہایت ادنے انسان ہے جسے مادرِ فطرت نے روگیوں کی شکل ناقص رکھا ہے اور جس کا بایاں کھوا اور بایاں پیر تقریبًا بیکار رہے۔ ساتھ ہی گلے کا ایسا موروثی مرض ہے کہ معمولی شکایت بھی مخدوش صورت اختیار کرلیتی ہے اور بیچارہ قیصر مجبور رہے کہ ان بیماریوں کے ڈر سے بڑی احتیاط کرتا رہے کیونکہ

اس مضمون کے صفحات غلطی سے اُلٹ گئے ہیں ناظرین ہندسوں کا لحاظ کرکے پڑہیں۔

اُسے آپ نے تار دیا کہ "میں فلاں اسٹیشن پر صبح کے ساڑھے سات بجے ریل میں تمھارا انتظار کروں گا، فلاں معاملے کے متعلق جو کاغذات تمھارے پاس موجود ہیں اُنھیں مہربانی سے ہمراہ لیتے آنا۔"

صبح کو قیصر بچھونے سے اُٹھا ہی تھا کہ شاہزادۂ ہواں لوہی کی بیوی کے آنے کی اطلاع ہوئی وہ جلدی سے ملاقات کے کمرے میں آیا اور رسمی صاحب سلامت کے بعد کہنے لگا۔ "خیر تو ہے پُھپا صاحب کا مزاج کیسا ہے؟"

پُھپی نے جواب دیا "بالکل اچھے ہیں۔ لیکن تمھیں بھی کیسے بے وقت کام یاد آتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ میں نے پسند نہیں کیا کہ تمھارے ضعیف العمر پُھپا کو تکلیف دوں۔ اُنھیں آرام کرتا چھوڑ کر خود یہ کاغذات لے آئی ——"

قیصر۔ "مگر پُھپی سلطنت کے معاملات میں آپ جانتی ہیں کہ شاہی حکم بجا لانے میں اس قسم کا تساہُل ——"

وہ یہیں تک کہنے پایا تھا کہ اُسکی پُھپی نے بات کاٹ دی اور جلدی سے بولی: "واہیات! اس قسم کے شاہی احکام تو کچھ کپ رُوی ہی جیسے لوگوں پر خوب چل سکتے ہیں۔ اپنے برابر والے لوگوں سے تم ایسی توقع نہیں کرسکتے —— لو اب مہربانی سے اپنے یہ کاغذ تو دیکھ بھال لو —— آگسٹا کہاں ہے؟"

یہ جھاڑ سُن کر وِلیم چُپ ہو کے رہ گیا اور یہی غنیمت سمجھا کہ دروازہ کھول کے اپنی نازک مزاج پُھپی کو قیصرہ کے کمرے میں پہنچا دے۔

مصنف کے بیان کے بموجب اصل بات یہ ہے کہ قیصر اپنے امراوں کو بھی ذاتی نوکر سمجھتا ہے اور اسلیے ایسا برتاؤ اُنکے ساتھ کرتا ہے؛ باقی رہی فوج، تو وہ اُسکے نزدیک خداوندِ جرمنی کے بندگانِ خاص میں ہے اور وہ بار بار جرمن رنگروٹوں کے سامنے تقریروں میں کہہ چکا ہے کہ تمھارا سب سے بڑا اور مقدس فرض یہ ہے کہ بادشاہی احکام کے مطابق چلو اور اسی کی اطاعت میں اپنی جان و ایمان کو نثار کر دینے میں بھی تامل نہ کرو۔ ممکن ہے کہ کسی وقت تمھارے عزیز و اقارب پر تشدد ضروری سمجھے تو تم پر لازم ہے کہ اگر ضروری ہو تو اُسکی خاطر اپنے باپ اور بھائی

تک کا گلا کاٹ ڈالو! ــ　　　وغیرہ وغیرہ"

اس موقعہ پر یہ بات قابلِ داد ہے کہ مصنفہ نے یہ پیشین گوئی اپنی کتاب میں کی ہے کہ اس قسم کی خونی تعلیم پاکر عجب نہیں جو قیصر کے یہ "فدائی" عنقریب اپنے ہاتھ یورپ کے لہو سے رنگین کریں اور قیصر کے اشارے پر شکاری کتوں کی طرح جھپٹ پڑیں۔

اس باب میں مصنفہ نے قیصر کی لیاقت اور مصروفیت کا بڑا خاکہ اُڑایا ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ یہ جو اسکی نسبت مشہور ہے کہ وہ دن رات معاملاتِ مُلکی میں منہمک رہتا ہے، سراسر لغو اور غلط ہے۔ قیصر کو فقط سیر و شکار اور سوتے رہنے کا شوق ہے کام سے وہ بہت کتراتا ہے اور اور دن کا زیادہ حصہ اپنے مصاحبوں اور فوجی افسروں کے ساتھ پھکڑ بازی اور خرافات میں گزار دیتا ہے۔ ہم اکثر انٹے کے کمرے میں اُسے اس حال میں کرسی پر پڑا دیکھیں گے کہ ایک پاؤں میز پر رکھا ہے اور ایک نیچے لٹکا ہوا جھونکے کھا رہا ہے میز کے اِردگرد اُسکے بدمذاق حاشیہ والے بیٹھے بیہودہ قصے سنا رہے ہیں اور اسی طرح ہنسی قہقہوں میں چار چار گھنٹے ختم ہو گئے ہیں — پھر مصنفہ قیصر کی ہنرمندی پر تمسخر کرتی ہے کہ اسکا اعلیٰ درجے کا مصور اور شاعر مشہور ہونا فقط اسکے وظیفہ خوار خوشامدیوں کی بدولت ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی خیال ولیم کو آجاتا ہے اور وہ اُسے اپنے درباری نقاش سے بیان کرتا ہے جو اسی خیال کو بنا سنوار کے تصویر کی شکل میں ایک نئی جان ڈالدیتا ہے اور یہی تصویر جنابِ قیصر سے منسوب کردی جاتی ہے۔ اسی پر اُسکی شاعری کو قیاس کر لینا چاہیے۔ البتہ مصنفہ کا بیان ہے کہ دو ایک ڈرامے اُس نے اپنے قلم سے ضرور لکھے ہیں مگر وہ بالکل معمولی درجے کے ہیں اور عوام یا خواص کوئی بھی اُنھیں پسند نہیں کرتا۔

یہ تمام کارروائیاں قیصر شہرت حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے۔ اس شے کا وہ اس قدر اندھا شوقین ہے کہ شہرت اور بدنامی میں بھی اُسے تمیز نہیں رہی ہے۔ چنانچہ مصنفہ کا بیان ہے کہ جب اُس نے جرمن ریخسٹاگ کو ایک تقریر میں سخت سُست کہا اور اس توہین پر ساری

یہ بھی اشارے کنائے محل میں ہونے لگے تھے کہ ہربٹ نے ولیم کو حرم سلطانی سے رُوشناس کر دینے کا سبز باغ دکھایا ہے اور طرح طرح کے لالچ دے کے قسطنطنیہ لیجا رہا ہے۔ مصنفہ کہتی ہے کہ یہ تو معلوم نہیں ہربٹ نے اس قسم کا کوئی مجنونانہ وعدہ اپنے آقا سے کیا تھا یا نہیں البتہ میں جانتی ہوں کہ میری مالکہ (قیصرہ) کو کامل یقین اس افواہ پر تھا اور اسی بنا پر اُس نے اپنا ایک خاص معتمد قیصر کے ساتھ لگا دیا تھا کہ اسکے شوہر کی باقاعدہ نگرانی کرتا رہے!

آگے چل کر جہاں مصنفہ نے قیصر کی خود پرستی اور شخصیت پسندی پر بحث کی ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ عبد الحمید خاں کا بھی اس لیے مدّاح ہے کہ یہ سلطان عہد قدیم کے جابر بادشاہوں کی طرح ایک مطلق العنان فرماں روا تھا۔ اور ولیم کے دل میں تمنا ہے تو یہ اور ہوس ہے تو یہ کہ وہ بھی اسی طرح نقارۂ استبداد بجائے اور خسروان عجم کی طرح برلن میں بیٹھکر خدائی کرے۔ لیکن آفت یہ ہے کہ جرمنی کے متمدن لوگ کسی عنوان شخصیت کی برداشت نہیں لا سکتے۔ اور ہرچند ولیم کچھ زباں زوری اور کچھ دھینگامشتی سے اپنی فرعونیت کو بہت نباہ لیتا ہے پھر بھی مجلس قومی یا رکیس ٹاگ وہ بلاے قوی ہے کہ مالی اور قانونی معاملات میں قیصر کی اکثر پیش نہیں جاتی اور اُسے اُنھیں "عوام الناس" کا ہاتھ تکنا پڑتا ہے۔

گر ساری قوم پر استبداد کا سکّہ نہیں بیٹھ سکتا تو نہ بیٹھے قیصر اپنے دل کے ارمان نجی کے ملازموں اور فوج والوں ہی پر نکال لیتا ہے۔ اول الذکر صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کاموں میں جتے رہتے ہیں۔ تنخواہیں نہایت قلیل اور غذائیں ایسی بُری ملتی ہیں کہ جب ۱۸۹۹ء میں ولیعہد انگلستان برلن آئے تو انکے نوکروں نے ایک دو روز کے بعد قیصر جرمنی کے آدمیوں کے ساتھ انکا کھانا کھانے سے انکار کر دیا، بلکہ انکی دیکھا دیکھی قیصری ملازم بھی اپنی باسی کوسی غذا پر ناک بھوں چڑھانے لگے۔ اسکے بعد مصنفہ کہتی ہے کہ ان ملازموں کی مصیبت ولیم ثانی کے عہد میں اور زیادہ اس لیے بڑھ گئی کہ جرمنی کا موجودہ فرماں روا نہ صرف اپنے بزرگوں جیسا خسیس

بلکہ اُن سے کہیں جا رہے اور چونکہ ہر ہفتے اپنی مملکت میں سفر کرتا رہتا ہے اس واسطے بچارے نوکر اس کے دقت بے وقت احکام بجا لانے سے سخت عاجز رہتے ہیں۔ کبھی وہ رات کے ایک بجے سواری تیار کرنے کا حکم دیتا ہے کبھی صبح کے پانچ بجے کسی دور دراز سفر پر آمادہ ہو جاتا ہے اور کبھی ریل پر پہنچتے پہنچتے ارادہ بدل کر حکم دیتا ہے کہ شکار کا سامان کیا جائے۔ ان ساری کارروائیوں میں ایک گھنٹے سے زیادہ دیر لگ جائے تو شاہی غضب نوکروں پر نازل ہوتا ہے۔ پھر جہاں کہیں اُسے جانا ہو وہاں یکایک پہنچ جانے کی وجہ سے جو دقتیں اسکے قیام وطعام کا انتظام کرتے میں ہوتی ہیں انکا حال کچھ وہی شخص جان سکتا ہے جسکے سپرد یہ کام کیا جائے۔ غرض یہ کہ قیصر کے ملازموں کو کسی وقت اطمینان نصیب نہیں ہوتا اور وہ ہر گھڑی تازہ احکام کے انتظار میں بیچین ومضطرب رہتے ہیں۔

مصنفہ کہتی ہے کہ اس قسم کا ناروا سلوک ادنی ملازمین ہی تک محدود نہیں بلکہ سلطنت کے بڑے بڑے عہدے دار بھی قیصر کی ان تلوّن مزاجیوں سے مبتلاے زحمت رہتے ہیں۔ کبھی کسی وزیر کو حکم ہوتا ہے کہ وہ فلاں فلاں کاغذات صبح کے نو بجے پیش کرے اور جب وہ قصرِ قیصری میں حاضر ہوتا ہے تو شاہی حاجب اُسے اطلاع دیتے ہیں کہ قیصر کو اسوقت فرصت نہیں وہ آپ سے دوپہر کو ملاقات کریں گے۔ بچارہ وزیر دوپہر کو حاضر ہوتا ہے تو قیصر اُس سے ہاتھ ملاتے ہی مسکراکر فرماتے ہیں کہ "اوہو نواب، تم ذرا دیر میں آئے، مجھے تو واللہ بالکل یاد ہی نہیں رہا کہ تم سے گفتگو کرنی ہے، اچھا اب تو مَیں ذرا مچھلی کے شکار کو جا رہا ہوں، رات کو فلاں مقام پر ایک جلسۂ افتتاحی میں شریک ہوں گا اسکے بعد بارہ بجے ہم اور تم یہیں اُس معاملہ میں بحث مباحثہ کریں گے۔ خدا حافظ"! اسی ضمن میں مصنفہ نے ایک واقعہ پرنس ہوان لوہی کا لکھا ہے۔ یہ ضعیف العمر مدبّر بسمارک کے جانشین کپ ریوی کے بعد جرمنی کا صدرِاعظم بنایا گیا تھا۔ قیصر کا اُس سے قریبی رشتہ ہوتا ہے اور قیصرہ اسکی بیوی کی حقیقی بھتیجی ہے۔ ولیم نے بڑی منت خوشامد سے اسکو اس عہدۂ جلیلہ کے لیے رضامند کیا تھا۔ ایک روز رات کے گیارہ بجے

جرمنی میں سخت جوش و خروش پھیلا اور اخبارات میں دھڑا دھڑ اسکے متعلق مضامین چھپے تو اُسوقت قیصر بہت ہی خوش اور مسرور تھا - وہ اخبار پڑھتا رو جہاں کہیں اپنا نام آتا اُسکی باچھیں کھل جاتیں -

مگر شہرت کے اس جنون سے بھی عجیب تر مصنف نے ایک نہایت دلچسپ بات قیصر کی نادرستی دماغ کے بارے میں یہ تحریر کی ہے کہ اُسے گنتی نہیں آتی اور سونے چاندی کے سکوں اور لاکھوں اور کروروں کے اعداد میں وہ صاف طور پر فرق نہیں کرسکتا - گویا وہ حساب میں قطعاً نابلد ہے - اور مصنف نے اسکی کئی بڑی مزے دار مثالیں فراہم کی ہیں - مثلاً جب کبھی قیصر کسی چھاؤنی کے معاینہ کو جاتا ہے اور فوجی افسروں کا مہمان ہوتا ہے تو وہاں اسکی تو اتر تاکید یہی ہوتی ہے کہ خبردار میری مہمانی پر دس مارک روزانہ سے زیادہ صرف نہ کیا جائے۔ (مارک ایک قدیم سکہ تقریباً بارہ روپیے کے ساوی ہوتا ہے) اسی حساب سے خزانۂ شاہی سے اسکے مصارف سفر ادا کیے جاتے ہیں حالانکہ اگر محض اسکی شراب کا اندازہ کیا جائے تو ہزاروں روپیے روزانہ کا صرفہ بیٹھتا ہے - لیکن مصنف کہتی ہے کہ قیصر کو اپنے دل میں اسی کا یقین ہے کہ میں رقم مذکورہ سے زیادہ ایک پائی خرچ نہیں کرتا اور وہ بار بار اس کفایت شعاری کی شیخیاں مارتا رہتا ہے اور بھول کر بھی اسکے خیال میں یہ بات نہیں آتی کہ اسکا اندازہ اسقدر غلط ہے کہ ایک دس برس کے بچے کو بھی اُس پر ہنسی آئے -

قیصر کی تمام عادات و افعال کو دیکھکر جو رائے مصنف نے قائم کی ہے اُسکا لبِّ لباب یہ ہے کہ وہ نہایت خود پسند، جابر اور سفاک بادشاہ ہے اور ذہانت و دیوانگی میں بہت کچھ محمد تغلق شاہنشاہِ دہلی، اور کیلی گولا قیصر روما سے ملتا جلتا ہے - باقی اسکے امیر وزیر یا درباریوں کے بارے میں کتاب زیر ریویو میں صرف جزوی باتیں درج ہیں اسی لیے اسکا اتنا جامع نام رکھنا قدرے غیر موزوں ہے - بااینہمہ کتاب مجموعی طور پر اچھی ہے، اور اسکا سستا نسخہ بارہ آنے قیمت میں کچھ زیادہ گراں نہیں - فقط

"ش"

شہر آشوب

(تضمین غزل حضرت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ)

نظمِ ہستی ہمہ آتش زیر و زبر می بینم — زانکہ ہر لحظہ بہ عنوانِ دگر می بینم
تیرہ چوں روے بتاں، روے سحر می بینم — ایں چہ شور ایست کہ در دورِ قمر می بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

قہر ہے پاتے ہیں دے دے کے دعائیں تمام — گردشِ بخت سے بن بن کے بگڑ جاتے ہیں کام
دیکھیے ہوتا ہے کیا اہلِ وفا کا انجام — ہمہ کس روے بہی می طلبد از ایام
مشکل این است کہ ہر روز بتر می بینم

رنجِ تا خیر ہے کیوں - سرخوشِ صہباے لست — تجھ تک آنے ہی کو ہے ساغرِ مے دست بدست
تلخ کامی سے نہ مایوس ہو اے قوم پرست — ابلہاں را ہمہ شربت ز گلاب و قند است
قوتِ دانا ہمہ از خونِ جگر می بینم

آدمی نام کو - حیوانوں سے بھی ہیں بدتر — پاس چھوٹوں کا ہے اصلا نہ بڑوں کا کچھ ڈر
ایک نقشہ نظر آتا ہے بعینہ گھر گھر — دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر
پسراں را ہمہ بدخواہِ پدر می بینم

دشمنی کی نہ زمانے میں رہی اب کوئی حد — دوستوں کو ہے ہم دوستوں کے ساتھ وہ کد
ایک عالم میں ہے پھیلا مرضِ بغض و حسد — ہیچ لطفے نہ برادر بہ برادر دارد
ہیچ مہرے نہ پسر را بہ پدر می بینم

نفس کی اپنے ذرا جانچ تو کر لے ناداں — نام کو آج نہیں تجھ میں شرافت کے نشاں
شرم اے قوم کہ ہے قابلِ عبرت یہ سماں — اسپِ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں
طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خر می بینم

سُن سکے درد میں ڈوبے ہوے اشعار تو سُن — ہاں مگر بیٹھ کے پہلو میں مرے سر کو نہ دُھن
صدق کے باغِ فصاحت کے یہ کچھ پھول ہیں چُن — پندِ حافظ شنو اے خواجہ برو نیکی کُن
زانکہ این پند بہ از گنجِ گہر می بینم

صدق - جائسی

اس کے کمزور قلب میں متعدی امراض کا خوف بیٹھ گیا ہے اور اسے چھوت چھات کا اس درجے وہم ہے کہ شاید مدراس کے مرہٹہ برہمنوں کو بھی نہ ہوگا۔ کسی بیمار درباری یا ملازم شاہی کو اجازت نہیں کہ وہ محل میں قدم تک دھر سکے۔ حتیٰ کہ مصنفہ نے دو تین مثالیں لکھی ہیں جن میں آدھی رات کے وقت محل کے معزز ملازموں کو باہر نکالے جانے کا ذکر ہے محض اس لیے کہ انھیں معمولی بخار وغیرہ کی شکایت پیدا ہوگئی تھی ؛

قیصرہ بھی اس وہم میں اپنے شوہر کی شریک ہے۔ اور گو وہ قیصر کی طرح طبعاً تنگ نہیں لیکن میاں کی خوشنودی کا خیال اس سے بھی وہی سختیاں محل کی عورتوں پر کراتا ہے جو اس کا شوہر مردوں پر کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ قیصر کی جابرانہ فرعونیت نے اپنی بیوی کو بھی اُسی طرح مغلوب و مرعوب کر رکھا ہے جس طرح کہ اُسکی رعایا کو۔ اور ہر چند وہ اپنی بیوی کو دل سے چاہتا ہے لیکن مصنفہ کہتی ہے کہ یہ محبت ایسی ہے جیسے کوئی اپنے مزاج شناس غلام سے کرنے لگے۔ یعنی اُسکے دل میں مطلق وقعت اپنی بیوی کی نہیں اور کبھی روا دار نہیں ہوتا کہ یہ عالی مرتبہ خاتون کوئی کام اسکے خلافِ منشا کر سکے۔

مصنفہ نے اس ذکر کے بعد اُن نج کے کمروں کا حال لکھا ہے جن میں قیصر اور قیصرہ رہتے سہتے ہیں۔ مصنفہ کا بیان ہے کہ ان میں ہر طرف خست اور افلاس اور بدمذاقی نظر آتی ہے۔ میلی کچیلی میزیں، پُرانی پُرانی بھدی کرسیاں، گلے سڑے منقش پردے اور تصویریں — غرض ہر طرف نحوست کی شان ہے۔ اور یہ تمام سامان اُس خدائے جرمنی کے جبروت کے سخت منافی ہے جو، مصنفہ یقین دلانا چاہتی ہے کہ ہمارے زمانے میں اپنے تئیں نمرود شداد لقائے باختری یا فرعونِ مصر سے کمتر نہیں سمجھتا۔ حالانکہ اُسکی مفلسی یا کنجوسی نے یہ نوبت پہنچا دی ہے کہ بچھونے کی چادریں بھی روزانہ نہیں بدلی جاتیں۔ اور خواب گاہِ قیصری میں ململ لٹھے تک کا کال ہے۔ لیکن سب سے دلچسپ بات اس شاہی جوڑے کی خانگی زندگی میں یہ ہے کہ قیصرہ کو تو اپنے نج کے کمروں میں ماما اصیلوں کا زیادہ آنا پسند نہیں اور قیصر اسکو روا نہیں رکھتا کہ

انکی بجائے مردوں سے کام لے۔ لہذا بہت سے کام بچاری قیصرہ کو اپنے ہاتھوں کرنے پڑتے ہیں۔ اور کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ آدھی رات کو اپنی خوابگاہ کا آتش دان کھڑی روشن کر رہی ہے!

مگر بدگمان قیصر کو اپنی عفت مآب بیوی کی نگرانی کا خیال ہو بھی تو بیکار ہے البتہ قیصر کا اسکی نسبت تنگ کرنا بالکل جائے سر ہے کہ وہ ایک آوارہ مزاج شخص ہے۔ اور مصنفہ نے اسکی عشقبازی یا سیاہ کاری کی کئی مثالیں فراہم کی ہیں جن میں سب سے بدتر، شہزادہ رڈولف کے ساتھ اسکے "جورو بدل" بھائی بننے کی روایت ہے۔ یہ آسٹروی شاہزادہ قیصر کا بڑا دوست تھا۔ اور اسی بنا پر قیصر نے مذکورۂ بالا تجویز کی تھی جو مصنفہ کہتی ہے کہ جرمن سپاہیوں میں بھی کوئی غیر معروف شے نہیں۔ لیکن جس وقت قیصر رات کو رڈولف کی بیوی کے کمرے میں گھسا تو وہ عفیفہ جاگ اٹھی اور چور سمجھکر اس نے سارے محل کو گھنٹیاں بجا بجا کے ہوشیار کر دیا۔ قیصر اس کی خوابگاہ سے بھاگا تاہم انکی بدمعاشی کا حال کسی نوکر چاکر کو معلوم ہوگیا اور انھیں کے ذریعے ہماری انگریز مصنفہ نے یہ کہانی سن کر اپنی کتاب میں لکھدی۔ بے خبر نہیں کہ اسکی کچھ اصلیت بھی ہے یا نہیں۔

اسکے بعد مصنفہ نے بسمارک کے عہدۂ وزارت سے برطرف کیے جانے کا ذکر کیا ہے، وہ کہتی ہے کہ اسکے دو سبب تھے۔ اوّل تو یہ کہ قیصر اس نامور شخص کے رسوخ و اقتدار سے جلتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ میرے سوا کسی کی اتنی عزت کی جائے۔ دوسرے قیصرہ کو اس سے اور اس کے بیٹے سے سخت نفرت تھی اور وہ جانتی تھی کہ موخر الذکر قیصر کی عشقبازیوں میں اسکا مددگار و ہمرازہے۔ چونکہ بسمارک ہی کی وجہ سے اسکا بیٹا وزیر خارجہ بنا دیا گیا تھا۔ لہذا قیصرہ اپنے نسوانی حسد سے ان دونوں باپ بیٹوں کی بیخ کنی کے درپے تھی اور ہر وقت انکی لگائی بجھائی کرتی رہتی تھی۔ اسی زمانے میں قیصر کو بیت المقدس کے حج اور سلطان عبد الحمید خاں کی ملاقات کا شوق چرّایا۔ بسمارک کا بیٹا ہربٹ وزیر خارجہ کی حیثیت سے اپنے آقا کے ساتھ تھا۔ اور

تلاشِ عجیب

"ہاں! تو آپ آج بھی وہاں جائیں گے نا؟" نظیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا!

"جانا تو ضرور چاہیے؛ اس لیے کہ اُس کے بلانے پر صاف انکار کر دینا کسی قدر بد تہذیبی معلوم ہوتی ہے! لیکن یہ آپ یاد رکھیں اب وہ مجھے اُلّو نہیں بنا سکتی!" میں نے متانت کے ساتھ جواب دیا!

"خیر یہ تو بعد کو معلوم ہوگا کہ وہ آپ کو کیا بنا سکتی ہے اور کیا نہیں بنا سکتی....."

"نہیں! اس کا آپ یقین کیجیے" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا "خواہ میں پہلے اُس سے کیسے ہی خلوص، اور کیسی ہی محبت، کی وجہ سے کیوں نہ ملا ہوں۔ لیکن اب اُسکی عیاری دیکھتے دیکھتے مجھے اُس سے ایسی ہی نفرت ہوگئی ہے جیسی پائنیر کے قاہرہ والے نامہ نگار کو انور پاشا سے ہے!"

"مگر مجھے ڈر یہ ہے کہ اُسکی چالاکی کا علم ہو جانے پر بھی اگر تم اُس سے ملتے رہے تو عنقریب تمھاری ایسی حالت نہ ہو جائے جیسی فی الحال بیچارے بلجیم والوں کی ہے!"

"جی نہیں! اب میں اُسکے دھوکہ میں قیامت تک نہیں آسکتا" میں نے جواب دیا!

اور واقعی مجھے یقین تھا کہ اب مَیں اُسکی ایک ایک بات تاڑ جاتا ہوں! مجھے واقعی اُس دن پر سخت غصہ آتا تھا جب میرے ایک دوست نے مجھے اُس سے بائیسکوپ میں ملایا تھا۔ بھلا کہاں مَیں میڈیکل کالج کا طالبِ علم۔ گھر سے کوسوں دُور محض حصولِ تعلیم کے لیے بمبئی میں مقیم: اور کہاں وہ سرتاپا عیّار۔ باتوں ہی باتوں میں خاتمہ کر دینے والی! یہ ضرور ہے کہ وہ مکان جس میں مَیں مقیم تھا۔ اُس کے بنگلہ سے بہت قریب تھا؛ مگر پھر بھی اُس ملاقات والے منحوس دن سے پیشتر مَیں ہزاروں دفعہ اُس بنگلہ کے سامنے سے گزرا ہوں گا لیکن کبھی میری نظر بھی اُس طرف نہیں اُٹھی!

تعارف کا دن میری خاموش اور طالب علمی کی زندگی کے لیے ایسا ہی تھا جیسے سراجیوہ والا واقعہ یورپ کی پُرامن اور ترقی آمیز زندگی کے لیے! میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ رقم جو ماہوار مجھے اپنے والدین سے وصول ہوتی تھی۔ اب پندرہ ہی دن میں کہاں سے کہاں اُڑ جاتی تھی اور بقیہ پندرہ دن میں کس مصیبت سے کاٹتا تھا! ضروری کتابوں، ضروری آلات، اور خدا جانے کن کن فرضی ضروری اشیاء کے نام سے کافی رقم میں اپنے والدین کو دھوکا دے دے کر وصول کرتا تھا اور سب اسی تعارفِ فتنہ انگیز کی نذر ہو جاتی تھی! مگر آخر کہاں تک؟ اب میرا ایمان مجھے لعنت کرتا تھا، اور اب مجھے والدین کو دھوکا دیتے ہوئے شرم آتی تھی! اُس میں مغرب کا خون تھا اور میری طبیعت کا رجحان لاکھ لاکھ مغربی تعلیم پر بھی مشرقی ہی تھا! یہ ظاہر ہے کہ مغرب و مشرق میں اتنا ہی فرق ہے جس قدر صبح اور شام میں: ممکن ہے کہ اُسکی تمام باتیں عین تہذیب ہوں لیکن میری آنکھوں سے وہ خوش نما نظر نہیں آتی تھیں! ...... میں اپنے خیالات کی رَو میں ڈوب چلا تھا کہ نظیر کی آواز نے ہوشیار کر دیا:۔ "اچھا تو بھئی! میں اب رخصت ہوتا ہوں" اُس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔" ممکن ہے کہ تم کو وہاں جانے میں دیر ہوتی ہو"۔

"نہیں ابھی تو چار بجے ہیں! اس نے مجھے پانچ بجے بلایا ہے!"، میں نے جواب دیا!

مگر نظیر مجھ سے ہاتھ ملا کر مسکراتا ہُوا، اور ایک معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتا ہُوا، چلا ہی گیا!

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

میرے ڈرائنگ روم میں۔ ملاقات کے کمرے میں۔ پہنچتے ہی وہ گھبرائی ہوئی پہلو کے کمرے میں سے آئی؛ اُس کا سانس چڑھا[1] ہُوا تھا، چہرے پر غیر معمولی انتشار کی کیفیت نمایاں تھی، اور مجھ سے گھبرائے ہوئے لہجہ میں مخاطب تھی:۔

"مجھے افسوس ہے! مسٹر عزیز میں اب آپ کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نہیں جا سکتی

---

[1] شاید لکھنؤ میں سانس کو مونث بولتے ہیں: اور دہلی میں مذکر: اُمید ہے کہ ایڈیٹر صاحب اس تفریق محاورہ کے جھگڑوں میں پڑنا پسند نہ کریں گے۔ میں وہی لکھ سکتا ہوں جو میں خود بولتا ہوں! جوش

جس کے لیے میں نے آپ کو بُلایا تھا؛ آپ کو واقعی میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی! مجھے اُمید ہو آپ معاف فرمائیں گے!"

میں: "خیر تو ہے؟ آخر کیا یکایک ہو گیا؟ کیا میں سُن سکتا ہوں"

وہ: "بڑا نقصان ہو گیا! گذشتہ سال میری چچی نے جو ایک سبز چمڑے کا بیگ مجھے دیا تھا وہ گُم ہو گیا! صبح میں اُسکو لے کر بازار گئی تھی! اِس وقت اُس کا پتہ نہیں ملتا! اور چچی جان آنیوالی ہیں۔ اگر اُنھوں نے اپنا عطیہ میرے پاس نہ پایا تو مجھے ڈر ہے کہ آیندہ وہ میرا نام اپنے وصیت نامہ سے خارج کر دیں گی! اور اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ میرا کس قدر نقصان ہو گیا! مجھے مطلق یاد نہیں کہ میں نے اُسے کہاں چھوڑا"

میں: "تو اب کیا کیا جائے؟" میں سمجھا تھا کہ ایک نئے بیگ کی فرمائش ہونیوالی ہے!

وہ۔(ایک عجیب مایوسی کی شان سے) "میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آتا!"

مجھے تعجب ہُوا کہ اس نے مدعاے دلی کے اظہار میں ایسی تاخیر کیوں کی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں کہہ اُٹھا: "تو پھر ویسا ہی ایک نیا بیگ نہ منگالو؟"

وہ: "نہیں! ویسا یہاں نہیں مِل سکتا! خدا جانے چچی جان میرے لیے کہاں سے لائی تھیں! دوسرے ویسا ہی تلاش کرنے کے لیے وقت درکار ہے اور وہ آج رات کو دس بجے والی گاڑی سے آ رہی ہیں! یہ ترکیب بے سود ہے! میں سخت پریشان ہوں!"

میں: "تو پھر کیا کیا جائے! میری عقل خود اس معاملہ میں کام نہیں کرتی"

وہ: "صرف ایک تدبیر نظر آتی ہے اگر اس میں خدا کامیابی دے: میں یہ سوچتی ہوں کہ جس جس راستہ سے صبح کو میں گزری ہوں اور جہاں جہاں گئی ہوں۔ وہیں اس وقت بھی گشت لگاؤں! ممکن ہے کہیں نہ کہیں پتہ چل جائے!"

وہ: "بشرطیکہ تم نے راستہ میں نہ پھینکا ہو اور کسی کو پا نہ گیا ہو"

میں: "ہاں بیشک! مگر اب سواے اسکے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی" ایک عجیب مایوسی اور پریشانی

کی شان کے ساتھ اُس نے مجھ سے استدعا کی "تم اگر اس میں میری امداد کرو تو میں بہت ممنون ہونگی! کیا تم میرے ساتھ چلنے کی تکلیف گوارا کر سکتے ہو؟"

مجھے اس میں کوئی عذر نہ تھا۔ اور عذر کی ظاہرہ کوئی وجہ بھی نہ تھی: نہ ایش نہ اُس نے کی تھی اور نہ آیندہ میں اسکی امید کرتا تھا: پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ شام کا وقت اُسکی ہمراہی میں محض چلنے پھرنے اور تلاش کے لیے صرف کرکے ایک لطف حاصل نہ کیا جاتا: میں نے بلا تامل کہا "میں تو اسی غرض سے آیا ہوں کہ تمھارے ساتھ ٹہلنے جاؤں۔ باغ یا بازار نہ سہی کوئی اور جگہ سہی۔ مجھے کوئی عذر نہیں ہے"

"آہ! تشکریہ! شکریۂ بسیار!!" اُسنے بیساختہ کہا۔ اور ایک ناقابلِ بیان پھرتی کے ساتھ وہ یہ کہتی ہوئی میری نظروں سے غائب ہوگئی "میں کپڑے بدل لوں: صرف دس منٹ انتظار کیجیے اور میں آئی"

+ + + + + + + + +

بہترین اور آسان طریقۂ تلاش یہ ہو سکتا تھا کہ ہم اُسی سلسلے اور اُسی ترتیب کے ساتھ ہر جگہ جاتے جہاں وہ صبح کو گئی تھی: اور یہی ہمنے کیا! فی الواقعی بیگ کوئی سوئی تو تھا ہی نہیں جس کو سڑک پر جھک جھک کر گھورنے کی ضرورت ہوتی: اس لیے راستہ خاموشی کے عالم میں کٹ گیا! پہلا نمبر تھیکری کتب فروش کی دوکان کا تھا جہاں پہنچکر میز کے پاس کھڑے ہوتے ہوے اُس نے مجھے بتایا کہ وہ صبح کو اسی میز کے پاس ناول پسند کرنے کے لیے کھڑی رہی تھی اور غالباً بیگ میز پر رکھدیا تھا! ہماری آپس کی گفتگو نے ایک نوجوان ملازم دوکان کو متوجہ کیا جو دُور سے ہماری گفتگو ایک خاص توجہ کے ساتھ سُن رہا تھا! وہ یہ کہتا ہُوا آگے آیا "کیا آپ کسی بیگ کی تلاش میں ہیں! مجھے ایک بیگ اس میز پر ملا تھا جو میں نے منیجر کو دیدیا ہے! آپ انتظار کریں میں ابھی لاتا ہوں! غالباً وہ آپ ہی کا بیگ ہوگا!"

میرے خیال میں قیصرِ جرمنی کو آغازِ جنگ کے زمانہ میں اپنی فوجوں کے پیرس اور وارسا کے

روز بروز قریب تر ہوتے جانے سے ایسی ہی خوشی ہوتی ہوگی جیسی اُس وقت اس جان ڈال دینے
والی خبر سے ہم دونوں کو ہوئی! جس طرح قیصر کو ہر ہفتہ میں پیرس میں ناشتہ کرنے اور وارسا میں عشا
کھانے کی اُمید قوی تھی اسی طرح ہم دونوں کو بھی ہر ہر منٹ میں اُس گم شدہ بیگ کے مل جانے کا یقین
تھا! "اَلْاِنتِظَارُ اَشَدُّ مِنَ الموت" کا تھوڑا بہت ذائقہ اُن چند لمحوں میں اچھی طرح حاصل ہو گیا! وہ
نہایت مسرت آمیز لہجہ اور تبسم نما چشم و لب کے ساتھ بولی "دیکھنا یہ شخص کس قدر میرے خالہ زاد بھائی
سے ملتا جلتا ہے! بالکل وہی قد، وہی چال؛ وہی دلکش گفتگو! کیسی بھولی شکل پائی ہے!"
میں نے - خدا ہی جانے آتشِ رقابت کی وجہ سے یا اور کسی سبب سے - کہا "اور اسکے کپڑے کیسے
ذلیل ہیں"
وہ "مگر لباس سے کیا ہوتا ہے - انسان کی طینت اچھی ہونی چاہیے؛ بیرونی نمایش کو میں کچھ
نہیں سمجھتی!"
میں - (تعجب کے ساتھ) "اگر واقعی تمھاری یہ رائے ہے تو مجھے ڈر ہے کہ تمھارے بہت سے دوستوں کا نام
فہرستِ تعارف سے خارج ہو جائے گا! اور اس کو تم شاید مشکل سے ......"

میں فقرہ ختم نہیں کر چکا تھا کہ نوجوان ملازم ایک بیگ لیے ہوئے سامنے موجود تھا: جس کو
دیکھتے ہی اُس نے بیساختہ کہا "نہیں! یہ میرا نہیں ہے! میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ وہ سبز چمڑے
کا ہے؟ یہ تو کالا ہے!"
نوجوان "مس صاحبہ مجھے افسوس ہے کہ یہ آپ کا نہیں ہے"
وہ "مگر ممکن ہے کہ تم نے غلطی کی ہو! میں سمجھتی ہوں تم سے سہو ہوا"
نوجوان (بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے نیچی نظروں سے) "سوائے اس بیگ کے اور کوئی نہیں ہے! مجھے
اچھی طرح معلوم ہے! یہی وہ بیگ ہے جو صبح کو مجھے میز پر رکھا ہوا ملا تھا!"
یہ جواب بجائے خود کیسا ہی مہذب اور برمحل کیوں نہ ہو، لیکن ایسی نوزائیدہ اُمید کے
دلدادہ میں اُسکو - اور اُسکی وجہ سے مجھ کو - کسی قدر درشت اور دل شکن معلوم ہوا! پہلی اُمید منقطع

ہوتے ہی ہم دونوں دوکان سے باہر تھے اور کچھ قدم چلتے ہی اُس نے مجھ سے کہا "یہ شخص کسقدر غیر مہذب اور بیہودہ ہے! میں نے اُسکو اپنے خالہ زاد بھائی کا ہمشکل بتانے میں سخت غلطی کھائی قطعی بھی میرے بھائی کی سی شکل نہیں ہے! نہایت بدنما چہرہ! درشت آواز! بے ہنگم چال! نہایت وحشی ہے!"

تھوڑی ہی دیر میں ایک شخص کی نسبت ایسی دو متضاد رائوں کا اظہار میرے لیے کچھ کم حیرت انگیز نہ تھا۔ وہ شخص اپنی ناکامی کی وجہ سے ایسی پلٹ گئی جیسے کسی اخبار کا نامہ نگار ایک بڑے شہر کے ناقابلِ تسخیر قلعوں اور استحکامات کی نسبت فتح ہوتے ہی دوسری زبان اختیار کر لیتا ہے! واقعی وہ پکّی یورپین تھی! افسوس ہے کہ مجھے علمِ زمانہ سازی سے مطلق لگاؤ نہیں! اور طرّہ یہ کہ سخن سازی کے فن میں بھی محض کورا ہوں!

ٹھیکری کی دوکان سے نکل کر چند اور دوکانوں کی خانہ تلاشی اور کئی سڑکوں کی پیمایش کے بعد سب سے آخری نمبر ڈائٹ اَوے کی دوکان کا تھا!

یہاں وہ کچھ بیلیں خریدنے آئی تھی اور بیلوں ٹوپیوں وغیرہ کا سامان دوکان کی تیسری منزل پر تھا؛ اس لیے اب بھی ہم کو اُسی حصہ میں جانا تھا! لِفٹ (افسوس ہے کہ مجھے اسکے لیے اُردو کا کوئی لفظ یاد نہیں) کے بدولت ہم دونوں چشم زدن میں اوپر تھے! اُس نے وہاں پہنچکر اُس حصہ کی نگراں ملازمہ سے دریافت کیا کہ کوئی بیگ سبز رنگ کا تو انکو نہیں پایا۔ اسکے جواب میں ملازمہ نے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہوے ہم سے انتظار کرنے کی استدعا کی اور ایک چپراسی کو منیجر سے دریافت کرنے کے لیے بھیجا! مَیں تو۔ جہاں تک مجھے خیال ہے۔ اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہا لیکن وہ۔ جو خلقی چلبلاہٹ کی وجہ سے بغیر کسی خاص مجبوری کے نچلا بیٹھنا قریب قریب گناہ کے سمجھتی تھی۔ چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوے ٹہلنے لگی! ملازمہ یا تو اس کی فطرت سے واقف ہو گی، یا شاید میری متجسس نگاہ کو تاڑ جانے کا ملکہ اُسے کافی ہوگا، بہرحال کسی وجہ سے ملازمہ نے اُس سے کہا "اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو چند ٹوپیاں دکھاؤں! نہایت عمدہ! اسی ہفتہ کے جہاز سے وصول ہوئی ہیں!

آخرین طرز کی! بالکل انوکھی!"

"ضرور! بڑی خوشی کے ساتھ" اُس نے جواب دیا۔

ملازمہ نے ایک الماری کے پاس جاکر ایک آسمانی رنگ کی ٹوپی جسپر کالے فیتہ کی خوبصورت گلاب نما بندش بندھی ہوئی تھی، دکھائی! ٹوپی کو ہاتھ میں لیتے ہوے اُس نے اپنی ٹوپی اُتار کر میز پر رکھی اور اس نئی ٹوپی کو زیبِ سر کرکے سامنے والے قدآدم آئینہ میں اُسکی خوبصورتی کا۔ یا یوں کہیے کہ اُسکے زیبِ سر ہونے کی صورت میں اپنی دلاویزی کا۔ اندازہ کرنے لگی! وہ آئینہ تو خیر اسی لیے مخصوص تھا کہ دن بھر میں ہزاروں خریداروں کے ساتھ ہر ایک کی مُنھ دیکھی کہے، گر سچ یہ ہے کہ اُس ٹوپی سے جس قدر فسوں سازی چشم و ابرو میں اضافہ ہوگیا اُسکا احساس میری آنکھوں کو غالبًا سادہ لوح آئینہ سے پیشتر ہو چکا تھا! ابھی وہ اس ٹوپی کے سر چڑھ کر بولنے والے جادو کا آئینہ میں پوری طرح اندازہ بھی نہیں کر چکی تھی کہ ملازمہ نے ایک اور سرخ رنگ کی مخروطی ٹوپی جسپر ایک طرف کنارے کے پاس کاسنی رنگ کا مہین کپڑا لگا ہُوا لٹک رہا تھا نکالی اور یہ کہتے ہوے کہ "اِسکو دیکھیے۔ کیسی اچھوتی، نفیس، اور انوکھی چیز ہے" اُسکے ہاتھ میں دی! سچ مجھے واقعی پہلی نظر میں وہ ٹوپی، خوشنما ہونے کے بجاے مضحکہ انگیز معلوم ہوتی تھی، لیکن ایک حسین کے سر چڑھتے ہی میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا نظر آنے لگی! گورے رنگ کے دلکش نقشہ پر سُرخ ریشمیں ٹوپی اور پھر شانے پر۔ جاورہ والے عمامہ کے شملہ کی طرح۔ کاسنی ریشمیں کپڑے کا ہوا میں لہرانا! غضب تھا، قیامت تھا، کچھ ایسی چیز تھا جسکی تشبیہ میرے دماغ میں نظر نہیں آتی! میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مَیں نے آئینہ میں کیا دیکھا۔ خود بخود میرے دماغ میں یہ شعر گردش کر رہا تھا

"اُو آئینہ میں دیکھنے والے جمال کے اچھے سے سامنا ہے۔ ذرا دیکھ بھال کے!"

اُس نے طرح طرح سے اُس ٹوپی کو دیکھا، پہلو پہلو سے اپنی شانِ دلربائی کو جانچا، اور ایک تبسم صبر سوز کے ساتھ مجھ سے خطاب کیا "کیا آپ بتا سکتے ہیں ان دونوں میں سے کون سی زیادہ اچھی ہے"

میں محوِ حیرت۔ نہیں نہیں۔ محوِ کرشمۂ دلستانی تھا، بے اختیار میری زبان سے نکلا "تم کو ایک سے

ایک اچھی معلوم ہوتی ہے! میں حیرت زدہ ہوں کہ کس کو ترجیح دوں!"

وہ - (ملازمہ سے) "بہتر ہو گا کہ آپ میرا پتہ لے لیں اور دونوں ٹوپیاں دے دیں - جو مجھے پسند آئے گی وہ رکھ لونگی - دوسری کل صبح کو واپس کر دونگی - آپ کل صبح کو آدمی بھیجیں!"

اب مجھے معلوم ہوا کہ میں نے جواب دینے میں عجلت سے کام لیا: اب میں سمجھا کہ وہ ایک چھوڑ دو دو ٹوپیاں خریدنی چاہتی ہے! لیکن ٹوپیاں کبس میں رکھی جا رہی تھیں اور آرڈر بُک یا فرمایش و خرید کی کتاب - پر وہ اپنا پتہ لکھ رہی تھی! تاہم میں کہہ ہی اُٹھا "میرے خیال میں تمھارے پاس کافی سے زیادہ ٹوپیاں موجود ہیں!"

وہ تو لکھنے میں برابر مصروف تھی ہی اس لیے میرے الفاظ اُسکی قوّتِ سامعہ پر ایسا اثر نہ ڈال سکے کہ اُسکی قوّتِ نطق میں ہیجان ہوتا - مگر ملازمہ کی آنکھوں نے دو نہایت حقارت میں ڈوبی ہوئی نظریں مجھ پر ڈالیں! میں خاموش تھا اور قصۂ زمیں بر سرِ زمیں! تاہم مجھے اسقدر اطمینان ضرور تھا کہ وہ اسوقت قیمت ادا نہیں کرنی چاہتی - اور بعد میں اگر مجھ سے مانگے گی تو جواب بھی صاف پائے گی! وہ خود لیجا رہی ہے اور خود اپنا پتہ دے رہی ہے لہذا خود ہی ذمہ دار ہے! کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ چپراسی منیجر کے پاس سے واپس آگیا اور یہاں بھی گم شدہ بیگ نہ ملنا تھا نہ ملا!

اب ہم وائٹ اَوے کی دوکان سے خالی ہاتھ نہیں بلکہ ٹوپیوں کا پارسل لیے ہوئے نکلے! راستہ اُسی گم شدہ بیگ کی یاد میں، اور چچی جان کے خوف میں، کٹا! یہاں سے سیدھا بنگلہ واپس آنا تھا، لہذا اور کسی دوکان میں جھانکنے کی خدا کے فضل سے ضرورت نہیں ہوئی! خالی ہاتھ گئے تھے لیکن بہ یک پارسل واپس آئے! بنگلہ میں پہنچتے ہی اُس نے مجھ سے کہا "اب ہماری کوشش ختم ہو گئی! میری بدقسمتی میں اب کوئی کلام نہیں!"

میں (اُسکا افسردہ دیکھکے) "نہیں - میرا خیال ہے کہ اب بھی شاید مل جائے! ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم بنگلہ میں واپس آکر کس کمرے میں گئی تھیں - کہاں کہاں بیٹھی تھیں - ؟"

وہ۔ (مایوسی کے ساتھ) "اس سے کیا فائدہ؟ میں پہلے ہی بڑے کمرے میں تلاش کر چکی ہوں"
مَیں "نہیں! جب ہم ہر جگہ ہو آئے تو بنگلہ میں بھی جہاں جہاں تم صبح کو واپس آکر گئی تھیں ضرور جانا چاہیے۔ مجھے پور اکھوج کا سلسلہ ختم کر لینے دو۔ پھر مَیں اپنی رائے پلٹوں گا!"
وہ "مَیں بڑے کمرے میں گئی تھی۔ (کچھ سوچ کر) نہیں، پہلے مَیں سونے کے کمرے میں گئی تھی۔ اور وہاں سے فوراً بڑے کمرے میں آئی تھی....."
مَیں "اچھا تو اب بھی ہمکو پہلے اُسی کمرے میں چلنا چاہیے"

وہ سونے کے کمرے کی طرف چلی۔ میں اُس سے دو قدم پیچھے تھا۔ کواڑ کھولتے ہی وہ مجھ سے پہلے کمرے کے اندر داخل ہو چکی تھی، اور جوں ہی مَیں اندر گھُسا کہ وہ انتہائے مسرت سے چیختی ہوئی میری طرف دَوڑی "آہا! بیگ! بیگ تو وہ پلنگ پر رکھا ہوا" اور واقعی وہ پلنگ پر رکھا ہُوا مجھے بھی نظر آرہا تھا! اُس نے عجیب شانِ دلربائی کے ساتھ۔ جس میں مسرت اور اُس سے بھی زیادہ شوخی جھلک رہی تھی۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوے کہا "آہ۔ شریر آدمی! تم نہایت شریر ہو! تم نے پہلے ہی یہ رائے کیوں نہ دی؟ کیوں اسقدر پریشاں کیا؟"

اب اُس نے دونوں ہاتھ میری گردن میں ڈال دیے تھے اُسکے نازک لب میرے مُنھ کے قریب تر ہوتے جاتے تھے "بتاؤ اس تکلیف اور پریشانی کی تم کو کیا سزا دی جائے؟" اُس نے پوچھا! اور ساتھ ہی میرے ہونٹوں نے ایک ایسی بیش بہا چیز سے لَس کیا جسکا اثر دل سے دماغ تک بجلی کی طرح دَوڑ گیا!

واقعی میں نے پہلے اُسکو یہ صلاح نہیں دی تھی! اگر یہ خطا باعثِ کوچہ گردی سمجھی جائے تو میں اسکا مجرم تھا۔ میں نے بخوشی کہا "جو آپ کا جی چاہے"!

جو اُسکا جی چاہا اُس نے سزا دی اور میں نے۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ انتہائے مسرت کے ساتھ یا تسلیم و رضا جوئی کے رنگ میں۔ سرِ اطاعت خم کر دیا!

* * * * * * * * * * *

دوسرے روز واقعی مجھے نذیر کے ہنسنے پر سخت غصہ آ رہا تھا! واٹ آوے کا بِل ابھی میں نے کل والی دونوں ٹوپیوں کی نسبت ادا کیا تھا، اور میں اسی پر برہم تھا کہ اپنے بِل میرے نام کیوں بھیجا؟ پھر ایسے وقت نذیر کا یہ کہہ کر ہنسنا کہ "اُس نے اپنے بجائے تمہارا ہی نام اور پتہ دیا ہوگا" اور زیادہ مجھے چڑچڑا بنائے دیتا تھا! میں واقعی اپنے بے وقوف ہونے میں اب مطلق بھی شک نہیں کرتا!

سلطان حیدر جوش

برقِ طور

جلایا خرمنِ ہستیِ دل برقِ تبسم نے تماشا طور کا دکھا دیا مشتاقِ تکلم نے
کیا بے خود سرا پا لَن ترانی کے ترنم نے ستم کیا کیا کیے عاشق پہ اندازِ ترحم نے

پتہ ملتا نہیں کس شوخ کو جلوہ نما دیکھا
کوئی موسیٰ سے پوچھے آپ نے دیکھا تو کیا دیکھا

ہوئے غش ہائے کوہِ طور پر یوں دیکھنے والے نہیں ہے تابِ نظارہ پڑے ہیں جان کے لالے
کبھی آہیں دلِ ناکام کرتا ہے کبھی نالے اثر کیا سحر کے اُس برق وش کے حسن نے ڈالے

گرا پردہ تو موسیٰ اپنا دامن جھاڑتے اُٹھے
غضب کچھ اور بھی دیکھا گریباں پھاڑتے اُٹھے

سمایا ایسا آنکھوں میں کسی کا نور کیا کہنا کہ موسیٰ کہہ رہے ہیں جلوۂ مستور کیا کہنا
جلائے سیکڑوں گھر لے چراغِ طور کیا کہنا ذرا بے خود بنا دے پھر مجھے منظور کیا کہنا

مری قسمت کہاں یہ تھی کہ قصہ پاک ہو جاتا
جگہ آنکھوں میں ملتی طور کی میں خاک ہو جاتا

باسط ۔ بسواتی

خاندان عباسیہ کے عادل اور دیندار خلفاء[1]

مہدی | مہدی ۱۲۷ھ میں بمقام ایذج پیدا ہوا۔ خاندان عباسیہ میں نہایت سخی، ہر دلعزیز دیندار عادل اور صادق الاعتقاد خلیفہ تھا۔ زنادقہ کو فنا کردیا اور اسی کے زمانہ میں ملاحدہ کے رد میں کتاب الجدول تالیف ہوئی۔

مہدی محدث تھا۔ حکومت ملتے ہی خزانہ کو ردِ مظالم اور آسایشِ رعایا میں صرف کیا۔ حاجت مندوں کے واسطے اُس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ مکہ معظمہ میں برف اسی کے زمانہ میں پہنچی۔ دیار رسول صلعم کی سڑک بنوائی۔ ۱۶۷ھ میں حرم محترم کی توسیع کی۔ غرض جب تک زندہ رہا امورِ خیر میں مصروف رہا۔ انہیں باتوں کا نتیجہ تھا کہ خدائے تعالیٰ نے ہارون الرشید اعظم سا جامعِ صفات بیٹا عطا فرمایا تھا۔ ۲۲۔ محرم ۱۶۹ھ میں انتقال کیا۔

ہارون | ۱۴۸ھ میں پیدا ہوا اور ۱۷۰ھ میں تختِ خلافت پر بیٹھا۔ اپنے زمانہ کا بے نظیر فرماں روا گزرا ہے۔ بہت سے حج کیے۔ کثیر التعداد غزوات میں مشغول رہا۔ نہایت فصیح البیان اور ادیب تھا مرتے وقت تک سَو رکعت نماز روزانہ پڑھتا رہا۔ ہزار درہم یومیہ خیرات کرتا تھا۔ علماء و فضلاء کا دوست اور قدردان تھا۔ صوفیۂ کرام کی صحبت کو بہت پسند کرتا تھا۔ حضرت خواجہ فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے دولت خانہ پر حاضر ہوکر استفادہ حاصل کرتا رہا۔ فرانس اور انگلستان میں اسکی متعدد سوانحعمریاں لکھی گئی ہیں اور یوروپین مورخین نے بالاتفاق اعظم کا خطاب دیا ہے ۱۹۳ھ میں انتقال کیا۔

مامون | ۱۷۰ھ میں پیدا ہوا۔ حدیث شریف، ادب اور فقہ کا امام تھا۔ اگر وہ فرماں روا نہ ہوتا تو ان علوم میں اُسکے کثیر التعداد شاگرد اُسکے نام کو چار چاند لگا دیتے۔ حزم۔ حلم۔ دین داری۔ تقویٰ۔ ذکاوت۔ شجاعت و ہیبت میں ممتاز گزرا ہے۔ رمضان المبارک میں کم و بیش ۳۳ مرتبہ

[1] مضمون ہٰذا کتب ذیل سے ماخوذ ہے: تاریخ الخلفا (علامہ جلال الدین سیوطیؒ) ابن خلدون۔ تاریخ اسلام (ڈاکٹر سید امیر علی صاحب) تاریخ الخلفاء عباسیہ

کلام اللہ شریف ختم کرتا تھا۔ ہمارے مخدوم شمس العلما، علامہ شبلی نعمانی نے مامون کی نہایت محققانہ سوانح عمری المامون لکھی ہے۔ یورپ کا علم دوست فرقہ مامون کی بہت تعریف کرتا ہے۔ ۲۱۸ھ میں انتقال ہوا۔ حضرت ابوعبادہؒ کا ارشاد ہے کہ میرے نزدیک مامون سے زیادہ صاحبِ مرتبہ اور سخی کوئی نہیں ہے۔

منتصر | ۲۴۷ھ ہجری میں تخت نشیں ہوا۔ خوب صورت۔ عاقل۔ نیک اور دین دار خلیفہ تھا۔ نیکی کی طرف راغب اور بدی کا دشمن تھا۔ اہلِ سادات پر جو مظالم اسکے باپ متوکل نے کیے تھے انکی تلافی ہر ممکن طریقہ سے کر دی۔ مزارِ مبارک سید الشہداء کربلا حضرت امام حسینؑ کی زیارت کی لوگوں کو اجازت دی۔ باغِ فدک اولادِ حسینؑ کو عطا کر دیا۔ رعایا میں جہاں تک ہو سکا عدل و انصاف پھیلایا۔ اگر ترک اُسے زہر نہ دیدیتے تو وہ اپنے وقت میں اور بھی نیک کام کرتا۔ کُل چھ ماہ خلافت کی اور ۲۴۸ھ ہجری میں انتقال ہُوا۔

مہتدی | ۲۱۸ھ ہجری میں پیدا ہُوا۔ اور ۲۵۵ھ ہجری میں خلیفہ بنایا گیا۔ خوب صورت۔ عابد و زاہد شب بیدار۔ احکامِ خدا کے اجرا میں سخت اور شجاع خلیفہ تھا۔ ابن خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ زمانۂ خلافت سے قتل کے وقت تک روزہ رکھتا رہا۔ معمولی لباس اور کھانا مقرر کر رکھا تھا۔ آرائش سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسکے وقت میں ظلم و ستم کا نام بھی لوگ بھول گئے تھے۔ ۲۵۶ھ میں ترکوں نے قتل کر ڈالا۔

مکتفی | ۲۶۴ھ ہجری میں پیدا ہُوا۔ خلافت کی مسند پر قدم رکھتے ہی جن مکانات پر اُسکے باپ نے جبراً دخل کر لیا تھا واگذاشت کر دیا۔ مساجد بنائیں اور علماء کی قدر کی۔ زنادقہ و قرامطہ کا استیصال کر دیا۔ مکتفی بہت بڑا ادیب اور صاحبِ علم شخص تھا۔ اُسکے اشعار و منشآت موجود ہیں اور ادب کی کتابوں میں جا بجا ملتے ہیں۔ ۲۹۵ھ ہجری میں انتقال کیا۔

متقی | ۲۹۹ھ ہجری میں پیدا ہُوا۔ خلفاء عباسیہ میں بہت بڑا مرتاض و دیندار گزرا ہے۔ ہمیشہ صائم رہتا تھا۔ رات بھر کبھی نہیں سویا۔ کسی غیر عورت کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ اُسکا قول

تھا کہ سوائے قرآن مجید کے مجھے کسی مصاحب کی ضرورت نہیں۔ زیادتی عبادت کی وجہ سے امورِ ملکت میں توجہ نہ کی۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف فتنہ و فساد برپا ہو گیا اور ۳۳۳ھ ہجری میں نالائق اہلکاروں نے اُسکی آنکھیں نکلوا ڈالیں۔ اسی حالت میں وہ ۳۵۷ھ ہجری تک زندگی کے دن پورے کرتا رہا۔ آخر شعبان میں قیدِ ہستی سے آزاد ہو گیا۔

قادر | ۳۳۶ھ ہجری میں پیدا ہوا۔ اس باخبر خلیفہ کی نمازِ تہجد کبھی قضا نہیں ہوئی۔ خیرات بہت کرتا تھا۔ بہت بڑا فقیہ اور صاحبِ شریعت تھا۔ علماء نے اُسکو علامہ ابی بشر یہ ترجیح دی ہے۔ فضائل صحابہ۔ تکفیر معتزلہ اور قائلین خلق قرآن کے رد میں ایک مبسوط تصنیف لکھی ۴۲۲ھ ہجری میں انتقال کیا۔

قائم | ۳۹۱ھ ہجری میں پیدا ہوا۔ بہ قول ابن کثیر خوبصورت۔ عابد و زاہد۔ عالم باعمل۔ خدائے پاک پر بھروسہ رکھنے والا۔ صابر۔ ادیب۔ خوش خط۔ عادل۔ متقی تھا۔ جس شخص نے سوال کیا اُسے پورا کر دیا۔ اسی خلیفہ کے بیٹے کی شادی سلطان طغرل بیگ سلجوقی سے ہوئی تھی۔ تاریخ نظام الملک طوسی میں مفصل طور سے یہ واقعہ درج ہے۔ قائم میں بہت بڑی صفت یہ تھی کہ اپنے مخالفین کی خطائیں ہمیشہ معاف کر دیتا تھا۔ جب تک زندہ رہا عفو کی صفت کو نہ چھوڑا۔ ۴۶۷ھ ہجری میں انتقال کیا۔

مقتدی | ۴۴۸ھ ہجری میں پیدا ہوا۔ لہو و لعب۔ رقص و سرود کا جانی دشمن تھا۔ تمام سلطنت میں احکامِ امتناعی جاری کر دیے اور جو لوگ ان لغویات کے عادی تھے سب کو سزائے سخت دی۔ حماموں کے بُرج گِروا دیے تاکہ لوگوں کے مکانات کی بے پردگی نہ ہو حکم دیا کہ کوئی شخص بغیر تہمد باندھے حمام میں نہ جائے۔ نہایت دین دار۔ متقی۔ قوی النفس اور عالی ہمت خلیفہ تھا۔ ۴۸۷ھ ہجری میں انتقال ہُوا۔

مستظہر | ۴۷۰ھ ہجری میں پیدا ہُوا۔ مورخ ابن اثیر لکھتا ہے کہ یہ خلیفہ نہایت ملائم طبیعت۔ کریم الاخلاق۔ نیک کاموں میں جلدی کرنے والا۔ خوش خط اور ادیب تھا۔ بدقسمتی سے اُسکا

تمام زمانہ لڑائیوں میں گزرا ۵۱۲ھ ہجری میں انتقال کیا۔

مسترشد | ۴۸۵ھ ہجری میں پیدا ہوا۔ بڑا باہمت۔ صائب الرائے۔ باہیبت۔ عابد وزاہد تھا کتابت میں یہ ملکہ حاصل تھا کہ بغداد کے کثیر التعداد قابل شخص اسکے شاگرد تھے۔ ۵۲۹ھ ہجری میں انتقال ہُوا۔

مقتفی | ۴۷۹ھ ہجری میں پیدا ہُوا۔ علامہ ذہبی و علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ یہ خلیفہ عالم۔ ادیب۔ شجاع۔ حلیم۔ خوش اخلاق۔ عابد و دیندار تھا۔ اسکی نظیر ائمہ مجتہدین میں بھی ذرا کم ملتی ہے۔ اس کے زمانۂ خلافت میں کوئی امر دیانت و دینداری کے خلاف نہیں ہوا۔ خوش قسمتی سے کارکن بھی باخبر ملے تھے۔ ہر معاملہ پر اسکی نظر تھی۔ موسیو ڈورائزاور ابو طالب عبد الرحمٰن ہاشمی لکھتے ہیں کہ مقتفی کا زمانۂ خلافت عباسیہ کے واسطے ابر رحمت تھا۔ ایسا باقبال تھا کہ جس قدر لڑائیاں لڑا سب میں فتح نصیب ہوئی۔ ۵۵۵ھ ہجری میں انتقال ہوا۔

مستنجد | ۵۱۸ھ ہجری میں پیدا ہُوا۔ عدالت و دینداری میں جواب نہیں رکھتا تھا تخت نشین ہوتے ہی تمام ٹیکس رعایا پر اُٹھا دیے۔ علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ یہ خلیفہ صائب الرائے غالب الفہم۔ اعلیٰ درجے کا ناظم و ناقد بزرگ تھا۔ ۵۶۶ھ ہجری میں انتقال ہوا۔

مستضی | ۵۳۶ھ ہجری میں پیدا ہوا۔ علامہ جلال الدین سیوطی و ابن جوزی فرماتے ہیں کہ تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی ناواجب ٹیکس معاف کر دیے۔ ایسا عدل و کرم پھیلایا کہ تمام رعایا شاد ہوگئی اور ہر طرف بحالی کے آثار نظر آنے لگے۔ بہت سا مال ہاشمیوں۔ علویوں کی نذر کیا۔ مدارس و مساجد تعمیر کرائے۔ نہایت حلیم۔ نیکوکار۔ دیندار شخص تھا۔ ۵۷۵ھ ہجری میں انتقال کیا۔

ناصر | ۵۵۳ھ ہجری میں پیدا ہوا۔ عجیب باقبال مسند خلیفہ تھا۔ اسکے زمانہ میں جس حاکم نے سرکشی کی خدائے تعالیٰ نے غیب سے اُسکا سر نیچا کر دیا عرب و عجم میں اسکی حشمت و دبدبہ کا غلغلہ تھا۔ عدالت و نیکی کی وجہ سے سلطنت نہایت بحال۔ اور رعایا خوش تھی۔ مظالم کا استیصال قطعی طور پر کر دیا۔ عمال و حکام ہر وقت خلیفہ سے خائف رہتے تھے۔ ۶۲۲ھ ہجری میں انتقال کیا

ظاہر | ۵۷۱ھ ہجری میں پیدا ہوا۔ جب تختِ خلافت پر قدم رکھا ہے تو ۵۲ سال کی عمر تھی۔ لوگو نے کہا کہ آپ فتوحات کی جانب توجہ کیوں نہیں کرتے۔ جواب دیا۔ جس شخص کا کھیت خشک ہوگیا ہو وہ کیا سرسبزی کی امید کرسکتا ہے۔ جو دُکان دار شام کے وقت ڈکان کھولے اُسکی کیا بکری ہوگی۔ بیکار طمع سے کیا فائدہ۔ دو روزہ زندگی کو عدل و انصاف میں بسر کرنا اچھا ہے۔ چنانچہ ظاہر نے اپنے زمانہ میں بے انتہا عطیات کیں۔ اور اس قدر عدل و انصاف کا دریا بہایا کہ لوگوں کو حضرت عمر ابن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے واقعات یاد آگئے۔ اہلِ سادات کی تعظیم و تکریم میں بجد مبالغہ کیا۔ جو لوگ قرضہ کے جرم میں مقید تھے اُن سب کو رہا کر دیا۔ مدتِ خلافت میں کوئی کام خلافِ خدا و رسول نہیں کیا۔ ۶۲۳ھ ہجری میں اس نیک و باخبر خلیفہ کا انتقال ہوگیا۔

مستنصر | ۵۸۸ھ ہجری میں پیدا ہوا۔ نہایت عادل۔ عابد و زاہد۔ شب بیدار۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ بزرگ تھا۔ علماء و فضلاء اس کے مقرب اور دو نیاء کرام ندیم تھے۔ احیاء سنت میں ہمیشہ قدم آگے رکھتا تھا۔ مساجد۔ سرائیں۔ مدارس۔ شفاخانے بنوائے۔ نصرتِ اسلام و رفاہ عامہ کے کام بہت سے کیے۔ ۶۴۰ھ ہجری میں انتقال ہُوا۔

معتضد | سنہ ولادت معلوم نہیں۔ نہایت صالح۔ دیندار۔ عادل۔ زکی۔ اور فہیم خلیفہ تھا۔ ۷۴۵ھ ہجری میں انتقال کیا۔

مستکفی | سنہ ولادت نامعلوم۔ نہایت صالح۔ دیندار۔ عادل۔ شب بیدار تھا۔ احیاء سنت میں بہت کوشاں اور بدعات سے متنفر تھا۔ ۸۵۵ھ ہجری میں انتقال کیا۔

خاندان عباسیہ میں سیکڑوں برس خلافت رہی اور اربابِ تواریخ جانتے ہیں کہ یہ کیسے باجبرو خلفاء گزرے ہیں۔ جناب رسالت مآب صلعم کے ارشاد کے موافق حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا خاندان خوب پھلا پھولا اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ بنی العباس سے زیادہ اسلام میں کوئی خاندان اس شان کا نہیں گزرا۔ لیکن نظام عالم یوں ہی قائم ہے کہ جس طرح بنی امیہ کے بعد بنی عباس حاکم ہوئے اُسی طرح اُن کے بعد دوسروں کو حاکم حقیقی نے عنان حکومت سپرد کر دی۔ وہی

بغداد جس کا لقب مدینۃ السلام اور دار العدل تھا، آج ہر لحاظ سے قابلِ عبرت ہے۔ اُسکے مدارس و مساجد کہاں گئے۔ خلیفہ سفاح (بانیِ سلطنتِ عباسیہ) کی اولاد کی قبریں بھی ذرا مشکل سے ملتی ہیں۔ عبرت کا مقام ہے۔

ہر آں کہ زاد بناچار بایدش نوشید زجامِ دہر مئے کل من علیہا فان

محمد شفیع الدین خاں مرادآبادی

غزل حضرت انوری

ہے جو میخانہ کی رونق مرے آجانے سے
بوے مے لینے کو دوڑی مجھے میخانے سے

آشنا سے کوئی مطلب ہو نہ بیگانے سے
ہوش کھوئے ہوئے ہم آتے ہیں میخانے سے

صبر میں خاک کروں آپکے سمجھانے سے
دلِ ناداں تو بہلتا نہیں بہلانے سے

سُرخروئی مجھے عشاق میں حاصل ہو جائے
ہے یہ قاتل کی غرض خون میں نہلانے سے

تمیہ آیا دلِ ناداں تو یہ ہمنے جانا
عقل کی بات بھی ہو سکتی ہے دیوانے سے

مرکے بھی جی نہ بھریگا مے وساغر سے مرا
روح کو تربہ پہنچ جائیگی میخانے سے

بے ریا سوز بھی کیا چیز ہے اللہ اللہ
شمع بھی جسکا سبق لیتی ہے پروانے سے

رنگ اپنے دلِ پژمردہ کا بالکل ہو وہی
حال ہو جاتا ہے جو پھول کا کمھلانے سے

عمر بھر ہوگا نہ پورا کبھی کارِ دُنیا
انوری کام جو نکلے گا تو مر جانے سے

نظرے خوش گزرے

دسمبر کا آخری ہفتہ حسب معمول قومی اور ملکی مجالس کی سرگرمیوں میں بسر ہوا مسلمانوں کی سب سے قدیم اور مشہور بزم تعلیمی آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اب کے راولپنڈی میں برپا ہوئی اور انجمن ترقی اردو کا اجلاس بھی بوجہ کانفرنس کے ایک شعبہ ہونے کے یہیں منعقد ہوا تعلیمی معاملات میں عام طور پر اب دلچسپی کم لی جاتی ہے جب دیکھیں بعض اوقات یہ خیال گذرتا ہے کہ غالباً کانفرنس کے انعقاد کی حاجت نہیں رہی۔ لیکن خود مسئلہ تعلیم کی اہمیت ایسی نہیں کہ کانفرنس سے اسقدر جلد بے نیازی حاصل ہو سکے اگرچہ اُسکے دائرہ عمل میں کافی وسعت اور طریق کار میں بعنایت تبدیلی کی گنجایش اور ضرورت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ باایں ہمہ کانفرنس نے تین دن تک صحبت مقررین و واعظین گرم رکھی اور کئی درجن ضروری اور غیر ضروری رزولیوشن اپنے نامۂ اعمال میں لکھوا لے گئی۔

مجمع کے لحاظ سے یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ اب کے کانفرنس پھیکی رہی یعنی۔ مدراس اور بنگال کے دور دراز صوبوں کا تو ذکر ہی نہیں۔ صوبۂ متحدہ اور خود جنوبی پنجاب کے اصحاب بھی خال خال نظر آتے تھے۔ لاہور کے ممتاز حضرات نے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ ارادی مقاطعہ کی پالیسی پر اتفاق کر لیا تھا۔ امرتسر کے بعض ارباب اثر البتہ موجود تھے ورنہ صرف شمالی پنجاب و سرحدی صوبہ کے اصحاب ہی سے کرسیاں پر نظر آتی تھیں۔

مولوی رحیم بخش صاحب پریسیڈنٹ کونسل آف ریجنسی بہاولپور قوم کے ایک ممتاز بزرگ ہیں اور غالباً کانفرنس کے اجلاس میں تشریف لا کر ایڈریس پڑھنے سے قبل بہت سے اصحاب اُنکے ساتھ عقیدت بھی رکھتے ہوں گے لیکن افسوس ہے کہ جو چیز دوسرے پریسیڈنٹوں کی قدر و منزلت کا باعث ہو جایا کرتی ہے وہی مولوی صاحب کو مورد مطاعن اور نشانۂ تضحیک بنانے کا باعث ہوئی۔ اور اسکا سبب اولین غالباً یہ تھا کہ انھوں نے اپنی مصلحتوں پر کانفرنس کے اغراض و مقاصد اور قوم کے حقیقی فوائد کو قربان کر دیا۔ سالہا سال سے اس پر بحث ہوتی اور اس بات کی عام طور پر شکایت کی جاتی رہی ہے کہ ہماری قومی مجالس کے صدر نشین صاحبان جو انگریزی زبان میں اپنے

صدارتی ایڈریس پڑھا کرتے ہیں وہ بجاے اسکے کہ اپنی قابلیتوں او مشوروں سے عام طور پر اہل ملک اور برادران قومی کو فائدہ پہنچائیں اُلٹے اُن کو ان مجالس اور نیز اپنی طرف سے بدعقیدہ اور اس لیے قومی تحریکات سے بدگماں و بیزار بنانے کی بدنما خدمات انجام دیتے ہیں۔ سال گذشتہ جب جسٹس شاہ دین نے آگرہ کانفرنس میں اپنا ایڈریس انگریزی میں پڑھا اور حاضرین کی تعداد کثیر نے اس سے بددلی کا اظہار کیا اور انجمن ترقی اُردو نے اس دستور کے خلاف ایک رزولیوشن کے ذریعہ سے صداے احتجاج بلند کی تو یہ امید بندھی تھی کہ آئندہ پریسیڈنٹ صاحباں کانفرنس کے لیے یہ تنبیہات کافی ہوں گی۔ لیکن افسوس ہے کہ مولوی رحیم بخش صاحب نے باوجودیکہ وہ اپنے چھپے ہوے انگریزی ایڈریس کو بھی پوری روانی و صحت کے ساتھ نہ پڑھ سکے عام خواہشات کے برخلاف اُردو زباں کو اپنے خیالات کا حامل بننے کی عزت نہیں بخشی اور یہ ایسی افسوسناک غلطی ہے کہ مولوی صاحب موصوف کو اس پر مبارکباد نہیں دی جاسکتی خدا کرے کہ آیندہ صدرنشیناں کانفرنس کے متعلق ہمیں یہ شکایت کرنے کا موقع نہ ملے اور ہمارے وہ واجب التعظیم بزرگ جو اس منزلت کی کرسی کو زیب و زینت بخشنے کے لیے منتخب ہوں اس بارہ میں اپنی ذمہ داریوں اور قوم کی ضرورتوں اور خواہشوں کا زیادہ لحاظ کیا کریں بجاے اسکے کہ ارباب حکومت اور انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کی مختصر اگرچہ با اختیار اور معزز جماعت کے دلوں میں اپنی قابلیت اور خوش فہمی کا سکہ بٹھانے کی کوشش فرمائیں۔

ایڈریس کے مطالب پر اگرچہ بہت تفصیل کے ساتھ بحث کی جاسکتی ہے مگر چونکہ اسکا بیشتر حصہ تعلیمی امور کے بجاے سیاسی مباحث کی نذر ہوگیا اسلیے ہم قصداً اس سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ اور غالباً ایڈریس کا یہ پہلو سب سے زیادہ قابل اعتراض ہے تعلیمی معاملات کے متعلق ارباب حکومت اور خود ہمارے بزرگان ملت ہمیشہ یہ خواہش ظاہر کرتے رہے ہیں کہ سیاسی امور کو ان میں کچھ دخل نہ ہونا چاہیے چنانچہ اسی کانفرنس کے جلسہ میں کئی بار اُس سطح مرتفع سے جو نمایاں اور ممتاز اصحاب کے لیے مخصوص تھی۔ یہ صدائیں سُنائی دیں کہ مقررین سیاسیات کی بحث سے احتراز کریں۔ لیکن یوروپ کے محاربۂ عظیم اور اسکے متعلق مسلمانوں اور ہندوستانیوں کی وفادارانہ خدمات و جذبات کا تذکرہ اور اظہار

وفاداری کے سلسلہ میں جرمنی کے تہذیب سوز طرزِ عمل پر نکتہ چینی اور استہزار وغیرہ یہ سب کیا ایسی باتیں نہیں تھیں جنکے بحث کرنے کے لیے مسلم لیگ کی خواب زدہ مجلس زیادہ موزوں تھی۔ کیونکہ ناممکن ہے کہ پریسیڈنٹ سکرٹری اور ممبران کانفرنس سب ایک ہی نقطۂ نظر سے ان مسائل کو دیکھیں اور نتائج کے لحاظ سے ایک ہی نقطہ کی طرف اُن کے دلائل و براہین اور اُنکا علم و تجربہ اُنھیں لیجائے۔ پھر جن ہمدردانِ قوم اور نبض شناسانِ ملت نے ایک تعلیمی مجمع میں ان مباحث کو چھیڑا تھا کیا وہ اس بات کی توقع رکھنے میں حق بجانب ہو سکتے تھے کہ دوسرے جب اسی مجلس میں اور زیادہ آزاد حیثیتوں سے ان معاملات پر بحث کرینگے تو اُنکی تقریریں خوش آیند اور مقاصد بزم تعلیمی کے لحاظ سے مناسب معلوم ہونگی۔ چنانچہ خود منتظمین کانفرنس کو یہ دیکھکر افسوس ہوا ہوگا کہ اس رویہ نے بعض لوگوں کی زبان سے وہ کہلا دیا جو اُنکے مصالح کے خلاف اور اُنکے کانوں کے لیے حد درجہ آزار رساں تھا۔

گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی کو سراہنے اور گورنمنٹ کے وکیل کی حیثیت سے اُن اعتراضات اور نکتہ چینیوں کا جواب دینے کے لیے جو ہندوستان کے اکثر اہل الرائے اس پالیسی پر کیا کرتے ہیں یہ موقع ناموزوں اگر نہیں تو خلاف مصلحت ضرور تھا۔ لیکن اس ایڈریس کا ایک معقول حصہ اس کوشش کی نذر ہوگیا اور اس بارہ میں بالکل مختلف عقائد رکھنے کے باوجود مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کہے بغیر آگے بڑھ جائیں۔

مطبوعہ ایڈریس کے ۷۴ صفحوں میں سے وہ سات صفحات البتہ سزاوارِ تحسین ہیں جو صنعتی و حرفتی تعلیم کے متعلق ہیں کیونکہ فی الحقیقت ملک کی اصلی منزلت کا انحصار بہت کچھ اُسی ترقی پر ہے جو اس میدان میں اہل ہند کو حاصل ہو جائے اور جسکی طرف سے مسلمان خصوصاً بہت غفلت کر رہے ہیں۔

تعلیم نسواں کے مختصراً تذکرہ کے باوجود ہمارے معزز رہنما کی تقریر اس مشورۂ نیک سے خالی نہیں کہ عورتوں کو تھوڑی انگریزی تعلیم بھی دی جائے کیونکہ "دواؤں کی شیشیوں اور دوسری خانگی ضرورت کی چیزوں اور اشیاء خوردنی کی چٹھیاں" اسی زبان میں ہوتی ہیں۔ پنجاب کی وہ تہذیب یافتہ جماعت جس نے سال گذشتہ انگریزی زبان کو لڑکیوں کے نصاب میں جگہ دینے کے متعلق کانفرنس سے زور دار شکایت

مشہور کرالیا تھا اس موقع پر جس قدر اظہار مسرت کرے کم ہوگا۔

آخر میں صاحب صدر نے یہ نہایت قیمتی مشورہ دیا ہے کہ جسطرح مغربی زبانوں اور خصوصاً انگریزی سے ترجمے کرکے دیسی زبانوں کو عام طور پر اہل ملک اور مسلمان خاص طور پر اردو کو توسیع دینے کی کوشش کر رہے ہیں اسی طرح عربی اور فارسی زبان میں جو جواہر پوشیدہ ہیں انکو بھی ہندوستانی لباس پہنایا جائے۔ انجمن ترقی اردو اس مشورہ سے بہت کچھ مستفیض ہوسکتی ہے اور غالباً نامہ دانشوران کا ترجمہ شایع کرنے کی جو کوشش اسکی طرف سے ہو رہی ہے اس میں دربار بھاولپور کی امداد حاصل کرنا ممکن ہو۔ مولوی عبدالحق صاحب اسے نوٹ کرلیں۔

اردو زبان کے متعلق ہمارے مقتدر صدر نشیں کو شاید اس بنا پر کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوی کہ اپنی تقریر کو انگریزی میں پڑھنے کے بعد اردو زبان کی اہمیت کو تسلیم کرنا اور اسکی ترقی کے مسئلہ کو زیر بحث لانا ایک عدم ظریفی ہوگی کہ شاید وہ دلدادگان اردو جو انگریزی تقریر سمجھ سکتے تھے اسکی تاب نہ لاتے۔ وجہ حال اسباب کچھ ہی ہوں لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اردو زبان سے خاص طور پر بے اعتنائی برتی گئی جسکے لیے تمام ہی خواہان اردو کو بجا طور پر افسوس و شکایت کا موقع ہے۔ خصوصاً تعلیمی حیثیت سے جو اہمیت ہماری مادری زبان کی ہونا چاہیے اسکے لحاظ سے یہ فروگذاشت یقیناً اس قابل تھی کہ صاحب صدر کو اس پر خاص توجہ دلائی جاتی۔

ایڈریس کے بعد کثیر التعداد رزدلیوشنوں سے قطع نظر کرکے مختصراً اس محنت و جانفشانی پر اظہار مسرت و امتنان کرنا مناسب ہوگا جو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اپنی رپورٹ کی تیاری میں برداشت کی۔ مسلمانان پنجاب کو اپنی صحیح تعلیمی حالت سے آگاہ کرنے کے لیے جو نقشے دکھائے گئے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ نہایت درجہ قابل تحسین تھے۔ ہمارے خیال میں ان نقشوں کے ذریعہ سے اندازہ و احساس کرنے میں مسلمانان پنجاب کو زیادہ مدد ملتی اگر کانفرنس میں تمام پنجاب کے تعلیم یافتہ اور قومی کام کرنے والے اصحاب موجود ہوتے اور نقشوں کے مفہوم کو حاضرین کے ذہن نشین کرنے کے لیے زیادہ وضاحت سے بیان کرنے کا موقع دیا جاتا۔

پراونشیل کانفرنسوں کی رپورٹوں کے سلسلہ میں مولوی بشیرالدین صاحب اڈیٹر البشیر کی رپورٹ بھی نہایت درجہ مفید ثابت ہوتی اگر صوبہ متحدہ کے کافی اصحاب جلسہ میں موجود ہوتے اور ایسے اہم کام کے لیے جس قدر وقت دیے جانے کی ضرورت تھی مولوی صاحب ممدوح کو اسی قدر وقت مل سکتا۔ کیونکہ جبتک ایسی ہی تفصیلات کے ساتھ برادران ملت کو یہ نہ بتایا جائے کہ تعلیمی حیثیت سے انکی کیا منزلت ہے تعلیم کو عام کرنے میں زیادہ کامیابی نہیں ہوگی۔

مسلمانوں کو جونا مسلمان ہوتے جاتے اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بناسے جارہے ہیں اب بھی مذہب کا کچھ ایسا چسکا ہے کہ اسکے تذکرہ کے بغیر کسی مجلس میں لطف نہیں آتا۔ اور ایجوکیشنل کانفرنس کی دلچسپیوں میں واعظین کرام کے خطبات کی وجہ سے جو اضافہ ہوجاتا ہے اس کو کانفرنس کے ارباب حل وعقد جو کہے جاتے ہیں اُنھوں نے بھی خوب سمجھ لیا ہے۔ اس سال بوجہ اسکے کہ کانفرنس کا اجلاس ایسے مقام پر منعقد ہو۔ رہا تھا جہاں جہالت وتاریکی کے باوجود مذہب کے متعلق وحشیانہ جوش بھی شاید پایا جاتا ہو مواعظ کا خاص اہتمام تھا۔ مگر کانفرنس کے عقائد اور غالباً مصالح کے خلاف سوء اتفاق سے مولوی عبیداللہ سندھی ناظم نظارۃ المعارف قرآنیہ دہلی نے تعلیم کے بجاے انجمن خدام کعبہ کے اغراض ومقاصد کو اپنے وعظ کا موضوع بنادیا۔ وعظ ہرچند کہ بجاے خود نہایت درجہ قابل تعریف تھا لیکن اسے کیا کریں کہ کانفرنس کے لیے وہ ایک سانحہ الم انگیز اور حادثۂ ہوش ربا سے کم نہیں ہوا اور اسلیے بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اُسکے ساتھ ہمدردی وغمگساری کا اظہار کیا جاے۔

جلسہ کی رونق بہت کم ہوجاتی اگر مسٹر محمد علی اور برادرم شوکت علی کی بامذاق۔ فتنہ زا اور جوش انگیز تقریروں سے حضار مجلس کی طبیعتیں گرم نہ ہوتی رہتیں۔ لیکن یہ نوک جھونک۔ یہ طعن وتشنیع اور یہ مضحکہ و استہزا، مانا کہ موزونی طبع۔ دلیرانہ مدافعت اور آزادہ روی کا مناسب اور ضروری مظہر تھا پھر بھی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے شایان شان نہیں کہا جاسکتا۔ اور کانفرنس کے ارباب حل وعقد اور اُن اصحاب کے نقطہ ہاے نظر میں بعدالمشرقین اور طریق کار میں بعدالمغربین کے باوجود ہم یہ ضرور کہیں گے کہ یہ رویہ خود ہمارے ان احباب کی قدر ومنزلت میں بھی کچھ اضافہ نہیں کرسکتا۔ فقدبر

اس بارہ میں ایڈیٹر الہلال کی روش ہمیں نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے کہ سرسید احمد خاں کی پالیسی اور کانفرنس کے تعلیمی عقاید اور دونوں کی چاردہ سالہ کوششوں سے علی روس الاشہاد اختلاف رکھنے کے باوجود وہ اجلاس کانفرنس میں اپنی خودداری اور سنجیدگی سے اپنی مخالفت پر وزن اور بوتر بنا دیتے ہیں اور محبت و یگانگت اگر نہیں تو کانفرنس کے ارباب حل وعقد کے دلوں میں اپنی ہیبت و دہشت ضرور بٹھا دیتے ہیں اور اس طرح پر بعض اوقات وہ مناسب اور مفید ترمیمات کرانے میں کامیاب رہتے ہیں۔

کانفرنس کے تیسرے اجلاس منعقدہ ۲۷ دسمبر وقت شب میں انجمن ترقی اُردو کا جلسہ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی رئیس بھیکن پور کی زیر صدارت ہوا۔ اور مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی دلچسپ رپورٹ پڑھ کر سُنائی ۔ جو ناظرین الناظر سے روشناس ہونے کے لیے آیندہ نمبر میں شایع کی جائے گی ۔ رپورٹ پر بعض حاضرین نے مختصر تبصرہ کیا جس میں سے مسٹر محمد علی کی تقریر خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ اُنھوں نے سکرٹری انجمن کی حُسن کارگذاری کا ذکر کرتے ہوے کہا کہ غالب کا مقبرہ بنانے کے لیے جو روپیہ کامریڈ کے ذریعہ سے اُنھوں نے جمع کیا تھا کلام غالب کے عمدہ ایڈیشن چھاپنے کے لیے اُن سے طلب کیا گیا تھا اور اس بارے میں کئی مراسلات آئے جنکا وہ جواب نہ دے سکے ۔ اور اُس روپیہ کو اس غرض کے لیے وہ دینا بھی نہیں چاہتے بلکہ غالب کا مقبرہ بنانے ہی میں اُسکو صرف کرینگے ۔ البتہ اپنی طرف سے مبلغ یکصد روپیہ عنایت فرمائیں گے ۔ اسی سلسلہ میں اُنھوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہوے کہ انجمن کی کتابوں کی تشہیر کا معقول انتظام نہیں ہے اس بات کا بھی وعدہ فرمایا کہ اپنے اخبار ہمدرد میں وہ انجمن کے اشتہارات بلا اجرت چھاپتے رہیں گے ۔ ایڈیٹر صاحب ہمدرد کی یہ فیاضانہ امداد نہایت درجہ قابل شکریہ ہے اور اگر دوسرے کثیر الاشاعت اخبارات کے مالکان بھی انجمن اُردو کو اسی فیاضی سے مدد دیں تو انجمن کے مفید کام میں بہت کچھ اضافہ ہو جاے ۔ مسٹر محمد ولی خاں پشاوری نے صاحب صدر کے انگریزی زبان میں تقریر کرنے پر نہایت آزادی کے ساتھ نکتہ چینی کی جسے حاضرین جلسہ نے جوش و خروش کے ساتھ تالیاں بجا بجا کر زیادہ وزن دار

بنا دیا۔ بعد ازاں حضار مجلس سے درخواست کی گئی کہ وہ بھی انجمن کی امداد میں عملی طور پر حصہ لیں چنانچہ اُسی وقت بعض حضرات نے انجمن کی رکنیت اور مطبوعات انجمن کی خریداری کے لیے اپنے نام لکھا دیے۔

انجمن کی طرف سے اب کے کوئی مفید اور علمی رزولیوشن پیش نہیں کیا گیا۔ صرف تعزیتی اور شکریہ کے رزولیوشنوں پر اکتفا کی گئی۔ اس کا سبب جیسا کہ بعض حضرات خیال کرینگے یہ نہ تھا کہ انجمن اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتی بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ ملک کی دوسری معزز مجالس کی طرح رزولیوشنوں کا اسراف کچھ پسندیدہ نہیں معلوم ہوتا۔ آگرہ کانفرنس میں جو رزولیوشن پاس کیے گئے تھے اگر اُن کے دسویں حصہ پر بھی عمل کیا جاسکتا تو ممکن تھا کہ اس سال بھی اُسی قدر یا اُس سے دوچند رزولیوشن ملک پر برسا دیے جاتے۔ انجمن کا کام زیادہ تر علمی ہے اسلیے تمام علمی کام کرنے والوں کی طرح اسے نسبتاً خاموشی کی ضرورت ہے۔ جب اپنے علمی کام کے اثر سے وہ ملک و قوم میں اپنا اعتبار قائم کرلے گی اور ہوا خواہان اردو کے دلوں میں اپنی مادری زبان کی اعانت و امداد کے جذبات اس حد تک پیدا ہوجائیں گے کہ انجمن کے رزولیوشن اُنمیں کوئی تحریک پیدا کرسکیں اُس وقت رزولیوشن پیش کرنے میں کوتاہی نہوگی۔ لائق ایڈیٹر صاحب وکیل نے اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ ہندی کانفرنس کی تابعیت میں انجمن ترقی اردو نے اس مضمون کا کوئی رزولیوشن پیش نہیں کیا کہ قومی مجالس میں اور قومی انجمنوں کی تمام کارروائیاں اُردو ہی میں ہوا کریں۔ اُنکی شکایت ایک حد تک بجا ہوتی اگر انجمن نے سال گذشتہ اس قسم کا ایک رزولیوشن پیش نہ کیا ہوتا۔ انجمن کے رزولیوشن کے ہوتے ہوے اور عام جذبات اور خود سکریٹری کانفرنس کی خواہشات کا علم رکھتے ہوے جب صدر نشین بزم تعلیمی کو اپنا ایڈریس انگریزی میں پڑھنا ہی مناسب معلوم ہوا تو پھر دوسروں پر ان رزولیوشنوں کا کیا اثر ہوسکتا ہے۔ البتہ خدا نے چاہا تو وقت آئیگا کہ انجمن کے علمی کارناموں سے ہوا خواہان اُردو میں روح پیدا ہو جائیگی کہ جب ایسے مجامع میں کوئی صاحب اُردو کے بجاے انگریزی میں تقریر کرنے اُٹھیں تو وہ متفق ہوکر اپنی اپنی کرسیاں چھوڑ دیں اور قومی ضرورتوں اور خواہشوں کے خلاف روش اختیار کرنے والوں کو اپنی اصلاح کرنے پر مجبور بنا دیں۔ البتہ مناسب ہوگا کہ سال آیندہ جب قومی جلسوں کا وقت آئے تو اُس سے

ایک مہینہ قبل انجمن کی طرف سے اس مفہوم کے رزولیوشن پاس کر کے منتخب شدہ صدر نشینان مجالس قومی کی خدمت میں بھیج دیے جائیں تاکہ انھیں اس بارہ میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس رہے۔

دوسرے دن صرف ابتدائی اجلاس میں ہمیں شریک ہونے کا موقع ملا جس میں ایڈیٹر صاحب الہلال نے مولانا شبلی نعمانی کی یادگار میں ایک دارالتصانیف قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ آزاد صاحب نے اپنے ممدوح دوست کی مدح سرائی میں جس قدر فصاحت و بلاغت صرف کی اُس سے اختلاف کرنے کی ضرورت نہیں البتہ کانفرنس کے اجلاس میں کھڑے ہو کر اور کانفرنس کے وجود کو بے سود اور سرسید احمد خاں کی کوششوں کو بے نتیجہ قرار دینا کسی طرح خوش آئند نہیں ہو سکتا۔

اس کے اجلاس میں سب سے نمایاں جو بات تھی وہ یہ ہے کہ شیخ عبداللہ صاحب سکرٹری شعبہ تعلیم نسواں تشریف نہیں لائے اور بدیں وجہ شعبہ تعلیم نسواں کا اجلاس ملتوی رہا۔ شیخ صاحب کی غیر حاضری کے خواہ کچھ ہی اسباب کیوں نہ ہوں لیکن خود فرقۂ اناث کی تعلیمی تحریک کے لیے یہ التوا کچھ مفید نہیں کہا جا سکتا اور اگر جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے یہ سچ ہے کہ گزشتہ سال آگرہ میں جو رپورٹ شیخ عبداللہ صاحب نے پڑھ کر سنائی تھی اور اُس پر جو افسوسناک بحث چھڑی اور جس بُری طرح شیخ صاحب کو اصل رپورٹ ضائع ہو جانے اور اُس کے بجائے فرضی رپورٹ مرتب کر کے پیش کرنے کا اعتراف کرنا پڑا اس سے شیخ صاحب بد دل ہو گئے اور اب کے کانفرنس کے نقادوں سے بچنے کے لیے انھوں نے شرکت کانفرنس سے احتراز کیا تو یہ صد درجہ افسوسناک ہوگا۔ البتہ اگر شیخ صاحب نے اس شعبہ کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے تحت سے نکال کر لیڈیز کانفرنس کا ماتحت بنانے کا ارادہ کر لیا ہے تو دوسری بات ہے اگرچہ ہم نہیں جانتے کہ ایسا کرنا کس حد تک قرین مصلحت اور مفید مطلب ہو سکتا ہے۔

اگر حقیقت میں شیخ صاحب کی غیر حاضری کے یہ اسباب نہیں اور یہ محض ایک اتفاقی امر ہے تو ارباب کانفرنس کو شیخ صاحب کی معیت میں کام کرنے کے لیے ایک یا دو اسسٹنٹ سکرٹری مقرر کرنا چاہیے جو ایسی ناگہانی صورتوں میں شعبہ کے اجلاس کا اہتمام کر سکیں۔ خود شیخ صاحب اگر اس خدمت کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں یا دوسرے اصحاب مقیم علی گڈھ میں سے کسی کے تفویض کر دیتے تو شاید اجلاس کو ملتوی کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

راولپنڈی سے اجلاس کانفرنس کے ختم ہونے کا انتظار کیے بغیر چلا آنا اچھا نہ معلوم ہوا لیکن سردی کے باعث شفیقی مولوی عبدالحق صاحب کی طبیعت قدرے ناساز ہوگئی تھی اسلیے ہم بھی مجبور ہوگئے۔ لاہور میں مختصر قیام کے بعد دہلی آئے اور وہاں سے پانی پت جانے کا قصد تھا کہ مولانا حالی کی زیارت سے مشرف ہوں۔ جب ریل میں بیٹھ چکے تو یہ معلوم کرکے صدمہ عظیم ہوا کہ مولانا نے اسی روز کو انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا الطاف حسین حالی جن کی وفات پر سارے ملک بھر میں ماتم کیا جائے گا اُس ممتاز گروہ کے آخری بزرگ تھے جس نے گذشتہ نصف صدی میں اردو علم ادب کی وہ بیش بہا خدمات کی ہیں جن کو اردو داں نسلیں کبھی فراموش نہ کرسکیں گی۔ یہی نہیں بلکہ درحقیقت اُردو شاعری میں جو عظیم الشان انقلاب مولانائے ممدوح نے پیدا کردیا اُسکے لحاظ سے وہ تمام دنیائے ادبی میں عام طور پر اور ہندوستان کے دور جدید میں خاص طور پر امتیاز رکھتے تھے اور اگرچہ ایک جماعت کثیر کو اُن کے عقائد ادبی سے سخت اختلاف بلکہ مخالفت رہی اور ہے لیکن جس طرح کہ ایک تخم زمین کی مدافعانہ کوششوں کا مقابلہ کرکے اوپر کی طرف پھوٹ نکلتا اور گرمی سردی۔ دھوپ اور بارش۔ آندھی اور اولوں کے باوجود درخت کی صورت میں ثمردار ہو کر برگ و بار سے مالامال ہوجاتا ہے بعینہٖ اُسی طرح مولانا حالی کی شاعری نے ہر قسم کی مزاحمتوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کرکے اپنے قدم سرزمین ادب پر مضبوطی کے ساتھ جمالیے اور اپنے ثمرات سے سارے ملک کو مستفیض بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ ایک ایسے مجدد فن اور محسن زبان اُردو کے انتقال کی خبر پاکر ہم خادمان اُردو کو جو صدمہ ہوا ہو تھوڑا ہے وقت تھا اور ہجوم غم کا تقاضا بھی کہ اپنے ٹکٹوں کو پھاڑ کر پھینکدیں اور پانی پت کے عزم سے باز آئیں۔ لیکن یہ خیال کرکے کہ مولانا کے مزار پر فاتحہ خوانی کرنے اور اُن کے پس ماندگاں کو اپنی دلی ہمدردی کا یقین دلانے کا فریضہ ادا ہو جائے گا ہم پانی پت گئے اور وہاں یہ دیکھکر ہمارے عقیدت شعار دل کو ایک طرح کا لطف خاص حاصل ہوا کہ مولانا حالی جس جگہ پر دفن کیے گئے ہیں وہ مقام حضرت شاہ بوعلی قلندر قدس سرہٗ العزیز ایسے ولی کامل کے مزار سے بالکل قریب اور خاص آنجناب کی درگاہ کے احاطہ میں واقع ہے۔

مولانا حالی صرف اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز اور باکمال شاعر ہی نہ تھے بلکہ آپ کا پایہ بحیثیت ایک معلم اخلاق اور حکیم امت ہونے کے اپنے معاصرین سے بہت بلند تھا۔ اور وہ لوگ جو مولانا ممدوح کے حالات سے زیادہ واقف تھے آپ کو ایک ولی اور بزرگ کامل کے مانند جانتے تھے کیونکہ آپکی ذات بابرکات حسن خلق و نیکی کی سراپا تصویر اور پاکیزگی و خلوص کی پیکر مجسم تھی۔ اور غالباً یہی سبب تھا کہ درگاہ قلندری میں آپ کو باریابی نصیب ہوئی۔ خداوند کریم مرحوم کو ان عظیم الشان خدمات قومی کے معاوضہ میں جو وہ عمر بھر کرتے رہے ہیں اور اس بے لوث اور نیکی سے بھری ہوئی زندگی کے صلہ میں جو اس فتنہ و شر کے زمانہ میں اُنھوں نے بسر کی ہے جنت نعیم عطا فرمائے ۔ آمین۔

الناظر کا یہ نمبر بتاخیر بسیار حاضر خدمت ہوتا ہے۔ دوسرے رسائل کے لیے یہ غالباً چنداں قابل خیال نہو لیکن پابندی وقت جسکی ایک خصوصیت سمجھی جاتی ہو اُسکے لیے یہ تاخیر کسی طرح قابل معافی نہیں ہوسکتی۔ ہمارے وہ معاصرین جو تقریباً ہر مہینہ اگر نہیں تو سال میں متعدد بار اس بات کے لیے عذر [illegible] کرتے رہتے ہیں کہ پرچہ وقت پر شائع نہیں ہوسکا ایسے مواقع پر جس قسم کے عذرات سے اپنے ناظرین کی تشفی کرتے ہیں غالباً ہمارے مقابلہ میں زیادہ ابرار اور نہایت خوش قسمت ہیں لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ اس قسم کی معذرت کا موقع آیا اور ہمیں خود اپنے وجود سے نفرت و بیزاری ہونے لگی۔ اڈیٹر کی بی بی کا کسی مرض شدید ناگہانی میں مبتلا ہوجانا یا اُسکا مسلسل سفر میں رہنا ہر چند کہ اُسکے کاموں میں ابتری کا سبب ہو لیکن یہ ایسے عذرات ہیں جنھیں ایک ذمہ دار اخبار نویس کو سرانجام فرائض میں سد راہ نہونے دینا چاہیے۔ اسی طرح اگر ہمارے وہ نوجوان دوست جو کچھ عرصہ سے الناظر کی ترتیب کے ایک بڑی حد تک ذمہ دار تھے پھوپھی کی اچانک موت کے باعث اپنا کام نہ کرسکیں تو اسے بھی ہم کوئی معقول عذر نہیں قرار دیسکتے۔ اسلیے نہایت صاف الفاظ میں اور سچی ندامت و شرمساری کے ساتھ اعتراف تقصیر کے سوا کوئی دوسری سبیل نظر نہیں آتی اور ہم اسی پر کاربند ہو کر ناظرین کرام کے لطف عمیم پر بھروسا کرتے ہیں اور بارگاہ رب العزت میں دعا کرتے ہیں کہ آیندہ اس قسم کا موقع نہ آنے پائے۔ البتہ ناظرین کی اطلاع کے لیے یہ ذکر کردینا ضروری جانتے ہیں کہ الناظر کی ترتیب کو بوجہ اسکے کہ ہمارے دوست عزیز جو اسوقت اس بار گراں سے اپنی سبکدوشی لیے ہوئے تھے اپنی مصروفیتوں اور مجبوریوں کے باعث اسکے زیادہ متحمل نہیں ہوسکتے ہمنے پھر اپنے ذمہ لے لیا ہے اور امید ہے کہ پوری مستعدی اور پابندی کے ساتھ اس خدمت کو انجام

فروری کے الناظر میں "میدان کارزار" پر ایک اعلیٰ درجہ کا مضمون شائع کیا جائیگا جس سے موجودہ جنگ یورپ کو پوری طرح سمجھنے میں بہت مدد ملیگی۔

خوان ادب

اس ماہ سے ایک نیا باب الناظر میں اضافہ ہوتا ہے۔ عنوان بالا کے تحت میں ارادہ ہے کہ ہر مہینہ چند کتابوں کا مختصر ذکر کیا جائے تاکہ ناظرین رسالہ کو اس بات کے اندازہ کرنے موقع مل سکے کہ کون کتاب اُنکے مذاق اور ضرورت کی شایع ہوی ہے جو اُنکے پاس موجود نہیں ہے۔ جدید کتابوں کے متعلق ہم کوشش کر کے معلومات بہم پہنچائیں گے اور جو کتابیں پہلے سے ملک میں پھیلی ہوی ہیں اُن کا تذکرہ بھی اسی ضمن میں ہوا کریگا۔ اختلاف مذاق وطبائع اور کتابوں کی خوبی نوعیت کا پورا لحاظ رہے گا اور کسی خاص رنگ مذاق کی پابندی نہ کی جاے گی۔ جو اصحاب ریویو کی امید پر اپنی کتابیں بھیجتے رہتے ہیں اور بسا اوقات مصروفیت یا دوسرے اسباب کے باعث تفصیلی اظہار راے میں کوتاہی ہوتی ہے اس ذریعہ سے ایک حد تک اُن کی خدمت زیادہ آساں ہو جاے گی۔ کیونکہ مجملاً اُن کی کتابوں کے بارہ میں کچھ نہ کچھ لکھا جا سکے گا۔

شہادت گواہان روبروے پبلک سروس کمیشن

(۷۰۶ صفحات قیمت عہ، الناظر بک ایجنسی)

لارڈ اسلنگٹن کے زیر صدارت جو کمیشن گذشتہ دو سال سے ہندوستان کے محکمہ جات سرکاری کی ملازمتوں کے بارہ میں دریافت حال کر رہا تھا اور جسکی رپورٹ سے بیشتر اہل ملک کو یہ توقع ہے کہ ہندوستانی ملازمین کی حالت بہتر ہو جاے گی اُسکے سامنے اس ملک میں جتنی شہادتیں گذریں اس ضخیم کتاب میں وہ سب یکجا کر دیگئی ہیں۔ جن لوگوں کو محکمہ جات سرکاری کے تقررات سے دلچسپی ہو یا جو اس بارۂ خاص میں سارے ملک کے یوروپین اور ہندوستانی مشاہیر کی رائیں جاننا چاہتے ہوں اُن کے لیے تو یہ کتاب بہت ہی دلچسپ ہے۔ ہندوستان کے ملکی اور سیاسی حالات کے متعلق جن اصحاب کو کسی قدر دلچسپی ہو اُن کو بھی ہمیں نہایت اعلیٰ درجہ کا مواد مل سکتا ہے۔ اور حجم کاغذ اور چھپائی وغیرہ کے لحاظ سے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ کتاب کوڑیوں کے مول فروخت ہو رہی ہے۔

خوشحال ہندوستان

(۱۶۰ صفحات قیمت عہ، الناظر بک ایجنسی)

مسٹر ولیم ڈگبی سی آئی ای ممبر پارلیمنٹ اُن چند ممتاز انگریزوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے ہندوستان کے حالات کو نہایت دلسوزی اور ہمدردی اور پوری محنت و

جانفشانی کے ساتھ مطالعہ کیا اور انگلستان کی پبلک کے سامنے یہاں کی اصلی کیفیت کو پیش کرتے رہنا اپنی زندگی کا مقصد خاص بنالیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان جن اقتصادی مشکلات میں پھنسا ہوا ہے اور افلاس نے یہاں کے کروڑہا نفوس کو جس مصیبت میں ڈال رکھا ہے اسکے متعلق آپ نے ایک ضخیم کتاب پراسپرس انڈیا (خوشحال ہندوستان) کے نام سے ۱۹۰۱ء میں لکھی تھی۔ منشی غلام قادر فصیح نے جو پنجاب کے ایک مشہور اہل قلم تھے بطور خلاصہ کے اسکے بعض ضروری اجزا کا ترجمہ ۱۹۰۸ء میں کیا تھا۔ اب اس کتاب کے تھوڑے ہی نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ ہندوستان کی اصلی حالت معلوم کرنے کا جنھیں شوق ہے انکو اسکے مطالعہ سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

مقالات سرسید

(قیمت عہ۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ)

اسکے ۴۴ صفحات ہیں سید صاحب کی تصنیفات تقریروں اور مضامین سے انتخاب کرکے ۹۰ اقتباسات (بقید حوالہ) درج کیے گئے ہیں اور جن اصحاب کو سید صاحب کی قیمتی رایوں اور خیالات کا نہایت ہی کم مطالعہ کی زحمت برداشت کرکے اندازہ کرنا ہو ان کے لیے یہ مجموعہ بہت مفید ہوگا۔ اور ادبی حیثیت سے سرسید کی جو منزلت ہے اس لحاظ سے تو ہر شخص کے لیے یہ دلچسپ ہے۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جنھوں نے سید صاحب کی علمی۔ ادبی و سیاسی تحریرات کے مجموعۂ کثیر کو پڑھا ہو انکے لیے یہ مجموعہ خصوصیت سے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔

انتخاب دیوان حسرت موہانی

۲۰ صفحات قیمت ۴ر سید یٰسین اسٹورس علیگڈھ

مولانا حسرت کی شاعری کے نمونے ناظرین الناظر دیکھتے رہے ہیں۔ اس مختصر مجموعہ میں وہ کل غزلیں درج ہیں جو رسالۂ اردوے معلے علیگڈھ اور ملک کے دوسرے ادبی رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

اخلاقی کہانیاں

(۲۰۸ صفحے چھوٹی تقطیع قیمت ۱۲ر پیسہ اخبار لاہور)

لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق یورپ کی زبانوں میں عام طور پر بہت سا مواد موجود ہے ہمارے ملک میں بھی اسکی کوشش ہو رہی ہے کہ اس ضرورت کو پورا کیا جاے۔ فاطمہ بیگم صاحبہ (منشی فاضل) اڈیٹر اخبار شریف بی بی لاہور نے یہ کتاب ننھے بچوں کے لیے مرتب کی ہے۔ جسمیں کسی قدر بڑے قلم سے بہت سی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں۔

جنتلمین ڈائری ۱۹۱۵ء (کلاں ۸ر خرد ۶ر) منیجر صاحب الناظر نے تھوڑی سی خوشنما و منقش جلد کی ۱۹۱۵ء کی ڈائریاں خاص ناظرین الناظر کے لیے منگائی ہیں انگریزی کی ڈائریوں کی طرح اسمیں بھی نہایت مفید و کارآمد باتیں ہیں جو اصحاب ڈائری

قطعاتِ تاریخِ وفات

جناب مولوی محمد صدر الدین خاں صاحب مرحوم رئیس کاکوری

یادگارِ جناب مولوی مفتی محمد خلیل الدین خاں صاحب بہادر مرحوم و مغفور مفتیِ شاہ اودھ

از نتیجۂ افکارِ منشی محمد ارتضیٰ علی صاحب المتخلص بہ شررؔ کاکوروی

تلمیذ نواب دبیر الدولہ فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی

ہے حبابِ آبِ دریا عالمِ ناپائدار ۔۔۔ ہے تغیر سے یہ حادث ہی قدم ایں کہاں
یہ تماشاگاہِ دنیا ہے طلسمی سیر بین ۔۔۔ ایک حالت پر نظر آتا نہیں رنگِ جہاں
آج عشرت ہے تو کل عشرت کی حسرت ہی ہمیں ۔۔۔ آج دولت کل فلاکت ہے ہماری میہماں
شاہدِ گل تھا ابھی جوبن پہ تھی فصلِ بہار ۔۔۔ یک بیک آئی خزاں ویراں ہوا سب بوستاں
ناشگفتہ تھے جو غنچے سب کے سب مرجھا گئے ۔۔۔ ہر طرف گلزار میں ایسی چلی بادِ خزاں
یہ تغیر یہ تبدل تھا نہایت درد خیز ۔۔۔ رہ گئے دل تھام کر حیرت میں گلچیں باغباں
عالمِ فانی سے وابستہ ہے یہ انسان بھی ۔۔۔ دستِ بیدادِ اجل سے بچ کے جاتا ہی کہاں
غور سے دیکھو تو ہستی کچھ نہیں اک خواب ہی ۔۔۔ ہی خیال و وہمِ باطل ہیچ ہے سب بے گماں
چند روزہ زندگی پر ہے ہمیں کتنا غرور ۔۔۔ کر رہے ہیں آہ اظہارِ وقارِ وعزوشاں
تیز جھوکا آگیا بادِ فنا کا جس گھڑی ۔۔۔ سب اکڑنا اپنا بھولے باغ میں سروِ رواں
موت کے پنجے کی سختی سے پکارے الحذر ۔۔۔ ہم نے دیکھا خس بدنداں تھے مسیحائے زماں
حفظ ہے پیکِ اجل کو خوب لَا یَسْتَاخِرُوْنَ ۔۔۔ ایک لمحے کی بھی مہلت دے یہ ممکن ہے کہاں
جا رہا ہے تیز گامی سے عدم کا قافلہ ۔۔۔ مرگِ سنگیں دل ہے رہبر اور میر کارواں
کر دیے ہیں حیف اس نے سیکڑوں گھر بےچراغ ۔۔۔ جن پہ مہرِ خاورِ اقبال تھا پرتو فشاں

سرکشانِ دارِ فانی سرنگوں ہیں خاک پر
وائے عبرت ہیں غذائے مور اُنکے استخواں

بسترِ مخمل پہ کل تھے سنگریزوں پہ ہیں آج
گلعذار و گلبدن گُل پیرہن غنچہ دہاں

مٹ گیا سب فرق سُلطان و گدا کا بعدِ مرگ
یہ نہیں کھُلتا نظر آتی ہیں کس کی ہڈیاں

کیا ہوئے فاضل، محدّث، منطقی، شاعر، حکیم
افتخارِ ملک و ملّت مایۂ فخرِ جہاں

ڈھونڈھتی ہیں اُنکو آنکھیں اب کہیں ملتے نہیں
ہوگئے ہیں پڑکے گردابِ فنا میں سب نہاں

حال کا یہ واقعہ ہے خاک میں پنہاں ہوئے
یادگارِ حضرتِ مفتی خلیل الدین خاں

حضرتِ نواب سرکارِ اودھ کے تھے سفیر
معتمد تھے خاص وہ۔ تھا شاہ اُنپر مہرباں

تھے امانت میں دیانت میں یگانہ۔ روزگار
ہوچکا تھا سیکڑوں موقعوں پہ اُنکا امتحاں

عالمِ اکمل ریاضی داں مہندس بے نظیر
دیکھتے تھے دُوربیں سے حالتِ سیارگاں

پایہ کیسے علم میں تھا اس قدر پایہ بلند
جُھک کے عرضِ حال خود کرتا تھا پیرِ آسماں

یادگارِ حضرتِ مرحوم جنسے ہے مراد
تھے وہ پوتے آپکے ابنِ بشیر الدین خاں

نام صدر الدین خاں تھا عالمِ نامی تھے وہ
شہرۂ علمش رسیدہ از زمیں تا آسماں

آپ کے اُستاد تھے تاہِ تقی مرشد تُراب
کروآں مغفور حاصل نعمتِ ہر دو جہاں

تھی اُنھیں علمِ ریاضی میں بھی اچھی دستگاہ
اُسکی باعث خاص تھی تعلیم جدِّ مہرباں

ہائے اُنکی ذات سے تھی مفتخر وضعِ قدیم
آج کاکوری میں ہم پاتے نہیں اُسکا نشاں

تا دمِ آخر نباہی جو روش کی اختیار
پیش آئیں وقتیں صدہا اُنھیں دشواریاں

خوش عقیدہ عابد و زاہد سخی پرہیزگار
صاحبِ علم و خرد تھے اور ممدوحِ جہاں

تھی دعا اُنکی نہو تکلیف وقتِ نزعِ رُوح
بوئے گُل کی طرح نکلے قالبِ خاکی سے جاں

ہوگئی مقبول درگاہِ خدا میں یہ دعا
کی مدد۔ مرشد تھے مقبولِ خدائے دوجہاں

بار تھا وہ سہہ نہ سکتے تھے تقاضائے اجل
قبلہ رُو خود ہوگئے دی اُسکو آسانی سے جاں

تھی نویں ماہِ رجب کی پنج شنبہ کا تھا دن
تیرہ سو بتیس[۱۳۳۲] ہجری تھا یہی سالِ رواں

بج گئے تھے چار ہنگامِ اذاں تھا وقتِ صبح   رُوح جا پہنچی عبادت کے لیے سوئے جناں
بعدِ طوفانِ ہوا تھا قطرہ افشاں ابرِ تر   رو رہا تھا آہ صدر الدین خاں کو آسماں
سرد جھوکا تھا ہوا کا۔ غمزدوں کی آہ سرد   شورِ باوِ تُند۔ یا بیکس یتیموں کی فغاں
رو دیے اس حادثے کو دیکھکر احباب و غیر   فرطِ غم سے مضطر و محزوں تھا اُنکا خانداں
ہاں بتا دے ہم کو مردم خیز کاکوری ذرا   جنسے شہرت تھی وہ تیرے نامور اب ہیں کہاں
خاک سے تیری اُٹھے تھے خاک میں تیری ملے   عالم و ناصح بہادر شاعرِ شیریں بیاں
ہے وطن افسوس تجھپر وہ بھی اب مٹنے کو ہیں   جو مٹے سے رہ گئے ہیں اگلی عظمت کے نشاں
بس شررؔ اب صبر کی تلقین کرنی چاہیے   بڑھ گیا ہے جوش تیرا روک خامہ کی عناں
صبر لازم ہے بلاشک غمزدہ انسان کو   ہے یہی ارشادِ خلاقِ زمین و آسماں

کر دعائے مغفرت تاریخِ رحلت اُس میں ہو
کہہ اُٹھا کر ہاتھ۔ عالی رُوح ہو فردوس آشیاں   ۱۳۳۲ھ

دیگر

خانِ عالی صفات صدر الدین   بُرد تشریف زیں جہانِ خراب
گفت فکرِ شررؔ بسالِ وفات   کہ۔ بود جنّتی مرید تراب

۱۳۳۲ھ

دیگر بہرِ مزار

یہاں ہے دفن ایک ذی علمِ نامی   بہت شہرہ تھا جسکے خانداں کا
شررؔ کہتی ہے رحمت بہرِ تاریخ   مزارِ پاک صدر الدین خاں کا

۱۳۳۲ھ

الناظر

نمبر ۲ جلد ۶ — یکم فروری ۱۹۱۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

النّاظر

نمبر ۶ جلد ۱۲ یکم فروری ۱۹۱۵ء

میدانِ کارزار

کیا اس کے ماننے میں کسی کو بھی شبہہ ہو سکتا ہے کہ زمانہ کی ہوا کے ساتھ مذاقِ پبلک بھی پلٹتا رہتا ہے؟ پھر آج کل جرمنی کی - یا کسی اور کی - فتنہ انگیزی سے، امن و سکون کے دفعتاً شرارۂ جنگ سے پلٹ جانے سے، ملک کا مذاق بھی بحالتِ موجودہ مثنوی میر حسن کے بجائے شاہنامۂ فردوسی کی طرف پھر گیا ہے! اخباروں کا وہ حصہ - بلکہ صرف وہ حصہ - جو اس عالمگیر جنگ کے متعلق ہوتا ہے نہایت دلچسپی اور خاص شوق کے ساتھ پڑھا یا سُنا جاتا ہے! لیکن میں اور آپ سب جانتے ہیں کہ اخباربیں دنیا کا کس قدر حصہ میدان کارزار کے مختلف تاروں کا مطلب کما حقہ سمجھ سکتا ہے، اور سمجھنے کے بعد اُس سے صحیح حالت کا اندازہ کر سکتا ہے!

بے بنیاد افواہوں کو نظر انداز کر کے مستند اخباروں کے تاروں کا مطلب، میں نہیں کہہ سکتا کہ پورے طور پر سمجھا جاتا ہے یا نہیں! واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی پبلک زیادہ تر، بلکہ قریب قریب سب - اس کوچہ سے نابلد ہے! مشرقی، صدیوں پُرانا، طریقۂ جنگ جس میں صرف ایک پانی پت کا میدان سلطنت کو ایک خاندان سے چھین کر دوسرے خاندان کو دے سکتا تھا۔

ہم لوگوں کے ذہن نشیں ہے، اور جب کبھی ہماری قوتِ متخیلہ میدان کارزار کی تصویر کھینچتی ہے تو وہی پرانے شاہنامہ کے میدان جنگ یا کوروں پانڈوں والے میدان کے خیال پر مبنی ہوتی ہے! موجودہ طریقۂ پیکار، اور کیفیتِ نقل و حرکت - جو بجائے خود ایک مستقل علم ہو گیا ہے - ہمارے دماغ پر مشکل سے عکس فگن ہو سکتے ہیں! اسکی وجہ زیادہ تر یہ بھی ہے کہ ہماری زبان میں علم الحرب کے متعلق کوئی تصنیف ہونا تو درکنار، اُس مذاق کی دلچسپ حکایات بھی موجود نہیں! اور علمی اصطلاحات کی طرح علم الحرب کی اصطلاحات بھی ہماری اُردو میں اس وقت تک مفقود ہیں یا کم از کم رائج نہیں ہیں! اس میں شک نہیں کہ بعض لایق اڈیٹروں نے "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" کے لحاظ سے، اخبار کی روزانہ خبروں میں مجبور ہو کر عربی کی امداد سے اکثر اصطلاحات کا ترجمہ کر لیا ہے، لیکن پھر بھی ایسے ترجمے اجتہادِ شخصی سے زیادہ نہیں کہے جا سکتے اور ابھی تک عام فہم یا زبان زدِ خلائق ہونے کی حد تک نہیں پہنچے ہیں! اگر انکو کافی اور صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی محض پیغامِ برقی کا لفظی ترجمہ علم الحرب کے قواعد اور اصول سے آگاہ نہیں کر سکتا! یہ ظاہر ہے کہ اس علم جدید پر کوئی دلچسپ مضمون جو کسی حد تک بھی اسکی تشریح کرتا ہو اُردو کے رسالوں میں مشکل سے نظر آئے گا! میرا مقصد اسوقت علم الحرب کے صرف اُس حصہ سے ہے جسکی واقفیت اخبار کے پیغام برقی کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر سکے! علم الحرب کے باریک اور دقیق اصولوں کو بیان کرنا تو غالباً ایک مستقل تصنیف و تالیف کی صورت میں وجود میں آ سکتا ہے! لیکن موجودہ میدانِ جنگ کے طریقۂ پیکار کی اس حد تک تشریح ضرور ہو سکتی ہے کہ روزانہ برقیات آسانی کے ساتھ سمجھی جا سکیں اور اُنکا اصلی مطلب ذہن نشیں ہو سکے! اس سے پہلے کہ میں اصل "ابجد" کو شروع کروں بہتر ہوگا کہ میں اسکو تسلیم کر لوں کہ میں اصطلاحاتِ علمی کا ترجمہ کرنے میں اجتہادِ ذاتی سے کام لونگا - جسکو بہ الفاظِ دیگر من گھڑت بھی کہا جا سکتا ہے! اگرچہ میں اسکے ساتھ ہی انگریزی الفاظ بھی لکھتا جاؤں گا تا کہ میرا ترجمہ صحیح نہ ہونے کی صورت میں اُس سے بہتر اور عام فہم اصطلاح کوئی دوسرا دماغ پیدا کر سکے!

* * * * * * * * *

اس قدر تقریباً ہر شخص جانتا ہے کہ ایک فوج بلحاظِ نوعیت تین اقسام پر منقسم ہو سکتی ہے:- ایک پیدل (Infantry)؛ دوسرے رسالہ (Cavalry)؛ تیسرے توپ خانہ (Artillary)۔ لڑائی کا آغاز ہوتے ہی سب سے پہلا کام اجتماعِ افواج ہے۔ اس اجتماع کے لیے سرحدِ مخصوص کے قریب ایک ایسا مقام تجویز کیا جاتا ہے جہاں ہر قسم کی آسانی حاصل ہو؛ یعنی جہاں ریلوے کی قریب قریب ہر لائن براہِ راست گزرتی ہو یا اور مختلف مقامات پر اُس مقامِ اجتماع تک جانے والی ریل سے مل گئی ہو! اُس مقام سے ملک کی مشہور اور قریب قریب ہر حصۂ ملک میں جانے والی پختہ اور کشادہ سڑکیں گزرتی ہوں! اور جہاں آبادی کے باہر ایک وسیع میدان خیمہ زنی کے لیے مل سکے! متذکرۂ بالا امور کے علاوہ اگر اُس مقام کو غلہ کی مَنڈی ہونے کا بھی فخر حاصل ہو تو سبحان اللہ۔ ورنہ اس آخری خصوصیت کو بمقابلۂ خصوصیاتِ اوّل الذکر نظر انداز کر دیا جاتا ہے! رسد اور اجتماعِ افواج کے- یعنی انتظامِ اندرونی کے- لحاظ سے ان خصوصیات کو پیشِ نظر رکھکر مقامِ اجتماع مقرر کیا جاتا ہے؛ لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ہی سب سے بڑی چیز اور مقصدِ اہم اُس مقام کا بلحاظ انتظامِ بیرونی قابلِ وقعت ہونا ہے! انتظامِ بیرونی سے یہ مطلب سمجھیے کہ مفروضہ میدانِ جنگ کی قربت، فوجی لحاظ سے استحکام، اور سرحد کو عبور کر کے دشمن کے کمترین محفوظ حصہ میں جانے والی ریل یا سڑکوں تک پہنچنے میں آسانی! ان دونوں اندرونی و بیرونی خصوصیات کو پیشِ نظر رکھکر ایک مقامِ اجتماع تجویز کیا جاتا ہے جو بعد میں بنیادِ جنگ (Base of War) بنجاتی ہے! جس قدر رسد، سامان، غلہ، فوج، احکامات، خط و کتابت؛ غرض ہر چیز- میدانِ کارزار کے لیے فراہم کی جاتی ہے یا وہاں پہنچانے کے لیے بھیجی جاتی ہے وہ ملک کے ہر ہر گوشہ سے اسی مقام پر آتی ہے! ایسا کبھی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی قریب کا راستہ اختیار کر لیا جائے اور لڑنے والی فوج تک کسی قسم کی امداد بلا مقامِ اجتماع سے گزرے ہوئے پہنچا دی جائے. کیونکہ ایسی

صورت میں بد نظمی اور خطرۂ دشمن، دونوں باتوں کا اندیشہ ہے! ایسا ممکن ہے کہ لڑائی اطراف ملک میں ہونے کی - یا بہت دُور تک میدانِ کارزار کے پھیل جانے کی وجہ سے - ایک کے بجائے دو یا اس سے بھی زیادہ مقامات اجتماع ہر سرحد اور رُخ کے لحاظ سے قائم کیے جائیں - مثلاً فرض کیجیے کہ (خدانخواستہ) ہندوستان کے ہر جہار طرف لڑائی پیش آئے تو راولپنڈی، پشاور - کراچی کلکتہ وغیرہ مختلف مقاماتِ اجتماع ہر سمت قائم کیے جا سکتے ہیں! مگر ایسی صورت میں ایک مرکزِ مقاماتِ اجتماع کی بھی ضرورت ہوگی جو قریب قریب ہر مقامِ اجتماع سے برابر کے فاصلہ پر ہواور جہاں سے ریل اور سڑکوں کی بدولت ہر مقامِ اجتماع تک آسانی کے ساتھ ہر قسم کی امداد پہنچائی جاسکے - ایسا مقام ہندوستان میں جھانسی فرض کیا جا سکتا ہے!

مقامِ اجتماع قائم ہو جانے کے بعد نقل و حرکت کی باری آتی ہے اور حملہ آور فوج دشمن کے مُلک میں پہلے سے طے کیے ہوئے مقامات اور راستوں پر بڑھ جاتی ہے! یہاں ایک بات صاف ظاہر ہے - طرفین میں سے جو کوئی اپنے دشمن سے پیشتر اجتماعِ افواج (Mobilisation) کرے گا وہی دوسرے کے مُلک میں گھس سکتا ہے اور مقابلہ شروع ہونے سے پیشتر اکثر سرحدی چھوٹے چھوٹے اور غیر محفوظ مقامات پر قابض ہو سکتا ہے! نہ صرف یہی بلکہ اکثر اوقات بہت دور تک بلا مقابلۂ عظیم گھسے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسکی پیش قدمی اُس وقت تک بند یا سُست نہیں ہو سکتی جب تک کہ دشمن کی فوج اپنی برابر کی طاقت سے اُس حملہ آور فوج کو کسی مقام پر روک کر مدافعانہ مقابلہ میں جم نہ جائے! نقل و حرکت کی مفصل داستان شروع کرنے سے پیشتر یہ ذہن نشین کر دینا بہتر ہوگا کہ مذکورۂ بالا فوج کی تین قسموں - پیدل، رسالہ، اور توپ خانہ - سے کیا مطلب ہے؟ پیدل (Infantry) سے یہ مراد ہے کہ اسکا بڑا حصہ سپاہیوں سے پُر ہے - یعنی اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ تمام فوج محض پیدل ہی پیدل کی ہے یا اس میں تھوڑا بہت رسالہ اور توپ خانہ موجود نہیں ہے! فی الواقع فوج کا بڑا حصّہ جو ہوگا وہ اُسکا نام ہے مگر اس میں کافی حصّہ اور اقسام کا بھی ہوگا! مثلاً پیدل - یا انفنٹری - میں

سواروں کا حصہ اور توپ خانہ کا سامان ضرور ہوگا، رسالہ میں توپ خانہ اور انفنٹری کا کچھ حصہ ضرور شامل ہوگا! وقس علیٰ ہذا!

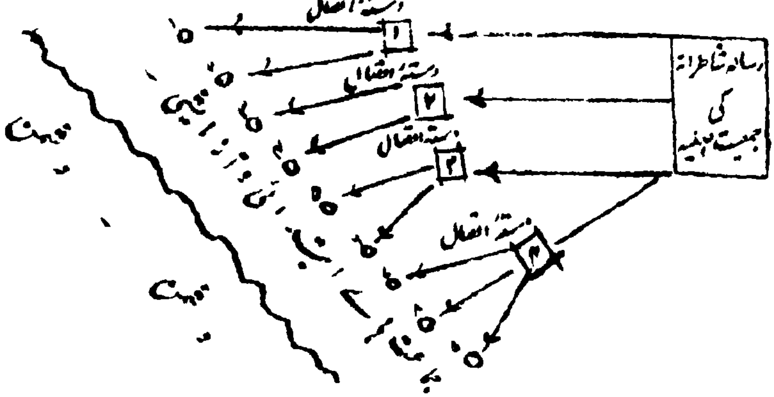
جب تک کہ فوج کی اپنے دشمن سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے وہ پیش قدمی کے ساتھ ایک اچھا موقع تلاش کرکے سب سے پہلے اپنے رسالہ کو استعمال کرتی ہے! چونکہ رسالہ بہ نسبت توپ خانہ یا پیدل کے زیادہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھ سکتا اور مسافت قطع کر سکتا ہے اس لیے کُل فوج ایک عمدہ مقام انتخاب کرکے رُک جاتی ہے اور صرف رسالہ آگے بڑھایا جاتا ہے! اس رسالہ کو جو سب سے پہلے آگے بڑھتا ہے اصطلاحِ علم الحرب میں (Stratigical cavalry) یا۔ بالفاظ دیگر رسالۂ شاطرانہ کہتے ہیں! اسکے فرائض مختصراً یہ ہیں :۔ دشمن کی تلاش، دشمن کے رسالہ کا مقابلہ کرکے اُسکو توڑ دینا، اور دشمن کی فوجی طاقت، دشمن کی پیش قدمی کا رُخ، دشمن کا طریقہ و راستۂ رسد و امداد، وغیرہ، کا خاص طور پر دریافت کرنا!! یہ رسالۂ شاطرانہ عموماً ایک۔ یا بعض اوقات اس سے زائد۔ ڈویژن (division) کا ہوتا ہے جس کے ساتھ بطور امداد توپخانۂ فرس (horse artillary) ضرور ہوتا ہے! بعض اوقات پیدل فوج کا سواروں والا حصہ (Mounted Infantry) اور سائیکل سواروں کی رجمنٹیں بھی اس میں شامل کر دی جاتی ہیں!

یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ رسالہ کو اپنی بندوقیں استعمال کرنے کے وقت گھوڑوں پر سے اُترنا پڑتا ہے! اسلیے فی الواقع رسالہ کی صرف تین چوتھائی تعداد۔ زیادہ سے زیادہ۔ فیر کرنے والے خط میں کام میں لائی جاسکتی ہیں؛ کیونکہ ہر چار آدمیوں میں سے ایک، گھوڑے تھامنے کے لیے چاہیے ہوتا ہے! اس گھوڑے پکڑنے والے حصے کو فوجی زبان میں "نمبر تین" (No. 3) کہتے ہیں! اس نام کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ہر چار آدمیوں کی صف میں سے تیسرے نمبر پر کھڑے ہونے والے کا فرض اپنی صف کے گھوڑے تھامنا ہوتا ہے! یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ رسالہ کو مقابلہ کے وقت گھوڑوں پر سے اُترنا پڑنا لازمی ہو؛ مگر جہاں کہیں جم کر مدافعانہ کارروائی

کی ضرورت ہو وہاں اوتر پڑنا ضروری ہے! اور اسی لیے رسالہ کے ساتھ سائیکل سواروں کی ٹکڑیں شامل کر دیجاتی ہیں، تاکہ ایسی مدافعانہ کارروائی کے وقت۔ جبکہ رسالہ کا ایک چوتھائی حصہ گھوڑوں کے پکڑنے میں نکل جاتا ہے۔ فیر کرنیوالی صف ([illegible]) میں تعداد بڑھائی جاسکے! تیز حملہ کرنے کے وقت تمام رسالہ گھوڑوں پر سوار رہ کر حملہ آور ہوتا ہے؛ البتہ ایسے موقعہ پر پیدل فوج کا سوار حصہ، اور توپخانہ غرض سب گھوڑوں کی پشت پر استعمال کیے جا سکتے ہیں!

ہاں! تو یہ آپ کی سمجھ میں آگیا کہ کل فوج ایک جگہ مقیم ہو کر صرف رسالۂ شاطرانہ کو دشمن کے مقابلہ اور تجسس ذرائع امداد و سمتِ نقل و حرکت کے لیے آگے بھیجتی ہے! اب یہ سنیے کہ یہ رسالۂ شاطرانہ بھی ایک پڑاؤ۔ یا اس سے کچھ زیادہ۔ آگے جا کر رک جاتا ہے اور ایک سو تا سپاہیوں کے کئی دستے اپنے سے آگے روانہ کرتا ہے! ان دستوں کو فوجی اصطلاح میں (Contact-squadrons) یا دستہائے اتصال کہتے ہیں! انکا فرض دشمن سے متصل یا قریب تر ہو جانا ہے! اب پھر ان دستوں میں سے ہر ایک اپنے میں سے نو سپاہیوں کی۔ یعنی ایک افسر، چھ سپاہی، اور دو سائیکل سواروں کی۔ چھوٹی چھوٹی جماعتیں، جو کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ چار ہوتی ہیں، مختلف سمتوں میں مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھاتا ہے! ان جماعتوں کو جنگی اصطلاح میں Reconnoitring patrols یا جماعتہائے ابتدائی و آزمائشی کہتے ہیں! ہر جماعت سے ایک سائیکل سوار اپنے دستہ کے پاس، اور ہر دستہ سے ایک موٹر سائیکل سوار رسالۂ شاطرانہ کی جمعیتِ اصلیہ کے پاس خبر و پیغام لیجاتے رہتے ہیں اور اس طرح ہر جماعتِ آزمائشی سے لیکر ہر دستۂ اتصال تک، اور ہر دستۂ اتصال سے لیکر رسالۂ شاطرانہ کی جمعیتِ اصلیہ تک ایک سلسلۂ پیغام و احکام قائم ہو جاتا ہے! اس سلسلۂ پیغام و تقسیم رسالۂ شاطرانہ کو شکل کھینچکر اس طرح سمجھایا جا سکتا ہے:۔

شکل بر صفحہ (۷)



یہ صاف ظاہر ہے کہ دشمن کی طرف سے بھی پیش قدمی اسی طرح کیجاتی ہے، اور اگر مخالفین قریب قریب آگے پیچھے میدانِ جنگ میں پہنچیں تو جانبین کی جماعتہائے آزمائشی ایک دوسرے کے مقابل ہونگی اور سب سے پیشتر ان ہی میں مقابلہ شروع ہوگا! فیر کرتے ہی ہر جماعت آزمائشی کا افسر اپنے سامنے والے دشمن کی جماعت کے حالات، اُسکا رُخ، اُسکی تعداد، اُسکا ارادہ۔ ان سب باتوں کی نسبت اپنی پختہ رائے قائم کرکے دستۂ اتصال کو اطلاع دیتا ہے۔ اور دستۂ اتصال کا افسر اپنی ہر جماعتِ آزمائشی سے آنے والی خبر سے اندازہ لگا کر ایک رائے امورِ مذکورۂ بالا کی نسبت قائم کرتا ہے اور اپنی رائے سے رسالۂ شاطرانہ کی جمعیت عملیہ کو مطلع کرتا ہے! یہاں یہ ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ایسی رائے قائم کرنے میں دیر نہیں لگائی جاسکتی بلکہ فیر ہونے کے بعد ہی جہاں تک جلد ہو سکتا ہے جماعت آزمائشی کا ایک بائیکل سوار اپنے دستۂ اتصال کی طرف اطلاع ضروری کا مراسلہ لے کر پوری تیزی کے ساتھ چل دیتا ہے! دستۂ اتصال کا افسر پوری بے چینی کے ساتھ ہر جماعتِ آزمائشی سے اطلاع آنے کا منتظر رہتا ہے اور جس وقت اُسکو تمام جماعتوں سے خبر مل گئی تو پھر وہ اپنی رائے قائم کرنے میں اور اسے رسالۂ شاطرانہ کی جمعیت عملیہ کو بذریعہ موٹر سائیکل سوار مطلع کرنے میں نہایت عجلت سے کام لیتا ہے! اگر ایسا اتفاق پیش آئے کہ دستۂ اتصال کے افسر کو سوائے ایک جماعتِ آزمائشی کے اور سب سے خبر مل جائے، اور اس باقیماندہ جماعت کے لیے وہ کافی انتظار بھی کر چکے، تو فوراً دوسری جماعتِ آزمائشی اُس لاخبر جماعت کے تعاقب و تلاش میں

روانہ کرے گا ؛ مگر کسی حالت میں ، محض ایک جماعت سے خبر نہ موصول ہونے کی وجہ سے ، وہ جمعیتِ اصلیہ کو خبر دینے میں تاخیر نہیں کر سکتا۔ بلکہ سمت ہائے مختلف کے بابت رائے زنی کرتے ہوئے ، اپنے مراسلہ میں ، اس سمت کو محض "بے پتہ" دکھا دے گا ! ہر دستہ اپنی اپنی جماعت ہائے آزمائشی و ابتدائی کو برابر اُسوقت تک کمک پہنچاتا رہے گا جب تک کہ رسالۂ شاطرانہ کی جمعیتِ اصلیۂ ہاں نہ پہنچ جائے !

رسالۂ شاطرانہ کا افسر تمام دستہائے اتصال سے خبر موصول ہو جانے پر دشمن کے رُخ ، دشمن کے قوی مقام ، وغیرہ وغیرہ کی نسبت رائے لگاتا ہے اور دشمن کا کمزور مقام معلوم ہو جانے پر اُسی طرف پورا زور دیتا ہے ! دشمن کے کمزور مقام کا اندازہ کرنے میں پوری احتیاط سے کام لیا جاتا ہے ! محض ایک یا دو جماعت ہائے آزمائشی کی اطلاع پر دشمن کی سامنے والی جماعتوں کو کمزور نہیں سمجھا جاتا بلکہ مختلف دستوں کی آزمائشی جماعتوں کا کسی خاص مقام کے ہم خیال ہونا زیادہ قابلِ لحاظ ہوتا ہے ! مثلاً اوپر والی شکل کی صورت میں اگر افسر جماعت اصلیہ کو جماعت ہائے نمبر (۱) و (۴) و (۸) سے یہ خبر موصول ہو کہ "دشمن کی جماعتیں انکے سامنے کمزور ہیں" تو ایسی اطلاع قابلِ وقعت نہیں ہو سکتی ! کیونکہ ان خبر دینے والی جماعتوں کی درمیانی جماعتیں (یعنی نمبران (۲) و ۳ و ۵ و ۶ وغیرہ) انکی ہم خیال نہیں ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دشمن کا کمزور مقام مسلسل طور پر ایک ہوگا نہ کہ ٹکڑے ہو کر کئی جگہ واقع ہو ! البتہ اگر جماعتہائے (۵) ، (۶) ، و (۷) و (۴) اپنی سامنے والی جماعتوں کو کمزور بتانے میں ہم خیال ہوں تو بیشک قابل لحاظ ہے ؛ اول تو اس وجہ سے کہ یہ جماعتیں (۴ و ۵ و ۶ و ۷) ایک تسلسل میں واقع ہوئی ہیں۔ دوسرے اس وجہ سے کہ یہ جماعتیں مختلف دستہ ہائے اتصال سے تعلق رکھتی ہیں ؛ یعنے جماعت نمبر ۴ دستۂ نمبر ۲ سے ، جماعتہائے نمبر ۵ و ۶ دستہ نمبر ۳ سے ؛ اور جماعت نمبر ۷ دستۂ نمبر ۴ سے ؛ ایسی صورت میں افسرِ رسالۂ شاطرانہ اس مقام کو۔ جماعت ۴ سے ۷ تک اُسکے مقام کو دشمن کا کمزور مقام سمجھے گا ! مختصر یہ کہ رسالۂ شاطرانہ کی جمعیتِ اصلیہ تین حصوں پر منقسم ہو

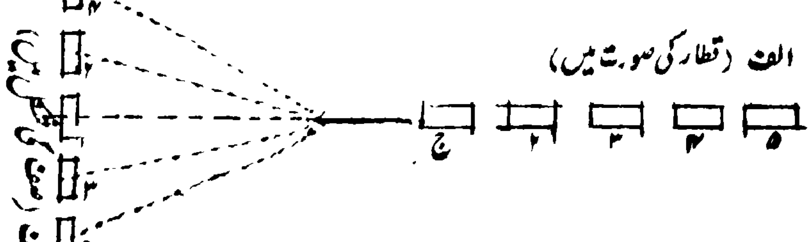
بڑھے گی ! ایک وہ حصہ جو برابر کی قوت پر تقسیم ہوکر ہر دستۂ اتصال تک پہنچے گا اور دستۂ اتصال میں شامل ہوکر یا تو خود جماعت ہائے آزمایشی تک بڑھ جائے گا یا انکو پیا ہو کر اپنے میں شامل ہو جانے کا حکم دے گا ؛ دوسرا وہ حصہ جو دشمن کا کمزور مقام معلوم ہو جانے پر اس جگہ غیر معمولی قوت کے ساتھ زور ڈالے گا اور صف توڑنے کی کوشش کرے گا ؛ تیسرا وہ حصہ جو بطور حصۂ محفوظ کے عقب میں تیار رہے گا تاکہ دشمن اگر کسی جگہ غیر معمولی زور ڈالے تو مدافعانہ طور پر استعمال کیا جا سکے ! اسکے بعد دو صورتیں واقع ہو سکتی ہیں :- اول تو یہ کہ رسالۂ شاطرانہ دشمن کے رسالہ کی صف توڑنے میں کامیاب ہو جائے اس صورت میں وہ دُور تک بڑھتا ہوا چلا جائے گا اور اکثر اوقات دشمن کی پیدل یا توپ خانہ والی فوج پر جو عقب میں آگے بڑھ رہی ہوگی حملہ آور ہو سکے گا ؛ دوسرے یہ کہ وہ دشمن کے رسالہ کی صف توڑنے میں کامیاب نہ ہو ۔ اس حالت میں وہ محض دشمن کے رسالہ کو روکے رکھنے کی کوشش کرے گا تاکہ اپنی پیدل و توپ خانہ کی جمعیت اصلیہ اطمینان کے ساتھ اُسکے پیچھے صف بندی کر سکے ! یہاں یہ بھی سمجھ لیجیے کہ رسالۂ شاطرانہ کا افسر اپنے ارادہ اور دشمن کے حالات سے ، حملہ آور ہونے سے پیشتر اپنی فوج کی جمعیت اصلیہ کو اطلاع دیدیتا ہے ! اس اطلاع کے ساتھ ہی کُل فوج افسر اعلیٰ کی تجویز کے موافق پوری تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگتی ہے ! یہ ملحوظ رہے کہ رسالۂ شاطرانہ اگر دشمن کی صف توڑ کر اسکے توپ خانہ یا پیدل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تو بھی سوائے چند تیز و تُند حملوں کے پیدل فوج کے مقابلہ میں قدم جما کر عرصہ تک کبھی نہیں لڑے گا !

اس تمام طریقۂ پیش قدمی پر نظر ڈالنے سے یہ صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ میدان جنگ میں ابتدائی کارروائی فریقین کے رسالہ ہائے شاطرانہ میں پیش آتی ہے ! اوّل مختلف جماعتہائے آزمایشی دشمن کی جماعتہائے آزمایشی پر کہیں کہیں حملہ آور ہوتی ہیں ۔ اور پھر فریقین کے شاطرانہ رسالوں کی جمعیتِ اصلیہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتی ہے ! رسالوں کی جمعیت ہائے اصلیہ کا مقابلہ بہ نسبت جماعت ہائے آزمایشی کے زیادہ دیرپا اور تُند ہوتا ہے !

اسکے بعد تھوڑے عرصہ کے لیے دونوں طرف خاموشی چھا جاتی ہے اور فریقین کے رسالے اپنے دشمن کے عقب میں آنے والی جمعیت اصلیہ کے نقل و حرکت کو دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس اطلاع کو حتی الامکان بہم پہنچا لینے کے بعد رسالۂ شاطرانہ کا مقصد اصلی پورا ہو جاتا ہے اور اسی اثناء میں پیدل و توپ خانہ کی جمعیتِ اصلیہ اسکے پیچھے میدان کارزار میں پہنچ جاتی ہے: اسکے پہنچتے ہی رسالۂ شاطرانہ یا تو ایک بازو کی طرف ہٹ جاتا ہے اور یا قطعی عقب میں چلا جاتا ہے!

اب گویا جانبین کی افواج اصلیہ (Main armies) ایک دوسرے کے سامنے ہیں! اس میں بھی سب سے پہلے جماعتِ کشّافیہ (Scouts)، اسکے بعد ہراولِ پیشیں (Advance guards)، اور سب سے آخر میں جماعتہائے اصلیہ (Main bodies)!

یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ فوج ہمیشہ قطار کی صورت میں آگے بڑھتی ہے، لیکن مقابلہ کے لیے اُسے صف کی صورت میں ہونا لازمی ہے! جب تک کہ وہ قطار (Column) کی بجائے صف (line) کی شکل اختیار نہ کرے وہ مقابلہ نہیں کر سکتی! یہ بھی سمجھ لیجیے کہ بیس ہزار سپاہیوں کا ایک ڈویژن قطار کی صورت میں آگے بڑھتے ہوئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک، سڑک کا بیس میل لمبا حصّہ گھیر لیتا ہے: اب یہ ظاہر ہے کہ اس قدر لمبی قطار کو صف کی صورت اختیار کرنے میں پورا ایک دن صرف ہو جاتا ہے۔



اس شکل سے یہ سمجھ میں آ سکتا ہے کہ قطار (Column) سے صف (line) کی صورت کیونکر اختیار کی جاتی ہے! الف ایک ہراول فوج ہے جو پانچ حصوں میں منقسم ہو کر بڑھ رہی ہے!

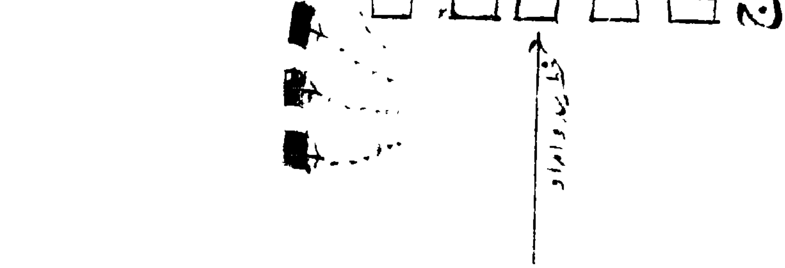
ہر حصہ کے افسر کے پاس میدانِ جنگ کا نقشہ ہے اور اُسکو اُس نقشے پر بتا دیا گیا ہے کہ اُسکا حصہ کہاں جائے گا! ج وہ مقام ہے جہاں تک ہر حصہ قطار کی صورت میں بڑھتا ہُوا اُسی سڑک پر آئے گا - یہاں سے ہر حصہ اپنے اپنے مقام کی طرف کٹ جائے گا - یعنی حصۂ اوّل سیدھا آگے جائے گا، دوم اُسکے داہنے بازو پر، سوم اسی کے (یعنی حصۂ اول کے) اُلٹے بازو پر، اور بقیہ حصّے اسی طرح ایک داہنے پر اور ایک بائیں پر!

پہلے دن ہراولِ پیشیں (Advance guard) صف کی صورت اختیار کرنے میں جغرافیائی حیثیت کے لحاظ سے تمام مقامی خصوصیات پر قابض ہو جانے میں، بہر دو آزمار ہتا ہے! مثلاً دریا کا کنارہ، اونچا ٹیلہ، آڑ کی جگہ، وغیرہ وغیرہ! دونوں طرف کے ہراول پہلے روز ایسے ہی مقامات پر قابض ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور جو جس مقام پر پہلے پہنچتا ہے وہی فوراً عارضی خندق کھود کر اُسکے اندر اُتر جاتا ہے اور جم جاتا ہے کیونکہ یہ طے شدہ ہے کہ صرف ایک شخص کو ہٹانے کے لیے جو خندق کی آڑ پکڑ چکا ہو کم از کم دو یا تین آدمیوں کی ضرورت ہے! اب یہ ظاہر ہے کہ فریقین کے ہراولِ پیشیں کی لڑائی اس قسم کی ہوتی ہے کہ چند نئے مقامات پر پہنچکر دشمن کو پیش قدمی سے روکنے اور خندق بنا کر آڑ پکڑنے میں کوشاں ہوتے ہیں اور چند دشمن کے چلے سے پہنچ جانے والوں کو خندقوں کی آڑ میں سے ہٹانے پر جد و جہد کرتے ہوتے ہیں! ہر جماعت اچھے مقام پر قابض ہونے کے لیے دوڑتی ہوئی اور لڑتی ہوئی نظر آتی ہے! اسی لحاظ سے پہلے دن کو اصطلاحِ علم الحرب میں (Day of frantic races) یا "روز تگاپو" کہتے ہیں!

یہ ظاہر ہو گیا کہ اوّل روز فریقین کے ہراول، میدانِ جنگ کے ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک، باہم مختلف مقامات پر جد و جہد کرتے نظر آتے ہیں! فوج کی جمعیتِ اصلیہ سے ہر مقام پر برابر کمک پہنچتی رہتی ہے اور اُسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف مقامات پر، جغرافیائی حیثیت سے، مقامی فوقیت حاصل کرنے کے لیے، چھوٹے چھوٹے حملے یا پیش قدمی روکنے کے لیے حملہ ہائے مزاحمانہ (Counter attacks) جنکو "جوابی حملے" بھی کہہ سکتے ہیں، فریقین

کے درمیان مسلسل پیش آتے ہیں ۔ تمام دن ایسے حملے اور مزاحمانہ کوششیں برابر جاری رہتی ہیں ۔ فریقین کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ دشمن کے مقابل میں اس خوبی سے صف آرا ہوں کہ اُسکا ایک رُخ دبالیں ۔ یہاں اور زیادہ بیان کرنے سے پیشتر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حصۂ صف آرا کو سمت کے لحاظ سے دو حصوں پر تقسیم کیا جاتا ہے ۔ اوّل قلب یعنی بیچ کا حصہ (Centre)، دوسرے دونوں بازو (wings یا flanks) ؛ سیدھے اور اُلٹے بازو کو میمنہ و میسرہ کہتے ہیں ۔ اب یہ سمجھیے کہ بازو دبانا یا اُلٹنا جسکو انگریزی میں باصطلاحِ علم الحرب out flanking کہتے ہیں کیا چیز ہے اور اس سے کیا فائدہ ہے ؟

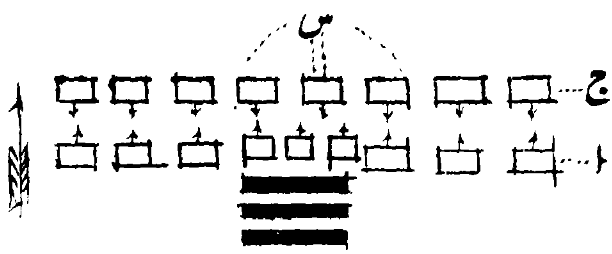
دراصل تمام رسد ، امداد یا کمک لڑنے والے حصہ کو عقب سے پہنچتی رہتی ہے ۔ عقب دراصل فوج کا حصۂ محفوظ ہے جو بہت پیچھے اسی لیے تیار رکھا جاتا ہے اور یہاں سے رسد و امداد وغیرہ کا سلسلہ برابر قائم رکھا جاتا ہے ۔ اُس راستہ کو جس پر سے یہ رسد و امداد قائم رکھی جاتی ہے بزبان علم الحرب (Line of communication) یا "خطِ رسد و امداد" کہتے ہیں ۔ اس خط کا تمام و کمال حملہ و مزاحمت کے خوف سے پاک ہونا نہایت ضروری ہے اور اسکو ہر طرف سے محفوظ رکھنا پہلا فرض ہے ۔ اسکے سمجھ لینے کے بعد یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی بازو کے دب جانے یا الٹ جانے سے یہ خط ایک جانب سے غیر محفوظ ہو جاتا ہے ۔ اس قسم کی نقل و حرکت کو "خطِ امداد کو خطرے میں ڈالنا" یا Threatening the line of communication کہتے ہیں ۔ پہلے روز صف آرائی کے وقت اسی کی کوشش کی جاتی ہے ۔



مذکورۂ بالا شکل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ فوج "ا" نے فوج "ج" کے مقابلہ میں اس خوبی سے صف بندی کی ہے کہ "ج" کا اُلٹا بازو بالکل دب گیا ہے اور اسکی وجہ سے خطِ امداد ایک جانب سے بالکل خطرہ میں پڑ گیا ہے! اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو خطِ امداد بالکل کٹ جاتا ہے اور ایسی صورت میں تمام حملہ آور صف جمعیت اصلیہ سے جدا ہو کر، کمک ورسد نہ پہنچنے کی وجہ سے، قطعی غارت ہو جاتی ہے۔ یا۔ تمام صف کو اس سرے سے اُس سرے تک بہت جلد اس قدر دُور ہٹانا پڑتا ہے کہ خطِ امداد پر دباؤ ڈالنے والے حصہ کو روکا جا سکے اور خطِ امداد کو محفوظ وقائم رکھا جا سکے! بعض اوقات جانبین اسی کوشش میں ایک بازو پر بہت دُور تک اور کافی عرصہ تک بڑھتے رہتے ہیں! اسکی مثال موجودہ جنگ میں صاف نظر آتی ہے! غالباً ۱۷ ستمبر ۱۹۱۴ء سے جرمن نے انگریزی و فرانسیسی فوج کا اُلٹا بازو اُلٹنے کی کوشش شروع کی! ادھر سے بھی یہی کوشش کی گئی۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دوسرے کا بازو دبانے کی کوشش میں فریقین (Soissons) سے شمال کی طرف برابر مقابلہ کرتے ہوئے بڑھتے رہے یہاں تک کہ ساحلِ بلجیم پر پہنچ جانے سے قدرت نے اس کارروائی کو روک دیا اور پھر نیوپورٹ (Nieuport) سے لِل (Lille) ہوتا ہوا بہت سے موڑوں کے ساتھ (Soissons) تک خطِ تقابل قائم ہو گیا!

اس مثال کو چھوڑ کر پھر اصل مطلب کی طرف رجوع ہو جائے! پہلا دن ختم ہونے کے بعد یا ابتدا کی صف آرائی کے بعد دوسرا دن شروع ہوتا ہے! اس روز فریقین مختلف مقامات پر محض آزمائشی حملے اور گولہ باری کرکے ایک دوسرے کی قوت کا اندازہ کرتے ہیں اور دشمن کا کمزور مقام معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں! اسوقت جنرل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے کمزور مقام کو ظاہر نہ ہونے دے اور فریق ثانی کو ایسا دھوکہ دے کہ وہ اُسکے زبردست مقام کو کمزور سمجھ کر اُس پر حملہ آور ہو اور آخر میں بُری طرح نقصان اُٹھا کر پسپا ہو! اب اگر جنرل کی غلطی سے دشمن کو کمزور مقام معلوم ہو گیا تو وہ یقینی اس مقام پر فوراً زور دیکر صف توڑ دے گا:-

(شکل بر صفحہ ۱۴)　　　و



(اس شکل سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوج "ا" نے فوج "ج" کا کمزور مقام "س" معلوم کرکے اسی جگہ غیر معمولی زور دیا ہے اور حملہ کرکے صف توڑنے کی کوشش کی ہے)

اگر بصورتِ دیگر فریقین کے جنرل اپنے اپنے کمزور مقامات کو چھپانے اور زد سے بچانے میں اس روز کامیاب رہے تو پھر پیش قدمی دونوں طرف سے بند کردی جائے گی اور دونوں طرف کے جنرل اپنے بڑے بڑے افسران کے ساتھ صلاح و مشورہ کریں گے۔ اس جلسۂ شوریٰ میں ایک ایک بات پر نہایت احتیاط کے ساتھ گہری نظر ڈال کر ایک رائے قائم کی جائے گی کہ کہاں کوشش کی جائے، کس مقام پر پوری طاقت کے ساتھ مختتم حملہ کیا جائے، اور بقیہ حصہ پر دشمن کو کس طرح مشغولِ پیکار رکھا جائے تاکہ زور دیے جانے والے مقام پر بقیہ اطراف سے ہٹا کر سپاہ مشغول نہ بلائی جاسکے۔ اس طرح ایک خطِ پیکار نقشہ پر بنایا جائے گا اور تمام حصۂ تقابل میں اس کی اطلاع دیدی جائے گی۔

اب یہ سمجھ لیجیے کہ حصۂ تقابل یعنی (Front) کیا چیز ہے؟ دوسرے الفاظ میں یہ فوج کا وہ حصہ ہے جو سب سے آگے بڑھا ہوا میدانِ کارزار میں صف آرا ہے۔ اس حصۂ تقابل کے بھی تین حصے ہیں:-

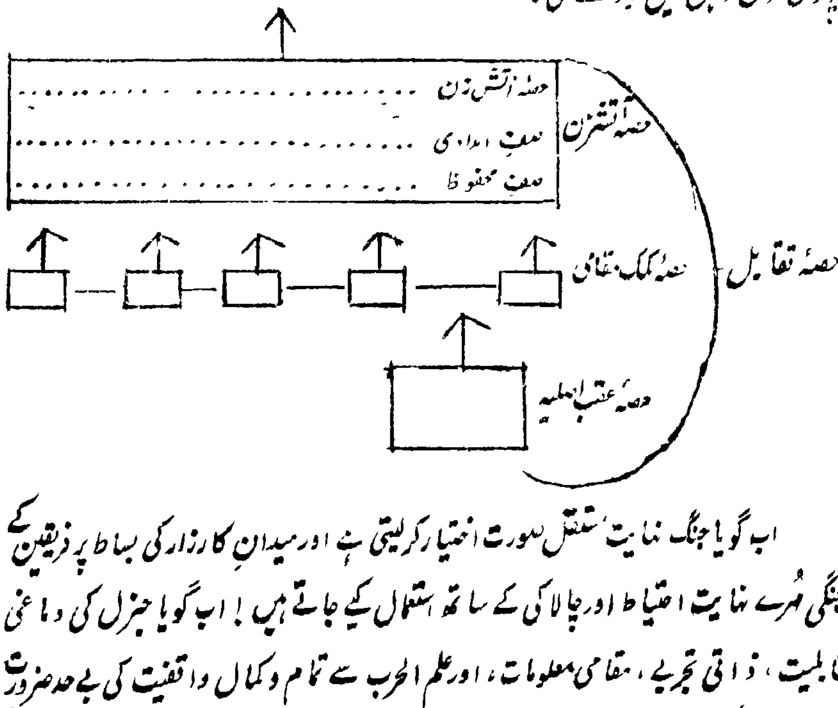
اوّل (Firing body) یا حصۂ آتش زن۔ اس حصہ میں آگے پیچھے تین صفیں ہوتی ہیں جن میں سپاہی ایک دوسرے سے دو قدم کے فاصلہ پر کھل کر کھڑے ہوتے ہیں۔ دوش بدوش مل کر کھڑے ہونے سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ دشمن کو نشانہ آسانی سے مل جاتا ہے۔ نیز گولیاں اور گولے جو دشمن کی طرف سے وہاں پھینکے جاتے ہیں زیادہ آدمیوں کو زخمی کردیتے ہیں۔ ان تینوں صفوں میں سے پہلی صف کو The firing line یا "صفِ آتش زن"

دوسری کو The supports یا "صفِ امدادی" اور تیسری کو The reserve یا "صفِ محفوظ" کہتے ہیں! یہ تینوں صفیں بالکل اسی طرح کام کرتی یا ٹوٹتی اور بنتی رہتی ہیں، جس طرح کسی سمندر کی تند و پُرشور موجیں ساحل کی پہاڑیوں پر ایک دوسرے کے بعد ٹکراتی ہیں اور فنا ہو جاتی ہیں! صفِ آتشزن کی کمی صفِ امدادی سے برابر پوری ہوتی رہتی ہے اور صفِ امدادی کی خلا صفِ محفوظ سے پُر ہوتی رہتی ہے! بعض اوقات دشمن کی تیز آتشباری کی وجہ سے زیادہ نقصان ہو جاتا ہے اور تینوں صفوں کی پوری جمعیت باقی نہیں رہتی، ایسی صورت میں آڑ پکڑ کر کمک کا انتظار کیا جاتا ہے جو عقب سے برابر آتی رہتی ہے، اور اس سے نقصان شدہ تعداد کی تلافی کیجاتی ہے! حملہ کرنے کی صورت میں۔ جو محض اُسوقت کیا جاتا ہے جبکہ دشمن کی گولہ باری کو اپنی گولہ باری سے سُست کر دیا جائے۔ صرف دو صفیں۔ یعنی پہلی اور دوسری۔ اس طرح آگے بڑھتی ہیں کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دونوں صفیں کم و بیش دس گز دوڑ جاتی ہیں اور رُک جاتی ہیں! جب صفِ محفوظ اُنکے پاس پہنچ جاتی ہے اور خلا کو پُر کر دیتی ہے تو پھر اُسی طرح وہ اور دس گز آگے بڑھ جاتی ہیں! جب یہ دونوں صفیں دشمن کے قریب تر ہو جاتی ہیں اور دشمن اپنی جگہ چھوڑ کر پسپا ہونے کے بجائے پوری طاقت کے ساتھ مدافعانہ آتشباری میں قدم جمائے رہتا ہے تو اکثر کثیر تعداد ضائع ہو جاتی ہے اور پھر یہ دونوں اُسوقت تک انتظار کرتی ہیں جب تک کہ کمکِ نو کے ذریعہ سے تینوں صفوں کی تعداد پھر از سرِ نو زندہ نہ کر دی جائے!

دوئم وہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں جو اکثر اوقات حصۂ آتشزن کے عقب میں اس لیے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر رکھی جاتی ہیں کہ دشمن کے مزاحمانہ حملہ کی صورت میں۔ یا۔ تیز آتشباری کی وجہ سے زیادہ تعداد ضائع ہو جانے کی صورت میں۔ فوراً امداد دے سکیں اور صف نہ ٹوٹنے دیں! ان جماعتوں کو علم الحرب کی زبان میں Local Reserve یا "مقامی کمک" کہتے ہیں! یہ بعض اوقات نہایت بیش بہا ثابت ہوتی ہیں!

سوئم وہ بڑا حصہ جو سب کے پیچھے محفوظ رکھا جاتا ہے! اسکو اصطلاحِ علم الحرب میں General Reserve یا "عقبِ اصلیہ" کہتے ہیں! اسکا استعمال دو موقعوں پر کیا جاتا ہے پہلے اُسوقت جبکہ فریقین بالکل دست وگریبان ہو جاتے ہیں۔ اسوقت یہ حصہ پوری طاقت کے ساتھ حملۂ مغلوبہ کی صورت میں آخری اور اختتامی کوشش کرتا ہے! دوسرے اُسوقت جبکہ دشمن کوئی ایسا ہی سخت مزاحمانہ حملہ کرکے پسپا کرنا چاہے تو اپنے آگے والے دونوں حصوں کو امداد دیکر پسپا ہونے سے بچا لیتا ہے!

اب آپ سمجھ گئے کہ حصۂ تقابل کے تین حصے کیے جا سکتے ہیں (۱) ایک حصۂ آتش زن جس میں تین صفیں ہوتی ہیں (۲) حصۂ کمکِ مقامی (۳) حصۂ عقبِ اصلیہ! اسکو ذیل کی شکل پوری طرح ذہن نشین کردے گی:-

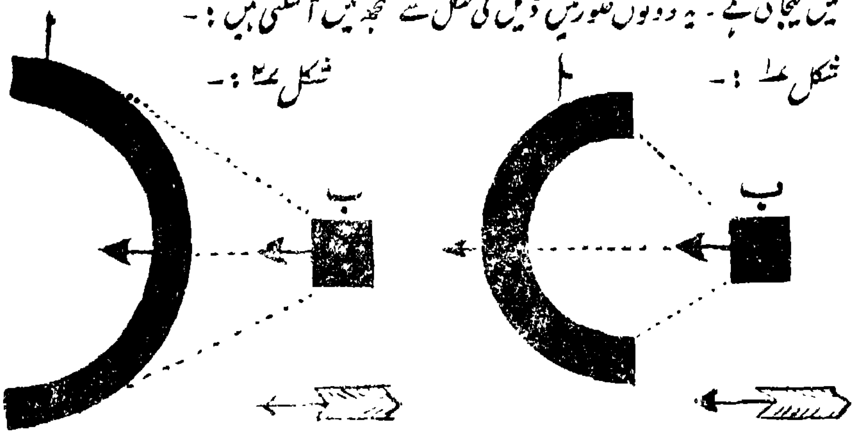


اب گویا جنگ نہایت مستقل صورت اختیار کرلیتی ہے اور میدانِ کارزار کی بساط پر فریقین کے جنگی مُہرے نہایت احتیاط اور چالاکی کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں! اب گویا جنرل کی دماغی قابلیت، ذاتی تجربے، مقامی معلومات، اور علم الحرب سے تمام وکمال واقفیت کی بے حد ضرورت ہوتی ہے! اگر حصۂ تقابل موجودہ جنگ کی طرح کوسوں یعنی "تلو، دو تلو میل" تک پھیلا ہوا ہو تو ہر جگہ نقل و حرکت نہایت احتیاط اور دوربینی کے ساتھ کیجائے گی! مختلف مقامات پر محض دھوکہ

دینے کے لیے حملے کیے جاتے ہیں تاکہ دشمن اُس طرف متوجہ ہو جائے اور وہ خاص مقام جہاں صف توڑنی مقصود ہے اُسکے خیال سے جاتا رہے! اکثر اوقات خود کچھ دور تک پسپا ہو جانا پسند کیا جاتا ہے جس سے کسی محفوظ مقام پر قدم جمانا حاصل ہو سکے، دشمن سے مقامی بلندی ہاتھ آئے، یا محض اس خیال سے کہ دشمن اس جگہ آگے بڑھ آئے تو اُسکے دونوں بازو دبائے جا سکیں!

یہاں ایک بات اور سمجھنے کے قابل ہے! وہ یہ کہ صف بندی کے بعد پیش قدمی دو صورت میں کیجاتی ہے۔ یہ دونوں صورتیں ذیل کی شکل سے سمجھ میں آ سکتی ہیں :-

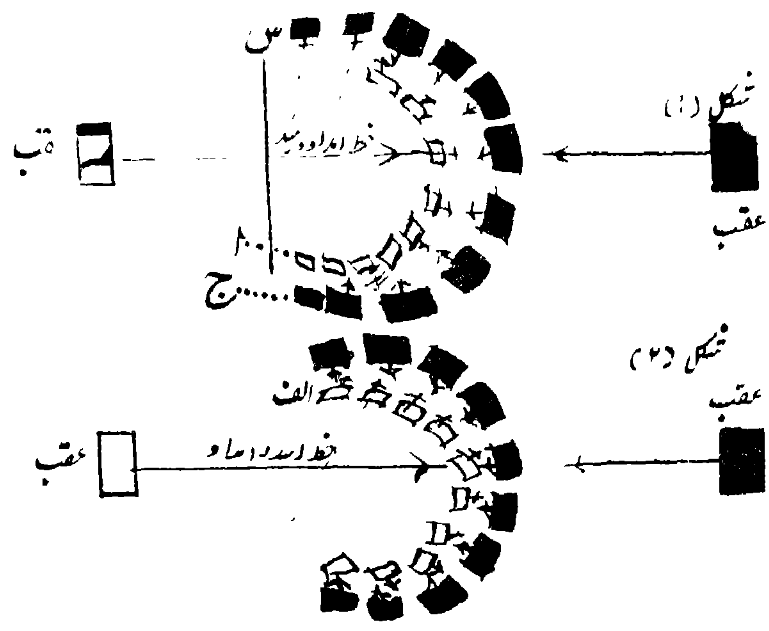
شکل ۱ :-　　شکل ۲ :-



اوّل شکل ۱ کو لیجیے۔ "ا" فوج کا حصۂ تقابل ہے اور "ب" اسی فوج کا عقب اصلیہ ہے جہاں سے تمام سامان رسد و امداد حصۂ تقابل کو پہنچائی جاتی ہے: شکل اوّل میں پیش قدمی اس طرح کے نصف محیط کی شکل میں کی گئی ہے کہ "عقب" اُسکا مرکز بنگیا ہے۔ یعنی دونوں بازو اندر کی طرف دبے ہوئے ہیں اور قلب آگے بڑھا ہوا ہے! اس صورت کو جنگی زبان میں Interior Lines یا "محیط اندرونی" کہتے ہیں! اس قسم کی شکل سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ حصۂ تقابل کے ہر مقام تک رسد و امداد نہایت آسانی اور حفاظت کے ساتھ پہنچائی جا سکتی ہے!

شکل ۲ میں بھی "ا" حصۂ تقابل ہے اور "ب" عقب اصلیہ ہے! اس میں پیش قدمی اس قسم کے محیط کی صورت میں کی گئی ہے جس کا مرکز اگر تلاش کیا جائے تو دشمن کی حد میں

واقع ہوگا ۔ اور عقب اس محیط کے باہر پیچھے کے رُخ قائم ہوگا ۔ یعنی دونوں بازو آگے بڑھے ہوئے ہوں گے اور قلب پیچھے ہٹا ہُوا ہوگا ۔ اس صورت کو اصطلاح علم الحرب میں Exterior lines ۔ یا "محیط بیرونی" کہتے ہیں ۔ ایسی صورت میں بازوؤں تک رسد و امداد پہنچانے میں نسبتاً دقت ہوتی ہے ۔ لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ اس صورت سے دشمن کا ایک بازو دبانے (Outflanking) یا قطعی دونوں جانب سے محیط کرلینے (Enveloping) کا بہت موقعہ مل سکتا ہے ۔



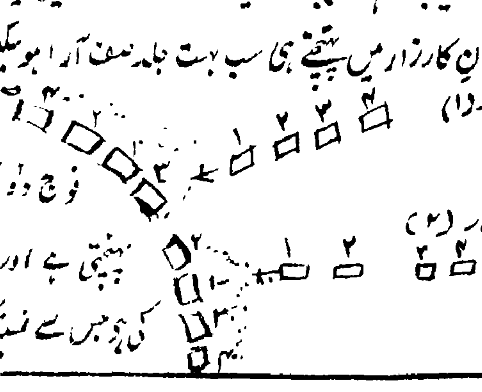
مذکورۃ الصدر دونوں شکلوں سے محیط بیرونی کی خوبی سمجھ میں آسکتی ہے ۔ شکل اول میں فوج "ج" نے فوج "ا" پر محیط بیرونی کی شکل میں اس طرح پیش قدمی کی ہے کہ فوج "ا" کا الٹا بازو بالکل دب گیا ہے اور اس طرف سے خط امداد و رسد خطرہ میں پڑ گیا ہے ۔ ایسی صورت میں "ا" کو اپنا حصۂ مقابل اس قدر دور ہٹانا ضروری ہے جس سے فوج "ج" کا دباؤ بچ سکے ۔ اس خط کو خط "س" سے اس شکل میں ظاہر کیا گیا ہے ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بازو الٹ جانے

کی صورت میں پھر حصۂ مقابل کا تھوڑی ہی دُور ہٹ کر قدم جما لینا نہایت مشکل ہے بلکہ تاریخ میں اسکی مثالیں بہت کم ہیں! چونکہ دشمن بھی ایسی حالت سے فائدہ اُٹھانے کے لیے برابر تیزی کے ساتھ دباتا چلا آئے گا اس لیے سیکڑوں میل ہٹنے کے بعد پھر قدم جمانے کا موقع ملسکتا ہے!

شکل (۲) میں فوج "ج" نے فوج "الف" کو بالکل محیط کر لیا ہے اور خط امداد و رسد قطعی غیر محفوظ ہوگیا ہے ایسی صورت میں فوج "الف" کا پیچھے ہٹنا یا اس محیط بلا سے نکل جانا تقریباً ناممکن ہے! اس طرح محیط ہو جانے کے معنی بالکل غارت ہو جانا ہیں!

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ دشمن پر حملہ آور ہونے کے لیے "محیط بیرونی" نہایت کارآمد اور نتیجہ خیز صورت ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ "محیط بیرونی" بنانے کے لیے فوج کی کثیر تعداد کی ضرورت ہے اور رسد وغیرہ پہنچانے کے لیے بھی تیز رفتار گاڑیوں کی بہت بڑی تعداد چاہیے! بعض اوقات بجائے محیط کے بازو خطِ مستقیم کی صورت میں بڑھے ہوتے ہیں اور محیط اندرونی و بیرونی کے بجائے زاویۂ اندرونی و بیرونی بناتے ہیں! جرمن زیادہ تر "محیط بیرونی" یا "زاویۂ بیرونی" کی صورت میں بڑھنے کے مشتاق ہیں!

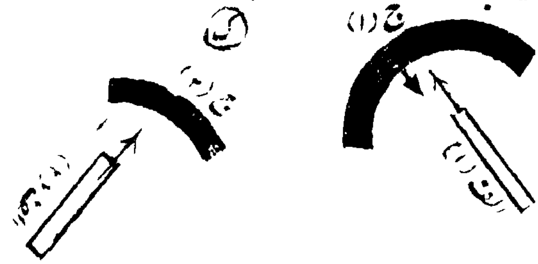
اس بات کا سمجھنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ فوج قطار کی صورت میں بڑھتے وقت اس قدر زیادہ لمبا حصہ سڑک کا گھیرتی ہے کہ صف کی شکل اختیار کرنے اور آخری رجمنٹوں کے پہنچنے میں بہت دیر لگ جاتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے! اسی وجہ سے اب یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ بجائے ایک قطار کے کئی قطاریں میلوں فاصلہ پر بڑھائی جاتی ہیں تاکہ میدانِ کارزار میں پہنچتے ہی سب بہت جلد صف آرا ہو سکیں۔ ذیل کی شکل سے یہ طریقہ سمجھ میں آ سکتا ہے!



(اس شکل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ایک فوج دو قطاروں کی صورت میں میدانِ جنگ میں پہنچتی ہے اور ہر قطار نے صف کی صورت ایک ساتھ اختیار کی ہے جس سے نسبتاً کم وقت میں تمام فوج نے صف بندی

کرلی ہے اور اس طرح تمام میدانِ کارزار میں بہت جلد پھیل گئی ہے!)

آج کل بجائے ایک قطار کے دو دو۔ تین تین قطاروں کی صورت میں ساری فوج مختلف مقامات سے ہوتی ہوئی گزرتی ہے مگر انکو اچھی طرح نقشہ پر بتا دیا جاتا ہے کہ میدانِ کارزار کہاں بنایا جائے! بلکہ وقت بھی مقرر کر دیا جاتا ہے تاکہ تمام قطاریں قریب قریب ایک ہی وقت میں میدانِ جنگ میں مختلف سمتوں سے پہنچکر صف آرا ہو سکیں! اس میں صف بندی میں بھی نسبتاً بہت کم وقت خرچ ہوتا ہے اور سب سے زیادہ یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ہر قطار مختلف شہروں اور راستوں سے گزرتی ہے اور میدانِ جنگ کے گرد و نواح کی اچھی طرح چھان بین ہو جاتی ہے مگر اس فائدہ کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا خطرہ بھی لگا ہوا ہے: وہ یہ کہ اگر دشمن کا رسالۂ شاطرانہ اس نقل و حرکت کو معلوم کر لینے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرف کے رسالۂ شاطرانہ کی صف توڑکر آگے بڑھ آیا تو پھر یہ قطاریں میدانِ جنگ میں نہیں پہنچ سکتیں اور ایک دوسرے سے جدا ہو جانے کے خطرہ میں پڑ جاتی ہیں۔ مثلاً شکل ذیل میں



الف اور ج " دو فریقین ہیں! الف کی فوج دو قطاروں کی صورت میں آگے بڑھ رہی ہے اور ہدایت کے موافق مختلف سمت و راستے سے دونوں قطاریں جا رہی ہیں! دونوں کا مقصد میدانِ کارزار میں پہنچکر صف آرا ہونا اور باہم مل جانا ہے۔ میدانِ کارزار ایک نقطہ ہے جہاں پہنچکر اجتماعِ اقطار (یعنی Synchronising the columns ہوگا) عمل میں آئے گا اور دونوں قطاریں مختلف سمتوں سے آکر ایک سلسلہ میں صف آرا ہونگی! لیکن دشمن کے رسالۂ شاطرانہ نے اس نقل و حرکت کا صحیح صحیح پتہ چلا لیا ہے اور الف کے رسالۂ شاطرانہ کی صف

توڑ کر آگے بڑھ آیا ہے جس سے فوج "ج" کو موقعہ مل گیا ہے کہ اُس نے الف کی دونوں قطاروں کو اپنے دو حصوں سے روک لیا اور میدانِ جنگ تک نہیں پہنچنے دیا! اب "ج" (۱) کا یہ کام ہے کہ وہ الف (۱) کو پسپا کرتا اور گھیرتا پیچھے ہٹاتے جائے۔ اور ج (۲) کا یہ کام ہے کہ الف (۲) کو محض بڑھنے سے جہاں تک ہو سکے روکے رکھے! ایسی صورت میں الف (۱) جدا ہو کر ج (۱) کا نشانہ بن جائے گا اور پھر ج (۱) دوسری سمت سے بڑھ کر الف (۲) کو گھیر لے گا! اس چال میں نپولین اعظم بہت مشاق تھا اور اپنی تمام عمر اسکو اکثر کام میں لاکر بڑی بڑی نمایاں فتوحات حاصل کرتا رہا! مگر یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس کوشش میں ناکامیابی کے معنی خود غارت ہو جانا ہے! نپولین اپنی تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ اس چال میں ناکام رہا اور اسی جگہ وہ غارت ہو گیا۔ یہ میدانِ واٹرلو کا واقعہ ہے جہاں وہ پرشیا والوں کو ولنگٹن کی فوج تک نہ پہنچنے دینے میں ناکامیاب ہُوا!

یہ ہے موجودہ میدان کارزار کی ابجد جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہو کہ جدید میدان جنگ بالکل ایک شطرنج کی بساط ہو جس پر ہر سمت مُہروں کو بڑھانا، ہٹانا، اور کٹانا پڑتا ہے! شاطروں کی صرف ایک غلطی تمام بازی کا رُخ پلٹ دیتی ہے اور جیتا ہُوا میدان ہاتھ سے جاتا رہتا ہے! فوجوں کو لڑانا اب محض شجاعت ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ نہایت دقیقہ سنج اور تجربہ کار دماغ کی ضرورت ہے! جدید علم الحرب کی تمام چالوں پر لکھنا تو ایک ضخیم کتاب کی شکل میں ممکن ہے مگر مذکورہ بالا امور کے سمجھ لینے کے بعد کم از کم جدید طریقۂ پیکار کا کچھ خیال قائم ہو سکتا ہے اور میدانِ جنگ کی نقل و حرکت میں دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے! چاہے طریقۂ جنگ کتنا ہی پلٹ گیا ہو لیکن اس پُرانے اور سچے ارشاد میں اب بھی مطلق فرق نہیں کہ۔

"اَلحَربُ خُدعَۃٌ"

سُلطان حیدر جوشؔ (علیگ)

شذرات

انسان ایک آفتاب ہے. مہر جہاں تاب سے بڑھ کر، جس کے عجوبہ دل کی آتش وہ تنویر اور تپش رکھتی ہے، جو مقیاس اور معیار سے باہر ہے ـ "امرسن"

مذہب خالص اور بے لوث خدا کے نزدیک یتیموں اور بیوہ عورتوں کی مصیبتوں میں شریک ہونا اور اپنے تئیں دُنیا سے ملوث نہ کرنا ہے ـ "جیمس اول"

رضائے الٰہی سے جو کچھ پیش آتا ہے میں اُس پر رضامند ہوں، کیونکہ میں خیال کرتا ہوں کہ جو کچھ میں پسند کروں گا خدائے تعالیٰ اُس سے بہتر پسند کرتا ہے ـ "ایپکٹیٹس"

قضاء کے پاؤں بہت نازک ہیں، کیوں کہ وہ اپنے قدم زمین پر نہیں رکھتی، بلکہ آدمیوں کے سر پر ـ "ہومر"

محبّت ایک نقرئی تار، اور ریشمی ڈوری ہے، جو دل کو دل سے اور جگر کو جگر سے، نیز جسم اور روح کو باندھ دیتی ہے ـ "والٹر سکاٹ"

موسیقی اصولِ فرائضِ انسانی کا ایک قانون ہے، جو تمام موجودات عالم میں روح پھونک دیتا ہے، دل کو بال و پر، تخیل کو طیران دیتا، غم کو مسرت سے تبدیل کر دیتا اور ہر شے میں جان ڈال دیتا ہے ـ یہ ایک جوہر نظام عالم ہے، اور ہر اچھی بھلی اور خوبصورت شے کی طرف جس کا یہ خود ایک غیر مرئی مگر حیرت انگیز، مجذوب اور ازلی جلوہ ہے!

رہنمائی کرتا ہے ۔　　　"فلاطون"

جس شخص میں موسیقی نہیں ۔ جو دلکش اور خوش گوار ترانوں سے متأثر نہیں ہوتا۔ وہ غارت گری، دغابازی اور بغاوت کے لائق ہے ۔　　　"شکسپیر"

کتابیں ہر ایک خود دار انسان کے پاس کم از کم ہزار ہونی چاہییں اور یہ ہزار کتابیں ایک ایسی الماری میں رکھی جا سکتی ہیں جو ۱۳ فٹ لمبی دس فٹ چوڑی اور چھ انچ گہری ہو ۔　"مارک ٹیلیس"

آمدنی کے لحاظ سے فی پونڈ ایک شلنگ کا خرچ کتابوں پر ایک ایسے کلرک کے لیے جو دوسو پونڈ سالانہ کماتا ہے میری رائے میں بہت کافی اور معقول ہے ۔　　"مارلی" (لارڈ)

اس سے زیادہ شرمناک امر کوئی نہیں کہ جس شخص کی سالانہ آمدنی ہزار پونڈ ہو اور وہ ہفتہ میں کتابوں پر محض ایک پونڈ خرچ کرے ۔　　"تیمپسن"

لٹریچر سب پیشوں میں زیادہ دلفریب، سب سے زیادہ دھوکا دینے والا اور سب سے بڑھ کر خطرناک پیشہ ہے ۔　　"مارلی" (اکسفورڈ ڈکشنری)

وقت ۔ بعض گھنٹے ایسے ہیں جو ہم سے لے لیے جاتے ہیں، بعض چرا لیے جاتے ہیں ۔ اور بعض کو ہم خود گنوا دیتے ہیں ۔ مگر جب ہم ان کو ہاتھ سے دے دیتے ہیں، تو پھر وہ کبھی ہم کو حاصل نہیں ہو سکتے ۔　"سینیکا"

اختر جوناگڑھی

عرضِ بیمار

پناہ اے عشق میں تو زندگی سے ہو گیا عاری — کہاں تک میری جانِ زار پر ہر دم شرر باری
دکھا دے اب اثر للہ اُس جذبِ حقیقی کا — کہ جس پر واقعی مبنی ہے تیری گرم بازاری
دے آرام دل کو آہ میرے راحتِ جاں کو — خبر کر دے کہ اے مصروفِ خود بینی و خود داری
برابر ہوتے ہیں ساعت بساعت غش غشی طاری — گزرتی ہیں ترے عاشق پہ فرقت کی شبیں بھاری
جو کچھ فصل ایک غش سے دوسرے کو ہو بھی جاتا ہو — تو اُتنی دیر تک رہتا ہے محوِ گریہ و زاری
زمانے بھر میں جس کا چارہ گر اک تو ہی تنہا ہو — غضب ہو وائے قسمت اُس مریضِ غم کی بیماری
کبھی انجام اُس خونیں جگر کا تو نے سوچا ہے — بجائے اشک اب آنکھوں سے جسکی ہے لہو جاری
نہیں سوچا قسم کھا جاؤں گا ہرگز نہیں سوچا — مری جاں جھوٹ باقی ورنہ یہ خوئے ستمگاری
سُن اب مجھ سے نتیجہ خون رونے کا فقط یہ ہے — بہت جلد ہی مرے گا کشتۂ تیغِ جفا کاری
سبب یہ ہے کہ جب خوں روتے روتے رہ نہ جائیگا — رگوں میں زندگی کے واسطے کیا ہوگا پھر ساری
یہ سچ ہے وہ خود اپنی جان سے بیزار ہے لیکن — ضرورت کیا، اُٹھے دنیا سے شاکی دل آزاری
جو کھو بیٹھا ہو تیری یاد میں ہوش و خرد ظالم — نہ رکھ اُسکے لیے جائز تغافل اور خودداری
تجھے اپنا پابندِ محبت یوں ستم کرنا — یہ وہ طرزِ عمل ہے جسکو کہہ سکتے ہیں خوں خواری
سلوک ایسا کرے جانِ جہاں بیمارِ الفت سے — رہے بیچارہ مرتے مرتے محوِ شکرِ دلداری
یہ ظاہر ہے کہ جب تک سانس تب تک آس باقی ہے — بسا اوقات صحت پاتے ہیں برسوں کے آزاری
تعجب کیا کہ بچ ہی جائے وہ دم توڑنے والا — پرستاری میں تیری کاٹ دے پھر زندگی ساری
خدا کے فضل سے ایسا اگر ہو جائے پھر کیا ہے — وفا کے ملک میں سکہ ہو تیرے نام کا جاری
اگر مر بھی گیا مر جائے کہنے کو تو یہ ہوگا — کہ تو نے وہ کیا جو کچھ کہ تھا شایانِ دلداری
اب آگے اُسکی قسمت تھی نہ جاں بر ہو سکا مانی — کسی کا کیا اجارہ ہے یہی تھی مرضیٔ باری
کوئی نادان اگر بالفرض ملزم بھی تجھے سمجھے — تو پیدا ہو گی تیرے واسطے کیا اس میں دشواری
ہے اب بھی اک جہاں واقف ترے طرزِ تغافل سے — زمانے کی زباں پہ آج بھی یہ لفظ ہیں جاری

ترے کوچے کو وہ بیمارِ غم دار الشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور موت کو اپنی دوا سمجھے

مانی (جائسی)

دربارِ اودھ کے چند تاریخی مرقعے*

(۱)

نصیر الدین حیدر بادشاہ

یہ شخص خاندان میر محمد امین کا آٹھواں بادشاہ تھا۔

میر محمد امین سعادت خاں

ایک لڑکی جو سعادت خاں کے بھانجے منصور علیخاں کو بیاہی گئی۔ اور

نواب منصور علیخاں، سعادت خاں کے بعد جانشین ہوا۔

منصور علیخاں
|
شجاع الدولہ
|
آصف الدولہ
|
سعادت علیخاں
|
غازی الدین حیدر
|
نصیر الدین حیدر

میر محمد امین حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد تھے۔ جب ایران میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں تو انھوں نے وطن کو خیرباد کہا۔ اور ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔ یہاں لاہور پہنچ کر سعادتخاں کے نام سے مشہور ہوئے اور محمد شاہ رنگیلے کی تخت نشینی کے بعد اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ ایران میں ان کی ہمشیرہ ایک امیر جعفر بیگ سے منسوب تھیں۔ جعفر بیگ کے انتقال کے بعد یہاں بھائی کے پاس آگئیں۔ انکے بڑے لڑکے نواب منصور علیخاں صفدر جنگ سے سعادت خاں کی اکلوتی بیٹی کی شادی ہوئی اور ماموں کے بعد صفدر جنگ صوبہ دار اودھ ہوئے۔

۱۷۵۶ء میں نواب منصور علیخاں کے انتقال کے بعد انکے بیٹے شجاع الدولہ مسند نشین ہوئے

* دریافت ماخذ کے لیے نوٹ مندرجہ صفحہ آئندہ ملاحظہ ہو

انھوں نے دو لڑکے چھوڑے آصف الدولہ اور سعادت علیخاں - اوّل الذکر باپ کے مرنے کے بعد مسند نشین ہوئے - لکھنؤ شہر کو آراستہ کیا - گرد و نواح میں محلات بنائے - رومی دروازہ اور امام باڑہ انکی عظیم یادگاریں ہیں - مختصر یہ کہ لکھنؤ میں جس چیز کو پوچھو معلوم ہوگا کہ آصف الدولہ ہی کی بنوائی ہوئی ہے

آصف الدولہ لاولد مرے - انکی جانشینی پر بڑے جھگڑے ہوے - لوگوں نے مل کر وزیر علیخاں آصف الدولہ کے ایک متبنی کو گدی پر بٹھایا مگر سرجان شور نے اسے علٰحدہ کرکے سعادت علیخاں کو گدی دی -

سعادت علیخاں نے اپنے حسن انتظام سے بہت دولت جمع کی - اور اپنے بیٹے غازی الدین حیدر کو وارث چھوڑ کر عالم بقا کو سدھارے - غازی الدین حیدر نے اپنے وزیر آغا میر کی صلاح سے یہ نمک حرامی کی کہ بادشاہ دہلی سے قطع تعلق کرلیا اور خود مختار بن بیٹھا اور سکہ اپنے نام کا رائج کیا -

نواب غازی الدین حیدر کی صرف ایک لڑکی تھی لیکن گدی نصیر الدین حیدر کو ملی جسے نواب نے کہا کہ ایک لونڈی کے بطن سے میری اولاد ہے - مگر اصل میں نصیر الدین حیدر ایک دھوبی کا لڑکا تھا جو محل میں کپڑے دھویا کرتا تھا - یہ شخص نہایت دنی الطبع، بدتمیز، اور احمق تھا -

نصیر الدین حیدر کی بیبیوں میں سے ایک بی بی بنصیب سلطان بہو (یا سلطانہ بوا) تھی جس کا ذکر حضرت "ناظر" اپنے مضمون مولہ نوٹ میں کرچکے ہیں - ابتدائے شادی سے اسکی طرف نصیر الدین حیدر کی بے التفاتی رہی اور عرصہ تک غریب کو صرف بیس روپے روزانہ ملا کیے - اسکے بعد بہت سے لوگوں کے کہنے سننے سے دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ کر دی گئی - لیکن یہ اجازت نہ تھی کہ اپنے کمروں کو چھوڑ کر

نوٹ: یہ مضمون فانی پارکس کی کتاب وانڈرنگز آف اے پلگرم (Wanderings of a pilgrim) سے ماخوذ ہے جسمیں اس واقف کار مصنفہ نے ریزیڈنسی کارندوں وغیرہ سے پوری مدد لیکر حالات لکھے ہیں - اسی کتاب سے ناظر صاحب کا مضمون "بیگمات اودھ" بھی ماخوذ تھا جو الناظر کے جولائی نمبر میں طبع ہوچکا ہے - ان بیگمات کا حال چونکہ ایک مرتبہ طبع ہوچکا ہے اسلیے اس مضمون میں درج کرنے سے احتراز کیا گیا - ۱۲

کہیں آ جا سکے۔ میکے سے جو نوکر چاکر ساتھ آئے تھے سب یک قلم موقوف کردیے گئے اور بیگم کی حالت ایک قیدی کی سی رہ گئی۔ نہ تو نواب کبھی آتا۔ نہ اسکے رشتہ دار آتے اور نہ کسی شخص کو اجازت تھی کہ اس سے مل سکتا۔ مرزا سلیمان شکوہ آصف الدولہ کے زمانہ سے لکھنؤ میں رہتے تھے۔ اور انپر جبر کرکے یہ شادی کی گئی تھی مگر مرزا بھی غریب کیا کرتا۔ اسکے باوں بچے کچے تھے آخر کہاں کہاں پٹیلتا۔ آخرکار اس مصیبت زدہ دہلی کے شہزادے کو جون سنہ ۱۸۲۹ء میں نہایت ذلت کے ساتھ لکھنؤ چھوڑنا اور دھوبی کے لڑکے کو تیمور کی لڑکی دینے کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔

نصیر الدین حیدر کی اور بھی بہت رنگ برنگی بیگمات تھیں مگر بمقتضائے اَلجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْسِ ملکہ زمانی بیگم ایک چرکٹے کی غیر مطلقہ جورو سے حضرت[۱] کو بہت شغف تھا۔ اور کلوہ المعروف بہ کیواں جاہ جسکی ولیعہدی کے لیے نواب نے پاپڑ بیل ڈالے، اسی چرکٹے کا بیٹا تھا۔

ملکہ زمانی بیگم اِدھر اپنے بیٹے کیواں جاہ کی ولیعہدی کے منصوبوں میں تھیں کہ چھٹی جولائی سنہ ۱۸۳۶ء کو نواب صاحب کسی مقوی دَوا کے دھوکے میں نہ معلوم کیا کھا کے ایسے سوئے کہ پھر نہ اُٹھے۔ اور درباری اخبار مورخہ ۷۔ جولائی سنہ ۱۸۳۶ء میں یہ خبر سب لوگوں نے پڑھی کہ "بادشاہِ اودھ نصیر الدین حیدر آج انتقال فرما گئے۔ چند روز سے طبیعت علیل تھی مگر بہت زیادہ علیل نہ تھی۔ کوئی دوا کھائی تھی جسکے بعد فوراً ہی مرگئے۔ شبہہ کیا جاتا ہے کہ کچھ زہر دیا گیا ہے۔ کرنل لو (Low) ریزیڈنٹ محل شاہی میں جاکر بادشاہِ مرحوم کے چچا کو مسند پر بٹھانے والے تھے ہی کہ بادشاہ بیگم (مرحوم کی ماں) پندرہ سو سپاہیوں اور دو ہاتھیوں کے ساتھ محل شاہی کی طرف مرحوم کے بیٹے کو لیکر آ پہنچیں کہ اُسے مسند نشیں کریں مگر محل کے دروازوں کو بند دیکھکر اُنھوں نے حکم دیا کہ ہاتھیوں کی ٹکر سے دروازہ توڑ دیا جائے۔ چنانچہ محل میں داخل ہوکر اُنھوں نے مُنّا جان (فریدوں بخت) کو تخت نشیں کیا۔ اتنے میں کرنل لو بھی فوج لیکر آ گئے۔ مگر بیگم نے محل سے باہر جانے سے انکار کیا۔ آخرکار فوج کو حکم دیا گیا کہ انھیں زبردستی نکال دے۔

[۱] اس بیگم کا بھی ذکر "ناظر صاحب" اپنے مضمون میں کرچکے ہیں اسلیے زیادہ تفصیل سے یہاں گریز کیجاتی ہے۔ ۱۲

بیگم اور منا جان قید کر دیے گئے۔ اور کیپ گارڈ کے ساتھ کان پور بھیج دیے گئے۔ فوج ہٹا لی گئی۔ بیگم کی طرف والوں میں سے تقریباً ساٹھ آدمیوں کی جانیں ضائع ہوئیں اور کمپنی کے دو یا تین سپاہی مارے گئے۔ اس ہنگامہ میں مسٹر پیٹن (Mr Paton) اسسٹنٹ ریزیڈنٹ بھی سخت زخمی ہوئے کرنل لو نے بادشاہ کے چچا کو مسند نشیں کیا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ تخت کے بہت سے جواہرات لوٹ لیے گئے اور جس کے جو ہاتھ لگا، لیکر چلتا ہوا۔ ان میں سے بعض شہر سے کچھ فاصلہ پر پکڑے گئے ہیں۔ جب سے بادشاہ بیگم اور لڑکا کان پور پہنچے ہیں لکھنو میں امن و امان ہے۔ بادشاہ بیگم چنار گڑھ میں قیدی بنا کر رکھی جائیں گی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لڑکا بادشاہ مرحوم کی اولاد سے نہیں تھا بلکہ بیگم نے اپنے نفع کے لیے اسے ایک آلہ بنانا چاہا تھا۔"

خود نصیر الدین حیدر آخر میں کیوان جاہ اور منا جان کو کہتے تھے کہ میرے بیٹے نہیں ہیں۔ اور اس فکر میں تھے کہ انکی نئی بیگم قدسیہ محل سے کوئی اولاد ہو تو اسے ولی عہد بنایا جائے۔

(۲)

بادشاہ اودھ کے وزیر نواب حکیم مہدی

حکیم مہدی صاحب ایک ادنیٰ درجہ کے آدمی تھے۔ ابتدا میں بڑی کوششوں سے کہیں بیس روپے کی ملازمت ملی تھی۔ زمانہ نے یاوری کرنی شروع کر دی اور ستارہ کچھ کچھ چمکنے لگا۔ انکی دولتمندی کی ابتدا اس طرح بیان کیجاتی ہے۔ کہ حکیم صاحب کہیں دورہ پر تھے اور ہمراہ ایک بہت دولتمند ہندو بھی تھا۔ خیمے نصب تھے اور قنات کے اندر ہی بہت اخلاص کے ساتھ اس لچھمی کے پیارے ہندو غریب کو بھی جگہ دی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شب کو معلوم ہوا کہ ہندو غریب گزر گیا اور لاش اسکے عزیزوں کو جو کیمپ ہی میں تھے حوالہ کر دی گئی تاکہ اپنی رسم و رواج کے مطابق کریا کرم کر دیں۔ ہندوؤں میں وہاں رسم تھی کہ مُردے کو لڈو پہلے کھلاتے تھے پھر کریا کرم کی کوئی رسم ادا کرتے تھے۔ اب لڈو کھلانے کے لیے لاش کا مُنہ جو کھولا گیا تو گردن پہ دو سیاہ نشان نظر آئے۔ اور مُنھ کے اندر کسی کی انگلی ملی جو دوسرے پورے سے کتری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اسی شب کو یہاں حکیم صاحب کے ایک معتبر رازدا

نوکر کی انگلی دوسرے بورے سے کتری ہوئی پائی گئی۔ اس ہندو کا خزانہ حکیم صاحب کے ہتھے چڑھا۔ اور انکے تموّل نے ترقی کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ اسکے بعد حکیم صاحب نے بہت سے چوروں اور قزاقوں کو ملازمت میں رکھا۔ جو قتل وغارت کرتے، ڈاکے مارتے اور حکیم صاحب کا خزانہ بھرتے۔ غرض کہ حکیم صاحب اس طرح بڑھے اور رفتہ رفتہ بادشاہ کی نظروں میں کھب گئے۔ بادشاہ نے اپنا وزیر السلطنۃ بنایا۔ اور نواب منتظم الدولہ مہدی علیخاں بہادر خطاب دیا۔

ایک مرتبہ حکیم صاحب نے دیکھا کہ بادشاہ کی نظروں سے کچھ گرتے جاتے ہیں تو جھٹ ایک رنڈی کو اپنی لڑکی بتا کر بادشاہ کے نکاح میں پیش کر دیا جس نے جاتے ہی حضرت ظل سبحانی کو گانٹھ لیا۔ یہ واقعہ ۱۸۱۲ء کا ہے۔ اسکے ڈیڑھ سال قبل یہی رنڈی لکھنؤ ریزیڈنسی میں پچیس روپے رات پر ناچا کرتی تھی۔ اب بادشاہ کو یہ فکر ہوئی کہ حکیم صاحب کی بھی شادی اسکی ماں سے ہو جائے۔

زمانہ کی کج رفتاری اور بادشاہ کی بوقلموں طبیعت نے حکیم صاحب کو گھر بٹھا دیا۔ اب فتح گڑھ میں رہنے لگے۔ جس مکان میں آج کل فوجی اسٹیشن ہسپتال ہے اُسی میں ۱۸۳۵ء میں نواب مہدی رہا کرتے تھے۔ انکے ایک صاحب زادے بھی تھے جنھیں لوگ "جرنیل" صاحب کہا کرتے تھے۔ ۱۸۳۵ء میں ان جرنیل صاحب کی عمر کوئی چالیس برس کے قریب ہوگی۔ باوجود اِن تمام اوصاف کے جن کا ذکر اوپر ہُوا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ نواب حکیم مہدی کو رفاہ عام کے کاموں کی طرف بھی توجہ نہ تھی۔ فتح گڑھ میں اُنھوں نے ایک مدرسہ اور شال بافی کا ایک کارخانہ قائم کیا تھا۔ مسافروں کے پُل۔ گھاٹ اور سرائیں بنوائی تھیں۔ نواب صاحب کو گھوڑوں کا بھی شوق تھا اور اکثر چیتے سے ہرن کا شکار کیا کرتے تھے۔ آپ کے یہاں فتح گڑھ میں تعزیہ داری بھی ہُوا کرتی جہاں علموں اور تعزیوں کے علاوہ دکن کی رسم کے مطابق "نعل صاحب" رکھے جاتے تھے۔ "نعل صاحب" گھوڑی کے ایک نعل تھے جو ایک بانس کے سرے پر بندھے ہوتے تھے۔ مسز فانی پارکس تعزیہ داری کو اچھی طرح بیان کرکے لکھتی ہیں کہ

میں نواب صاحب سے ملی۔ انکے مکان پر گئی۔ مکان بہت شاندار ہے نواب صاحب دروازہ تک

مجھے سینہ کو آئے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اندر لیگئے - نواب صاحب خاصے وجیہ اور خوش اخلاق آدمی ہیں - انکے سر پر کام کی ہوئی ایک ٹوپی تھی - جسپر زربفت کی پگڑی بندھی ہوئی تھی - لباس سفید ململ کا تھا - گھر کے کمرے عجیب و غریب ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ کے چینی بازار کی کوئی دوکان ہے اور اعلےٰ و ادنےٰ سب قیمت کی اشیاء ملی جلی رکھی ہیں - کمرے کے وسط میں تمام میزیں بچھی ہوئی ہیں جن پر طرح طرح کی چیزیں رکھی ہیں - اِدھر اُدھر شیشے کے خانے سجائے ہوے رکھے ہیں جن میں دیواری گھڑیاں - جیبی گھڑیاں - دھوپ گھڑیاں - قطب نما - بندوقیں - پستول - تلواریں - اور دیگر مختلف اشیاء سجی ہوئی ہیں "

یہی عورت آگے چل کر لکھتی ہے کہ

۳- مارچ ۱۸۳۵ء کو حکیم مہدی مجھے اپنے گھر لے گئے - انکے زنانہ کے کمرے ملیے اور تنگ ہیں اور بجانب باغ ستونوں پر عمارت استادہ ہے جہاں تین فوارے چل رہے ہیں اور سنہری مچھلیاں حوضوں میں تیر رہی ہیں - بیگم صاحبہ کو مچھلیوں کا بہت شوق معلوم ہوتا ہے انکے پاس کچھ خوبصورت کبوتر بھی ہیں جو دانہ کھانے کے لیے فواروں کے پاس آتے ہیں - ہندستانی لوگ خاص کر لکھنؤ والے کبوتروں کی نسل کا خاص لحاظ رکھتے ہیں بعض نسلوں کی بہت قیمت مانگی جاتی ہے ..... یہاں زنانے میں بھی کئی ایک شیشے کے بڑے خانے اسی طرح سجے ہوے رکھے تھے جیسے اوپر بیان ہوے - کھڑکیوں کے بالائی شیشوں پر کہیں رنگین اور کہیں سادے انگریزی چھاپوں کے نشان تھے - ایک جگہ لارڈ ریوم کی تصویر بنی تھی ایک جگہ مشہور عورتوں کی نیم برہنہ تصویریں تھیں - پارلیمنٹ کے ممبروں کی تصویریں بکثرت تھیں کہیں بہار - گرمی و خزاں و سردی کے موسموں کی دیویوں کی تصویریں تھیں - مختصر یہ کہ زنانے کے اندر ان تصویروں کا یہ ایک عجیب و نادر مجموعہ تھا ..... میں سر پر ایک انگریزی زیور پہنے ہوے تھی جسے بیگم صاحبہ نے بہت پسند کیا اس لیے کہ مشرقی عورتوں کے ٹیکے سے وہ بہت مشابہ تھا - نواب صاحب کی پہلی بیگم کا جن سے انھیں بہت الفت تھی انتقال ہوگیا ہو

انکی لاش کئے (شاید کربلائے معلیٰ ہی) بھیجی گئی تھی مگر وہ وہاں تک نہیں پہنچنے پائی اور نہ معلوم کس طرح راستہ ہی میں نذرِ آب ہوگئی۔ یہاں اسے بہت منحوس سمجھا گیا۔ اس واقعہ کے چار سال بعد نواب صاحب نے دوسری شادی کی۔ یہ دوسری بیوی پہلی بیوی کی لونڈی ہیں۔"

نواب حکیم مہدی کو انگریزی میں خط لکھنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب فتح گڑھ سے کمشنری اُٹھنے لگی تو انھوں نے خیال کیا کہ کمشنر صاحب جو انکے ملاقاتیوں میں سے تھے وہ بھی فتح گڑھ سے چلے جائیں گے۔ انھوں نے نہایت خلوص کے ساتھ ایک عجیب غریب خط صاحب موصوف کو لکھا جس کا ایک جملہ یہ ہے۔

اُس شخص کی نسبت جسنے لے میرے پیارے دوست تمھاری جگہ تخفیف کرنے کا خیال کیا تھا میری یہ خواہش ہے کہ خدا اُسے جہنم رسید کرے۔	"As for the man who formed the idea of doing away with your appointment, my dear friend, may God blast him under the earth."

ایک دن صبح کو نواب صاحب مسز فانی پارکس سے ملنے کے لیے گئے تو اس لباس میں تھے خاکی رنگ کی کاٹ رائی (corduroy) کے برجس۔ پیروں میں سیاہ چمڑے کا بوٹ۔ ہاتھوں میں موٹے چمڑے کے دستانے۔ اسپر ڈھاکہ کی نہایت باریک عمدہ چکن کی چپکن۔ اس چپکن پر زردی مائل سرخ ساٹن کا ایک لباس تھا۔ جسپر سنہرا کام کیا ہوا تھا۔ سر پر بنارسی زربفت کی سرخ پگڑی اور ہاتھ میں ایک تلوار تھی۔ پیچھے پیچھے ایک خدمتگار حُقہ لیے ہوے تھا۔ اور نواب صاحب بہت مزے میں تھے۔

۱۸۳۷ء میں نواب صاحب کے پھر دن پلٹے اور بادشاہ کے یہاں یاد ہوئی۔ نواب حکیم مہدی پھر وزیر بنائے گئے۔ ۲۴۔ اگست کو بہت خوش خوش لکھنؤ کی طرف کوچ کیا۔ شہر سے نکلتے ہی ایک عجیب حادثہ پیش آیا جس نے اُنکی تمام مسرتوں پر پانی پھیر دیا۔ یعنی جس گھوڑے پر انکا نقارہ جارہا تھا وہ گر کر مرگیا اور ایک توپ بھی اُلٹ گئی۔ یہ نہایت بُرا شگون تھا۔ عجیب بات ہے کہ اسکے چند ہی مہینے بعد یعنی عین "بڑے دن" کے روز حکیم مہدی نے اس دارِ فانی کو خیرباد کہا۔ انکے بیٹے "جرنیل صاحب" نے جو خط مسز فانی پارکس کو لکھا تھا اُسکی نقل حسبِ ذیل ہے:-

"Dear Madam,
I have to inform you that my poor uncle Nawab Muntazim uddawlah Bahadur seserted this life at the decree and will of Providence, at half past three o'clock A.M. the day before yesterday, Monday the 25th inst, after a short illness of six days only; consequently seeing him any more in this world is all buried in oblivion. The Begam Sahiba tenders her kind remembrances to you.
With best wishes believe me to be dear madam
Yours very faithfully
Ushrafuddowlah
Ahmad Ali Khan
Bahadur"

جناب من

میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ میرے غریب چچا نواب منتظم الدولہ بہادر نے پرسوں دوشنبہ کو تاریخ ۲۵ ساڑھے تین بجے رات کے وقت صرف چھ روز کی مختصر علالت کے بعد حسب مرضی و حکم خداوندی اس عالم سے رحلت کی۔ بس اب اس دنیا میں اُنکو دیکھنے کی آرزو صرف طاق نسیان ہے۔ بیگم صاحبہ آپ کو بہت بہت پوچھتی ہیں۔ جناب مجھے اپنا نہایت درجہ خیر طلب تصور فرمائیں۔

آپ کا وفا شعار

اشرف الدولہ احمد علی خاں بہادر

(۳)

بادشاہ اودھ اور گورنر جنرل ہند کی ملاقات

جنوری ۱۸۲۷ء کی پانچویں تاریخ ہے۔ دریائے گنگا کے دوسرے کنارے پر اپنی سرحد میں بادشاہ اودھ غازی الدین حیدر کے خیمہ و خرگاہ پڑے ہوئے ہیں۔ دریا پر ایک خوبصورت کشتیوں کا پُل بنایا گیا ہے۔ کیمپ میں اس قدر آدمی، جانور اور خیمے نظر آتے ہیں کہ تل دھرنے کی بھی جگہ نظر نہیں آتی۔ ہاتھیوں کی تعداد دو ہزار کے قریب ہے اور اس سے زیادہ اونٹوں کی فوج ہے۔ اور ہر طرف ایک جم غفیر نظر آتا ہے۔

۶۔ جنوری کو گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنک کی آمد آمد کی خبر سنائی دی اور تمام کانپور میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ بادشاہی کیمپ میں کچھ جنبش سی نظر آنے لگی۔ کہا جاتا ہے کہ کل بادشاہ اور

گورنر جنرل ساتھ کھانا کھائیں گے۔ ساتویں تاریخ کو طلوع آفتاب کے پہلے ہی سے شاہی کیمپ میں نقاروں کی آواز اور توپوں کی گرج سنائی دینے لگی۔ اور معلوم ہوا کہ کشتیوں کے پُل سے اُترنے کا سامان کیا جا رہا ہے۔ صبح کے ابھی سات بجے ہوں گے کہ زرق برق سجے ہوئے ہاتھیوں اونٹوں اور فوجوں کی ایک بیٹھا رقطار پُل پر سے عبور کرنے لگی۔ اور جہاں گورنر جنرل کے خیمے پڑے ہوئے تھے اُس طرف کو جاتی نظر آئی۔ تمام راستہ ہاتھیوں اور اونٹوں سے بند تھا۔ گھوڑے دَوڑتے نظر آتے تھے۔ بندوقیں سر ہو رہی تھیں اور بادشاہ کوئی آدھے راستہ پر پہنچ گئے تھے۔

لارڈ ولیم بنٹنک نے آدھی دُور سے بادشاہ کا استقبال کیا۔ بادشاہ نے اپنے ہی ہودج میں ہاتھی پر اُنھیں بٹھا لیا اور اب دونوں ساتھ ساتھ سواروں اور پیدلوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کھانے کے خیمہ کی طرف چلے۔ یہاں جس خیمہ میں دعوت کا انتظام کیا گیا تھا لیڈی ولیم بنٹنک دیگر مہمانوں کو لیے انکے استقبال کے لیے کھڑی تھیں۔ بادشاہ کا ہاتھی پہنچا اور معمولی معانقہ اور آداب کے بعد تمام مہمان کھانے کے خیمہ میں گئے۔ یہ عجیب غریب سین تھا۔ ہندوستانیوں کے شاندار زرق برق لباس، اُونچے اونچے ہاتھی جن پر سُرخ مخمل کی سنہری کام کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں انگریزی فوج کی دُو رُویہ صفیں، اور دن کا سہانا منظر، سب نے ملکر ایک عجیب عالم پیدا کر دیا۔

آٹھویں تاریخ گورنر جنرل بازدید کی ملاقات کے لیے کشتیوں کا پُل عبور کرکے بادشاہ کے پاس آئے اور گنگا کے پار سرحدِ اودھ میں دونوں نے مِل کر کھانا کھایا اور بادشاہ نے گورنر جنرل کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی۔

دسویں تاریخ کو بادشاہ نے لکھنؤ کا قصد فرمایا اور بارہویں کو گورنر جنرل بھی روانہ ہوئے۔ اب یہاں لکھنؤ میں دعوت کے سامان ہونے لگے۔ محل سرتا سر آراستہ کیا گیا۔ اور مہمانِ عالیشان کی آمد آمد کا انتظار ہونے لگا۔ اٹھارہویں تاریخ کو گورنر جنرل معہ اپنی جماعت کے صبح کے وقت ہاتھیوں پر سوار ریزیڈنسی سے روانہ ہوئے۔ ہاتھی نہایت تکلف سے سجائے گئے تھے اور کوئی دقیقہ آراستگی اور تزک و احتشام کا رہ نہیں گیا تھا۔ جلوس کا منظر نہایت دلکش تھا۔ زرق برق جھولوں

اور عماریوں سے آراستہ ہاتھیوں اور اونٹوں کی قطاریں، ہندوستانی میزبانوں کے رنگ برنگی لباس، سواروں کے جلوس اور انگریزی فوج کا گورنر جنرل کے جلو میں ساتھ ساتھ چلنا، دیکھنے والے کو مبہوت کیے دیتا تھا۔ گورنر جنرل آدھے راستہ پر پہنچے تھے کہ بادشاہ آکر ملے اور اپنے ہاتھی پر بٹھا کر محل شاہی کی طرف لے چلے۔ یہاں کھانے کا انتظام نہایت خوبصورت سونے چاندی کے برتنوں میں کیا گیا تھا۔

کھانے سے جب فراغت ہو چکی تو ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے تمام مہمان جھکے۔ دریائے گومتی برآمدہ کے سامنے بہ رہا ہے، اور دوسرے کنارے پر بہت سے ہاتھی کھڑے جھوم رہے ہیں۔ انکی جوڑیں پہلے سے بندھی ہوئی ہیں اور فیلبان باہم چشمک زنی کر رہے ہیں۔ پہلے پہل ہاتھیوں نے لڑائی کی طرف رُخ نہیں کیا اور گو مہاوت چڑھے ہوئے گود رہے تھے مگر وہ نہیں جھکتے تھے۔ آخرکار دو ہاتھیوں کو انکے مہاوت کسی قدر پیچھے ہٹا لے گئے اور بیچ میں ایک ہتنی کو لا کر کھڑا کر دیا۔ جوں ہی ان کوہ پیکر جانوروں نے مادہ کو دیکھا غصہ سے آگ ہو گئے۔ اور قدم بڑھائے ہوئے ایکدوسرے کی طرف جھپٹے۔ پہلا حملہ دانتوں سے کیا گیا اور ایک دوسرے کو ڈھکیلنے لگا۔ ایک نے اپنی سونڈ سے دوسرے کی ٹانگ پکڑ لی اور پٹک دینے کی کوشش کی۔ اسمیں جب کامیابی نہیں ہوئی تو ایک نے دوسرے کی سونڈ کو لپیٹا اور اب گویا دراصل جنگ شروع ہوئی۔ جب دونوں کا غصہ بہت بڑھ جاتا اور اندیشہ ہوتا کہ کہیں کسی کو سخت صدمہ نہ پہنچ جائے، تو اُنکے سامنے آتشبازی پھینکی جاتی جس سے خوف زدہ ہو کر ہٹ جاتے۔ بیچارے مہاوت کی حالت اس لڑائی میں سخت خطرناک ہوتی ہے۔ ایک ہاتھی دوسرے کے مہاوت کو پکڑ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس حملہ سے بچنے کیلیے بڑی چُستی چالاکی کی ضرورت ہے۔

یہ جوڑ برابر چھوڑا دی گئی اور دوسری جوڑ لڑوائی گئی۔ ان ہاتھیوں کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ بالکل لڑنا نہیں چاہتے۔ سواروں اور پیدلیوں نے بھالوں سے گود گود کر انھیں کھانا شروع کیا۔ ایک ہاتھی کسی طرح بھی لڑنا نہیں چاہتا تھا مگر جب ایک دفعہ لڑنے لگا تو بہت بہادری

سے لڑا اور اپنے دشمن کو ڈھکیلتا ہوا دریا کی طرف لیچلا اور گومتی میں لیجا کر اُلٹ دیا۔
ہاتھیوں کی اور بہت سی جوڑیں لڑیں۔ جب یہ ختم ہوگئے تو گینڈے سامنے لائے گئے۔
اور ان میں لڑائی شروع ہوئی۔ ہزاروں آدمی پیدل اور گھوڑوں پر میدان میں چاروں طرف کھڑے ہوے تھے۔ جب گینڈے غصہ میں آئے تو اُنھوں نے لوگوں کی بھیڑ پر حملہ کیا جن میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔

برآمدہ کے سامنے گومتی میں ایک بادشاہی بجرا پڑا ہوا تھا جو بالکل مچھلی کی شکل کا تھا۔ جسکے سنہرے سفنے آفتاب کی شعاع سے جگمگا رہے تھے۔ ایک بند احاطہ میں جسکی دیواریں برآمدہ پر سے نظر آرہی تھیں سات آٹھ عمدہ جنگلی بھینسے بند تھے۔ ان بھینسوں پر دو شیر، ایک لکڑ بگھا، اور تین ریچھ چھوڑ دیے گئے۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ شیر جھپٹ کر بھینسوں پر حملہ کرینگے مگر اسکے بجاے وہ احاطے کی دیوار کے گرد سمٹ کر پیچھے ہٹنے لگے۔ بھینسوں نے تین تین چار چار کی ٹولی بنا کر ایک ساتھ حملہ کیا۔ حملہ کرتے وقت انکی سر زمین کی طرف جھکے ہوے تھے۔ جب شیر کے قریب پہنچے جو زمین پر پڑا ہُوا تھا تو کبھی ایسا ہوتا کہ شیر کچھ نہ بولتا اور خاموش پڑا رہتا۔ یہ حالت دیکھکر بھینسے بھی کبھی لَوٹ جاتے لیکن اگر کبھی شیر اُٹھکر پنجہ مار دیتا تو بھینسے سینگوں پر اُٹھا کر اُسے ہَوا میں پھینکدیتے اور جب وہ زمین پر گرنے لگتا تو پھر اوپر سے اوپر ہی لَوٹا دیتے۔ اس حملہ میں شیر زخمی ہوگئے۔ ریچھوں کی لڑائی سب سے زیادہ دلچسپ تھی اور ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے تھے مگر قبل اسکے کہ کوئی جان ضائع ہو چھوڑا دیے گئے۔

اسکے بعد مینڈھوں کی لڑائی ہوئی جن کی ٹکروں کی آواز دُور تک تڑاقے کے ساتھ آتی تھی۔ ایک گھوڑے اور دو شیروں کی لڑائی ہونے والی تھی مگر لیڈی ولیم بنٹنک اُٹھکر چلی گئیں۔ اور لڑائی ملتوی ہوگئی۔ کہتے ہیں کہ کچھ دن ہوے اس گھوڑے پر دو شیر چھوڑے گئے تھے اور اس نے دونوں کو مار ڈالا تھا۔

صبح سے شام تک یہ تماشا ہوتا رہا جسکے بعد سب لوگ اپنی اپنی فرودگاہ پر گئے۔ تین دن رہکر

گورنر جنرل بائیس تاریخ کو علی الصباح لکھنؤ سے رخصت ہوے۔

(۴)

تقریب جشن تاج پوشی مبارک

آئیے ہم آپ کو تھوڑی دیر کے لیے لکھنؤ کے اُس سب سے زیادہ دلچسپ اور پُر تکلف جشن کی سیر کرائیں جو شاہ عالم پناہ نصیرالدین حیدر کی تاج پوشی کی یادگار میں سالانہ ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس جشن کے لیے کوئی مہینہ یا تاریخ مقرر نہیں۔ بادشاہ سلامت خود اپنی مرضی سے جو دن تاریخ مقرر فرماتے ہیں اُسی روز جشن منایا جاتا ہے۔

پہلے زنانہ کا حال سُنیے۔ ایک ہفتہ پہلے سے اس جشن کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ سب سے زیادہ بادشاہ بیگم سرگرم ہیں۔ بہوؤں پر تاکید ہے کہ کوئی دقیقہ بناؤ کا رہ نہ جائے۔ محل کی زیب و آرایش میں خود بھی حصہ لے رہی ہیں۔ رنڈاپے کی وجہ سے انکے جسم پر کوئی زیور نہیں۔ انکے سوا بادشاہ مرحوم کی ایک اور نہایت حسین بیگم ہیں وہ بھی اسی طرح زیور اُتارے ہوے ہیں اور اپنے شوق کے مطابق انتظام میں حصہ لے رہی ہیں۔

خدا خدا کر کے یہ مبارک ساعت آئی۔ احاطہ محل کے اندر کے بڑے بڑے بڑے درختوں پہ جھولے ڈالے گئے۔ ڈال ڈال آراستہ کی گئی پتی پتی سجائی گئی۔ بیچ میں ایک فوارہ ہے جسکے متصل گنجان درختوں کی صفیں استادہ ہیں۔ دروازہ کے پاس اُردا بیگنیوں کی ایک رجمنٹ نقرئی عصا لیے کھڑی ہے۔ انکے لباس مردانے ہیں۔ حبشی خواجہ سراؤں کی خوفناک صورتوں اور ان مردانی عورتوں نے کسی قدر خوفناک منظر پیدا کر دیا ہے۔

نصیرالدین حیدر کی متعدد بیگمات ہیں۔ جن میں اصلی بیگم مرزا محمد سلیمان شکوہ بادشاہ دہلی کے بڑے بھائی کی صاحب زادی ہیں۔ بادشاہ بیگم سے جب انکا ذکر آتا ہے تو وہ ٹال سی جاتی ہیں اور دوسری بات چھیڑ دیتی ہیں۔ بادشاہ پر سب سے زیادہ رسوخ ملکہ زمانی بیگم کا ہے جو کبھی کبھی بندگان عالی کے کان بھی سہلا دیا کرتی ہیں۔ مگر ان سب بیگمات میں اگر کوئی ملکہ حُسن ہے تو وہ

آج محل ہے، جس کا نام شاہجہاں کی چہیتی بیوی ارجمند بانو کے نام پر بادشاہ نے رکھا ہے۔ یہ بیگم نہایت درجہ حسین اور خوبصورت ہے۔ چہرے کا نقشہ۔ آنکھیں اور پلکیں حد درجہ نازک اور بے عیب ہیں۔ ہاتھ پیر نازک، چھوٹے چھوٹے اور ایسے لچکدار کہ آہوِ رمیدہ بھی مات کھاتا ہے۔ لباس زربفتِ طلائی کا مرصع کار، وجواہر نگار ہے۔ بال بال میں موتی پروئے ہوئے ہیں جنکی لڑیاں زلفِ پیچاں کی زنجیر کے ساتھ ہم آغوش صراحی دار گردن سے گذر کے کمر تک پہنچتی ہیں۔ ہر لڑی کے آخر میں ایک بڑا سا موتی ہے اور کاکلوں کے چھلّے چاند سے چہرے پر بہت دلفریب معلوم ہو رہے ہیں۔ پیشانی پر ایک چھوٹا سا طلائی حلقہ آویزاں ہے جس میں بڑے بڑے بیضاوی موتی، نیلم اور پکھراج لٹک رہے ہیں۔ آنکھوں کے بیچ میں یہ موتیوں کا جھومر دیکھنے والوں کی آنکھوں میں چکا چوندھ ڈال رہا ہے۔ اس زیور کے اوپر ایک کلغی ہے جو اس موتیوں کی جھالر کو گرنے سے سنبھالے ہوئے ہے۔ کانوں میں سونے کی بالیاں ہیں جن میں چھوٹے بڑے موتی اور جواہرات جگمگا رہے ہیں۔ ناک میں ایک نتھ ہے اور گلے میں جواہرات کا طوق اور موتیوں کے مالے بکثرت پڑے ہیں جو اس نازنین کی صباحتِ جسم کے ساتھ چشمک زنی کر رہے ہیں۔ بدن پر کئی گز لمبی کلیوں کی ایک پشواز ہے جسکا بالائی حصہ صرف گردن کے پاس سے کھلا ہے اور آستینیں کہنیوں کے پاس سے وا ہیں اور دو حصے ہو کر اِدھر اُدھر لٹک رہی ہیں۔ جب وہ چلتی ہیں تو کئی عورتیں اُسکے پائینچوں کو اُٹھائے رہتی ہیں بدن کی حرکت سے اگر کہیں موتی و جواہرات دوپٹہ میں اُلجھ جاتے ہیں تو خواصیں دوڑ کر نہایت سلیقہ کے ساتھ سلجھا دیتی ہیں۔ اسی طرح کا بناؤ کم و بیش ہر بیگم کا ہے۔

اب زنانہ کے اس دلفریب منظر کو چھوڑ کر جسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا، آئیے ذرا مردانے کی سیر کریں۔ یہاں صاحب ریزیڈنٹ بہادر اور اُنکے ہمراہیوں کے لیے نہایت پُر تکلف دعوت کا سامان کیا جا رہا ہے۔ نیوتا پہلے ہی روانہ ہو چکا ہے۔ اِدھر میزبان اپنے ہاں تیاریاں کر رہے ہیں شاہی محل سجایا جا رہا ہے۔ تمام شہر کی آئینہ بندی ہو رہی ہے۔ سڑکوں پر بہت زیادہ اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اُدھر مہمان طرح طرح کے انتظام کر رہے ہیں۔ جلسے کے مطابق لباس کا انتخاب

کیا جارہا ہے۔ اور مشرقی و مغربی تہذیب کے سنگم کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

تیسری جنوری ۱۸۳۱ء کی صبح طرح طرح کے پیام مسرت لاتی ہے اور صاحب ریزیڈنٹ بہادر اپنے حوالیوں موالیوں سمیت بادشاہ کے ہاں دعوت کھانے روانہ ہوئے ہیں۔ راستہ ہی سے نہایت گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا جارہا ہے۔ اور ایک نہایت آراستہ کمرے میں لیجاکر بٹھائے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد جس کمرے میں کھانا چُنا ہوا تھا وہاں سب جاتے ہیں۔ بادشاہ کے ساتھ ایک طرف نواب منتظم الدولہ مہدی علیخاں وزیر السلطنۃ بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک طرف ریزیڈنٹ صاحب بہادر ہیں۔ نواب صاحب کھانے پر تو بیٹھے ہیں لیکن ایک ہاتھ میں بہت بڑے بڑے دانوں کی تسبیح ہے جو کھٹا کھٹ چلی جارہی ہے۔

بادشاہ نے اپنا حُقّہ نواب حکیم مہدی کو دیا اور پھر ریزیڈنٹ صاحب کو دیا۔ بادشاہی حُقّہ صرف خاص خاص لوگوں کو دیا جاتا ہے جیسے کہ گورنر جنرل۔کمانڈر انچیف۔ ریزیڈنٹ اور اسقف کلکتہ ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی عزت ہے اور بادشاہ کی طرف سے عین سرفرازی سمجھی جاتی ہے۔

کھانے کے بعد شاہ عالم پناہ دوسرے کمرے میں جاتے ہیں جہاں ریزیڈنٹ صاحب بہادر تمام آداب و مراسم کے ساتھ بادشاہ کے سر سے پگڑی علٰحدہ کرکے تاجِ جواہر نگار سر پر رکھدیتے ہیں اور بادشاہ سلامت اس جاہ و جلال کے ساتھ مسند پر رونق افروز ہوتے ہیں اور تمام اخوانِ ریاست اور امیر اُمرا کی نذریں گزرنے لگتی ہیں۔

سب سے پہلے کیواں جاہ آتے ہیں۔ یہ سب سے بڑے لڑکے ہیں۔ سن کوئی چودہ برس کا ہے۔ چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی رذیل نیچ قوم کا لڑکا ہے۔ سر پر لمبے لمبے پٹے ہیں۔ اور ہونٹ بھدّے نیچے کو لٹکے ہوئے ہیں۔ دانت اس سے بھی زیادہ خراب ہیں۔ لڑکے کی صورت دیکھتے ہی صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کس طبقے کا ہوگا۔ صاحبزادے صاحب کو بادشاہ کی طرف سے اسیوقت بنارس کی نقرئی وطلائی و بیز کمخاب کے پانچ خلعت یکے بعد دیگرے پہنائے جاتے ہیں سر پر ایک جواہر نگار عمامہ رکھا جاتا ہے اور لوہے آبدار و جواہرات کا ایک مالا گلے میں پہنایا جاتا ہے

ان تمام خلعتوں پر چار پانچ جوڑ کشمیری شالیں اُڑھا دی جاتی ہیں۔ اسکے بعد ایک تلوار۔ نیمچہ۔ اور ایک ڈھال عطا ہوتی ہے اور سواری کے لیے ایک ہاتھی۔ ایک گھوڑا۔ اور ایک پالکی مرحمت ہوتی ہے۔ اس سرفرازی کے بعد کیوان جاہ آداب بجا لاتے ہیں اور چند اشرفیاں نذر پیش کرکے اُلٹے پاؤں واپس جاتے ہیں۔

اسکے بعد ایک چھوٹے صاحبزادے فریدوں بخت کی باری آتی ہے۔ چہرے سے یہ ایک شوخ اور دلیر لڑکا معلوم ہوتا ہے اور اُسی طرح خلعت لیکر اور نذر دیکر آداب بجا لاتا ہوا واپس جاتا ہے۔

ان دونوں کے بعد وزیر السلطنۃ نواب حکیم مہدی کی باری آتی ہے۔ پہلے خلعت پہنایا جاتا ہے وہ چھوٹا پڑتا ہے اور صرف ایک ہی آستین ہاتھ میں چڑھتی ہے۔ کچھ رُعبِ شاہی اور کچھ خلعت کے بدن پر نہ آنے کی بدشگونی کے ڈر سے بدن میں لرزہ پڑ جاتا ہے۔ آخرکار حکیم مہدی بادشاہ کے سامنے لمبے لمبے پڑ جاتے ہیں اور اپنی پگڑی اُتار کر قدموں پر رکھ دیتے ہیں۔ شاہ عالم پناہ اسکے عوض میں ایک جواہر نگار عمامہ وزیر السلطنۃ کے سر پر رکھدیتے ہیں۔ اسکی تصویر یوں کھینچیے کہ ایک بڈھا شخص ہے جسے عمر کے وزن نے خم کر دیا ہے۔ سر بالکل چکنا تربوز کی طرح ہے اور بدن پر خلعتوں۔ شالوں اور تحفہ تحائف کا بار ہے۔ اور سر سے پیر تک کھڑا کانپ رہا ہے۔ ہاتھ سے انکس (   ) گر پڑتا ہے۔ اس شگون بد کو دیکھکر کانپ جاتا ہے اشرفیاں نذر دینے کے لیے ہاتھ میں لیتا ہے لیکن لرزے کی وجہ سے زمین پر تخت کے پایہ کے پاس گر پڑتا ہے۔ لوگ اسے منحوس سمجھتے ہیں کہ شاید اب دوبارہ نذر دینا اسے نصیب نہ ہوگا۔

اسکے بعد نواب معتصم الدولہ کی باری آتی ہے جو نواب غازی الدین حیدر کے نواسے اور حقیقی وارثِ تخت و تاج تھے۔ یہ ایک خوبصورت آدمی ہیں۔ آنکھوں سے تیزی اور چہرے سے نیکی و ذہانت ٹپکتی ہے۔ اِنکے آتے ہی بادشاہ کے چہرے پر شکنیں پڑ جاتی ہیں اور نہایت سردمہری سے انکی نذر قبول کیجاتی ہے۔ یہ دیکھکر کہ ایک شخص جو دراصل وارثِ سلطنت تھا ایک ایسے شخص کو

نذر دے رہا ہے جیسے سلطنت سے کوئی تعلق نہ تھا، سخت رنج معلوم ہوتا ہے۔

جس وقت یہ مراسم ادا ہو رہی تھیں بادشاہ کے سر پر جواہرات کی پنکھا ورہوتی جاتی تھی ایک انگریز نے جھپٹا مارنے کا خیال کیا، مگر یہ دیکھکر کہ ریزیڈنٹ خاموش کھڑا ہے اور جب اوپر سے جواہرات گرتے ہیں تو ہاتھ سرکا کر نیچے گر جانے دیتا ہے، یہ بھی چپ اُسی طرح کھڑا رہا۔ جب یہ جواہرات زمین پر گرتے تو خدمتگار اور چوبدار اُٹھا لیتے۔

عطائے خلعت وغیرہ کی رسوم ادا ہونے کے بعد مہمانوں کو ہار پہنائے گئے۔ پہلے یہ ہار بادشاہ موارید کے ہوتے تھے لیکن چار برس ہونے کو آتے ہیں کہ گورنمنٹ نے ایسے تحائف قبول کرنے کی ممانعت کر دی ہے اس لیے اب سونے چاندی کے بنائے جاتے ہیں۔ ہار کے بعد گلاب کا عطر ملا گیا ریزیڈنٹ کے بادشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے ملا۔ پان آئے۔ گلاب پاشی کی گئی۔ اسکے بعد بادشاہِ اودھ کو "بہت بہت سلام" کر کے تمام مہمان رخصت ہوئے۔

"آوازِ بازگشت"

غزل

از جناب حسرت موہانی

مر مٹیں گے جو غمِ ہجر کی ایذا ہے یہی — اک نہ اک روز ترے عشق میں ہونا ہے یہی
آج اغیار ہیں جو یار تھے کل تک کیا خوب — آپ کے دامنِ انصاف پہ دھبا ہے یہی
ناگوار اب ہے بہت تلخیِ ہجراں لیکن — تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا ہے یہی
یا ہماری ہی یہ قسمت ہے کہ محروم ہیں ہم — یا مگر اُنکی محبت کا نتیجا ہے یہی

یہ جو اک دردِ محبت کی خلش ہے حسرت
مقصدِ دل ہے یہی جانِ تمنا ہے یہی

ونٹرس ٹیل

سسلی (صقلیہ) کا بادشاہ لیونٹس جسکی پری جمال ملکہ کا نام ہرمونیا تھا۔ اور امن و امان کی دُنیا پر جسکی فرماں روائی تھی۔ جیسے کچھ اُسکی سلطنت میں شورش اور طوائف الملوکی کا نام نہ تھا ویسے ہی بادشاہ کے شبستانِ عشرت میں جامِ عیش اور ساقیِ ماہ وش کے سوا کسی کی رسائی نہ تھی۔

کنگ لیونٹس اور کوئن ہرمونیا میں جو الفت اور پیار تھا اُسے دیکھتے ہوے تو رات اور دن کے چوبیس گھنٹے عیش و مسرت کی سیج پر گزرتے تھے۔ مگر اسی صحبت عیش میں کبھی خوش مزاج لیونٹس کے دل کا کنول یادِ طفلی کی یادِ ہموم سے مرجھایا ہوا نظر آتا تھا۔ جب بچپن کے یار پولکسن کی گرما گرم صحبت اور پھر خواب میں بھی اُسکی صورت نظر نہ آنے کا خیال آ جاتا۔

اس شاد و کامراں بادشاہ کی یہی ایک آرزو تھی جو بر نہ آئی تھی۔ ورنہ کامیابی و عیش کا کوئی سامان نہ تھا جو یہاں مہیا نہ ہو۔ لیونٹس اور پولکسن نے اپنے بچپن کا زمانہ ایک ساتھ بسر کیا تھا۔ ایک ساتھ کھیلے کودے۔ پڑھے لکھے۔ پھر دونوں کے والدین کی اچانک موت نے ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔ جہاں سے جدا ہو کر دونوں کو اپنے اپنے ملک کی عنانِ حکومت اپنے ناتجربہ کار ہاتھوں میں لینی پڑی۔ جدائی کے وقت دونوں نے ایسا گہرا اثر لیا تھا کہ اب تک تازہ تھا۔

(۲)

آفتابِ عالمتاب اپنا نصف دائرۂ مسافت قطع کر کے نصفِ زیریں کی طرف جا رہا ہے۔ اُسکی حدت و تیزی، اُسکا نصف النہاری جاہ و جلال، اُسکا آنکھ میں چبھنا چوندھ پیدا کر دینے والا پُر رعب چہرہ زرد پڑ چکا ہے۔ اور اُسکی نیرِ وزہ آن پر ایمان لانے والوں کے "لَا اُحِبُّ الآفِلِیْن" کہنے کا وقت قریب ہے۔

خوشگوار خنکی ذی حس اجسام کو اپنا منت کش احساس بنا رہی ہے جنکا دھوپ کی تیزی سے ناک میں دَم آگیا تھا۔

پادشاہ وسلی معہ پادشاہ بیگم کے پُر تکلف اور خوشنما ایوانِ شاہی سے برآمد ہوکر خانہ باغ میں معروفِ گلگشت ہے۔ خانہ باغ اسوقت ہنرمندانہ کارسازیوں سے اور کچھ وقت کی سازگاری سے رشکِ چمن زار بہشت بنگیا ہے۔ سرو ہوائیں جنت سے سامانِ مسرت لارہی ہیں، نہریں اندازمیں کوثر وتسنیم کو مات کررہی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پرندے طیورِ جنت کی طرح شاخ درشاخ اُڑتے پھرتے ہیں۔ قدرت کے ان دلچسپ تماشوں کی سیر میں پادشاہ محو ہو رہا تھا کہ چوبدار نے سامنے آکر مجرائے شاہی عرض کیا اور خبر دی کہ شاہِ بوہومیا حضورا قدس واعلی کے ایوانِ معلے میں عنقریب مہمان ہونے والے ہیں۔ لشکر دارالسلطنت سے قریب آچکا ہے اور پیش خیمہ آگیا۔

اس خبر سے پادشاہ کا چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ جیسے کسی فتحِ عظیم کی خبر سے سلاطین کا دل بڑھ جاتا ہے اُسی طرح بادشاہ کا دل اسوقت اپنے پُرانے دوست کی آمد کی خبر سے بڑھ رہا تھا

پادشاہ نے تعجب سے پوچھا "بھلا میرے معزز مہمان کی سواری کتنی دُور ہوگی۔ اور کتنے عرصے میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے؟

چوبدار (دابِ شاہی کو ملحوظ رکھکر) عالم پناہ کے عالی وقار مہمان ایک گھنٹے کے اندرہی اندر قصرِ معلی میں داخل ہوجائیں گے۔ سواری دو تین میل کے فاصلے پر ہے۔

اسکے بعد پادشاہ نے سپہ سالارِ فوج کو طلب کیا اور حکم دیا کہ استقبالی والنٹیروں کا رسالہ دُور سے پادشاہ بوہومیا کا استقبال کرنے کو فوراً روانہ کیا جائے۔ اور حضوری باڈی گارڈ کا رسالہ فلڈرس سے آراستہ ہوکر بیرونِ شہر خیر مقدم کرے" بادشاہ کا یہ حکم سُن کر امتثالاً لِلاَمر سپہ سالار وہاں سے چلا گیا اور خود پولکسن کے انتظار کے مزے لوٹنے لگا۔ انبساط چہرے سے نمایاں تھا۔ بادشاہ بیگم (جو چہل قدمی میں پادشاہ کے ساتھ تھی اور تیز قدمی میں اسکا ساتھ نہ دیسکتی تھی) کچھ خوش رنگ پھولوں سے خوش فعلیاں کررہی تھی۔ کہ دفعتہً فوجی بینڈ کی خوشگوار گت سے

بادشاہ بوہیمیا کے وُرود کا مژدہ منتظر میزبانوں (بادشاہ و بیگم) کے کانوں کو سُنایا، بادشاہ فرطِ انبساط سے اُچھل پڑا۔ شہر کے اندر داخلہ ہوتے ہی سلامی کی توپیں سر ہونا شروع ہوئیں ایوانِ شاہی میں ایک باقاعدہ ہلچل پیدا ہوگئی۔ کہ سواری ایوانِ شاہی کے سامنے آ گئی۔ بادشاہ نے جوشِ مسرت سے مغلوب ہوکر بچپن کے بچھڑے ہوئے یار کے شوقِ دید میں ایوانِ شاہی کے صدر دروازے پر آکر مہمان کا استقبال کیا۔ دونوں آرزومند نگاہیں ملیں۔ کچھ قطرے آنسوؤں کے پہلی نظروں پر دونوں طرف سے نچھاور کیے گئے۔ پھر دونوں بادشاہ ایک جوشِ بیخودی میں باہم بغل گیر ہوئے۔ اور میزبان بادشاہ اپنے عالی منزلت مہمان کو اُسکے دونوں بازوؤں میں ہاتھ ڈالے ہوئے ایک ولولہ خیز انداز کے ساتھ لیکر آراستہ و پیراستہ سجے سجائے موتی محل میں داخل ہوا۔

(۳)

فلکِ کج رفتار تیری عربدہ پردازی ہمیشہ نئے رنگ دکھاتی ہے۔ جس طرح تجھے مایوس و مہجور کو پیکرِ مقصود سے ہم آغوش کرانے میں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ ویسا ہی اک آرزومند سراپا امید کے تخیلاتِ آرزو پر پانی پھیرنے میں بھی۔ تو خوش کرتا ہے۔ تو ترساتا بھی ہے۔ کہیں اختلاف دُور کرکے موافقت کے پھول کھلاتا ہے اور کہیں اختلاف کا ایسا بے نشان و گمان شوشہ چھوڑ دیتا ہے کہ ایسے دو دل جو باہم شیر و شکر اور قیدِ غیریت سے آزاد ہوتے ہیں۔ جو ایک جان دو قالب کا وجود ہوتے ہیں اور جنمیں سے ایک کی زندگی بغیر دوسرے کے نیم جانی اور تلخکامی سے گزرتی ہے جنکی ایک لحظے کی جدائی پہاڑ ہوجاتی ہے اُنکو دو دل اور دشمن جانی بناکر ایک کو دوسرے کا درپے آزار کر دیتی ہے۔

ہرمونیا کون؟ جو کل ملکہ ہرمونیا تھی اور جو بادشاہ کی آنکھوں کی پُتلی تھی۔ وہ جسکے پَیر میں آج قیدِ ستم کی بیڑیاں ہیں اور اُف کرنے کی مجال نہیں۔ وہ ملکہ ہرمونیا جسکی نزہت چشمِ بداندیش کی تاب نہ لاسکتی تھی۔ آج ہر طرح کی سختیاں جھیل رہی ہے۔ وا غضب

اُسکا پھول ساجسم، اور یہ ظلم وستم کے کوڑے۔ اُسکا کنول سا دل اور یہ مصائب کے لمڈورے کل جسکی خوشی مین بادشاہ کی خوشی تھی اور جسکا حکم حکم شاہی سے بالا تھا۔ آج بادشاہ کی نظر اُس سے ستم آفرین گردش دوار کے ایکا ونی اشارے میں ویسی پھر گئی کہ ان کلوں تیل ہی نہ تھا گویا" مہر والفت کا تو ذکر ہی کیا غیظ وغضب کی انتہا نہیں۔ آخر ا کوئی جرم ؟ تقصیر؟ واقعات ہم سے اور آپ سے پوشیدہ نہیں، اگر کوئی فی مظلوم ہرمونیا کی مہمان نوازی کے شریفانہ برتاؤ اور فرمانِ شوہری کی تعمیل میں اُسپر لگا دی گئی اور تمام مظالم کی جو اُسکی قیمتی جان پر ہو رہے ہیں، بنیاد قائم کی گئی تو اسکی کُنہ اگر آج نہیں تو کل ظاہر ہوکے رہیگی۔ اُسوقت رکیک الخیال حاسد، اور ضعیف رائے رکھنے والے بادشاہ کو خود اپنے کیے پر پچھتاوا ہوگا۔

پولکسن اپنے دوست لیونٹس کی پر شوق ملاقات اور شاہانہ ضیافتوں کا گہرا نقش اپنے دل پر لیکر ایک ماہ کے بعد واپسیِ وطن کا ارادہ ظاہر کر رہا ہے۔ لیونٹس کی طرف سے ابھی کچھ دن اور رہنے کا اظہار ہو رہا ہے۔ بادشاہ کہہ تھکا۔ اُس نے ملکہ کو اشارہ کیا کہ تم کہو شاید تمھارے کہنے کا کچھ اثر ہو۔ بچپن کے گہرے دوست گفتگو میں انداز بے تکلفی سے ہر طرح کہنے سُننے کا موقعہ تھا۔ ملکہ کی طرف سے حسب پاسے لیونٹس تہذیب وتکلف کے لہجے میں یہ سلسلہ جو چھڑا تو بیچارہ پولکسن عجب کشمکش میں پڑ گیا۔ اصرار بڑھتا گیا۔ مجبوراً تکلف اور حجتِ لطیف کے مقابلے میں قدرتی انفعال نے اُس سے فسخِ عزیمت کرا دیا اور پولکسن رہ پڑا۔

اب سُنیئے! فوری مسرت لیونٹس کو پولکسن کے رہنے سے تو ضرور ہوئی مگر اُسکے کینہ جو دل میں ایک چور سا پیدا ہو گیا۔ جس نے اُس تنگ خیال کوتہ اندیش بادشاہ کے خیالات اسکی توجہ کی طرف مائل کیے کہ "کیوں پولکسن! میرے اصرار پر نہ ٹھہرا اور ملکہ کے کہنے پر ٹھہر گیا" اور ملکۂ عصمت کی طرف سے بادشاہ نے خیالات فاسد پیدا کر لیے۔ جسکی پاکبازی وعفاف کا ایک عمد

تک اُسے تجربہ ہوچکا تھا۔ اور پولکسن سے بھی بادشاہ بدظن ہوگیا۔ جسکا لازمی نتیجہ اس بدبخت اور حاسد بادشاہ کی طرف سے اسکے سوا اور کیا ہوسکتا تھا کہ وہ امکانی آزار اُنکو پہنچائے چنانچہ اُسنے فوری کمیلو کو (جو اُسکے دربار کا ایک معزز کرسی نشین تھا اور بادشاہ کو اُسکی صائب رائے کا اکثر تجربہ ہوا تھا اس لیے بادشاہ اکثر نازک خانگی و ملکی امور میں اُس سے پرائیوٹ مشورہ بھی طلب کیا کرتا تھا) طلب کیا۔ اور سارا ماجرا اُسے کہ سُنایا، اور حکم دیا کہ "تم فوراً پولکسن کو زہر دینے کی تدبیر کرو۔ ہرمونیا کے لیے سوچ کر کوئی حکم دیا جائے گا۔"

(۴)

رات کے دس بج چکے ہیں۔ گیارہ کا عمل ہے۔ کمیلو اپنے کمرے میں خاموش بیٹھا خیالات میں غلطاں و پیچاں ہے کہ (بولے) خانساماں نے آکر عرض کیا "میز تیار ہے"

کمیلو ! (جیسے غنودگی سے کوئی ہوشیار ہوجاتا ہے) چونک کر۔ "میز چُنا گیا؟"

بولے "سب تیار ہے۔ سرکار تشریف لے چلیں۔"

کمیلو کرسی سے اُٹھا، آفس کلاک کی طرف وقت دیکھنے کو اُسکی نگاہ اُٹھی تھی کہ کلاک نے ٹن ٹن گیارہ بجائے۔ کمیلو کھانے کے کمرے میں گیا۔ میز پہ بیٹھا۔ دو چار چیزیں لیں، کچھ کھایا، اور نام کرکے فوری اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کھانے کے کمرے سے نکل کر خلافِ معمول آفس روم میں پھر آگیا۔ کیونکہ ڈرائنگ روم سے نکل کر پندرہ منٹ تک کھُلے برآمدے میں اُسکا چہل قدمی کرنا اُسکا معمول بہ تھا۔ مگر آج کسی گہری فکر کے آثار اُسکے بشرے سے نمایاں ہیں۔ جس سے اُسکے اندرونی پیچ و تاب کی کیفیت صاف ظاہر ہورہی ہے۔ کمرے میں آکر وہ لکھنے کی میز کے سامنے کرسی پہ بیٹھ گیا۔ پھر سر کرسی کی پشت پر ٹیک اور آنکھوں کو بلند کرکے چھت کی طرف دیر تک دیکھتا رہا۔ اور کچھ الفاظ اُسکے مُنھ سے مدھم آوازیں نکلنے لگے۔ کہ "ہا تھا" میں بادشاہ کے حکم سے پولکسن کو زہر دُوں۔ ارتکاب زہرخورانی سراسر خلافِ قانون، خلافِ اخلاق، اور شرافت سے بعید ہے۔ پھر بادشاہ کو کیا جواب دوں؟"

"یہ مجھے معلوم ہے کہ بادشاہ کی برافروختگی محض حاسدانہ و ظالمانہ ہے۔ پولکسن اور ہرمونیا دونوں جس کا شکار بننے والے ہیں۔ پھر کیا میں ان میں سے کسی کی امداد کر سکتا ہوں؟ ہرمونیا پر میرا دسترس نہیں، البتہ پولکسن کو بادشاہ کی اس گھات کی اطلاع قبل از قبل دے دوں تاکہ وہ اپنا بچاؤ کر سکے۔ اسکے پھندے سے نکل جائے۔ مگر پھر میری خیر نہیں۔ بادشاہ یہی سمجھے گا کہ میں ہی اُسکا بھیدی تھا۔ اُسکا شبہ میرے سوا کس پر ہوگا مگر ملکہ کو اس پنجۂ ظلم میں چھوڑ دینا سراسر بزدلی ہے۔ اچھا کوئی تدبیر سوچوں گا۔ بالفعل پولکسن کو خبردار کر دینا چاہیے۔ جسکی جان جوکھوں ہو رہی ہے" یہ کہتے ہوئے وہ سنبھل کے بیٹھا۔ سگار بکس اٹھا کر اُس میں سے ایک سگار جلایا اور پینے لگا۔ سگار پیتا تھا اور بطور شغل اُنگلی اُسپر مار کر اُسکی خاک گراتا تھا۔ یہ کرتے کرتے وہ کرسی سے اٹھا اور سیاہ سوٹ پہن کر اپنے بنگلے کے کمپونڈ سے نکلا۔ اور کچھ ٹھہر کر سوچنے لگا۔ پھر قدم اُٹھایا، اور شاہ بوہیمیا کے کیمپ کی طرف چل نکلا۔ چلنے کو تو چلا مگر دل سینے میں اچھل رہا تھا۔ پیر چلتے چلتے رک جاتے تھے خیر! بدقت تمام وہ کیمپ کے قریب پہنچا۔ تو گشتی پولیس نے اُسے روکا، مگر اُسے اطمینان بخش جواب دے کر وہ کیمپ میں داخل ہوا۔ شاہی خیمے کے پاس پہنچتے وقت بھی سنتری نے روکا۔ مگر کمیلو نے اُس سے کچھ آہستہ آہستہ باتیں کیں اُس نے پردہ اُٹھا کر اندر کے پہرے والے سے کچھ کہا۔ اور چند منٹ کے بعد کمیلو اُسکے توسط سے اندر جا کر باریاب ہوا۔ اسکے کہنے کی ضرورت نہیں کہ کمیلو نے اپنی اخلاقی سفارت کس خوب صورتی سے ادا کی اور کس کشادہ دلی سے اُس کا خیر مقدم ہوا۔

بہرحال کمیلو اور پولکسن کا ایک عرصے تک تخلیہ رہا۔ اُسکے بعد بادشاہ نے داروغۂ اصطبل کو طلب کیا، جسے دو خاص سواری کے آراستہ و تیز دم گھوڑے اور چار سواروں کی حاضری کا حکم دیا گیا۔ اور پھر اپنے مشیر خاص کو بُلا کر اُس سے کسی خاص امر میں مشورہ کیا۔ اتنے میں اصطبل سے گھوڑے اور سوار تیار ہو کر آ گئے۔ چوبدار نے اطلاع کی۔ بادشاہ اور کمیلو

دونوں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور کیمپ سے باہر ہوتے ہی ہوا رفتار گھوڑے جنوب و مغرب کی سمت اُڑا دیے گئے۔

(۵)

ملکہ ہرمونیا اپنے خوب صورت و آراستہ شیش محل میں ایک یورپین کرسی پر بیٹھی ہے اور سامنے ایک دوسری چھوٹی کرسی پر خوب صورت شاہزادہ (   ) دیدہ زیب چشم ما دور ہے۔ شاہزادہ اپنی پیاری پیاری باتوں سے ماں کے دل کی کلی کھلا رہا ہے۔ مگر ملکہ اسوقت ایسی غمگین ہے کہ اُسکا کمھلایا ہُوا چہرہ اُسکی دلی کاوشوں کا اظہار کر رہا ہے۔ خوب صورت اور کم سن شاہزادے نے اپنی مادرِ مشفقہ کی بےچینی کا اثر اپنے ننھے سے دل پر جب محسوس کیا تو بمقتضائے جوشِ خون ماں کا غم غلط کرنے کے لیے بچپن کے پیارے لب و لہجے میں ایک سادہ حکایت بیان کرنی شروع کی۔

ابھی شاہزادے نے قصے کا آغاز ہی کیا تھا کہ معاً پادشاہ اس کمرے میں داخل ہُوا اور آتے ہی اُس نے شاہزادے کو ملکہ کے قریب سے اُنگلی پکڑکے اُٹھا لیا اور ہمراہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ ملکہ کے متعلق فرمانِ شاہی کی تعمیل کریں۔ اشارہ ہوتے ہی ملکہ اپنے محل سے دور ایک قطعۂ مکان میں پہنچا دی گئیں۔ اور اُنھیں بتا دیا گیا کہ وہ یہاں شاہی مجرم کی حیثیت سے تا حکمِ ثانی نظربند رہیں گی۔

ننھے دل کا شاہزادہ اس دل شکن نظارہ کے دیکھنے کی تاب نہ لاکر رو پڑا۔ مگر بادشاہ کی نظر میں ناسمجھ بچے کے بلا سبب رو دینے سے زیادہ اسکی وقعت نہ تھی۔

یہاں سے جاکر پادشاہ نے لارڈ کیلومنس اور لارڈ ڈین کو طلب کیا اور حکم دیا کہ ڈلفاس کے یونانی گرجا میں جاکر کلامِ عبرانی سے استخارہ کریں کہ ملکہ کے ساتھ جو تعذیر ہوئی ہے یا آئندہ ہونے والی ہے، ملکہ اُسکی مستوجب ہے یا نہیں؟

(۶)

بیگناہ ہرمونیا کو قیدِ تنہائی میں پڑے ہوئے آج کئی روز گزر گئے۔ اور جب سے وہ اس کال کوٹھری میں آئی ہے، سرد مہریِ زمانہ سے کچھ ایسی متاثر ہوئی ہے کہ ہر وقت اُسے یہ کھٹکا لگا رہتا ہے۔ دیکھوں اب آگے کیا پیش آتا ہے؟"

اسی اُدھیڑ بُن میں وہ اسوقت بھی لگی ہوئی تھی کہ باہر سے ایک خادمہ آئی جسکی گود میں ایک شیرخوار بچّی تھی۔ اُس نے عرض کیا کہ بادشاہ کے حکم سے میں شاہزادی کو آپ کے پاس لائی ہوں۔ ملکہ نے بچّی کو دیکھتے ہی اپنی آغوشِ شفقت اُسکے لیے پھیلا دی۔ جس کا اشارہ پاتے ہی بچّی اُس نووارد خادمہ کی گود سے اس مامتا بھری گود میں گر پڑی اور بلبلا کر ماں سے لپٹ گئی۔ ماں نے بھی اپنی کئی دن کی چھوٹی ہوئی بچّی کو پایا تو باوجود اندوہ و آلام کے اُسکا دل بالشوں بڑھ گیا۔ بھینچ بھینچ کر اُسے گلے لگاتی تھی۔ کبھی اُسکے پھول سے جسم پر ... تھی۔ جب اُسکی مامتا کا اُمڈا ہوا جوش کم ہوا تو یہ سوچ کر کہ خدا جانے اسے ... بچی دودھ ملا ہو یا نہیں، اپنی ایک چھاتی دی جس سے دودھ ٹپک رہا تھا۔ وہ اُسے دودھ پلا دیتی تھی اور فرطِ محبت میں بار بار سینے سے لگا لیتی تھی۔

(۷)

لیڈی اینٹگونس جو ملکہ کی ایک جاں نثار سہیلی تھی، قیدخانے کے دروازے پر آئی اور ایک محافظ عورت کو مخاطب کرکے کہہ رہی ہے کہ" بہن! ملکۂ مقید کو تم میرا ایک پیام سُنا سکتی ہو؟" محافظ عورت نے حامی بھری تو اُس نے کہا" ملکہ سے جا کر عرض کرو کہ آپ کی ایک وفادار کنیز عرض کرتی ہے کہ ننھی شاہزادی کو اگر آپ مجھے مرحمت فرمائیں تو جہاں پناہ کے روبرو لیجا کر انھیں اُس معصوم بچّی کا واسطہ دلاؤں۔ اور عفوِ تقصیر کی استدعا کروں۔ شاید کچھ اسکی معصومیت ہی پر ترس کھائیں اور اِس بیدادت باز آئیں"

یہ محافظ خادمہ فی الفور اندر گئی اور ملکہ سے سارا حال بیان کیا۔ ملکہ نے قدرتاً ل

کیا۔ اور پھر دل میں کچھ فیصلہ کر کے ٹھنڈے دل سے گلعذار ننھی شاہزادی کو اُسکے حوالہ کردیا کہ وہ سجا کر اُس فرشتۂ رحمت کے آغوش میں اُسے دے آئے۔

اس طرح جب پولینا کو ننھی شاہزادی مل گئی تو وہ سیدھی وہاں سے محل شاہی کو آئی اور بادشاہ کے روبرو حاضر ہوکر معصوم بچی کو بادشاہ کے پیروں سے چمٹا دیا۔ خود ہرمونیا کی داستانِ غم سنانے اور اُسکی بے قصوری بیان کرنے میں رطب اللساں ہوئی اور دیر تک رقّت کے لہجے میں یہ افسانہ بادشاہ کو سناتی رہی۔ مگر بادشاہ اس سے ویسا ہی برافروختہ ہو جیسے ہرمونیا کی قسمت اُس سے برگشتہ تھی۔ اور پولینا کو اپنے سامنے سے دُور دفان ہوجانے کا حکم دیا۔ پولینا خود تو بہ حیثیت مجبوری وہاں سے چلی آئی مگر شاہزادی کو فرش پر بادشاہ کے پیروں کے پاس پڑا رہنے دیا۔ کہ کاش! اُسکی یہ ادائے معصومیت ہی کچھ موثر ہوجائے۔ مگر اُس سنگدل بادشاہ پر اسکا جو اثر ہوا وہ یہی کہ اُس نے لارڈ اینٹی گونس (پولینا کا شوہر) کو بُلا کر یہ حکم دیا کہ وہ شاہزادی کو کسی جنگل بیابان میں جہاں کوئی آدمی ہو نہ آدم زاد لیجا کر چھوڑ آئے، تاکہ کوئی درندہ اُسکی زندگی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردے، مگر کسی کو اِسکی خبر تک نہ ہو۔ لارڈ اینٹی گونس اس جبروتی فرمان کی تعمیل کے لیے شاہزادی کو لیکر روانہ ہوا۔

(۸)

ڈلفاس جانے والوں کے انتظار سے اُکتا کر بادشاہ نے ملکہ کو طلب کیا تاکہ اُسکی فردِ جرم اُسے سنائی جائے۔

ملکہ بادشاہ کے حضور میں دست بستہ کھڑی ہے اور اپنی قسمت کا آخری فیصلہ یا انتہائی ذلت و رسوائی کے الفاظ سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہورہی ہے۔ کیونکہ اُسکے جذبۂ غیرت وحمیت نے اس رسوائی کی زندگی سے موت کو اُسکی نظروں میں بدرجہا بہتر بنا دیا ہے، جسکی وہ ہر لحظہ منتظر رہتی ہے۔ مگر اسوقت اُسکا استقلال چہرے سے حیا وعفت کی سرخی میں جھلک رہا ہے اور وہ ایک بے ساختگی کے ساتھ نظر پائیں کیے حکم اخیر پر اس طرح کان لگائے کھڑی ہے جیسے

کوئی خونی مجرم اپنی رہائی کی آس باندھے ہوتا ہے۔
معاملہ زیر غور تھا کہ ڈلفاس سے اہل کمیشن واپس آ گئے۔ چوبدار نے اطلاع کی۔ اور فی الفور اُنکی حضوری میں یاد ہوئی۔ اہل کمیشن حاضر ہوئے اور سربمہر خریطہ حضوری میں پیش کیا۔ چیف سکرٹری کو حکم ہوا کہ باآواز بلند اُسے پڑھکر سنائے۔ جس نے خریطے کی مہریں توڑ کے ایک تحریر (جسکے سرنامے پر انجیل مقدس کے میناکار حروف جگمگا رہے تھے) نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ مضمون یہ تھا:-

"ہرمونیا بیگناہ ہے" "پولکسن پر بے سروپا بہتان باندھا جا رہا ہے"۔ "کمیلو ایک وفادار اور سچا آدمی ہے"۔ "لیونٹس ایک حاسد، ظالم اور بیداد گر ہے۔ اُسکے تاج وتخت کا کوئی وارث نہ ہوگا۔ تاوقتیکہ جو دولت اُس نے کھو دی ہے اُسکے پھر ہاتھ نہ آجائے"۔

یہ الفاظ بادشاہ کے مدعا کے بالکل خلاف تھے۔ جنھیں سنکر اُسنے تامل کیا۔ دل میں کہا "ہو نہو اس میں سازش کو دخل ہے"۔ پھر ایک شخص کو ایما ہوا کہ ملکہ کے متعلق جو تجویز ابھی کی گئی ہے وہ سنائی جائے۔ وہ تجویز لے کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ ایک نرس (دایہ) نے حاضر ہو کر گلوگیر آواز میں نہایت ادب سے یہ بیان کیا کہ "جس وقت فرخ سیر شاہزادے نے یہ سنا کہ میری مادر مہربان مثل ایک شاہی قیدی کے دیوان خاص میں اپنا آخری فیصلہ سننے کے لیے لائی گئی ہیں فرط غیرت سے شاہزادے کی حالت متغیر ہو گئی۔ یہانتک کہ تھوڑے ہی عرصے میں ننھے دل کا کنول شرم و غیرت کے جھونکے سے ٹوٹ کر قضا، کے دریا میں غرق ہو گیا اور ایسا ڈوبا کہ پھر نہ اُبھر سکا"۔

یہ خالی الفاظ نہ تھے۔ بلکہ ان میں تیزی تھی۔ جو ایک اسیر ستم، قید و محبوس کے لیے اور خود قہرمان بادشاہ کے لیے تیر و خنجر تھے۔ جو اُن دونوں کے دل و جگر کے پار ہو گئے۔ بادشاہ نے تو سنتے ہی کلیجا دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور غریب ملکہ کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ اہل دربار

میں ایک سنسنی سی دَوڑ گئی

ایک سکوتِ بے خودی کے بعد پادشاہ نے آنکھیں کھولیں تو پولینیا کو ملکہ کے لیجانے کا اشارہ کیا۔ پادشاہ کی نظروں میں پولینیا کو اسوقت رحم و رقت کا لازوال رس دکھائی دیا اور وہ حسبِ ایما، اُسے وہاں سے لے گئی۔ ملکہ آپ سے نہیں بلکہ پولینیا کی رہبری کے سہارے سے وہاں سے چلی تو گئی، مگر اُسکا دل سرد اور چہرہ زرد تھا۔

پولینیا پھر آئی اور با دیدۂ گریاں بیان کیا کہ "ملکہ بھی اس عالمِ فانی سے گلشن یا دوانی کو چل بسیں"۔ یہ خبر نہ تھی جلتے ہوے توے پر پانی کا چھینٹا تھا۔ ملکہ کی بولتی چالتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اُسکے اوصاف، علم، وقار، اور عالی ظرفی متشکل ہو کر سامنے آگئے۔ اور اُسپر نفرین و ملامت کرنے لگے۔ سلبِ حواس اور قوّتِ واہمہ کے ہاتھوں حسرت و یاس کے صدہا مرقعے اُسکی نظروں سے گزر گئے۔ ان سب سے متاثر ہو کر پادشاہ کا دل مصروفِ نالہ و شیون تھا زبان جسکی ترجمان تھی :-

پیاری ملکہ ----- جان و دل سے زیادہ عزیز ملکہ ---- آہ! تو حسن کی دیوی، عشق و محبت کی تصویرِ مجسم اور وفا و عصمت کی موہنی مورت تھی۔ تجھپر ظلم ہُوا، تو نے افنہ کی، تجھپر بہتان باندھا گیا اور تو نے بُرا نہ جانا۔ خدا گواہ .... تو نے اس راہ میں شہادت کی موت پائی۔ تو ..... وہ تھی کہ کلامِ حق نے جسکی عصمت پر گواہی دی -- آہ! ملکہ --- مظلوم ملکہ --- وفا شعار ملکہ .... کا - کا کا -- کہتے کہتے پادشاہ غش کھا کر گرا۔ خدام آواز سُنکر دوڑے۔ اور سنبھال کر لٹا دیا۔ عنبر سارا کا لخلخہ سُنگھایا گیا۔ بادکش جھلا گیا۔ بہزار تدابیر دیر کے بعد پادشاہ نے آنکھ کھولی اور پھر آنکھ بند کر لی۔

اس حالت میں جو عالمِ رؤیا سے مشابہ تھی، بادشاہ کے سامنے کلامِ عبرانی کے الفاظ کی صداقت نمایاں ہونے لگی۔ کلامِ عبرانی کا ایک ایک فقرہ پیشِ نظر تھا۔ کلامِ عبرانی میں ملکہ کی

بیگناہی کا مضمون تھا۔ لیکن اب اُسکا دل خود اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ ایک بیگناہ کی
کلام عبرانی میں خود اُسکو ظالم ٹھہرایا گیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی گردن پہ ایک چھوٹی بچی کا دو لوگوں
کا خون پاتا تھا۔ یہ بھی وہ سمجھ رہا تھا کہ اب یہ دونوں لعل کھو کر وارثِ تاج و تخت کہاں سے
لائے گا۔ ان صدمات نے بادشاہ کو شکستہ دل کر دیا تھا جسکی وجہ سے عیشِ دنیا اس کی
نظروں میں تلخ ہو رہا تھا۔

اب اُسکی رہی سہی آس اگر کچھ تھی تو یہی کہ اگر اپنی کوئنس واپس آتا تو شیرخوار
شاہزادی کی تلاش و جستجو کے لیے پھر بھیجا جاتا کیا عجب ہو خدا نے اُس معصوم اور ننھی سی جان
کی حفاظت خود کی ہو اور اُسکے پاس کسی دشمنِ انسان درندے یا موذی کو پھٹکنے نہ دیا ہو۔
خدا ایسا بھی کرتا ہے کہ جو جانیں اس طرح معرضِ ہلاکت میں ڈالی جاتی ہیں اُنکی حفاظت کے
سامان غیب سے پیدا کر دیتا ہے۔

غرض وہی لیونٹس جسکی زندگی کچھ دنوں پہلے شاہانہ کر و فر سے گزرتی تھی، ان واقعات
کے بعد نہایت تلخکامی اور تیرہ بانی کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرتا تھا اور بہ ہزار حسرت کہتا تھا ؎

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

(باقی آیندہ) سید سخاوت حسین (حیدرآباد)

غزل صدق جائسی

دم اے ملک الموت ذرا ٹھہر خدا لے
واپس مرا قاصد درِ جانانہ سے آلے

ہو جس کی خلش روح کو سرمایۂ لذت
کیونکر کوئی وہ تیر کلیجے سے نکالے

حسرت ہے کہ چار آنکھ کسی روز تو کر لے
اونچی نگاہوں سے مجھے دیکھنے والے

اے نالۂ دل اُسپہ اثر ہو تو میں جانوں
بے فائدہ یوں عرش ہلانے کو ہلا لے

آنکھیں مری کیا کم تھیں جو بیٹھے گریہ و زاری
روتے ہیں عبث مجھپہ مرے پاؤں کے چھالے

یہ کشتۂ حسرت نہیں گو قتل کے قابل
اس عزم سے ظالم کہیں خنجر تو اٹھا لے

اے صدق کہینگے جو وہ معلوم ہے تجھکو
حال دل بیتاب سنانے کو سُنا لے

بے ثباتی دنیا

ثبات عالمِ امکاں کو زینہار نہیں — یہ وہ چمن ہے کہ جسمیں سدا بہار نہیں
کبھی خزاں کا ہے دورہ کبھی ہے موسمِ گل — فضائے گلشنِ امکاں کا اعتبار نہیں

اگر ہے چشمِ بصیرت تو سوئے گورستاں — نگاہ غور سے کر تا حصول ہو عرفاں
پڑے ہیں چین سے سوتے مکین قبروں کے — نہ انکو ہوش ہے اپنا نہ کچھ خیالِ مکاں
انھیں میں ایسے ہیں جو تھے کبھی سریر آرا — جہاں میں چلتا تھا آگے انھیں کے طبل و نشاں
انھیں کے سطوت و شاہانہ سے زمانے میں — لرزتا رہتا تھا ہر ایک طفل و پیر و جواں
انھیں میں وہ بھی ہیں جن کو کہ اک زمانے نے — کہا تھا خالق و رازق خدائے کون و مکاں
رہا قیام نہ کچھ انکی شان و شوکت کو — نہ چھوڑا ہائے زمانے نے کوئی انکا نشاں
پڑا ہے خاک میں سوتا وہ فاتح و منصور — کیا تھا شرق سے تا غرب جسنے فتح جہاں
انھیں میں سوتے ہیں وہ حسن و ناز کے پتلے — کہ جنکو دیکھکے پڑھتے تھے کلمہ انس و جاں
نہ اب وہ حسن رہا ہے نہ سرگیں آنکھیں — نہ پھول سا وہ بدن ہے نہ موئے مشک افشاں
پڑے ہیں کنج لحد میں غرض فقیر و امیر — گدا و شاہ ہیں اس سرزمیں پہ سب یکساں

رہا جہاں میں پیمبر کوئی نہ کوئی شاہ — نشاں کسی کا ہے باقی کسی کا ہے نہیں نام
پڑے ہیں کنجِ لحد میں وہ بیکس و تنہا — خبر کسی کو نہیں ہے کہاں ہیں رستم و سام
قصور چھوڑ کے جنگل بسائے ہیں سب نے — ملا ہے مُردوں کو قبروں میں کچھ عجب آرام
ملا یا خاک میں قبروں کو بھی زمانے نے — نہ دیکھا ہائے کہ کیسا تھا کوئی گل اندام
فنا فنا کی صدا دے رہے ہیں انجم و چرخ — سناتے آیۂ عبرت ہیں تجھکو صبح و شام

بگوشِ ہوش تو سن کل من علیہا فان
فنا ہے سب کو بجز وجہ ذوالجلال و الاکرام

اظہر علی، بی اے

اکسیرِ سخن پر ایک نظر

شاعری کسی زبان کی ہو، اکتسابی نہیں وہبی ہوتی ہے۔ یہ مسلمات سے ہے اور اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ شاعر جو فطرتاً طبع موزوں اور فکر رسا لیکر پیدا ہوتا ہے اُسکا دل و دماغ تمام افکار دنیوی سے فارغ اور مکروہات زمانہ سے پاک فقط روحانی مسرتوں اور وجدانی لذتوں سے ہمیشہ کامیاب رہتا ہے، جسکی ایک عمدہ نظیر حیات سعدی ہے۔ یعنی جس پُر آشوب زمانے میں فارسی کے اس نامور شاعر کو خلافتِ بغداد کی تباہی کا یہ مرثیہ لکھنا پڑا ہے کہ

آسماں را حق بود گر خوں بگرید بر زمیں ۔۔۔ بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المؤمنیں

اسی کے آخر میں یہ فلسفہ بھی بیان کیا ہے۔

کو نگسا نند از پئے مردار دنیا جنگجو ۔۔۔ اے برادر گر خردمندی چو سیمرغاں نشیں

اور وہی زمانۂ پُر شور و شر ہے کہ کتاب بوستاں کے اختتام کی مسرت دلی میں فرما گئے ہیں

دراں حالت کہ مارا وقتِ خوش بود ۔۔۔ ز ہجری شش صد و پنجاہ و شش بود

لیکن سچ یہ ہے کہ ہر ایک زبان اور ہر ملک کے شاعر کو خواہ وہ کیسا ہی زندہ دل اور رنج و آلام دنیاوی سے بے پروا ہو، پھر بھی اپنے گرد و پیش کی ہیئتِ اجتماعیہ اور حالات و واقعات زمانہ سے طبعاً اثر پذیر ہونا پڑتا ہے۔ جسکی وجہ سے اُسکے اندازِ بیان اور رنگ کلام میں اقتضاء زمانہ کی کیفیت ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً سنسکرت شاعری کو لیجیے کہ ویدوں کی سادہ اور دلنشیں نظمیات کا لطف رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا اور وہ زمانہ آیا جب سنسکرت شاعری کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ یعنی دیوتائے سخن والمیک کا دَور زرّیں شروع ہوا، جبکہ سوسائٹی کی حالت پہلے سے بہت مختلف ہوگئی تھی اور ارزان و آسان زندگی کے بجائے ملک میں رزم و بزم کے بھی کچھ کچھ ساز و سامان پیدا ہوگئے تھے۔ سیدھے سادے قصے کہانیوں کے بجائے کسی قدر معارف و حکم اور علوم و فنون کا بازار گرم ہو چلا تھا مگر مذہبی رنگ سوسائٹی پر غالب تھا اسی وجہ سے والمیک

کی تصنیفات میں لطیف استعارات اور معانی آفرینی کے ساتھ ہی مفید مطالب اور اخلاقی پہلو صاف آشکارا ہیں۔ یہاں تک کہ غالباً اسکے بعد ہی مشہور شاعر کالی داس کی شاعری کو فروغ ہوا جس کا ٹھیک زمانہ معلوم نہیں مگر رنگ سخن سے پتا چلتا ہے کہ اسکے عہد میں راجاسے پرجا تک تعیش میں چور تھے اور ملک میں کسی قدر تکلفات کا دَور دورہ ہو چلا تھا۔ انداز بیاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کی سنسکرت پہلے کی سی صاف وشستہ نہیں رہی تھی بلکہ بھاکھا سے بہت کچھ مخلوط ہو چکی تھی۔

آج کل کالی داس کی شاعری کے چند نمونے اُردو میں حضرت شاکر ادیٹر قیصر نے اکسیرِ سخن کے نام سے شایع کیے ہیں جس سے کالی داس کے شاعرانہ خیالات کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ بھاکھا کو اگر دوشیزۂ رعنا کہیے تو اُردو بھی ایک عروسِ زیبا ہے جو سولہوں سنگار کیے ہوے اسوقت عالم آرائے شباب اور آشوبِ اہلِ نظر بنی ہوئی ہے۔ مسٹر شاکر نے کالی داس کی مردہ شاعری پر یہ احسانِ عظیم کیا ہے کہ اُسکو ملک کی مروجہ اور مقبول زمانہ زبان میں لاکے گویا ازسرِ نو زندہ بنا دیا ہے۔ اور ایک لغزگفتار شاعر کی یادگار کو فی الحال تازہ کر دکھایا ہے۔ خود اُردو زبان کے لیے بھی یہ بات کچھ کم مایۂ ناز نہیں ہے کہ اُسکی نادر ہوسکے قیمتی مگر گمشدہ جواہر آج پھر اسکی زیبایش میں شامل ہو گئے ہیں۔

یہ چند پریشان نظمیں جو پیشتر رسالۂ زمانہ وغیرہ میں چھپ چکی ہیں اب یکجا اشاعت پذیر ہوئی ہیں۔ انکے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ کالی داس کا پایۂ سخن ہندوستان میں کس قدر بلند رہا ہے۔ اگرچہ اسکے کلام میں فارسی شعرا کا سا زورِ بیان اور لطائفِ معنوی مفقود ہیں اور عمر خیام کے نکات فلسفیانہ یا حافظ کے مذاقِ صوفیانہ کی جھلک بہت کم نظر آتی ہے لیکن اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ اسکے زمانے کے مذاق طبائع اور خاکِ ہند کے مناظر قدرتی تک محدود ہے ورنہ کالی داس کا ایسا رند مشرب اگر آبِ انگور کی لذت سے واقف ہوتا تو اسکی بزمِ سخن مینائے مے سے خالی نہ نظر آتی۔

اس کتاب کی اشاعت سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے زمانۂ کالی داس کے ساز و سامان اور مذاق طبائع کی حقیقت کھل جاتی ہے اور جس طرح اُسکی نازک خیالیوں کا ثبوت ملتا ہے اُسی طرح اُسکی کمزوریاں بھی صاف صاف نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کنول کا پھول جو بلحاظ شادابی کے سرزمینِ ہند کی بے نظیر چیز ہے اور جو ایک بالغ نظر شاعر کے لیے عرفانِ حقیقی کا تجلی گاہ بنجاتا ہے، اسکی تعریف میں کالی داس نے ایسا کچھ لکھا ہے کہ اس پھول کی ساری لطافت و رعنائی خاک میں ملا دی ہے۔ اسکے مضمون کا ترجمہ حسب ذیل کیا گیا ہے۔

تلاشِ شہد میں ہیں مکھیاں سب پرواز — مگر مزاج میں یہ سادگی کے ہیں انداز
کہ ناچتے کہیں آتے ہیں جب نظر طاؤس — فضائے دشت میں پھیلائے بال و پر طاؤس
ترانے گاتی ہوئی جب قریب آتی ہیں — کنول کے پھولوں کے دھوکے میں بیٹھ جاتی ہیں

سمجھ میں نہیں آتا کہ پرِ طاؤس کو مکھیوں کی نظر سے دیکھنے کی کیا ضرورت تھی. مگر اُردو کے بھی کسی شاعر نے اسی طرح کا کمال دکھایا ہے

طپیدہ ہوں کہ ہو سوزِ سینۂ بلبل — نظارۂ رُخِ گلفام سے مجھے افسوس

ایسی تشبیہیں جو واقعہ نگاری کے خلاف ہوں مذاقِ سلیم پر گراں گزرتی ہیں مگر تشبیہ کا لطف تو اسکو کہتے ہیں کہ فضائے مرغزار کا نقشہ ایک شعر میں کھینچ دیا ہے

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا — تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

معمولی باتوں کو پیچیدہ مضمون اور طولِ فضول کے ساتھ بیان کرنا ایک طرح کا نقص ہے جو کالیداس کے کلام میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً اُس نے عورت کی تعریف میں ہندوانی دیومالا سے کام لیکر یہ مضمون آفرینی کی ہے جس کا ترجمہ بایں الفاظ ہو سکتا ہے

نمودِ حسنِ ازل ہے نظارگیِ چمن — مگر کنول میں کہاں جلوۂ مہِ روشن
نہ ماہتاب میں وہ آب و رنگِ نیلوفر — کہ طرفہ تر ہے فروغِ جمالِ چہرۂ زن

قریب قریب اسی مضمون کو لسان الغیب کی زبان سے سنیے تو وہ مختصر الفاظ میں اور کس قدر

بے ساختہ کہہ گئے ہیں۔

روشنیِ طلعتِ تو ماہ ندارد　　پیشِ تو گل رونق گیاہ ندارد

مطلب یہ ہے کہ گلِ خوش منظر کے سامنے گھاس پھونس کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔ لیکن کالیداس کو معذور سمجھنا چاہیے اگر اسکے کلام میں گل و سنبل، ساقی و مُل اور ترانہائے بلبل کے ایسے سامانِ دلکشی موجود نہیں ہیں ظاہر ہے کہ گلاب کے پھولوں میں جو خوشبو ہے وہ کنول کی بیل اور بیولوں میں کہاں سے آ سکتی ہے۔ یا شعرائے فارسی نے قمری و بلبل کی نوسنجیوں میں جو سوز و ساز دکھایا ہے وہ کوئل کی کوکو اور پپیہے کی پیہو پکار میں کیونکر پیدا ہو سکتا ہے کہ "ایں زمین را آسمانے دیگر است" اسی طرح ساقی نامے جو فارسی شعرا نے کثرت سے لکھے ہیں وہ بحسبِ اقتضائے وقت کچھ انھیں لوگوں کے لیے مخصوص تھے جو کہہ گئے ہیں "آں قدح بشکست وآں ساقی نماند"

مگر با ایں ہمہ کالیداس کی سحر نگاری، لفاظی، رنگینیِ خیالات اور جذبات آفریں مناظرِ قدرتی کی تصویر کشی ہزار تحسین و آفریں کی مستحق ہے کہ اسکے لطفِ کلام کا اندازہ اکسیر سخن کے مطالعے سے بخوبی ہو سکتا ہے جس میں ہندی زبان کی سال خوردہ شاعری کامیابی کے ساتھ اردو کے فیشن ایبل لباس میں جلوہ گر کی گئی ہے اور جسکی تالیف و اشاعت کا کریڈٹ مسٹر شاکر اڈیٹر عصر کی خوش مذاقی کو حاصل ہے۔

مگر افسوس ہے کہ اکسیر سخن پر ریویو کرتے ہوئے اڈیٹر صاحب رسالۂ زمانہ نے یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ یہ نظمیں شاکر کی نہیں بلکہ سرور جہان آبادی کی طبعِ موزوں کا نتیجہ ہیں۔ اور اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ کوئی تحریری ثبوت بھی دے سکتے ہیں۔ جسکے ہم بھی منتظر ہیں زیادہ تر اسوجہ سے کہ الناظر نمبر ۔ میں ہمارے دوست حضرت ابو الرشاد نے قبل از قبل مسٹر شاکر کے نمبر میں ایک مضمون "مے دو آتشہ" کے عنوان سے لکھ مارا ہے اور اُس میں اپنی طرف سے چند شبہات پیدا کر دیے ہیں جو بجائے خود اس پیچیدہ سوال کو پیچیدہ تر بنانے والے ہیں۔ یعنی ایک دلیل تو یہ پیش کی گئی ہے کہ مسٹر شاکر نظم نگاری پر بخوبی قادر ہیں اور بہت سی انکی نظمیں مختلف رسائل میں

شایع و مقبول عام ہو چکی ہیں - ہر چند کہ انکے کلام کی چند خامیان بھی اسی مضمون میں کھائی گئی ہیں جو بعینہ سرور کی فروگذاشتوں کا نمونہ ہیں - مثلاً سرور کی نظم "مارِ آستیں" پہلے مخزن میں چھپی تھی جسکی خود تصحیح کرکے اُنھوں نے دوبارہ زمانہ میں چھپوایا ہے. اور انکی نظم "خاکِ وطن" کا یہ شعر خلافِ محاورہ ہوگیا ہے

میرے دامن میں شگفتہ تھے کبھی قدرت کے پھول گُندھ رہے تھے تیری چوٹی میں کبھی جدت کے پھول

یوں چاہیے تھا :-

اور گندھے تھے تیری چوٹی میں کبھی جدت کے پھول

اسی طرح سرور کی دوسری نظم "حسرتِ شباب" کا شعر ذیل بھی تعقیدِ شدید کی وجہ سے مہمل ہوگیا ہے :-

وہ جھوم جھوم کے چلنا نسیم کا سَن سے سمن بَروں کا نکلنا وہ بچکے دامن سے

شاید مفہوم یہ ہوگا :- سمن بَروں کا اُلجھنا وہ خار دامن سے - یا دامن بچاکے چلنا

اسی طرح کی اور غلطیاں جامِ سرور میں موجود ہیں جو خاص اہتمام سے شایع ہوا ہے مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پختگیِ کلام نہ سرور میں تھی اور نہ شاکر میں ہے -

دوسری دلیل یہ ہے کہ سرور نے اپنی حیات میں نام کا اعلان کیوں نہیں کیا اور یہ نظمیں اُنکے دونوں مجموعہاے کلام میں کیوں نہ شامل کی گئیں - لیکن کوئی تو بات ہے کہ سرور نے اپنی ہمہ گیر طبیعت سے فارسی و انگریزی تک کے ترجمے اور اقتباسات کثرت سے کیے ہیں پھر اُسکا ملک کی ایسی قابل قدر شاعری کی طرف مطلق التفات نہ کرنا کیا معنی رکھتا تھا بلکہ مذہبی رنگ میں بھی انکی جو نظمیں ہیں وہ طبعزاد سمجھی جائینگی شاید یہ وجہ ہو کہ بلحاظ یگانگت سرور کو ہندی شاعری کی قدر افزائی اپنے ہی مُنھ سے اچھی نہ معلوم ہوئی ہوگی - فقط

حق پسند

نظرے خوش گزرے

اس نمبر میں سب سے پہلے جو مضمون درج کیا گیا ہے اُسکے لیے غالبًا ناظرین کو کسی قدر انتظار رہوگا۔ اگرچہ گزشتہ نمبر کے بتاخیر شایع ہونے کی وجہ سے یہ پرچہ ناظرین کے ہاتھوں میں جلد پہنچتا ہے۔ تاہم جن احباب نے ہمارا جلی قلم سے لکھا ہوا اعلان ملاحظہ فرمایا ہوگا وہ کس قدر متوقع اور منتظر ضرور رہی ہوں گے۔ "میدانِ کارزار" کے مطالعہ سے ناظرین الناظر کی اُس معلومات میں ہر چند کہ کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا جو روزانہ یا ہفتہ وار اخبارات کے ذریعہ سے اُنھیں حاصل ہوتی رہتی ہے تاہم اُن خبروں کی صحت و حقیقت کے متعلق نسبتًا صحیح اندازہ کرنے میں اس مضمون سے بہت مدد ملیگی اور بہت سے اصحاب کو۔ خصوصًا جنھیں محض اُردو اخبارات کے ترجموں ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اب ہر فی خبر اُس کے مفہوم کو پوری طرح ذہن نشین کر لینے میں بڑی آسانی ہوگی۔ کیونکہ فوجوں کی تقسیم اور طریق کار کے متعلق کسی قسم کی معلومات نہ ہونے کی وجہ سے بسا اوقات وہ تار کی خبروں کو پڑھکر اور وہ بھی جبکہ ایک ہی مقام پر جم کر لڑائی ہو رہی ہو اور اخبارات میں بار بار اگرچہ کسی قدر مختلف حیثیتوں میں ایک ہی قطعہ زمین کا ذکر ہو دماغ پر زور دینے اور مطلب سمجھنے کی کوشش کرتے ہوں گے اور بالآخر فن حرب سے قطعًا نابلد ہونے کی وجہ سے اس کوشش میں ناکامیاب رہتے اور سخت اُلجھن میں مبتلا ہو جاتے ہوں گے۔ اب تک کسی اُردو اخبار یا رسالہ میں نہ تو کوئی مضمون ایسا شایع ہوا جسکے مطالعہ سے اخبار جنگ عام ناظرین کے لیے نسبتًا قابل فہم ہو جاتے اور نہ ہماری زبان میں سوائے چند فوجی قواعد کی کتابوں کے اس قسم کا سرمایۂ ادبی ہی موجود ہے جسکی مدد سے یہ مشکل مسئلہ حل ہو سکتا اگرچہ سوائے خاص خاص صورتوں کے عام طور پر اس قسم کی کتابوں سے استفادہ کرنا بھی بجائے خود دشوار و محال تھا۔

ہمارے دوست سید سلطان حیدر صاحب جنکے پُرلطف مضامین سے ناظرین کو برابر بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملتا رہتا ہے، سزاوار تحسین اور مستحق شکریہ ہیں کہ اُنھوں نے اُردو داں پبلک کی واقعی مجبوریوں اور وقتی ضرورتوں پر لحاظ کرکے یہ مضمون لکھا اور اسکے لکھنے میں جو زحمت اُنکو اُٹھانا پڑی ہوگی اُسکا اندازہ وہ ناظرین رسالہ اچھی طرح کر سکیں گے جو انگریزی زبان سے ناآشنا ہیں۔ اگر اس قسم کے سلسلہ چند مضامین مرتب

کرکے شایع ہوسکیں تو اُردو داں احباب کے لیے نہایت آسانیاں پیدا ہوجائیں گی اور اُنھیں بعض خبروں کے مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے جو اُلجھن ہوتی ہے اُسکے رفع ہوجانے کے باعث جنگی اخبار سے دوگونہ دلچسپی پیدا ہوجائے گی۔ اور ہمیں یقین واثق ہے کہ ہمارے کرم فرمانے جس ضرورت کو ہم سے پہلے محسوس کرلیا اُسکے رفع کرنے کی اُنھیں ہم سے زیادہ فکر بھی ہوگی اور اسی لیے غالباً یہ خواہش بالکل حق بجانب ہے کہ وہ اپنی قیمتی فرصت سے اپنے ابنائے وطن اور برادرانِ ملکی کو مستفید فرمائیں اور اس سلسلے کو یہیں نہ چھوڑ دیں۔ یہ مروّت ہے کہ اگر بجائے ہمارے لائق دوست کے جن کا تعلق سول سروس سے ہے کوئی فوجی تعلقات رکھنے والے بزرگ اس طرف متوجہ ہوتے تو اُنکے لیے خود بھی نسبتاً آسان ہوتا اور اُنکی تحریروں کو دوسرے بھی زیادہ مستند جانتے لیکن سُلجھا کر بیان کرنا اور پھر اپنے شگفتہ طرزِ تحریر سے مضمون کو دلچسپ بنا دینا کچھ ہمارے دوست ہی کا حصہ تھا اسلیے غالباً ہماری طرح ناظرینِ الناظر بھی اسی کو پسند کرینگے کہ اس سلسلے کو سید صاحب ہی جاری رکھیں۔ شکلوں کے ذریعے سے عام فہم بنانے کی جو کوشش اس مضمون میں کی گئی ہے وہ خاص طور پر قابلِ داد ہے اور انگریزی اصطلاحات کے ترجمے میں جو دماغ سوزی کرنا پڑی ہوگی وہ بھی لائقِ ستایش ہے۔ اگرچہ ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انگریزی داں طبقہ ان سے زیادہ مطمئن نہ ہوگا۔ کیونکہ اصلاح کی بہت گنجایش نظر آتی ہے مثلاً General Reserve کا ترجمہ جب "کمک مقامی" کیا گیا ہے تو Local Reserve کے لیے "عقب اصلیہ" کسی طرح تسلی بخش نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً اس بنا پر کہ افواجِ اصلیہ اور جماعتہائے اصلیہ جہاں آئی ہیں وہاں انگریزی لفظ "Regular" سے "اصلیہ" مراد لیا گیا ہے۔ ماسوا اسکے "عقب" اصطلاح علم الحرب میں ایک موزوں ترجگہ حاصل کرچکا ہے۔ جو Reserve کا مرادف نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بہرحال اصطلاحات کی بحث سے قطع نظر کرکے اگر دیکھا جائے تو سید صاحب کی کوشش اور محنت حد درجہ آفریں کے قابل ہے اور ناظرینِ الناظر کو خوش اور شکرگزار ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے اُنھیں کی مشکل آسان ہوجائیگی۔

اُردو زبان کو پے در پے جو نقصانات پہنچ رہے ہیں وہ حد درجہ وحشت انگیز اور قابلِ افسوس ہیں شبلی و حالی کی وفات کے بعد ہی منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ کا انتقال تمام بہی خواہان و ہمدردانِ

اُردو کے لیے یاس افزا ہوگا۔ منشی صاحب مرحوم اگرچہ اُردو کے لیے اُسی وقت سے مُردوں میں شمار ہونے کے قابل تھے جبکہ فالج کے متعدد دَوروں نے اُنھیں تقریباً بیکار کر دیا تھا، لیکن ۲۴ رجنوری ۱۹۱۷ء کو واقعتاً اس دارِ فانی سے اُنھوں نے رحلت فرمائی۔ اِنّا لِلّٰہ واِنّا الیہ راجعون۔

اُردو زبان پر جو قدرت مرحوم کو حاصل تھی کسی کو نہوئی۔ اور ظرافت و شوخی کے لحاظ سے تو وہ یگانۂ روزگار اگر کہے جاتے تو بھی مبالغہ نہ ہوتا۔ معمولی باتوں میں اس قدر لطیف پیرائے اختیار کرتے اور ایسے انوکھے اور دلچسپ انداز پیدا کرتے کہ مخاطبین مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ جاتے۔ اور جو حال باتوں کا تھا بعینہٖ وہی اسلوب تحریر میں عیاں ہوتا۔ اودھ پنچ کے پڑھنے والوں میں سے کسی کے متعلق اگر آج بھی کوئی یہ بیان کرے کہ ہنسے ہنستے اُسکا دم نکل گیا، تو شاید یقین کر لیا جائے۔ اس زمانے میں اس مذاق کی تحریروں کے نہ پڑھنے والے رہے اور نہ سمجھنے والے، لیکن پھر بھی اُنکی تصانیف کو پڑھتے وقت ناممکن ہے کہ ہنسے بغیر رہا جائے۔ پھر، اُنکی تحریروں کی بڑی خوبی یہ ہوتی تھی کہ ہمدرد کے تجاہلِ عامیانہ کی طرح محض الفاظ کا گورکھ دھندھا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ ظرافت کے پیرائے میں جو کہتے اور جو سمجھاتے ہیں یہ کہ دوسرا متانت کے لہجے میں اس فرض کو ادا نہیں کر سکتا تھا۔ نکتہ چینی اور اعتراض کے لیے غالباً یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ پنچ کی زبان سے بہتر اور موثر دوسرا طریقہ نہیں ہو سکتا۔ اور اگرچہ منشی صاحب نے اس باب میں انگریزی کے پنچ اخبارات کا تتبع اختیار کیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے اس رنگ کو ایسا اپنایا کہ اگر لندن پنچ کا ایڈیٹر کبھی ہندوستان میں آتا اور ہماری زبان سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع پاتا تو اُنکی تحریروں پر رشک و حسد کیے بغیر نہ رہ سکتا اور یقیناً ہم سے زیادہ اُنکی قدر و منزلت کرتا۔

انجمن ترقی اُردو کی سالانہ رپورٹ افسوس ہے کہ خواہش اور وعدے کے مطابق ہم نذر ناظرین نہیں کر سکتے۔ اس وجہ سے نہیں کہ ہمارے مصالح اسکے خلاف ہوگئے یا ہم گنجائش نہ نکال سکے بلکہ اسکا سبب یہ ہوا کہ رپورٹ جبکہ کانفرنس میں پڑھی جا چکی تو ہمارے دوست قاضی تلمذ حسین صاحب نے جو دفتر کانفرنس کے مہتمم ہیں سکرٹری صاحب سے نقل رکھنے اور شاید اخبارات میں اقتباس دینے کے لیے لے لی تھی اور جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب کی آخری

تحریر سے معلوم ہوا۔ اب تک رپورٹ علی گڑھ سے اُنکے پاس نہیں پہنچی۔ آیندہ مہینے غالباً اُس کا شایع کرنا ممکن ہوگا۔

ماہ دسمبر کے الناظر میں ہمارے دوست ابوالرشاد صاحب نے مئے دو آتشہ کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا اُس میں اکسیر سخن کی نظموں کے متعلق ایڈیٹر صاحب زمانہ کے اس بیان کی صداقت سے انکار کیا تھا کہ "انکو نظم اردو کا جامہ سرور مرحوم نے پہنایا ہے" اب ہمارے "حق پسند" دوست نے اکسیر سخن پر جو نظر ڈالی ہے اُس میں مسٹر دیا نراین نگم کی تائید میں اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ خود مسٹر دیا نراین نگم نے اپنی ایکسچنج کی تحریر میں بھی ہمیں یقین دلایا ہے کہ واقعہ یہی ہے۔ لیکن مسٹر شاکر نے اپنے رسالہ العصر کے تازہ نمبر کے ساتھ ایک دو صفحے کا ضمیمہ شایع کیا ہے جس میں صاف صاف ایڈیٹر صاحب زمانہ کے بیان کی تردید کی اور اُنکی اس روش کو ذاتی کدورت پر محمول کیا ہے۔ میں اس بحث سے ذاتی طور پر نہ تو کچھ سروکار ہوسکتا ہے اور نہ اسے ہم کچھ پسندیدہ جانتے ہیں۔ لیکن چونکہ بحث چھڑ گئی ہے اور غلط فہمی کے بجائے غلط بیانی کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے اس لیے اس گتھی کا صاف ہو جانا ہی اچھا ہے اور ہم اپنے دیرینہ کرم فرما ایڈیٹر صاحب زمانہ کو اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ اگر جیسا کہ اُنکا دعویٰ ہے اُنکے پاس اپنے بیان کی تائید میں کافی ثبوت موجود ہے تو اب اُسکو شایع کر دیں تاکہ حقیقت حال ظاہر ہو جائے۔ اور اگر واقعی اُن سے لغزش ہوگئی ہے اور یہ محض اُنکا ایک قیاس و خیال تھا تو پھر اُنھیں مسٹر شاکر کے بیان کی صحت کو تسلیم کر کے اُن سے معذرت کر لینا چاہیے۔ کیونکہ کسی اخبار نویس کی عزت و منزلت میں قیاس کی غلطی یا اعترافِ تقصیر سے کوئی فرق نہیں آسکتا البتہ ہٹ دھرمی اور غلط باور کرانے کی کوشش حد درجہ مذموم ہوگی۔

لکھنؤ کے نامور ڈاکٹر خان بہادر عبدالرحیم کا جنوری کے آخری ہفتے میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم نہ صرف اس شہر کے بلکہ صوبے بھر کے ممتاز ارباب فن میں شمار ہوتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ امراض چشم کے معالجے میں تو وہ سارے ہندوستان کیلیے مایہ ناز تھے۔ اُنکے پسماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ہم اُس عام و وسیع الاثر نقصان پر افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے جو ایک ماہر فن کے ارتحال سے کسی ملک و قوم کو پہنچتا ہے۔ خدا مرحوم کو جنت نعیم عطا فرمائے۔ آمین

خوان ادب

نظام الملک طوسی

(حجم ۴۰۰ صفحے۔ مجلد۔ قیمت عہ۔ الناظر بک ایجنسی)

مولوی عبدالرزاق صاحب نے البرامکہ لکھکر اردو مصنفین کی صف اول میں ہمیشہ کے لیے جگہ حاصل کر لی تھی۔ اور اب نظام الملک کی بدولت یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ انکا مرتبہ بحیثیت ایک تاریخی مصنف کے چند درجہ اور بلند ہوگیا ہے۔ اس کتاب پر مفصل تبصرہ تو بعد کو کیا جائے گا، سردست ناظرین الناظر کی واقفیت کے لیے اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ نظام الملک طوسی، ملکشاہ سلجوقی اور الپ ارسلان کے زمانہ میں وزارت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہا۔ اور اول الذکر کے عہد میں معزول ہوجانے کے بعد حسن بن صباح بانی فرقۂ اسماعیلیہ کے ایک فدائی کے ہاتھوں شہید ہوا۔ وہ اگرچہ اپنے عہد کی سیاسیات کا ماہر اور انتظامی امور میں دستگاہ کامل رکھتا تھا لیکن ان اوصاف سے کہیں زیادہ اسکی عظمت کا سبب اسکا فضل و کمال تھا۔ قابل سوانح نگار نے جہاں اپنے ممدوح کے ان تمام مختلف النوع خصوصیات پر تفصیلی بحث کی ہے وہاں کتاب کا ایک بڑا حصہ دولت سلجوقیہ کی اجمالی تاریخ اور قانون سلطنت کے بیان میں صرف کیا ہے۔ جو قطع نظر دلچسپ ہونے کے بہت سبق آموز ہے۔ اور آخر میں خود نظام الملک کا لکھا ہوا "دستور الوزرا" درج کر دیا ہے جو خاص طور پر قابل دید ہے۔ کتاب کی ظاہری زیب و زینت میں اہتمام بلیغ کیا گیا ہے جسکے لیے منشی رحمت اللہ رعد کا نام نامی کافی ضمانت ہے۔ جلد بھی عمدہ ہے اگرچہ اس بارے میں مولوی سید محمد حسن بلگرامی نے جنکی ہم ممنون نے "فغان ایران" شائع فرمائی ہے تمام مصنفین اردو پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ اس لاجواب کتاب سے ہم آیندہ مہینے میں ناظرین کو روشناس کریں گے۔

فرائض والدین

(حجم ۴۶ صفحے۔ قیمت ۳ر الناظر بک ایجنسی)

ہماری زندگی میں سب سے اہم اور مشکل مسئلہ بچوں کی تعلیم کا ہے اس چھوٹے سے رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں کو خدا نے اپنے فضل و کرم سے اولاد دی ہو وہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوشش کریں اور جو ہدایتیں اسمیں درج ہیں انپر عمل پیرا ہوں۔ تمام اُن لوگوں کو جو صاحب اولاد ہوں اسے ضرور پڑھنا اور پڑھکر "خادم تعلیم" صاحب مصنف رسالۂ ہذا کے مشوروں پر چلنے کی کوشش کرنا چاہیے کہ اس میں انکے بچوں کی فلاح و بہبود اور قوم کی آیندہ ترقی کا راز مضمر ہے

انتخاب نظام المشائخ

(حصہ اول۔ ۸ جزو۔ قیمت ۱۲ر دفتر نظام المشائخ دہلی)

نظام المشائخ کی سنہ ۱۳۲۹ھ کی جلدوں میں سے چیدہ اور دلچسپ مضامین یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیے گئے ہیں۔ جن میں خواجہ حسن نظامی صاحب کے مضامین خاص طور پڑھے جائیں گے۔ کیونکہ اُن کی تحریریں قبولیت عام حاصل کر چکی ہیں۔ اور اس مجموعے میں انکی قد آدم تصویر کے ساتھ ایڈیٹر نظام المشائخ کا چہرہ مہرہ بھی دکھایا گیا ہے۔

تذکرۂ خواتین دکن

(حجم ۴۴ صفحے۔ قیمت ۴ر الناظر بک ایجنسی)

اصلی لاثانی مکمل مجموعۂ خطب حرمین شریفین ابن نباتہ عربی مع ترجمۂ نظم اُردو طبع ہو چکا۔

مترجمۂ

عالم باعمل فاضل بے بدل رئیس العارفین حضرت مولائی مرشدی سیدسند مولوی سید شاہ فقیر محی الدین صاحب قبلہ قادری چشتی المتخلص بہ قبل ۔ معزز ناظرین ! یہ وہ مقبول خاص و عام مشہور خطبۂ متبرکہ ہے جس سے اکثر مولفین و مترجمین خطب نے بعض خطبوں کا انتخاب کرکے اُردو نظم فرمایا ہے آج تک کسی کو بھی پورے نظم ترجمے کی طرف خیال نہ ہوا ۔ ہندوستان کے چند اہل مطابع نے البتہ اُسکو نثر میں ترجمہ کروا کے چھاپا مگر نثر سے خطیب وسامعین کو کوئی فائدہ نہیں ہی زمانا عوام الناس زبان عربی سے بالکل بے بہرہ ہوگئے مقتضائے وقت یہ ہے کہ عوام جس زبان کو سمجھیں اُسی زبان میں احکام آلہیۂ امور شرعیۂ محمدیۂ سنائیں جہالت اور بعلمی روز بروز اہل اسلام کو احکام آلہی اور امور شرعی سے جدا کر رہی ہے اس پر آشوب زمانہ میں حتی الامکان عامۂ مسلمین کی اصلاح ہر دینی کام میں نظر رکھنا فرض ہے۔ شارع علیہ الصلوۃ والسلام کا مقصود اصلی اس سے صرف اصلاح ہے۔ تمام ہفتہ جنکو امورات دنیاوی سے فرصت نہ ملے اُنکو ایک وقت میں اس طریقے سے ضروری ہدایتیں گوش گزار کیجائیں جس سے انکو خوبی دارین حاصل ہو۔ آج خالص زبان عربی سے مقصود شارع بالکل مفقود ہوا جاتا ہے ۔ اس کام کا خیال عرصہ دراز سے قلب پریشان میں متمکن رہا کہ کوئی ایسی صورت ہو جس سے ہالے اُردو خوان بھائی فائدہ اُٹھائیں ۔ لیکن قادر متعال ہر کام کے لیے اوقات مقرر فرماچکا ہے اور وہ امر اُسی وقت مقررہ میں پورا ہوگا الحمد للہ ثم الحمد للہ توفیق سبحانی اور تائید ربانی سے مجموعۂ خطب ابن نباتہ مروجۂ حرمین شریفین مترجم منظوم بہ تمام و کمال طبع ہوگیا۔ اسکے علاوہ صحاح ستہ ومشکوۃ شریف وغیرہ سے ضروری احادیث نبویہ کے مضامین منظوم کرکے خطبہائے متفرقہ کے نام سے آخر میں شامل کر دیے ہیں۔ لکھائی ۔ چھپائی اور صحت نہایت عمدہ اور دو قسم کے کاغذ (چکنا ولایتی۔ رسمی معمولی) پر چھپا ہے ۔ تعداد صفحات (۲۱۶) قیمت صرف معمولی کاغذ ۱۲ ر مجلد ۱۴ ر چکنا ولایتی مجلد عہ ر و نیز خطبہ کا ٹائیٹل بسبب پنجرنگہ مطلا ہونے کے نہایت دلکش اور بہت ہی خوش نما ہے۔

ملنے کا پتہ

کے - حاجی محمد محی الدین سوداگر و تاجر کتب متصل مسجد براہیم (نمبر دکان ۳۹۹) منگلور

الناظر

نمبر ۶۹ جلد ۱۲ — یکم مارچ سنہ ۱۹۱۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۶۹ جلد ۱۱ یکم مارچ ۱۹۱۵ء

مل کی منطق

(۳)

(سلسلہ کے لیے الناظر دسمبر و جنوری ملاحظہ طلب ہیں)

(۵) مغالطات متعلق بہ تعمیم۔ یہ مل کی فہرست اصناف مغالطات کا آخری عنوان ہے۔ اسکے تحت میں وہ تمام غلطیاں داخل ہیں، جو انسان سے وضع کلیات میں ہوتی ہیں۔ یعنی یہ بالکل ممکن ہے کہ مشاہدۂ جزئیات صحیح ہو، لیکن اس سے استقراءً جو نتائج و تعمیمات قائم کیے جاتے ہیں، وہ غلط ہوتے ہیں۔ اس طرح کی غلطیوں کا تمام و کمال احاطہ کرنا تو صریحاً ناممکن ہے، البتہ یہ ممکن ہے، کہ اس طبقے کے چند نمایاں و عامۃ الورود مغالطات کی تعیین کر دی جائے۔ چنانچہ مل نے یہی کیا۔

(الف) اس طرح کی غلطیوں کی ایک عام شکل یہ ہے، کہ انسان ایسے کلیات و تعمیمات قائم کرنے لگتا ہے، جن کا غلط و صحیح ہونا ایک طرف، اُن تک تجربہ و استقراء کا دسترس ہی نہیں ہوتا۔ انتاج استقرائی کے لیے لازمی ہے، کہ جن چیزوں کی بابت نتائج قائم کیے جا رہے ہیں، اُنکے احوال کے قوانین سے ایک حد تک ہمیں واقفیت ہو، ورنہ ہر استقراء بے معنی رہے گا۔ مثلاً کرۂ ارض کے موسمی تغیرات کے مشاہدہ سے ہم نظام شمسی کے بعض دیگر سیاروں، یا پھر اُن اجرام فلکی کے، جو سرے سے نظام شمسی سے خارج ہیں، موسم کے بارہ میں کوئی نتیجہ نکالیں۔ ظاہر ہے، ہمیں اپنے کرہ کے علاوہ کسی جرم فلکی کے قوانین طبعی

کا علم نہیں۔ اور اس لاعلمی کی بنا پر ہمیں وہاں کے متعلق کوئی استقراء قائم کرنے کا حق نہیں۔ اسی قبیل سے وہ غلطی بھی ہے، جس میں عموماً منکرینِ معجزات مبتلا ہیں۔ یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں امور، جن کے وقوع کا دعوے کیا جاتا ہے، چونکہ قوانین قدرت کے مخالف ہیں، اس لیے انکا واقع ہونا ناممکن ہے۔ لیکن جب اُنکے اس قول کی تحلیل کیجاتی ہے، تو بالآخر "قانون قدرت کی مخالفت" کے معنی صرف اس قدر نکلتے ہیں، کہ اب تک اُنھیں کسی ایسے قانون طبعی کا علم نہیں ہوا، جو واقعہٴ زیر بحث کی تکوین کا باعث بن سکے۔ حالانکہ یہ بالکل ممکن ہے، کہ ہمیں اب تک اُس قانون کا علم نہ ہوا ہو، مگر آئندہ ہو جائے۔ اس لیے عدم علم، کسی حالت میں علم عدم کے مستلزم نہیں۔

(ب) اسی طرح وہ تعمیمات بھی، مغالطہ پر مبنی ہیں، جن میں فطرت کے قائم کردہ تنوعات کے درمیان توحید پیدا کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ اس مغالطہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ، جس میں اکثر قدمائے یونان مبتلا رہے ہیں۔ اور وہ یہ ہے، کہ بالکل متبائن الجنس و مختلف النوع چیزوں کو ایک ہی اصل کی فروع سمجھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً مشہور یونانی حکیم طالیس کا یہ دعویٰ، کہ تمام کائنات کی اصل پانی ہے، یا دیمقراطیس کا یہ نظریہ کہ دنیا کی ہر شے کی علتِ اولیٰ　　ہے۔ دوسری صورت وہ ہے، جو آج کل کے اکثر علمائے سائنس کے نظریات میں پائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ ہے، کہ مختلف حاسات جو ہمارے مختلف آلاتِ حواس کو متاثر کرتے ہیں، ایک ہی قانون یا کلیہ کے تحت میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر ٹنڈل کا یہ دعوے، کہ حرارت، نور، آواز، وغیرہ مختلف حاسات، جن میں سے کوئی ہماری حس لامسہ کو متاثر کرتا ہے، کوئی حس باصرہ کو، اور کوئی حس سامعہ کو، سب کے سب حرکت کے مظاہر و اشکال ہیں۔ ان تمام صورتوں میں، ان نظریات کے بانی اس امر کو نظرانداز کر گئے ہیں، کہ اگر یہ سب چیزیں ایک ہی علت کی معلول ہوتیں، تو ان میں اس قدر اصولی و فروعی اختلاف کیونکر پیدا ہو جاتا۔ اصنافِ موجودات میں ہر صنف اپنے مخصوص قوانین طبعی رکھتی ہے، اس لیے ایک صنف کے قوانین کو دوسرے پر بعینہٖ منطبق کرنا سخت استقرائی غلطی ہے۔

(ج) مغالطہٴ تعمیم کی ایک اور نہایت عام الورود شکل یہ ہے، کہ استقراء کی بنیاد محض تعدد نظائر پر رکھی

جاتی ہے۔ یعنی بلا لحاظِ حالات مخصوص و مقتضیاتِ زمان و مکان، محض مشاہدہ کے بھروسہ پر کلیات قائم کیے جاتے ہیں، اور یہ غیر تربیت یافتہ نفس بشری کی طبعی رفتار ہے۔ ایک عامی شخص جب اپنے ذہن میں اسپر غور کرتا ہے کہ

"فلاں الف، فلاں الف، فلاں الف سب میرے تجربہ میں ب ثابت ہوئے ہیں
اور کوئی الف مجھے اب تک ایسا نہیں ملا، جو ب نہ ہو"

تو وہ بالکل قدرتی طور پر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے، کہ

"کُل الف، ب ہیں"

استقراء کا یہ ناقص طریقہ جس قدر غلط ہے، افسوس ہے، کہ اُسی قدر عام و ظاہر فریب ہے۔ پولیٹکل مقررین، اخبار نویس و عام مصنفین، اپنی روزانہ تقریر و تحریر میں اس طرح کی غلطیاں کرتے ہیں اور بہ کثرت کرتے ہیں، لیکن عموماً ان نتائج کی غلطی، لوگوں کی نظر سے مخفی رہتی ہے۔ مثلاً اس طرح کے چند مغالطات درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

(۱) افریقہ کے حبشیوں میں کسی طرح کے تمدن کی صلاحیت ہی نہیں، کیونکہ شروع سے لیکر آج تک وہ ہمیشہ جہالت و بربریت میں رہے ہیں۔

(۲) اہل ہند ہمیشہ غیر اقوام کی غلامی میں رہیں گے، کیونکہ تاریخ کسی ایسے زمانہ کی نظیر سے خالی ہے جبکہ خود اہل ہند، یہاں حکمراں رہے ہوں۔

(۳) فلاں فلاں کتب بیں اشخاص، جب کتبخانوں سے باہر ایسے کاموں میں لگا دیے گئے جنھیں کتابی معلومات سے کوئی واسطہ نہ تھا، تو ناکام رہے ہیں۔ اس لیے لازماً ارباب علم و فلاسفہ، عملی زندگی میں پڑنے کے ناقابل ہیں۔

(۴) طبقۂ نسواں میں اب تک اتنے نامور و مشاہیر نہیں پیدا ہوے ہیں، جتنے طبقۂ رجال میں ہوے ہیں، لہذا عورت فطرۃً و لازماً مرد سے کمتر ہے۔

(۵) اسوقت تک ہر مادّی شے ذی وزن ثابت ہوئی ہے، لہذا نا ممکن ہے کہ کوئی مادّہ ایسا ہو، جو

وزن سے خالی ہو۔

یہ تمام مثالیں ہیں مغالطۂ زیر نظر کی۔ ان سب میں قدر مشترک یہ ہے، کہ یہ تمام تر اصول ذیل پرمبنی ومتفرع ہیں:۔

"جو کچھ اب تک نہیں ہوا ہے، وہ آیندہ بھی نہ ہوگا"

یہ کلیہ اس لحاظ سے تو بے شبہہ صحیح ہے، کہ جب تک تمام حالات و شرائط قائم رہیں گے، واقعہ بھی بدستور قائم رہے گا۔ لیکن تمام حالات و شرائط کا استقصاء کرکے، یہ دیکھنا کہ وہ کسی خاص موقع پر کس حد تک قائم ہیں، بجائے خود ایک خاص تحقیقات کا محتاج ہے، جس کا فیصلہ محض تعدد امثلہ ونظائر سے نہیں ہوسکتا۔ مانا کہ ایک شے ابتدائے آفرینش سے اب تک عالم وجود میں نہیں آئی ہے، لیکن یہ کہاں سے لازم آگیا، کہ وہ آیندہ بھی کسی حالت میں نہ پیدا ہوگی؟ اگر اب تک اسکی تکوین نہیں ہوئی، تو اسکی صاف وجہ یہ ہے، کہ اب تک اسکی تکوین کے کافی علل واسباب نہیں جمع ہوے، لیکن دنیا کے ہر روزہ اختلاف حالات کے ساتھ اگر آیندہ وہ کل علل و شرائط مجتمع ہوجائیں، تو یقیناً وہ شے وجود میں آجائے گی۔ اور کائنات کی ہمہ وقت تغیر پذیری کو پیش نظر رکھتے ہوے، ایسے علل و شرائط کے اجتماع میں کیا استحالہ ہے؟

(د) اسکے بعد اُن مغالطات کا نمبر آتا ہے، جن میں ہمزمانی کو تعلیل کا مرادف سمجھ لیا جاتا ہے۔ دو واقعات ایک ہی زمانہ میں ہوتے ہیں، اور انکے بارے میں یہ یقین کرلیا جاتا ہے، کہ انکے درمیان علت ومعلول کا تعلق ہے، حالانکہ ظاہر ہے کہ ہمزمانی، رشتۂ تعلیل کی مطلقاً مستلزم نہیں۔

(۱) اورنگ زیب کے زمانہ سے سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہُوا، لہذا اورنگ زیب زوال سلطنت مغلیہ کا باعث تھا۔

(۲) انگریزوں کے عہد حکومت میں، ہندوستان میں طاعون پھیلا، لہذا انگریزی حکومت طاعون پھیلانے کا باعث ہوئی۔

اس طرح کے غلط استقرائی نتائج ہم روزمرہ اپنے گردوپیش دیکھتے رہتے ہیں۔

اسی سے ملتا جلتا ایک دوسرا مغالطہ ہے، جسے گویا اس کا عکس کہنا چاہیے۔ اسکی صورت یہ ہوتی ہے، کہ کوئی واقعہ، جو متعدد عوامل موثرہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسکی اصلی علت اُن متعدد عوامل میں سے کوئی ایک شے قرار دے لیجاتی ہے، اور باقی کو بالکل نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر جمہوری سلطنت امریکہ میں مفید ثابت ہوئی ہے۔ تو بغیر امریکہ کے مخصوص حالات کا لحاظ کیے ہوے اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جمہوریت فی نفسہ ہر حالت میں فلاحِ رعایا کا باعث ہے، یا مثلاً ابتدائی جبری تعلیم انگلستان میں باعثِ برکت ثابت ہوئی ہے۔ تو اس سے اس نتیجہ پر پہنچنا، کہ بلا لحاظِ اختلافِ حالات، ہر ملک اور ہر سطح تمدن کے لیے جبری طریقۂ تعلیم مفید ہوگا۔

(ھ) فہرست مغالطات کا آخری عنوان، تمثیل ناقص ہے۔ تمثیل وتشبیہ سے انتاج قطعی کا دعی تو کوئی بھی نہیں۔ البتہ اگر تمثیل صحیح ہوتی ہے، تو اُس کا منشا یہ ہوتا ہے، کہ اگر ایک شے کسی ایک خصوصیت کے لحاظ سے، دوسری شے سے مشابہ ہے۔ تو بعض دوسری خصوصیات کے لحاظ سے بھی جو پہلی خصوصیات کی علت ومعلول نہیں، وہ اسکی مشابہ ہوگی۔ تمثیل سے کسی شے کی واقعیت کا ثبوت کسی حالت میں نہیں ہوسکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے، کہ ایک شے کے متعلق امکان یا احتمال پیدا ہوجائے۔ مثلاً ہم بعض سیاروں کے متعلق جانتے ہیں، کہ وہ شکل میں مدوّر ہیں، آفتاب کے گرد گھومتے ہیں، خود اپنے محور پر بھی گردش کرتے ہیں، آفتاب کی قوتِ جذب سے متأثر ہوتے ہیں، غرض ان سب حیثیات سے وہ ہمارے کرۂ ارض کے مشابہ و مماثل ہیں۔ اب اس مشابہت کی بنا پر ممکن ہے، کہ وہ انسانی آبادی کے لحاظ سے بھی کرۂ ارض کے مشابہ ہوں، یعنی ممکن ہے، کہ زمین کی طرح وہاں بھی لوگ بستے ہوں۔ لیکن یہ صرف امکان ہی امکان ہے۔ کیونکہ انسانی آبادی، اور سیاروں کے کروی الشکل وغیرہ ہونے کے درمیان کوئی نسبت تعلیل نہیں، ورنہ پھر تمثیل تمثیل نہ رہیگی، بلکہ استقراء کے دائرہ میں داخل ہوجائے گی)۔ مگر لوگوں کی ایک عام غلطی یہ ہے کہ اس امکان کو یقین کا درجہ دے دیتے ہیں۔ اور محض تشبیہ کی بنا پر قطعیت تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

یہ غلطی تو اُس وقت ہوتی ہے، جب تشبیہ صحیح ہو، لیکن اس بارے میں اصلی مغالطہ کی صورت

ہے، کہ تشبیہ ناقص ہو۔ تشبیہ کے ناقص ہونے کے یہ معنی ہیں، کہ جن دو خصوصیات کے درمیان تشبیہ دینا مقصود ہو۔ اُنکے درمیان ہمارے علم میں رشتۂ تعلیل نہ صرف غیر موجود ہو۔ بلکہ اس کا قطعی ثبوت بھی موجود ہو، کہ ان میں علت و معلول کی نسبت ہو ہی نہیں سکتی۔ مثلاً حامیانِ استبداد کا مشہور استدلالِ تمثیلی یہ ہے، کہ

> جس طرح خاندان کا وہ نظام نہایت کامیاب و خوش آیند ہوتا ہے، جس میں خانگی حکومت کا افسر اعلیٰ، کوئی بزرگ خاندان ہوتا ہے، جسکے فیصلوں میں بچوں کی رائے کو دخل نہیں ہوتا، اسی طرح سیاسیات میں بھی وہ نظام سلطنت سب سے زیادہ کامیاب و خوش آیند ہوگا، جس میں مُلک کی حکومت تمامتر ایک فرماں روا کے ہاتھ میں ہو، اور جس کے احکام میں رعایا کی رائے کو کچھ دخل نہ ہو۔

اس سے قطع نظر کرکے، کہ اس تمثیل میں، مقدمہ ممثل لہٗ بجائے خود کہاں تک صحیح ہے، اس میں اصلی مغالطہ یہ ہے، کہ حکومتِ خانگی و سیاسی کے درمیان، جن دو خصوصیات (یعنی مطلق العنانی و کامیابی) کے درمیان نسبت تعلیل قائم کی گئی ہے۔ ان کے متعلق ہمیں یہ بہ تحقیق معلوم ہے، کہ ایسی کوئی نسبت نہیں قرار دی جاسکتی۔ کیوں کہ خانگی زندگی کی مسرت میں افسرِ خاندان کی حکومت کی غیر مسئولیت کو کوئی دخل نہیں، بلکہ یہ تمامتر نتیجہ ہوتی ہے، اپنے خُردوں کے ساتھ افسرِ خانداں کی فطری بزرگانہ شفقت و مرحمت، اور سِن و تجربہ کار ہونے کا۔ حالانکہ ان دونوں چیزوں سے کوئی بھی ایک شخص و مطلق فرماں رواکے لیے ضروری نہیں۔ اس طرح کے چند مزید مغالطات درج ذیل ہیں۔

(۱) افراد کی حیات کی رفتار طبعی یہ ہے، کہ بچپن، لڑکپن، جوانی، سے گزر کر ضعیف ہوں، اور انکے قُویٰ میں بغیر کسی خاص مرض کے از خود انحطاط پیدا ہو جائے۔ اسی طرح حیات اقوام، جو حیاتِ افراد کے مشابہ ہے، اُسکا اقتضائے طبعی بھی یہی ہے، کہ بالآخر ضعیف ہو، اور محض کبر سنی کے باعث اس میں از خود انحطاط پیدا ہو۔

(۲) آدمی جب غرق ہونے لگتا ہے۔ تو اُسکے سر سے پانی کا ایک بالشت اور دس گز اونچا ہوتا

دونوں برابر ہیں۔ دونوں صورتوں میں وہ یکساں غرق ہوگا۔ اسی طرح گناہ کرتے وقت گناہ کا چھوٹا یا بڑا ہونا دونوں یکساں ہیں۔ وہ بہرصورت مساوی درجہ کا گناہ گار ہوگا۔

(۳) رفتار میں یک رنگی و یکسانیت، وابِ شرافت ہے۔ کبھی تیز چلنا، اور کبھی سُست، متانت کے خلاف ہے۔ جسے سوسائٹی نے صرف انسانی ضروریات کی مجبوریوں سے جائز رکھا ہے۔ مگر سیاروں کو کوئی ایسی مجبور کُن ضرورت لاحق نہیں ہوسکتی، اس لیے سیاروں کی رفتار شروع سے آخر تک ایک سی ہوتی ہے۔

(۴) کشتی، خواہ لعل و جواہر سے لدی ہو، خواہ ردی کاغذ سے، دونوں صورتوں میں اُسکے غرق ہونے سے ملاح کی یکساں حماقت ظاہر ہوتی ہے، اسی طرح آدمی کی کسی غلطی سے نقصان قلیل ہو یا کثیر، اسکی حماقت بہرصورت ساوی درجہ کی ہوگی۔

مغالطاتِ تمثیلی اکثر استعارات وتشبیہات کے پردہ میں ہوتے ہیں۔ استعارہ، بجائے خود استدلالی وقعت مطلق نہیں رکھتا، البتہ وہ یہ اشارہ کرتا ہے، کہ دو چیزوں کے درمیان کوئی وجہ شبہ موجود ہے، جسکی بنا پر ممکن ہے کہ استدلال قائم ہوسکے۔ تشبیہاتِ مرکّب میں ہمیشہ تشبیہاتِ مفرد کی بہ نسبت مغالطہ کا زیادہ احتمال ہوتا ہے۔ ایک بہت بڑا سبب مغالطاتِ تمثیلی کا یہ ہوتا ہے، کہ بعض اوقات زبان میں بالکل متباین ومختلف مفاہیم کو ادا کرنے کے لیے ایک ہی لفظ موجود ہوتا ہے، اور اس اشتراکِ لفظی کی بنا پر لوگ اشتراکِ معنوی قرار دینے لگتے ہیں، جو اکثر حالتوں میں ایک شدید غلطی ہوتی ہے۔ مثلاً ہماری زبان میں ایک لفظ "سخت" ہے۔ غور کرکے دیکھو یہ کتنے مفاہیم کے لیے استعمال ہوتا ہے؟ پتھر بھی سخت ہوتا ہے، دل بھی سخت ہوتا ہے، گرہ بھی سخت ہوتی ہے، دشواری بھی سخت ہوتی ہے، گفتگو بھی سخت ہوتی ہے۔ گرمی و سردی بھی سخت ہوتی ہے، وغیرہ۔ لیکن اگر کوئی شخص، سخت کلامی یا سخت مزاجی کی تمثیل سے، پتھر یا لوہے کی سختی کی علت تک پہنچنا چاہے، تو یہ کسقدر مغالطہ آمیز طریقہ ہوگا!

ل نے مغالطات پر جو کچھ لکھا تھا، اسکی ضروری تلخیص، اضافۂ تمثیلات کے ساتھ، گر کسی قسم کی

تنقید کے بغیر، اُوپر گزر چکی۔ مِل کے اقوال وبیانات کی تشریح اگرچہ ہم نے قصداً اس قدر کھول کر کی ہے، کہ اسکی رائے کی کمزوریاں، فہمیدہ ناظرین کو بہ آسانی نظر آسکتی ہیں، تاہم اُنپر صراحت کے ساتھ کوئی تنقید نہیں کی گئی۔ لیکن اس خاموشی سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا، کہ راقمِ مضمون، مِل کے اقوالِ بالا کو تنقید ونکتہ چینی سے بالاتر سمجھتا ہے۔ صفحاتِ گزشتہ میں مقولات وغیرہ پر جو سرسری تنقید کی گئی تھی، وہ عام منطقئین کے مذاق کے موافق تھی، جس میں راقمِ مضمون کے اجتہاد کو مطلق دخل نہ تھا۔ لیکن اگر اِس حصۂ مغالطات پر کوئی مجتہدانہ نظر کی جاتی، یا کم ازکم یہ کہ منطق جدید کے ائمہ مثلاً ڈاکٹر شیلر (Schiller) یا سب سے بڑھ کر ڈاکٹر مرسیر (Mercier) کے نقطۂ خیال سے (جو اپنے تئیں علانیہ ارسطو کا ہمسرو مدمقابل قرار دیتا ہے) اس موضوع پر روشنی ڈالی جاتی، تو ایک نہایت طویل جداگانہ بحث چھڑ جاتی، جو شاید مضمون ہٰذا کے اصلی مقصد یعنی اُردو داں پبلک سے مِل کے تعارف کرانے کے، حق میں زیادہ مفید نہ ہوتی۔

مِل کے نظام المنطق کے آخری حصہ کا عنوان ہے " منطقِ عمرانیات "۔ اسمیں مِل نے منطق کے جو کچھ اصول وقواعد مقرر کیے ہیں، اُنھیں معاشری واخلاقی مسائل پر منطبق کیا ہے۔ اس حصّہ کی تیاری میں اگرچہ مِل نے کمالِ دِقتِ نظر کو صرف کیا ہے، لیکن درحقیقت اس موضوع کو منطق سے کوئی واسطہ نہیں، یہ فلسفہ کا ایک جداگانہ مبحث ہے۔ اور اسی لیے اس کا ذکر اس وقت ہم قلم انداز کرتے ہیں۔

افسوس ہے، کہ جو شغف وانہماک مِل کو منطق کے خشک ونظری مباحث سے تھا، نفس بشری کے عملی وتر وتازہ مسائل سے نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی ساری محنت وجاں فشانی کا نچوڑ اس کوشش پر لگا دیا ہے، کہ مسائل عمرانی کو ایک ایک کرکے اپنے وضع کردہ قوانین منطق کے تحت میں لایا جائے۔ وہ غریب یہ نہیں جانتا تھا، کہ عمرانیات کی کلید، منطقیات نہیں، نفسیات ہے۔ وہ اس سے بیخبر تھا، کہ اخلاق ومعاشرت کے پیچیدہ وغامض مسائل کا حل، تقریباً تمامتر اسپر موقوف ہے، کہ فطرت بشری

کو سمجھا جائے، اور اُسکے قوانین سے واقفیت پیدا کی جائے۔ ایسی حالت میں، گو ہمیں اُسکی سعی و محنت کا پورا اعتراف ہے، لیکن اُس کی جاں فشانی کے ثمرات کو ہم ایک "عظیم الشان صیغہ" سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔ ہاں اس سلسلہ میں یہ ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے، کہ عمرانیات کے غوامض و اسرار کی عقدہ کشائی کے لیے محض افراد کے قوائے ذہنی یا نفسیات فردیہ (Individual Psychology) کا مطالعہ کافی نہیں، بلکہ اسکے لیے ضرورت ہے اجتماع و جماعات کے قوائے ذہنی سے واقف ہونے اور نفسیاتِ جمعیہ (Collective Psychology) سے مدد لینے کی۔ جس کا ایک اہم جزو "فلسفۂ اجتماع" کے عنوان سے عنقریب ایک مستقل رسالہ کی شکل میں پیش کشِ ناظرین ہوگا۔

عبدالماجد

غزل

(از جناب مولوی رضا علی۔ وحشت۔ کلکتہ)

بگڑتے ہو جو تم سُن کر مری تقریرِ بیتابی
بتاؤ بھی تو کچھ آخر مجھے تدبیرِ بیتابی

دمِ عرضِ تمنا ضبط سے گو کام لیتا تھا
نمایاں تھی مری صورت سے اک تصویرِ بیتابی

عبث تم بھی اُلجھتے ہو ہمارا حالِ دل سُنکر
کوئی تقریر میں تقریر ہے تقریرِ بیتابی؟

یہ اندازِ تغافل کس لیے مدِ نظر ٹھہرا
بُری لگتی ہے جب تمکو مری تقصیرِ بیتابی؟

اُنھیں کیا چھیڑنا منظور ہے اے اضطرابِ دل
نگاہِ گرم سے کرتے ہیں وہ تعذیرِ بیتابی

نمائش اُنکو ہے منظور اپنی شانِ تمکیں کی
ذرا اُٹھکر خبر لے اُنکی اے تاثیرِ بیتابی

پیام و نامہ اپنے دونوں کے دونوں ہیں بےمعنی
وہ ہے تقریرِ بیتابی یہ ہے تحریرِ بیتابی

تعلق کیا دلِ دیوانہ کو صبر و تحمل سے
حیا اُنکی مگر ہوتی ہے دامنگیرِ بیتابی

خیالِ نکتہ پردازی کہاں اور میں کہاں وحشت
غزل اپنی ہے اک اُلجھی ہوئی تقریرِ بیتابی

تعداد و طاقت

پرانے طریقۂ جنگ اور نئے اصولِ پیکار میں اسی قدر فرق ہے جس قدر بیل گاڑی اور ریل کی ڈاک گاڑی میں! "میدانِ کارزار" کی سرخی والے مضمون میں اس سے زیادہ نہیں ظاہر کیا جا سکا کہ آج کل میدان جنگ میں کس طرح پیش قدمی کی جاتی ہے اور کس طرح ایک، دوسرے کے مقابل صف آرا ہوتا ہے! مگر وہ ضروری مسائل جن کو جدید علم الحرب کے اصولِ موضوعہ یا علومِ متعارفہ کہا جاتا ہے چیزِ دیگر ہیں! ارادہ ہے کہ ان اصولوں کو موجودہ جنگی شطرنج کے موافق نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے اور حتی الامکان ناواقف پبلک کو اس سے آشنا بنایا جائے! ہر ایک اصول پر علٰحدہ علٰحدہ مستقل مضامین کی ضرورت ہے اور میں زیادہ تر جرمنی کے مشہور جنرل وان برن ہارڈی کے خیالات کا اقتباس کروں گا! مجھے ڈر ہے کہ زمین نہایت خشک ہے اور ہندوستانی طبائع کے لیے خصوصاً غیر دلچسپ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہندوستانی کی تعریف مختصر الفاظ میں۔ ع۔" لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں" سے زیادہ اچھی نہیں اختراع کیجا سکتی! لیکن پھر بھی موجودہ مذاق اس بات کا مقتضی ہے کہ علم الحرب کی نسبت اگر کچھ کان دھر کے سنا جاسکتا ہے تو آج ہی۔ صرف آج ہی!!

جرمن کے مشہور ماہرِ فنِّ حرب کلازیوٹز (Clausewitz) کا مقولہ ہے کہ "لڑائی بالکل گھرگھٹ کی طرح ہے۔ کیوں کہ یہ ہر موقعہ پر نیا رنگ بدلتی رہتی ہے"! اس میں شک نہیں کہ یہ مقولہ بالکل سچا اور تاریخ کی بے شمار شہادتوں پر مبنی ہے۔ لیکن پھر بھی اس قدر ضرور ماننا پڑتا ہے کہ اگر مختلف لڑائیوں کی جنگی کارروائیوں اور انکے نتائج پر غور سے نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک خاص بات ہمیشہ قریب قریب ہر لڑائی میں باقی رہتی ہے۔ ایک خاص صورت جنگی کارروائی میں ہمیشہ واقع ہوتی ہے۔ ایک خاص تعلق عملی کارروائی اور حصول مقصد میں قریب قریب کیساں نظر آتا ہے!

اوّل۔ لڑائی کا مقصد ہمیشہ سے ایک ہی چلا آتا ہے! کلازویٹز مقصدِ جنگ کی تعریف نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں یہ کرتا ہے کہ " اپنے منشاءِ دلی کو دشمن سے بزور پورا کرا لینا مقصدِ جنگ ہے" خواہ اپنی منشاءِ دلی دشمن کو شکست دینے سے حاصل ہو یا کوئی خاص حصہ ملک اس سے چھین لینے سے بر آسکے! بہرحال ہر صورت میں مقصدِ جنگ وہی ایک رہے گا! دوئم۔ فریقین لڑائی کے وقت ہمیشہ اسی ایک "قانون حملہ و مدافعت" (Law of attack and defence) پر کاربند ہوتے ہیں کیوں کہ کوئی جنگی کارروائی حملہ اور مدافعت کے علاوہ تصور میں کوئی قائم نہیں کی جاسکتی! سوئم۔ ہر لڑائی کی تمام عملی کارروائی کا دارومدار محض سپاہیوں کی جسمانی، دماغی، اور اخلاقی خصوصیات پر ہوتا ہے! یہ تینوں باتیں زمانۂ جاہلیت کی لڑائیوں سے لے کر موجودہ جنگ تک ہر لڑائی میں برابر نمایاں رہیں اور ہمیشہ یہ ہی رہیں گی! گویا یہ تینوں باتیں بہ حیثیتِ مجموعی جنگ کی روح ہیں جو ہمیشہ مختلف اوقات میں ایک نئے قالب میں جنم لیتی رہی ہے اور خدا جانے کب تک لیتی رہے گی!

اب ان متذکرۂ بالا غیر تغیر پذیر اصولوں کو علومِ متعارفہ مان کر جو اصول ہر حالات و وقت کے لحاظ سے وضع کیے جائیں قابلِ عمل سمجھے جاسکتے ہیں، اور کم و بیش ہر موقعہ پر کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں! لڑائی واقعی نہایت زندہ چیز ہے جس کا محض خیالی خاکہ اصلیت سے مو بہ مو نہیں مل سکتا! یہ صاف ظاہر ہے کہ سیاہی اور کاغذ کے ذریعہ سے علم الحرب کا کوئی ایسا نظریہ قائم کرنا جو ہر شعبہ میں عمل کے وقت لفظ بہ لفظ ناقابلِ مخالفت ثابت ہو، ناممکن ہے! مقامی خصوصیات، اسلحۂ نو ایجاد، طریقۂ پیغام رسانی، وغیرہ وغیرہ سب تغیر پذیر ہیں اور ان کے ساتھ ہی تدابیرِ ناظرانہ بھی منقلب ہیں۔ اس لیے کوئی ایسا اصول جو کسی حد تک بھی قابلِ تبدیلی نہ ہو قائم نہیں کیا جاسکتا! تاہم ایسی صورت میں ایک ایسا نظریہ ضرور قائم کیا جاسکتا ہے جو کم و بیش ہر موقعہ پر بطور اصول کے ہمیشہ کارآمد ہونے کا گمانِ غالب رکھتا ہو۔ ایسے نظریہ کو اصطلاحِ علمی میں (Theory of probabilities) یا بہ الفاظِ دیگر "نظریۂ گمانِ غالب" کہتے ہیں!

یہ نظریہ ہر اصول کی نسبت گزشتہ واقعات کے نتائج پر اور موجودہ ایجاداتِ نو کا لحاظ رکھکر قائم کیا جا سکتا ہے! ماضی و حال ہمیشہ مستقبل کے لیے اعلیٰ درجہ کی رہنمائی کرسکتے ہیں! مثلاً جنگ کا پرانی خاکہ کسی ایک نئی ایجاد کی وجہ سے فی الفور از سرتاپا نہیں پلٹ سکتا۔ بلکہ ہمیشہ ایسی تبدیلی بتدریج واقع ہوگی! مثال کے طور پر بارود کو لیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ بارود کے عالمِ وجود میں آجانے کے صدیوں بعد بندوق کی لڑائی اپنی موجودہ شکل تدریج پیدا کرسکی! نئی ایجادات کا پورا اور صحیح استعمال اُس وقت تک نہیں بیان کیا جا سکتا جب تک کہ وہ مختلف مقامات میں، اور مختلف حالات میں، میدانِ جنگ میں کام میں نہ لائی جا چکیں اور انکی خوبیاں اور نقائص اچھی طرح منکشف نہ ہو جائیں! اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ماضیِ قریب میں جو اصولِ حرب صحیح ثابت ہوے ہیں وہ حال میں بہ تغیر قلیل ضرور کارآمد اور سچے ثابت ہوں گے! ہماری مثال کے طور پر اصولِ رسد و امداد کو بیان کیا جا سکتا ہے: فریڈرک اعظم کے زمانہ میں فوج کا دارمدار اپنے ملک کے مرکزِ جنگ پر تھا، وہ قطعی طور پر رسد اور امداد کے لیے خطِ رسد و امداد کے قیام پر مجبور تھی! اُس زمانہ میں خطِ رسد و امداد کو کاٹ دینا فوج کو مغلوب کر لینے یا غارت کر دینے کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے خط امداد و رسد کا تحفظ ہر فریق کا فرضِ اوّلیں تھا! نپولین اعظم نے اپنے زمانہ میں نیا رنگ لیا اور بجاے مرکزِ جنگ سے رسد حاصل کرنے کے زیادہ تر میدانِ جنگ کے گرد و نواح سے رسد مہیا کرنے کا اصول قائم کیا! اس سے گویا وہ مرکزِ جنگ سے تعلق رکھنے سے آزاد ہو گیا اور خط امداد و رسد کی وقعت اسکے سامنے کچھ بھی نہ رہی! جرمنی نے بھی ۱۸۷۰ء کی لڑائی میں اسی سے زیادہ تر کام لیا اور یہ اصول کارآمد ثابت ہُوا! اسی کے لحاظ سے فیلڈ مارشل وان ڈی گولٹز (Von der Goltz) اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے کہ "ہم کو اپنے خطِ رسد و امداد پر دباؤ پڑنے کی کبھی پروا نہ کرنی چاہیے، بلکہ ہمیشہ آگے بڑھنے اور دشمن کو ہٹانے جانے میں مصروف رہنا چاہیے تاکہ وہ خود بخود عاجز آکر پسپا ہو کر ہمارے خطِ رسد پر سے اپنا دباؤ ہٹا لینے پر مجبور ہو جائے!" وان ڈی گولٹز کا یہ خیال اس وقت صحیح اور قابلِ پذیرائی ہے جبکہ

میدان جنگ ایک ایسے زرخیز اور غلّہ پیدا کرنے والے ملک میں ہو جہاں گرد و نواح سے رسد بہ آسانی مہیا کی جا سکے، ورنہ بحالت دیگر، خطِ امداد کا منقطع ہو جانا پھر وہی اثر قائم کرے گا جو وہ فریڈرک کے زمانہ میں کرتا تھا! غالباً اسی خیال سے جرمنی نے ۱۸۷۰ء کی لڑائی میں گرد و نواح سے زیادہ تر رسد حاصل کرنے کے ساتھ ہی مرکزِ جنگ سے بھی تعلق قائم رکھا اور خطِ رسد و امداد سے بھی قطعی غفلت اختیار نہیں کی!

مختصر یہ کہ اُن تین باتوں کے علاوہ جو رُوحِ جنگ سمجھی جا سکتی ہیں۔ جنگ کا قالب بتدریج پلٹتا رہتا ہے اور نئی اختراعات بتدریج اپنا اثر ڈالتی اور بیرونی شکل کو پلٹتی رہتی ہیں! ان پلٹ جانے والی باتوں میں سب سے پہلے قابلِ غور سوال تعدادِ سپاہ کا ہے! زمانۂ جاہلیت سے اس وقت تک تعداد کے لحاظ سے بہت کچھ تبدل واقع ہو چکا ہے! اسکی سب سے بڑی وجہ مختصر طور پر یہ بتائی جا سکتی ہے کہ پہلے ہر ملک پیشہ ور فوج رکھتا تھا اور اب بجائے اسکے یورپ کی ہر تہذیب یافتہ سلطنت نے۔ بہ استثنائے چند۔ لازمی فوجی خدمت کا قانون نافذ کر کے تمام قوم کو فوجی سانچے میں ڈھال دینے کی کوشش کی ہے! واقعہ یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں ہر ملک اپنی حفاظت یا اپنی جوعِ ملک گیری کے لحاظ سے ایک تنخواہ پانے والی فوج رکھا کرتا تھا جسکو پیشہ ور فوج بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں ملک کی آمدنی کے لحاظ سے بہت زیادہ فوج ہمیشہ رکھنا نا ممکن تھی اس لئے فوج کی تعداد کبھی ملکی آمدنی کی طاقت سے زیادہ نہیں بڑھ سکتی تھی! اب محض اس خرچ کا بار کم کرنے کے لیے دنیا نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ پیشہ ور فوج تو ہمیشہ ایک حد تک قابلِ برداشت تعداد میں قائم رکھی جائے، لیکن ساتھ ہی ملک کی تمام نرینہ آبادی کو لازمی فوجی خدمت کے قانون سے علم الحرب سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ ضرورت کے وقت تعداد حسبِ خواہش بڑھائی جا سکے اور ہمیشہ خرچ اسی قدر باقی رہے جس قدر کہ ملک کا خزانہ برداشت کر سکتا ہے!

اگر سچ پوچھیے تو پیشہ ور فوج کے بجائے قومی فوج کی اہمیت کو مذہب اسلام نے آج سے تیرہ سو [۱۳۰۰] برس پیشتر خوب اچھی طرح دریافت کر لیا تھا اور ایک خلیفہؓ کے وقت میں عملی طور پر مسلمانوں کی

تمام نرینہ آبادی وظیفۂ سپاہی حاصل کرنے کے معاوضہ میں خاص مدت تک جنگی خدمات بجا لانے کے لیے مجبور کی گئی تھی! اس وقت ہم کو یہ بحث کرنی مقصود نہیں ہے کہ اس قومی فوج کا موجد اولین اسلام تھا یا یورپ کی تہذیب جدید، اس لیے ہم اسکو فی الحال نظر انداز کرتے ہیں!

آج کل یورپ میں سپاہ کی تعداد برابر بڑھاتے رہنے کی عام وبا پھیل گئی ہے اور ہر سلطنت اپنی آمدنی پر مستقل پیشہ ور فوج کا۔ جسکو (Standing Army) یا باقاعدہ فوج بھی کہہ سکتے ہیں۔ انتہائی نقطہ تک بار برداشت کر رہی ہے! اس لیے میرے خیال میں تعداد سب سے پہلی قابل بحث چیز ہے!

اوّل یہ دیکھنا چاہیے کہ بڑی تعداد کی فوج ضرورت کے وقت کن کن باتوں کی محتاج ہوگی! جنگ کا آغاز ہوتے ہی مستقل باقاعدہ فوج کے علاوہ تمام ایسے انفاس جو بروے قانونِ خدمتِ جنگی ایک معینہ میعاد تک فوج میں شامل رہ کر قواعد دانی کے مراتب طے کر چکے ہوں، اجتماعِ افواج کے وقت، شرکتِ جنگ کے لیے ہر پیشہ و ملازمت سے سبک دوش کر دیئے جاتے ہیں اور فوج میں لے لیے جاتے ہیں۔ اس سے فوجِ مستقل کی تعداد دُوگنی اور بعض اوقات تگنی تک ہو جاتی ہے! اب اس بے شمار انبوہ میں بڑا حصہ وہ ہوتا ہے جو عمر کے لحاظ سے انحطاط کی حد تک پہنچا ہُوا ہوتا ہے نیز اس تعداد اضافہ شدہ کے لئے افسروں کی ضرورت لاحق ہوتی ہے! اسی لحاظ سے تمام فوج کو تین حصوں پر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ سپاہِ درجۂ اوّل۔ درجۂ دوئم۔ و درجۂ سوئم۔ ! ایسی سپاہ جو ہر طریقہ سے مکمل، تیار، واقف، اور قوی ہو درجۂ اوّل کہی جاتی ہے! درجۂ دوئم وہ ہے جس میں اضافہ شدہ تعداد کے بہترین انفاس بہ لحاظ عمر، طاقت، واقفیت وغیرہ کے چن لیے جاتے ہیں! درجۂ سوئم وہ ہے جس میں سن رسیدہ اشخاص یا بالکل نوجوان اور نیم واقف اشخاص رکھے جاتے ہیں! درجۂ اوّل کی سپاہ (First line troops) دشمن کے مقابلہ کے لیے بڑھائی جاتی ہے اور دشمن کے مُلک میں گھُسنے، جاں بازی کرنے، بہادری کے جوہر دکھانے وغیرہ وغیرہ کے لیے مخصوص ہے! سپاہِ درجۂ دوئم مفتوح قلعوں اور عقب

میں بنائے جانے والے جنگی استحکامات کی غور پرداخت میں کام لائی جاتی ہے نیز ضرورت کے وقت درجۂ اول کی کمی جو قتل کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو پوری کرنے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے! درجۂ سوئم کی سپاہ محض مفتوحہ آبادیوں کو محفوظ رکھنے یا خاص خاص گوشۂ ملک میں امن برقرار رکھنے کے لیے کام آتی ہے!

اس اضافہ شدہ تعداد کی وجہ سے ملک کی زراعت و تجارت میں کمی ہونی لازمی ہے۔ اس لیے ایسی بڑی تعداد آغاز جنگ سے انتہائے جنگ تک برابر باقی نہیں رکھی جا سکتی۔ بلکہ جب دشمن کے مقابلہ میں قابل وقعت فتوحات حاصل ہو جاتی ہیں تو سپاہ درجۂ دوئم و سوئم کا بڑا حصہ فوجی خدمت سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے تاکہ ملک کی اندرونی زراعت و تجارت میں نا قابلِ برداشت نقصان نہ واقع ہو سکے! البتہ جب فریقین ایک دوسرے کو کسی خاص مقام پر کافی عرصہ تک روک لیں اور کسی کو کوئی نمایاں فتح حاصل نہ ہو سکے تو عموماً انجام میں غلبہ اُسی فریق کو حاصل ہوتا ہے جس کا ایک سپاہی اپنے دشمن سے اخلاقی، قوتی، جسمانی اور دماغی خصوصیات کے لحاظ سے نسبتاً فوقیت رکھتا ہو۔ بفرض محال اگر ان تمام باتوں میں بھی فریقین بالکل یکساں ہوں تو پھر اُس فریق کو غلبہ حاصل ہو گا جو مالی حیثیت سے اپنے دشمن سے زیادہ دیر تک جنگ کے اخراجات کا متحمل ہو سکے!

بڑی تعداد کی سپاہ کے لیے جنگ کے زمانہ میں جو مشکلات واقع ہوتی ہیں وہ بھی نہایت اہم ہیں! سب سے پہلی مشکل یہ پڑتی ہے کہ چھوٹے درجہ کے افسروں کی غیر معمولی تعداد کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اور یہ افسر کم از کم ایسی قابلیت کے مہیا کیے جاتے ہیں جو اپنے گروہ کی رہبری پورے طور پر کر سکیں! اسکے بعد رسد کا سوال پیدا ہوتا ہے: گو رسد سے بھی پیشتر خود اس تعدادِ کثیر کی نقل و حرکت کے لیے متعدد ریلوں کی ضرورت ہے جو انکو قلیل عرصہ میں میدانِ جنگ تک پہنچا سکیں اپھر سامانِ حرب کے انبار اس تعدادِ کثیر کے استعمال کے لیے فراہم کرنا اور ہر حصہ میں برابر پہنچاتے رہنا ایک بڑی دقت کا سامنا ہے! اسکے ساتھ ہی زخمیوں کے معالجہ کے لیے جنگی شفا خانوں کی بڑی تعداد مہیا کرنے کی اور انکو برابر عقب میں تیار رکھنے کی مشکل پیش آتی ہے! سب سے زیادہ دقت یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایسی بڑی

فوج کے اجتماع اور عملی کارروائی کے لیے نہایت بڑے اور وسیع میدان کی ضرورت ہوتی ہے اور جنگ بجائے کسی ایک حصۂ ملک تک محدود رہنے کے بہت دُور تک پھیل جاتی ہے؛ اب ایسے طویل خطِ تقابل کی صورت میں رسد کا تمام جگہ روزانہ بلاتاخیر پہنچتا رہنا کس قدر مشکل کام ہو جاتا ہے؟ پھر ان سب باتوں کے علاوہ اس تعدادِ کثیر کو صف آرا کرنے کے لیے سڑکوں اور رستوں کا جال بنانا اور استعمال کرنا پڑتا ہے تاکہ یہ انبوہِ کثیر، بلا دقت و تضیع اوقات، خطِ تقابل پر قدم جما سکے! اب یہاں یہ بھی قابل غور ہے کہ ہر سڑک پر سے اس قدر کثیر تعداد پیش قدمی کے وقت بڑھائی جاتی ہے جس قدر کہ سڑک کی محدود وسعت اجازت دے سکے! پھر مختلف سڑکیں استعمال کرنے کے وقت یہ لحاظ رکھنا بھی نہایت ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر سڑک پر جانے والی تعداد کے موافق رسد و سامانِ جنگ برابر پہنچتا رہے! اسی کے لحاظ سے مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ہر راستہ کے عقب میں ذخیرۂ سامان و رسد قائم کیا جائے اور برابر ہر دستہ کی پیش قدمی کے ساتھ آگے بڑھایا جائے۔ مگر یہ دقت اُس وقت اور بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے جب کہ فوج کی کثیر تعداد کے لائق میدانِ جنگ کے گرد و نواح سے کافی رسد فراہم نہیں ہو سکتی اور مُلک کے اندرونی مرکزِ جنگ سے سلسلہ قائم رکھنا لازمی اور ضروری ہو جاتا ہے!

حرابیۂ جنگ کے لحاظ سے بھی بڑی تعداد کی وجہ سے بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے! بڑی تعداد کی وجہ سے بیشمار قطاروں کی صورت میں متوازی جانے والی سڑکوں پر پیش قدمی کرنی پڑتی ہے اور ایسی صورت میں صاف ظاہر ہے کہ کثیر تعداد کو صف کی شکل اختیار کرنے میں بہت دیر لگ جاتی ہے! ساتھ ہی راستوں کی مقامی مشکلات یعنی نشیب و فراز، تنگی و ناہمواری، یہ سب باتیں تعدادِ کثیر کی پیش قدمی میں بہ نسبت ایک چھوٹی فوج کے زیادہ دقتیں پیدا کرتی ہیں اور انکے عبور کرنے میں نسبتاً زیادہ وقت اور پوری محنت درکار ہوتی ہے! ایک اور بات قابلِ لحاظ یہ بھی ہے کہ ایسی بڑی فوج کی نقل و حرکت میں بلا کسی لڑائی کے جانوں کا نقصان بھی بہت ہوتا ہے، مثالاً ۱۸۷۰ء کی لڑائی پیش کی جا سکتی ہے جس میں پہلے معرکۂ جنگ کے واقع

ہونے تک محض نقل و حرکت کی وجہ سے جرمنی فوج میں آٹھ اور نو فی صدی کے درمیان جانوں کا نقصان ہوگیا تھا! یہ سب مشکلات تو محض اُس صورت میں واقع ہوتی ہیں جب کہ برابر کامیابی حاصل ہوتی رہے یا کم از کم کسی مصیبت سے سامنا نہ پڑے! لیکن فی الواقع سب سے زیادہ تباہ کُن دقت یہ بھی ہے کہ اگر فوجِ کثیر کی رسد صرف ایک روز کے لیے بھی بند ہو جائے یا کسی اور وجہ سے کوئی پست ہمت کرنے والی افواہ پھیل جائے تو پھر یہ انبوہِ کثیر کسی کے قابو کا نہیں رہتا اور ایسی بے چینی اور سراسیمگی پھیل جاتی ہے جس سے محض دشمن سے شکست اُٹھانے کا ہی اندیشہ نہیں رہتا بلکہ خود اِس بے ہنگم اور بے چین انبوہ کے ہاتھوں اپنا مُلک خطرہ میں پڑ جانے کا پورا پورا خوف پیدا ہو جاتا ہے!!

متذکرۂ بالا تمام باتوں پر مجملاً نظر ڈالنے سے یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ "آخر ایسی مشکلات اور مصائب کے ہوتے ہوئے کیوں بڑی تعداد کی افواج مہیا کی جاتی ہیں۔ اور اس کثرتِ تعداد کی روز بروز بڑھنے والی وبا یورپ میں کس بنا پر اس قدر عالمگیر ہے"؟

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ نسلیں جنگ کے وقت محض تعداد کو فیصلہ کُن جزوِ اعظم سمجھنے لگی ہیں! اور اس خیال یا یقین کی بنا اس دلیل پر ہے کہ اگر مختلف سلطنتوں کا سامانِ جنگ۔ یعنی خوبی اسلحہ۔ اور قابلیتِ سپاہ برابر سمجھ لی جائے تو ایک کو دوسرے پر غلبہ محض تعداد کی زیادتی سے حاصل ہو سکتا ہے! سچ بھی یہ ہے کہ ایسی برابری کی صورت میں محض تعداد ہی قابلِ لحاظ سمجھی جا سکتی ہے! اسکے علاوہ ہر فوج کی طاقت کا اندازہ بھی دفترِ جنگ محض تعداد کے لحاظ سے کرتا ہے! یہ معلوم ہو جانے پر کہ دشمن کی فوج کی تعداد کس قدر ہے۔ پھر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ کیا اور کس قدر کر سکتی ہے اور اسکا دفعیہ کس طرح ممکن ہے! لیکن فی الحقیقت تعداد اور طاقت دو علیحدہ چیزیں ہیں اور ایک عملی سپاہی میدانِ جنگ میں کاغذی نتائج کی کمزوری اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتا ہے! دفترِ جنگ اگر دشمن کی طاقت محض اسکی تعداد کے لحاظ سے سمجھتا ہے تو وہ کبھی ایسے نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا جو کاغذ کی سطح پر، اربعہ کے لحاظ سے، صحیح ہونے پر، میدانِ کارزار میں بھی عمل کے وقت صحیح ثابت ہو! دشمن کی تعداد معلوم ہو جانے سے اس قدر ضرور رائے لگائی جا سکتی ہے کہ کون سی بات

تعدادِ معلوم شدہ کی انتہائی قابلیت تک ممکن ہے اور کس قدر ناممکنِ محض ہے! لیکن ایسی رائے قائم کرنے کے وقت سب سے زیادہ سپاہ و دشمن کی قومی خصوصیات کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری چیز ہے: مثلاً ایک قوم آگے بڑھنے میں نہایت دلیری کا اظہار کرتی ہے لیکن شکست کے وقت مدافعانہ طور پر قدم جمانے میں بہت جلد پژمردہ دل ہو جاتی ہے - یا ایک قوم اسکے برعکس مدافعت میں لوہے کی دیوار بجاتی ہے لیکن حملہ کرنے میں تھوڑی سی مشکل اُسکے اوسان باختہ کر دیتی ہے! قومی خصوصیات ایک فطرتی جزوِ اعظم ہے جو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا! بعض قوم خاص خاص اسلحہ کے استعمال میں اس قدر مشاق ہوتی ہے کہ محض اُس خاص اسلحہ کے استعمال کے وقت وہ دوسری قوم کی زیادہ تعداد پر بآسانی غلبہ حاصل کر لیتی ہے! مثلاً عرب نیزہ و تیر کے استعمال کے لیے کسی زمانہ میں خاص طور پر ممتاز تھے، یا موجودہ زمانہ میں کاسک اور ترک تلوار کے دھنی مانے جاتے ہیں! انگریزوں کی خصوصیت سنگین کی لڑائی بیان کی جاتی ہے اور توپ خانہ و آتش فگن اسلحہ کے استعمال پر جرمن بہت دل دادہ ہیں! تعداد کے ساتھ ان خصوصیات کا پورا پورا لحاظ رکھے بغیر طاقت کا اندازہ کبھی نہیں کیا جا سکتا! محض تعداد کو طاقت سمجھ لینا سراسر غلط فہمی ہے! تاریخ شاہد ہے کہ اکثر اوقات بڑی تعداد کی فوج کو اپنے سے چھوٹی تعداد والے دشمن سے شکست اٹھانی پڑی ہے! جس وقت باؤربکی (Bourbaki) نے اپنی کثیر التعداد فوج سے لی آئین (Lisaine) پر حملہ کیا تو جگہ کی تنگی کی وجہ سے اُسکو سخت وقت کا سامنا پڑا - ۲۲۳ توپوں میں سے صرف ۸۰ توپیں کام میں لائی جا سکیں اور باقی جگہ کی تنگی کی وجہ سے محض بیکار رہیں: علیٰ ہذا پیدل فوج بھی اپنی زیادتی تعداد کا کوئی اثر دشمن پر نہیں ڈال سکی اور نہ ہی میدانِ جنگ نے ساری پیدل فوج کو ایک ساتھ حملہ آور ہونے کی اجازت دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بڑی فوج کو چھوٹی فوج کے سامنے میدان چھوڑنا پڑا! ایسی صورتیں اکثر پیدا ہو سکتی ہیں اور ہوئی ہیں کہ بڑی تعداد والی فوج کسی خاص مقام پر محض اپنی تعداد کی وجہ سے دیر میں مجتمع ہو سکی ہے اور چھوٹی فوج نے اس سے پیشتر صف آرا ہو کر اُسے پسپا کر دیا ہے! اسکے علاوہ

بعض اوقات ملک کی ویرانی اور سڑکوں کی کمی کی وجہ سے بڑی تعداد کی پیش قدمی اور رسد میں سخت دقتوں کا سامنا پڑا ہے! یہ صاف ظاہر ہے کہ سڑکیں ہر ملک میں بہ اعتبار آبادی کی آمد و رفت کے بنائی جاتی ہیں اور ایک کم آباد و ویران ملک میں بہت دور دور اور کم ہوتی ہیں! ایسے ملک میں بڑی تعداد کی فوج خود اپنی ہستی قائم نہیں رکھ سکتی! ہر ملک کی پیداوار کے لحاظ سے ایک خاص تعداد سے زیادہ کے لیے رسد فراہم کرنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور یہ سب سے بڑی مصیبت ہے! نپولین اعظم جیسے فطرتی جنرل نے بھی اسی دقت کی وجہ سے سخت نقصان اٹھایا تھا! ۱۸۱۲ء میں جب نپولین نے روس میں پیش قدمی کی تو محض بڑی تعداد کی وجہ سے وہ تمام فوج کے لیے سردی کے اثر سے بچائے رکھنے والی وردیاں اور سامان کافی فراہم نہ کرسکا! اسکے علاوہ ملک کی ویرانی اور سڑکوں کے دور دور واقع ہونے کی وجہ سے وہ فوج کو کئی راستوں پر تقسیم کرکے نہ بڑھا سکا کیونکہ تقسیم کرکے بڑھانے میں ہر قطار دوسری قطار سے فاصلۂ دراز پر جا پڑتی تھی اور ایسے ویران ملک میں کئی کئی جگہ رسد کا انتظام کرنا ناممکن تھا۔ مجبوراً فوج کو مجتمع رکھکر پیش قدمی کرنی پڑی لیکن پھر بھی۔ باوجود قرب قطار کے۔ ہر حصہ کو رسد پوری نہ پہنچ سکی اور بھوکے غول تمام قواعد و فرمانبرداری کے قوانین سے آزاد ہوگئے! اسکی وجہ سے اس قدر گڑبڑ پھیلی اور نقصان ہوا کہ کل فوج میں سے جو آغاز پیش قدمی کے وقت تین لاکھ تھی۔ صرف ایک لاکھ تیئیس ہزار فوج بوروڈینو (Borodino) کے میدان تک پہنچ سکی اور یہ بھی آگے بڑھ کر ماسکو (Moscow) پہنچتے پہنچتے صرف نوّے ہزار رہ گئی! نتیجہ یہ ہوا کہ مزید پیش قدمی قطعی ناممکن ہوگئی اور بے نیل و مرام واپس ہوتے ہوئے یہ نوّے ہزار بھی بھوک اور جاڑے کا شکار بن گئے!

مذکورۂ بالا مثالیں تو ایسی ہیں جن پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ناموزونیِ ملک یا ناموافقتِ آب و ہوا اس بربادی کا باعث ہوئی لیکن اسکے علاوہ تاریخ میں بے شمار مثالیں ایسی بھی موجود ہیں جہاں کوئی فطرتی مصیبت درپیش نہیں آئی اور پھر بھی قلیل تعداد نے کثیر تعداد کو ہرا دیا!

رومیوں نے اپنے زمانہ میں قلیل ہی تعداد سے بڑے سے بڑے ملکوں کو زیر کیا۔ عربوں نے اپنے عروج کے وقت شام اور ایران میں قریب قریب تمام نمایاں فتوحات قلیل تعداد سے ہی حاصل کیں اور اپنے سے کہیں زیادہ بڑی فوجوں کو نیچا دکھایا۔ جنگِ یرموک اسکی بیّن مثال ہے جہاں دشمن کی تعداد عربوں سے قریب قریب ڈھائی گُنی تھی! ان تمام واقعات پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ قلم دوات کے ذریعہ سے چاہے کتنے ہی منطقی دلائل پیدا کر کے تعداد کو فیصلہ کُن جزوِ اعظم سمجھ لیا جائے لیکن میدانِ جنگ میں عملی صورت میں ایسے تمام دلائل قطعی لغو ثابت ہوتے ہیں! اس سے یہ نتیجہ صاف طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تعداد اور طاقت لازم و ملزوم نہیں ہیں بلکہ دو جداگانہ چیزیں ہیں اور ایک کے ساتھ دوسرے کا ہونا لازمی نہیں ہے! اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تعداد سے طاقت کا اندازہ نہ کیا جائے تو پھر وہ کونسا ذریعہ ہے جس سے طاقت معلوم ہو سکے؟

اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ دشمن کی تعداد کے ساتھ اُسکی تمام قابلیتوں اور خصوصیتوں کا بھی کامل علم بہم پہنچایا جائے۔ یہ میدانِ جنگ میں نہیں ہو سکتا بلکہ پیشتر سے مکمل معلومات ہونی چاہییں۔ دشمن کی پسندیدگی و رجحانِ طبع۔ دشمن کی مالی حالت و کمزور پہلو۔ ان سب باتوں کا علم جنگ سے پیشتر جہاں تک اچھا حاصل ہو سکے وقتاً فوقتاً کیا جائے تاکہ جنگ کے وقت دشمن کی تعداد کے ساتھ ان خصوصیات کا لحاظ رکھا جا سکے! اب واضح طور پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ تعداد کو علٰحدہ کر کے طاقتِ فوج کن کن باتوں پر مبنی ہے! سپاہیوں کی جسمانی اور اخلاقی مضبوطی؛ قوم کا مجموعی چال چلن؛ سپاہیوں اور گھوڑوں کی قواعد دانی؛ سامان نقل و حرکتِ رسد کی عمدگی اور اسلحۂ جنگ کی اعلیٰ و مضبوط ساخت؛ سپاہیوں میں فرماں برداری کا پورا پورا احساس؛ سپاہیوں میں اپنے اوپر بھروسہ کرنے بلکہ یقین رکھنے کی قوت؛ سپاہیوں کو اپنے افسروں کی اعلیٰ قابلیت پر پورا پورا اعتماد؛ افسروں میں ذہانت، تجربۂ کامل، اور بہادری کا جوش؛ اور تمام قوم میں حُبِّ وطن کا پورا پورا اثر؛ یہ وہ باتیں ہیں جنکا ہونا

لازمی اور ضروری ہے اور ہر فوج کی طاقت کی کمی و بیشی ان ہی اجزاء کی کمی و بیشی پر منحصر ہے! شاید متذکرۂ بالا باتوں میں سے وہ باتیں بادی النظر میں فضول نظر آئیں جو سپاہ کے علاوہ کُل قوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر دراصل وہ بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہیں! یہ ظاہر ہے کہ جنگ کے وقت مُلک کی آمدنی کو بڑا زبردست دھکا لگتا ہے اور تجارت و زراعت پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے، ہر پیشہ و صنعت کی قدر میں کمی ہو جاتی ہے۔ اور ہر قسم کی کفایت شعاری لاحق ہو جاتی ہے! اگر کُل قوم کو ان باتوں کا احساس نہ ہو اور تمام مشکلات کو دلیری و صبر کے ساتھ برداشت نہ کرسکے تو محض لڑنے والی فوج ایسے دشمن کا جسکی تمام قوم اس احساس میں ڈوبی ہوئی ہو کچھ نہیں کرسکتی! اسکو بھی چھوڑ دیا جائے تو ایک اور پہلو سے بھی تمام قوم کا ایک ہی رنگ میں رنگا ہونا نہایت ضروری قرار پاتا ہے۔ وہ یہ کہ جب لڑائی کی تیزی و شدت جانوں کا نقصان کثیر کر دیتی ہے۔ اور ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ تو اس کمی کے پورا کرنے کے لیے نئی تعداد مُلک کی آبادی میں سے بھرتی کی جاتی ہے۔ اگر قوم کو حُبِّ وطن کا احساس نہیں ہے تو کسی تحصیلدار اور کمشنر صاحب کی کوشش بارآور نہیں ہو سکتی اور کوئی بھرتی ہونے کے لیے بخوشی تیار نہیں ہوتا! یا اگر کسی جبریہ قانون کے نفاذ کے بدولت بھرتی کرنے کے لیے کافی تعداد مل بھی جائے تو ایسی کمزور اخلاق کی مخلوق میدانِ جنگ میں کچھ وقعت نہیں رکھتی بلکہ اُلٹی بلائے جاں ہو جاتی ہے! بلائے جاں اس وجہ سے سمجھیے کہ اِن ناموزوں افراد کو تنہا تو استعمال کیا ہی نہیں جا سکتا البتہ اگر تربیت یافتہ فوج میں تھوڑے تھوڑے گروہ شامل کر دیے جائیں تو ان کا استعمال ممکن ہے۔ لیکن ایسی صورت میں اس مادّۂ فاسد کے وجود سے تربیت یافتہ فوج کے جسم تندرست میں ایک ناقابل علاج ناسور پیدا ہو جاتا ہے! فوج کے سپاہی شطرنج کے لکڑی کے مُہرے تو ہیں نہیں کہ سب کی قوت یکساں ہو۔ اس لیے عمدہ چیز میں خراب چیز کو شامل کرنا گویا خود عمدہ چیز کی قیمت گھٹا دینا ہے! جنگ ایسی چیز نہیں ہے جہاں دس دلیروں کے ساتھ پانچ بزدل مل جُل کر کام کر جائیں۔ ایسی آمیزش ناموزوں سے

اُلٹا یہ خوف پیدا ہوجاتا ہے کہ کبھی ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ نہ کردے اور مٹھی بھر بزدل ساری فوج کو پست ہمت نہ بنادیں! موت کا سامنا کرتے ہوئے کسی ایک سے بھی پست ہمتی کا اظہار غضب کا دل شکن ہوتا ہے! اس قسم کی مثال ۱۸۷۰ء کی فرانسیسی امپیریل فوج میں صاف نظر آتی ہے! اس لڑائی میں جب نوآموزوں اور پنشن یافتہ یا ریزرو فوج کو باقاعدہ فوج میں ملا یا گیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ باقاعدہ فوج بھی کمزور اور کم قیمت ہوگئی! پانچویں آرمی کور صرف ایسی تھی جس میں سے ایسی آمیزش آخر میں جدا کردی گئی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ سار (Saar) سے ہٹتے ہوئے جب یہ فوج مِز (Metz) کے سامنے پہنچی تو اسکے افسر نے افسر اعلیٰ سے درخواست کی کہ نوآموز حصۂ سپاہ جو اس میں شامل تھا علٰحدہ کرلیا جائے اور قلعۂ مِز کی نگہبانی کے لیے تعینات کردیا جائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایسے مادۂ فاسد کا وجود تعداد کے کم ہوجانے سے بدرجہا زیادہ نقصان دہ ہے! افسر اعلیٰ نے اسکی درخواست منظور کرلی اور یہ نوآمیز شدہ حصہ علٰحدہ کردیا گیا۔ اسکے بعد پانچویں آرمی کور جس بہادری کے ساتھ لڑی وہ کبھی صفحۂ تاریخ سے نہیں مٹ سکتی! فرانس کی کثیر التعداد فوج میں سے صرف یہ ہی وہ آرمی کور (Army Corps) تھی جس نے جرمن کے شدید ترین حملوں اور انتہائی کوششوں کے مقابلہ میں بھی ایک انچ زمین آخر وقت تک نہیں چھوڑی حالانکہ اور بریگیڈ - فرانسیسی فوج کے دستے - نہایت معمولی حملوں کے سامنے پسپا ہوتے چلے گئے! اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جزوِ اعظم تعداد نہیں ہے بلکہ طاقت ہے!

اصلیت یہ ہے کہ طریقۂ اجرائے جنگ (Way of Conducting War) فتح و شکست کا جزوِ اعظم ہے! مقامِ جنگ کی قدرتی خصوصیات، یا مصنوعی استحکامات، اور اسلحۂ نوایجاد کا مکمل استعمال، ایسی باتیں ہیں جن سے پیدا ہونے والے مفاد جس فریق کو حاصل ہوجائیں وہ انجام تک غالب ہی رہتا ہے! یہی وجہ ہے کہ فریقین ابتدائے جنگ میں تند و تیز شاطرانہ حملہ

مطلب اس سے پانچویں آرمی کور کے صرف ایک بریگیڈ سے مطلب ہے جس کا نام لاپاسٹ کا بریگیڈ (Lapasset's Brigade) تھا!

ایسے مفاد حاصل کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور جو فریق ان مفاد کے بدولت فوقیت پاتا ہے اُسکا پلہ آخر وقت تک ۔ بلا کسی غیر معمولی غلطی کے ۔ ضرور بھاری رہتا ہے ! اس ابتدائی شاطرانہ کارروائی کے بدولت ہی ایک کم تعداد والی فوج اپنے سے بدرجہا زیادہ فوج کے مختلف حصوں کو علٰحدہ علٰحدہ ، یکے بعد دیگرے ، شکست دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور بڑی فوج کو کسی ایک جگہ اپنے مقابل مجتمع ہونے کی فرصت نہیں دیتی ! لیکن ایسی تمام فتوحات اعلیٰ درجہ کی رہبری کی محتاج ہیں اور بلا ایک بہادر ، تیز فہم ، مضبوط اور واقف افسر کے انکا واقع ہونا ناممکن ہے! اعلیٰ درجہ کا افسر اپنی قابلیتِ دماغی ، اپنے تجربے ، اور اپنی جوش افزا دلیری سے چھوٹی تعداد سے ہی تمام فوقیت و غلبہ حاصل کرلیتا ہے ! عربوں کی ابتدائی فتوحات میں خالدؓ سیف اللہ اور بنی اُمیّہ کے زمانہ میں قتیبہ بن مُسلم ایسے افسروں کی زندہ مثال تھے : نادر شاہ ، محمود غزنوی ، اور بابر بھی اعلیٰ درجہ کے مستقل مزاج ، دُھن کے پکّے اور دلیر افسر گزرے ہیں ! انقلابِ حکومتِ فرانس (French Revolution) کے زمانہ میں نپولین نے عمدہ طریقہ اجرائے جنگ کے بدولت ، برابر فتوحات حاصل کیں ! خصوصًا یہ کپتانِ اعظم ۔ ہمیشہ فاتح بننے والا کورسیکن ۱۷۹۶ء کے پہلے محاصرہ میں غضب کی جدّت اور دلیری کا اظہار کرتا رہا ! اسکے دشمنوں کی افواج تعداد کے لحاظ سے اُس سے بہت زیادہ تھیں لیکن وہ اپنی چھوٹی سی فوج سے ان کثیر التعداد افواج کے مختلف حصوں کو برابر شکست دیتا رہا ۔ اُسکی شاطرانہ چال صرف یہ تھی کہ وہ دشمن کی تمام فوجِ کثیر التعداد کو کسی جگہ مجتمع نہیں ہونے دیتا تھا اور اپنی تھوڑی فوج سے پہلے ایک حصہ کو شکست دیتا تھا اور پھر پلٹ کر دوسرے کو ہٹا دیتا تھا ۔ ان شکست یافتہ حصص کا پراگندہ ہوتا رہنا آخرکار مختتم نا کامیابی کا باعث ہُوا اور نپولین کے دشمن اُسکے مقابلہ میں اپنی بڑی تعداد کی فوج کو مجتمع کرلینے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئے ! صرف ایک ہی فوج سے جو نسبتًا تھوڑی اور قلیل التعداد تھی نپولین اپنے تمام دشمنوں کو مقامی شکستیں متواتر دیتے رہنے ، اور انجام میں قطعی طور پر فاتح بننے میں کامیاب رہا ! اگر نپولین کی مثال کو چھوڑ دیا جائے تو بھی زمانہ قریب میں

اس قسم کی اور مثالیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً ۰۴-۱۹۰۴ء کے آغاز میں جب جاپان نے روس پر حملہ کیا تو اُسکو اچھی طرح علم تھا کہ زار کی کثیر التعداد افواج اُس سے کئی گنی زائد ہیں۔ مگر وہ یہ سمجھتا تھا کہ زار اپنی تمام فوجوں کو پورٹ آرتھر کے قریب ایک ساتھ نہیں پہنچا سکتا اور نہ کبھی مجتمع کرنے میں کامیاب ہو سکے گا اس لیے جس قدر فوج کہ وہ ایک وقت میں لا سکے گا اُسکو ہم برابر شکستیں دیتے رہنے کی طاقت رکھتے ہیں! جاپان کا یہ خیال بالکل صحیح تھا اور چھوٹی سلطنت بڑی سلطنت کی کثیر التعداد فوج کے کاٹتے رہنے اور شکستیں دیتے رہنے میں کامیاب ہو گئی!

اب اس تمام بحث اور مثالوں سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ طاقت اور تعداد دو مختلف چیزیں ہیں اور چھوٹی تعداد والی فوج اپنی عمدگی اور حُسنِ اجراے جنگ کے بدولت بڑی تعداد والی فوج کے مختلف حصوں پر مقامی فتوحات برابر حاصل کر سکتی ہے۔ یا اپنی طاقت کے بدولت دشمن کے مقابلہ میں اس قدر استقلال کے ساتھ پانوں جمائے رکھ سکتی ہے کہ وہ غلبہ جو دشمن کو بلحاظ زیادتیِ تعداد کے حاصل ہو اس زیادتیِ طاقت کے اظہار سے اسکا وزن برابر ہو جائے اور غلبۂ تعداد کچھ اثر نہ ڈال سکے!

خیال ہے کہ ان تمام دلائل کو پڑھنے کے بعد یہ غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے کہ تعداد بمقابلۂ طاقت کے کچھ اثر نہیں رکھتی۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس خاص بات کو اور زیادہ واضح کر دیا جائے! حقیقت یہ ہے کہ دونوں چیزوں کا موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس تمام طول و طویل بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض اوقات مقامی مشکلات یا کسی اعلیٰ درجہ کے افسر کی قابلیت چھوٹی فوج کو بڑی فوج پر غالب کر دیتی ہیں! لیکن زیادتیِ تعداد کے مقابلہ میں ایسی شاطرانہ یا دلیرانہ کارروائی کا امکان ایک خاص حد تک محدود ہے! اگر ایک فوج اور دوسری فوج میں ایک اور دس اور ایک اور پانچ کی نسبت ہو تو دنیا کی کوئی طاقت شاطرانہ قابلیت، یا بے نظیر بہادری۔ ایسی چھوٹی فوج کو کسی طرح کامیاب نہیں بنا سکتی! اس قدر زیادتیِ تعداد گویا حد سے متجاوز ہو جاتی ہے! آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ فنِ کشتی کا ماہر پہلوان

اپنے سے زیادہ تنومند اور طاقتور کو محض داؤ پیچ سے مار لیتا ہے، لیکن اگر لنگر اور طاقت کے لحاظ سے ایک دوسرے میں دُگنے یا تگنے کا فرق ہو تو کوئی پیچ اپنے اظہارِ ہنر سے ایسی دُگنی طاقت کے مقابلہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ بعینہٖ یہی حالت فوج کی تعداد اور طاقت کی بھی سمجھ لیجیے! اسکی ایک بیّن مثال نپولین کے زمانہ میں نظر آتی ہے۔ جب ۱۸۱۳ء میں نپولین اپنی کم تعداد فوج کے ساتھ متحدہ سلطنتوں کی بڑی فوج کا مقابلہ کر رہا تھا۔ تو اُس نے جرمنی کی فوج کے مختلف حصوں کو جو کئی قطاروں میں علٰحدہ علٰحدہ بڑھ رہے تھے متعدد مقامات پر اپنی پُرانی چال کے ساتھ مقامی شکستیں دیں اور سخت نقصان پہنچا کر اُنکو پسپا کر دیا۔ لیکن فی الواقع نپولین کی فوج اور سلطنتہائے متحدہ کی فوج میں تعداد کے لحاظ سے اس قدر زیادہ فرق تھا کہ یہ شکستیں اُٹھانے اور سخت نقصان کے بعد بھی متحدہ فوج کی جمعیتِ اصلیہ سے مقابلہ ہوا تو محض تعداد کی ناقابلِ برداشت زیادتی نے نپولین کو پامال کر ڈالا۔ یہ اچھی طرح تاریخ بتاتی ہے کہ جمعیتِ اصلیہ نے نپولین کی فوج کے مقابلہ میں کسی بہادری یا پامردی کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ فی الواقع محض تعداد کی بدولت فتح حاصل ہوئی! ایسی ہی ایک اور مثال امریکہ کی جنگ میں پائی جاتی ہے جو شمالی امریکہ اور جنوبی ریاستہائے متحدہ کے مابین پیش آئی تھی اسکو عام طور پر (American war of secession) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یا بہ الفاظِ دیگر، امریکہ کی جنگِ انحراف کہا جا سکتا ہے! اس لڑائی میں شمالی فوج بہ نسبت جنوبی ریاستوں کی فوج کے، تعداد کے لحاظ سے، بہت بڑی تھی! جنوبی فوج کا افسر جنرل لی (General Lee) اپنی اعلےٰ درجہ کی قابلیتِ جنگ اور دلیری کے اظہار سے عرصۂ دراز تک بڑی تعداد کے دباؤ کو دُور کرتا رہا۔ اور بار بار اُس نے اندرونی خط پر مقامی فتوحات حاصل کیں، اور نہایت بہادری اور شاطرانہ کارروائی کے ساتھ ہر مرتبہ بڑی تعداد کی فوج کو کاٹ کاٹ کر ہٹا دیا! لیکن ہر مرتبہ شمالی فوج کی تعداد بڑھتی جاتی تھی اور بالآخر وہ ناقابلِ برداشت اور لاعلاج حد تک پہنچ گئی! فوجِ جنوبی کے تمام ذرائع بقائے طاقت اور خط رسد و امداد منقطع ہو گئے

اور جنوب کے جاں نثار بہادروں کو اپنے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جنوبی ریاستوں کی فوج نے اعلےٰ درجہ کی طاقت اور دلیری اور اُنکے افسروں نے نہایت مکمل قابلیت کا اظہار کیا لیکن محض تعداد کی ناقابلِ برداشت زیادتی نے انکو مجبور ہی کر ڈالا! فتح بھی شمال کو محض بے شمار تعداد کی بدولت نصیب ہوئی!

تعداد کے موافق اور مخالف دلائل پر بغور نظر ڈالنے کے بعد صحیح نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ محض تعداد کی زیادتی ہی فتح کا جزوِ اعظم نہیں ہے، بلکہ طاقتِ فوج اور افسروں کی قابلیت، تعداد کی زیادتی کے مقابلہ میں ایک خاص حد تک ضرور کامیابی حاصل کر سکتی ہیں، البتہ ناقابلِ برداشت زیادتی کے مقابلہ میں کوئی معجز نما اظہارِ قابلیت و دلیری ناممکن کو ممکن نہیں کر سکتا!! بس یہ ہی تعداد و طاقت کا قانونِ اعظم ہے اور اسکے خلاف عمل پیرا ہونے پر سوائے نقصان اور شکست کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا!

تعداد و طاقتِ فوج پر جو کچھ مجھے لکھنا تھا لکھ چکا! مگر چلتے چلتے مجھے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مفلس ہندوستان کے علمی شورش کرنے والے بم اندازوں سے بھی پوچھ لوں کہ گورنمنٹ کے مقابلہ میں آپ کے پاس تعداد ہے، طاقت ہے، تمول ہے، فنِ حرب سے واقفیت ہے، قومی اتفاق ہے، حبِ وطن کا پورا پورا احساس ہے؟ اگر یہ بھی نہیں تو پھر کیا ہے؟

سچ یہ ہے کہ ہندوستان کی مفلسی، نااتفاقی، ناواقفیت، اور فاقہ مستی پر رونا بھی آتا ہے اور ہنسی بھی! خدا ہی جانے کون سا جذبہ صحیح اور دیرپا ہے! **سُلطان حیدر جوش**

غزل حضرت بسمل

چمن بنکر نظر میں خانۂ صیاد رہتا ہے
یہ میرا دل ہی جو تکلیف میں بھی شاد رہتا ہے
ذرا سی چیز ہے دل، سپہ جملے جو ہر گردوں کے
خدا جانے اُجڑ جاتا ہے یا آباد رہتا ہے
شبِ امید میری کس طرح پامال کیجا ئے
انھیں فکروں میں دن بھر وہ ستم ایجاد رہتا ہے
کبھی دشمن سے نفرت جس ستمگر کو تھی اے بسمل
خدا کی شان ہے وہ غیر کے گھر شاد رہتا ہے

مجبورِ محبت

شاق ہے جینا - ہُوا یہ کاہشِ غم کا اثر تیرے قدموں کی قسم بارِ گراں ہے تن پہ سر
ہے تمنائے سکونِ قلبِ مضطر جس قدر آرزوئے موت اُس سے بھی زیادہ ہے مگر
جیسے کہنے میں مرے اے راحتِ جاں تو نہیں
یونہیں دل پر بس نہیں ہے موت پر قابو نہیں

جب یہ حالت ہے کہ تو مصروفِ جشنِ عید ہے اور جاں برلب مریضِ اشتیاقِ دید ہے
کون ہو بالیں پہ - شمعِ مردۂ امید ہے بیکسی ہے ظلمتِ نومیدیِ جاوید ہے
تو مسیحائی پہ آمادہ ہو - یہ ممکن نہیں
دل شکیبائی پہ آمادہ ہو - یہ ممکن نہیں

اب سکوں ہو کس طرح - ظاہر ہے معذوری مری موت ہی باقی ہے جو حسرت کرے پوری مری
آہ - یہ فصل اور صحنِ باغ سے دوری مری قابلِ صد رحم ہے افسوس مجبوری مری
گل چمن میں ہیں چمن میرے دلِ ناشاد میں
میں قفس میں ہوں قفس ہے قبضۂ صیّاد میں

رحم کر اے موت مجھ میں تابِ غم اصلا نہیں رحم کر اے موت مجھ سے دُکھ سہا جاتا نہیں
موت کیا تجھ کو بھی میرے درد کی پروا نہیں موت کیا مشکل میں کام آنا ترا شیوا نہیں
تو ہی اک ملجا ہے میری التجا کے واسطے
موت نا امید مت کرنا خدا کے واسطے

آہ - قیدِ زندگانی جس بلا کا نام ہے وہ بقولِ غالب اک بندِ غم و آلام ہے
جیتے جی راحت ملے گی یہ خیالِ خام ہے تو اگر آغوش میں لے لے تو پھر آرام ہے
ہے خدا شاہد کہ مجھ کو رنج کا یارا نہیں

اب سوا اسکے کہ مرجاؤں کوئی چارہ نہیں

تیری ڈیوڑھی کو سمجھ کر درگہِ عیشِ دوام — منتظر ہوں صبح سے لے موت اب ہوتی ہے شام
دل میں تیری یاد ہے وردِ زباں ہے تیرا نام — آرزو میری نہ رہنے پائے بے نیلِ مرام
ہے فقط تیرے کرم پر منحصر عشرت مری
تیرے ہی دامن سے وابستہ ہے اب حسرت مری

میری پیاری موت۔ اب تو دن بہت کم رہ گیا — آفتاب اپنی شعاعیں لے کے مغرب کو چلا
ہے سہانا وقت گلزارِ جہاں ہے پُر فضا — آج کی یہ شام ہو بس میری شامِ مدعا
بعدِ مغرب آج مجھکو بیکس و تنہا نہ چھوڑ
ہاں شبِ غم کے مظالم کے لیے جیتا نہ چھوڑ

جلد آ۔ بس دن کی روشنی جانے لگی — رات اپنی کاکُلِ مشکیں کو بکھرانے لگی
ہاں۔ مرے کہنے سے تو لے موت کیوں آنے لگی — ہائے تو بھی نازِ معشوقانہ دکھلانے لگی
خون کر ڈالا اُمیدوں کا بڑی ظالم ہے تُو
کیوں نہ ہو۔ آخر کسی کی تیغ کی ہمدم ہے تُو

جوشِ وحشت اب فقط تیرا سہارا ہے مجھے — مشغلہ صحرا نوردی کا بھی پیارا ہے مجھے
کب اسیری موسمِ گل میں گوارا ہے مجھے — آ ادھر۔ یہ رُوحِ مجنوں کا اشارا ہے مجھے
"رخصت اے زنداں جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے"

ہاتھ اُٹھ جاتا ہے رہ رہ کر گریباں کی طرف — وحشتِ دل کو رہی ہے چل بیاباں کی طرف
پاؤں لیکن بڑھ رہے ہیں کوئے جاناں کی طرف — بے قراری کھینچتی ہے راحتِ جاں کی طرف
مخمصے میں دل پڑا ہے کشمکش میں جان ہے
آہ۔ اب مانی ہے اور یہ جاں گزا سامان ہے

مانیؔ جائسی

جرمنی

(۲)

بنی آدم نے جب ابتدائے تمدّن میں بستی اور گھروندے بنا بنا کے رہنا شروع کیا تو ان میں کوئی نمایاں فرقِ مراتب نہ تھا۔ شخصی طور پر سب آزاد تھے اور سب آپس میں برابر والے تھے۔ کوئی کسی کا حاکم و محکوم یا ملازم و آقا نہ تھا۔ لیکن خاندان کا بڑا بوڑھا یا وہ تجربہ کار ہونے کے لحاظ سے قابلِ تعظیم اور ایک حد تک لایقِ اطاعت سمجھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اسی کی حیثیت ایک دنیوی سردار یا شیخ قبیلہ، اور مذہبی طور پر قسّیس یا پروہت کی ہوگئی جو گویا ایک مطلق العنان "شاہ ظل اللہ" کی ابتدائی نشو و نما تھی۔

دنیا کی تاریخِ ادیان گواہ ہے کہ اس جابرانہ اور غیر قدرتی طرزِ حکمرانی کو اوّل اوّل مذہبِ عیسوی سے بڑا فروغ ہوا۔ مسیحیت شخصی بادشاہوں کی گود میں پلی تھی۔ وہ اگر انکا رتبہ نہ بڑھاتی تو خود کیونکر پھیلتی؟ چنانچہ یورپ میں اُسکا عہدِ ترقی شخصیت و مطلق العنانی کے عین عروج کا زمانہ ہے۔ اور جوں ہی کہ اُسکا اثر دلوں پر سے کم ہوا، شخصی بادشاہت بھی کوئی مقبول و مطبوع چیز نہ رہی! اسی عظیم الشان تغیر کی وجہ سے تاریخ یورپ کا یہ حصہ بنی انسان کے واسطے سب سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز سمجھا جاتا ہے۔ ہم بھی اپنے مختصر مضمون کے مناسب حال چند کلمے اس بارے میں لکھینگے۔

پانچویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی تک دینِ مسیحی کا سب سے بڑا مرکز اس لحاظ سے تو ملکِ اطالیہ تھا کہ اُسکا قدیم پایۂ تخت (رومہ) مقدس پاپا کا مسکن و مستقر تھا لیکن یہاں کے لوگوں کی حالت اس درجہ ردی تھی کہ انکا عدم وجود برابر سمجھنا چاہیے۔ انکی قدیم تہذیب مٹ چکی تھی اور اب انکی پچھلی عیاشیوں کی یادگار بد اخلاقی اور پست ہمتی اور فرد مائگی اور خود غرضانہ حماقتوں کی شکل میں باقی تھی۔ گویا کئی اعتبار سے اس ملکِ ہندوستان سے اُنکی حالت ملتی جُلتی تھی اور ظاہر ہے کہ ایسے فی الانحطاط لوگوں سے دنیا کی ذہنی یا عمرانی ترقیوں میں اضافہ کرنے کی کوئی امید نہیں کیجا سکتی اسکے برعکس اُنکے جان وار ہمسائے اگرچہ غیر مہذب تھے مگر زوال یافتہ

نہ تھے اُنپر مسیحیت کا اثر بھی گہرا پڑا اور مقدس سلطنتِ رومہ کی وجہ سے انکا تعلق بھی پاپائے رومہ سے زیادہ قوی ہوگیا - پھر جب فلسفۂ یونان اور علوم نظری بارہویں صدی کے اخیر میں پھیلے تو اُنھیں میں بڑے بڑے آزاد خیال علما اور صاحبِ فکر فلسفی پیدا ہوے - الٰہیات سے اس قوم کو زیادہ لگاؤ ہونے کا بھی سبب وہی تھا جو ہم نے لکھا کہ اہل جرمنی پر مذہب اس طرح مسلّط تھا کہ قدیم اہل اسلام کی طرح انکا دماغ دوسری طرف بمشکل جا سکتا تھا - لھذا مذہبی آزادخیالی کی سب سے پہلی تحریک بھی اسی خطّے میں پیدا ہوئی - مذہب نے اپنا کامل تفوّق برقرار رکھنے کے لیے جس قدر زیادہ جبر اور دنیاوی طریقِ سیاست سے کام لیا اُسی قدر مذہب سے بدگمانی بڑھتی گئی حتّٰی کہ ریفارمیشن (اصلاح) کے جھیں میں عیسائیوں کے بڑے گروہ نے پاپا کے پنجۂ استبداد سے رہائی پائی اور شاید اسی زمانے میں لامذہبی کے اُس زینے کی بنیاد بھی پڑ گئی جسپر چڑھ کر آج کل یورپ تمام الہامی مذاہب سے بانگِ دُہل انکار کر رہا ہے -

لیکن جرمنی کے ہمسائے فرانس میں جب علمی بیداری اور دماغی ترقیاں شروع ہوئیں، اور ساتھ ہی اس جدید مذہبی آزادخیالی کا اثر پھیلا تو وہاں دینی ہلچل کے بجاے اِک دنیاوی تغیّر رُونما ہوا - وہاں والوں کا پاپاے رومہ سے اتنا تعلق نہ تھا جتنا اہل جرمنی کا اور نہ انھیں اپنے مطلق العنان بادشاہوں کی زیادتیوں کے آگے مذہب کی جبّاری زیادہ تکلیف دہ نظر آتی تھی - کیونکہ بادشاہت تو بادشاہت وہاں کی امارت نے ایک غیرمعمولی اقتدار اور نام نہاد "ربّانی" منصب اختیار کر رکھا تھا جسکی وجہ سے فرانس کے جمہور الناس ان اُمرا کے غلام معلوم ہوتے تھے - انھیں نامعقول اور غیر قدرتی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا نام فرنچ ریولیوشن (فرانسیسی انقلاب) ہے۔[1]

[1] کیسی عجیب بات ہے کہ اس دنیاوی آزادی حاصل کرنے کی جد وجہد کو تو انقلاب انقلاب کہہ کے بدنام کیا گیا اور اس پہلی مذہبی آزادی کو 'اصلاح' کا خطاب ملا - اور افسوس ہے کہ اس مُلکی آزادی کو بدنام کرنے والے جرمنی اور انگلستان کے وہ نامور اہل قلم تھے جنکی حریتِ فکر کا سکّہ بیٹھا ہوا تھا - انکے نزدیک دنیا میں کسی "قائم شدہ آئین" کو توڑنا ایسا مجنونانہ گناہ تھا جسکی بخشش ہی ممکن نہیں - اس مسئلہ کے موافق اور مخالف پہلوؤں پر دیکھو برک کی کتاب Reflections on the French Revolution اور مازنی کی تنقید کارلائل پر

جب جرمنی میں مذہبی آزادخیالی یعنی اصلاح کی تحریک پھیلی تھی تو پاپا کے ایما سے عیسائی بادشاہوں نے اُسے دبانے کی کوشش کی تھی اور اصلی وجہ یہ تھی کہ خود وہ اپنی موروثی بادشاہت اور مطلق العنانی کو ایک مذہبی رنگ میں پیش کرنے کے عادی تھے اور، جیسا کہ ہم اشارۃً لکھ آئے ہیں، اپنی ظل اللّٰہی کو عیسائیت کا رہینِ احسان سمجھتے تھے۔ لیکن اب جو فرانس میں اس نئی ملکی آزادی کا خیال پھیلا تو انکا خوف اور زیادہ بڑھ گیا کیونکہ یہ براہِ راست اُن سے اور منصبِ بادشاہی سے عداوت تھی۔ لہذا جب لوئی پانزدہم اور ملکۂ فرانس کا اہل جمہوریت نے سر کاٹا تو آسٹریا اور انگلستان، روس، ٹرکی اور ہسپانیہ سب کے سب فوجیں لے کے فرانس سے لڑنے پر آمادہ ہوگئے اور اُن یادگار لڑائیوں کا سلسلہ چھڑ گیا جن میں نپولین بوناپارٹ نے شہرتِ دوام کا تمغہ حاصل کیا اور پیہم شکستیں دے کر جرمنی کی متعدد مغربی ریاستیں دبالیں۔ اس لیے کہ یہ علاقے ابھی تک برائے نام آسٹریا کی شاہنشاہی میں داخل تھے۔ اور آسٹریا، فرانس کا سب سے قوی حریف بنا ہوا تھا۔ پرشیا کا بادشاہ جو اوّل اوّل آسٹریا کی رقابت میں شریک جنگ نہوا تھا، جرمنی کی ریاستیں جاتی دیکھکر خود بھی مقابلہ پر آیا مگر اپنے اتحادی انگریزوں سمیت جینا پر ایسی ذلیل شکست کھائی کہ اپنا تمام مغربی علاقہ نپولین کے حوالہ کرنے پر مجبور ہُوا اور یہ اقرار بھی اُسے کرنا پڑا کہ ایک وقت میں بیالیس ہزار سے زیادہ فوج اپنی مملکت میں نہ رکھ سکے گا۔

بعض مورخین کا بیان ہے کہ نپولین کی انھیں فتوحات نے مقدس سلطنت رومہ کا صحیح معنوں میں خاتمہ کردیا کیونکہ جرمن شاہنشاہی یا شارلمین کی وراثت، ایک نوخیز رقیب پرشیا کی دست اندازی کے باوجود، ابھی تک برائے نام آسٹریا سے منسوب ہوا کرتی تھی، اسکو فرانس نے کچل دیا اور اسکے اور پرشیا کے وہ تمام علاقے دبالیے جنکا مالک، مقدس سلطنت رومہ کی جانب سے شاہنشاہِ جرمنی کا لقب پاتا تھا، لہذا سمجھنا چاہیے کہ جینا کی لڑائی کے بعد نیم مذہبی سلطنت، رہی سہی، مٹ گئی۔ اور اسی کے ساتھ جرمنی کا اتحادِ ملکی اگر کچھ باقی تھا تو اب شکست ہوگیا۔

لیکن زمانہ اگر ایک مخالف پلٹا کھا جاتا ہے تو انقلابِ موافق لانے میں بھی دیر
انھیں دنوں پرُشیا کا منصب وزارت ایک ایسے شخص کے تفویض ہوا جسکا نام جرمنی
میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ یہ (۵) سیٹن تھا جس نے اپنے بچے کھچے علاقے میں ترقی کی ایک
پھونک دی اور فرانسیسیوں سے انتقام لینے کی بہ شدومد تیاریاں شروع کیں۔ اسی
اُس نے پہلے تو اُن غلاموں کو کامل آزادی ولائی جو پرُشیا میں ابھی تک بھیڑ بکریوں
کا کرتے تھے اسکے بعد ایک کثیر التعداد فوج کو اِس طرح قواعد داں اور مسلح بنایا کہ قا
اقرار کی بھی خلاف ورزی نہ ہو جینا کی شکست کے بعد دب کر اسکا ہو رہنے فرانسیسیو
کرلیا تھا۔ ترکیب اسکی یہ تھی کہ ایک وقت میں صرف بیالیس ہزار آدمی بھرتی کیے جا
اور جب یہ اعلیٰ درجے کے قواعد داں ہو جاتے تو انھیں رخصت کر دیا جاتا اور نئے بیا
انکی جگہ لے لیتے۔ اس طرح گو ایک وقت میں بیالیس ہزار سے زیادہ فوج پرُشیا نے ح
کبھی نہ رکھی لیکن حقیقتاً قریب قریب اپنی تمام رعایا کو سپاہی بنا دیا، اور جس وقت نپول
ماسکو سے مایوس و ناکام لوٹا تو اُسکی تھکی ماندی اور بے دل فوج کو پرشوی سپاہیوں
بہت بڑی جماعت نے آگھیرا۔ مقام لیزگ پر لڑائی ہوئی اور ناممکن التسخیر نپولین کی
فوج نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیے۔ "شاہنشاہِ فرانسیسیاں" گرفتار کرلیا گیا اور ج
کی حکومت (۶) اس شرط پر اُسکو دے دی گئی کہ آیندہ سرزمینِ یورپ پر قدم نہ د
لیکن اس بے قرار پارے کو قائم و ساکن رکھنا آسان نہ تھا۔ موقعہ ملتے ہی وہ پھر ا
اپنے شیدائی، فرانسیسیوں کی ایک جمعیت تازہ لے کر پھر بڑھا کہ اہلِ پرُشیا کی تنبیہ کر
کے لیے انگریزوں نے بھی اپنی چیدہ اور منتخب فوج ساحلِ بلجیم پر اُتار دی تھی۔ چونکہ
اسبابِ شکست سے یہاں بحث کرنی نہیں ہے لہذا یہ لکھنا کافی ہے کہ اس مرتبہ بھی قسمت
ساتھ دغا کی اور ابکے وہ قید کرکے اتنی دور بھیجا گیا کہ وہاں سے جیتے جی تو کیا مر کر
کی زمیں دیکھنی اُسے نصیب نہ ہوئی۔ (۱۸۱۶ء)

لیزگ کی شکست نے مغربی ریاستہائے جرمنی پرسے اہل فرانس کا قبضہ اٹھا دیا تھا اور انھیں علاقوں کی ترتیب و تنظیم کی خاطر وی آنا (پایۂ تخت آسٹریا) میں ایک مشہور و معروف کانگرس اپنے اجلاس شروع کرچکی تھی - نپولین کے دوبارہ خروج نے اسکی کارروائیوں میں ایک عارضی انتشار تو پیدا کردیا لیکن اسکے دوبارہ مغلوب ہونے پر تمام انتظامات خاطرخواہ طے پاگئے پرشیا کو اسکے ایثار کا معقول معاوضہ حاصل ہوا، کئی ریاستیں آزاد قرار پائیں اور ہمبرگ، فرنکفورٹ وغیرہ شہروں کو بھی پوری آزادی عطا ہوگئی - باقی اُنتالیس ریاستیں اگرچہ اندرونی طور پر خود مختار تھیں مگر انکی ایک بین الممالک انجمن فرنکفورٹ میں قائم کی گئی تھی جس میں ہر ریاست اپنا وکیل بھیجتی تھی اور سلطنتِ آسٹریا کا سفیر انکا صدر نشین ہوتا تھا - اسی انجمن کا نام جرمن کانفیڈریسی ہے جسے گذشتہ طوائف الملوکی اور جدید متحدہ جرمنی کے درمیان ایک پُل سمجھنا چاہیے کہ اسی پُل پر سے گزر کر جرمن قوم آسٹروی اقتدار سے آزاد اور اپنی قومیت کے اصلی لباس میں جلوہ گر ہوئی۔

لیکن وی آنا کانگرس نے جو کچھ فیصلہ کیا تھا اُسکا بڑا مقصد یہ تھا کہ آسٹریا، پرشیا اور جرمنی کے بعض طاقتور رئیسوں کی ایک مفاہمت ہو جائے، اور بے شبہ اس میں وہ کامیاب ہوئی۔ مگر جمہور اہل ملک اس قرارداد سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے۔ وہ دَورِ قدیم کی تاریکی سے نکل چکے تھے اور انکی دماغی ترقیاں ایک زیادہ وسیع اور زیادہ آزاد مدنیت اور حکومت مانگتی تھیں۔ اُنھیں نہ تو اپنے ہاں اندرونی طوائف الملوکی کا قائم رہنا پسند تھا اور نہ آسٹریا کا بیرونی اثر خوش آتا تھا۔ وہ سارے ملک کی ایک منتخب مجلس یا پارلیمنٹ بنانی چاہتے تھے۔ اور اپنے چھوٹے چھوٹے رئیسوں کی مطلق العنانی کم کرنے کے درپے تھے - لیکن ان عوام الناس یا محبانِ وطن کی کوششیں اوّل اوّل سخت ناکام رہیں - ہر ریاست کے فرماں روانے اس آزاد خیالی کو دبانا فرض جانا اور ایسے ایسے تشدد کیے کہ ان شریفانہ تحریکوں کے حامی طرح طرح کی اذیتوں اور عقوبتوں میں مبتلا ہوگئے، اور برسوں اُنھیں جلاوطنی کی یا جیل خانوں کی ہوا کھانی پڑی - افسوس یہ ہے کہ اوروں کی طرح پرشیا کا نیا بادشاہ فریڈرک ولیم چہارم بھی شخصیت و استبداد کا طرفدار نکلا۔

وہ بڑا تعلیم یافتہ روشن خیال شاہزادہ تھا اور جب اُسنے تمام مُلک میں تجارتی اتحاد اپنی سرپرستی میں قائم کیے تو وطن پرستوں کے گروہ میں بڑی بڑی امیدیں اُس سے قائم کرلی گئیں کہ شاید اسکی مدد سے لوگوں کو حقوقِ آزادی میسّر آجائیں، لیکن جیسا کہ پہلے لکھا گیا باں ہمہ دانش وفضیلت، اس معاملۂ خاص میں عہدِ قدیم کے جابر بادشاہوں سے کم متعصب نہ تھا اور اُس نے بھی اپنے ہم وطن احرار کو دبانے میں اسی شدومد سے کوشش کی جیسی کہ جرمنی کے اور جاہل رئیس کرتے تھے!

شاید وہ بے بس مخلوق، جو مکّار زبردستوں سے اس درجہ مغلوب ہوجاتی ہے کہ پھر سچی پھڑکن کے باوجود کوئی امید اسکے اُبھرنے کی باقی نہیں رہتی، آخر کار اُس قادر وقہار کی مدد پاتی ہے جس نے بڑے بڑے فراعنہ کو پست کیا ہے۔ واقعی، دنیا میں مظلوم کے بچ نکلنے کی دو ہی صورتیں ہیں: یا تو مظلوم میں اتنی طاقت اور ہمت پیدا ہوجائے کہ وہ اپنی مدافعت کرسکے اور یا، ظالم کا ہاتھ اس طرح شل ہوجائے کہ مارنے کے لیے اُٹھ ہی نہ سکے۔ پہلی شے بہت کچھ انسانی کوشش کا ثمرہ ہوتی ہے لیکن دوسرا نتیجہ ہمیشہ اُن اسباب سے منتج ہوتا ہے جو ایک پُر اسرار قانونِ قدرت کے ماتحت کام کررہے ہیں۔ اسی قسم کا کرشمۂ قدرت ہمیں اس وقت جرمنی کی تاریخ میں نظر آتا ہے سنہ ۱۸۴۷ء میں جرمنی کے بڑے بڑے وطن پرست قید خانوں میں تھے تو گھر کی چار دیواری میں سر پھوڑتے تھے۔ غاصبانِ قوت و مُلک سے رہائی پانے کی کوئی تحریک سرسبز ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ تقریر یا تحریر کی اُنھیں آزادی نہ تھی، ظالموں کے خلاف متحدہ سرکشی کرنے کی لوگوں میں جسارت نہ تھی، ہر سمت مایوسی کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، استحصالِ حقوق کے تمام رستوں پر اہلِ اقتدار نے آگ اور تلواریں بچھا رکھی تھیں ـــــ یکایک فرانس میں ایک تیسرے[1] انقلاب نے سر اُٹھایا۔ انھیں لپٹوں نے جو پیرس کے ایوانِ شہر (ٹاؤن ہال) سے بلند ہوئیں تمام وسطی اور مغربی یورپ کو مشتعل کردیا۔ اور اس امن سوز روشنی کو ایک مرتبہ نپولین جیسے مشعل برداروں کی ضرورت بھی پیش نہ آئی۔ گویا ہر بڑی بستی میں بارود کا ذخیرہ پہلے سے

[1] فرانس کا دوسرا انقلاب شاہ چارلس دہم کے وقت میں ہوا تھا (سنہ [illegible])

موجود تھا کہ ذرا سی حرکت پاتے ہی آگ لے گیا۔ طالبان آزادی جہاں تہاں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر جگہ ایک قیامت برپا ہوگئی۔ انسان کا خون برسات کے پانی کی طرح گلی گلی بہتا پھرا۔ "آزادی مساوات" "ابھی نہیں تو کبھی نہیں!" کے شور نے ہوا میں تلاطم ڈال دیا۔ نیپلز اور آسٹریا کے بادشاہ بے اوسان ہو کر بھاگے۔ لوی فلپ فرماں روائے فرانس نے بھیس بدل کر جان بچائی، جرمنی کے خود مختار رئیس تہ خانوں میں منہ چھپاتے پھرے۔ شاہِ پروشیا نے "عوام کالانعام" کے آگے اپنا محترم سر جھکا دیا اور جب برلن کے بازاروں میں خون کی کیچڑ بھر گئی تو وثیم کا پائے ثبات بھی قائم نہ رہ سکا، اسکے "خطرناک ہموطنوں" نے فتح پائی، اُسے حقوق انتخاب اور ایک مجلس ملکی دینی پڑی اور اپنے دعاوی خود مختاری سے بڑی حد تک مجبوراً دست بردار ہونا پڑا۔ قریب قریب یہی صورت دوسری ریاستوں میں پیش آئی اور ہر "ننھی سی" ریاست کی ایک "ننھی سی" مجلس قائم ہوگئی۔

مگر جرمنی کے اربابِ فکر ایسی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدوں میں زاویہ نشیں ہونا نہ چاہتے تھے، اُنکے کشادگی یافتہ خیالات میں اپنے قبیلے یا محدود علاقے والوں کا نام "قوم" نہ تھا۔ وہ جرمن قومیت کو ہمزبانی کی قدرتی بنیاد پر تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اور اس معیار کی رُو سے دو کروڑ نفوس اور ایک بڑے علاقے کو شیرازۂ اتحاد میں باندھنا اُنکا نصب العین تھا۔ اسی بنا پر مختلف ریاستوں کی مجالس نے ایک اعلانِ عام کے ذریعے پانسو اہل الرائے کو اطراف واکنافِ سلطنت سے بلایا اور فرنکفورٹ میں ایک بڑی مجلسِ مشاورت منعقد کی۔ ویآنا کانگرس نے جو بِرالِک نظام آسٹروی سفیر کی ماتحتی میں قائم کیا تھا، وہ توڑ دیا گیا اور اسکی بجائے عالمگیر حقوقِ انتخاب (یونیورسل سفریج) کو اس طرح رائج کیا گیا کہ پچاس ہزار افراد اپنا ایک وکیل منتخب کریں اور اِن وکلا کی قومی مجلس مہماتِ سلطنت سرانجام دے۔ چنانچہ اسی فیصلے کے بموجب قوم جرمن کی پہلی منتخب پارلیمنٹ نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ فرنکفورٹ میں اجلاس کیا (۱۸۴۸ء) بے شبہ اس طرز حکومت کی اہل جرمنی کو بڑی چاہت تھی لیکن مشترک ملکداری کے طریقوں

سے وہ عملاً بالکل ناواقف تھے۔ انکا، جو سیکڑوں برس سے شخصی بادشاہت کے پنجے میں گرفتار تھے، قومی یا جمہوری حکومت چلانا، قدرتی طور پر، دقتوں سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ جتنے نئے وکیل فرنکفورٹ کی مجلس میں چھنٹ کر آئے تھے نہایت جوشیلے محب وطن ہونے کے باوجود، سخت ناتجربہ کار اور ضدی تقریریئے تھے۔ اُن میں ذرا ذرا سی باتوں پر جھگڑے پیدا ہو جاتے اور ہفتے کے ہفتے اس بحث مباحثہ میں رائیگاں جاتے۔ بڑی مشکلوں کے بعد اُنھوں نے خدا خدا کر کے اصولی قوانین اپنے مُلک کے تیار کیے اور اسکی رُو سے شاہ آسٹریا کو جرمنی سے بالکل بے تعلق قرار دیا گیا اور طے پایا کہ پُرشیا کے بادشاہ کو جرمنی کا موروثی مگر آئینی حکمراں مقرر کیا جائے۔ اس قرارداد کے مطابق ایک وفد برلن میں ولیم کے پاس گیا اور اُس سے جرمن شاہنشاہی قبول کر لینے کی درخواست کی۔ ولیم نے اُس وقت اپنی پچھلی رسوائی کا بدلہ یوں اُتارا کہ حقارت کے ساتھ اس درخواست کو نامنظور کر دیا۔

اس واقعے سے مجلس کی شہرت کو بڑا صدمہ پہنچا۔ وہ بالکل بے اثر، بچوں کا کھیل معلوم ہونے لگی، سارے ممبر تتربتر ہو گئے اور آخرکار وہ اسی چھماہی کے اندر، پتوں کی آگ کی طرح، دھواں بنکر ہوا میں غائب ہو گئی۔

ادھر، الگ الگ ریاستوں میں جو پارلیمنٹیں (؟) بنائی گئی تھیں، ان میں فساد پیدا ہوئے، اور پرشوی مجلس میں، جس کا انعقاد برلن میں ہوا کرتا تھا، کُشت و خون تک کی نوبت پہنچی۔ جنوبی ریاستوں کے اکثر رئیس آسٹریا سے مل گئے، اور وہاں کی مجلسیں، ایرانی پارلیمنٹ کی طرح، بجبر توڑ دی گئیں۔ ساتھ ہی سارے مُلک میں ایک سیاسی رجعت پیدا ہوئی، شخصیت نے جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا، اور فرانسس جوزف (موجودہ شاہِ آسٹریا) اور فریڈرک ولیم چہارم شاہِ پُرشیا نے بیسیوں محب وطن ریستوں کو قید میں سڑا سڑا کے مار ڈالا۔ قلم اور زبان کی آزادی چھین لی گئی اور برسوں تک تشدد و استبداد کا دَور دورا رہا۔

لیکن آزادی، انسان کا فطری حق ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ اس لذت کو بھول جائے مگر

یہ ممکن نہیں کہ اُس سے یہ حق زبردستی چھین لیا جائے۔ چنانچہ ولیم جیسے بڑے جرمن اور جابر بادشاہ کو ہم اکثر اپنے شاہی قصر میں اس بات پر انگلیاں چباتے دیکھتے ہیں، کہ اسکی "مجنون" رعایا کسی طرح شخصیت سے مانوس نہیں ہوتی، اور بالکلیہ مرعوب و مغلوب ہونیکے باوجود جمہوریت کی قربان گاہ پر بھینٹ پہ بھینٹ چڑھائے جاتی ہے! آخر اس کشاکش کا یہ انجام ہوا کہ ولیم اپنے مُلک سے بیزار ہوگیا اور منصبِ بادشاہی سے قریب قریب دست بردار ہو بیٹھا۔ جس سے ثابت ہے کہ وہ اپنے اصول کا کیسا پکّا تھا، کہ اُسے بادشاہت چھوڑ دینا گوارا تھا مگر پارلیمنٹ ٹے کر حکومت کرنی گوارا نہ تھی ـــــ لیکن اس واقعے سے یہ بات بھی اچھی طرح ثابت ہے کہ جمہور کی رائے اور سچی خواہش میں کیسی خداداد قوت ہے کہ بڑے بڑے خود سر اُسکے آگے ہار ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں ـــــ خواہ معقولیت کے ساتھ، خواہ فرانسس جوزف شاہنشاہ آسٹریا کی طرح زبردستی کیونکہ ولیم اگر شخصی بادشاہت کو علمی اور عقلی طور پر ایک ضروری آئین تمدن سمجھتا تھا، تو جوزف رسمی طور پر اُسے اپنا ورثہ جانتا تھا، جسے حاصل کرنے میں، اسکے نزدیک بنی انسان کا خون بہانا نہ صرف جائز بلکہ ثواب کا کام تھا ـــــ نتیجہ اس فرعونیت کا یہ نکلا کہ جب شمالی اٹلی میں آزادی کی تحریک پیدا ہوئی اور وہاں کے لوگوں نے فرانس کی مدد سے آسٹروی حکومت[۱] کا جُوا اپنی گردنوں پر سے اُتار پھینکنا چاہا تو جوزف کو پچاس ہزار آدمی بھی ایسے نہ ملے جو اسکی خاطر جا کر اطالویوں سے لڑتے[۲]! بلکہ جو تلواریں اُس نے اپنے سپاہیوں کو اطالیہ والوں کے گلے کاٹنے کے واسطے

---

۱ مقدس سلطنت روما قائم ہونے کے بعد سے یہ علاقے جرمن شاہنشاہی میں داخل ہو گئے تھے۔ اور جب یہ منصب، بادشاہان آسٹریا کے ترکے میں آیا تو مذکورہ علاقے بھی اُنھیں کے قبضے میں چلے گئے۔ اور اسی ۱۸۵۸ء کی لڑائی میں انھیں آزادی ملی۔ دو تین ضلعے اب بھی آسٹریا کی سلطنت میں شامل ہیں۔ اور انھیں اطالیہ کے وطن پرست اب تک لینے کی تاک میں رہتے ہیں اور "اطالیا اریدنتا" یا "بے چھٹی اطالیہ" کے نام سے پکارتے ہیں

۲ نام گنانے کو فوج تو آسٹریا کی مدد کو لڑنے گئی تھی مگر فی الحقیقت وہ ایسی بے دلی سے گئی کہ تقریباً بے لڑے بھڑے واپس آگئی۔

وہی تھیں، اسکے ہموطنوں نے اُسی کے سر پر انھیں علم کرنا زیادہ ضروری سمجھا اور اسے مجبور کیا کہ ایک واضعِ آئین و قوانین مجلس کے موافقِ منشا چلنے پر حلف اُٹھائے۔ اس مجلس کے بنجانے کے بعد جوزف نے اطالیہ کا عوض جرمنی سے لینا چاہا۔ یعنی وہاں کی ریاستوں کے تمام روساء کو فرنکفورٹ میں جمع کیا اور انھیں بعض لالچ دے کر پرانے طریق کے مطابق اپنی ماتحتی میں لانا چاہا۔ لیکن خود غرضی چھپائے نہ چھپی اور یہ گفتگو بیکار گئی۔ (۱۸۶۱ء)

اسی زمانے میں فریڈرک ولیم نے وفات پائی اور ولیم اول جانشین تاج و تخت ہوا، اور یہی وہ نامور بادشاہ ہے جسے اہلِ جرمنی بجا طور پر اپنا قومی سورما سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ایسا متحمل مزاج سپاہی ایسا جاں فروش بادشاہ اور ایسا جمہوریت پسند شہزادہ دنیا میں کم پیدا ہوتا ہے۔" واقعی دس برس کے اندر اُس نے مملکتِ جرمنی اور قومِ جرمنی کو اس بلندی پر لا کھڑا کیا جس پر پہنچنے کی وہ ایک صدی سے جد و جہد کر رہے تھے۔ لیکن اس جلیل الشان ترقی کے بانیوں میں ایک اور شخص کا نام بھی آتا ہے جسکی شہرتِ روشن نے ولیم کی ناموری کو ماند کر دیا تھا۔ وہ بسمارک ہے جو بہت سی سیاسی خدمتوں پر مامور رہنے کے بعد ۱۸۶۲ء میں پرشیا کے منصبِ وزارت پر سرفراز ہوا۔ اور قلمدانِ مدار المہامی سنبھالتے ہی ڈنمارک سے لڑائی چھیڑ دی۔ یہ ایک اصول موضوعہ، بسمارک کا تھا کہ "ملکی اتحاد کے لیے غیرملکی لڑائی اکسیر کا کام دیتی ہے"۔ چنانچہ گو تمام برِ اعظم اس جنگ کے خلاف تھا اور انگلستان و فرانس خصوصاً نہ چاہتے تھے کہ پرشیا بحرِ شمالی کے ساحل پر اپنا سر نکالے لیکن برلن کا برہمن خوب سمجھتا تھا کہ یہ دونوں سلطنتیں اپنی باہمی رقابت کی وجہ سے کوئی کارروائی ملکر نہیں کر سکتیں اودھر اپنے جنوبی ہمسائے آسٹریا کو اُسنے پہلے ہی منافع کا لالچ دے کر اپنے سے ملا لیا تھا۔ غرض بسمارک کو اس دست برد میں خاطرخواہ کامیابی ہوئی اور شلسوگ، لاون برگ اور ہالسٹین کے تین زرخیز ضلعے پرشیا سے الحاق کر لیے گئے۔ اس علاقے کو ترقی دے کر جو تجارتی اور جنگی کام پرشیا نے بعد میں ان ضلعوں سے لیا[1] اُس نے انکی قدر و قیمت اور بھی بڑھا دی ورنہ اسوقت بہت سے اہل الرائے یہی چاہتے تھے کہ حسب قرارداد

[1] کیل، ولیمزہوین اور لکس ہوین کی مشہور جنگی بندرگاہیں انھیں علاقوں میں بنائی گئی ہیں۔

ان میں آسٹریا کو بھی حصہ دار بنا لیا جائے۔ مگر بسمارک نے سب سے پہلے تو ان میں ایک بڑی تعداد پرشوی آبادکاروں کی بسادی اور پھر یہ حجت نکالی کہ آسٹریا ان دور دست علاقوں کے قبضے سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتا پس مناسب یہ ہے کہ اسکی رفاقت کا احسان کسی اور طریقے سے اتار دیا جائے!

ان اڑان گھائیوں نے شاہ آسٹریا کو سخت ناراض کیا لیکن اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے اتنی فرصت اسے نہ تھی کہ پرشیا پر فوج کشی کرتا جسکے دلیر اور قواعد داں سپاہی دنیا کے سب سے اچھے لڑنے والوں میں شمار کیے جانے لگے تھے۔ ادھر بسمارک کے ابھارنے سے اہل اطالیہ بھی آسٹرویوں سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو بیٹھے تھے۔ غرض فرانسس جوزف کی جان بڑے عذاب میں تھی کہ یکایک خود پرشوی فوجیں خاص ولیم کے زیر کمان آسٹریا کی حدود میں گھس پڑیں۔ اور وہ تیز و تند لڑائی شروع ہوگئی جسے جنگ ہفت ہفتہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مئی ۱۸۶۶ء میں اعلان جنگ ہوا اور جولائی میں لڑائی ہو چکی! اس جنگ میں اخلاقی طور پر آسٹریا کو بہت نقصان پہنچا، نو مفتوح علاقوں کی حصہ داری سے اسے دست بردار ہونا پڑا اور دوسری طرف جرمن ریاستوں کی وہ برائے نام شاہنشاہی چھوٹی بڑی جسے شاہ آسٹریا اپنا موروثی حق تصور کیا کرتا تھا۔ (دیکھو صلح نامہ پراگ مرتبہ جولائی ۱۸۶۶ء)

اس لڑائی کے خاتمے پر جب فتحمند ولیم واپس ہوا تو تمام ملک نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اسکا استقبال کیا اور ہر طرف ایسی خوشیاں منائی گئیں جنکی نظیر جرمن تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس جوش مسرت کے موقع کو بھی، بسمارک نے، جسے اتحاد ملکی کی دھن لگی ہوئی تھی، [illegible] بیکار نہ جانے دیا ــــ عین اسوقت کہ شہر برلن ولیم کے فاتحانہ داخلے پر ایک شاندار جلوس نکالنے کی تیاریاں کر رہا تھا اور ہر گھر میں کسی بہت بڑی شادی یا عید کا سا ہنگامہ برپا تھا بسمارک دفتر وزارت میں بیٹھا ریاستہائے جرمنی کے مشترکہ نظام سلطنت کا مسودہ ترتیب دے رہا تھا! ناظرین کو یاد ہوگا کہ مجلس فرنکفورٹ نے جو آئین حکومت تیار کیا تھا اسکے زیر عمل نہ آنے کے

بڑے دو سبب تھے۔ اوّل تو شاہِ آسٹریا اور اُسکے زیر اثر جرمن رئیسوں کی مخالفت جنھیں کسی طرح گوارا نہ ہوسکتا تھا کہ شاہِ آسٹریا کو چھوڑکر شاہ پرشیا کو متحد جرمنی کا حکمراں بنایا جائے۔ اور دوسرا عجیب سبب خود فریڈرک ولیم کا اس منصب کے قبول کرنے سے انکار، جس نے اس تجویز کی رہی سہی وقعت کو خاک میں ملا دیا۔ مگر اب پندرہ برس بعد صورتِ حالات بالکل دوسری تھی: جرمنی کی شمالی ریاستیں پرشیا کے پورے اثر میں آچکی تھیں۔ باقیماندہ پر اگر اسکا اثر نہ تھا تو آسٹریا کا بھی اب اُٹھ چکا تھا۔ صلح نامۂ پریگ نے آسٹریا کا رہا سہا واسطہ جرمنی سے اُڑا دیا تھا۔ بس جو جنوبی ریاستیں پرشیا کا اقتدار دیکھنا پسند نہ کرتی تھیں وہ بطور خود اُسکی رقیب تھیں آسٹریا کا انھیں اب سہارا نہ تھا۔ غرض اُسی آئینِ حکومت کی اب بسمارک نے تجدید کی۔ ہر ریاست کو اپنی اپنی مجلس اور اندرونی اختیارات دیے گئے اور کُل مُلک کی ایک منتخب مجلس علٰحدہ قائم ہوئی، پرشیا کا بادشاہ تمام متحدہ مملکت کا شاہنشاہ قرار پایا اور اسی کا پرشوی وزیر مجلس قومی یا ڈائٹ میں اُسکا ذمہ دار نائب سلطنت۔ لیکن اس مجوزہ آئین کے زیر کار آنے میں صرف ایک دقت ابھی تک باقی تھی اور وہ بعض جنوبی ریاستوں کی چشمک تھی جنھیں پرشیا کا اسقدر بڑھ جانا گراں تھا اور جو فرانسیسیوں کے اغوا سے اپنے اپنے مُلک میں فوجی تیاریاں کر رہی تھیں کہ ضرورت ہو تو بزور اپنی خود مختاری کی مدافعت کرسکیں۔ اور بے شبہہ یہ اندرونی رقابتیں ابھی کچھ عرصے تک در جرمنی کو متفرق اور غیر متحد رکھتیں اگر وہ عظیم الشان لڑائی فرانس کے ساتھ نہ چھڑ جاتی جسے بسمارک اپنی "سب سے آخری اور سب سے صاف کُشتی" کہا کرتا تھا۔

اس لڑائی کا سب سے قریبی سبب تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہسپانیہ کے خالی تخت کے لیے شاہزادہ لیوپولڈ کا انتخاب عمل میں آیا تھا جو پرشیا کے شاہی خاندان ہوان زولرن کا رُکن تھا۔ فرانس نے اسپر اعتراض کیا اور اسی بنا پر لیوپولڈ نے اپنا اقرار اہل ہسپانیہ سے "واپس" لے لیا۔ لیکن اب فرانسیسی حکومت نے پرشیا سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ عہد کرے کہ کبھی اس خاندان کا کوئی آدمی ہسپانیہ کے تخت کو قبول نہ کرے گا! بسمارک نے اس لغو شرط کو نامنظور کر دیا اور اسی پر

لڑائی چھڑ گئی[1] - مگر اصلی وجہ لڑائی کی دیکھو تو فقط یہ بات نہ تھی بلکہ اس میں ایک پرانی رقابت اور حسد کا ہاتھ بھی شریک تھا - یوں تو نپولین بوناپارٹ کے زمانے سے پرشیا اور فرانس میں قومی دشمنی راسخ ہوگئی تھی مگر ۱۸۶۳ء کی جنگِ ڈنمارک کے بعد سے تو فرانس کو بڑی تاملی گم ہوئی تھی کہ جس طرح ہوسکے اس ہاتھ پاؤں نکالنے والے ہمسائے کو کچل دے - اسکا غصہ اس وجہ سے اور بھی بڑھ گیا تھا کہ جب اس نے لکسمبرگ کو خریدنا چاہا تو بسمارک نے اسکو روک دیا حالانکہ جب شلس وگ وغیرہ پر پرشیا نے قبضہ کیا اور فرانس نے اس قبضے کو تسلیم کرلیا تو عام طور پر یہ امید کی جاتی تھی کہ بسمارک اسکے لکسمبرگ خرید لینے پر اعتراض نہ کریگا - جب ادھر سے ناکامی ہوئی تو فرانس نے خفیہ طور پر بلجیم کا الحاق کرلینے کی تیاریاں کیں - یہ خبر بھی بسمارک سے مخفی نہ رہی اور سرحد پر اس نے اپنی فوجوں کا جماؤ کرکے صاف صاف یہ بات جتا دی کہ پرشیا - فرانس کے قبضۂ بلجیم کو کسی طرح گوارا نہیں کرسکتا[2] -

ان سب باتوں پر فرانس دانت کِلکِلا ہی رہا تھا کہ پرشیا نے آسٹریا کو شکست دی اور نئے نظامِ حکومت کے بموجب ولیم اوّل کے "شاہنشاہِ جرمنی" ہونے کا اعلان کیا گیا - اور اس واقعے نے فرانس کے حسد اور تشکوک کو اس قدر بڑھایا کہ اب وہ اپنے ہمسائے کو ذلیل کرنے کے درپے ہوگیا اور دست و گریباں ہونے کے نئے نئے بہانے ڈھونڈنے لگا (۱۸۶۹ء) یہاں تک

[1] بسمارک پر شبہہ کیا جاتا ہے کہ لڑائی چھیڑنے کی غرض سے خود اس نے ایک بناوٹی تار فرانس میں شایع کرادیا جس میں فرانسیسی سفیر کے ساتھ حکومتِ پرشیا کی سخت بدسلوکی کا ذکر تھا - اس توہین کی خبر نے تمام فرانسیسیوں میں سخت جوش پھیلا دیا جسکا فوری نتیجہ اعلانِ جنگ تھا

[2] اس موقع پر یہ لکھنا دلچسپی اور فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ اسی زمانے میں انگلستان کی پارلیمنٹ میں بھی یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ اگر فرانس بلجیم پر حملہ کرے تو کیا پچھلے معاہدوں کی بموجب سلطنتِ برطانیہ پر یہ لازم آئیگا (باقی بصفحہ ۴۲)

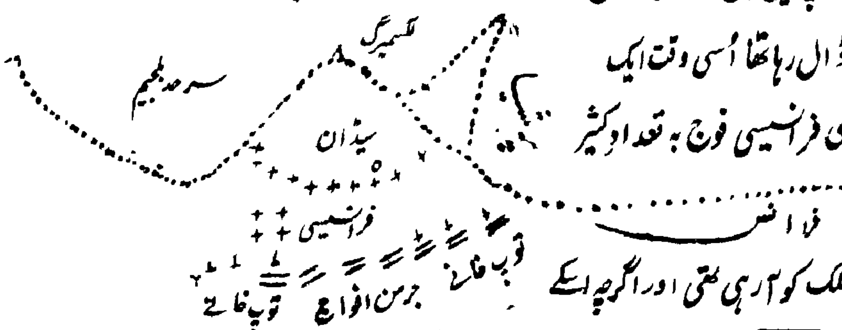
کہ شاہزادۂ لیوپولڈ کے معاملہ میں ذراسی بات طول پکڑ گئی اور آخر جولائی ۱۸۷۰ء میں عظیم الشان فرینکو پرشین وار (محاربۂ فرانس و پرشیا) نے یورپ میں ہل چل مچادی۔ لطف یہ ہے کہ اس لڑائی کے چھڑتے وقت فرانس کے ارباب حکومت کو تو یہ اُمید تھی کہ یہ جنگ پرشیا کا زور ڈھائے یا نہ ڈھائے سلطنت جرمنی میں ضرور تفرقہ پیدا کردے گی، جنوبی ریاستیں بغاوت کردیں گی اور بسمارک کا نیا نظام اتحاد تار تار ہوجائے گا ــــ لیکن بسمارک کو یقین تھا کہ اس لڑائی سے جرمن قوم کا اتحاد اور زیادہ مضبوط ہوجائے گا اور جنوبی ریاستوں سے پیش از پیش اُس نے خفیہ معاہدے کرلیے تھے جنھیں عین اعلانِ جنگ کے وقت ظاہر کیا جسکی وجہ سے اگر کوئی رئیس دل میں فرانس کا طرفدار بھی تھا تو اُسے علانیہ اُدھر مل جانے کی جرأت نہ پڑی۔ ادھر فرانس کی پچھلی زیادتیوں کے انتقام لینے کا وہ جوش پھیلا کہ ہر گوشۂ ملک سے ہزاروں والنیٹیر مادرِ وطن کے لیے جان دینے ولیم کے جھنڈے تلے آجمع ہوے اور پہلے ہی معرکے میں فرانس کا بادشاہ نپولین ثالث ایک لاکھ سے زیادہ سپاہیوں سمیت مقام سیڈان پر قیدی بنا کے پرشیا میں بھیج دیا گیا! بعض فرانسیسی مورخین کا خیال ہے کہ اس موقع پر نپولین نے سخت بزدلی دکھائی لیکن واقفکارانِ فن کہتے ہیں کہ اگر وہ شجاعت دکھاتا تو دشمن کو ایک پلٹن کا نقصان پہنچائے بغیر اپنی ساری فوج کو کٹوا دیتا۔ فی تحقیقت سیڈان کی زبردست فتح جرمن جرنیل مولٹکے کا ایسا درخشاں کارنامہ ہے جسکی نظیر تاریخ حرب میں نہیں ملتی۔ بغیر لڑے بھڑے اُس نے اس موقع پر یہ کمال کیا تھا کہ اپنی تمام فوج دشمن کے دہنے بازو پر پھیلادی تھیں اور اُسے مجبور کردیا تھا کہ اگر وہ پسپا ہو تو ایک تنگ راستے سے گزرے جو

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۔ کہ وہ بلجیم کی آزادی برقرار رکھنے کے لیے ہتھیار اُٹھائے؟ جواب میں وزیر اعظم لارڈ ڈربی نے اس سے انکار کیا اور فرمایا کہ ایسے معاملے محض خلاقی شے ہوتے ہیں اور دوسری بڑی طاقتیں جو ان عہدناموں کی شریک تھیں اگر انکی خلاف ورزی کریں تو اکیلی برطانیہ سیاسی قانون میں اِلا قوام کی رُو سے مجبور نہیں ہے کہ ان معاہدوں کی بزور تعمیل اور پابندی کرائے (بسنو نگہ)

جرمن توپخانوں کی عین زد میں تھا، اور اگر آگے بڑھے تو پرشوی سرحد میں داخل ہوتے ہوتے بالکل محصور ہو جائے۔ اگر بائیں طرف جائے تو بلجیم کی سرحد ملی ہوئی تھی جہاں فرانسیسی سپاہیوں فوراً ہتھیار رکھوا لیے جاتے کیونکہ اسکی حیثیت ایک ناطرفدار حکومت کی تھی۔

جنگ کا خاکا

نپولین جس وقت جرمنوں کے سامنے ہتھیار ڈال رہا تھا اُسی وقت ایک دوسری فرانسیسی فوج بہ تعداد کثیر



اسکی کمک کو آ رہی تھی اور اگرچہ اسکے کمانڈر بنیز نے سیڈان کا راستہ صاف کر لیا تھا لیکن پھر بھی پرشوی فوج اُسکے عقب میں آ کر جلد بڑھ جانے کا موقعہ نہ دیتی تھی۔ اسی تاخیر کے باعث بنیز ابھی شہر مٹز کے قریب ہی تھا کہ نپولین گرفتار ہو گیا اور وہی فوجیں جو اُس سے لڑ رہی تھیں بنیز کی طرف پلٹ پڑیں۔ اب بنیز کے عقب میں تو پہلی پرشوی فوج تھی اور سامنے سے سیڈان کا فاتح اپنے پرجوش سپاہیوں کو لیے چلا آ رہا تھا جنکے دل نپولین کی کامل شکست نے غیرمعمولی طور پر بڑھا دیے تھے۔ نتیجہ اس اُلٹ پلٹ کا یہ ہوا کہ بنیز بھی مٹز پر گھِر گیا اور دو مہینے کے محاصرے کے بعد اُسنے ہتھیار ڈال دیے۔ اسوقت تک فرانسیسیوں کی آخری اُمید جرنیل مک ماہن کی تیسری فوج سے قائم تھی اور بےشبہ اگر یہ شخص اپنے دشمن جیسی مستعدی اور کارروائی دکھاتا تو کم سے کم بنیز کی ڈیڑھ لاکھ فوج جرمنوں کے محاصرے سے چھوٹ جاتی اور فرانس ایک بڑی ذلت سے بچ جاتا۔ لیکن مک ماہن، جو اُنکے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۲ - گویا سر ایڈورڈ گرے اور مسٹر ایسکوئیتھ جن اخلاقی معاہدوں کو آج اسقدر ضروری سمجھ رہے ہیں کہ انکی خلاف ورزی نے انھیں موجودہ جنگ میں حصہ لینے پر مجبور کیا، ۴۰ برس قبل لارڈ ڈربی کے نزدیک وہ ایسے سنگین نہ تھے۔

کی ٹکر کا نہ تھا، اسے ہر طرف اپنی نالائقی سے ہزیمت اٹھانی پڑی اور آخر میں اسکا تمام لشکر بے دل ہو کر تتر بتر ہو گیا۔

سچ پوچھو تو ایک معنی کر لڑائی کا خاتمہ اسی وقت ہو چکا تھا جب نپولین نے اطاعت قبول کی تھی۔ لیکن اسکی شکست اور گرفتاری نے جمہوریت پسندوں کو موقع دیا کہ وہ چوتھی مرتبہ علم بغاوت بلند کریں اور اس جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالیں جس کا تھوڑے سے رد و بدل کے بعد ہمارے عہد تک قائم رہنا مقدر تھا۔ ساتھ ہی جمہوریہ فرانس کی طرف سے ایک فوج جلدی میں مرتب کر کے بھیجی گئی کہ پرشوی حملہ آوروں کو پیرس سے آگے روک دے۔ لیکن اس سیلاب آتش کا محض حب الوطنی کے زور پر روک رکھنا محال تھا، خصوصاً جب بیزن نے مدمے مایوس ہو کر ہتھیار ڈال دیے تو تقریباً تمام فوج جو پرشیا سے بھیجی گئی تھی پیرس کے گرد مجتمع ہو گئی اور وہ پر عقوبت محاصرہ شروع ہوا جس میں پیرس کے سیکڑوں آدمی فاقہ کشی اور سرمائی لباس و سامان کی نامیسری سے ہلاک ہو گئے (دسمبر ۱۸۷۰ء) ہم ان مصائب کی تکلیف دہ تفصیل کو جو اس سال بد نصیب فرانسیسیوں پر نازل ہوئیں قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ جنوری ۱۸۷۱ء میں صلح نامہ فرانکفورٹ کی ترتیب عمل میں آئی جسکی رو سے علاقہ السائس اور جنوب مشرقی لورین کے علاوہ پچاس کھرب فرانک (تقریباً ۲ کھرب روپیہ) فرانس کے ذمے تاوان جنگ ڈالا گیا مگر نو مفتوح علاقوں میں اتنی اجازت دے دی گئی کہ ایک تاریخ معین تک جو لوگ چاہیں فرانسیسی مملکت میں نقل مکان کر جائیں۔ اس طرح لڑائی کے ختم ہوتے ہی مارچ ۱۸۷۱ء میں متحدہ جرمنی کی پہلی قومی مجلس کا انعقاد ہوا جس میں تمام ریاستوں کے نمایندے بطوع خاطر شریک ہوئے، ساری گذشتہ رقابتیں اور مخالفتیں مٹ گئیں اور جرمنی کی جدید تاریخ کا آغاز ہوا۔

(۲)

یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ ممالکِ جرمنی کا سیاسی نظام ۱۸۷۱ء میں مکمل ہوگیا تھا لیکن اندرونی اور فروعی اختلافات ابھی تک جوں کے توں موجود تھے لہٰذا حقیقی معنوں میں یہ زمانہ اتحادِ جرمنی کا آغاز ہے نہ کہ تکمیل کا۔ بات یہ ہے کہ طوائف الملوکی کے دور میں ہر علاقے کا قانون، گز و سکہ، اور ضابطہ جدا گانہ تھا، تجارتی اور راہداری کے محصول مختلف تھے، ڈاک خانے اور ریلیں الگ الگ تھیں، اب ضرورت پیش آئی کہ انھیں ایک عام اور مشترک انتظام کے ماتحت لایا جائے کہ اسکے بغیر قوم کی متحد ترقی اور سلطنت کا استحکام ممکن نہ تھا۔ بسمارک نے اسکے لیے سرتوڑ کوشش کی اور سخت جد و جہد کے بعد ۱۸۷۹ء میں ساری مملکت کا یکساں انتظامِ عدالت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اسی طرح دوسرے اختلافات کو دُور کرنے میں اُسے بہت دقتیں پیش آئیں، کیونکہ روشن خیال ہونے کے باوجود، لوگوں کی قدامت پسند طبائع کو پرانی رسموں کا یک لخت چھوڑنا گوارا نہ تھا، اور بسمارک ہی جیسا زیرک اور مستقل مزاج مدبر تھا جس نے بیس برس لگاتار کوششیں کرکے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی اور قوم جرمنی کو فلاح و بہتری کے ایسے رستے پر ڈال دیا کہ جس پر چلنے سے وہ بہت جلد دنیا کی ایک عظیم الشان قوم بن گئی۔ کیا مالی اور تجارتی[1]، اور کیا علمی اور دماغی[2] ——

[1] ۱۹۱۱ء میں سلطنت کا مالیہ ساڑھے چودہ کروڑ پونڈ سے زیادہ تھا۔ اور اسکے روزافزوں مصارفِ جنگی و ملکی وغیرہ کے واسطے یہ رقم کثیر بھی، جو برطانیۂ کلاں و آئرلینڈ جیسے دولتمند ممالک کے مجموعی مالیے کے قریب قریب پہنچ گئی ہے، بمشکل مکتفی ہوتی تھی۔ اسی طرح جرمنی کی دن دونی اور رات چوگنی ہونے والی تجارت بھی برطانیہ سے کم نہیں بلکہ جہاں تک درآمد کا تعلق ہے، کچھ سوا ہی نکلتی ہے یعنی گو برطانیہ اپنے تموّل کی وجہ سے چیزیں خریدنے میں سب سے بڑھا ہوا ہے لیکن باہر مصنوعات بنا بنا کے بھیجنے کے معاملے میں وہ اس نئے حریف سے دبا جاتا ہے جنکی تجارت درآمد و برآمد پچھلے چار سال میں حسبِ ذیل رہی ہے:—

ہر قسم کی ترقی میں اس نے اپنے تئیں عالم سے ممتاز و سربلند کرلیا۔ اور آخرِ کار اسکے حوصلے اسقدر بڑھے کہ دنیا کی تمام بڑی بڑی اور دولتمند ترین سلطنتوں سے مقابلہ کرنے لگی اور گُتھ گئی!

جرمنی کی عام اور تدریجی ترقیوں پر وضاحت کے ساتھ بحث کرنے کا یہ موقعہ نہیں ہے اور ہمیں جلدی ہے کہ زیادہ پھیلائے بغیر اپنے مضمون کو ختم کردیں۔ لیکن اُن سیاسی معاملات کا ذکر کرنا ضرور ہے جو ایک طرح سے براہ راست موجودہ جنگ کا سبب ہوے۔

۱۸۷۸ء میں جب ترکوں اور روسیوں کی وہ خوں ریز لڑائی ختم ہوئی جس میں سلطنتِ عثمانیہ کی بنیادیں، خود اپنے لوگوں کی غداری سے متزلزل ہوگئیں، تو برلن کا مشہور و معروف عہدنامہ ہُوا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۔

سال	درآمد	برآمد
سنہ ۱۹۰۰	۴۷ کرور پونڈ	۳۲ کرو. ۴۰ لاکھ پونڈ
سنہ ۱۹۰۹	۴۴ ,,	۳۴ ,, ۲۹ ,,
سنہ ۱۹۱۰	۴۶ ½ ,,	۳۸ ,, ۲۲ ,,
سنہ ۱۹۱۱	۴۰ ¾ ,,	۴۰ ,, ۵۰ ,,

لیکن جرمنی کا سب سے قابلِ تحسین کارنامہ علم و فن کی ترقی ہے۔ اس خوش نصیب ملک میں کوئی انسان ناخواندہ نہیں ملتا اور کل ساڑھے چھ کروڑ آبادی کے لیے ساٹھ ہزار سے زیادہ ابتدائی مدارس ہیں جن میں ایک کروڑ کے قریب بچے تعلیم پاتے ہیں۔ (حالانکہ ہمارے ملک ہندوستان میں تینتیس کروڑ آبادی کے باوجود کل تعلیم پانے والوں کی جن میں ابتدائی اور اعلےٰ سب درجے شامل ہیں تعداد صرف ۶۲ لاکھ ۱۱ ہزار ہے!) علاوہ بیلڑوں مختلف مدارس علم و فن کے جرمنی میں اکیس یونیورسٹیاں بڑی بڑی ہیں، اور ان میں پچپن ۵۵ ہزار طلبا، فلسفہ و قانون، الٰہیات و طبابت وغیرہ علوم کی منتہیانہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ (برطانیۂ کلاں و آئرلینڈ میں طلبائے یونیورسٹی کی کل تعداد اکیس ہزار سے زیادہ نہیں اور ان میں بھی بہت زیادہ طالب علم ممالک غیر کے شامل ہیں حالانکہ جرمنی میں وہ نسبتاً کم ہیں)۔

اور اُسی کے بموجب یورپ کی بڑی طاقتوں کا موجودہ توازن قائم کیا گیا۔ اور اس میں سب سے زیادہ نفع میں انگلستان اور آسٹریا والے رہے۔ جنھیں بے لوٹ بھڑے سلطنت عثمانیہ کے معقول علاقے مل گئے۔ باقی روس کی اشک شوئی ایک کثیر تاوانِ جنگ، قفقاز اور یہ اُمید دلا کے کر دی گئی کہ بلغاریہ کی نئی ریاست روسی اثر بڑھانے کے لیے بلقان میں ہراول کا کام دے گی۔ یہی وہ آخری شق ہے جس کا بر روے کار آنا آسٹریا کو شاق ہے۔ برلن کانگرس کے مباحثوں میں بھی اسکے ان خیالات کا اظہار پوری طرح ہو چکا ہے۔ اور اسی وجہ سے روسیوں کو اسکے ساتھ ایک قلبی عداوت پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہی رقابت ٹرپل الائنس یعنی "اتحادِ ثلاثہ" کی اصل وجہ تحریک ہے۔ اوّل اوّل اسکے تحریر میں آتے وقت اطالیہ شریکِ اتحاد نہ تھا اور اسلیے وہ صرف آسٹریا اور جرمنی کا باہمی تحالف یا اتحاد تھا، اور اُسکی خاص خاص شرطیں جو عہدنامہ اتحاد کا لُب لباب ہیں، یہ تھیں کہ

"(الف) اگر کوئی بڑی طاقت آسٹریا پر شمال مشرق کی طرف سے حملہ کرے تو جرمنی کا فرض ہوگا کہ وہ اُسکی امداد و مدافعت کرے۔ اور (ب) اگر جرمنی کے ایک سلطنت سے مصروفِ پیکار رہنے کے زمانے میں کوئی دوسری سلطنت اُسپر حملہ آور ہو تو آسٹریا کا فرض ہوگا کہ اُس کی جانب سے سینہ سپر ہو جائے"

ناظرین نے ان ہر دو شرائط کی اہمیت کو یقین ہے اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا؛ پہلی کا تو یہ مطلب ہے کہ جرمنی آسٹریا کی مدد کرے بشرطیکہ اُسپر روس حملہ آور ہو۔ اور دوسری شرط کا مدعا یہ ہے کہ اگر جرمنی فرانس سے مصروفِ پیکار ہو جائے (جس کا ۱۸۷۰ء سے برابر اندیشہ رہا ہے) اور اُس وقت روسی فرانسیسیوں کی شرکت کریں تو آسٹریا کو جرمنی کی طرف سے لڑنا پڑے گا۔ مگر اس معاہدے میں دو باتیں بالخصوص قابلِ لحاظ ہیں۔ اوّل تو یہ کہ شرط کے الفاظ ایسے ہیں کہ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ لڑائی چھیڑنے والے روسی نہیں بلکہ آسٹرین ہیں، تو جرمنی قانوناً پابند نہیں ہے کہ اُنکا شریک ہو!

یہی وہ بحث تھی جسکی بنیاد پر شاطر جرمنی پرنس بسمارک نے اتحادِ مذکور کے دو ہی برس بعد روسیوں سے بھی ایک خفیہ عہدنامہ کر لیا تھا (۱۸۸۴ء) - اُسکا مضمون یہ تھا کہ اگر روسیوں پر کوئی بڑی سلطنت حملہ آور ہو تو جرمنی غیر جانبدار رہے گا، اور اگر جرمنی کسی بڑی سلطنت سے مصروفِ جنگ ہو تو روس غیر جانبداری کا اعلان کردے گا ـــــ مطلب یہ کہ اگر آسٹریا پیش قدمی کرے تو جرمنی اُسکی مدد نہ کرے گا کیونکہ آسٹریا کے ساتھ پہلے اتحاد کی رُو سے اُسکی شرکتِ جنگ فقط اُس صورت میں ضروری ہوتی ہے جبکہ کوئی اور طاقت آسٹریا پر حملہ کرے !

دوسری بات جو آسٹریا اور جرمنی کے معاہدے سے مترشح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جرمنی اکیلے فرانس کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے اُسی وقت تیار تھا، اور اُسے آسٹروی اعانت کی صرف اُس صورت میں ضرورت محسوس ہوسکتی تھی جبکہ روسی فرانس کے ساتھ مل جائیں۔

جرمنی انھیں پیچیدہ غیر ملکی معاہدوں میں گرفتار تھی کہ ولیم اوّل نے وفات پائی اور فریڈرک بادشاہ ہُوا - لیکن چند ماہ کے اندر وہ بھی مرگیا اور موجودہ قیصر ولیم ثانی نے تختِ جرمنی نے زینت پائی - (۱۸۸۸ء) ۔ اس شخص کو اگرچہ دعوے تو یہ تھا کہ وہ اپنے دادا ولیم اوّل کے قدم بقدم چلنے کا آرزومند ہے لیکن فی الحقیقت جمہوریت پسندی کا جہاں تک تعلق ہے اُسے اپنے دادا سے کچھ نسبت نہیں اور نہ اپنے دادا کے محبوب وزیر بسمارک ہی کے ساتھ اچھی طرح نباہ سکا - اسی اَن بَن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۰ء میں یہ نامور وزیر مستعفی ہوگیا اور کیپ ری وی نے اُسکی جگہ لی - ساتھ ہی بادشاہ کا ذاتی اثر و اقتدار اس قدر بڑھ گیا کہ بہت سے اہل الرائے متردد نظر آنے لگے کہ کہیں آخر میں یہاں آئینی اور مشروطہ یا دستوری حکومت ہی کا خاتمہ نہ ہوجائے۔

شاید انھی افکار کی وجہ تھی کہ جرمنی میں ان دنوں سوشلزم (جسکا اہلِ مصر "اصولِ اشتراک" ترجمہ کرنے لگے ہیں) کی تحریک کو بڑی تقویت اور سرسبزی حاصل ہوئی[1] - یہ نئی شخصیت

---

[1] حاشیہ کے لیے صفحہ آیندہ ملاحظہ ہو۔

کی عین ضد ہے اور اسکے حامی دنیا بھر میں عام مساوات پھیلانا چاہتے ہیں۔ انکا مقصد یہ ہے کہ حکومت ہر فرد رعایا کو یکساں طور پر تعلیم و تربیت دیا کرے اور جب وہ جوان ہو کر اپنی زندگی شروع کریں تو سب کو بالکل مساوی سرمایۂ ابتدائی مہیا کردے تاکہ وہ اُس سے اپنا کام شروع کر سکیں اور پھر حسب لیاقت وحیثیت مدارج ترقی حاصل کریں۔ اپنی زندگی میں انھیں ایسی دولت جمع کرلینے کا اختیار رہے جو قانونی اور جائز ذرایع سے اکھٹی کی گئی ہو، لیکن مرنے کے بعد ہر شخص کا ترکہ سلطنت یا حکومت کے ہاتھ میں منتقل ہو جانا چاہیے کہ وہ تمام قوم کی فلاح و بہبود میں اُسے لگا دے ــــــ بالفاظِ دیگر موجودہ طریقِ وراثت توڑ دیا جائے جو ہماری قدرتی مساوات میں حارج اور مانع آتی ہے اور اس بات کا موقع دیتی ہے کہ ایک دولتمند کا لڑکا اپنے آبا کے جمع کردہ سرمائے سے اتنا بڑا آدمی بنجائے کہ دوسری زندگی کی جد و جہد میں بحیثیتِ مساوی اسکا مقابلہ کرنے سے عاری اور قاصر رہ جائیں[۱۵]۔

یاد رکھنا چاہیے کہ سوشلزم کو انارکزم یا شورش و خوں ریزی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ قیصر امرائے جرمنی سمیت اُسکو بدنام و مغلوب کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ قدرتی طور پر اکثر روشن خیال ارباب فکر اُسکے حامی ہیں اور مزدور پیشہ یا ادنیٰ درجے کے لوگ اس گروہ میں شمولیت رکھتے ہیں۔ لیکن عام طور پر جو لوگ اس تعلیم کے اصولاً مخالف ہیں وہ بھی کوئی دشمنی اس سے نہیں رکھتے اور کئی مرتبہ جب حکومت نے ارادہ کیا کہ بڑے بڑے اشتراکی لیڈروں پر مقدمہ چلائے تو سارے ملک میں ان سے ہمدردی کا جوش پھیل گیا اور قیصر اور اسکے مشیروں کو

(نوٹ ۱۴) چنانچہ اسوقت مجلس قومی کے کل ۳۹۷ ممبروں میں ۱۱۰ سوشلسٹ یا اشتراکی ہیں اور اتنی بڑی تعداد کسی دوسری جماعت کی نہیں ہے۔ اگرچہ اشتراکیوں کی مخالفت میں اکثر وہ سب فریق بھی باہم متحد ہو جاتے ہیں۔

۱۵ افسوس ہے کہ اس مہتم بالشان موضوع پر، جو یورپ کی جدید ذہنی ترقیوں کا، اور اسکی دنیاوی عظمت و آزاد خیالی کا عطر عطیر ہے، اُردو میں کوئی کتاب بھی نہیں لکھی گئی۔ حالانکہ اقتدار پرست ایشیا میں سب سے زیادہ ضرورت اسی انسانی مساوات کی تعلیم پھیلانے کی ہے۔

اپنی زبردستیوں میں ذلت و ناکامی اُٹھانی پڑی۔

ان تمام آزاد خیالیوں کے باوجود بھی یہ کہنا غلط نہیں معلوم ہوتا کہ جرمنی میں ابھی تک شخصیت کا زور ہے اور قیصر سلطنت کے انتظامات پر ضرورت سے زیادہ حاوی ہوگیا ہے۔ اسکے زمانے میں مُلک نے جو مسلسل ترقیاں کی ہیں، اُنکی وضاحت تو یہیں بیان کرنی محض طوالت ہے۔ البتہ اُن سیاسی تغیرات کا حال مختصر لکھنا ضروری ہے جنکا معلول اس خوفناک محاربۂ عالمگیر کی صورت میں دنیا کو پریشان و مضطرب کر رہا ہے۔

۱۸۹۰ء میں سب سے پہلے کپ ریوی نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر روس و آسٹریا کی لڑائی چھڑے تو جرمنی کو اپنے عہد قائم رکھنے میں نہایت دشواری پیش آئے گی۔ آج کل کی لڑائیوں میں یہ ثابت کرنا کہ پہل فلانے فریق نے کی، تقریباً محال ہوگیا ہے پس جرمنی کی حکومت کے لیے کوئی خاص رویہ اختیار کرنا بھی، صورتِ مذکورہ میں، ناممکن ہوجائے گا اور اگر وہ خاموش بیٹھی رہے گی تو آسٹریا چھوڑ ساری دنیا کی نظر میں عہد شکن قرار پائے گی۔ نظر بریں اخلاقاً یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم صرف ایک معاہدے کو قایم رکھیں اور یا دونوں سے ہاتھ اُٹھالیں۔

اس مسئلے میں اندر ہی اندر اہلِ حکومت بہت دن گفت و شنید کرتے رہے اور انجام کار جب روسی معاہدے کی، جو بسمارک نے چھ سال کے واسطے کیا تھا، تجدید کا وقت آیا تو کپ ریوی نے اُس سے انکار کردیا۔ اور بالواسطہ اس ایتلاف کی بنا ڈالی جو روس و فرانس کے درمیان ۱۸۹۳ء میں ہُوا اور جس میں بعد ازاں انگریز بھی کچھ ظاہر کچھ چھُپے ہوے، شریک ہو گئے۔

روس و فرانس کا علیٰحدہ ہو جانا ایسی چھوٹی بات نہ تھی کہ جرمنی میں اسپر کوئی توجہ نہ کیجاتی یہ دونوں دنیا کی بڑی طاقتیں تھیں اور دونوں جرمنی کے ہمسائے میں ملی ہوئی تھیں۔ لہذا مُلک بھر میں اپنی مدافعت کرنے کا جوش پھیل گیا، فوجی خدمت کے جبری قانون کو اور زیادہ وسعت دی گئی اور اس پیمانے پر جنگی تیاریوں کا سلسلہ شروع ہوا جس کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔

نہ سب کچھ تھا لیکن دلوں کے بُخار دلوں میں تھے اور ہر فریق تیاری کی فرصت کو غنیمت سمجھے جاتا تھا۔ روس و فرانس تو اپنے فوجی نظام کے درست کرنے میں اور بیرونی مقبوضات کے جھگڑوں میں پھنسے ہوے تھے اور جرمنی تجارت و مصنوعات بڑھا بڑھا کے کافی دولت جمع کرنے کی دُھن میں لگا ہُوا تھا۔ اسی اثنا میں جنوبی افریقہ کی لڑائی بوئروں اور انگریزوں کے درمیان چھڑ گئی اور جب انگریزی بیڑے نے سختی سے جرمنی جہازوں کی تلاشیاں لیں کہ اُن اشیاے ممنوعہ کو افریقہ نہ لے جانے دیں جو قوانینِ بین الاقوام کی روسے کوئی غیر جانبدار متخاصمین کے ہاتھ نہیں فروخت کر سکتا، تو اُسوقت جرمن خیالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ یعنی اپنی بحری طاقت بڑھانے کی انھیں ضرورت محسوس ہوئی اور وہ انگلستان سے سخت بدظن ہوگئے۔ ساتھ ہی تجارتی رقابت اور علمی رشک نے اُنکے دلوں میں عجب قسم کی نفرت انگریزوں کی طرف سے پیدا کرنی شروع کی اور وہ جو اُنکے بڑے مدّاح اور مقلد تھے رفتہ رفتہ قلبی دشمن ہوگئے۔ گویا پہلے خیالات کے ردّ عمل کا آغاز ہُوا۔

روس و جاپان کی لڑائی میں بالٹک بیڑے کی تباہی نے جرمنوں کو بڑا موقع دے دیا کہ وہ اپنی بحری تیاریوں کو خاص برطانیہ کے مقابلے میں لائیں۔ چنانچہ جنگی بندرگاہ کیل (جو بحیرۂ بالٹک کے رُخ پر واقع ہے) کے دوسری جانب بندر ولیم (ولیمزہیون) تیار کی گئی جسکا رُخ انگلستان کی جانب بحیرۂ شمالی میں تھا۔ اور ان دونوں مقامات کو نہر کیل کے ذریعے اس طرح ملا دیا گیا کہ جس وقت چاہیں ۲۴ گھنٹے کے اندر اپنا تمام و کمال بیڑا بحیرۂ بالٹک سے بحیرۂ شمالی میں منتقل کر لیں! حالانکہ اُسکا پہلا سمندری سفر کم سے کم پانچ دن کا ہے۔ اسی کے قریب سمندر میں جزیرۂ ہلو گو لینڈ ہے جسے بسمارک نے بعض افریقی علاقے دے کر انگریزوں سے بدلے میں لے لیا تھا۔ (۱۸۹۰ء)۔ اور اُس وقت کسی کو یہ خدشہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہی ذرا سا گمنام ٹاپو جرمن تیاریوں کی بدولت ایسی اہم چیز بنجائے گا کہ خود انگریز اُسے "ایک طمنچہ، جسکی نال انگلستان کی طرف ہے" قرار دیں گے۔

لیکن شاید سب سے زیادہ جن چیزوں نے ان دونوں قوموں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا کی وہ بغداد ریلوے کا جھگڑا اور قضیۂ اگادر ہے۔ پہلے میں جرمنی کے تجارتی منافع سے انگریزی مصالح ملکی آکے ٹکراتے ہیں اور دوسرے میں تو صاف صاف انھوں نے فرانس کی حمایت لی تھی اور جرمنوں کو دھمکا دیا تھا کہ وہ مراکو کے معاملے میں دخل دیگا تو تمام انگریزی سرمایہ جو جرمنی میں پھیلا ہُوا ہو اکدم ہٹا لیا جائیگا۔ بالفاظِ دیگر، ایک ایسا اقتصادی نقصان اُسے پہنچایا جائیگا جسکی تلافی ہونی دشوار ہو۔

الغرض یہ بیج دلوں میں پڑے ہوئے ہی تھے کہ موجودہ جنگ چھڑ گئی۔ اور انگریزا ہل حکومت نے فیصلہ کر دیا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ اب مصلحت نہ برتی جائے اور جرمنی سے ایک وار پار۔ لڑائی لڑکے طے کر دیا جائے کہ دنیا میں آیندہ بڑا انگریز تھیں رہنا ہے یا ہمیں؟ اب جسکو بدا دیوے۔

سیّد ہاشمی (فریدآبادی)

بی بی حوّا بابا آدم سے کہتی ہیں

(ماخوذ از پیراڈائز لوسٹ۔ ملٹن)

"ہے کیسی مفرح یہ ٹھنڈی ہوا — ہے دلچسپ کیسا سحر کا سماں!
وہ مرغِ خوش آہنگ کے چہچہے — وہ اُڑ اُڑ کے جانا یہاں سے وہاں
مہکنا وہ گلہائے خوش رنگ کا — تر و تازہ ہوں جن سے روح و رواں
لپٹ جانا وہ شاخ کا شاخ سے — وہ غنچوں کے لب سے تبسّم عیاں
جوانانِ گلشن کی وہ چھیڑ چھاڑ — وہ پھولوں سے بلبل کی اٹکھیلیاں
شعاعوں کا وہ عکس تالاب میں — وہ ہونا ہر اک موج کا زرفشاں
وہ پُر لطف لیلائے شب کا وُرود — وہ راحت فزا چاندنی کا سماں
چمکتے دمکتے ستاروں کا نور — ہو جس سے منوّر یہ سارا جہاں
وہ مخلوق کا ایسا پیہم سکوت — کہ کانوں کو اک "ہوں" بھی گزرے گراں
شگفتہ مگر دل کو تیرے بغیر — کریں گی نہ ہرگز یہ دلچسپیاں"

اختر (جوناگڑھی)

ریویو الانسان

(قیمت عہ ازسجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی۔ بازار عیسیٰ میاں۔ حیدرآباد دکن)

افسوس ہے اس کتاب پر جسے شایع ہوئے بہت دن ہو چکے ہیں اب تک ہمیں ریویو کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ حالانکہ الانسان اُردو زبان کی بہت اچھی اور مفید کتابوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اسکے ۱۰ باب اور ۲۱۲ صفحے ہیں اور ان میں آدمی کی جسمانی شناخت سے لے کر قوائے ظاہر و باطن، تہذیب، تمدن، مذہب، اخلاق وغیرہ تمام ضروری مباحث پر مختصر اور دلچسپ بحث کی گئی ہے، جسکی وجہ سے کتاب میں ایک عالمانہ جامعیت پیدا ہو گئی ہے۔ ہماری دانست میں اُردو خواں حضرات کو اس کا مطالعہ نہایت نافع ہوگا اور انگریزی داں لوگ بھی جو وقت اسکے پڑھنے میں صرف کریں گے وہ ضایع نہ جائیگا۔ صاحب کتاب نے آفرینش انسان کے ذکر میں مسئلۂ ارتقا کو بھی چھیڑا ہے اور چند اہلِ سائنس کے اقوال لکھکر نظریۂ ڈارون کی تردید کرنی چاہی ہے۔ وہ لینگ کی رائے نقل کرتے ہیں کہ وحشی سے وحشی انسان کے دماغ اور اعلیٰ سے اعلیٰ بندر کے دماغ میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے پس یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ آدمی، بندر کی ترقی یافتہ نوع کا نام ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ جدید تحقیقات کے سیلاب نے عرصہ ہوا کہ ان تمام شکوک و اعتراضات کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا۔ آج "ڈارون تھیوری" اک قیاس یا نظریہ نہیں، ایک قانون ہے جسکی، بغیر نہایت قوی دلائل و براہین کے، تردید یا تخفیف کرنا سخت لاعلمانہ جسارت ہے۔ ہمارے ہمعصر اور یورپ کے سب سے زیادہ نامور جرمن فلسفی ہیکل نے بار بار اس بات کو لکھا اور ثابت کیا ہے کہ ایک بن مانس اور وحشی انسان کے دماغ میں اتنا زیادہ فرق نہیں ہوتا جتنا کہ ایک وحشی اور ایک تربیت یافتہ شخص کے دماغ میں نظر آتا ہے۔ اسکے علاوہ جب خود آدمی کی چند سالہ کوششوں نے کُتّے اور کبوتر کی اسقدر مختلف نسلیں پیدا کر دی ہیں کہ اپنی اصل سے بالکل الگ اور غیر مشابہ ہیں

تو مادرِ فطرت کے لیے جو صبح سے شام تک مٹی کو نباتات اور نباتات میں کیڑے اور کیڑوں سے پردار تیتریاں بناتی رہتی ہے، کیا مشکل ہے کہ ایک ادنیٰ نوعِ حیوانی کو اعلیٰ ترین نوع میں مبدّل کر دے!

"ش"

موت

اے اجل سردفترِ دارِ فنا ہے تیرا نام — تجھ سے آثارِ قیامت ہیں نمایاں صبح و شام
کچھ تجھے پروا نہیں برہم ہو دنیا کا نظام — کھینچ کر لاتی ہے مرغِ رُوح کو تو زیرِ دام
جاں بلب اشکوں سے ہو یا بندِ غم یا آہ سے
تجھکو کیا مطلب کسی کے نالۂ جانکاہ سے

پیچ و تابِ نزع کی تو پھینکتی ہے جب کمند — پیکرِ ذی رُوح میں ہوتا ہے لرزاں بند بند
زندگی بھر تو رہا غافل دلِ غفلت پسند — خوابِ غفلت سے جہاں چونکا۔ تو دیکھی آنکھ بند
ڈوب کر قعرِ فنا میں کوئی گھبرایا تو کیا
سر پہ پانی چڑھ گیا۔ پھر ہوش میں آیا تو کیا

تیرا آنا باعثِ بربادیِ کاشانہ ہے — منزلِ آباد میں تجھ سے عیاں ویرانہ ہے
گو یہ دُنیا رہگذر ہے اور مہمان خانہ ہے — اسپہ بھی ہر سو تری بیداد کا افسانہ ہے
رحم سے ناآشنا کچھ اس طرح ہے دل ترا
عاجزوں کا ذکر کیا۔ سرکش بھی ہے قائل ترا

توڑ دے رگ رگ بدن کی تجھ میں وہ تاثیر ہے — جسمِ انسانی تجھی سے پیکرِ تصویر ہے
روح کھنچ آتی ہے اتنی قوتِ تسخیر ہے — تیرے آگے سرد ساری گرمیِ تدبیر ہے
گو بظاہر تو نے زائل کی بصارت آنکھ سے
اُٹھ گئے غفلت کے پردے درحقیقت آنکھ سے

لوٹ لے جاتی ہے دم میں کاروانِ عیش کو　　خون کے آنسو رُلاتی ہے جہانِ عیش کو
خاک کرتی ہے بہارِ بوستانِ عیش کو　　کلبۂ احزاں بناتی ہے مکانِ عیش کو
تو نے دستِ ظلم سے چھینا کسی کا تخت و تاج
دے دیا نغموں کے بدلے نالۂ دل کا رواج

قصرِ خاکی میں جو رکھا تو نے اے ظالم قدم　　دل کے ذرّے ذرّے سے پیدا ہوئی تصویرِ غم
اشکِ حسرت کی تراوش نے کیا آنکھوں کو نم　　غیر حالت ہو چلی کھنچنے لگا رگ رگ سے دم
ہچکیوں سے ہوگئے پیہم عیاں آثارِ حشر
گرم آخر کو سرِ بالیں ہوا بازارِ حشر

مرنے والے کے الم میں کوئی مضطر سینہ چاک　　سوزِ پنہاں کے اثر سے دل کسی کا جل کے خاک
سخت جاں کوئی کیے دیتا ہے اپنے کو ہلاک　　پیٹتا ہے سر کوئی حسرت زدہ - اندوہ ناک
عرش کے پائے ہلا دیتا ہے کوئی آہ سے
دل تلاطم میں کسی کا نالۂ جاں کاہ سے

سنگِ فرقت سے کسی کا شیشۂ دل چور ہے　　دردِ حرماں سے کوئی فریاد پر مجبور ہے
کاوشِ غم سے کسی کے قلب میں ناسور ہے　　کوئی طالب ہے ترا - تو اُس سے لیکن دور ہے
رنج سہہ سہہ کر کسی کے لب پہ ہے مُہرِ سکوت
کوئی پابندِ رضاے ربِّ حَیٌّ لَا یَمُوتُ

جو گیا دنیا سے پھر اُس کا پتا مفقود ہے　　سامنے سرمنزلِ مُلکِ عدم موجود ہے
غافلو آئینۂ عبرت یہ ہست و بود ہے　　شورشِ نظارۂ رنگِ چمن بے سود ہے
سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں　(حضرت غالبؒ)

سید محمد جعفر قدسی جائسی

نظرے خوش گزرے

دسمبر گزشتہ سے ناقابلِ تلافی اموات پر اظہار رنج و ہمدردی کی جو ناخوشگوار اور الم انگیز خدمت انجام دینا پڑتی ہے اُسکا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ شبلی و حالی کے لیے اگر بہی خواہانِ اُردو اور پرستارانِ اسلام اشک فشاں تھے تو آج سارا ہندوستان اُس فدائے ملک کے لیے نوحہ خوانی کر رہا ہے جسنے ساعات کے لحاظ سے اگرچہ زندگی تھوڑی پائی لیکن میزان عمل پر ان نسبتاً کم ساعات کو تولا جائے تو بڑی بڑی عمریں بھی اُسکے مقابلہ میں مثل پر سبک ثابت ہونگی۔ مسٹر گوپال کرشنا گوکھلے جنکی بے وقت موت پر ہم اظہارِ غم و الم کر رہے ہیں، حقیقت میں ایسے نامور فرزندانِ ملک میں سے تھے کہ اُنکی زندگی کے حالات پر نہ صرف اس زمانہ میں۔ بلکہ آیندہ نسلوں کو بھی بجا طور پر فخر کرنے کا موقع رہے گا۔ حُبِّ وطن اور قوم پرستی کے جذبات نے اُنکے دل پر کچھ ایسا قابو پا لیا تھا کہ اُنھیں اپنی ذات کی مطلق پروا نہیں رہی تھی جسے آخرکار اس قدر جلد قربان کر دینا پڑا۔ جو غیر معمولی دل و دماغ مبدءِ فیاض نے اس محبِ وطن کو عطا فرمایا تھا وہ بجائے خود ایک گراں قدر خصوصیت تھی لیکن جس طریقہ پر اُن اہلیتوں اور کمالات کو خدمتِ ملکی و قومی میں صرف کرنے کی توفیق اُنھیں عطا ہوئی یہ فی الاصل ایک قابلِ رشک و عظیم الشان نعمتِ الٰہی تھی۔ ملک و قوم کے لیے ایثار نفس کی جو مثال مسٹر گوکھلے کی زندگی میں پائی جاتی ہے، چاہیے کہ تمام فرزندانِ ہند عام طور پر، اور مسلمان خادمانِ قوم خاص طور پر جنکے ہاتھوں میں ہماری قومی کشتی بازیچۂ امواج بنی ہوئی ہے اُس سے سبق حاصل کریں۔ مسٹر گوکھلے کے حالات پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں ہے کہ عمل و اعتدال اُنکی ذات میں ایسے دو جوہر تھے جن میں اُنکی کامیابی کا اصلی راز مضمر تھا۔ ایک زمانہ میں بعض اصحاب اُنکو خوشامدی سمجھتے اور کہتے تھے۔ اور شاید اب بھی کانگریس کی انتہا پسند جماعت اُنکو قومی غدار اور حکومت پرست کے غیر خوش آیند اور ناموزوں القاب سے یاد کرتی ہو۔ لیکن ان لوگوں کو مستثنیٰ کرکے اگر دوسرے اہل الرائے اور صاحبانِ بصیرت کے خیالات معلوم کیے جائیں تو ظاہر ہوگا کہ اس وسیع براعظم میں جسے زبان و ملل کے امتیازات کی بنا پر اگر تقسیم کیا جائے تو یورپ سے کہیں زیادہ قومیتیں اور صوبے بنجائینگے۔ کوئی

دوسرا شخص مسٹر گوکھلے کا ہمرتبہ نہیں سمجھا گیا۔ اور اگر انکی زندگی میں کبھی اس ملک کو حکومت خود اختیاری کا موقع دیا جاتا تو اپنی ہردل عزیزی اور اعتماد عام کے لحاظ سے غالباً اس آئینی حکومت کے صدر نشین وہی منتخب ہوتے۔

دوسری اقوام و ملل سے قطع نظر کرکے اگر ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات رقابت پر نظر کی جائے تو بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہندو لیڈروں میں صرف مسٹر گوکھلے ہی ایسے شخص تھے جو اپنی قوم میں پورا اقتدار رکھنے کے باوجود مسلمانوں کا اعتماد بھی ایک بڑی حد تک حاصل کر چکے تھے اور سیاسی طور پر ان دونوں قوموں کے درمیان اتحاد پیدا ہونے کی اگر کچھ توقعات تھیں تو بے شبہ اس بڑے صلح پسند محبِ وطن کی وفات نے ان امیدوں میں بجد اضمحلال پیدا کر دیا ہے۔ خدائے کریم اس "نامور فدائی" کا نعم البدل عطا فرمائے اور اہلِ ملک کو اسکی خدمات کی قدر اور اسکی مثال کی تابعیت کرنے کی توفیق ــــ آمین۔

فروری کا الناظر تیار ہو گیا جب ہمیں اپنے شہر کے نامور اور ذہین طبیب حکیم عبدالولی صاحب کے انتقالِ پُرملال کی اطلاع ملی۔ مرحوم کو اس شہر کے سوا باہر بھی دُور دُور تک کے لوگ جانتے تھے اور انکے کمالات اور خوبیاں ایسی تھیں کہ یقیناً سب اُنکی قدر کرتے ہونگے۔ اپنے دوسرے معاصرین کے مقابلہ میں اس لحاظ سے وہ خاص طور پر ممتاز تھے کہ ملکی و قومی تحریکات میں بجد دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ دہلی کے مشہور رئیس طبیب جناب حاذق الملک کو اپنی آل انڈیا یونانی ویدک کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لیے جب اس مرکز طبی میں ایک شریک و معاون کی ضرورت پڑی تو اُس اختلاف کے باوجود جو خود اپنے خاندان کے بزرگوں اور بھائیوں کی طرف سے کیا گیا، اُنھوں نے کانفرنس میں پوری دلچسپی اور انہماک کے ساتھ شرکت کی اور لکھنؤ کا جلاس کانفرنس حقیقت یہ ہے کہ بہت کچھ انھیں کی کوششوں کا رہین منت ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ خود مقاصد کانفرنس اور منتظمین کے طریق کار نے طب یونانی کے سچے بہی خواہوں کو اُس سے بدگمان کرکے اُسکا مخالف بنا دیا اور اُسکی سودمندی باقی نہ رہی ورنہ اگر اتحاد و اتفاق کے ساتھ اور عمدہ اصولوں پر کام کیا جاتا تو اتباک کانفرنس نے اس شعبہ میں ایک نئی روح پھونک دی ہوتی۔ حکیم عبدالولی صاحب کے جوش قومی کا ایک دوسرا مظہر رسالہ معلومات ہے جو انکے برادر خرد مسٹر عبدالوالی بی اے کی اڈیٹری میں جھوائی ٹولہ سے نکلتا ہے۔ ہم اڈیٹر صاحب معلومات اور دیگر اصحاب خاندان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے یہ توقع ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ متفق

طور پر اس رسالہ کے بقا و قیام میں سعی فرمائیں گے ۔ اور مرحوم کے لیے بدل دعاے مغفرت کرتے ہیں۔

نواب ڈھاکہ۔ نواب خواجہ سر سلیم اللہ بہادر نے بھی انتقال کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون ۔ تقسیم بنگالہ نے جو نزاع ہندو بنگالیوں میں پیدا کر دی تھی اُسکو فرو کرنے اور بے اثر بنانے کے لیے سلطان مشرقی بنگالہ کو جس طرح اُبھارنے کی کوشش کی گئی تھی اُسکا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اس گھوارۂ عشرت کے پروردہ لیکن ذہین و تربیت یافتہ امیر کو اُنکے ۔ وہ نمایاں بننے اور قائم مقامی کرنے کا موقع مل گیا ۔ اور حق یہ ہے کہ اس زمانہ میں جتنے اربابِ دولت و اقتدار مسلمانوں کے لیڈر بن گئے ہیں کسی میں سرداری کی وہ شانیں نہیں پائی جاتی ہیں جو خواجہ سلیم اللہ مرحوم میں جمع ہو گئی تھیں۔ فیاضی و سیرچشمی میں اگر وہ اپنی آپ نظیر تھے تو رعب و اثر میں بھی وہ یکتا تھے۔ پھر بڑی بات یہ تھی کہ عیش پسندی اور امارت نے اُنکے قواے ذہنی کو بالکل بیکار نہیں بنا دیا تھا۔ اور یہی اسباب ہیں کہ اُنکے انتقال نے ہمارے مشرقی برادرانِ ملت کو سخت صدمہ پہنچایا ہے خداوند کریم اُنھیں اُنکا نعم البدل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ہمارے شہر کی مشہور علمی آبادی فرنگی محل کے ساتھ جو علمی روایات وابستہ ہیں اُنسے تمام اہلِ ہند واقف ہیں۔ اس لیے غالباً یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ یہاں کے مدرسۂ نظامیہ کے تربیت یافتگان نے اسی ماہ ربیع الثانی سے ایک علمی ۔ مذہبی ۔ تاریخی اور ادبی رسالہ جاری کرنے کا ارادہ کیا ہے اور عزیزی مولوی صبغۃ اللہ شہید کی اڈیٹری میں ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ جلد ترقی کر جائے گا ۔ النظامیہ کا مقصد علوم قدیمہ کی حفاظت کرنا اور قلوب اسلامی میں مذہبی روشنی پھیلانا ہوگا۔ سیاسیاتِ ملکی سے اُسے کچھ سروکار نہ ہوگا اور ہندوستان کے مشہور اربابِ علم کے مضامین سے اُسکے اوراق زینت پاتے رہیں گے ۔ رسالہ کا حجم دو جزو اور قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (۲/۸) مقرر کی گئی ہے۔ اصحاب ذوق منیجر النظامیہ فرنگی محل ۔ لکھنؤ۔ کے پتہ پر مراسلت کریں۔

خوانِ ادب

فغانِ ایران

(مجلد باتصویر۔ قیمت عہ۔ الناظر بک ایجنسی)

مملکت ایران کے جمہوریت پسند اور وطن پرست گروہ نے جب سنہ ۱۹۰۹ع کے وسط میں بدبخت محمد علی شاہ کو تخت و تاج سے محروم کرکے جلا وطنی کی زندگی بسر کرنے کے لیے یورپ میں پناہ گزیں کر دیا اور روس و انگلستان کے متحدہ اسطے سے اس جلا وطنی کے معاوضہ میں اُسے سولہ ہزار چھ سو چھیاسٹھ پاؤنڈ سالانہ کی پنشن دیے جانے کا حکومت دستوری نے وعدہ کر لیا تو مجلس آئینی ازسرِ نو قائم ہوئی اور نئی امیدوں اور امنگوں کے ساتھ سلطنت کے انتظام میں مصروف ہوئی۔ اور تمام اسلامی حلقوں میں یہ بیجا توقع پیدا ہو گئی کہ آگے چلکر وطن پرستوں کے ہاتھوں اس قدیم مملکت کو پھر وہی عظمت و منزلت حاصل ہو جائیگی جو یورپین ممالک کے عروج و اقتدار سے قبل اُسے حاصل تھی۔ ملک کا خزانہ اُسوقت خالی تھا اور مالیہ کا نظم و نسق کچھ ایسی ابتری کی حالت میں تھا کہ بیرونی امداد کے بغیر کسی قسم کی اصلاح و ترقی ممکن نہ تھی۔ اسلیے آخر سنہ ۱۹۱۰ع میں مجلس نے ممالک متحدہ امریکہ سے مراسلت شروع کی اور صدر المہام خزانہ کے عہدہ پر مسٹر ڈبلیو مارگن شوسٹر نامی ایک امریکن کا تقرر کیا گیا۔ مئی سنہ ۱۹۱۱ع میں مسٹر شوسٹر طہران پہنچے اور مہینے تک نہایت قابلیت۔ فرض شناسی اور ہمدردی کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض کو ادا کرکے روسی سازشوں کی بدولت اوائل سنہ ۱۹۱۲ع میں ایران سے چلے آئے۔ اور اسی سال کے وسط میں اُنکی قابل قدر کتاب (The Strangling of Persia) شایع ہوئی۔ جسکو ہمارے معزز دوست سید محمد حسن بلگرامی کی اہلیہ صاحبہ نے اُردو میں ترجمہ کرکے "فغان ایران" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ کتاب موجودہ زمانہ کی بہترین تصنیفات میں شمار کیے جانے کے قابل ہے اس لیے کہ قطع نظر اپنے ادبی محاسن کے تاریخی حیثیت سے اسکے اندر ایسا مواد جمع کر دیا گیا ہے جسکے مطالعہ سے بیک نظر "ایران" کے متعلق تمام پیچیدہ واقعات کا علم ہو جاتا ہے اور اُسکے ماضی سے مستقبل کے بارے میں نتائج اخذ کرنے اور اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔

اُردو زبان میں سیاسی لٹریچر اخبارات و رسائل کے مضامین کے سوا تقریباً نہونے کے برابر ہے اور جو چند کتابیں چھپ گئی ہیں اُن میں بھی ہندوستان سے باہر کی دنیا کے متعلق کوئی معلومات نہیں ہے۔ "فغان ایران" اس وجہ سے خاص طور پر مطالعہ کے قابل ہے کہ ایران کے حالات سے بحث کرنے کے بعد

مسٹر شوسٹر کے ایک طویل باب یورو پین حکومتوں کی پالیسی چالوں، انکے اغراض اور انکی خفیہ کارروائیوں کے متعلق اضافہ کیا ہے جسکے مطالعہ سے اس ملک کے باشندوں کو عام طور پر اور جن لوگوں کو ہلالی حکومتوں کے بقا و استحکام کی آرزو ہے انکو خاص طور پر یورپ کے حکمت عملیوں کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ اس لیے تمام وہ اصحاب جنھیں اصل کتاب کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا انکی ایک ایک جلد منگا کر ضرور ملاحظہ کریں۔ ترجمہ نہایت سلیس ہے اور کتاب کے چھپوانے میں بہت اہتمام کیا گیا ہے۔ ۱۸ تصویریں ولایت کے اسی کارخانہ سے بنوائی گئی ہیں جس نے اصل کتاب کے لیے تصویریں مہیا کی تھیں۔ اور جلد تو ایسی خوشنما ہے کہ اس سے پہلے کسی اردو کی کتاب کی جلد ایسے اہتمام سے نہیں بنوائی گئی۔

محاربۂ فرانس و پرشیا

(قیمت ۸ر۔ الناظر بک ایجنسی)

موجودہ جنگ یورپ نے جرمنی اور شہنشاہ جرمنی کو تمام دنیا کے غور و فکر کا مرکز بنا دیا ہے اور بے شبہ حال کے واقعات کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے لازمی ہے کہ گزشتہ تاریخ و سیرت سے واقفیت بہم پہنچائی جائے "جرمنی کی مختصر تاریخ" کے عنوان سے جو دلآویز اور دلچسپ مضمون عزیزی سید ہاشمی سلمہ نے لکھا ہے اور جسکا دوسرا نمبر اسی پرچے میں شائع کیا جاتا ہے اسکے مطالعہ سے اردو داں حضرات کو نتائج جنگ کے متعلق رائے قائم کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ اسی مضمون میں اس جنگ کا کسی قدر اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے جو فرانس اور پرشیا کے درمیان ۱۸۷۰ء میں ہوئی تھی اور جس کو فی الحقیقت جرمن کی موجودہ عظمت و ہیبت کی بنیاد سمجھنا چاہیے۔ تقریباً اٹھارہ سال ہوئے کہ مولوی مصباح الدین احمد صاحب نے اسی جنگ کے متعلق ایک انگریزی تاریخ کا ترجمہ کیا تھا۔ اسوقت کی ضروریات پر نظر کرکے بڑی کوشش سے اُسکے چند نسخے الناظر بک ایجنسی نے مہیا کیے ہیں۔ جو ناظرین الناظر جرمنی کے نامور وزیر بسمارک کی حکمت عملیوں پر مطلع ہونا چاہیں وہ اس کتاب کو ضرور ملاحظہ کریں۔ اور اسی سلسلہ میں

شہنشاہ جرمنی کا سفر قسطنطنیہ

جس کی قیمت صرف ۸ر ہے ملاحظہ کریں "دربار برلن کے اسرار" کی مصنفہ نے اس سفر کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے ہیں اور جن کا اعادہ اُس مختصر ریویو میں کیا جا چکا ہے جو جنوری کے الناظر میں اسی کتاب پر لکھا گیا ہے اُن کی تنقید اور جانچ پڑتال میں اس رسالہ سے بڑی مدد ملے گی۔ کتاب کے آخر میں مولانا امجد علی اشہری کی ایک مختصر تقریظ ہے جو خاص دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

رپورٹ انجمن ترقی اُردو

بابت ۱۹۱۴ء

جناب صدر انجمن

میں انجمن ترقی اُردو کی سالانہ رپورٹ جناب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ اس سال میں انجمن کو اپنے مقاصد میں کہانتک کامیابی ہوئی۔

انجمن کی گزشتہ تاریخ پر نظر ڈالنے کی اس وقت کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ اسکی بڑی خصوصیت اور اسکا بڑا کام اسکی ناکامی تھی۔ اور اس لیے وہ دس گیارہ سال تک کس مپرسی کی حالت میں پڑی سسکتی رہی۔ آخر اسکی وجہ کیا؟ اسکا مقصد دیکھا جائے تو بہت ہی اچھا۔ بہت نیک، پھر یہ کسی کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتی، کسی کو بُرا بھلا نہیں کہتی، کسی کی چوری نہیں پکڑتی، کسی سے حلف نہیں لیتی۔ اور اس سے بڑھ کر اس میں ایک بڑی خوبی یہ تھی، جسے تمام اہل کانفرنس سنکر خوش ہونگے، کہ وہ کسی سے چندہ نہیں مانگتی تھی۔ اسکی حیا اور غیرت کی قسم کھانی چاہیے کہ وہ دس سال تک کبھی کسی سے ایک پیسہ کی خواہاں نہیں ہوئی۔ یوں کسی داتا نے اپنی خوشی سے

بھیک کا ٹکڑا دے دیا تو اس نے سر آنکھوں پر لیا، ورنہ سوال کرنا اُسکے مذہب میں حرام تھا۔ البتہ کانفرنس سے اسکا پانسو روپیہ سالیانہ مقرر ہے۔ وہ بھی کبھی ملا اور کبھی نہیں ملا۔ لیکن ایک ایسے بڑے کام کے لیے پانسو روپیہ سالانہ ایسا ہی ہے جیسے اونٹ کے منھ میں زیرہ۔ پانسو روپے، سال بھر کی خط وکتابت کے لیے بھی تو کافی نہیں ہوتے۔ کام اتنا بڑا، مقاصد ایسے عظیم الشان، لیکن سرمایہ کے نام پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ انجمن چاہتی ہے کہ مُلک میں روشنی پھیلائے۔ زبان اُردو کی اشاعت کرے اسکے علم ادب کو ترقی دے اور اُسے علمی زبان بنائے، مگر بغیر سرمایہ کے۔ کیا ممکن ہے ایک ایسے مہتم بالشان کام کو بغیر کسی سرمائے کے کرنا گویا ہوا میں قلعہ بنانا یا ریت میں ناؤ چلانا ہے۔

دس سال کی متواتر ناکامی کے بعد آخر وہ کرنا پڑا جو نہ کرنا تھا اور وہ ناگوار اور دل آزار طریقہ اختیار کرنا پڑا، جسے سنکر اکثر حضرات ناک بھوں چڑھائیں گے۔ یعنی چندہ مانگنا۔ یہی وہ بڑا قصور تھا جو سرسید احمد خاں بہادر نے کیا تھا۔ باقی یہ کہ اُنھوں نے مذہب میں دخل دیا، ہمارے رسم ورواج پر حملہ کیا وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں ہیں۔ یہ سب کچھ قدیم سے ہوتا چلا آیا تھا، لیکن چندہ مانگنا، اس بدعت کا بانی وہی مرحوم تھا، اور خدا اُسکے اس گناہِ عظیم کو معاف کرے۔

اگرچہ میں اس عزت کے قابل نہیں لیکن حُسنِ اتفاق سمجھیے یا سوء اتفاق، مجھے علی گڑھ کالج کے طالب علم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ مگر میں کالج میں ایک مٹھا طالب علم تھا۔ میں نہ کبھی کھیلوں میں شریک ہوا نہ یونین کلب میں حصہ لیا اور نہ انتخابِ پریزیڈنٹ وسکرٹری کے ہنگامے میں شامل ہُوا۔ غرض جو خوبیاں ایک علی گڑھ کالج کے

طالب علم کے لیے تقاضائے شرافت ہیں، اُن میں سے مجھ میں ایک بھی نہ تھی۔ لیکن نہ معلوم کیونکر، کبھی کبھی چندہ کرنے کی مجھے عزت حاصل ہوئی۔ یہ سُنتِ سر سیّد تھی۔ مگر وہ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ طالب علم بڑا آزاد ہوتا ہے، اور آج کل تو اسکی آزادی اور بے مہاری کے ڈنکے بج رہے ہیں، وہ جس سے چاہتا بل سکتا اور جہاں چاہتا گھس جاتا ہے۔ نہ اسے کسی کے چین بجبیں ہونے کا ڈر، نہ کسی کے انکار سے شرم، نہ کسی کے بُرا بھلا کہنے کا خوف اور نہ اپنی کہنے میں باک۔ لیکن اتنی مدت کے بعد جب انجمن کا بوجھ سر پر آپڑا اور اسکی خاطر چار و ناچار چندہ کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑا تو معلوم ہُوا کہ یہ کیسی کڑی منزل ہے۔ اگر جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں ـــ یہ ہے بڑی بد اخلاقی کا کام۔ معلوم یہ ہُوا کہ چندہ دینا آسان ہے چندہ لینا بہت مشکل ہے۔ چندہ لینے والا آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے اور لوگ اسکی صورت سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ مگر برخلاف اسکے چندہ دینے والے کی ہر جگہ عزت و توقیر ہوتی ہے۔ اس لیے جو حضرات مُلک و قوم کے لیے چندہ دیتے ہیں اُنہیں، اُس یہودی کی طرح جو اپنے معبد میں جاکر کہتا تھا کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے محصول لینے والا نہیں بنایا۔ خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ اُس نے اُنھیں چندہ دینے والا بنایا، چندہ لینے والا نہیں بنایا۔ خدا ہر اشراف کو چندہ دینے کی توفیق عطا کرے مگر چندہ لینے کی ذلت سے بچائے۔ ایک فقیر میں بھی کچھ شرم و لحاظ ہوتا ہے لیکن چندہ مانگنے والا تو سچ مچ آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لیتا ہے۔ لیکن باوجود اسکے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ دینے والے اب بھی بہت ہیں، مگر لینے والے نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ سچ ہو لیکن ہم میں سے کتنے ہیں جو اس ناگوار کام کے انجام دینے کا دل گردہ رکھتے ہوں۔

میں کسی اور کی تو کہتا نہیں، لیکن میری یہ حالت ہے کہ اسکے نام سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک ایک قدم من من بھر کا ہو جاتا ہے۔

غرض اس خیال سے کہ بغیر سرمایہ کے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی، اور سرمایہ آج کل بغیر چندے کے ممکن نہیں، میں نے ریاستِ حیدرآباد کے چند مقامات میں کچھ رقم جمع کرنے کی کوشش کی اور آپ یہ سنکر خوش ہوں گے کہ اس ذریعہ سے اس سال میں ۴۲۹۸/۶/۶ (چار ہزار دو سو اٹھانوے چھ آنے چھ پائی) سکۂ انگریزی اور ۳۴۲۷/۸/۱۱ (تین ہزار چار سو ستائیس آٹھ آنے گیارہ پائی) سکۂ عثمانیہ انجمن کو ملے۔ یہ رقم کچھ بڑی نہیں ہے خصوصاً ایک ایسے سال میں جبکہ یورپ کی منحوس جنگ کی وجہ سے ایک دنیا سوگ میں ہے۔

لیکن اس سے بڑھ کر خوشخبری یہ ہے (اور غالباً جناب کو اسکا علم ہو چکا ہوگا) کہ اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ نے انجمن کو سرپرستی خاص کا اعزاز بخشا اور فرمان واجب الاذعان میں یہ ارشاد فرمایا کہ

انجمن ترقی اردو کا سرپرست ہونا میں بہت خوشی کے ساتھ قبول کرتا ہوں اور اس انجمن کے مقاصد کی کامیابی کا میں دلچسپی کے ساتھ خواہاں رہوں گا۔

یہ سرپرستی بجائے خود نہایت مبارک اور بہت بڑی نعمت ہے، لیکن اعلیحضرت اقدس نے ازراہ مراحم خسروانہ انجمن کے لیے بارہ سو روپے کی مستقل امداد کی بھی منظوری عطا فرمائی۔ دولتِ آصفیہ کی سرکار سے ہندوستان کی مختلف درسگاہوں اور مفید

اور قومی کاموں اور اہل علم کو جو امداد ملتی ہے وہ محتاج توصیف وثنا نہیں، تمام ملک اسکا مرہون منت ہے۔ انجمن ترقی اُردو، جس کا اب تک کوئی والی وارث نہ تھا، اور قریب تھا کہ وہ یوں ہی ٹھٹھر کر رہ جائے، وہ اب انشاء اللہ اعلیحضرت واقدس کے ظل عاطفت میں پھولے پھلے گی اور اُن مقاصد کی تکمیل ہوکے رہیگی جسکے لیے یہ قائم کی گئی تھی۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ اسکی بنیاد قائم اور مستحکم ہوئی ہے۔

دوسری خوش خبری علیا حضرۃ بیگم صاحبۂ بھوپال دام اقبالہا کی سرپرستی ہے۔ گزشتہ سال جب انجمن کی عرضداشت علیا حضرۃ دام اقبالہا کی خدمت میں پیش ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ اسوقت جو کتابیں تیار ہیں یا جو زیر تالیف وتصنیف ہوں اُنکے اخراجات طبع کا تخمینہ پیش کیا جائے۔ اُس وقت کے لحاظ سے کُل تخمینہ پانچ ہزار روپے کا تیار کرکے پیش کیا گیا۔ اسپر سرکار عالیہ نے یہ حکم صادر فرمایا کہ جب دو ہزار روپیہ دوسرے حضرات سے جمع ہوجائے تو تین ہزار روپیہ سرکار سے مرحمت کیا جائے۔ چنانچہ اس سال جب دو ہزار روپیہ جمع ہوگیا تو اسکی اطلاع دی گئی جسپر سے علیا حضرۃ نے بکمال خوشی ۳۰۰۰ ؁ ر۔ عطا فرمائے۔ علیا حضرۃ علم وکمال کی سچی قدر دان ہیں اور ہر نیک اور قومی کام میں نہایت مسرت اور فیاضی کے ساتھ اعانت فرماتی ہیں۔ اُنکی ذات ہماری قوم کے لیے باعثِ رحمت ہے۔

تیسری یہ خوش خبری بھی آپ سُن کر خوش ہونگے کہ جناب صاحبزادہ حاجی حمید اللہ خاں بہادر نے بھی ازراہ قدردانی ما ۵ ؁ سالانہ کی مستقل امداد انجمن کو جیب خاص سے عطا فرمائی۔ جناب صاحبزادۂ ممدوح علیا حضرۃ بیگم صاحبہ بھوپال کے فرزند اصغر ہیں اور مفید اور قومی کاموں کی امداد میں اپنی والدۂ محترمہ کے قدم بقدم

چلتے ہیں۔ انجمن جناب صاحبزادہ صاحب کی بیحد ممنون ہے۔

جناب والا۔ آپ مجھے معاف فرمائیں کہ میں نے رپورٹ کی ابتداہی میں یہ داستان چھیڑ دی۔ لیکن اسکی وجہ ہے۔ اول تو یہ کہ میں یہ سمجھ چکا تھا اور غالباً انجمن کے کسی بہی خواہ کو اس سے انکار نہ ہوگا کہ جب تک انجمن کی مالی حالت کی طرف سے اطمینان نہ ہو جائے اُس وقت تک اسکے مقاصد کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ دوسرے اس سال میرا زیادہ وقت اسی میں صرف ہُوا۔ چنانچہ میرے بیان سے آپ پر ظاہر ہُوا ہوگا کہ فی الحال انجمن کی مالی حالت اگر قابل اطمینان نہیں تو کم سے کم ایسی ضرور ہوگئی ہے کہ اب ہم علمی کام اطمینان خاطر سے شروع کر سکتے ہیں۔ لیکن باوجود اسکے انجمن علمی کام کی طرف سے بھی غافل نہیں رہی اور اگرچہ اس سال میں زیادہ کتابیں طبع اور شایع نہیں ہوئیں۔ تاہم اُس نے اس قدر کام کیا ہے جو ابتک کبھی نہیں ہُوا تھا۔ جسکی مختصر تفصیل یہ ہے۔

۱۔ **فلسفۂ جذبات** مصنفہ مولوی عبدالماجد صاحب بی اے شایع ہو چکی ہے۔ یہ کتاب علم النفس کے ایک ضروری شعبہ پر ہے اور اُردو علم ادب میں اس بحث پر یہ پہلی کتاب ہے۔ فاضل مصنف نے جس قابلیت اور خوبی سے اس مشکل کام کو انجام دیا ہے وہ نہایت قابل تعریف اور مستحق مبارکباد ہے۔ اگرچہ اس کتاب کی اتنی قدر نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ جس کا ذمہ دار نہ مصنف ہے اور نہ انجمن۔ بلکہ ملک کا عام مذاق ہے۔ لیکن انجمن کا کام یہ نہیں کہ وہ عام مذاق کی پیروی کرے۔ بلکہ اسکا بڑا فرض عام مذاق کی اصلاح کرنا ہے اس نظر سے اگر دیکھا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر انجمن اس سال یہی ایک کتاب پیش کرتی تو اسکی حُسن کارگزاری کے لیے کافی تھی۔

۲- دوسری کتاب **مقدمات الطبیعات** ہے جسکا ذکر میں اپنی سال گزشتہ کی رپورٹ میں کر چکا ہوں۔ اسکے مؤلف جناب مولوی مرزا مہدی خاں کوکب ہیں۔ جو عربی، فارسی اور انگریزی کے عالم ہیں اور خصوصاً جدید سائنس کو اُنھوں نے انگلستان رہ کر بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ یقین ہے کہ یہ کتاب مُلک کے حق میں مفید ثابت ہوگی۔

اس کتاب کے طبع کرانے میں مجھے بڑی کھکھیڑ اُٹھانی پڑی۔ کامل ایک سال ہوتا ہے کہ یہ کتاب لاہور کے ایک نامی مطبع کو چھاپنے کے لیے دی گئی تھی اور مالک مطبع کی درخواست پر ایک معقول رقم پیشگی ادا کردی تھی۔ اور حالانکہ صاحب مطبع نے دو مہینے میں چھاپ کر دینے کا وعدہ کیا تھا، لیکن باوجود متواتر وعدوں کے وہ سال بھر میں بھی اس کام کو انجام نہ دے سکے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دینی پڑی، اور اس سے بڑی دھمکی یہ تھی کہ اگر آخر سال تک کتاب نہ چھپی تو کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں کچا چٹھا کھولا جائے گا۔ غالباً اس ڈر سے اُنھوں نے جلدی جلدی کتاب چھاپنی شروع کی اور خدا خدا کرکے اب نصف سے زائد حصّہ طبع ہو چکا ہے۔ اس سے مجھے اور بعض دیگر ارکان انجمن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جبتک انجمن کا ذاتی مطبع نہ ہوگا، کتابوں کا صحیح اور عمدہ اور وقت پر چھپنا دشوار ہے۔ چنانچہ اسی خیال کی بنا پر مدِ محفوظ میں ایک معقول رقم الگ رکھ لی گئی ہے۔ اور یہ معاملہ زیر غور ہے۔

۳- تیسری کتاب **البیرونی** پر ہے۔ علامہ ابوریحان بیرونی نہ صرف اسلام کے بلکہ دُنیا کے اکابر حکما میں سے گزرے ہیں۔ اور بعض خصوصیات کے لحاظ سے وہ حکمائے اسلام میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ لیکن ہم میں سے کتنے ہیں جو اُنکے علمی کارناموں سے واقف ہیں۔ اس سے قبل عرصہ ہُوا کہ منشی عنایت اللہ صاحب بی اے نے

ایک مضمون اس جدّ حکیم کے حالات میں لکھا تھا اور جسے سرسید مرحوم نے بڑی مسرت اور فخر کے ساتھ کانفرنس کے ایک اجلاس میں پیش کیا تھا۔ اسکے بعد شاید ایک آدھ اور مضمون کسی اُردو کے رسالہ میں شایع ہُوا۔ لیکن یہ مضامین بالکل ناکمل اور ناقص تھے، اب مولوی سید حسن صاحب برنی بی اے نے یہ کتاب کمال تجسّس و تحقیق سے انجمن کے لیے لکھی ہے اور جسکے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف میں ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں، جن کے تبحر و فضل و کمال سے ایک دنیا کو حیرت و استعجاب ہے۔ قابل مصنف نے اس کتاب کے لکھنے میں جو محنت شاقہ اُٹھائی ہے اور جس فیاضی سے اُنھوں نے اسکا پہلا اڈیشن انجمن کو بلا کسی معاوضہ کے عطا فرمایا ہے وہ نہایت قابل شکر گزاری ہے۔ اسی ضمن میں مَیں اس امر کا بیان کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب مسٹر حیدری بی اے ہوم سکرٹری دولتِ آصفیہ نے جنھیں علمی و تعلیمی کاموں سے بیحد دلچسپی ہے، بکمال قدر دانی دو سو روپیہ اس کے طبع و اشاعت کے لیے انجمن کو عنایت فرمائے ہیں۔ جسکے لیے انجمن انکی نہایت ممنون ہے۔

۴۔ گزشتہ سال جب انجمن نے جدید اُردو قاعدے کے متعلق اعلان کیا، تو اس خیال سے اکثر اصحاب نے ہمدردی کا اظہار فرمایا اور اسکی ضرورت کو تسلیم کیا۔ آگرہ کے اجلاس کانفرنس میں بعض حضرات نے اس مسئلہ پر غور و بحث کرنے کے لیے وہاں آنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اور خاص روز مقرر کرکے اسکی کمیٹی کا اجلاس بھی کیا گیا۔ اگرچہ اُسوقت کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہُوا، لیکن تبادلۂ خیالات سے بہت کچھ فائدہ ہوا۔ جن حضرات نے اُردو قاعدے کی اصلاح پر غور و فکر کیا تھا اور جنھیں

اسکے متعلق کافی تجربہ تھا، اُنھوں نے انجمن کی تحریک پر اپنے اپنے قاعدے بھیجے۔ ان تمام قاعدوں میں سے جنکی تعداد پندرہ تھی، دو قاعدے خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک منشی سید الطاف حسین صاحب تشنہ فریدآبادی کا اور دوسرا سید احمد علی صاحب صدر مدرس مدرسۂ ویجاپور (حیدرآباد دکن) کا۔ ان دونوں صاحبوں نے اس مسئلہ پر کامل غور کیا ہے اور درحقیقت ان دونوں صاحبوں کی محنت و جاں فشانی اورخصوصاً میر احمد علی صاحب کی جدت و فکر بہت قابل قدر ہے۔ تمام قاعدے میں نے سید ہاشمی صاحب کے حوالہ کیے، جنھوں نے ابتدا سے اس معاملہ میں خاص دلچسپی ظاہر کی تھی اُنھوں نے ایک مفصل تبصرہ ان قاعدوں پر لکھا، میں نے اپنی رائے کے ساتھ اس تبصرہ کو رسالہ کی صورت میں طبع کرکے اہل الرائے حضرات کی خدمت میں روانہ کیا تاکہ اُنکی رائے کے بعد نیا قاعدہ مرتب کیا جائے۔ چونکہ میری تجویز کے شایع ہونے پر کسی قدر غلط فہمی واقع ہوئی تھی اس لیے میں اس موقع پر مختصراً اُن چند اصول کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو اس نئے قاعدے کی ترتیب سے متعلق ہیں۔

اُردو قاعدے کی اصلاح سے انجمن کا مقصد یہ ہے کہ مبتدی اُردو ابجد کو کم سے کم مدت اور سہل سے سہل طریقہ سے لکھ پڑھ سکے۔ چنانچہ اسکے متعلق جو بحث اور خط و کتابت ہوئی تو جن حضرات کو بچوں کی تعلیم کا خاص تجربہ ہے اور جنھوں نے اس مسئلہ پر مدتوں غور کیا ہے وہ مفصلۂ ذیل اصول پر، باستثنائے چند جزئی اختلاف کے متفق ہیں۔

۱- موجودہ ترتیب حروف میں تبدیلی، جس سے بچوں کو حرفوں کے ملاکر پڑھنے نیز لکھنے میں آسانی ہو۔

۲۔ موجودہ طریقۂ ہجا کی اصلاح۔

۳۔ اعراب کا استعمال صحیح اور سہل طریقہ پر، تاکہ اعراب کے خواص سے آگاہ ہو کر مبتدی اُنکے استعمال پر بطور خود قادر ہو جائے۔

میری رائے میں سب سے بڑی اصلاح جو اسوقت نہایت ضروری اور مقدم ہے وہ طریقۂ تعلیم کی اصلاح ہے۔ باقی اصلاحیں اور تبدیلیاں ضمنی اور اسکے تحت میں ہیں مروجہ طریقۂ تعلیم میں بڑا نقص یہ ہے کہ وہ از سرتاپا تقلیدی ہے۔ بچے کی سمجھ پر اسکا مطلق اثر نہیں پڑتا۔ وہ بچارا صرف اُستاد کے بول دُہرا دیتاہے، اور زبان سے جو کہتاہے اُسے کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ بلکہ اگر حضرت اُستاد، سوء اتفاق سے، کبھی غور فرمائیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کیا کہلوا رہے ہیں، تو اُنھیں خود حیرت ہوگی کہ درحقیقت یہ معاملہ کیاہے؛ اور بس اتنی ہی بات پر ساری اصلاح کا دارومدار ہے۔ سخت حیرت کی بات ہے کہ اگرچہ سالہا سال سے یہ طریقہ مروج ہے، لیکن کسی معلّم کا خیال اِدھر نہ آیا اور یہ تقلید کا پھندا نسلاً بعد نسلٍ معصوم بچوں کے گلے میں اور سخت ہوتا گیا۔

بعض حضرات کو میری مطبوعہ تجویز سے غلط فہمی ہوئی ہے اس لیے اس موقع پر اس امر کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں کہ انجمن کا منشأ یہ نہیں ہے کہ موجودہ رسمِ خط کے حدود سے تجاوز کیا جائے یا کوئی ایسی اصلاح عمل میں لائی جائے جس سے اُردو زبان کی تقریر و تحریر کی خصوصیات پر اثر پڑے۔ اصل بات یہ ہے کہ جن معاملات کا تعلق عقل و دماغ سے ہوتاہے اور اُنکا دائرۂ اثر وہیں تک محدود رہتاہے اُنکی اصلاح آسان ہوتی ہے، لیکن جب معاملہ کی صورت تقلیدی ہو جاتی ہے اور اُسکا اثر عقل و دماغ سے گزر کر طبیعتوں میں پیوست ہو جاتاہے تو وہ حالت اعتقادی ہو جاتی ہے

اور اسکی اصلاح میں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید اُردو قاعدے کی نوبت یہیں تک پہنچ گئی ہے۔

بہرحال یہ چند اصول، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے متفق علیہ ہوگئے ہیں۔ لہذا اب مولوی سید الطاف حسین صاحب اور مولوی سید احمد علی صاحب کے دونوں قاعدوں کو پیش نظر رکھ کر جدید قاعدے کی ترتیب عمل میں آئے گی۔ انجمن ان دونوں صاحبوں کی محنت اور کاوش اور ہمدردی کی شکرگزار ہے۔

۵۔ علم طبقات الارض پر ایک کتاب تیار ہے۔ اور طبع کے لیے دیدی گئی ہے مولانا شبلی مرحوم نے ۱۹۰۳ء میں طبقات الارض پر ایک کتاب لکھنے کا اعلان عام طور پر مشتہر کیا تھا اور بعض حضرات کو خاص طور پر بھی اس طرف متوجہ کیا مگر کسی نے ہامی نہ بھری۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب نے جن کا ذکر خیر میں پہلے کرچکا ہوں، اس مہم کو سر کیا۔ امید ہے کہ اس کتاب سے اُردو علم ادب میں اضافہ ہوگا۔

۶۔ **پلوٹارکس لاؤز** کے ترجمہ کے متعلق میں اپنی سال گزشتہ کی رپورٹ میں ذکر کرچکا ہوں۔ اس کے ترجمہ کا خیال سب سے پہلے مولوی محمد عزیز مرزا صاحب مرحوم نے کیا تھا۔ اب مولوی سید ہاشمی صاحب نے انجمن کے لیے اسکا ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اور میرے بعض احباب نے اسے بالاستیعاب دیکھا ہے۔ فی الحقیقت ترجمہ بہت شگفتہ، فصیح اور سلیس زبان میں کیا گیا ہے۔ یہ دنیا کی نہایت نامور کتابوں میں سے ہے اور اس نے یورپ کے خیالات اور تمدن پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ انگریزی میں جس شخص نے اول اول اس کا ترجمہ کیا اُسے اسکے صلہ میں "ارل ڈم" عطا کی گئی

(یعنی اعلیٰ طبقۂ لارڈز یعنی امرائے انگلستان میں شریک کیا گیا) امید ہے کہ یہ ہمارے ملک اور خاص کر نوجوانوں کے لیے نہایت مفید ثابت ہوگی اور اردو زبان اس خزانۂ لازوال سے محروم نہ رہے گی۔ فی الحال چار سو صفحے کا ترجمہ ہو چکا ہے اور چند ماہ کے عرصہ میں طبع کے لیے دیدیا جائیگا۔

۷۔ میر انشاء اللہ خاں دہلوی کی **دریائے لطافت** ایک مشہور کتاب ہے۔ جو اب بالکل نایاب ہے۔ یہ کتاب اُردو زبان کی معلومات کے لیے بیحد مفید ثابت ہوگی خاص کر اُردو زبان کے صرف و نحو اور لغت کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ لیکن اسکے ازسرِنو طبع کرنے کے لیے کسی قدر تغیر و تبدل کی ضرورت تھی۔ خاص کر اس حصہ کا جو عروض و منطق پر مرزا قتیل کا لکھا ہوا ہے، نیز بعض فحش مقامات کا حذف اسمیں ضروری تھا۔ لہذا اسے ازسرِنو لکھوا کر مطبع میں بھیدیا گیا ہے۔

۸۔ **نامۂ دانشوراں**۔ یہ کتاب ناصر الدین شاہ ایران کے حکم سے ایران کے بڑے بڑے نامور علما کی ایک مشترک مجلس نے لکھنی شروع کی تھی، جسکی دو جلدیں چھپکر شایع ہوئیں۔ چونکہ انجمن کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اُردو میں مشاہیر رجال کا ایک مکمل سلسلہ تیار کیا جائے، اس لیے ابتدا اس کتاب سے کی گئی اور مولانا شبلی مرحوم نے اس ترجمہ کے لیے اعلان مشتہر کیا اور سب سے بہتر مولوی ریاض حسن صاحب کا ترجمہ پایا گیا۔ چنانچہ مولانا شبلی مرحوم نے انکے ترجمے کے متعلق لکھا ہے کہ

"یہ ترجمہ اس قدر صحیح، دلچسپ اور بامحاورہ ہے کہ اس سے بہتر ترجمہ ہونا غالباً ممکن نہ تھا۔"

چونکہ ایک عرصہ سے انجمن کا کام سرد پڑ گیا تھا۔ اس لیے کسی نے خبر نہ لی اور مولوی صاحب

نے بھی کچھ تو بعض خانگی مشکلات کی وجہ سے اور غالباً کچھ انجمن کی عدم توجہ کے سبب اس کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ میں نے جو آپ مولوی صاحب سے اس بارے میں سلسلہ جنبانی کی تو معلوم ہوا کہ ۴۰۰ صفحات کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اسکے بعد میں نے انھیں لکھا کہ اگر ترجمہ شدہ اجزا عنایت فرمائے جائیں تو طبع کا انتظام کیا جائے اور باقی حصے کا ترجمہ وہ ساتھ ساتھ کرتے رہیں۔ مولوی صاحب نے کمال عنایت میری اس استدعا کو منظور کرلیا ہے اور امید ہے کہ آیندہ سال تک اس کتاب کا بھی ایک حصہ طبع و شایع ہو جائے گا۔

۹- ڈوزی کی **تاریخ اسپین** (عہد اسلام) کے متعلق انجمن کی سال گزشتہ کی رپورٹ میں مفصل ذکر ہو چکا ہے اس وقت میں صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسکی چاروں جلدوں کا ترجمہ ختم ہو چکا ہے۔ اور ممکن تھا کہ کتاب اس وقت تک طبع میں چلی جاتی۔ لیکن ایک دقت یہ ہے کہ ہمیں اسما و اعلام اس کثرت سے ہیں کہ انکی تصحیح اصل عربی تاریخوں اور کتب اسما و رجال سے کرنے میں وقت درکار ہوگا۔ اسکی تصحیح مولوی عبداللہ خاں صاحب (کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن) نے اپنے ذمہ لی ہے اور در حقیقت اُن سے بہتر اس کام کو کوئی اور انجام بھی نہیں دے سکتا۔ علاوہ اسکے جا بجا حواشی کی بھی ضرورت ہے۔ اور اسکے لیے بھی ایک اچھے کتب خانے اور وقت کی ضرورت ہے بہر حال کوشش کی جائے گی کہ آیندہ سال تک طبع ہو جائے۔ یہ کتاب اسلامی تاریخی معلومات کا مخزن ہے اور اگر، جیسا خیال اور ارادہ ہے، اسی طرح اسکی ترتیب عمل میں آگئی، تو اس سے اُردو علم ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگا۔

۱۰- مرزا غالب۔ اُردو زبان کے ایسے باکمال اور بلند خیال شاعر گزرے ہیں کہ جن کا شمار دنیا کے اعلیٰ شاعروں میں ہو سکتا ہے، اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے،

اُنکے کلام کی روز بروز قدر بڑھتی جاتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اُنکا کلام ایسا غلط اور خراب چھپا ہے، جسے دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے۔ انجمن نے اسکا ایک صحیح اور عمدہ اڈیشن چھاپنے کا ارادہ کیا ہے، اور اس خیال کو اکثر اصحاب نے پسند فرمایا ہے۔ اور اسکے ساتھ یہ جدت بھی کرنی چاہی کہ اُردو زبان کے نامور اہل قلم سے مرزا صاحب کی خصوصیات شاعری پر مضامین لکھوا کر اُنکے کلام کے ساتھ شایع کیے جائیں۔ چنانچہ مُلک کے مشہور اور نامور انشا پردازوں سے یہ استدعا کی گئی۔ لیکن سوائے مولوی عبد الحلیم صاحب شرر اور مولوی رضا علی صاحب وحشت کے کسی نے ہامی نہ بھری۔ لیکن اب تک ان صاحبوں سے بھی مضامین وصول نہیں ہوے۔ خوش قسمتی سے مرزا صاحب کے دیوان کا ایک صحیح قلمی نسخہ بھی دستیاب ہوگیا ہے۔ یہ نسخہ نواب ضیاءالدین خاں نیّر نے لکھوایا تھا اور مرزا صاحب کی نظر سے گزر چکا ہے۔ جناب نواب احمد سعید خاں صاحب نے بکمال عنایت و لطف وہ نسخہ انجمن کو مستعار عنایت فرمایا اور انجمن نے اسپر سے ایک نسخہ تیار کیا ہے۔ لیکن چونکہ مرزا صاحب کا کلام مشکل اور دقیق ہے، اس لیے یہ خیال کیا گیا کہ بعض بعض مقامات پر ضروری حواشی اور شرح بھی لکھدی جائے۔ یہ اڈیشن تیار ہو رہا ہے اور آیندہ سال طبع کیا جائے گا۔ جناب نواب عماد الملک بہادر نے جو خود بڑے ادیب اور صاحبِ ذوق ہیں، ازراہِ قدر دانی پانسو روپیہ اسکے اخراجات کے لیے مرحمت فرمائے ہیں۔

۱۱۔ ابتداے قیام انجمن میں اُردو زبان میں علم ہیئت جدید پر کتاب لکھوانے کی کوشش کی گئی تھی، مگر اسمیں ناکامیابی ہوئی۔ لیکن یہ انجمن کی خوش قسمتی ہے کہ پروفیسر برکت علی صاحب بی۔ایس۔سی۔ پروفیسر کمسٹری مدرسۃ العلوم مسلمانان، علی گڑھ اس علم پر نہایت سرگرمی اور محنت سے انجمن کے لیے ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ انجمن پروفیسر صاحب

کی اس ہمدردی اور توجہ کی نہایت ممنون ہے۔

۱۲۔ انجمن نے لغتِ اصطلاحاتِ علم ہیئت بھی تیار کردیا ہے۔ اس لغت کو پروفیسر برکت علی صاحب نے بغور مطالعہ فرمایا اور بعض ترمیمات کی رائے دی جنکی تکمیل عنقریب ہوجائے گی۔ یہ لغت انجمن کے لیے مولوی سید مختار احمد صاحب نے بڑی محنت اور تلاش کے بعد تیار کیا۔ اسمیں اصل اصطلاحات ۱۱۸۲ ہیں اور اگر اُن ضمنی اصطلاحات کا بھی شمار کیا جائے جو اصل الفاظ کی ترکیب سے بنی ہیں تو کُل تعداد ۳۰۵۳ ہوتی ہے۔ یہ تعداد ناگری پرچارنی سبھا کی اصطلاحاتِ علم ہیئت سے کئی گنی ہے۔

۱۳۔ مولوی حافظ علی صاحب ہماری قوم میں اُن بزرگوں میں سے ہیں جو صحیح معنوں میں طالب علم اور عالم کہلانے کے مستحق ہیں اور جو قدیم وجدید فلسفہ میں بڑی دستگاہ رکھتے ہیں۔ بہت ہی کم لوگ ہیں جو آپ کے نام سے واقف ہیں۔ لیکن جس قدر وہ عزلت نشیں اور تنہائی پسند ہیں، اُسی قدر آپ کا علم پختہ اور گہرا ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے انجمن کے لیے انگلستان کے نامور حکیم ہربرٹ اسپنسر کی کتاب (Ethics) علم الاخلاق کا ترجمہ شروع کردیا ہے۔ اور چند ابواب ترجمہ کرکے میرے پاس بھیج بھی دیے ہیں۔ میں نے جب اس ترجمہ کا اصل سے مقابلہ کیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ ہم میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ایسے مشکل اور کٹھن مضامین کا ترجمہ اس سلاست اور خوبی کے ساتھ کرسکتے ہیں۔ میری رائے میں اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ اور یہ مولوی صاحب ہی کا حق تھا۔ جب کتاب چھپ کر شایع ہوگی، تو معلوم ہوگا کہ مولوی صاحب کس پایہ کے شخص ہیں۔

۱۴۔ ڈاکٹر لطافت حسین خاں صاحب ڈی ایم ایس۔ علی گڑھ کے پرانے طالب علم ہیں اور وہ علی گڑھ کالج نیز انگلستان میں ہمیشہ نیکنام، مستعد اور شوقین طالب علم

رہے ہیں اُنھوں نے انجمن کے لیے علم و اعمال حفظان صحت پر ایک مبسوط کتاب لکھنی شروع کی ہے۔ دو باب لکھکر میرے پاس بھیجے ہیں۔ جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بہت دلچسپ اور نہایت مفید ہوگی۔ اس فن پر اُردو زبان میں جو چند رسالے مدارس کے لیے لکھے گئے ہیں وہ بالکل ناکافی اور ناقص ہیں۔ ڈاکٹر لطافت حسین خاں صاحب نے جس ڈھنگ اور اصول پر اسے لکھنا شروع کیا ہے۔ وہ تکمیل ہونے کے بعد زبان اُردو میں ایک بے نظیر کتاب ہوگی اور اُردو علم ادب کی ایک بڑی کمی کو پورا کرے گی۔

۱۵۔ مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب انجمن کے لیے گزو کی مشہور کتاب تاریخ تمدن کا ترجمہ کر رہے ہیں اور نصف کتاب سے زیادہ کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ مرزا صاحب موصوف علوم جدیدہ و قدیمہ کے عالم ہیں اور طالب علمانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ آپ جس مستعدی اور سرگرمی سے انجمن کی خدمت کر رہے ہیں، میں نہیں جانتا کہ کن الفاظ میں اُنکا شکریہ ادا کروں۔ میں اس سے قبل ابھی دو اور کتابوں کا نام لے چکا ہوں جو آپ نے انجمن کے لیے لکھی ہیں۔ اور پھر انھیں تین کتابوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ متعدد کتابیں مختلف علوم پر انجمن کے لیے لکھنا چاہتے ہیں۔ اس عالم پیری میں انکی ہمت اور جوان ہوتی جاتی ہے خدا انکی عمر اور ہمت میں برکت دے۔

۱۶۔ جان اسٹوارٹ مل اکابر حکماے انگلستان سے گزرا ہے۔ اس حکیم نے اپنی سوانح عمری خود لکھی ہے۔ اس میں صرف معمولی واقعاتِ زندگی ہی نہیں بلکہ خیالات کی سرگذشت بھی ہے۔ اور بہت دلچسپ اور حکیمانہ کتاب ہے۔ ہمارے دوست مسٹر عزیز احمد خاں بی اے نے اسکا ترجمہ کیا ہے اور انجمن کے پاس بھیجا ہے۔ یہ کتاب انجمن کے زیر غور ہے اور ابھی ابھی میں اسپر کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

۱۷۔ مولوی سجاد مرزا بیگ صاحب، ایک قابل مصنف اور مؤلف ہیں اور انھوں نے ابتدائے قیام انجمن کے زمانہ میں مولوی شبلی مرحوم کو بہت مدد دی اور انکی خدمات کا مولوی شبلی مرحوم نے اپنی رپورٹ میں اعتراف بھی کیا تھا۔ مرزا صاحب موصوف نے یہ اطلاع دی ہے کہ انھوں نے اُردو زبان کی اُن تمام کتابوں کی۔ جو اب تک لکھی گئی ہیں، ایک فہرست تیار کی ہے۔ جو درحقیقت ایک قابل قدر کام ہے۔ اس بارے میں اُنسے خط وکتابت جاری ہے۔

۱۸۔ مولوی محمد الیاس صاحب برنی نے جو اقتصادیات کے امتحان ایم۔ اے میں یونیورسٹی میں اوّل آئے تھے، انجمن کے لیے علم الاقتصاد پر کتاب لکھنے کا وعدہ کیا ہے اور اسکے لیے سامان بھی بہم پہنچا رہے ہیں۔ آپ نے اس علم کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے اور یقین ہے کہ جو کتاب انکے قلم سے نکلے گی وہ بلا شبہہ قابل قدر ہوگی۔

۱۹۔ مولوی سید افتخار عالم صاحب مؤلف حیاۃ النذیر انجمن کے لیے حضرت امیر خسرو کی سوانح عمری بڑی تحقیق اور جستجو سے لکھ رہے ہیں۔ سید صاحب ایک قابل اور مشہور مصنف ہیں اور امید ہے کہ اُنکی سعی اور محنت سے ایک بڑی کمی پوری ہو جائے گی۔ کیونکہ حضرت امیر خسرو اُن بزرگوں میں سے ہیں جن پر ہندوستان کو بجا طور فخر و ناز ہے اور اگر دیکھا جائے تو یہ حضرت امیر خسرو ہی تھے جنھوں نے ہندی کو ایسے ڈھنگ سے استعمال کیا اور وہ ایسا مقبول ہوا کہ آخر کئی صدی بعد انکی جدّت اُردو زبان کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اور اگر یہ کہا جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ شخص جس نے اُردو زبان کی بنیاد کی پہلی اینٹ رکھی وہ امیر خسرو تھے۔ ایسے باکمال۔ شاعر بے مثال حکیم اور محسن اُردو کی سوانح عمری کا نہ ہونا ہماری زبان کی ناداری اور ناشکری پر دلالت کرتا ہے

انجمن مولوی سید افتخار عالم صاحب کی ممنون ہے کہ انھوں نے اس ضروری کام کو اپنے ذمہ لیا۔

جناب والا۔ فراہمی سرمایہ اور اشاعت علوم کے متعلق جو کوشش اور سعی انجمن کی طرف سے اس سال عمل میں آئی ہے۔ اُسکا مختصر ذکر میں آپ کی خدمت میں عرض کرچکا ہوں۔ لیکن انجمن اپنے دوسرے مقاصد کی طرف سے بھی غافل نہیں رہی ہے۔ انجمن کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مختلف مقامات میں شاخیں قائم کرکے انجمن کے مقاصد کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ اس سال انجمن کی ایک شاخ بیادگار سالگرہ اعلیحضرت حضور نظام مدظلہ العالی مستقر ضلع پربھنی (ریاست حیدرآباد دکن) میں قائم کی گئی اور اسکے متعلق اردو زبان کا ایک کتب خانہ اور دارالاخبار بھی کھولا گیا۔ جسکے لیے عہدہ داران و وکلا و اہل پربھنی نے پانسو روپے کا چندہ اور اسکے علاوہ سامان بھی عنایت فرمایا اس بارے میں انجمن تمام ارکان اور خاص کر مولوی اوصدالدین صاحب (سابق ناظم عدالت پربھنی وحال مددگار معتمد تعمیرات) اور مولوی وحید الدین صاحب اوّل تعلقدار ضلع و مولوی نصیرالدین ناظم عدالت کی ہمدردی اور توجہ کی تشکرگزار رہے۔ مولوی وحید الدین صاحب جو ایک نیک نفس، قدردان علم و ہنر اور ہمدرد بزرگ ہیں، اسکے صدر اور مولوی سید علی صاحب بی اے جو ایک قابل اور سرگرم نوجوان ہیں اسکے معتمد اور مولوی خیرالدین صاحب وکیل، جو قومی کاموں میں بڑی مستعدی سے حصہ لیتے ہیں اسکے شریک معتمد قرار پائے۔ یقین ہے کہ اہل پربھنی و کارکنانِ انجمن کی سرگرمی و کوشش سے یہ شاخ فروغ پائے گی۔

اس ضمن میں اس امر کا تذکرہ بھی بہی خواہان اُردو کے مسرت و اطمینان کا

باعث ہوگا کہ سرکار نظام نے ایک گشتی اپنے تمام عہدہ داروں اور دفاتر کے نام جاری فرمائی ہے کہ تمام خط و کتابت التزاماً اُردو زبان میں ہوا کرے۔ اور صرف اتنی ہی تاکید نہیں کی گئی بلکہ زبان کو مخلوط اور خراب ہونے سے بھی بچانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس گشتی کا وہ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

نقل گشتی محکمہ سرکار مورخہ ۲۴ شعبان ۱۳۳۱ھ

"اہل نظر کو محسوس ہو رہا ہے کہ آخر چند سال کے عرصہ میں دفتری تحریرات میں ایک قسم کا ناپسندیدہ تغیر پیدا ہو رہا ہے۔ جا بے جا انگریزی الفاظ کا استعمال روز افزوں ترقی کر رہا ہے جس سے نہ صرف عوام رعایا اور عموماً غیر انگریزی داں لوگوں کو سرکاری تحریرات کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے مسلمانوں کی مادری زبان مخلوط ہو کر خراب اور بہت سی صورتوں میں باعث مضحکہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے عام طور پر اطلاع دی جاتی ہے کہ تحریرات میں غیر مانوس انگریزی الفاظ کا استعمال بالکلیہ ترک کیا جائے۔ اکثر اوقات یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض عہدہ دار معمولی اُردو روبکارات کا جواب انگریزی میں لکھتے ہیں۔ جس سے عملہ اور اہل معاملہ کو بڑی دقت پیش آتی ہے۔ اس لیے عام طور پر حکم دیا جاتا ہے کہ سوائے یوروپین عہدہ داروں کے جو اُردو لکھنے پر قادر نہیں ہیں، کوئی عہدہ دار سرکاری بغیر کسی خاص ضرورت کے سرکاری تحریرات انگریزی زبان میں نہ کیا کرے۔"

+ + + + + + + + شرح دستخط نواب اراکین المہام بہادر سرکار عالی

سرکار نظام کا یہ ضروری حکم جو اُردو کی حفاظت و اشاعت کے لیے نافذ کیا گیا ہے بہت ہی قابل تشکر یہ ہے۔

اگرچہ حسابات انجمن کے مفصل گوشوارے اس رپورٹ کے ساتھ منسلک ہیں جن سے آمد و خرچ کی صحیح کیفیت معلوم ہو سکتی ہے۔ لیکن مختصر یہ ہے کہ کل آمدنی جو اس سال بذریعہ چندۂ ارکان انجمن و عطیات وصول ہوئی وہ ۳۴۴۲/۸/- حالی اور ۴۲۹۸/۱۱/- سکۂ انگریزی تھے جس میں سے صیغۂ تالیف و ترجمہ مراسلت خرید کتب، اشاعت کتب، اور متفرق اخراجات میں ۹۵۵/۴/- حالی اور ۱۴۳۰/۹/۶ صرف ہوئے۔ اور باقی ۲۴۸۷/۴/- حالی اور ۲۸۶۸/۱/۱۰ کلدار۔

آمدنی کی رقم میں ۳۰۰۰ سکۂ انگریزی علیا حضرۃ بیگم صاحبہ بھوپال دام اقبالہا کے عطا کردہ ہیں۔ جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

مبلغ ۱۱۳۲ جناب مرزا محمد علی خاں صاحب بہادر صوبہ دار ورنگل کا عطیہ ہے۔ مرزا صاحب ممدوح نے انجمن کے اغراض و مقاصد سے کمال ہمدردی فرمائی۔ اور انجمن ان کی اس ہمدردی اور عطیہ کی بیحد ممنون ہے۔

۱۰۰۰ سکۂ انگریزی جناب نواب عماد الملک بہادر (مولوی سید حسین صاحب بلگرامی) کا عطیہ ہے۔ جو نواب صاحب ممدوح نے کلامِ غالب کے جدید اڈیشن کے لیے مرحمت فرمایا۔ میں کسی طرح جناب نواب صاحب مدفیوضہ کے اُن احسانات کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا جو آپ نے انجمن ترقی اُردو اور اُردو زبان پر فرمائے ہیں۔ آپ نے ایسے زمانہ میں جبکہ آپ نہایت عدیم الفرصت تھے۔ انجمن کا پریزیڈنٹ بننا منظور فرمایا اور پھر ہر طرح سے اور ہر وقت انجمن کی ترقی اور امداد کے لیے ساعی رہے۔ یہی نہیں کہ آپ نے جیبِ خاص سے وقتاً فوقتاً اعانت فرمائی۔ بلکہ اعلیحضرت حضور پرنور خلد اللہ ملکہ نے جو انجمن کو اپنی سرپرستی اور سالانہ بارہ سو روپے کی مستقل امداد سے عزت بخشی ہے وہ محض

جناب نواب صاحب کی سعی کا نتیجہ ہے۔ یہ استحکام جو انجمن کو اس وقت حاصل ہوا ہے وہ محض آپ کی بدولت ہے۔ اور جب تک انجمن ترقی اُردو اور اُسکے کارنامے قائم ہیں اُردو زبان ہمیشہ اُن کی رہینِ مِنّت رہے گی

انجمن راجہ صاحب ڈومکندہ (ریاست حیدرآباد دکن) کی بھی ممنون ہے کہ اُنھوں نے ۱۰۰۰ر کا عطیہ انجمن کو عطا فرمایا۔ راجہ صاحب خود اُردو زبان کے مؤلف ومصنف اور قدردانِ علم وہنر ہیں۔

انجمن مسز خدیو جنگ کی بھی شکرگزار ہے کہ اُنھوں نے ازراہِ ہمدردی خاتونانِ حیدرآباد میں ان مقاصد کی تبلیغ کی اور چندہ وصول کرکے بھیجا۔

نیز انجمن مسز حیدری اور مسز ہمایوں مرزا کی ہمدردی کی بھی ممنوں ہے۔

میں اس موقع پر مسٹر محمد امین مہتمم تاریخ ریاست بھوپال کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنھوں نے انجمن کے لیے بھوپال میں سعی فرمائی۔ اور آیندہ وہاں معقول تعداد ارکان کی بنانے کا وعدہ کیا ہے۔ ان سے انجمن کو بہت سے توقعات ہیں۔

اگر انجمن کی اس سال کی کارگزاری کسی قدر قابل اطمینان اور اسکی بنیاد کسی قدر مستحکم معلوم ہو تو یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ وہ اہل ملک کی امداد و اعانت سے مستغنی ہوگئی۔ بلکہ یہی وقت اُسکی اعانت اور اُسکے لیے سعی کا ہے۔ تاکہ اسمیں انحطاط پیدا نہ ہونے پائے اور وہ ہر سال اس سے زیادہ ترقی کرتی چلی جائے۔ ہم ایک خاندان کے زندہ رکھنے کے لیے کون سی کوشش ہے جو اُٹھا رکھتے ہیں، کیسی کچھ مصیبتیں نہیں جھیلتے اور کیا کچھ ایثار نہیں کرتے، تو کیا کروڑوں مخلوق کی زبان کے زندہ رکھنے اور ترقی دینے کے لیے اتنی محنت اور کوشش اور ایثار بھی نہ کیا جائے، جو ایک خاندان کے

زندہ رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ آج کل کا وہ زمانہ ہے جس میں بے زبان جانوروں اور کھنڈروں کے بچانے کے لیے ہزاروں اور لاکھوں روپے صرف کیے جاتے ہیں تو کیا ایسی زبان کے لیے جس پر کروڑوں انسانوں کی بہبودی اور فلاح منحصر ہے، اتنا بھی نہ صرف کیا جائے۔ کم سے کم اگر ہم اس رقم کا دسواں حصہ بھی اس پر صرف کریں جو ہم اپنی غیر ضروری اور تکلیف دہ نمود و نمایش اور شیخی پر صرف کرتے ہیں تو ایک عظیم الشان علمی کام ہو سکتا ہے۔ زبان صرف اظہار خیالات ہی کا آلہ نہیں بلکہ الفاظ خود خیال کو سجھاتے اور پیدا کرتے ہیں اور زبان کا عقل و دماغ، غور و فکر، ذہن و جدت سے بہت قوی تعلق ہے۔ اگر اہل ملک میں ان قوتوں کی نشو و نما ضروری ہے تو اپنی زبان کی ترقی لازمی اور لابد ہے۔ ورنہ اگر محض نقالی کے برتے پر ہم معراج ترقی تک پہنچنا چاہتے ہیں تو

ایں خیال است و محال است و جنوں

میں اپنے فرض کے ادا کرنے میں قاصر رہوں گا اگر میں جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کا دلی شکریہ ادا نہ کروں۔ جناب صاحبزادہ صاحب کو تعلیمی اور علمی کاموں سے جو گہری دلچسپی اور ہمدردی ہے اور جس خلوص سے وہ اس کام کو انجام دے رہے ہیں وہ تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ اگر وہ میری حوصلہ افزائی نہ کرتے اور مجھے آزادی سے کام کرنے کی اجازت نہ دیتے تو میں کچھ بھی نہ کر سکتا۔

انجمن علیا حضرۃ بیگم صاحبۂ بھوپال۔ مولوی عبداللہ صاحب منہاس اڈیٹر وکیل حافظ حسین الدین صاحب ۔ محمد ابراہیم صاحب۔ شیخ عطاءاللہ صاحب

وکیل گجرات اور مولوی عبدالرحیم صاحب مولوی فاضل کی بھی ممنون ہے کہ اُنھوں نے انجمن کو کتابیں عنایت فرمائیں۔ جنکی فہرست اس رپورٹ کے ضمیمہ میں درج ہے۔ حافظ حسین الدین صاحب کا عطیہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ حافظ صاحب کے دادا مولوی مسیح الدین خاں بہادر میر منشی گورنر جنرل اور سفیر شاہ اودھ تھے اور بعد ازاں واجد علیشاہ مرحوم کی والدہ کے ساتھ انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد اُنھوں نے مرشد آباد میں ایک مطبع آفتاب عالمتاب نامی قائم کیا تھا جس میں تاریخ و ادب پر بہت اچھی اچھی کتابیں ٹائپ میں طبع ہوئیں۔ ان کتابوں کا ایک ایک نسخہ حافظ حسین الدین صاحب نے انجمن کو عنایت فرمایا۔

میں اڈیٹر صاحبان ہمدرد۔ زمیندار، وکیل۔ عصر جدید، نیّر اعظم، مساوات الناظر، کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے انجمن کی کارروائیوں کی وقتاً فوقتاً اپنے اخباروں کے ذریعہ سے اشاعت کی اور اپنے اخبار بھی انجمن کو بھیجے۔

آخر میں مَیں دو نوجوانوں کا خصوصیت کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک مولوی ظفر الملک صاحب علوی اڈیٹر الناظر (لکھنؤ) ہیں۔ جنھوں نے انجمن کا کام بڑی سرگرمی، جوش اور خلوص کے ساتھ انجام دیا۔ اکثر ایسے کام جنکا تعلق عمل اور دوڑ دھوپ سے تھا، وہ میں نے انھیں سے لیے اور انھوں نے ہمیشہ خوشی خوشی اور مستعدی کے ساتھ کیے۔ چنانچہ جن دنوں مَیں حیدرآباد گیا ہُوا تھا میں نے چندہ وصول کرنا چاہا تو انھیں اپنی مدد کے لیے بُلا بھیجا۔ وہ فوراً اپنا تمام کاروبار چھوڑ کر وہاں پہنچے اور بڑی مستعدی کے ساتھ میرے شریک غالب رہے۔ اسکے علاوہ انھوں نے انجمن کی ماہانہ رپورٹیں اپنے صرف سے طبع کرکے مجھے دیں جو اخبارات

اور ارکان انجمن میں تقسیم کیجاتی ہیں ۔ نیز انجمن کے دارالاشاعت کا انتظام کیا اور انجمن کے تمام معاملات میں مفید مشورے دیتے رہے۔

دوسرے سید ہاشمی صاحب ۔ اُنھوں نے مجھے علمی کام میں بہت بڑی مدد دی جدید اُردو قاعدے کے مسئلہ میں انھوں نے شروع سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور جس قدر قاعدے وصول ہوے تھے اُنھیں بالاستیعاب دیکھا اور ان پر ایک تبصرہ لکھکر دیا ۔ اکثر علمی مسودات کے لکھنے میں مدد دی اور اس وقت انجمن کے لیے کلامِ غالب کے جدید اڈیشن کی ترتیب میں مصروف ہیں۔

میں نے ان دو صاحبوں کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو اکثر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ ان میں ایثار کا مادّہ نہیں ۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو ۔ لیکن کم سے کم میں اسے صحیح نہیں سمجھتا ۔ یہ دو مثالیں ایسی ہیں جس سے مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں اب بھی ایسے ہیں جو ایثار اور خلوص سے کام کر سکتے ہیں بشرطیکہ کوئی کام لینے والا ہو۔

رپورٹ ختم کرنے سے قبل میں اُن دو پُرملال حادثات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے انجمن کو نیز اُردو زبان کو صدمہ پہنچا ہے ۔ اس کانفرنس میں کون ہے جسے شمس العلما مولانا شبلی مرحوم کی وفات کا رنج و افسوس نہیں ۔ مولانا ایک نہایت روشن خیال عالم اور اعلیٰ درجہ کے ادیب تھے ۔ اُنکی تمام عمر علمی مشاغل میں صرف ہوئی اور مرتے دم تک اسی دُھن میں رہے ۔ انجمن سے انھیں خاص تعلق تھا ۔ اس انجمن کے پہلے سکرٹری وہی تھے ۔ اُنھوں ہی نے اسکے قواعد وضوابط مرتب کیے اور اسکی بنیاد قائم کی ۔ اُردو زبان پر اُنکے بڑے احسانات ہیں ۔ خاص کر اسلامی تاریخ پر

جو تحقیق و تنقید مولانا نے فرمائی ہے اور اسکا صحیح ذوق مُلک میں پھیلایا وہ کسی شرح و تفصیل کا محتاج نہیں۔ اور اگرچہ مرحوم اب ہم میں نہیں ہیں، لیکن جب تک اُردو زبان قائم ہے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

دوسرا صدمہ اُردو زبان کو اس سال ماسٹر پیارے لال صاحب سابق انسپکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی مَوت سے پہنچا۔ ماسٹر صاحب مرحوم ایک قدیم وضع کے بزرگ تھے۔ اُردو زبان سے اُنھیں خاص اُنس تھا۔ قصصِ ہند حصۂ اول اور رسوم ہند، وہ اُنکی یادگاریں باقی ہیں اُنکی تمام عمر محکمۂ سررشتۂ تعلیم میں صرف ہوئی۔ اُنھوں نے اُردو زبان کے لغات تیار کرنے میں مدد دی۔ ۱۸۷۷ء کے قیصری دربار کے جو حالات سرکاری طور پر تیار کیے گئے تھے، اُنکا ترجمہ ماسٹر صاحب نے بہت اچھی اور فصیح زبان میں کیا۔ مرزا غالب کے دیکھنے والوں میں سے تھے۔ اور مرزا صاحب اُنپر نظرِ عنایت رکھتے تھے۔ چنانچہ اُنکے رقعات میں ماسٹر صاحب کا ذکر موجود ہے۔ ماسٹر صاحب کی تالیفات و تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھیں اس زبان پر کس قدر قدرت تھی اور وہ کیسی فصیح اور عمدہ زبان لکھتے تھے۔ مرحوم انجمن کی مجلسِ شوریٰ کے رُکن تھے اور اُنکی وفات سے اُردو زبان کو ایسا نقصان پہنچا ہے جو بہت قابلِ افسوس ہے۔

عبد الحق

قوتِ مردی کے لیے ہماری نئی ایجاد

اگر آپ جھوٹے اشتہاروں سے بدظن ہو کر علاج سے تنگ ہو گئے ہوں تو آخر میں اب ایکبار ہماری سفارش کو قبول فرمائیں اور ہماری فارمیسی کی مشہور و معروف دوا آتنگ نگرہ گولیوں کا استعمال فرمائیں اور پھر مالک کی قدرت کا مشاہدہ کریں۔ گئی ہوئی اور ہاتھوں سے کھوئی ہوئی جملہ طاقتیں از سرِ نو عود کر آئیں تو ہمارا ذمہ۔ صاحب جو اسکے پاس بیٹھ جاتے ہیں معزز ہیں اصحاب تعریف فرماتے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں سرٹیفکٹ موجود ہیں۔ مرد و ں اور عورتوں کو دونوں کو مفید اور نباتات سے مرکب ہیں۔ قیمت بھی بہت کم ہے صرف فی بکس بتیس گولیوں کا ایک روپیہ۔ آزمائش شرط ہے۔ یکمشت چار روپے کے خریدار کو ایک روپیہ کی دوا زیادہ ملیگی

(پتہ)

ویدشاستری۔ جام نگر۔ کاٹھیاوار

ایجنٹ۔ امید چند مہتا۔ کناری بازار دہلی

الناظر

نمبر ۴ جلد ۱۲ — یکم اپریل سنہ ۱۹۱۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۷ جلد ۱۲ — یکم اپریل ۱۹۱۵ء

اڈیٹر

گزشتہ نصف صدی میں جو مغربی عجائب و نوادر ہمارے ملک میں نواح یورپ سے آئی ہیں اُن میں اڈیٹر کا بہت اعلیٰ درجہ ہے۔

جس طرح بیشتر پیچیدہ مشینوں کی ساخت و اصل سے ہم ہندوستانیوں کو پوری واقفیت نہیں ہے اور اُنکے وجود کا یقین محض اُنکے مرتب شدہ نتیجوں سے اخذ کیا جاتا ہے اسی طرح حضرت اڈیٹر کے بھی وجود کا ثبوت اخبار ہے۔ انکی حالت بالکل پہیلی کی سی ہے جسے بوجھنے کی ہر شخص کوشش کرتا ہے۔ ہر اخبار کے کسی نہ کسی صفحہ پر ایک بزرگ کا نام دیا ہوتا ہے جو اپنے کو اڈیٹر کے لقب سے منسوب کرتا ہے۔ لیکن محض اس اندراج نام سے یہ ہرگز پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے ترتیب اخبار میں حصّہ لیا بھی ہے یا نہیں اور اگر لیا ہے تو کس حد تک۔ علاوہ بریں یہ اڈیٹرانِ حال کی خوش کرداری کا نتیجہ ہے کہ گورنمنٹ نے اندراج نام کا قاعدہ جاری کر دیا ہے اور نیز مختلف قسم کے قانون ان معزز حضرات کی نگرانی کے متعلق رائج کیے ہیں۔ ورنہ اکٹا ڈیورنا[1] جو روما میں تقریباً دو ہزار برس پہلے جاری تھا۔ ایپکن گزٹ جو چینیوں کا سب سے پُرانا اخبار تھا اور ۶ صدی عیسوی میں

[1] دنیا میں سب سے پُرانا اخبار۔

قائم ہوا۔ یا آکسفورڈ گزٹ جو اب لندن گزٹ کے نام سے شائع ہوتا ہے وغیرہ میں کبھی اڈیٹر صاحب کے نام کی ضرورت بپابندیِ شرط قانون نہیں ہوئی۔ لیکن اب معاملہ برعکس ہے۔ عربی۔ فارسی۔ سنسکرت۔ بنگالی۔ مرہٹی وغیرہ میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو لفظ اڈیٹر کے مفہوم کو پوری طرح ادا کرسکے۔ انگریزی میں بھی اگر اس لفظ کے معنی پر نظر ڈالی جائے اور وہ کام جو ان حضرت کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں اُنکا خیال کیا جائے تو اس قدر مافوق العادت افعال آپ سے سرزد ہوتے ہیں کہ بجائے "علمی[1] خیالات کی دایہ کے" اگر آپ کو آسیب یا جنات سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں جنھیں آپ سے تعارف کا موقع ہے اور آپ سے خط وکتابت کرتے ہیں آپ کی صورت سے ناواقف ہیں اگر کوئی ضعیف الاعتقاد آپ کے وجود کو معرضِ بحث میں ڈال دے اور بلا باقاعدہ منطقی دلائل کے یقین ماننے سے انکار کرے تو ہمارے اڈیٹر صاحب کا وجود بلا تکلف عدم سے تبدیل ہو جائے گا۔ اور ہر علمی خیال کو بلا امدادِ دایہ پردۂ عدم سے ظہور میں آنا پڑے گا۔

بیچارے مصنفین و پُرخیال لوگ سخت مصیبت میں مبتلا ہوں گے کہ اس بیسویں صدی میں انکا احاطۂ امکان و دائرۂ عمل اس قدر وسیع ہوگیا ہے کہ پروفیسر[2] ہیو چشالم جیسا قابل آدمی آپ کی تعریف سے قاصر رہا اور اُسے اعتراف کرنا پڑا کہ بذریعہ الفاظ آپ کی تعریف غیر ممکن ہے۔ معلوم نہیں کہ اور کس ذریعہ سے ممکن ہے۔ جب آپ ہر وقت نیا روپ بھر کر پبلک کے سامنے آیا چاہیں تو آپ کی تعریف کس طرح کیجا سکتی ہے۔ کبھی مظلوموں کے ہمنوا ہوکر ظالموں کو کوستے اور رقیق القلوب اور بیکسوں کو رُلاتے اور بہادروں کو مدد پر آمادہ کرتے ہیں کبھی ظالموں کا ساتھ دے کر دنیا کے روبرو اُنکے مظالم کو منطقی دلائل کے بہترین لباس پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ کبھی بھیکوں کی اعانت میں اُنکے ہمراہ کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیے ہوے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا بریٹانکا جلد ۱۹ صفحہ ۵۴۶ گیارہویں اڈیشن۔

[2] Professor Hugh Chisholm دیکھو انسائیکلوپیڈیا بریٹانکا مذکورۂ بالا۔

ہر پڑھے لکھے آدمی سے بیدریغ سوال کرتے ہیں ․․․․ آپ کا اصلی فرض حالات موجودہ و واقعات گزشتہ کو انڈیپنڈنٹ پردۂ قرطاس ظاہر کرنا تھا لیکن اس ترقی کی ہیٹڑ کے زمانہ میں آپ بے بہرہ نہیں رہے۔ یعنی ماضی سے مستقبل بن گئے۔ اور حسب اصول ارتقا بالکل رنگ بدل گیا ہے۔ اب آپکی ڈیوٹی عامۂ خلائق کو ایک خاص امر کی قبولیت کے لیے تیار کرنا۔ اُنکے رجحان رائے کو ایک خاص صورت اختیار کرنے میں مدد دینا اور واقعات آیندہ کے لیے مواد مرتب کرنا ہے۔ اب آپ کے اصول کے موافق الفاظ کا بہترین استعمال اظہارِ واقعات نہیں بلکہ اخفا سے واردات معلوم ہوتا ہے۔ غرضکہ انکے اصولوں کو جن پر انکے اعمال مبنی ہیں جاننا اور انکی اصل پہچاننا ہم ہندوستانیوں کے احاطۂ امکان سے باہر ہے۔ اگرچہ نئے فیشن والوں کے سر میں مثل دیگر نیم پز خیالات کے ایک یہ سودا بھی ہوگا کہ اُن سے پورا تعارف ہے اور وہ اڈیٹر کی اصلیت سے کما حقہٗ واقف ہیں لیکن پرانے فیشن والے اپنی ناواقفیت کے اظہار میں دریغ نہیں کرتے۔

ابھی تک لفظ اڈیٹر کے تلفظ میں سخت اختلاف ہے۔ بہت لوگ اُدیٹر پڑھتے ہیں۔ بہت ایسے ہیں کہ جو اڈیٹر کی صحت پر لڑائی لڑنے کو تیار رہیں۔ کچھ لوگ اڈ۔ یٹر تبلاتے ہیں۔ چونکہ نظامِ عالم کا دارومدار محض صحتِ الفاظ پر مبنی ہے لہذا ہمارے مولویوں اور پنڈتوں کی رائے کے بموجب ایک بہت بڑا جلسہ اس لفظ کی صحت کی تحقیقات کے واسطے منعقد کیا گیا بہت شدید بحث کے بعد بنظر رفع حجت یہ طے کر لیا گیا کہ انھیں دو زبانوں یعنی عربی و سنسکرت (جو در اصل تمام الفاظِ مروجۂ عالم کی مبدأ و ماخذ ہیں) میں سے کسی ایک زبان کا لفظ ہے۔ اسکے بعد بڑی بڑی ضخیم جلدوں اور پستکوں کے پشتارے منجانب فریقین پیش ہونا شروع ہوے۔ گردانوں اور اشلوکوں کی وہ بھرمار ہوئی کہ الحفیظ والامان۔ تعلیل و تغیر۔ سندھی و بتپتی وغیرہ کا کوئی قاعدہ نہیں بچا کہ جس کا حوالہ نہ دیا گیا ہو۔ بیچارہ اڈیٹر بھی ایسا اینچا کھینچی میں پڑا کہ عمر بھر نہ بھولے گا۔

اس دوران میں ایک دیس بھگت بول اُٹھے کہ یہ لفظ سودیشی ہے لیکن جس طرح کہ یہاں سے خام چیزیں یورپ جاتی ہیں اور وہاں سے نئی صورت بنا کر اور نیا نام ایکر آتی ہیں اسی طرح کا اتفاق اس لفظ میں بھی ہُوا ہے اور چند حروف کے سر پر نفیشن کی ٹوپی رکھدی گئی ہے۔ ابھی اس فقرہ پر کوئی رائے ظاہر نہ ہونے پائی تھی کہ ایک مولوی صاحب کی نظر حاضرین میں سے ایک صاحب پر پڑی جو اپنی پاکٹ بُک میں جلدی جلدی کچھ نوٹ کر رہے تھے[۱]۔ دیکھتے ہی چہرے کا رنگ فق ہوگیا پنڈت جی سے جو قریب ہی بیٹھے تھے، کان میں جُھک کر کہا "خفیہ پولیس" اتنا سننا تھا کہ پنڈت جی کے حواس غائب ہوگئے۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ سرگوشی تمام مجلس میں پھیل گئی۔ اور خدا جانے کیوں یکایک مجلس برخاست ہوگئی۔ ممبران کچھ گھبرائے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔ فراشوں کو بہت سی کتابیں اور پتکیں، بلاتعداد رومال اور انگوچھے اور چھڑیاں اور کئی قسم کے جوتے گھیتلے، سلیم شاہی، کفشیں، دلّی وال دستیاب ہوے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ چیزیں یہاں کیسے پہنچ گئیں جبکہ ہر شخص اُنکی ملکیت و سرپرستی سے انکار کرتا ہے۔ اس امر کی مزید تفتیش کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، ہاں یہ افسوس ضرور ہے کہ جلسے میں کوئی مختتم رائے بوجہ قبل از وقت ختم ہو جانے کے قائم نہ ہوسکی جسکی وجہ سے دنیا کے علم و عقل میں معتدبہ اضافہ ہونے سے رہ گیا۔ سُنا جاتا ہے کہ اس جلسہ کی روئداد کئی اخباروں میں شایع ہونے کی غرض سے بھیجی گئی تھی لیکن سبھوں نے اس بنا پر کہ اسکا تعلق ذاتیات سے معلوم ہوتا ہے ناراض ہوکر اشاعت سے انکار کیا واللہ اعلم کہاں تک صحیح ہے۔

جبکہ ابھی تک اصلیت لفظ ہی خلط بحث میں ہے تو معنی و مفہوم کا کیا کہنا۔ ہندوستان میں جہاں کہ اوہام پرستی کا بازار اسوقت تک گرم ہے انواع و اقسام کے خیالات و اوصاف اڈیٹر کے ساتھ وابستہ کر رکھے ہیں۔ کوئی صاحب اُنکو خدا رسیدہ بزرگ سمجھتے ہیں جنکی ریاضت پردہ غیب

---

[۱] یہ واقعہ اُسوقت کا معلوم ہوا جب تک کہ گورنمنٹ نے یہ سرکلر نہیں جاری کیا تھا کہ سودیشی بغاوت کے معنوں میں نہیں مستعمل ہونا چاہیے۔ جیسا کہ پولیس کے کاغذات سے ظاہر ہوتا ہے۔

کو اُنہیں ابھا دیا اور اسرارِ عالم کو اُنپر نمایاں کر دیا ہے۔ دنیا کے ہر حصّہ کے واقعات روح افزا و سوانحات جاں گزا سے اُنکو فی الفور اطلاع ہو جاتی ہے۔ قوّتِ روحانی کو جذباتِ مادّی و کثافتِ دنیا وی سے صاف کرنے میں اس قدر کامیابی حاصل کی ہے کہ ضمیر بالکل روشن ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی سوداگر مشکل سے ایسا نکلے گا جس کی دوکان کی اشیا بقید تفصیل و قیمت آپ کو معلوم نہ ہوں۔ لیکن مشرقی درویشوں کے برخلاف آپ سے گوشۂ عافیت میں چُپ بیٹھا نہیں جاتا۔ اپنی معلومات کو دنیا پر ظاہر کر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور تائید میں اُس فرانسیسی فلاسفر کا قول پیش کرتے ہیں جس کا مقولہ تھا کہ

> واقعات کے اظہار کرنے سے باز مت رہو چاہے قید کیے جاؤ۔ بے عزتی کی جائے۔ کان کاٹے جائیں یا پھانسی دی جائے۔

لیکن اس قسم کے اقوال ہمارے مُلک کے غیر متعلق ہیں اور علی الخصوص آج کل۔ توبہ توبہ سلطنت سے آج تک ہمارے یہاں کبھی کسی کو رائے ظاہر کرنے کی علت میں پھانسی نہیں دیگئی۔ کان جیسی بے گناہ چیز پر ہاتھ لگانا ہمارے یہاں نامردی میں داخل ہے۔ رہی قید و بے عزتی وہ محض خیالی ہوتی ہے۔ عزت سے موٹر پر بٹھا کر لیجاتے ہیں اچھی جگہ رکھتے ہیں نوکر چاکر خدمت کے واسطے دیے جاتے ہیں اور متعلقین کو گھاتے میں تنخواہ وافر ملتی ہے۔ یہ کوئی قید ہے۔ اس گرانی میں ایسی قید خدا سب کو نصیب کرے۔

چاہے جن حکما کے اقوال اپنے فعل کی تائید میں پیش کریں لیکن اصل کو چھپا نہیں سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ بڑے کم ظرف واقع ہوے ہیں۔ بات آپ کے پیٹ میں نہیں سماتی اگر شاید آپ ضبط کرنے کی کوشش کریں تو صحت پر اثر پڑے۔ دلائل تو ہر شخص کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ حسب استعداد خود ہر شخص اُن میں سے چُن کر اپنے عادات و اطوار کی صفائی میں پیش کرتا ہے اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ "خوے بدرا بہانہ بسیار"۔

بہر حال انکے پچھڑ ہر ونگ بنگرہ ہر معاملہ میں پایا استفسا۔ رائے زنی کرنے سے انکو خود

بہت بڑا نقصان پہنچا۔ خوش عقیدہ اور سریع الاعتقاد حضرات ان سے کنارہ کش ہو گئے اور اسی وجہ سے انکی شاہی پریکٹس (وکالت) کو فروغ نہ ہُوا ورنہ نہ جانے کس قدر چڑھائے چڑھتے اور منتیں اُترتیں۔

دیگر حضرات جو مغربی ترقی کو محض تسخیرِ مادہ پر محمول کرتے ہیں اُن کے تراتوں اور تو اسنجیوں کے لحاظ سے ۔ انکو ستار، سارنگی، ہارمونیم، گراموفون کی برادری میں شمار کرتے ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے کہ قرب و بُعد کا اثر انکی صدائے نہ و رفتار پر نہیں پڑتا۔ ہر موجِ اثیر کا نقش بلا لحاظِ بُعد انکے سطحِ خیال پر منقش ہو جاتا ہے اور اُسکو یہ فوراً اپنے سُروں میں رو برو پبلک کے پیش کرتے ہیں۔ غرضکہ پرانے حضرات میں سے کوئی بھی انکی اصلیت کو اب تک نہیں سمجھ سکا۔ اُنکے نزدیک اگر کوئی لفظ ایسا ہے کہ جسکے پسِ پشت کسی ہیولیٰ کا پتہ نہیں چلتا تو وہ لفظ اڈیٹر ہے۔

بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بزرگ کے اقوال سے انکے وجود کا پتہ لگایا جائے۔ اُس ضمیر[1] سے جو ہمیشہ یہ حضرت اپنے واسطے استعمال کرتے ہیں یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ منفرد شخص نہیں اور اگر ہیں بھی تو بادشاہ وقت یا پرانی کمپنی بہادر سے اس قدر قریبی رشتہ داری ہے کہ جو ضمائر اُنکے واسطے مخصوص ہیں اُنکو نہایت آزادی سے اپنے واسطے استعمال کرتے ہیں۔ گمان ہوتا ہے کہ اعزازِ آبائی و وجاہت دیرینہ کا اثر اب تک انکے دماغ سے نہیں نکلا اور "پدرم سلطان بود" کے چکر میں ابھی تک پڑے ہوئے ہیں۔ اگر ان سے خود انکی حیثیت و خاندانی تعلقات کے متعلق سوال کیا جائے تو اپنے تئیں نقارۂ خدا کا منادی تواز بتلاتے ہیں۔ اور اسپر فخر کرتے ہیں۔ تواریخ ہندوستان کی سیر سے یہ امر ثابت ہے کہ اس بھارت ورش میں قریب قریب ہر ایک قوم نے باشندائے معدودے چند ایک نہ ایک وقت ترقی کی ہے اور غلاموں سے لیکر پاسیوں اور نفیروں تک نے معاملاتِ مُلکی کو ایک خاص صورت اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے لیکن نقارچیوں

---

[1] یعنی "ہم"۔

خاندان کا اب تک عروج نہیں پایا جاتا اور کوئی شخص اس برادری میں ایسا نہیں ہوا جسنے تاریخ بنانے میں کوئی حصہ لیا ہو۔ مگر ممکن ہے کہ "ذرہ کا بھی چمکے گا ستارہ" کے اصول پر کچھ عجب نہیں کہ انقلاب روزگار نے دودمان نقارچیاں کو فروغ دینے کی ٹھان لی ہو تعجب یہ ہے کہ یہ حضرت آبا و اجداد کے کارناموں پر بالکل بھروسا نہیں کرتے۔ ہر جگہ اپنی ذاتی لیاقت اور اہل برادری کے اثر کا حوالہ دیتے ہیں اور اُسی پر نازاں ہیں۔

بظاہر ہم کو تاہ بینوں کو تو کوئی اثر یا وقار معلوم نہیں ہوتا بجز اسکے کہ ذرا سی بات پر قاؤں قاؤں کر کے تمام دنیا کو سر پہ اُٹھا لیتے ہیں۔ ہر چہار طرف سے صدائیں بلند ہو جاتی ہیں کہ "ہماری رائے یہ ہے" اور "ہم منجانب پبلک یہ پیش کرتے ہیں"۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ قانونی جکڑ بندیاں اس قدر زیادہ ہوتی جاتی ہیں ان سے کوئی صاحب نہیں پوچھتے کہ آپ جو اس طرح چلا رہے ہیں تو آپ کے پاس کوئی مختارنامۂ خاص یا عام یا وکالت نامہ منجانب بیچاری پبلک کے ہے یا آپ سے اور پبلک سے کوئی خاص رشتہ داری ہے جسکی وجہ سے آپ کو استحقاق چلانے کا حاصل ہے۔ ابھی تھوڑے روز گزرے کہ ایک اڈیٹر صاحب کا تنگ توبڑہ۔ نقارہ۔ چوبیں۔ آگ۔ چلم۔ تمباکو۔ سب بے سُرے ہونیکے جرم میں ضبط ہو گیا۔ گھر کی تلاشی ہوئی کسی قسم کا مختارنامہ یا وکالت نامہ منجانب پبلک اُنکے یہاں سے برآمد نہیں ہوا۔ ساری شیخی خاک میں مل گئی۔

اس شور و شر کے عالم میں گویا ان حضرات کی سہالک کا زمانہ ہے۔ سُنا گیا ہے کہ گورنمنٹ نے بمجبوری محکمۂ احتساب بسرکردگی ایک پُرانے باراں دیدہ اڈیٹر کے قائم کیا ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی طرز عمل ہے جیسا کہ اودھ کے ایک معزز تعلقدار صاحب نے اپنے ایک اہلکار کے غبن گرفت کرنے پر برتا۔ بجائے اسکے کہ خائن کی تہدید و تنبیہ کریں ایک محاسب اُس سے چار چند تنخواہ کا اُسکے اوپر مقرر کیا تاکہ اُسکے افعال کا نگراں رہے اور وہ خیانت نہ کرنے دے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس اودھ نگری کی آب و ہوا کا اثر ہماری پیاری گورنمنٹ پر بھی پڑنے لگا۔

اگر واقعی گورنمنٹ ان معزز حضرات کے مضر اثر کو روکنا چاہتی ہے تو اس معاملہ میں بھی انتظام و ترتیب کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ دُنیا محض نتیجۂ انتظام ہے اور افراد و اقوام کی ترقی اور انکا تنزل محض اصول انتظام و ترتیب کی پابندی یا خلاف ورزی سے ہے۔ ایسی صورت میں محض پتیوں اور کانٹوں کو تراش دینے سے یہ امید کرنا کہ مضر اثر کا قرار واقعی انتظام ہوگیا خلافِ اقتضاے دانشمندی ہے۔ اگر شجر باقی ہے تو کسی نہ کسی وقت پھر وہی بیل دنہار ظاہر ہو جائیں گے اور سیکڑوں بے گناہ بندوں کے دامن خیال پارہ پارہ نظر آئیں گے۔ پریس ایکٹ اور قوانین ضبطی اخبارات وغیرہ کے بجاے اگر گورنمنٹ ایک کمیشن (سلک انڈسٹری کمیشن کی طرح) مقرر فرمائے جو انکی اصل۔ انکے نشو ونما کے اسباب انسداد کی تدابیر۔ انکی ترقی کے مختلف مدارج اور انکا زمانہ۔ اخبار بینی۔ اخبار نویسی۔ کارسپانڈنٹ۔ ریوٹر۔ اڈیٹر کی تفصیل کے متعلق مبسوط و مکمل تحقیقات کرکے رپورٹ پیش کرے تو ہمیں اُمید ہے کہ اسوقت کی مشکلات میں معتد بہ کمی ہو جائے گی اور اخراجاتِ کمیشن فروختِ رپورٹ سے نہایت آسانی سے ادا ہو جائیں گے۔ اگر اُسکے کاپی رائٹ کے فروخت کا اشتہار ابھی سے دے دیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ مطبع والے کس طرح ہاتھوں ہاتھ خرید لیتے ہیں اور انکو اُس سے کس قدر فائدہ کی امید ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ ہزاروں رزولیوشن شکریہ کے گورنمنٹ کی خدمت میں روانہ ہوں۔

اڈیٹر صاحب کو بظاہر نا خوش ہونے کی تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی لیکن خوشی کی امید بھی ہمیں بہت کم ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے حسب نسب کے متعلق کسی قسم کی تحقیقات کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہ محض اُفتادِ طبیعت ہے اسکے واسطے وجہ موجہ ڈھونڈھنا لاحاصل ہے۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ لڑائی کے بادل صاف ہو جانے پر اس ضروری امر کی طرف توجہ مبذول کی جائے گی۔

عبدالحق

تاریخ مذہب اہل ہنود کا ایک ورق

(سلسلۂ الناظر ماہ اگست ۱۹۱۴ء)

تمثیلی انتخابات

۱- خطاب بہ اگنی جو دیوتاؤں کا موبد ہے

اے بندگی کے مستحق اور بہبود کے مختار کل۔ ملبوس ہو اور اپنے ثنا خوانوں کی کل قربانیاں پیش کر۔
ہماری حمد اور ہمارے کلام ربانی کے توسل سے اے جوانِ رعنا ہمارا موبد برگزیدہ تو ہی ہو
کیونکہ اس جہان میں باپ بیٹے کی بجائے۔ عزیز اپنے عزیز کی بجائے اور محب باصفا اپنے
دوست کی جگہ۔ سب پرستش کرتے ہیں۔

عدو کُش آریامن ہتر۔ ورن کو مثل انسان ہماری مقدس گھاس پر بٹھا۔ اے قاصدِ
دیرینہ ہماری قربانی اور صحبت سے محظوظ ہو۔ اور ہمارے راگ بگوش جاں سُن۔

اس دائمی رسم میں جو کچھ ہم دیوتاؤں کو نذر کرتے ہیں وہ تیرے ہی توسط سے کرتے ہیں۔
وہ ہمارا خاندانی مربی پروہت مسرت بخش اور برگزیدہ دیوتا رہے اور ہم اپنی روشن
آتش کے طفیل اُسکو عزیز رہیں۔ ہمنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے نیران طالع پیش کیں،
اور اُنھوں نے ہمکو دولتِ بے بہا کرامت فرمائی۔ پس ہم آگ روشن کرکے تجھسے بھی دعا کرتے ہیں۔

اور اے ذاتِ غیرفانی! اسی طرح فانی انسانوں کے مدائح ہمارا اور تیرا مشترک حصہ ہوں
اے اگنی شکنی پتر (پور تواں) اپنی آگوں کے تصدق ہماری قربانی اور ہمارے کلام
سے محظوظ ہو۔

۲۔ دعائے تجہیز و تکفین

(اہل ہنود کی تجہیز و تکفین میں اس دعا کے اشعار پڑھے جاتے ہیں کیونکہ شاستر میں یہی ہدایت ہے)

اس دیوتا کو نذر پیش کر جسنے دشوار گزار پہاڑ طے کیے۔ گم گشتہ راہ لوگوں کا ہادی بنا۔ وہ کون۔ وہ وسونت کا بیٹا جو مجمع خلائق ہے یعنی یم۔ اس نے ہمارے لیے ایک مامن تلاش کیا۔ وہ ایسا اصل ملک اب ہم سے کوئی غصب نہیں کرسکتا جہاں ہمارے نیاگاں پیشینہ گئے ہیں اُسی جگہ اور اُنکے ہی نقش قدم پر بچے بھی جاتے ہیں +

ہاں! ان ہی قدیم رستوں پر جو ہمارے آبا و اجداد طے کر چکے ہیں تو بھی چلا جا۔ برابر قدم بڑھائے چلا جا۔ یم اور ورن دونوں دیوتاؤں کو اُنکی راحت پر شاداں و فرحاں پائیگا۔

ہاں لے ناک کے پتلے اِسے ہو جا اپنے آبا میں۔ یم میں۔ اور اپنے جوہر ذاتی میں جو فردوس بریں میں ہے۔ اپنی خامیاں پس پشت ڈال اور اپنے حقیقی وطن کی جانب راہی ہو۔ اور زندگی سے معمور ہو کر ہیئت جسمانی اختیار کرلے۔

الفراق، الوداع، رخصت: اجداد نے اسکے لیے یہ محل تیار کیا ہے۔ یم اسکے واسطے ایک ایسی جائے آسایش منظور کرتا ہے جو روز و شب اور دریاؤں سے مزین ہے۔

راہ راست پر قدم مارتا ہُوا دونوں سارمیان کُتوں کے قریب سے گزر جا۔ جنکی چار آنکھیں ہیں اور انکے مُنھ میں لجام دے رکھے ہیں۔ پھر اپنے منتظر اجداد کے قرب میں پہنچ جا جو یم کے ساتھ مسرتِ جاودانی کے جشن مناتے ہیں۔

اے شہنشاہ یم۔ ہم تجھ سے التجا کرتے ہیں کہ اس آدمی کو اپنے دونوں کتوں کی حفاظت میں سپرد کرنا جو چار آنکھیں رکھتے ہیں اور انسانوں کے نگہبان اور محافظ ہیں۔ اور اسکو صحت و دولت کرامت فرما

ا۔ زمانۂ ویدکے لوگوں کی شاخیں جو ذات میں تبدیل ہوگئیں

(۱) برہمن۔ موبد۔ ہادیانِ مذہب۔

(۲) کشتری - صاحبان ذوی الاختیار - حاکم اور نبرد آزما۔ (نیز راجنیا - یہ دوسرا نام ہی)

(۳) ویش - خدام القوم یعنی فلاحین -

(۴) شودر - قدیم اصلی باشندے جو برہمنوں کے زیر اقتدار لائے گئے -

۲ - برہمنوں کے تین ۳ طبقے

(۱) ہوتری - جنکے فرائض قربانی کے متعلق تھے - ہو کے معنی آگ پر ڈالنا -

(۲) اُدگاتری - مغنّی - ماہر علم تجوید - اُدگائی بمعنی گانا -

(۳) اَدھ وریو - موبد عامل - ادھ وَر " عمل

۳ - وید اور ان کے نام

(۱) ہوتری (حمد) تعریفیں پڑھتا ہے لہذا رگ وید (رچ کے معنی حمد یا تعریف)

(۲) اُدگاتری سُر الاپتا ہے - لہذا سام وید (سامانی " " راگ)

(۳) ادھ وریو دعائے قربانی پڑھتا ہے لہذا یجروید (یجشی " دعائے قربانی)

وید ثلاثہ کی ترقی - سنہ نامعلوم

بیرونی واقعات	تاریخ	علم ادب
بنی اسرائیل کا مصر سے کوچ تقریباً سنہ ۱۳۲۰ قبل مسیح	ہندی آرین دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر آباد پیشوایان مذہب گروہوں میں منقسم ہوتے ہیں -	حمد وثنا کے راگ بتدریج تصنیف ہوتے ہیں -
فتح ٹرائے	پیشوایان مذہب کی تعلیم کا آغاز -	
داؤد علیہ السلام بادشاہ بنی اسرائیل تقریباً سنہ [illegible] قبل مسیح	ہندی ریاستیں مشرق میں پہنچ جاتی ہیں - چار ذاتوں کا مسئلہ -	رگ وید کی بتدریج تالیف　سام وید کی تالیف　یجروید کی تالیف

دیوتا کی قسمیں

لاریب دیوتا دو قسم کے ہیں۔ کیونکہ اولاً دیوتا تو دیوتا ہیں ہی۔ ثانیاً برہمن جنھوں نے علم مقدس کی تحصیل کی اور اب اسکی تعلیم دیتے ہیں۔ یہ انسانی (یا فانی) دیوتا ہیں۔

تیسرا باب۔ اُتم جگ۔ برہمن۔ سنہ نامعلوم

اسوقت ایک بڑا اہم سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ سیدھی سادھی قوم جو اسوقت ہمارے پیش نظر ہے، کس طرح موجودہ ہندوؤں میں تبدیل ہوگئی؟ یہ تغیر دو قوتوں کے باعث ظہور میں آیا :-

۱۔ عامۃ الناس کی تہذیب و تمدن میں بتدریج ترقی۔

۲۔ انکا ہندوستان کو بتدریج فتح کرلینا۔

فتح کچھ تو جنگ و جدل کی بدولت نصیب ہوئی، لیکن زیادہ تر مقتدایانِ دین کی امداد سے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے زبردست علم اور تہذیب کے ذریعہ قبائل کو ایسا مفتون کیا کہ وہ انکے پیرو بنگئے۔ اس باب میں اور نیز آئندہ باب میں یہ بتایا جائے گا کہ ہندو مذہب موجودہ شکل میں کیونکر تبدیل ہوگیا۔

تاریخ | اس عہد میں آریاؤں کی پیش قدمی مشرق کی طرف برابر جاری رہی۔ اور دورانِ پیش قدمی میں وہ اپنی پُرانی آبادی کو پیچھے چھوڑتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ اس زمانہ کے اختتام پر تقریباً تمام شمالی ہند میں انکی حکومت اور تہذیب کا دَور دَورہ تھا۔ ایک طرف تو آریاؤں کی پیش قدمی جاری تھی، دوسری طرف برہمن قدیم وحشی قبیلوں کو اپنے دائرۂ اثر میں لاتے تھے۔ اور ساتھ کے ساتھ ہی انکو اپنے نظام تمدن میں ایک خاص مرتبہ دیتے تھے۔ چودن پرن ذات کی شکل میں مضبوطی کے ساتھ تبدیل ہو رہا تھا۔ اس طرح متعدد ذاتیں پیدا ہوگئیں۔ ملک بہت سی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ جن میں سے اکثر آریاؤں کے زیر نگیں تھیں۔ تجارت میں نمایاں ترقی ہوئی حتیٰ کہ بحرِ ہند میں بھی سفر کرنے لگے۔ دولت میں افزونی ہوئی۔ ہندی

ملاحوں اور بابل کے تجار کے باہمی ربط سے فن تحریر[1] ہندوستان میں لایا گیا۔ لیکن سامان تحریر کے آسان اور موزوں نہ ہونے کے باعث صدیوں تک علم ادب اسکی خدمت سے محروم رہا۔ اس زمانہ کے اختتام سے پہلے ہی خاندان میں بزرگوں کی حکومت نے بہت استحکام حاصل کر لیا تھا۔ اور لوگ عورتوں کو حقیر سمجھنے لگے تھے۔ ہوتے ہوتے پھر ایک قاعدہ بنگیا کہ ہندو اپنی بیویوں کے ساتھ نہیں کھا سکتے تھے۔

مذہب | قربانیوں کی رسم کا زیادہ طویل اور پر تکلف ہوجانا اس عہد کو مذہبی رنگ دیتا ہے۔

---

[1] فن تحریر کا نہایت قدیم ذکر ایک رسالہ میں ہے جسمیں بدھ مذہب کے متفرق [illegible] ہیں۔ نواہا میں کھیلوں کی ایک طویل فہرست ہے جس میں علاوہ اور کھیلوں کے ایک کھیل [illegible] پر انگلی سے حروف لکھنا یا ہوا میں اشاروں سے حروف بنانا پھر ان کا معلوم کرنا ہے۔ یہ رسالہ [illegible] کی تصنیف ہے۔ تین چار رسالے ایسے ہیں جو بدھ والوں کے قانون شرع میں نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ (۱) لکھائی لکھنا قابل تعریف عمدہ فن ہے (۲) دوسری جگہ ایک مجرم کی بابت لکھا ہے کہ وہ بادشاہ کی تختی پر لکھوا [illegible] کہ اسے پولیس نے طلب کیا ہے۔ (۳) ایک جگہ یہ بحث ہے کہ نو عمر لڑکے کو کونسا پیشہ اختیار کرنا چاہیئے اسلئے والدین کہتے ہیں کتابت یہ درست ہے کہ اہل قلم ہونا نہایت معزز اور باآرام پیشہ ہے لیکن اس سے انگلیوں میں درد پیدا ہو جائے گا (۴) اگر کوئی مشنری خودکشی کے فوائد معروض تحریر میں لاتا ہے تو ہر حرف کے لیے اُس سے مواخذہ کیا جائے گا۔ ان مثالوں سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ فن تحریر علم ادب کی بھی خدمت کرتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو جو فہرست مشنریوں کے اسباب ضروری کی دی ہوئی ہے اس میں کتب کا ہونا بھی ضروری تھا۔ لیکن وہاں کتابوں کا ذکر نہیں ہے اور جہاں کہیں ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ کتابیں ہماری کتابوں کی طرح لکھی جاتی تھیں یا مستعمل ہوتی تھیں نہیں یہ بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں نے اپنے حافظہ کو اسدرجہ تک پہنچا دیا تھا کہ وہ اسی کی مدد سے کتابوں کو محفوظ رکھتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ صدیوں تک ایسے مفید فن کی طرف سے غافل رہے سامان تحریر دستیاب ہونے کی دقت کوئی ایسی دقت نہ تھی۔ کام چلانے کیلیے بھوج پتر ہرن کی کھال وغیرہ ایسی چیزیں نکل ہی آئیں۔ اب سے ایک صدی پیشتر میسور میں تاجر لوگ حساب کتاب کپڑے پر لکھا کرتے تھے۔ یہ بارہ فٹ سے لیکر اٹھارہ فٹ تک لمبا اور آٹھ انچ اور بارہ انچ کے درمیان چوڑا کپڑا ہوتا تھا۔ اس مضمون پر جداگانہ بحث کی ضرورت ہے لہذا یہاں اسی قدر لکھنے پر اکتفا کیجاتی ہے۔

زمانۂ رگ وید میں تو آدمی دیوتاؤں کی التفات کے حصول میں سرگرم رہتا تھے۔ یا قربانی کے بھجن اور دعا کے ذریعہ انکو امداد پر مائل کرتے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں قربانی کی نسبت لوگوں کے خیالات میں عجیب تغیر واقع ہوا۔ اب یہ سمجھا جانے لگا کہ اگر قربانی کے تمام ارکان بصحت تمام ادا کر دیے جائیں تو دیوتا ضرور کوئی عمدہ انعام کرامت فرمائیں گے۔ اور اگر انکی مدت کو طوالت دی جائے تو انسان دیوتا کے مرتبہ کو پہنچ سکتا ہے۔ قربانی کے ارکان کو بصحت انجام دینا عمدہ ترین مذہب سمجھا گیا۔

اس وجہ سے پروہت کا اقتدار بہت بڑھ گیا۔ قربانی کے پیچیدہ مسائل میں اس سے مدد لیجاتی تھی۔ انکے بغیر اہل دنیا بے دست و پا تھے۔ اسی باعث برہمن کی ایزدی طاقت کو لوگوں نے پورے طور پر تسلیم کر لیا اور وہ اعمال مذہب کا جزو لاینفک شمار ہونے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ برہمنوں کے اثر اور طاقت نے انکو انکلوایا اور حقیقی خدا سے زیادہ انکا ڈر لوگوں کے دلوں میں بٹھایا۔ برہمنوں کو نذرانہ پیش کرنا اور دیوتاؤں کو قربانی چڑھانا یکساں طور پر مستوجب ثواب سمجھے جانے لگے۔ قربانی کے قدیم مراسم میں ایزادی کی اور انکو زیادہ شاندار و پیچیدہ بنایا یہاں تک کہ معمولی آدمی کے لیے ان مراسم کا صحت کے ساتھ انجام دینا آسان بات نہیں رہی۔ اسی عہد میں راجسویہ[۱]، اسوامیدھ[۲]۔ پرش میدھ[۳] اور دیگر قربانیوں نے محدود شکل اختیار کی اور اطراف عالم میں مشہور ہو گئیں۔

اس زمانہ میں برہمنوں کے مذہبی خیالات میں بہت تغیر ہوا۔ خدائے واحد پر اعتقاد کی بنیاد رکھی گئی اور اسکو یعنی خدا کو یا تو خالق بالذات مانتے تھے یا اکثر اسکی وحدت شہود کے قائل تھے۔ جو مخلوقات عالم میں جلوہ نما تھا۔ اس خیال کے ساتھ یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ ہولی

[۱] تخت نشینی کے موقع پر جو قربانی ہوتی تھی اس کا نام راجسویہ تھا۔

[۲] وہ قربانی جو ایک راجا اپنی عظمت و اقتدار کا سکہ جمانے کے لیے کرتا تھا۔

[۳] انسانی قربانی۔ لیکن انسان کی بجائے کسی دوسرے حیوان کو بھی ذبح کر سکتے تھے۔

دیوتا فانی ہیں تا وقتیکہ وہ خدائے تعالیٰ سے اپنی سخت ریاضت اور قربانی کے عوض حیاتِ جاودانی حاصل نہ کرلیں۔ بہت سے قدیم دیوتا مقبولیت کی مسند سے اُٹھا دیے گئے۔ انکی جگہ جنھوں نے شہرت کے پھریرے لہرائے ان میں سے رودرا جسکو اب شو کا خطاب ملا اور وشنو مشہور تر ہیں۔

اس زمانہ کے اختتام کے قریب ہم راہبوں کے ایک اصلی فرقہ سے دوچار ہوتے ہیں یہ جنگل میں لکڑی یا پتوں کی جھونپڑیاں بناکر رہتے تھے۔ وان پرستھ (یعنی بن باسی راہب) انکا نام تھا۔ انکی جائے رہایش آشرم کے نام سے مشہور تھی۔ انکی پوشش درخت کی چھال یا چمڑے کی ہوتی تھی۔ بالوں کو جٹا کی صورت میں رکھتے تھے۔ جنگل کے پھل پھول ہی انکی خوراک تھی۔ جانوروں کو ذبح کرنا اور سبز شاخ کا توڑنا انکے عقیدے میں ممنوع تھا۔ دیوتاؤں کی عبادت اور قدماپرستی انھیں کے دم سے جاری رہی۔ خاندان اور برادری میں انکی عظمت کو قیام رہا۔ لیکن وہ کسی قسم کا کام نہیں کرتے تھے۔ حد درجہ کی سخت ریاضت مثلاً شدت کی گرمی سردی برداشت کرنا۔ نامرغوب غذا کھانا۔ تکلیف دہ حالتوں میں رہنا۔ وغیرہ وغیرہ اُن کی عبادت تھی۔ تپس سے اب بھی وہی حیرت میں ڈالنے والی طاقت مقصود تھی۔ لیکن اب آکر اخلاقی اغراض قدیم اغراض کا جزو بن گئے۔ اب گوشہ نشین تصفیۂ رُوح اور قربِ خدا کے متلاشی ہیں۔ نیز انکی آرزو ہے کہ انسانوں اور دیوتاؤں پر انکو تصرف مل جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو نوجوان اس زندگی میں قدم رکھنے والے ہوتے تھے اُنکو ایک خاص قسم کی تعلیم دیجاتی تھی جس کا نام آرنیک (منسوب بہ جنگل) تھا۔ اس بن ودیا[1] کا ضروری جزو وہ خاص کوشش ہے جو قربانی کو بذریعۂ تمثیل دنیوی آلایشوں سے منزہ کرتی ہے۔ یہ تعلیم تپسی کی عبادت کا رکنِ رکین ہے۔

قدیم باشندوں کے مذہب سے کچھ تعرض نہیں کیا گیا۔ انکے قدیم دیوتا اور عبادات بدستورِ سابق رہے۔ ہاں ان سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ برہمنوں کے تفوق اور اُنکے خیالات کی برتری کو

---

[1] بن ودیا۔ یا بن سکھشا۔

تسلیم کرتے ہیں۔ اس طرح جو ارتباط پیدا ہوا قدرتاً اسکا نتیجہ نکلا کہ قدیم باشندوں نے آریاؤں سے بہت کچھ تحصیل کیا اور دوسری طرف انکے بہت سے خیالات اور پرانی مذہبی رسوم اور اصول ویدک دھرم میں داخل ہوگئے اور ایک زبردست انقلاب کا باعث ہوئے۔ یعنے خیالات مسئلہ تناسخ کی طرف رجوع ہوئے۔ سانپ درخت تالاب عظمت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے اور بیاہ کرانا ایک مذہبی کاروبار ہو گیا۔

علم ادب | ویدوں کی درس گاہوں نے اب زبردست علمی انجمنوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اور ہر انجمن کی جدا جدا روایات تھیں۔ عامۃ الناس انکی وقعت کرتے تھے اور ان میں تعلیم پانا فخر و مباہات کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ ہر برہمن کے لیے یہ لازمی امر تھا کہ وید پڑھنے کے لیے کسی نہ کسی درس گاہ میں تعلیم حاصل کرے اور ایک اپنے فرقہ سے جو وید منصوص ہے اُسکو ازبر یاد کرے۔ اُستاد مفصل طور پر الگ بتاتا تھا۔ بالخصوص مذہب کے متعلق فرائض پاک راگوں کا صحیح تلفظ اور چند خاص حرکات اور کہانیوں کے معنی شرح اور واضح بیان کیے جاتے تھے۔ کسی درس گاہ کی زبانی روایات اس کا برہمن کہلاتی تھیں اسوقت سے ہر برہمن پر اپنے فرقہ کا وید اور اسکے متعلق برہمن ہوتا تھا دونوں کا مطالعہ کرنا فرض تھا۔ جوں جوں تعلیم پھیلتی گئی۔ ہر وید کے متعلق درس گاہوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ اور تعلیم میں چھوٹے بڑے اختلافات بھی پیدا ہوگئے۔ یہاں تک کہ ہر درس گاہ سے ایک جداگانہ برہمن مخصوص ہوگیا۔ اور درسگاہ کی روایات کا نام اسکے لیے مقرر ہوا۔ یہ ہے برہمن کی اصلیت۔ جو دنیا کی نظر میں بے سود اور لایعنی افسانہ ہے۔ لیکن مورخ کے لیے وہ بیحد قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ کیونکہ انکے مطالعہ سے عالموں نے اس زمانہ کے طرز معاشرت اور مذہب کی تصویر کھینچی ہے۔

اتھروا وید یعنی وید چہارم اسی زمانہ میں تالیف ہوا۔ بہیئت مجموعی اور تین ویدوں کی نسبت یہ جدید واقع ہوا ہے لیکن اس میں جو مواد اکٹھا کیا گیا ہے وہ قدیم ہے۔ دوسرے ویدوں کی نسبت اسکو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ لوگوں کے توہمات اس میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔

اور زیادہ تر منتروں پر مشتمل ہے۔ انکی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ، جو بہبودی کا باعث ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جن سے رنج و مصیبت پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرے ویدوں کے ساتھ شمار ہونے کے وقت اتھروا وید کتم انتظار میں پڑا رہا۔

ذیل کی عبارت میں وہ حکم مندرج ہے جسکی رُو سے خاوند کا بیوی کے ساتھ اکل و شرب میں شریک ہونا منع ہے :۔

> ٭یں وجہ اسکو اپنی بیوی کی موجودگی میں کھانا نہیں چاہیے۔ کیونکہ جو ایسا کرتا ہے اسکے تو انا فرزند نرینہ پیدا نہیں ہوتا ہے اور جس عورت کی موجودگی میں وہ کھانا نہیں کھاتا ہے مضبوط فرزند پیدا ہوتا ہے۔

تمثیلی انتخابات

١۔ قربانی کی اصلیت اور قدرت

جب عالم کا مالک پراجا پتی ذی روح حیوانات کو خلق کر چکا تو اسکو تکان سی محسوس ہوئی مخلوق نے اس سے روگردانی اختیار کی اور اب اسکی راحت اور خوراک کے لیے اس کے پاس نہ رہی۔ اس نے سوچا میں خلقِ عالم کے باعث درماندہ و ناتواں ہوگیا ہوں اور جو میرا مدعا تھا وہ بھی حاصل نہیں ہوا۔ میری مخلوق مجھ سے برگشتہ ہوگئی۔ اور وہ میری خوراک و آسایش کے لیے میرے پاس نہ رہی۔ پھر اُس نے اس بات پر غور کیا کہ وہ کون سے ذرائع ہیں جن سے میں طاقت ور بنجاؤں۔ میری مخلوق میرے پاس آجائے۔ کیا ہی اچھی بات ہو کہ میری خوراک اور آسایش کے لیے یہ میرے گرد جمع ہو جائیں۔

اس نے ثنا (باری تعالیٰ) اور مشقت (و ریاضت) جاری رکھی اور مخلوق کا آرزو مند رہا۔ اس نے گیارہ شکاروں کو دیکھا اور انکی قربانی پیش کرکے دوبارہ طاقت حاصل کر لی۔ مخلوق اسکے پاس آگئی اور اسکی خوراک و آسایش کے لیے اسکے ساتھ رہنے لگی۔ قربانی کی بدولت اسکی حالت فی الحقیقت بہتر ہو گئی۔

لہذا لازم ہُوا کہ قربانی پیش کرنے والا گیارہ قربانیاں چڑھائے۔ کیونکہ اس طرح اُسکی اولاد اور مویشی میں افزونی ہوتی ہے۔ جانور اسکے پاس آجاتے ہیں۔ اور اسکی خوراک اور راحت کے لیے اُسی کے پاس رہتے ہیں۔ قربانی اُسکو بہتر بنا دیتی ہے۔ پس واجب ہوا کہ قربانی میں گیارہ جانیں نذر کیجائیں۔

۲- بخار دُور کرنے کے لیے منتر

ہاں تو اب اگنی۔ سوم۔ اور ورن۔ شکنجہ کا پتھر اور مذبح اور گھاس اور مشتعل ہیزم پاک طاقت سے معمور ہو کر بخار کو بھگا دیں اور موذیوں کو دُور رکھیں۔

اور تو اے بخار جو انسان کو زرد رُو بنا دیتا ہے اگنی کی طرح اُنکو بھسم کر دیتا ہے تو خود مضمحل اور بے اثر ہو جا۔ یا تو زیر زمین غائب ہو جا یا نیست ہو جا۔

جا اے بخار اکسی خبیث کو چمٹ جا۔ یا کسی ستانی شودر لڑکی کے جسم میں لرزہ ڈال دے۔ جا یہاں سے دفع ہو اور اپنے ہی لگوں سگوں کو کھا۔ فلاں فلاں دُور دراز مقامات میں اپنا تسلط جما۔ اپنے بھائی کم زوری اور اپنی بہن کھانسی کو اپنے ہمراہ لے جا۔ اپنے کُنبے کو لے کر دشمنوں میں چلا جا۔

بخار کا تعاقب کر و خواہ وہ سرد ہو یا گرم۔ اسکی آفرنیش خواہ گرمی سے ہوئی ہو خواہ بارش سے۔ گندھارس۔ موجوتس۔ انگس اور ماگدھس کو ہم بخار دیتے ہیں گویا کہ وہ قیمتی شے ہے۔

۳- بڑے بڑے چرن یا درگاہیں اور اُنکے برہمن

چرن	برہمن
۱ رگ وید اَے ترایے ین کَوشی تکی	اسے ترے یا کوشی تکی

ب سام وید	
تانڈِنس	پنچ وِنسا
چھن دوگیاس	[چھن دوگیا]
تلاواکارس	تلاواکار
یجروید (سیاہ)	
تے تری نیس	تے تری یا
کاتھکاس	
میترایانیاس	ست پتھ
" (سفید)	
اتھروید	گوپتھ

چھن دوگیا برہمن اب موجود نہیں ہے اگرچہ چھن دوگیا اُپنشد ہے۔

۴۔ برہمنوں کا زمانہ۔ (سنہ نامعلوم)

بیرونی واقعات	تاریخ ہند	علم ادب
الائیجا پیغمبر تقریباً ۸۶۰ ق م	آرین کرکشتر میں	برہمن
		پنچ وِسا
الیڈ کی تصنیف	قربانی کا پیچیدہ ہونا	تے تری یا [illegible]
		تلاواکار
	آرین وسط ملک میں	کوشی تکی
		اے ترے یا
آئی زایا پیغمبر، ۷۴۰ تا ۷۰۰، ق م	فن تحریر کا آنا	ست پتھ
	ون پرستوں کا عروج	گوپتھ

اظہر علی (از دہلی)

فغانِ مُسلِم

درد سے تنگ آ کے مصروفِ فغاں ہوتے ہیں ہم
کب شکایت سنجِ جورِ آسماں ہوتے ہیں ہم
اپنی بربادی کا افسانہ ہے مشہورِ جہاں
محفلِ دشمن میں زیبِ داستاں ہوتے ہیں ہم
تعرِ ذلت میں ہم اُتنے ہی گرے جاتے ہیں حیف
جس قدر شامت سے رسوائے جہاں ہوتے ہیں ہم
شادمان و کامراں ہوتے ہیں اپنے سب حریف
خستہ تن افسردہ دل آزردہ جاں ہوتے ہیں ہم
محترز دنیا سے ۔ خود اپنی نگاہوں میں سُبک
طبعِ عالم پر الٰہی کیوں گراں ہوتے ہیں ہم
کھائے ہیں دھوکے بہت اے آسمانِ نیلگوں
دل کبھی ہوتا ہے خوش تو بدگماں ہوتے ہیں ہم!
امتیازِ حق و باطل یک قلم جاتا رہا
سود کرتے ہیں ہوس، وقفِ زیاں ہوتے ہیں ہم
پھر ہرا ہے تازہ سے ہے قلبِ مُسلم خوں چکاں
آج پھر وحشت نوا سنجِ فغاں ہوتے ہیں ہم

رضا علی وحشت (کلکتہ)

بابی مذہب

(ملخّص از مضمون انگریزی نوشتۂ براؤن)

باب وہ لقب ہے جو ایک شیرازی سید مرزا علی محمدؐ نے اختیار کیا تھا۔ سنہ ۱۸۴۴ء سے اس نے ایک نئے مذہب کا وعظ شروع کیا۔ یہ مذہب باوجود سخت سے سخت سزاؤں اور بانی کے قتل کے ابتک حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ایران میں پھیل رہا ہے۔ اس مذہب کی تاریخ اور مسائل میں کچھ ایسی خاص باتیں ہیں کہ ابتدا ہی سے اس نے نہ صرف ایشیا بلکہ اقوام یورپ و امریکہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے۔ اور اسکے متعلق اس قدر کتابیں تصنیف کی گئی ہیں کہ ایک محنتی سے محنتی طالب علم کے لیے مشکل ہے کہ وہ ان میں سے تھوڑی سی بھی پورے طور سے ختم کر سکے۔ اس لیے اس مضمون پہ تفصیل کے ساتھ بحث کرنا اس مضمون کی حدود سے باہر جانا ہے۔ لہذا ہم اس مضمون میں مذہب باب کی تاریخ اور مسائل کا صرف ایک خاکہ سا کھینچیں گے۔

مذہب بابی کے ابتدائی اصولوں کو سمجھنے کے لیے بھی شیعی مسئلۂ امامت کو اچھی طرح سمجھنا اور خصوصاً امام دوازدہم یعنی امام مہدی کی بابت انکے عقاید کا جاننا از بس ضروری ہے۔ شیعی خیال کے مطابق حضرت محمدؐ نے اپنے بعد اپنے داماد حضرت علی ابن ابی طالب کو مسلمانوں کا روحانی پیشوا قرار دیا تھا۔ لیکن حضرت علیؑ سے پہلے حضرت ابوبکرؓ۔ عمرؓ۔ اور عثمانؓ خلیفہ ہوگئے اور گو حضرت عثمانؓ کے بعد جناب علیؓ کو خلافت ملی مگر وہ مشکل سے ۵ سال تک خلافت کے فرائض ادا کر سکے تھے کہ شہید کر دیے گئے۔ (۶۵۶ء ۔ ۶۶۱ء)۔ آپ کے سب سے بڑے فرزند حضرت حسنؓ نے اپنے والد کے انتقال کے چار۔ پانچ ماہ بعد امامت سے علیحدگی اختیار کی اور معاویہؓ امام ہوگئے۔ آپ کے چھوٹے فرزند حضرت حسینؓ نے چاہا کہ بنو اُمیّہ سے اپنے حقوق واپس لیں لیکن اسی کوشش میں ۱۰۔ محرم الحرام سنہ ۶۱ھ مطابق ۱۰ اکتوبر سنہ ۶۸۰ء کو میدان کربلا میں جام شہادت نوش کیا۔ باقی ۹ امام بنو امیہ اور بعدہٗ بنو عباس سے ڈرتے رہے اور اکثر زہر دیکر شہید

کیے گئے۔ یہ تو امام حضرت حسینؑ کی اولاد میں تو تھے ہی لیکن عام طور پر یہ بھی خیال ہے کہ وہ یزدعجز ثالث کی بیٹی کی اولاد میں بھی تھے جسکو عربوں نے جنگ قادسیہ میں گرفتار کر لیا تھا اور اسکا عقد حضرت حسین سے ہوا تھا۔ یہ عقیدہ تیسری صدی ہجری ہی میں عام ہوگیا تھا کیونکہ مشہور مورخ الیعقوبی نے اپنی ایک کتاب میں اسکا ذکر کیا ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اماموں کی عزت ایران میں اس درجہ کیجاتی ہے۔ کیوں کہ اس طرح وہ صرف حضرت رسولِ خداؐ ہی کی اولاد میں نہ تھے بلکہ خاندانِ ساسانی کا خون بھی انکی رگوں میں موجود تھا۔ پس مذہبی اقتدار کا حق جو اماموں کو خدا کی طرف سے تفویض ہُوا تھا اور جسکو ان سے چھینا گیا اور ایمان کا انحصار امام وقت کی پیروی پر۔ یہ دو مسئلے بنگئے جن پر فرقۂ اہل تشیع عقادر رکھتا ہے۔

شیعوں کا خیال ہے کہ جو شخص بغیر امام وقت کو مانے ہوے مرے وہ کافر کی موت مرتا ہے۔ فرقۂ اثنا عشریہ کے عقیدہ کے مطابق امام دوازدہم یعنی امام مہدی اس سلسلہ میں سب سے آخر تھے۔ امام مہدی کا انتقال ۳۲۹ھ میں ہوگیا۔ لیکن چونکہ انکے عقیدہ کے مطابق دنیا کا گزر بغیر امام کے ناممکن ہے، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ گو امام مہدی کا ظاہری طور پر انتقال ہوگیا ہے لیکن حقیقتاً وہ زندہ ہیں اور مع اپنے معتقدین کے ایک گروہ کے شہر جابلقا یا جابلسا میں رہتے ہیں۔ انکا یہ بھی یقین کامل ہے کہ امام موصوف قیامت کے قریب ظاہر ہوں گے اور دنیا کو جو ظلمت سے پُر ہوگی نور سے منور کر دیں گے۔ یہ ظہور مہدی کا اعتقاد ہر ایرانی شیعہ کے دل میں موجود ہے اور وہ جب کبھی امام مہدی کا نام لیتا ہے تو جہاں اُنکو حجت اللہ اور بقیۃ اللہ کے لقب سے ملقب کرتا ہے وہاں عجل اللہ فرجہ بھی کہہ دیتا ہے۔

مذہب بابی کے متعلق اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ مرزا علی محمد باب کا ظہور ۱۲۶۰ھ یعنی امام مہدی کے امام ہونے کے پورے ۱۰۰۰ سال بعد ہُوا۔ شیعی خیال کے مطابق امام مہدی صرف ایک دفعہ عام لوگوں کے سامنے آئے اور وہ اپنے امام ہونے کے پہلے دن جب اُنھوں نے اپنے والد کی نمازِ جنازہ ادا کی تھی۔ اپنی اس غیبت کے ۶۹ برس بعد تک وہ

اپنے پیرووں کو ۴ اشخاص کے توسط سے ہدایات بھیجتے رہتے۔ ان اشخاص کو باب سمجھا جاتا تھا ۳۲۹ھ میں بابوں کا یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ یہ زمانہ غیبت صغریٰ کہلاتا ہے۔ اور امامِ آخر سے اپنے پیرووں تک کسی خبر کا آنا ناممکن ہوگیا۔ ۳۲۹ھ سے ظہورِ علی محمد باب تک کے زمانہ کو بابی غیبتِ کبریٰ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اس طرح مرزا علی محمد نے شروع ہی میں باب ہونے کا دعوےٰ کیا۔ اور اس نے ظاہر کیا کہ اسکے ذریعہ سے وہ رابطۂ گفتگو جو امام مخفی اور اسکے پیرووں کے درمیان بند ہوگیا تھا پھر شروع ہوگا۔ مرزا خود اس خطاب کا مخترع نہ تھا۔ کیوں کہ اس سے پہلے دسویں صدی عیسوی میں شلمغانی نے مسیح موعود ہونے کا دعوےٰ کیا تھا۔ لیکن زمانۂ حال میں شیخ احمد الاحساعی کے معتقدین امام مہدی کے مقلدین میں ایک ایسے شخص کی موجودگی پر یقین رکھتے تھے جس سے امام کا سلسلۂ گفتگو جاری رہتا ہے۔ ایسے شخص کو وہ شیعۂ کامل کہتے تھے۔

نہ شیخ احمد نے اور نہ اُسکے بعد سید کاظم نے باب ہونے کا دعوےٰ کیا۔ نہ صرف مرزا علی محمد کا بلکہ اسکے اول مقلدین ملاحسین اور قرۃ العین وغیرہ کا بھی اسی شیعی فرقہ سے تعلق تھا۔ سید کاظم کی وفات کے بعد اسکے پیرووں نے اپنے اعتقاد کے مطابق اسکا جانشین تلاش کرنا شروع کیا۔ مرزا علی محمد نے سید کاظم کی وفات کے بعد تھوڑے ہی عرصہ بعد ۲۳ مئی ۱۸۴۴ء کو باب ہونے کا دعوےٰ کیا اور حاجی محمد کریم خاں کو جو خاندان قاچار سے تھا، کچھ تنگ خیال شیعیوں نے اپنا دینی پیشوا تسلیم کیا۔ پس مذہب شیعی کی تعلیمات میں مذہبِ بابی کی ابتدا کو تلاش کرنا چاہیے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ کسی یورپین محقق نے آج تک شیخ احمد اور سید کاظم کی تصانیف کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔

مذہب بابی کی تاریخ بانی کے زمانۂ حیات میں

(۱۸۴۴ء - ۱۸۵۰ء)

تاریخ بابی کے پہلے باب کی ابتدا، ۲۳ مئی ۱۸۴۴ء کو ظہور باب سے ہوتی ہے۔ اور

اس باب کا اختتام تبریز میں ۹ رجولائی ۱۸۵۰ء کو باب کی شہادت پر ہوتا ہے۔ اس مختصر تا کے تاریخی حالات مقالۂ سیاح اور تاریخ جدید سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اس زمانہ کی ۳ تاریخیں پیروانِ مذہب نے فارسی زبان میں لکھی ہیں۔ ان میں سب سے قدیم اور قابل اعتبار تصنیف مرزا جامی کاشانی کی ہے جو ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۲ء کے درمیان لکھی گئی۔ یہ کتاب ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ مصنف ۱۵ ستمبر ۱۸۵۲ء کو مع ۲۰ دیگر معزز بابیوں کے طہران میں شہید ہوا۔ اس کتاب کا پورا قلمی نسخہ پیرس کی بائبلو تھیک نیشنل میں موجود ہے۔ یہ نسخہ فرانس کے مشہور مستشرق لی کامٹ ڈی گابینو ایران سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اسی جگہ ایک اور قلمی نسخہ بھی ہے لیکن اسکے دو ثلث ضائع ہو گئے ہیں۔ دوسری کتاب تاریخ جدید ہے جس کے مصنف مرزا حسین ہمدانی ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۷۵ء و ۱۸۸۰ء کے درمیان لکھی گئی۔ اس میں اور اول الذکر کتابوں میں چند اہم اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مقالۂ سیاح جو تیسری کتاب ہے، مذہبِ بابی کی ابتدائی تاریخ سے اس قدر بحث نہیں کرتی جتنی کہ بہاء اللہ کے سوانح اور تصنیفات سے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب بہاء اللہ کے بیٹے عباس آفندی کی تصنیف ہے۔

مذہب بابی کی بابت مسلمان مصنفین کی تصانیف کو زیادہ قابلِ اعتبار نہ خیال کرنا چاہیے۔ خصوصاً لسان الملک نے اپنی ناسخ التواریخ اور رضا قلی خان نے اپنی تصنیف روضۃ الصفا میں بہت تعصب سے کام لیا ہے۔ لیکن دو تصانیف اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ایک مذہب بابی پر جمال الدین افغانی کا مضمون جو عربی دائرۃ المعارف (مطبوعہ بیروت ۱۸۸۱ء) میں شایع ہوا۔ اور دوسری وہ تاریخ جو ایک ایرانی عالم نے عربی زبان میں لکھی ہے اور جو قاہرہ میں (۱۹۰۴ء) طبع ہوئی۔

اس ابتدائی زمانہ کے صرف مختصر سے حالات یہاں درج کیے جا سکتے ہیں۔ باب کی عمر ظہور کے وقت صرف ۲۴ سال کی تھی اور پورے ۳۰ سال کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ شہید ہو گیا۔ زمانۂ بابیت میں وہ زیادہ تر قید میں رہا۔ اس نے اگست ۱۸۴۵ء سے مارچ ۱۸۴۶ء

تک شیراز میں۔ مارچ ۱۸۴۶ء سے مارچ ۱۸۴۷ء تک صفہان میں اور اپنی زندگی کے آخری ۶ ماہ چہریق کے محل میں گزارے۔ اصفہان کے زمانۂ قید میں اسکو بہت آزادی رہی۔ کیونکہ وہاں کا حاکم منوچہر خاں اسپر بہت مہربان تھا۔ زمانۂ قید میں اسکو اپنی تصانیف اور خط وکتابت جاری رکھنے کی اجازت تھی۔ لیکن یہ آزادی آخری حصۂ قید میں اس سے چھین لی گئی تھی۔ قید میں رہنے کے باعث وہ ان خونخوار لڑائیوں میں شامل نہ ہوسکا جو اُسکے پیرووں اور مسلمانوں میں ہوئیں۔ منجملہ انکے ذیل کی لڑائیاں قابل ذکر ہیں:- (۱) جنگ شیخ تبرسی، جو بانو دش کے پاس بسرکردگی ملا حسین بوشہری اور ملا حاجی محمد علی بارفروشی ۱۸۴۶ء کے موسم خزاں میں ہوئی۔ (۲) جنگ زنجان۔ جو بسرکردگی ملا محمد علی زنجانی ۱۸۵۰ء میں زنجان کے قریب واقع ہوئی۔ (۳) جنگ یزد و نریز جو بسرکردگی آغا سید یحیٰی اسی سنہ میں ہوئی۔ اس زمانہ کے منجملہ اور واقعات کے طہران میں ۷ بابیوں کی شہادت کا واقعہ بھی بہت اہم خیال کیا جاتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں مرزا علی محمد نے باب کا لقب اپنے ایک پیرو کو عطا کر دیا اور خود قائم اور نقطہ ہونے کا دعوے کیا۔ اور اسی وجہ سے اسکے معتقدین اسکو حضرت نقطۂ اولیٰ، اور حضرت ربی الاعلیٰ کے لقب سے پکارتے ہیں۔ لیکن بعد کو بہائیوں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ مرزا علی محمد باب، بہاء اللہ کا پیش برادر تھا۔ ان القاب کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ لیکن خود باب کی زمانہ آخر کی تحریر البیان سے اور اُسکے معاصر موءرخ مرزا جانی کی تصنیفات سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ باب کو اسکے مقلدین ایک خدائی اوتار تصور کرتے تھے۔

اسکے وقت انتقال کے حالات اور اسکا اول فیرسے عجیب طرح سے بچ جانا، ایسے واقعات ہیں کہ جو تمام مذکورۂ بالا کتب تاریخ میں مل سکتے ہیں۔ اسکے پیرووں نے کئی روز بعد اسکی اور اسکے ساتھی مرزا محمد علی تبریزی کی لاشوں کو ڈھونڈھ نکالا۔ ان لاشوں کو ۱۷ سال تک ایک چھوٹے سے مقبرے میں چھپا کر رکھا گیا۔ اس مقبرے کا نام امام زادۂ معصوم ہے۔ بعدہ بہاء اللہ کے حکم سے یہ لاشیں عکا بھیجدی گئیں۔ جہاں وہ ایک مقبرے میں دفن میں جو اسی غرض سے بنوایا گیا تھا

صبح ازل کا زمانۂ اقتدار

(۱۸۵۰ء و ۱۲۶۶ھ)

اپنی وفات سے پہلے ہی باب نے مرزا یحییٰ کو اپنا جانشین بنا دیا تھا۔ اسکے والد کا نام مرزا بزرگ نوری تھا۔ اور بہاء اللہ کا سوتیلا بھائی تھا۔ مرزا جانی کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ ظہور باب کے وقت مرزا یحییٰ کی عمر صرف ۱۴ سال کی تھی۔ وہ ابھی لڑکا ہی تھا کہ اسکی ماں کا انتقال ہوگیا۔ اور اسکی سوتیلی ماں نے اسکی پرورش کی۔ بہاء اللہ، مرزا یحییٰ سے تیرہ سال بڑا تھا۔ ہمارا سب سے پرانا اور غیر متعصب مؤرخ مرزا جانی لکھتا ہے کہ اس نے بہاء اللہ کو یہ کہتے سنا کہ مجھکو یہ گمان بھی نہ تھا کہ یحییٰ اس قدر بڑے مرتبہ پر پہنچے گا۔ ظہور کے ایک سال بعد جبکہ اسکی عمر صرف ۱۵ سال کی تھی۔ وہ باب کے حالات سنکر کچھ ایسا متاثر ہوا کہ فوراً خراسان کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اور جناب قدوس محمد علی بارفروشی اور قرۃ العین سے ملاقات کی۔ اور بہاء اللہ کے ہمراہ اُن بابیوں سے جا ملنے کی کوشش کی جو شیخ طبرسی میں محصور تھے۔ ظہور کے پانچویں سال جب شیخ طبرسی فتح ہوگیا اور یحییٰ کے غیر معمولی جوش کا حال سنکر باب نے اعلان کر دیا کہ سال پنجم کی علامت جیسا کہ حدیث میں درج ہے پوری ہوگئی۔ باب نے یحییٰ کو 'صبح ازل' کا لقب عطا کیا اور اپنی ذاتی انگشتری بطور تحفہ کے بھیجی اور نیز اُسکو اختیار دیا کہ وہ البیان میں ۸ واحدوں کا اضافہ کر سکتا ہے۔ اور آخر یہ کہ اسکو اپنا جانشین بنا دیا۔ باب کی وفات کے بعد اسکے تمام معتقدین نے یک زبان ہو کر صبح ازل کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کیا۔ لیکن کچھ تو یحییٰ کی کمسنی کے باعث اور کچھ اسکی عزلت گزینی کی وجہ سے بہاء اللہ کا اثر برابر بڑھتا رہا۔ باب کی جانشینی کے لیے بہت سے اور لوگ بھی مدعی تھے۔ جن میں سے ایک مرزا اسد اللہ تبریزی کو گوبنو کی روایت کے مطابق بابیوں نے سمندر میں غرق کر دیا تھا۔ مرزا جانی کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ سید باقر ہندی اور آغا محمد بھی اس عہدہ کے متمنی تھے۔ مرزا جانی اس صورتِ حالات کو بہت پسند کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جس طرح وہ درخت سب میں بہتر ہے جو زیادہ بار آور ہو، اسی طرح وہ مذہب بھی

بہترین مذاہب ہے جس میں سب سے زیادہ اظہار ربّانی ہوں۔ لیکن ان لوگوں میں سے کسی کے بھی زیادہ پیرو نہ ہوئے اور ایک عرصہ تک صبح ازل کا اقتدار قائم رہا۔

جولائی ۱۸۵۰ء سے اگست ۱۸۵۲ء تک ایران میں بابیوں کا کچھ چرچا نہ تھا۔ لیکن ۱۵ اگست ۱۸۵۲ء کو تین یا چار پیروان مذہب نے شہنشاہ ناصرالدین پر حملہ کیا۔ اس حملہ کرنے میں معزز بابیوں کا حصہ نہ تھا۔ چنانچہ یہ حملہ ناکامیاب رہا۔ لیکن اسکے بعد بابیوں پر سلطنت کی طرف سے بہت ظالمانہ برتاؤ روا رکھا گیا۔ ۲۸ معزز بابی ۱۵ ستمبر ۱۸۵۲ء کو طہران میں قتل کیے گئے۔ مقتولین میں چند قیمتی جانیں بھی تھیں۔ اُن میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں۔ یادونگار شاعرہ قرۃ العین۔ ملا شیخ علی الملقب بہ جناب اعظم۔ آغا سید حسین۔ باب کا رازداں سلیمان خاں۔ اور نیز ہمارا مورخ مرزا جانی۔ اس خیال سے کہ تمام طبقوں کے لوگ اس قتل میں حصہ لے سکیں، ہر فرقہ کو ایک ایک قیدی سپرد کر دیا گیا اور ہر طبقہ کے لوگوں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر بے رحمی اور ظلم کے ساتھ انکو قتل کیا۔ مقتولین کی ہمت اور استقلال نے اور خصوصاً سلیمان خاں کی حالتِ نزع کے وقت کی کیفیت نے حاضرین پر ایک عجیب اثر ڈالا اور گونہ کی رائے میں اسی اثر نے اشاعتِ مذہب کے لیے وہ کام سرانجام دیا جسکو تمام تصنیف اور مواعظ سابقہ بل کر نہ کرسکے تھے۔ (مفصل حالات کے لیے دیکھو انگریزی ترجمۂ مقالۂ سیاح صفحہ ۳۲۲ - ۳۲۴) اگرچہ بہاءاللہ بھی گرفتار ہوگیا تھا لیکن کسی ترکیب سے وہ اور صبح ازل اس موقعہ پر قتل ہونے سے بچ گئے۔ دونوں ۱۸۵۲ء کے آخر میں بغداد پہنچے۔ بارہ تیرہ سال تک بغداد اس مذہب کا اصلی مرکز بنا رہا۔ اور اسوقت صبح ازل کا اقتدار قائم تھا۔ حتیٰ کہ بہاءاللہ خود اپنی کتاب "ایقان" مصنفہ ۱۸۶۲ء میں اسکو اپنا پیشوا تسلیم کرتا ہے۔ بغداد کے زمانہ قیام کے حالات مقابلۃً کمیاب ہیں لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ اشاعتِ مذہب کا کام برابر خاموشی سے جاری رہا۔ بغداد پہنچنے کے ایک سال بعد بہاءاللہ تن تنہا کردستان ترکی کی پہاڑیوں میں چلا گیا۔ بہائیوں کے خیال کے مطابق اسی زمانہ میں اسپر تمام رموز ربّانی کا انکشاف ہوا۔ لیکن

ازلی اسکی وجہ وہ مخالفت بتاتے ہیں جو بہاء اللہ اور چند پرانے خیال کے بابیوں میں تھی صبح ازل چونکہ ایک نیک طینت اور الگ رہنے والی طبیعت کا آدمی تھا اس لیے اُس میں اور بہاء اللہ میں کوئی لڑائی نہ ہوئی۔ تنازعہ کی بنا بہاء اللہ اور ملا محمد جعفر اور ملا رجب علی کے جھگڑوں سے پڑی۔ آخرکار ایرانی قونصل متعینۂ بغداد، مرزا بزرگ خاں اور ایرانی سفیر مقیم قسطنطنیہ کی خواہش کے مطابق سلطنت ترکی نے بابیوں کو بغداد سے خارج کر دیا۔

پہلے تو ان دونوں کو قسطنطنیہ بلا لیا گیا جہاں چار مہینے قیام کے بعد وہ آدرنہ بھیجدیے گئے۔ آدرنہ میں وہ قریب ۴ سال کے رہے وہیں ۱۸۶۶ء میں بہاء اللہ نے اعلان کیا کہ وہ وہ ظہور موعود ہے جسکی بابت باب نے پیشین گوئی کی تھی۔ بہاء اللہ نے صرف اسی پر اکتفا نہ کی کہ اپنے کو باب کا جانشیں بتلائے، بلکہ اس نے ظاہر کیا کہ باب میری بشارت دینے والا تھا۔ اس دعوے کو بابیوں کی ایک جماعت کثیرہ نے قبول کر لیا لیکن صبح ازل اور کچھ معزز بابیوں نے اور نیز اُن اٹھارہ معتقدین باب میں سے جن کو حروف حی کہا جاتا تھا، کسی ایک نے اسکی بہت سختی سے مخالفت کی۔ تنازعہ بڑھتا گیا۔ اکثر لوگ مارے گئے۔ بہاء اللہ اور صبح ازل نے ایک دوسرے کو زہر دینے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ ترکی سلطنت مداخلت کرنے پر مجبور ہوئی اور صبح ازل کو فاماگستا واقع قبرص اور بہاء اللہ کو عکا واقع شام روانہ کر دیا۔

بہاء اللہ کا زمانۂ اقتدار

(۱۸۶۶ء - ۱۸۹۲ء)

دونوں فرقوں میں اختلافات بڑھتے گئے اور بالآخر مذہب بابی کے دو مقابل مرکز ہوگئے۔ ایک فاماگستا اور دوسرے عکا۔ گو صبح ازل کی موافقت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اثر رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ اور اسکا حلقۂ مقلدین دن بدن تنگ ہوتا جاتا ہے۔ ایران میں بہت قلیل تعداد ازلیوں کی باقی ہے اور وہ بھی صرف کرمان میں۔ صبح ازل کا سالا شیخ احمد کرمانی جو بہت بڑا صاحب علم اور بااثر شخص

تھا۔ شاہ ناصر الدین کی جان پر حملہ کرنے کے الزام میں قتل کیا گیا۔ اس نے مذہب بابی کے مسائل اور اسکے فلسفہ پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا نام ہشت بہشت ہے۔ صبح ازل ابھی زندہ ہے اور گو وہ تاریخی حیثیت سے ایک عجیب شخصیت ضرور ہے تاہم اب وہ کوئی با اثر شخص نہیں ہے۔

مذہب بابی کی ابتدائی تاریخ معلوم کرنے کے لیے اس سے بہتر ذریعہ ملنا ناممکن ہے۔ وہ بہت آزادی کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ برخلاف اسکے عکا میں یہ بات نہیں پائی جاتی کیونکہ وہاں مصلحتِ وقت کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ اس حالت میں صبح ازل کا مقابلہ نپولین کی اس حالت سے کیا جا سکتا ہے جبکہ وہ جزیرۂ سنیٹ ہلینا میں قید تھا۔ وہ ایک شخص ہے جس نے کبھی مذہبی دنیا میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اب اسکا زمانۂ اثر ختم ہو چکا ہے۔ اسکی تصانیف کثیر ہیں، لیکن انکو پڑھنے والے معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ کسی انگریزی عالم نے اسکی تصانیف کے اس مجموعہ کے مطالعہ کی طرف توجہ نہیں کی جو مسٹر کوہم کی کوشش سے برٹش میوزیم نے حاصل کیا ہے۔ اب چار برس سے مذہب بابی کا مرکز عکا میں ہے۔ اور ہم اب اپنی توجہ اس طرف مبذول کرتے ہیں۔

ازلیوں اور بہائیوں کی وجہ تنازع کو مسٹر سسل اسپرنگ رائس انگریزی وزیر متعینۂ طہران نے تمثیلاً خوب بیان کیا ہے۔ انکی رائے میں ان دونوں فرقوں کے امر متنازع فیہ کی مثال بالکل اس اختلاف کی سی ہے جو سنیٹ پال اور سینٹ پیٹر میں تھا کہ آیا مذہب عیسوی یہودی مذہب ہی کا ایک فرقہ ہے یا بذاتِ خود ایک نیا مذہب ہے۔

پرانے مذہب بابی نے گو اسلام کو یہ کہکر چھوڑ دیا ہے کہ پیغمبر اسلام آخری پیغمبر نہیں، اور کلام مجید الہامی کتاب نہیں۔ تاہم اسمیں شیعی عقائد کا عنصر ضرور پایا جاتا ہے۔ لیکن بہاء اللہ کی تعلیمات میں ایک اور ہی رنگ پایا جاتا ہے۔ اسکا مذہب مذہب بابی سے زیادہ قابل عمل ہے اور تعلیمات میں رموزِ نامعلوم کا حصہ نہیں۔ وہ تمام بنی نوع کے واسطے مذہب ہونے کا دعوے کرتا ہے اور صرف اہل تشیع کو دعوت نہیں دیتا۔ اسکا طرز عمل ایرانی حکومت اور شاہ کی طرف

زیادہ صلح کن ہے جیسا کہ بہاء اللہ کے ایک مشہور خط لوحِ سلطان کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہے
یہ خط بہاء اللہ نے عکا پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد لکھا تھا۔ اور جیسا کہ مقالۂ سیاح کے صفحہ ۱۰۲ پر مذکور ہے
ایک نوجوان بہائی مرزا بدیع کو بھیجا گیا تھا۔ اس نے بذاتِ خود جا کر یہ خط شاہ کی خدمت میں پیش
کیا۔ اس گستاخی پر اسکو قتل کر ڈالا گیا۔ بہاء اللہ نے اور بہت سے بادشاہوں کے پاس بھی
خطوط بھیجے جن میں ملکہ وکٹوریہ، زارِ روس، اور پاپائے روم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس
زمانہ کے مفصل حالات تحریر کرنے کے لیے ہمارے پاس کافی ذرائع موجود نہیں لیکن اس قدر ضرور
کہا جا سکتا ہے کہ تبلیغ مذہب کا کام آہستہ آہستہ لیکن مستعدی کے ساتھ جاری رہا۔ ایران میں
بہائیوں پر طرح طرح کے مظالم کیے گئے لیکن اپنے پیشوا کے حکم کے مطابق کہ مرنا مارنے سے
بہتر ہے وہ ان تکالیف کو سہتے رہے۔ جولائی ۱۸۶۹ء میں مرزا بدیع قتل کیا گیا۔ ۱۸۷۹ء میں
دو اصفہانی سید جو آب سلطان الشہدا اور محبوب الشہدا کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ علماءِ شہر
کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ۱۸۹۱ء کے موسمِ گرما میں نجف آباد میں بہائیوں کو بہت بے رحمی کے
ساتھ قتل کیا گیا۔ ۸ ستمبر ۱۸۸۹ء کا واقعہ ہے کہ ایک معزز بہائی حاجی محمد رضا اصفہانی کو عشق آباد
کے چوراہے پر دو شیعہ فدائیوں نے قتل کر ڈالا۔ یہ فدائی مشہد مقدس سے اسی غرض سے بھیجے گئے
تھے۔ روسی عدالت نے ان فدائیوں کو حبسِ دوام کی سزا دی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ بہائیوں
پر ظلم کرنے والوں کو سزا دی گئی۔ چنانچہ بہائیوں نے اس موقعہ پر بڑی خوشی منائی۔ بہاء اللہ
نے اس موقعہ پر دو آیات کے الہام کا دعوے کیا، جن میں روسی انصاف کی بہت تعریف ہے
اور بہائیوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اس واقعہ کو ہرگز نہ بھولیں۔ ۱۹۰۳ء میں بہائیوں پر
یزد میں بہت سخت مظالم کیے گئے جنکا تذکرہ نیپیر ملکام نے اپنی کتاب ایک ایرانی شہر میں پنجسالہ
قیام میں تفصیل سے کیا ہے

مذہب بہائی کی موجودہ تاریخ میں ایک دلچسپ اور اہم واقعہ یہ ہے کہ امریکہ میں انکا
مذہب برابر اشاعت پا رہا ہے۔ امریکہ میں اس کام کو ایک شامی بہائی ابراہیم جارج خیر اللہ

نے شروع کیا۔ بنا ب موصوف کی شادی ایک انگریز خاتون سے ہوئی ہے اور آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے شکاگو میں اس کام کو ۱۸۹۲ء میں شروع کیا۔ آپ کی پیدائش کوہ لبنان کی ہے اور آپ کئی برس تک قاہرہ میں مقیم رہے۔ جہاں ایک شخص عبدالکریم نامی نے انکو مذہب بہائی کا پیرو بنا لیا۔ ازاں بعد انھوں نے امریکہ میں بودو باش اختیار کر لی۔ آج امریکہ میں کئی ہزار بہائی موجود ہیں اور امریکہ میں اس مذہب کی بابت بہت سی معلومات اور تصانیف دستیاب ہوسکتی ہیں۔

بہاء اللہ کی وفات سے آج تک

(۱۸۹۲ء - ۱۹۰۸ء)

بہاء اللہ ۳ لڑکے اور ۹ لڑکیاں چھوڑ کر ۲۹ مئی ۱۸۹۲ء کو جہان فانی سے راہی ملک عدم ہوا۔ اسکے انتقال کے بعد فوراً ہی اسکے سب سے بڑے بیٹے عباس آفندی (غصن اعظم) اور منجھلے بیٹے محمد علی (غصن اکبر) میں جانشینی کے لیے جھگڑا شروع ہو گیا۔ حسب معمول دو فرقے پیدا ہو گئے۔ ایک وہ جو حالات کو بدستور قائم رکھنے کا خواہاں تھا اور دوسرا وہ جو ترقی خیالات کا حامی تھا عباس آفندی فرقۂ مؤخرالذکر کا پیشوا تھا۔ اور اپنے دعوے کی سند میں وہ کتاب اقدس کی یہ آیت پیش کرتا تھا کہ "تمام اغصان، افنان اور منتسبین کو لازم ہے کہ غصن اعظم کی پیروی کریں"۔ اس قدر معلوم کرنے کے بعد یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس قدر صاف حکم کی موجودگی میں محمد علی کو عباس آفندی سے تنازع کی کوئی گنجایش نہیں۔ لیکن عباس آفندی نے دعویٰ کیا کہ سلسلۂ الہام ہنوز بند نہیں ہوا۔ اور بہاء اللہ کی وفات کے بعد سے وہ ذریعۂ الہام ہو گا۔ اس خیال کی مخالفت محمد علی اور اسکے مقلدین نے بہت سختی کے ساتھ کی۔ وہ اپنی مخالفت کی دلیل 'کتاب اقدس' سے لاتے ہیں۔ جس میں درج ہے کہ "جو کوئی ہزار سال گزرنے سے پہلے صاحب امر ہونے کا دعویٰ کرے کاذب ہے"۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو بہاء اللہ عباس آفندی کو صاف طور پر اپنا جانشین مقرر کرتا ہے اور دوسری طرف کتاب اقدس ہی سے

اسکے کذب کا ثبوت مل جاتا ہے۔ پہلے کچھ دن دونوں بھائیوں کے معتقدین کے گروہ برابر رہے لیکن عباس آفندی کا اثر روز بروز بڑھتا گیا اور اسکے بھائی محمد علی کا حلقۂ اثر تنگ ہوتا گیا۔ اختلافِ عقائد نے تعلقات باہمی پر بہت بُرا اثر ڈالا اور اب کی یہ اثر صرف ایران ہی تک محدود نہ تھا بلکہ امریکہ، مصر اور شام تک پہنچا۔ ابراہیم جارج خیراللہ جو امریکہ میں بہائی مذہب کا واعظ تھا محمد علی کی طرف ہوگیا۔ لیکن اسکی مخالفت کرنے کے لیے عباس آفندی نے معمّر اور تجربہ کار عالم مرزا ابوالفضل کو ریاستہائے متحدہ امریکہ کو روانہ کیا۔

مذہب

باب کے زمانۂ حیات ہی میں اسکے مذہب میں اکثر تغیرات ہوگئے تھے۔ ان تغیرات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے لیے باب کی کثیرالتعداد اور ضخیم تصانیف کا بغور مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ باب کی تصانیف میں مندرجۂ ذیل کتابیں بہت اہم ہیں:۔ زیارت نامہ اور صحیفۃ البیان الحرمین یہ دونوں کتابیں سال ظہور ہی میں تصنیف کی گئیں۔ دلائل السبع اور تفاسیر سورۂ یوسف۔ الکوثر والعصر وغیرہ اسکی آخری تصانیف میں البیان اور کتاب الاحکام بہت ہی اہم ہیں۔

ان تصانیف میں کچھ تو ایسی ہیں کہ جنکی عبارت عام فہم اور طرز تحریر سادہ ہے لیکن بعض ایسی بھی ہیں کہ جن میں مضامین کی تکرار اور عربی لغات ٹھُسے ہوئے ہیں۔ اور عوام کا تو کیا ذکر محنتی سے محنتی پڑھنے والا بھی انکو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ صبح ازل کی تصانیف کا طرز بالکل باب کی طرح ہے۔ لیکن بہاءاللہ اور عباس آفندی کی تصنیفات میں یہ بات نہیں۔ ان میں ناقابلِ فہم و ادراک باتوں کا ذکر تک نہیں اور اسکا طرز تحریر بالکل سادہ اور عام فہم ہے۔

بابیوں میں انجام رُوح کی بابت بہت اختلافات ہیں۔ لیکن تمام فرقے اس بات پر بالکل متفق ہیں کہ دوبارہ احیاءِ جسم ناممکن ہے۔ البیان کے چند مقامات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رُوح جسم کی موت کے بعد بھی اُسکے دنیاوی معاملات میں دلچسپی لیتی رہتی ہے۔ کچھ بابی تناسخِ ارواح کے بھی قائل ہیں۔

گو مذہب بابی کے چند مسائل بہت ہی مبہم ہیں لیکن اسکو تصوف سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور اُسکے جانشینوں کے احکام کی پابندی لازمی ہے اور اسمیں چون وچرا کی گنجایش نہیں ہے بہاء اللہ نے مساوات کی تعلیم دی ہے۔ برخلاف اسکے محمد علی باب اور صبح ازل کا طرز عمل اس سے بالکل جدا گانہ ہے۔

بابی خیال کے مطابق اصلیتِ خدا کا سمجھنا فہم سے بالاتر اور حدودِ ادراک سے باہر ہے۔ ہم اسکی بابت جو کچھ معلوم کرسکتے ہیں وہ صرف اُن پاک انسانوں کی زندگیوں کے ذریعہ سے جنکو یکے بعد دیگرے اُس نے ہم میں مبعوث کیا۔ تمام پیغمبر ایک ہی اصلیت کی فروع ہیں۔ اور ایک ذاتِ بزرگ ضرورت زمانہ اور تقاضاے وقت کے مطابق انکو تعلیم دیکر ہماری ہدایت کے لیے ارسال فرماتی ہے۔ تمام پیغمبروں کی تعلیمات ایک ہیں۔ لیکن جس طرح ایک ہی اُستاد ایک مضمون بچوں کو اور طرح پڑھاتا ہے اور اُسی مضمون کی تعلیم نوجوان طالب علموں کو بالکل مختلف طریقہ سے دیتا ہے، اسی طرح پیغمبر بھی اپنی تعلیمات ان مدارج ترقی و تمدن کو مدنظر رکھکر دیتا ہے جن پر اُسکی قوم اُسوقت ہو۔ مثلاً، وہ کہتے ہیں کہ مادّی دوزخ وجنت کا جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ نے انکو بیان کیا ہے، ہرگز وجود نہیں۔ لیکن عرب کے تپتے ہوے ریگستانوں کے باشندوں کو انکی ماہیت سے واقف کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں ہوسکتا تھا

بابیوں کا یقین ہے کہ دنیا ابد تک قائم رہیگی۔ اور وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ دنیا ایک قانون مقررہ کے ماتحت کام کر رہی ہے اور کرتی رہیگی۔ اس لیے جو تعلیمات و احکامات آج ضرورت وقت کے مطابق ہیں کل ایسے نہ رہیں گے۔ اور اسی طرح ہادیان برحق اور پیغمبروں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ چنانچہ اُنکا یقین ہے کہ نہ کوئی پیغمبر آخری پیغمبر ہوسکتا ہے اور نہ کوئی کتاب الہامی آخری الہامی کتاب ہونے کا دعوے کرسکتی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ہر پیغمبر نے اپنے جانشین کی بابت پیشین گوئی کی۔ لیکن جب وہ جانشین پیدا ہوا تو سب لوگوں نے اُسپر ایمان لانے سے انکار کیا۔ یہودی کس ہمپنی کے ساتھ مسیحؑ کا

انتظار کر رہے تھے، لیکن جب ظہور ہوا تو وہ اُس پر ایمان نہ لائے۔ اسی طرح جب حضرت عیسیٰؑ کی پیشین گوئی پوری ہوئی اور پیغمبر اسلامؐ نے بعثت فرمائی تو عیسائیوں نے اُنکو پیغمبر برحق ماننے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح، گو شیعہ کبھی امام مہدی کا نام بغیر عجل اللہ فرجہٗ کہے نہیں لیتے لیکن جب امام مخفی باب کی شکل میں ظاہر ہوے تو ان لوگوں نے نہ صرف اُن پر ایمان لانے سے انکار کیا، بلکہ باب کو طرح طرح کی تکالیف پہنچائیں۔ قید کیا۔ اور بالآخر اُسکو مار ڈالا۔

باب نے اپنی تعلیمات میں ہر جگہ یہ کوشش کی ہے کہ اسکے پیرو کہیں اسی غلطی کے مرتکب نہ ہوں۔ اور چنانچہ وہ اُنکو مَن یُظہرہُ اللہ پر ایمان لانے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ اگر کوئی شخص خدا کی طرف سے مبعوث ہونے کا دعوے کرے تو اُسکے صدق یا کذب کے معلوم کرنے کی حتی الوسع کوشش کرو۔ اور بالفرض اگر تم اُسکو کاذب ہی پاؤ تو بھی اُس پر ظلم و تشدد روا نہ رکھو۔

سطور مندرجۂ بالا سے ایک یورپین محقق کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہونا بالکل قرین قیاس ہے کہ مذہب بابی میں مغرب کے عقلی خیالات کا بڑا عنصر شامل ہے۔ لیکن پیشین گوئیوں کے پورا ہونے کے یقین کا ل۔ طلسمات کی قدر و قیمت، اور نام کے حروف کے اعداد سے اشخاص میں تناسب کا خیال۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو ایک مغربی محقق کو بالکل عجیب معلوم ہونگی۔ لیکن سب سے عجیب اور متحیر کر دینے والی چیز وہ محبت اور احساس حرمت ہے جو ہر بابی اور بہائی کو اپنے پیشوا کے ساتھ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں، باب کو اُسکے پیرو، 'حضرت ربی الاعلیٰ' کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ بہاءاللہ کے معتقدین اُسکو 'جمال مبارک' اور 'حق تعالےٰ' تک کہتے ہیں۔

اب ہم الفاظ نقطہ اور واحد کی بابت کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ لفظ نقطہ کو بابی ایک حدیث سے منسوب کرتے ہیں جو حضرت علیؓ سے مروی بتائی جاتی ہے۔ اس حدیث کا مضمون یہ ہے کہ تمام قرآن مجید کے مضامین کا لُبّ لباب سورۂ فاتحہ میں ہے اور سورۂ فاتحہ کے تمام مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم میں پوشیدہ ہیں اور اسکے تمام مضامین حرف ’ب‘ میں، اور ’ب‘ کے تمام مضامین اُسکے نقطہ میں مضمر ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم میں ۱۹ حرف ہیں۔ لفظ واحد کے حروف کے اعداد بھی ۱۹ ہیں (و = ۶ - ا = ۱ - ح = ۸ - د = ۴) ۱۹ کو دو بار ضرب دینے سے ۳۶۱ حاصل ضرب ہوتا ہے۔ اور اسکو بابی ”عدد کل شئی“ کہتے ہیں۔ بابی ۱۹ کے عدد کی بہت عزت کرتے ہیں۔ چنانچہ بابی سال میں ۱۹ مہینے اور ہر مہینے میں ۱۹ دن ہوتے ہیں۔ اسی عدد ۱۹ کی رعایت سے باب نے پہلے پہل اپنے ۱۸ پیرو بنائے اور انکو ’حروف حی‘ کہا جاتا ہے۔

باب کے اکثر احکام ایسے ہیں جنکو اب بالکل نہیں مانا جاتا۔ چنانچہ تمباکو پینے اور افیون کھانے کی ممانعت اور اموال تجہیز و تکفین کی بابت جو احکام باب نے جاری کیے اب انکو ماننے والے اور ان پر عمل کرنے والے بہت کم لوگ باقی ہیں۔ برخلاف اسکے بہاء اللہ کے احکام پر جو کتاب اقدس میں درج ہیں انکی سادگی اور سہل العمل ہونے کی وجہ سے سب لوگ عمل پیرا ہیں۔

روحانی حیثیت سے صبح ازل کی موافقت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اسمیں شبہہ نہیں کہ بلاان تغیرات و اصلاحات کے جو بہاء اللہ نے اس مذہب میں کیں اسکے مقلدین کا دائرہ ہرگز اس قدر وسیع نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اگر بہاء اللہ کی کوششیں بارآور نہ ہوتیں تو یہ مذہب بھی مثل ان لاتعداد اسلامی فرقوں کے ہوتا جو کچھ دن زور و شور کے ساتھ زندہ رہ کر صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو گئے۔ آج بابیوں اور ازلیوں کی تعداد بہت کم ہے اور دن بدن کم ہو رہی ہے۔ برخلاف اسکے بہاء اللہ کے پیرووں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور روز بروز اُسکا دائرۂ اثر وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اور اسکا اثر صرف ایران ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کی اشاعت کا کام امریکہ اور انگلستان میں بھی بڑے زور و شور کے ساتھ انجام دیا جا رہا ہے۔

تصانیف

مذہب بابی کی بابت جو تصانیف موجود ہیں اور جن سے اسکی بابت بیش بہا معلومات ہم

پہنچ سکتی ہیں انکو ہم پانچ حصوں میں تقسیم کریں گے۔ (۱) تصانیف مرزا علی محمد باب۔ (۲) تصانیف صبح ازل۔ (۳) تصانیف مرزا حسین علی بہاء اللہ۔ (۴) تصانیف عبد البہاء عباس آفندی۔ (۴) ان لوگوں کے پیرووں کی تصانیف۔

۱- تصانیف باب ۵ حصوں میں تقسیم ہوسکتی ہیں:- (۱) آیات (۲) تفاسیر (۳) مناجات (۴) شئون علمیہ (۵) صور علمیہ۔ لفظ بیان کا اطلاق قسم اول کی تصانیف پر ہوتا ہے اور انکا طرز تحریر آیات قرآنی سے مشابہ ہے۔ تصانیف باب میں سب سے اہم اور عمدہ معلومات بہم پہنچانے والی کتاب بیان فارسی ہے۔

۲- صبح ازل کی تصانیف میں سب سے پہلی تصنیف کتاب نور ہے۔ حال ہی میں مسٹر کوہیم کی کوشش سے برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں صبح ازل کی کتابوں کے بہت سے دستی نسخے آگئے ہیں۔

۳- بہاء اللہ کی اُن تصانیف میں جو اُسنے دعوے ظہور کے قبل تحریر کیں "ایقان" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اسکا فرانسیسی ترجمہ مسٹر ہیوائٹ اور مسٹر حبیب اللہ شیرازی نے طبع کرایا ہے۔ بعد کی تصانیف میں کتاب اقدس۔ الواح سلاطین۔ لوحِ بشارت۔ اور کتابِ عہدی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۴- عباس آفندی کی تصانیف میں "معاوضات" خاص اہمیت رکھتی ہے اور اسکا بھی ترجمہ فرانسیسی اور انگریزی میں ہو چکا ہے۔

۵- قسم پنجم کی تصانیف میں ابراہیم جارج خیراللہ اور مرزا جانی کاشانی۔ رضا قلی خاں اور حاجی عبد الرحیم کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہمارا مضمون نا مکمل رہیگا اگر ہم تصانیف کے سلسلہ میں سحر نگار شاعرہ قرۃ العین کا تذکرہ نہ کریں۔ اس شاعرہ نے مذہب بابی کی اشاعت کے لیے بڑے بڑے کارہاے نمایاں کیے ہیں۔ انگریزی ترجمۂ مقالۂ سیاح میں مسٹر براؤن تحریر فرماتے ہیں:-

"کسی زمانے اور کسی ملک میں قرۃ العین جیسی عورتوں کا پیدا ہونا بہت شاذ ہے اور

خصوصاً ایران جیسے ملک میں اسکا پیدا ہونا ایک حیرت انگیز واقعہ نہیں بلکہ معجزہ ہے۔ کیا بلحاظ اپنے حسن وجمال۔ کیا بلحاظ اپنی ذہنی لیاقت۔ کیا بلحاظ اپنی جادو بیانی اور کیا بلحاظ اپنے مذہب کی بیباکانہ محبت کے وہ ایران میں اپنی ثانی آپ ہے۔ اگر مذہب بابی کے پاس فخر کرنے کے لیے کوئی اور بڑی چیز نہ ہوتی تو اُسکے لیے یہی کافی تھا کہ اُس نے قرۃ العین جیسی ایک عورت پیدا کر دی۔

ایام جدائی

ذاکر حسین خاں

تخمیس بر قطعہ حضرت فصیح الفصحا ملک الشعرا جناب نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی

شوخی طبیعت سے ہو اک رابطہ جس کو — کیا قہر ہے اے صدق وہ خاموش اگر ہو
افسردہ دل آیا جو نظر شاعر خوش گو — کل داغ سے یوں پوچھا یہ کسی نے کہ بتا تو
کیا حال ہے اے بسمل صمصام جدائی

کہہ صاف کہ ہے کس نگہ مست کا بسمل — کس شمع کا پروانہ ہے کس گل پہ ہے مائل
معلوم تو ہو باعث افسردگی دل — سرشار ہے کیوں بادۂ اندوہ سے غافل
گردوں نے پلایا تجھے کیا جام جدائی

یہ کس کی محبت نے بنایا ترا نقشا — لاغر ہے بدن خشک ہیں لب زرد ہے چہرا
سب ہجر کے آثار ہیں صورت سے ہویدا — آنکھوں سے برستے ہیں دُرِ اشک تمنا
سینہ ہے ترا مخزن آلام جدائی

درپیش ہے کس دوست کی دُوری کا تجھے غم — کس دشمن جاں کے لیے تیرا ہے یہ عالم
رہ رہ کے یہ کیوں سینہ میں ہوک اُٹھتی ہے پیہم — کیوں دل پہ ترا ہاتھ ہے کیوں چشم ہے پُرنم
ہے تجھ سے جدا کون سا آرام جدائی

حد بھی ہے کوئی رنج کی اے کشتۂ ابرو — بس کھینچ نہ آہیں نہ بہا آنکھوں سے آنسو

چھپتا ہے تو ملنے کا لطف آنے کا پہلو — آغازِ جدائی کو جدائی نہ سمجھ تو
ہوتا ہے وصال ایک دن انجامِ جدائی

ممکن نہیں ہے چارۂ دردِ دلِ مضطر — لیکن ہے ہر اک کام کا اک وقت مقرر
ہوگی تجھے [illegible] — [illegible]
حسرت نہ نکلے [illegible] جدائی

مرتا ہے اگر بس ستم آرا ہے بتا تو — کس کے لئے جیتا ہے معلوم تو کچھ ہو
کیا جرم ہے اس کا [illegible] جتا نہیں ہمکو — [illegible] نہ پوچھو نہ پوچھو
کچھ اور کرو ذکر نہ لو نامِ جدائی

کس منہ سے کروں آہ میں اقرارِ محبت — شایانِ محبت نہ سزاوارِ محبت
چھیڑو نہ سنکے پھیر کے اذکارِ محبت — احباب کہتے ہیں واقفِ اسرارِ محبت
جھنجھلائے کہ او موردِ الزامِ جدائی

مرتا ہے مگر ضبط محبت کے ہیں دعوے — دے انکو یہ فقرے وہ نہ ہوں جاننے والے
واقف نہیں کون اس تری شوریدہ سری سے — ہم پوچھ کے احوال خطاوار ہی ٹھہرے
گویا کہ دیا ہم نے یہ پیغامِ جدائی

بے جا نہیں تجھ سے ترے احباب کو نفرت — سچ ہے کہ نہیں رحم کے قابل تری حالت
بس دیکھ کے بے مہریِ اربابِ مروت — اک نالہ کیا مرغِ گرفتار کی صورت
مقطع یہ پڑھا اس نے تہِ دامِ جدائی

برداشت کے قابل نہیں آلامِ جدائی — دل کانپتا ہے سن کے مرا نامِ جدائی
بدتر ہے کہیں نزع سے ہنگامِ جدائی — اللہ نہ دکھائے گردشِ ایامِ جدائی
کم صبحِ قیامت سے نہیں شامِ جدائی

صدق (جائسی)

وِنٹرس ٹیل

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو الناظر بابت ماہ فروری ۱۹۱۵ء)

(۹)

ساحل بوہومیا جو اسوقت اپنی پُرشور اور متلاطم موجوں کی وجہ سے آبی رزم گاہ بنا ہوا ہے۔ سر بہ فلک موجیں آآکر اُسے تھپیڑے دیتی ہیں، اور ساحل سے تسابق کی بیتاب کوشش میں ناکام ہو کر پلٹتی ہیں اور پلٹ کر بحرِ ناپیدا کنار میں فنا ہو جاتی ہیں۔ کنارہ ایک کوہ نما اٹل استقلال سے اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اور ان بنات بحر کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ شوریدگی اچھی نہیں۔ اپنی حد سے تجاوز ہونا ناوک عدم کا صید بننا ہے۔

بقا و فنا کا یہ قدرتی منظر ابھی جاری تھا کہ ایک بڑی نہنگ آسا کھاتا، دھواں اُگلتا ہوا (اسٹیمر) اور اپنی رفتار کی دھوم دھامٹ سے زہرۂ بحر کو آب آب کرتا ہوا آکر کنارے لنگر انداز ہوا۔ اسٹیمر سے پلیٹ فارم پر اُترنے کے لیے چوبی زینہ لگا دیا گیا اور دو آدمی اُسپر سے اُترے جن میں سے ایک شخص کوئی معزز افسر معلوم ہوتا تھا۔ اور دوسرا اُسکا ملازم، جسکی گود میں ایک چھوٹا بچہ تھا۔ افسر جب پلیٹ فارم پر آگیا تو ہم نے قریب سے دیکھکر پہچانا کہ لارڈ اینٹی گونس ہے، جو غالباً اپنی اُس ظالمانہ سفارت کو انجام دینے کے لیے اترا ہے جسپر اُسکی ماموری کا حال پچھلے باب میں ناظرین پڑھ چکے ہیں۔ اور پچھلے آدمی کی گود میں سیاہ چادر سے لپٹا ہوا جو بچہ ہے وہ شاہ بوہیمیا کی ننھی شاہزادی ہے۔ دونوں آدمی پلیٹ فارم سے باہر آئے۔ وہ صبا رفتار گھوڑے کاروان سرا کے سوداگروں سے منگواکر اُنپر سوار ہوے اور ایک سمت کو باگیں اُٹھادیں تھوڑی دُور شاہراہ پر جانے کے بعد ایک پگڈنڈی کی طرف مُڑ گئے، جو ایک گنجان جنگل کی خاردار جھاڑیوں میں جاکر غائب ہوگئی تھی۔ جب گھنے درختوں اور جھاڑیوں میں پہنچ گئے تو چلتے چلتے افسر نے اپنے گھوڑے کی باگ کھینچی۔ اشارہ پاتے ہی گھوڑا رُکا۔ پچھلے سوار نے بھی گھوڑا روک لیا، اور

فوراً گھوڑے سے اُتر پڑا۔ افسر کے سامنے گیا تو اُس نے قریب کے جنگلی درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے لڑکی کو ڈال دینے کا حکم دیا۔ جسکی اُسنے فوراً تعمیل کی۔ لڑکی کو وہاں لٹا دیا، اور پھر گھوڑے کی پیٹھ پر آ بیٹھا۔ ابھی گھوڑوں نے سو پچاس ہی قدم کی مسافت طے کی ہوگی کہ خودبخود گھوڑے بدکنے لگے۔ آگے کو کسی طرح قدم نہ بڑھاتے تھے۔ دونوں سوار اپنے اپنے گھوڑوں کو چمکارتے تھے، گردنوں پر ہاتھ پھیر کے اُنھیں روکتے تھے، مگر گھوڑے نتھنے پھُلا پھُلا کر بدحواس ہوے جاتے تھے۔ ہمارے لارڈ کا گھوڑا دفعتاً بدحواس ہوکر دائرہ کی شکل اپنی جگہ پر پھر گیا۔ اگر کوئی دوسرا معمولی سوار ہوتا تو زمین پر ہی آ رہتا، مگر گھوڑا بالکل بیقابو ہو رہا تھا، وہ اُسکو روک کر اُتر ہی پڑا۔ جسکے بعد دوسرا سوار بھی اُتر رہا تھا کہ جھاڑیوں کی پشت سے شیر کے ڈکارنے کی گرج دار آواز نے انھیں خود حواس باختہ کر دیا: اور دونوں ایک دوسرے کو گھبرائی ہوئی اور سخت مایوسی کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ کہ اتنے میں ابوالحارث عالمِ صحرا کا اکیلا اور پُر رعب شہنشاہ ایک تمکنت کی شان سے سامنے نکل آیا۔ اسکے بعد چشم زدن میں اُن دونوں کا قصہ پاک تھا۔

اُس معصوم بچی کی اِس جنگل بیابان میں جو دُردسا نہ ہوتی، تھوڑی تھی۔ کہ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ ایک غریب گڑریا بکریوں کی ریوڑ لیے، خدا معلوم کدھر سے اس طرف آ نکلا۔ جاتے جاتے اُسکے کان میں آدمی بچہ کے رونے کی آواز آئی۔ جسے سنکر وہ سخت متحیر ہوا اور رُک رہا کہ آواز پر کان لگا کر سُنے۔ اس مرتبہ جو آواز آئی تو وہ سیدھا اُسکی طرف چلا۔ چلتے چلتے اُسنے محسوس کیا کہ سامنے کی جھاڑی سے آواز آ رہی ہے۔ جھاڑی کی پشت پر جوں ہی پہنچا اُسکی آنکھوں نے ایک ایسا تماشا دیکھا جو اکثر گدڑی میں لال دکھا دیتا ہے۔ بچے کے خوبصورت پیارے اور روشن چہرے کو وہ دیکھتا تھا اور ہکا بکا ہو کر رہ جاتا تھا۔ کبھی وہ اُسکو خدا کی خدائی کی ایک بڑی نعمت سمجھکر لینے کو ہاتھ لپکاتا، مگر پھر اُسکی گراں قدری سے خود ہی مرعوب ہوکر ہاتھ کھینچ لیتا۔ کبھی وہ خیال کرتا کہ چاندنی راتوں میں جو چیز آسمان پر چاند کی شکل میں نظر آتی ہے

یہ اُسی کا کوئی ٹکڑا ہے۔ غرض وہ دیر تک اسی طرح نقش حیرت بنا رہا۔ اور کچھ اُسکی سمجھ میں نہ آیا۔ یہاں تک کہ اُس چاند کے ٹکڑے نے ہاتھ پیر پھینکنے شروع کیے، اور کچھ بسورنے لگا۔ اس مرتبہ اس بھولے اور متحیر گڈریے نے ہمت کرکے اُس قدرت کے لعل کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھا لیا اور لیکر جنگل سے سیدھا گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اب اُسے نہ بکریوں کا ہوش تھا نہ گلہ کی سُدھ۔ اور گھر پہنچکر اسنے وہ ہیرا اپنی عورت کو بھی نہ دکھایا، جب تک کہ اُس نے جھونپڑے کی سب سے زیادہ پوشیدہ و محفوظ جگہ نہ پا لی۔ بکمال احتیاط سے اُسکے لینے کو گود نہ پھیلادی گود میں لینے کو تو اُس نے لیا، مگر حیرت اور رعب سے وہ بوکھلا سی گئی۔ اس اثنا میں کپڑے کی اندر نظر جو اٹھی تو اُسکے پوتڑے کے نیچے اُسکے لباس و اشیاء پہ پڑی۔ جس میں مخملی کارچوب کے کام کا جاکٹ۔ اُون کا ٹوپ، جسپر جواہرات کا جگمگانا اگر نظر کو خیرہ کر رہا تھا تو کانوں میں لٹکنے کے ایسے موتی اپنی آب دکھاتے اور نگوں کے ہیرے شعاع میں آفتاب کو شرما رہے تھے۔

جاکٹ کے ایک کاج میں ایک طلائی زنجیر لٹک رہی تھی جس میں ایک لیبل (پرچی) لگا تھا۔ اور اُسپر نقش عبارت میں شاہزادی کا سنہ پیدائش، نام، وجہ اخراج وغیرہ درج تھی۔ اس تمام سامان کا جائزہ گڈریے اور گڈرن نے متفقہ حیثیت سے لیا۔ جائزہ لے چکے اور اس اعجوبۂ روزگار نعمت کو اپنے حق کا ایک خداداد عطیہ یقین کر چکے تو رائے ٹھہری کہ ہمیں یہ مکان چھوڑ کر کہیں اور سکونت اختیار کرنی چاہیے۔ ورنہ خبر ہونے پہ یقیناً یہ دولت گرانبہا ہمارے مخالفین ہمارے قبضے میں نہ دیکھ سکیں گے۔

قصہ مختصر دونوں میاں بیوی کھا پکا کر جلدی جلدی نقل سکونت کے لیے تیار ہو گئے۔ دو ایک بکریاں جو گھر میں باقی تھیں اُنکا دودھ دوہا گیا اور روئی کی بتی سے بچہ کے مُنہ میں دیا گیا۔ اوپر کا دودھ تھا، مگر دودھ نہ پائے ہوئے بچے کو بہت دیر ہوئی تھی۔ اس لیے دیر تک بتی کو چوستا رہا اور جب سیر ہو گیا تو بتی سے مُنہ کو ہٹا لیا۔

بعد ازاں بچی کو لیکر دونوں ایک سمت چل نکلے۔ اور وہاں سے پوری ایک منزل پر جا کے ایک غیر مانوس مقام پر سکونت کی ٹھہرائی۔ تھوڑھکا نا کرنے کے بعد کوئی چیز اُس لڑکی کی اُتار کر بیچی، جسکے بھلے چنگے دام آئے۔ اُس سے کچھ بکریاں اور کچھ اپنی ضروریات کا موٹا جھوٹا سامان خریدا۔ اور اُس عطیۂ پروردگار کی دیکھ بھال میاں بی بی بڑے درد و محبت سے کرنے لگے۔

بہرحال اس پُرامن وادی میں وہ نورِ نگاہِ دہقاں ہزار ہا چاہ جیت کے ساتھ پل کر سنِ شعور کو پہنچی۔ گڈریے کی قسمت کا یہ تارہ درخشاں و تاباں نظر آیا تو ایک عالم رشک و حیرت کے مارے مرنے لگا۔

ظاہر ہے کہ گڈریے کے یہاں کی ٹھیٹھ تربیت سے لڑکی کو جیسا کچھ ادب آموز سبق ملا ہوگا۔ مگر سچ یہ ہے کہ اُسکی نیچرل آدائیں خود ایک گونہ محتاجِ تربیت نہ تھیں۔

روز وہ رنگِ گُل کی طرح نکھرتی اور بوئے گُل کی طرح مہکتی جاتی تھی۔ جسے دیکھ کر زمانہ ششدر و حیران رہ جاتا۔ اور ہر شخص گدڑی میں لعل قیاس کرتا۔ مگر یہ کون جانتا تھا کہ یہ گوہر آبدار شہریاروں کے تاج سے ٹوٹ کر فقیر کی جھولی میں گرا ہے۔

(۱۰)

نیزہ کرن کا دیدۂ گردوں میں ڈال کے
مغرب میں پھینکی رات کی پُتلی نکال کے

مرزا دبیر کا یہ شعر اگرچہ عام طور سے شاعرانہ تخیل سے زیادہ وقعت نہ رکھتا ہو، مگر فی الواقع اس میں فن اسٹرانومی کے اُس مہتم بالشان مسئلہ کا بیان کیا گیا ہے جس پر اس فن کی تمام تفریعات قائم کی جاتی ہیں۔ لیکن اسے تو وہی لوگ جانیں گے جنھوں نے صحیفۂ قدرت کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

اُس روز جبکہ ولی عہد بوہومیا اپنی قدر اندازی و نشانہ بازی کا جوہر دکھانے کے لیے تن تنہا ایک بڑے لاگو مردم خوار شیر کے شکار کو جانیوالا تھا، اسکے رخصت کرنے کو فوجیں قصرِ معلّیٰ کے روبرو سلامی دینے اور "بسلامت روی و باز آئی" کی دل نواز گت سُنانے کو صف بستہ تھیں۔ اِدھر آفتاب کی کرن پھوٹی، سلامی کی دردی بجی، اُدھر فوجوں میں ایک باقاعدہ تحریک سی پیدا ہوگئی۔

کیونکہ شاہزادہ بھی ویسے ہی محل سے برآمد ہو گیا۔ بینڈ نے عجیب و نشیریں حوصلہ افزا ترانہ چھیڑا۔ نیزوں کی حرکت اور برہنہ تلواروں کی چمچاہٹ نے وہ سماں دکھا دیا کہ پایۂ تخت پر ہو میا کے رہنے والے کہہ اٹھے کہ آفتاب کا دعوے غلط۔ انھیں روشنی کے شعاعوں نے تاریکی شب کو مٹا یا۔ آفتاب میں ضیا دی، اور عالم میں اُجالا پھیلایا ہے۔

شاہزادہ چیرہ نیلی لباس زیب تن کیے ایک شکی گھوڑے پر سوار عجب شان سے نکلا، اور شکارگاہ کو روانہ ہوا۔ گنتی کے صرف بارہ شکاریوں کا ایک دستہ ہمراہِ رکاب تھا شہزادہ شکارگاہ کو پہنچ کر شکار کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔ ہانکے ہوئے صحرائی جانور اِدھر سے اُدھر بھاگے جاتے ہیں۔ اس لیے جگہ کو خطرہ سے خالی نہ پایا کر ہم بھی وہاں سے چلے آئے۔

شام کو واپسی پر ہم پھر شاہزادے سے دوچار ہوئے۔ اُسکے چہرے سے استقلال اور کامیابی کے آثار نمایاں تھے۔ شکاریوں کا وہی دستہ ساتھ تھا۔ اور پیچھے جو گاڑی پر ایک گراں ڈیل لمبا، اور بڑے کلّے جبڑے کا شیر لدا ہوا تھا۔

شاہزادہ شام کے وقت کی قدرتی دلچسپیوں پر نظر کرتا اور جنگل و دیہات کی سیر کرتا ہوا جا رہا تھا کہ ایک بکریوں کا چرتا ہوا گلّہ نظر پڑا جس میں چھوٹے بڑے میمنے آزادی سے اُچھل کود رہے تھے۔ اس تماشہ کو دیکھنے کے لیے اُس نے گھوڑے کی باگ ڈھیلی کر دی۔ کہ دفعۃً گلّہ چرانے والوں میں اُس نے ایک ایسی پیاری اور دلکش شکل دیکھی جسے دیکھتے ہی وہ حیرت زدہ ہو گیا۔ از خود رفتگی میں گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور اپنی جگہ پر تھوڑی دیر کے لیے بُت بن کے رہ گیا۔ پھر ناتجربہ کارانہ خودداری کے خیال سے یکایک چونک کے" میں غلطی پر تھا میری شان اور حیثیت کے شایاں ہرگز یہ بات نہ تھی جو ظہور میں آئی۔ ساتھ کے شکاریوں نے میرے بلا وجہ ٹھہرنے پر کیا خیال قائم کیا ہوگا؟" (پھر ان خیالات کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ کے اور اُکتا کے)" اُف! کوئی جو چاہے خیال کرے۔ مجھے ذرہ برابر اس کی پروا نہیں

یں یہاں رہ جاؤں گا، اس لڑکی کے باپ سے کہوں گا کہ وہ مع اسکے یہاں سے چل کر میرے یہاں رہے، اُسکو علیحدہ مکان دلوا دوں گا۔ تاکہ کسی کو خبر بھی نہ ہو۔ (خود ہی دل میں!) یہ سب باتیں کیوں؟) اس لیے کہ اُس نے پیاری اور دلربا صورت پائی ہے۔ میرے خاندان میں بھی تو کوئی اس شکل و شمائل کا نہیں۔ ایسی پری چہرہ مہ جبیں کو محلوں میں رہنا چاہیے، جنگل میں رہنے سے اس کا حسن میلا ہو جائیگا۔ اے لو! وہ سامنے سے بھی ہٹ گئی نہیں، بکریوں کے ساتھ اُدھر جا رہی ہے۔ کاش وہ بکریوں کے ساتھ اِدھر آتی۔ میں کیونکر اُدھر جاؤں، میرے سوار بھی ساتھ جائیں گے، جن کو دیکھکر یہ لوگ پاس ہونگے تو اور وہ رہا کے دَم لیں گے۔ (گویا اُسکی خیالی صورت کو مخاطب بنا کے)

"بصورتِ تو بُتے کم تر آفرید خدا قلم کشیدہ و دست از قلم کشید خدا"

ہمارے جوان بخت و جوان سال شاہزادے کے لیے اسوقت اُسکی ناتجربہ کاری ہزار آفتوں کی ایک آفت تھی، جو نہ سنبھلنے دیتی تھی، نہ کوئی تدبیر اُس سے اسکی بن آتی تھی کہ اُس سے قریب ہوکے اچھی طرح اُس خوش جمال نازنیں کو جی بھر کے دیکھے۔ وہ سخت کش مکش میں پھنسا ہوا تھا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

روکے ہے مجھے صبر تو کھینچے ہے مجھے شوق کعبہ مرے آگے ہے کلیسا مرے پیچھے

اسی کشش و پیچ اور چہ کنم کے دوران میں خدا جانے شاہزادہ کیا سوچا کہ گھوڑے کو ایک ایڑ بتائی۔ جس کے ساتھ ہی وہ پرکالۂ آفت اُس لق و دق عرصۂ دشت میں طرارے بھرنے لگا۔ اور چشم زدن میں شاہزادہ ایوان شاہی میں تھا۔ شاہزادہ کے پہنچتے ہی اس جان جوکھوں مہم سے واپس آنے پر مبارک سلامت کی دھوم کیسی کچھ مچی ہوگی۔ کس قدر زر و جواہر نچھاور کیا گیا ہوگا۔ کیسا لنگر لُٹا ہوگا۔ اُسکے ہنگامے کا کیا پوچھنا۔ ہمیں تو اسکی فکر ہے کہ اپنی اپنی فکر میں ہر شخص لگا ہوا ہے اور غریب شاہزادے کی فکر کسی کو نہیں۔ وہ شکار کو گیا اور شیر مار کے لایا، مگر اُس کا دل تیر نظر کا شکار ہو گیا۔ اُسکے چہرے سے اضمحلال نمایاں اور دماغ

میں خیالات کا ایک طوفان برپا ہے۔ خیالات یہ ہیں :-

وہ جنت کی حور تھی۔ یا کوہ قاف کی پری؟ حقیقۃً اگر ایسا ہی ہو، کہ کوہ قاف سے اُتر کر یا جنت سے نزول کر کے ایک جھلک دکھا کر اور اپنی تجلی رُخ کا دیوانہ بنا کے چلتی ہوئی ہو۔ نہیں، نہیں، وہ اُن پیاری بکریوں کی مالک تھی، اور کشورِ حُسن کی ملکہ۔ گڈریے کی لڑکی۔ مگر گڈریے کے گھر۔ اور ایسی لڑکی! ہو نہ ہو یہ کہیں کی شاہزادی تھی: پھر وہ یہاں کیسے؟ اور کیوں آئی؟ شاید سیر کو آئی ہو۔ جنگل کی ہَوا اُسے پسند آگئی ہو، اور رُک گئی ہو۔ نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا، یوں اور اس حال میں کیوں ہوتی۔ محل سے شاید روٹھ کر بلا اطلاع چلی آئی ہو۔ مگر پھر لوگ منانے کیوں نہیں آئے؟ کس مُلک کی شاہزادی ہوگی؟ فروغِ حُسن یہ کہ آفتاب تاک جھانکے۔ پھر جیسے بنے گا وہاں پہنچوں گا۔ (خیالی جوش میں)

کفِ پائے بہ زمینے کہ رسد تو نازنیں را
بلبِ خیال بوسم ہمہ عمر آں زمیں را

اچھا ہوا کہ اِسوقت وہاں سے چلا آیا۔ ورنہ بیتابیِ دل اور بڑھتی۔ اور ساتھ والوں کو اسکی اطلاع ہو جاتی۔ اب میں اس طرح تبدیل وضع کر کے وہاں جاؤں گا کہ یہ فرشتگانِ عذاب (اشاقت والے) میرے ساتھ نہ ہوں۔ اور اسی لیے اِسوقت صفائی کے ساتھ میرا چلا آنا اچھا ہوا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ساتھ کے سوار دُور تھے، کسی کی نظر بھی اُس تک نہ پہونچی ہوگی"

شاہزادہ اسی اُدھیڑبُن میں مصروف ہے۔ چونکہ کوچۂ عشق میں آج پہلے پہل اُسنے قدم رکھا ہے اس لیے اُسکے عزائم و افکار اگر ناتجربہ کاری، جوش، اور اضطرار کا پہلو لیے ہوئے ہوں تو شاہزادہ اُنپر قابل مواخذہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اسی نوعیت کے بے سلسلہ خیالات

اُسکے فکرمند دماغ میں گونجینگے اور فوراً دھوئیں کی طرح اُڑ جائیں گے۔ خیالات کے ہیجان اور جذبات کے طوفان کی حالت میں چونکہ تنہائی بسا اوقات اچھے مشیروں کا کام دیا کرتی ہے۔ اس لیے ہم بھی شاہزادہ کو تنہائی کا موقعہ دیکر اپنی راہ لیتے ہیں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

علی الصباح چو مردم بکار و بار روند
بلا کشان محبت بکوئے یار روند

شہزادے نے دل میں جو ٹھانی تھی اُسی منصوبہ پر صبح سویرے، مُنھ اندھیرے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور گڑریوں کا جامہ اختیار کرکے پڑا پھرتا اُسی چراگاہ میں پہنچا اور جنگل کے گلہ بانوں سے جا ملا۔

نکتہ شناس ناظرین اس بات کو تو خوب سمجھ گئے ہونگے کہ بوہیمیا کا شاہزادہ جسکی نگاہِ ناز کا گھائل ہوا ہے وہ (پیاری، پرڈیٹا) سسلی کی شاہزادی ہے، جو حسب معمول اپنے فرضی باپ گڑریے کے ساتھ چراگاہ میں گلہ کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔

بہرحال اس واقعہ کے بعد سے شاہزادہ کا روزانہ معمول تھا کہ صبح اُٹھکے گڑریوں کا بھیس بدلتا چراگاہ میں پہنچا اور شاہزادی سے مزے مزے کی باتیں کرکے دل بہلاتا اور گھنٹے دو گھنٹے کے بعد پھر محل میں آجاتا۔

رفتہ رفتہ بے پتہ و نشان اس طرح شاہزادے کے روز غائب ہوجانیکی خبر بادشاہ کو لگی جاسوسوں کے ذریعہ سے بادشاہ نے اس کا سراغ لیا، اور ایک روز خود معہ کیلو کے بہ تبدیل وضع و شکل گڑریے کے جھونپڑے میں جا موجود ہوا۔ یہاں ایک جشن برپا تھا۔ پوچھنے سے معلوم ہوا کہ کسی تیوہار کا دن ہونے کی وجہ سے اہل برادری کی دعوت دی گئی ہے۔ لوگ آ جا رہے ہیں۔ ہر شخص اپنے رنگ میں ایسا مگن ہو رہا ہے کہ اس پورے مجمع کے متعلق مسرت و شادمانی کا میلا کہنا بیجا نہیں۔ کوئی ناچ کود رہا ہے، کوئی ساتھیوں سے مذاق اور ٹھٹھول میں مصروف ہے۔ مگر ایسے متحرک مجمع میں دو حسن کی جیتی جاگتی تصویریں (شاہزادہ اور پرڈیٹا) الگ بیٹھی ہوئی مصروف راز و نیاز ہیں۔ اپنی صحبت میں اگرچہ یہ دو ہی متنفس تھے، مگر اس سارے متصادم المذاق مجمع سے زیادہ خوش اور فرحت و انبساط مجسم بن رہے تھے۔ اور باتوں میں ایسے محو تھے کہ اپنے

گرد و پیش کی اُنھیں اصلا خبر نہ تھی -

بادشاہ نے ان دونوں کو دیکھا اور تاڑ گیا کہ شاہزادے کو اسی حسن کی دیبی کا جوشِ پرستش کھینچ لاتا ہے -

صنعتِ کاملہ کے اس نمونے کو دیکھ کر ذرا دیر کے لیے بادشاہ کا دل بھی جوشِ بے اختیاری کا مغلوب ہو گیا - (باقی) سید سخاوت حسین (حیدرآباد)

افسردہ دل

ہاں اے دلِ افسردہ ترے سوز کے صدقے　　اس خامشی و ضبطِ غم اندوز کے صدقے
پہلی سی غضب تجھ میں وہ باتیں نہیں باقی　　الفت کی محبت کی وہ گھاتیں نہیں باقی
کچھ ایسا تو افسردہ ہے کچھ ایسا حزیں ہے　　شک ہوتا ہے پہلو میں مرے ہے کہ نہیں ہے
خنداں تھا شگفتہ تھا کبھی گُل کی طرح تو　　رہ رہ کے چہکتا بھی تھا بلبل کی طرح تو
چلتے ہوے فقروں کا ترے رنگ ظرافت　　زاہد سے نہ شوخی ہے نہ واعظ سے شرارت
نفرت ہوئی اس درجہ تجھے اہلِ جہاں سے　　باقی نہ رہا لطف ذرا بزمِ بتاں سے
آتا ہے کبھی لب پہ تو بس ایک ترانہ　　بے مہریِ عالم کا سُناتا ہے فسانہ
پھر بھی تو ہر اک طرح سے ہمراز ہے میرا　　ہمدرد ہے ہمدم ہے تو دمساز ہے میرا
دنیا کے علائق سے غرض خوب چھڑایا　　جلوت سے اُٹھا کر مجھے خلوت میں بٹھایا

احباب! مبارک ہو تمھیں بزمِ طرب خیز　　باسط سے بپئے عذر سنو شعرِ دل آویز

"در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را"

باسط - بسوانی

غزل

از جناب سید محمد ہادی صاحب ہادی

تڑپتے ہیں ہزاروں قطرہ ہائے اشک داماں میں
اثر شورِ قیامت کا ہے بیتابیٔ ہر اک ارماں میں

اگر اظہار ہو مطلوب زخمِ دل کی لذت کا
زبانیں سیکڑوں پیدا ابھی ہو جائیں پیکاں میں

نہیں معلوم کیا ہو دل کی حالت یہ غنیمت ہے
الجھ جاتی ہے خود وحشت مرے تارِ گریباں میں

نتیجہ اس کا اطمینان سے ہے آغوشِ مدفن کا
تسلی کا بھی پہلو ہے ترے جورِ فراواں میں

مداوائے دمِ وحشت بات دیوانے کی باقی ہو
ابھی کچھ دھجیاں باقی ہیں وحشت کے گریباں میں

کسی کے روئے رنگیں کا تصور ہائے کیا شے ہے
بہارِ خلد حاصل ہے مرے دل کو بیاباں میں

بہار آتے ہی پھر جوشِ جنوں نے پاؤں پھیلائے
تعجب کیا ہے چل جائے اگر دست و گریباں میں

دلِ آتش فشاں میں جمع لاکھوں آرزوئیں ہیں
الٰہی آگ لگ جائے نہ اس الفت کے ساماں میں

جفا کے تیری شاہد ہونگے دھبے اشکِ خونیں کے
انھیں پالا ہے ہم نے اس لیے آغوشِ داماں میں

نظر آتی نہیں دل میں کہیں امید کی صورت
تری الفت کا گھر ہم نے بنایا ہے بیاباں میں

خدا کے واسطے آزاد کر دو قیدِ ہستی سے
ہمارا کام بنتا ہے تمھارے ایک احساں میں

حقیقت قطرہ ہائے اشک کی ہم سے کوئی پوچھے
لیے پھرتے ہیں اس دولت کو ہم آغوشِ مژگاں میں

بھلا رنج و خوشی کا ساتھ کیا یہ ماجرا کیا ہے
ہوئے جاتے ہیں پیدا خارِ حسرت قلبِ شاداں میں

فنا ہو کر بھی اسکے چاہنے والے نہیں مرتے
محبت کی رہیگی روح میرے جسمِ بے جاں میں

ہمارے نالوں کی اشک شوئی کس طرح کر دی
ہمیں تسکین کا پہلو ملا خارِ بیاباں میں

دلِ سوزاں سے شعلے آگ کے ہر دم نکلتے ہیں
یہی ہے روشنی گھر کی شبِ تاریکِ ہجراں میں

غمِ ہجراں نہیں یہ جو قیامت کا نمونہ ہے
اسی کا کچھ اثر ہے نالہائے عندلیباں میں

پسِ مردن بھی شوقِ بادہ نوشی کی یہ حالت ہے
ہماری روح رہتی ہے دکانِ مے فروشاں میں

سمجھ میں تیری زاہد راز یہ آ ہی نہیں سکتا
خدا جانے وہ کافر کیا ہے میری چشمِ حیراں میں

بتاؤں کیا حقیقت آتشِ فرقت کی اے ہمدم
تمنا ہو گئی ہے خاک جل کر قلبِ سوزاں میں

سرشکِ گرم میرے دونوں عالم کو جلا دیتے
دبا رکھا ہے لیکن میں نے انکو چشمِ حیراں میں

تعجب کچھ نہیں ہادی جو برپا حشر ہو جائے
حقیقت صور کی پیدا ہے میرے شورِ افغاں میں

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

ہندوستان بھر میں تعلیم کا شور و غل مچا ہوا تھا، لیکن ایک حیدرآباد ایسا خطہ تھا جو اپنی پرانی وضع نبھائے چلا آتا تھا۔ اُسے حرکت اور جد و جہد سرے سے پسند نہ تھی بلکہ اکثر امور میں وہ تامل و توقف، صبر و انتظار کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ اسکی حالت اُس بڈھے اژدہے کی سی تھی جو اپنے شکار کے لیے حرکت کرنا نہیں چاہتا، بلکہ یہ چاہتا ہے کہ شکار خود پڑے پڑے اُسکے پاس آجائے۔ لیکن نہایت خوشی کا مقام ہے کہ اس اژدہے نے بھی حرکت کی، اسمیں بھی حس پیدا ہوئی۔ زمانہ کے اثر سے بچنا ممکن نہ تھا۔ آس پاس کے حالات نے، ضروریات نے، زمانے اور خاص کر اپنی پست حالت نے بعض ہمدردانِ ملک کو چونکایا، اُنھوں نے کمر ہمت باندھی اور اپنی سب سے شدید ضرورت کے پورا کرنے کے لیے کھڑے ہوے۔ جس کا نتیجہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس ہے۔ اسپر ارکان کانفرنس اور سکرٹری اور پریزیڈنٹ کو جس قدر مبارکباد دی جائے کم ہے۔ اور اس موقعہ پر جس قدر مسرت اور خوشی کی جائے بجا ہے۔ یہ گویا حیدرآباد میں نیا دور شروع ہُوا ہے۔ اور اس کانفرنس کا قیام آیندہ بہبودی کا پتہ دیتا ہے اور یقین ہوتا ہے کہ جو بیج آج بویا گیا ہے، اگر ہمدرد ہاتھوں نے اُسکی آبیاری کی تو تھوڑے ہی عرصہ میں وہ ایک سرسبز لہلہاتا ہُوا کھیت نظر آئے گا۔

اہل کانفرنس کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اُنھیں مسٹر حیدری (ہوم سکرٹری دولت آصفیہ) جیسا ہمدرد، صاحب علم اور قدردانِ علم پریزیڈنٹ ملا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر مسٹر حیدری کی ہمدردی شاملِ حال نہ ہوتی تو نہ تو کانفرنس کو اس قدر کامیابی ہوتی اور نہ شاید اسکا وجود اب تک ظہور میں آتا۔ اور کانفرنس کو اپنے پہلے اجلاس کے لیے اس سے بہتر پریزیڈنٹ ملنا ممکن نہ تھا۔

اعلیٰحضرت حضور پرنور خلد اللہ ملکہٗ کا شکریہ ادا کرنا بھی لازم ہے کہ اعلیٰحضرت نے بکمال خوشی اس کانفرنس کے انعقاد کی اجازت دی اور اسکے اجلاسوں کے لیے جدید ٹاؤن ہال کا وسیع اور

خوب صورت ہال عنایت فرمایا اور اضلاع کے ملازمین و عہدہ داروں کے لیے یہ رعایت فرمائی کہ شرکت کانفرنس کے ایام رخصت میں شمار نہ ہونگے۔ اعلیٰحضرت کی سرپرستی نے اسے چار چاند لگا دیے۔

مسٹر حیدری کا افتتاحی ایڈریس نہایت فصیح پُراثر اور پُرمغز تھا۔ تمام حاضرین جو ایک ہزار سے زائد تھے ہمہ تن گوش بنے ہوئے سُن رہے تھے البتہ وقتاً فوقتاً نعرہائے تحسین اور صدائے چیرز سے یہ سکوت ٹوٹ جاتا تھا۔

فاضل صدر مجلس نے اپنے ایڈریس میں سب سے اول اس خوں خوار و خون ریز جنگ کا ذکر کیا جو آج کل یورپ میں ہو رہی ہے اور جس سے ایک عالم میں ماتم برپا ہے۔ اور فرمایا گھٹا تاریکی میں صرف ایک جھلک نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ہم نے بحیثیتِ رعایا اپنا فرض بکمال خوبی ادا کیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اعلیٰحضرت واقدس نے اپنا حق دوستی پورا کیا۔ اسکے بعد اُنھوں نے محب قوم مسٹر گوکھلے، مولانا شبلی، اور مولانا حالی اور ڈاکٹر اگھورناتھ کی وفات پر اپنے دلی رنج و الم کا اظہار کیا۔ ان بزرگوں نے اپنی زندگی میں حب وطن اور ایثار کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے جو ہم سب کے لیے قابل تقلید ہے۔

اسکے بعد صدر مجلس نے حیدرآباد کی تعلیمی حالت اور اسکی پستی کے اسباب پر بڑی دلچسپ بحث کی۔ درحقیقت یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ تمام ریاست میں لکھے پڑھوں کی تعداد فیصدی ۲،۲ ہے۔ اور جب اس کا مقابلہ قرب و جوار کی ریاستوں اور برٹش انڈیا کے صوبوں سے کیا جاتا ہے تو بہت شرمناک معلوم ہوتی ہے۔ البتہ علوم مشرقیہ کی تعلیم پر جس کا جدید انتظام حال ہی میں ہُوا ہے اپنا اطمینان ظاہر کیا ہے۔ جس میں یہ خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ علوم کی تعلیم اُردو زبان زبان میں ہو اور انگریزی بطور زبان دوم کے سکھائی جائے۔ اس مسئلہ پر بڑی پر لطف بحث کی اور بہ دلائل اس امر کو ثابت کیا کہ ابتدائی تعلیم اور خاصکر علوم کو انگریزی زبان میں پڑھانے سے دماغ پر بڑا بار اور بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور جدت طبع اور رسائی ذہن ایک حد تک معطل ہو جاتی ہے۔ علاوہ اسکے نری انگریزی تعلیم اور خالص مشرقی تعلیم الگ الگ ہمارے لیے مضر ہے۔ ایک ہیں مُلک دوسرے

بیگانہ کر دیتی ہے اور دوسری ہمیں جدید علم و روشنی سے محروم رکھتی ہے اس لیے دونوں کو سمو کر نیا نصاب تعلیم تیار کیا جائے اور یہی صحیح طریقہ ہماری علمی ترقی کا ہے۔

اُردو زبان کی اشاعت اور ترقی اور اسکی ضرورت پر صدر مجلس نے نہایت عمدہ تقریر کی اور ثابت کیا کہ ہندوستان کے مختلف الاقوام اور مختلف المذاہب لوگوں کے لیے یہ زبان مشترک ہے اور باہم اتفاق و اتحاد کے ترقی دینے کی بہت بڑی معاون ہے۔ خصوصاً حیدرآباد میں جہاں سرکاری اور دفتری زبان اُردو ہے۔

اس کے بعد ابتدائی تعلیم، تعلیم نسواں، مُلکی حرفت وصنعت اور فنون لطیفہ پر خاص توجہ کرنے کی بڑی تاکید کی اور ان تمام مسائل پر پُر زور بحث فرمائی۔ آخر میں فاضل صدر مجلس نے چند بیش بہا نصیحتیں کیں جو نہ صرف اہل حیدرآباد بلکہ تمام اہل ہند کو یاد رکھنی چاہئیں۔ اور وہ خود اُنھیں کے فصیح اور پُر اثر الفاظ میں پڑھنے کے قابل ہیں۔

ابتدائی تعلیم اور تعلیم نسواں کی اشاعت اور ترقی کے متعلق رزولیوشن پیش ہوئے۔ تعلیم نسواں پر مسز سروجنی نائڈو نے بہت فصیح اور عمدہ تقریر کی۔ بعض رزولیوشن بہت اہم اور مفید منظور ہوئے، جن میں سے ایک یہ تھا کہ سرکار سے درخواست کی جائے کہ وہ ایک کمیٹی اس امر کی تحقیقات کے لیے مقرر کرے کہ کیا وجہ ہے کہ ریاست حیدرآباد کے طالب علم بمبئی، پنجاب اور الہ آباد کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں۔ اور ممالک محروسہ سرکار عالی سے باہر مثلاً علی گڑھ، آگرہ، پونا، لاہور، بمبئی کے مدارس میں تعلیم پاتے ہیں اور یہاں کے امتحانات میٹرک یا اسکول لیونگ سرٹیفکٹ میں شریک نہیں ہوتے۔ اس رزولیوشن کو مسٹر ولنگر ایم اے ایل ایل بی چیف انسپکٹر مدارس نے پیش کیا۔ یہ امر بیشک قابل غور ہے۔ اور اس سے یہاں ہائی اسکولوں کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے اصل یہ ہے کہ ممالک محروسہ کے امتحانات یونیورسٹی کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے ہے اور ابتدا سے غلطی ہوئی۔ مدراس یونیورسٹی بہت مشکل اور ترقی یافتہ ہے حالانکہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں تعلیم کی [illegible] ہے، اس سے ایک ایسی یونیورسٹی سے الحاق کرنے کا یہی نتیجہ ہوگا۔ یہ بہت اچھی تجویز ہے کہ بذریعہ کمیٹی

اسکی تحقیق کی جائے ۔ لوگوں پر اسکا بڑا اثر ہوا کہ مسٹر ولنکر نے اُردو میں تقریر کی ۔

ایک اور رزولیوشن اُردو زبان کی اشاعت و ترقی اور علمی تصانیف و تالیفات کے متعلق تھا اور اس میں سرکار سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ سررشتۂ علوم و فنون جو پہلے قائم کیا تھا اور جسپر بارہ ہزار روپیہ سالانہ خرچ ہوتا تھا، وہ رقم اب اُردو میں علمی تصانیف کے لیے منظور کی جائے ۔ یہ رزولیوشن مولوی عبدالحق بی اے مہتمم تعلیمات حلقۂ اورنگ آباد نے پیش کیا اور اُردو زبان کی اشاعت و ترقی کی ضرورت پر تقریر کی اور اس امر کو ثابت کیا کہ اس ملک کی علمی ترقی کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اُردو زبان کو علوم سے مالا مال کیا جائے ۔ جو لوگ غیر زبانوں کو سیکھتے ہیں یا غیر زبانوں کے ذریعہ علوم حاصل کرتے ہیں اُنکے پیش نظر ہمیشہ یہ بات رہنی چاہیے کہ اس سے مقصود ملک کی خدمت اور اپنی زبان کی ترقی ہے ۔

ایک دوسرا رزولیوشن اس مضمون کا پیش ہوا کہ اب اسسٹنٹ سرجن جماعتوں کی تعلیم طبی اُردو زبان کے ذریعے سے ہو ۔ اسکی مخالفت نواب خدیو جنگ بہادر نائب ناظم سررشتۂ طبابت سرکار عالی نے بڑی قابلیت سے کی اور اُن دقتوں کا اظہار کیا جو اُردو زبان کے ذریعہ سے طبی تعلیم میں پیش آئیں گی اُن کا خیال تھا کہ اول تو اُردو زبان میں جدید فن طب پر کتابیں نہیں اور اس لیے تعلیم ممکن نہیں ۔ دوسرے جو لوگ اُردو میں یہ فن حاصل کریں گے وہ اپنے علم کو بڑھا نہیں سکتے ۔ لیکن کثرت رائے سے رزولیوشن پاس ہوگیا ۔ اس موقعہ پر اس امر کا بیان کرنا فائدہ اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حال ہی میں بنگالی علم ادب کی اکاڈیمی کی طرف سے ایک یہ تحریک بنگال گورنمنٹ کے سامنے پیش کی گئی ہے کہ اس صوبہ کے طبی مدارس میں اس فن کی تعلیم بنگالی زبان کے ذریعہ سے دی جائے اور امتحانات بھی اسی زبان میں ہوا کریں ۔ آجکل وہاں صرف عورتوں کے لیے یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ تمام مضامین میں سوالات کے جوابات بنگالی زبان میں دے سکتی ہیں ۔ لیکن مرد صرف کیمسٹری اور زوالوجی میں ایسا کرسکتے ہیں ۔ جب عورتوں کے لیے یہ رعایت ہے تو مردوں کے ساتھ ہوسکتی ہے معلوم ہوا کہ زبان سدراہ نہیں ہے ۔ اور جب بنگالی میں یہ ممکن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُردو میں

ایسا نہ ہو سکے ۔ طب کی تحصیل سے مراد انگریزی سیکھنا نہیں بلکہ علم سیکھنا ہے اور علم کے لیے کسی زبان کی خصوصیت نہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ اسوقت ہماری زبانیں اسکی متحمل نہیں ۔ لیکن آخر وہ زمانہ کب آئے گا کہ ہم اپنی زبان میں علوم سیکھ سکیں اور اس لیے اسکی ابتدا ابھی سے ہونی چاہیے ۔

ایک اور رزولیوشن جو تعلیمی ترقی کے لیے نہایت ضروری تھا پیش کیا گیا ۔ اسکا مقصد یہ تھا کہ ایک وظائف فنڈ قائم کیا جائے اور نادار اور ہونہار طالب علموں کو وظیفے دیکر اُنکی اعلیٰ تعلیم کی کوشش کی جائے ۔ اس رزولیوشن کو مولوی عبدالحق بی اے مہتمم تعلیمات حلقۂ اورنگ آباد نے پیش کیا اور اسکی شدید ضرورت پر ایک موثر تقریر کی ۔ جلسہ میں اُسی وقت بعض اصحاب نے چندے دینے شروع کیے ۔ تقریباً چار ہزار روپے اُسی وقت ہو گئے ۔ بعض حضرات نے ماہانہ رقمیں دینے کا وعدہ کیا ۔ ان میں سے بعض چندے خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ مسٹر حیدری نے (اگرچہ اُنھوں نے جلسے میں اپنا نام ظاہر نہیں کیا) پچیس روپیہ ماہانہ چندہ اس فنڈ میں دینا منظور کیا اور مسٹر الما لطیفی ناظم تعلیمات سررشتۂ تعلیمات سرکار عالی نے ڈیڑھ ہزار روپیہ عنایت فرمایا ۔ اور استقبالی کمیٹی کے پریزیڈنٹ مولوی فیض الدین صاحب وکیل ہائی کورٹ نے ایک ہزار روپیہ ۔

یہ تمام رزولیوشن بغلبۂ آرا پاس ہوے ۔ اگرچہ کانفرنس کا یہ پہلا اجلاس تھا لیکن بڑی کامیابی کے ساتھ انجام پایا جو درحقیقت نہایت مسرت کی بات ہے ۔ اس کامیابی کا سہرا زیادہ تر جناب مسٹر حیدری پریزیڈنٹ کانفرنس اور مستعد سکرٹری مولوی محمد مرتضیٰ صاحب دیگر ارکان کانفرنس کے سر رہا ۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ کانفرنس مُلک کے حق میں مفید ثابت ہوگی اور آیندہ اسکے اجلاس ملک کے مختلف شہروں میں منعقد کیے جائیں گے ۔ کیونکہ بلدہ سے کہیں زیادہ ضرورت اضلاع کو ہے اور اس لیے ان خیالات کی اشاعت بلدہ سے باہر زیادہ ضروری ہے ۔ نیز ہمیں یقین ہے کہ جو رزولیوشن کانفرنس کے اجلاس میں پاس ہوے ہیں وہ صرف کاغذ ہی پر نہ رہیں گے بلکہ اُن کو عملی صورت میں لانے کی کوشش کی جائے گی ۔ اور سب سے زیادہ جو شخص اس میں مدد دے سکتا اور جس پر ہر پھر کر ہماری نظر پڑتی ہے وہ مسٹر حیدری ہیں ۔ اسوقت دولتِ آصفیہ میں کوئی عہدہ دار

ان سے بڑھ کر ہمدرد اور تعلیم میں دلچسپی لینے والا نہیں۔ اگر ارکان کانفرنس نے ایسی ہی مستعدی سے کام لیا تو سب سے زیادہ امداد انھیں مسٹر حیدری سے ملے گی۔

پریزیڈنٹ کی آخری تقریر اگرچہ مختصر تھی لیکن بہت برمحل اور موثر تھی۔ اسکے بعد مولوی عبدالحق نے کانفرنس کی طرف سے پریزیڈنٹ کا شکریہ ادا کیا اور مسٹر حیدری کے لیے تمام حاضرین نے بڑے جوش سے تین چیرز دیے۔

اسکے بعد وظائف فنڈ کی امداد میں مختصر سی منی ریڈنگ ہوئی۔ اسکے بعد پریزیڈنٹ اور خاص خاص حضرات کا فوٹو لیا گیا۔

آخر میں مسٹر حیدری نے ارکان کانفرنس کو ایٹ ہوم دیا اور کانفرنس خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہو گئی۔

"ع"

غزل

دشت میں ناقۂ لیلیٰ کا گزر ہو جانا — اور بھی قیس کا ہے خاک بسر ہو جانا
حشر کیا چیز ہے۔ اُس حسن کے جلوہ کیلیے — ایک ہنگامۂ اربابِ نظر ہو جانا
دیکھ اے اشک نہ آنکھوں میں ٹھہرنے والے — سیپ میں قطرۂ نیساں کا گہر ہو جانا
اپنے نالوں سے پشیماں ہوں کسی کے آگے — اِنکو لازم نہ تھا ممنونِ اثر ہو جانا
میری بیداد طلبی نے مجھے مرنے نہ دیا — ورنہ آساں تھا شبِ غم کی سحر ہو جانا
میری گم گشتگیِ دل کی خبر دیتا ہے — ناوکِ ناز کا پیوستِ جگر ہو جانا

رنج دشمن بھی گوارا نہیں مجھکو ارشد
دل کا دُکھنا اُدھر اور درد اِدھر ہو جانا

ارشد تھانوی

نظرے خوش گزرے

خدا جنت نصیب کرے سید احمد خاں مرحوم کو اس ملک کے پامال و زوال پذیر مسلمانوں میں تعلیم دنیاوی کی اشاعت و ترویج کے لیے جو مساعی جمیلہ اور مخلصانہ کوشش اُنھوں نے کیں وہ ہر روز برگ و بار لا رہی ہیں۔ ہندوستان کے وہ خطہ ہائے منجمد بھی، جہاں زمانہ کی آفتاب سا تمازت سے کسی اثر کا نمودار ہونا مستبعد خیال کیا جاتا تھا، مرحوم کی تعلیمی تحریک سے بے بہرہ نہ رہے اور جلد یا دیر ہر زمین میں اُنکے بوئے ہوئے تخم نے سر نکالا اور آثار بتا رہے ہیں کہ تعلیمی حیثیت سے چند ہی روز میں ان مقامات پر لہلہاتی ہوئی کھیتیاں تیار ہو جائیں گی۔

سر سید مرحوم نے اپنی تعلیمی تحریک کو جب عام طور پر ملک میں شایع کرنا شروع کیا اور اس صوبہ سے باہر قدم نکالے تو سب سے پہلے جو زبردست اور فیاض ہاتھ اُنکی اعانت و امداد اور اس تحریک قومی کی پشت پناہی اور سرپرستی کے لیے بڑھا وہ نواب مختار الملک بہادر سر سالار جنگ اول مدار المہام ریاست حیدر آباد کا ہاتھ تھا جنھوں نے اپنی ژرف نگاہی اور بلند نظری سے اُنکے تجویز نسخہ کے تیر بہدف ہونے کا اندازہ کر کے بڑے حوصلہ اور فیاضی کے ساتھ اُنکے تعلیمی مشن کو لبیک کہا اور ریاست حیدر آباد کی طرف سے اور نیز اپنی جاگیر ذاتی سے علیگڑھ کالج کے لیے جو آیندہ مسلم یونیورسٹی کی صورت میں مسلمانوں کا ایک عظیم الشان تعلیمی مرکز ہونیوالا ہے گراں قدر رقمیں مقرر کیں۔

اگر دکن کی سرزمین پنجاب کی طرح سیراب ہوتی اور وہاں کے ارباب ہمت اُسی زمانہ میں اپنے ملک کی تعلیم کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتے تو اس میں شبہہ نہیں ہے کہ آج علم کا آفتاب دولت آصفیہ کی حدود میں نصف النہار پر نظر آتا۔ لیکن افسوس ہے کہ بہت سا قیمتی وقت فرصت خواب غفلت کی نذر ہو گیا اور جیسا چاہیے تھا اس تحریک سے اُس سرزمین کو فائدہ نہ پہنچا۔ بارے، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ انجام کار دکن کے چند ذی ہوش اور باہمت اصحاب کو اپنے ملک کی تعلیمی پستی کا پورے طور پر احساس ہوا اور اُسکی وجہ سے جو عظیم الشان نقصانات اہل ملک کو پہنچے۔ پہنچ رہے اور پہنچ سکتے ہیں اُنپر نظر

کرکے اُن حضرات نے اُسی مرکّب کیمیا صفت کو تیار کرنے کی جدوجہد کی جسکی بدولت سرسید احمد خاں مرحوم نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم دنیاوی کے نشر و اشاعت کی تحریک عام کردی یعنی آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نمونہ پر وہاں بھی ایک بزم تعلیمی قائم کی گئی ہے جس میں مختلف اضلاعِ ریاست کے با اثر، ذی فہم اور بالغ نظر اصحاب شریک ہو کر اہل ملک کی ضرورتوں اور مناسبتوں پر لحاظ کرکے مسائلِ تعلیمی کا تصفیہ کیا کریں گے۔ اس کانفرنس کا پہلا اجلاس یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو مسٹر اے حیدری بی اے ہوم سکرٹری کے زیر صدارت، محبوب ٹاؤن ہال باغ عامہ (بلدۂ حیدرآباد دکن) میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا۔ اجلاس کی کارروائی ہمارے ایک عزیز دوست نے جو اس جلسہ میں شریک تھے قلمبند کرکے ارسال فرمائی ہے جو اسی پرچہ میں نہایت دلی مسرت اور شکرگزاری کے ساتھ شایع کی جاتی ہے۔ اس مختصر کارروائی کے ملاحظہ سے ناظرین کو کسی قدر اس بات کا اندازہ کرنے کا موقع ملے گا کہ اگر اعلیٰحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کی گورنمنٹ نے اسی طرح آیندہ بھی اس بزم تعلیمی پر اپنی نظر عنایت مبذول رکھی اور ذمہ دار اعلیٰ عہدہ دارانِ تعلیم نے کانفرنس کو پوری امداد دی تو وہ دن دُور نہیں کہ حیدرآباد کی تعلیمی مشکل آسان ہو جائے گی اور سارے مُلک میں اس سرے سے اُس سرے تک علوم و فنون کی ندیاں اسی چشمہ سے نکلکر جاری ہو جائیں گی جن کے باعث اہل مُلک کے دل و دماغ روشن و منور ہو کر آیندہ نسلوں کی ترقی و بہبود میں مصروف کار ہو سکیں گے۔

مسٹر حیدری اور مسٹر اما لطیفی جنکے ہاتھ میں اسوقت اہل دکن کی تعلیمی باگ خداوندتعالیٰ نے دے رکھی ہے دونوں نہایت روشن خیال، علم دوست، فہمیدہ اور ضروریاتِ زمانہ سے پورے طور پر واقف ہیں اس لیے ہمیں یقین واثق ہے کہ ان حضرات کی توجہ سے کانفرنس کو بڑی امداد ملیگی اور اسکو کامیاب بنانے میں انکی روشن ضمیری کا بڑا حصہ ہوگا۔

مولوی سید مرتضیٰ جو کانفرنس کے سکرٹری اور رُوحِ رواں ہیں ہماری خاص ستایش و توصیف کے مستحق ہیں کہ ایسے نوجوان افراد قوم میں خال خال نظر آتے ہیں جو ملکی مفاد اور قومی

بہبود کے لیے دوربینی اور تامل اندیشی کے ساتھ اپنی فرصت کے قیمتی اوقات صرف کرکے ایسے مثبت نتائج حاصل کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں اور ہمیں امید کامل ہے کہ ارباب ملک ایسے صاحب فکر اولو العزم نوجوان کے مساعی جمیلہ اور کوشش ہائے حسنہ کی پوری قدر کریں گے اور جس حقیقی عزت کے وہ محض اپنے کام کی وجہ سے مستحق و سزاوار ہیں اُس سے دریغ نہ کریں گے۔

صاحب صدر کی مطبوعہ تقریر ہمارے پاس پہنچ گئی ہے اور انشاء اللہ آئندہ پرچہ میں ہم اُسے تمام درج کرینگے۔ لیکن اس موقعہ پر اس بات پر اظہار مسرت کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مسٹر حیدری اگرچہ ایسے صوبہ کے باشندے ہیں جہاں کے بسنے والوں کی مادری زبان اردو نہیں ہے اور معاشرت و تعلیم انگریزی کی وجہ سے انھیں آسانی بھی اسی میں معلوم ہونا چاہیے تھی کہ وہ اپنے خطبہ صدارت کو انگریزی زبان میں ادا کریں لیکن حاضرین جلسہ کے دلی رجحان اور ریاست کی دفتری زبان کے پاس خاطر سے صاحب موصوف نے اپنی آسانی سے قطع نظر کرکے اپنی تقریر صدارت اردو زبان میں پڑھی۔ کاش کہ پنجاب و صوبجات متحدہ کے وہ نامور اور معزز اصحاب جو ہماری مجالس تعلیمی میں ہمیشہ انگریزی زبان میں اپنی صدارتی تقریریں پڑھنا ہی ضروری جانتے ہیں۔ دولت آصفیہ کے اس ممتاز رکن کے اعلیٰ تدبر اور روشن خیالی سے سبق حاصل کریں۔ حکمراں جماعت کے اعلیٰ افراد کے ملاحظہ کے لیے انگریزی میں ترجمہ کرا دینا کافی ہے جیسا کہ اس موقعہ پر مسٹر حیدری نے غالباً کیا ہوگا۔

گزشتہ اکتوبر میں ہمارے برادر معظم مسٹر ظفر علی خاں بی اے مالک و اڈیٹر زمیندار جبکہ انگلستان سے وطن آئے ہوئے انھیں صرف ایک مہینہ گزرا تھا گورنمنٹ کے ایک نئے قانون کے بموجب جو اس جنگ کے اوائل میں ممالک غیر سے آنیوالوں کی نگہداشت کے لیے جاری کیا گیا تھا، اپنے وطن کرم آباد میں مقیم رہنے اور پبلک اخبارات سے مطلقاً بے تعلقی اختیار کرنے پر مجبور کیے گئے تھے۔ اب اسی قانون کے تحت میں جو مزید دفعات قانونی صوبہ پنجاب کی مجلس آئین و قوانین نے اضافہ کی ہیں اُنکی رو سے برادر موصوف سے اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ وہ حدود معینہ سے باہر نہ جائینگے دس ہزار کی ضمانت طلب کی گئی ہے۔ جس سے متاثر ہو کر اُنھوں نے حسب ذیل اعلان کے ذریعہ سے اخبار زمیندار کے مالکانہ حقوق

سے دست کشی اختیار کی ہے۔

اعلان۔ اخبار زمیندار ... اور اسکے کُل تعلقات کے حقوق ملکیت سے میں آج کے دن برضا و رغبت و ثبات ہوش و حواس ... بی بی برکت بیگم کے حق میں دستکش ہوتا ہوں اور ان حقوق کو برکت بیگم کے نام ہبہ کرتا ہوں ... آج سے اسکے سیاہ و سفید کی مختار اور اسکی آمد و خرچ کی ذمہ دار ہیں۔ ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۱۴ء سے بلکہ میرا اور اس اخبار کا ایڈیٹوریل تعلق منقطع ہوا تھا آج سے میرا اور اس اخبار کا مالکانہ تعلق میری مرضی سے قطع ہوتا ہے اور میں آج تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوتا ہوں فقط

کرم آباد ظفر علی خاں ۱۸ مارچ سنہ ۱۵ء

یہ واقعہ چونکہ نتیجہ ہے بعض سیاسی پیچیدگیوں کا۔ اس لیے ہم اسکے متعلق کوئی رائے ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتے البتہ اپنا اخبار نویس کی حیثیت سے اور نیز ذاتی تعلقات برادرانہ کی بنا پر ناممکن ہے کہ اس مصیبت میں اپنے عزیز بھائی کے ساتھ اظہار ہمدردی نہ کریں اور اس بات کے لیے بارگاہ حضرت ذوالجلال میں نہایت عاجزی و الحاح کے ساتھ دعا نہ کریں کہ برادر موصوف کو اس سخت ابتلا کے عالم میں ثبات و استقلال کی توفیق عطا ہو۔ آمین

ایسٹر کی تعطیل سر پر آگئی ہے۔ مجالس قومی کے سالانہ میلے جگہ جگہ منعقد ہونے والے ہیں۔ ہمارے شہر میں بھی ندوۃ العلما کا سالانہ جلسہ کا انعقاد ہوگا۔ اور بعض اسباب کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں کا دنگل زیادہ پر شور اور عبرت انگیز ثابت ہوگا۔ مولانا شبلی اگرچہ ندوہ پر تسلط جمانے کی آرزو لیے ہوئے تہ خاک دفن ہو چکے ہیں لیکن فساد کا تخم اُن کے ساتھ فنا ہونے والا نہ تھا۔ اُنکے جو اراکین مقامی انجمن اصلاح (افساد؟) کی آڑ میں ندوہ پر قابو پانے کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ اور سُنا گیا ہے کہ مولوی غلام محی الدین آزاد المعروف بہ ابوالکلام جنھیں گورنمنٹ بنگال نے پریس ایکٹ کے ذریعہ سے اخباری ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا ہے ان سب کے سرغنہ بنکر مولوی صاحبان سے دست گریباں ہونے والے ہیں۔ اللھم احفظنا۔

الناظر

نمبر ۱۷ جلد ۱۲ — یکم مئی ۱۹۱۵ء

النّاظر

نمبر ۶ جلد ۱۲ — یکم مئی ۱۹۱۵ء

خطبۂ افتتاحیہ مجلس تعلیمی حیدرآباد دکن

(از جناب مسٹر اکبر نذر علی حیدری بی اے۔ معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامۂ دولتِ آصفیہ)

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے معزز صدر نشین صاحب کی تقریر حسب ذیل درج ذیل کیجاتی ہے۔ تقریر کے محاسن پر کسی وضاحت سے بحث کیے بغیر ہم مسٹر حیدری کو دلی مبارکباد دیتے ہیں کہ باوجود اُس گہرے تعلق کے جو بلحاظ اپنے عہدے کے سرکاری محکمۂ تعلیم سے انکو حاصل ہے اُنھوں نے مختلف امور تعلیمی کے بارے میں اپنے خیالات بڑی صفائی اور آزادی سے ظاہر فرمائے اور اہلِ مُلک کی تمام ضرورتوں اور سچی خواہشوں کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا۔ خدا سب صدر نشینوں کو اسکی توفیق دے۔ آمین۔

حضرات! یہ بہت نازک اور پُرخطر وقت ہے۔ یورپ میں ایک خونخوار اور خونریز جنگ ہو رہی ہے۔ جس سے ایک عالم میں ماتم بپا ہے۔ ہزاروں لاکھوں بندگان خدا بے وجہ و بےگناہ قتل کیے جا رہے ہیں اور ساری دنیا میں ایک تشویش اور ہنگامہ مچا ہُوا ہے۔ لیکن اس تاریکی میں صرف ایک جھلک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمنے بحیثیت رعایا کے اپنے فرض کو بکمال خوبی انجام دیا اور اس سے بڑھکر یہ کہ ہمارے آقائے ولی نعمت اعلیٰحضرت حضور انور خلد اللہ ملکہٗ نے اپنی پُرخلوص دوستی کا حق ادا کر دیا جو اُنھیں اپنے آبائے کرام سے ارثاً ملا ہے۔ ہمیں خدائے ذوالجلال پر پورا بھروسا ہے کہ وہ حق کا ساتھ

دیگا۔ اور جبر و استبداد کو پامال کریگا۔ اس لیے یہاں نہ بدامنی ہے اور نہ بے چینی۔ اور پورا اطمینان حاصل ہے۔ اور اس اطمینان کی ایک دلیل یہ ہے کہ ہم آج اس نیک کام کو شروع کرنیوالے ہیں اور اس تعلیمی مجلس کا آغاز کرنے کو ہیں جس سے ہمارے ملک کی فلاح اور ہماری امیدیں وابستہ ہیں اور ہم سب کو اعلیحضرت حضور پرنور خلد اللہ ملکہٗ کا تہ دل سے شکرگزار ہونا چاہیے کہ از رہ مراحم خسروانہ اس مجلس کے انعقاد کی منظوری عطا فرمائی۔

اسکے بعد میں اپنا دلی رنج و افسوس اس ملکی اور قومی صدمہ پر ظاہر کرتا ہوں جو اس سال ہندوستان کو محب قوم مسٹر گوکھلے، مولانا حالی اور مولانا شبلی و ڈاکٹر رگھوناتھ کی وفات سے پہنچا ہے میرا یہ اظہار رنج محض رسمی بحیثیت میر مجلس کانفرنس کے نہیں ہے بلکہ درحقیقت میرا دل اس پرالم حادثہ سے پاش پاش ہے۔ مجھے تینوں بزرگوں کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ اور جب مجھے انکی وفات کا خیال آتا ہے تو میرا دل بھر آتا ہے اور بھرے جلسے میں کون ایسا ہے جسے ان محسنین ملک کی وفات پر حقیقی رنج و الم نہ ہو۔ کیا ہم اتنے بڑے ملک میں کسی ایک شخص کا نام بھی بتا سکتے ہیں جسنے اپنے ملک کی ایسی بے ریائی اس قدر خلوص اور ایثار نفس کے ساتھ خدمت کی ہو اور جس نے اپنے ملک کی خاطر اپنی جان و مال اور عزت سب کچھ قربان کر دیا ہو۔ مجھے مسٹر گوکھلے کے دوسرے خیالات سے بحث نہیں لیکن جو بے نظیر تعلیمی خدمت انھوں نے کی ہے اور جو ایثار و خلوص کا نمونہ انھوں نے پیش کیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ کیا ہم اپنی قوم میں مولانا حالی کی نظیر پیش کر سکتے ہیں جس نے اردو ادب میں ایسا انقلاب عظیم پیدا کیا ہو۔ جس کے پردرد نغموں نے اہل ملک کو خواب غفلت سے اس طرح جگایا ہو اور جس کی پاک سیرت اور اعلیٰ خصائل کا ایسا عجیب و غریب اثر ہوا ہو؟ کیا کوئی ہمیں اسوقت ڈاکٹر رگھوناتھ سے بڑھکر علم یا طالبعلموں کا سچا دوست بتا سکتا ہے۔ کیا اسوقت مولانا شبلی کی کوئی مثال ہمارے ملک میں موجود ہے جسنے اپنی ساری عمر علمی تحقیقات میں صرف کی ہو جس نے تاریخ اسلامی کا ایسا صحیح ذوق ملک میں پیدا کیا ہو اور جس نے آخر دم تک اسی علمی دھن میں اپنی عمر صرف کر دی ہو۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ان تینوں محبان وطن نے اپنی ہمت اور کوشش اور عمر کا بڑا حصہ تعلیم کی تشویق اور اشاعت میں صرف کیا

جو بنیاد ہے تمام ترقیوں اور بہبودیوں کی۔ یہ تینوں غریب خاندان کے تھے۔ عمر بھر غریب اور قلیل معاش رہے لیکن جو کام انھوں نے کیے ہیں اور جو عزت انھیں حاصل ہے کیا کوئی لکھ پتی اور کروڑ پتی اُس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو دنیا کا نمک اور عالم کی روشنی کہلاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو ملک کے فدائی اور قوم کے شیدائی ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جنکی زندگی قابل تقلید ہے۔ ہم سب کو انکی وفات کا رنج اور صدمہ ہے۔ لیکن ہماری سعادتمندی یہی ہے کہ ہم اُنکی پاک زندگی اور اُنکے خلوص اور ایثار سے سبق حاصل کریں۔

حضرات! میں آپ صاحبوں کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے اس تعلیمی مجلس کے قیام سے ملک پر ایسا بڑا احسان کیا ہے کہ جس کا شکریہ نہ صرف ہم بلکہ آیندہ نسلیں بھی ادا کرینگی۔ میری رائے میں اگر اس ملک کے لیے سب سے بہتر سب سے مفید اور سب سے اعلیٰ کوئی کام ہو سکتا ہے تو وہ ایک ایسی ہی تعلیمی مجلس ہے۔ اگرچہ یہ کام بہت پہلے شروع ہونا چاہیے تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ہمنے بہت دیر کی ہے، لیکن اس تاخیر کی تلافی ہم اپنی مستعدی۔ جفاکشی اور محنت سے کر سکتے ہیں۔ اور اگر یہ کام اسی جوش اور مستعدی کے ساتھ جاری رہا تو ہم دیکھیں گے کہ اسکے نتائج کیسے عمدہ اور اسکے اثرات کیسے بے بہا پیدا ہوں گے۔ مناسب تو یہ تھا کہ اس مجلس کی صدارت کے لیے کسی صاحب علم و فضل کا انتخاب کیا جاتا جو اس خدمت کو مجھ سے بہتر اور زیادہ خوبی کے ساتھ انجام دیتا۔ مجھے علم و فضل کا ہرگز دعوے نہیں ہے۔ اور یہ میں بغیر کسی انکسار اور تصنع کے کہتا ہوں۔ لیکن میں علم کا خدمت گزار ضرور ہوں اور اس ناچیز خدمت گزاری پر مجھے فخر ہے۔ میرا دلی منشا ہے کہ اس ملک میں تعلیم عام ہو اور علم کی روشنی سے سارا ملک منور ہو جائے۔ مجھے ابتدائے ملازمت سے جہاں جہاں میں رہا تعلیم سے خاص دلچسپی رہی اور میں نے اپنی بساط کے موافق ہمیشہ اس میں حصہ لیا۔ اور جب سے میں اس ریاست میں ہوں مجھے سب سے زیادہ خیال تعلیم کا رہا۔ اور جب تک میں ہوں گا میں ہمیشہ اسکی ترقی کو مدنظر رکھوں گا۔ اس لیے جو عزت کہ

آپ نے مجھے اس مجلس کے اجلاس اوّل کی صدارت کی بخشی ہے اسکا میں تہِ دل سے ممنون ہوں اور اس موقع کو میں اپنی زندگی میں ہمیشہ فخر ومباہات کے ساتھ یاد رکھوں گا۔

حضرات! علاوہ اُن اعلیٰ خوبیوں اور نیکیوں کے جو ہمیشہ عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ ہر زمانہ میں بلحاظ ضروریاتِ وقت اور اقتضائے زمانہ بہت سی دوسری ایسی چیزیں اور بہت سے دوسرے ایسے کام ہیں جن کی قدر ومنزلت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اُنکا درجہ نیکی اور ثواب تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر اس زمانہ کے حالات اور ضروریات پر نظر ڈالی جائے تو اشاعت تعلیم اور علم پھیلانا درحقیقت نیکی اور ثواب کا کام ہے اور اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں کہونگا کہ جہاد کا کام ہے۔ کیا جہالت وظلمت سے جنگ کرنا، تاریکی کو رفع کرنا، اور علم کی روشنی پھیلانا جہاد نہیں ہے۔ خصوصاً ایک ایسے ملک میں جہاں تعلیمی حالت پست ہے، جہاں علم مفقود ہوتا جاتا ہے اور جہاں ابھی لوگوں کو علم کی پوری قدر نہیں ہے اور جہاں آپ کو یہ سنکر سخت تعجب ہوگا کہ معمولی پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ایک ہزار میں صرف (۲۸) ہے یعنی سو میں ۲٫۸۔ یہ خوشی اور تشکر کی بات ہے کہ گزشتہ دس سال میں حیدرآباد کی آبادی نے قابلِ لحاظ اور معتدبہ ترقی کی ہے لیکن جب آبادی کی ترقی کے مقابلہ میں تعلیمی حالت پر نظر کیجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بجائے ترقی کے اسکی تعداد چار کس فی ہزار گھٹ گئی ہے۔

اگر آپ قرب وجوار کے انگریزی صوبوں اور ریاستوں سے مقابلہ کریں گے تو آپ کو صاف معلوم ہوگا کہ ہم کس قدر پیچھے ہٹے ہیں۔ اور اس مقدس کام کے لیے کس قدر جان توڑ کوشش کرنی چاہیے۔ ملاحظہ ہو۔

ٹراونکور	میں فی صدی لکھے پڑھے	۱۵
بڑودہ	"	۱۰٫۱
مدراس	"	۷٫۵
بمبئی	"	۸

میسور	"	۶،۳
ممالک متوسط و برار	"	۳،۳
ریاست حیدرآباد	"	۲،۹

میں نے اس تفاوت کے دکھانے کے لیے ایک ڈایاگرام تیار کیا ہے جو اس وقت آپ کے سامنے ہے اور جس سے ایک نظر میں ہماری تعلیمی حالت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے گا - کیا یہ حالت قابلِ حیرت، قابل افسوس اور قابل شرم نہیں ہے؟ سررشتۂ تعلیمات کو الزام دینا آسان ہے، لیکن کیا ملک کے تعلیم یافتہ اور دیگر باخبر صحاب کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اس سررشتہ کو مدد دیں اور تعلیم کی اشاعت میں مختلف طور سے کوشش کریں؟

اگرچہ سررشتہ تعلیم اس خاص غرض سے سرکار نے قائم کیا ہے لیکن درحقیقت تعلیم ایک ایسی چیز ہے کہ اسکے لیے کوشش کرنا تمام سررشتوں، تمام تعلیم یافتہ اور ملک کے بہی خواہ اصحاب کا فرض ہے۔ کیا رعایائے ممالک محروسہ سرکار عالی ہندوستان کے دوسرے حصص کے باشندوں سے زیادہ کم سمجھ زیادہ غبی اور زیادہ ناقص الذہن ہے؟ یہ ممکن نہیں - اور اس لیے اس کمی کے اسباب ہمیں تلاش کرنے چاہییں -

اس میں شک نہیں کہ تعلیمی لحاظ سے خاص شہر حیدرآباد کی حالت بہت قابل اطمینان ہے اور اگر اسکا مقابلہ اضلاع سے کیا جائے تو حیرت انگیز ہے - تقریباً بیس فیصدی خواندہ اشخاص میں سے ستر فی صدی انگریزی پڑھے لکھے اور اکانسی فی صدی خواندہ عورتیں ہیں - لیکن کیا ممالک محروسہ سرکار عالی سے صرف شہر حیدرآباد مراد ہے؟

مگر جب ہم اعلیٰ تعلیم کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو جو مسرت ہمیں بلدہ کی تعلیمی حالت سے ہوئی تھی وہ مبدل با فسوس و حسرت ہو جاتی ہے -

حضرات! یہ حالت ناگفتہ بہ ہے - اور اسکے بیان کرنے سے بھی شرم معلوم ہوتی ہے - لیکن اس سے میرا مقصد کسی کو الزام دینا نہیں بلکہ میرا منشا اس سے یہ ہے کہ ارکان کانفرنس جنھوں نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے، وہ ابھی سے سمجھ لیں کہ اُنکے سامنے کیسا بڑا کیسا اہم اور کیسا دشوار کام ہے

کام ہے۔ اور ابھی سے انھیں اُن موانعات کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے جو ہمارے رستہ میں حائل ہیں
اگر دیکھا جائے تو سارے ملک میں بلدہ ہی ایک شہر ہے اور بلاشبہہ یہ بہت بڑا شہر ہے لیکن اسکے سوائے ملک کے دوسرے بہت کم ایسے مقامات ہیں جن میں شہریت کے آثار پائے جاتے ہوں اور یہی وجہ ہے کہ وہاں تعلیم کی ضرورت اس قدر محسوس نہیں ہوئی ہے۔ شہروں کے ترقی پانے اور بڑھنے سے قصبات اور پھر دیہات پر اثر پڑے گا۔ چنانچہ بلدہ کا جو اثر اُسکے قرب وجوار پر پڑا ہے اس سے میرے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ تمام ضلاع ممالک محروسہ میں صرف اطراف بلدہ اور میدک ایسے ضلعے ہیں، جہاں لکھے پڑھے لوگوں کا اوسط تمام ریاست کے اوسط کے برابر بلکہ اس سے کچھ زائد ہے اور یہ صرف بلدہ کا اثر ہے۔

اسکے علاوہ تجارت ایک ایسی چیز ہے جو تعلیم کی ممد اور اُسکی ترقی کا باعث ہوتی ہے۔ جوں جوں ریلوں اور سڑکوں کی توسیع ہوگی اور ذرائع آمد و رفت سہل ہوتے جائیں گے تجارت کو فروغ ہوگا اور اسکے ساتھ ساتھ تعلیم کو بھی ترقی ہوگی۔ چنانچہ جن مقامات پر پہلے ریل نہ تھی اور اب ہوگئی ہے وہاں تجارت کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی بڑھتی جاتی ہے۔ جسکی ایک نظیر پربھنی ہے۔

تیسرے اس ملک کی رعایا زیادہ تر زراعت پیشہ ہے اور تقریباً ۶۲ فی صدی اشخاص زراعت یا اسکے متعلقہ پیشوں میں مصروف ہیں اور انھیں ابھی تک تعلیم کی ضرورت اور فوائد محسوس نہیں ہوئے ہیں۔

چوتھے جاگیرات میں تعلیم کی طرف بہت کم بلکہ مطلق توجہ نہیں کی گئی، جس کا اثر ملک کے اوسط پر پڑتا ہے۔

پانچویں ایک وجہ تعلیم کی کمی کی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہمارا مقرر کردہ نصاب تعلیم خصوصاً اضلاع اور دیہات کی ضروریات یا وہاں کے لوگوں کے طبائع اور خواہشات کے مناسب نہ ہو۔

چھٹے نیچ اقوام جن کی ایک تعداد کثیر یہاں آباد ہے اور بلحاظ تعداد کے ہندو مسلمانوں کے بعد انھیں کا درجہ ہے۔ تعلیم کی نعمت سے بالکل محروم ہیں۔ انکی تعلیم کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے۔
اسکے علاوہ اور بھی ایسے اسباب ہوں گے جو اب تک اشاعت تعلیم کے مانع رہے ہوں اور جہاں تک

میری نظر نہ پہنچی ہو۔ لیکن میری رائے میں بہت بڑی کمی سچے جوش اور خلوص کی ہے۔ اگر کام کرنیوالوں میں جوش اور خلوص ہو اور دلوں میں درد ہو تو رفتہ رفتہ سب موانعات خود بخود اُٹھ جائیں گے۔ اس لیے اس کانفرنس کا کام صرف یہی نہ ہوگا کہ وہ بلدہ میں اپنے اجلاس کرے اور دلخوش کن تجاویز پر بحث کرکے اُنھیں منظور کرے بلکہ شہر شہر اور گانوں گانوں پھرنا ہوگا۔ واقعات اور حالات پر غور کرکے صحیح نتائج قائم کرنے ہوں گے اور مشنریوں کی طرح ایثار سے کام لینا پڑے گا۔ اُس وقت اسکا کام مقبول ہوگا اور یقیناً سرکار اُسکے نتائج پر غور کریگی اور اُن سے معتدبہ فائدہ اُٹھائیگی۔ اگر کانفرنس نے یہ کام کرلیا تو سمجھنا چاہیے کہ اُسنے ایک ایسی بڑی مہم سر کی جسکے اثرات دُور تک پہنچیں گے اور موجودہ اور آیندہ نسلیں ہمیشہ اُسکی رہین منت رہیں گی۔

سررشتہ تعلیمات کی رپورٹوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خانگی مدارس کی تعداد بہ نسبت سابق کے کم ہوتی جاتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ صحیح اعداد دستیاب نہ ہوے ہوں۔ لیکن اغلب یہی ہے کہ انکی تعداد میں سرکاری مدارس قائم ہونے سے کمی ہوگئی ہے۔ اور مشکل یہ آپڑی ہے کہ چونکہ ہمارا مقرر کردہ نصاب تعلیم اُنکی ضروریات اور خواہش کے مطابق نہیں اس لیے وہ لوگ اپنے بچوں کو ہمارے مدارس میں بھیجنے میں تامل کرتے ہیں اور خانگی مدارس کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ایک وجہ اُنکی جہالت ہے کہ وہ سرکاری تعلیم کی قدر نہیں کرتے اور خانگی مدرس اُنھیں مغالطہ دیکر اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ دوسرے اُنکا خیال بھی ایک حد تک صحیح ہے کہ ہمنے اپنے نصاب میں اُنکی خواہشات کا لحاظ نہیں رکھا۔ ایسے بہتر طریقہ یہ ہے کہ مدارس دیہی کے نصاب میں زیادہ سختی نہ کیجائے۔ اور اس طور سے مرتب کیا جائے کہ اہل دیہہ کی خواہشات کا لحاظ بھی رہے اور تعلیم کی غایت بھی پوری ہو۔ اور ایسا ہونا ناممکن نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سررشتۂ تعلیم میں جو اصلاح نصاب تعلیم کے متعلق تجاویز ہو رہی ہیں اُن میں اس امر کا لحاظ کیا گیا ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ تمام ہندوستان میں برما تعلیم کے لحاظ سے سب سے بہتر حالت برما کی ہے۔ جہاں خواندہ اشخاص فی صدی ۲۲ سے زائد ہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ وہاں خانگی مدارس (بدھ خانقاہوں میں) بکثرت ہیں۔ اور اس لیے یہ کہنا کسی طرح بیجا نہیں

کہ اس ملک میں خواندہ اشخاص کی کمی خانگی مدارس کی تعداد گھٹ جانے سے ہوئی ہے۔ اگر ہمنے انکی طرف سے غفلت کی ہے تو اب ضرور ہے کہ انکا قائم مقام پیدا کرکے اس نقصان کی تلافی کریں۔

یہ چند اسباب ہیں جو میرے خیال میں اشاعت تعلیم کے مانع ہیں۔ ممکن ہے کہ اور بھی بہت سے اسباب ہونگے اور ضرور ہوں گے جن پر میری نظر نہیں پڑی اور جنمیں ہمارے قدیم روایات سوشل حالات اور توہم پرستی کو بہت کچھ دخل ہوگا۔ یہ اب کانفرنس کا کام ہے کہ انکی تلاش کرے اور انپر غور کرے اور ایسی تجاویز عمل میں لائے جو موانعات کو اٹھا دیں اور اشاعت تعلیم کا رستہ نکالیں۔ کانفرنس کی یہ تجاویز بلا شبہہ قابل قدر ہونگی۔

لیکن، حضرات! جہالت کی جڑ اسوقت تک نہیں کٹ سکتی، جبتک علم کی اشاعت ہماری عورتوں اور لڑکیوں میں نہ ہو۔ وہ ملک اور قوم کبھی تعلیم یافتہ اور شائستہ نہیں ہوسکتی جسکے مرد تو علم حاصل کریں اور عورتیں علم سے بے بہرہ رہیں۔ گویا اسکے یہ معنی ہیں کہ ایک جسم ایسا ہے جو نصف تو صحیح سالم ہے اور نصف مفلوج؟ بچوں پر ماں باپ دونوں کا اثر ہوتا ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ ماں کا اثر باپ سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں تو کیا اسکے ساتھ یہ بھی مانتے ہیں کہ جاہل اور بے علم ماں کا اثر بچہ پر اچھا پڑے گا؟ اگر وہ گودیں، جن میں ہماری اولادیں پرورش پاتی ہیں، جہاں وہ اخلاق و مذہب کا پہلا سبق سیکھتی ہیں، جہاں اوّل اوّل انکا کیرکٹر منتا ہے، علم سے خالی ہیں۔ تو پھر ہم کیونکر یقین کرسکتے ہیں کہ جب ہماری اولادیں اُن گودوں میں پرورش پاکر بڑھیں گی تو وہ حقیقی علم و اخلاق سے آراستہ ہوں گی؟ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں جہالت کا زور ہے۔ علم کی کمی ہے اور تعلیم کی طرف سے عام بے توجہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جن خاندانوں کے مرد تعلیم یافتہ ہوگئے ہیں اُنکی عورتوں میں بھی علم کا چرچا ہوتا جاتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ جب مرد تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو عورتوں کی تعلیم کا خود بخود انتظام کرلیں گے۔ ایک قسم کا مغالطہ اور دھوکا ہے۔ کیا اسکی کوئی حد مقرر ہے؟ کیا اسکی کوئی مدت معین ہے؟ کیا اسوقت تک انتظار کرنا عقل کی بات ہے؟ اور کیا ہم اس نقصان عظیم کو چپکے بیٹھے سہا کریں جو اس مدتِ مدید اور انتظار شدید میں ہماری نسلوں کو پہنچنے والا ہے؟

اصلاح دونوں کی یکساں اور ساتھ ساتھ ہونی چاہیے۔ کیونکہ دونوں پر ہمارے خاندانوں کی بقا اور آیندہ نسلوں کی اصلاح منحصر ہے۔

حضرات! یہ وقت تعلیم نسواں کے فوائد و نقصانات پر بحث کرنے کا نہیں ہے۔ بحثوں کا وقت گزر چکا اب عمل کا زمانہ ہے۔ ہمیں اب کچھ کرکے دکھانا چاہیے۔ موجودہ کی اصلاح اور آیندہ کی فکر ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ وقت لا طائل بحثوں میں گزر جائے اور ہمیں آیندہ نسلوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ مجھے یہ ذکر کرتے ہوے شرم معلوم ہوتی ہے کہ اس ملک میں خواندہ عورتوں کی تعداد ہزار میں صفر ۴ ہے۔ اور اگر بلدہ کو خارج کر دیا جائے تو یہ تعداد فی ہزار ۲ ہی رہ جاتی ہے۔ جو نہایت قابل افسوس ہے۔ کانفرنس کو یہ امر نظر رکھنا چاہیے کہ وہ اگر اپنے ملک کو تعلیم یافتہ بنانا چاہتی ہے تو تعلیم نسواں کی سب سے زیادہ فکر کرے۔ اس ملک میں خواندہ اشخاص کی جو کمی دکھائی گئی ہے یعنی فی ہزار ۲۸ تو اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ عورتیں تعلیم میں مردوں سے بہت پیچھے ہیں اور اس کمی کا اثر عام اوسط پر پڑا ہے اگر عورتوں کو خارج کر دیا جائے تو خواندہ مرد فی ہزار ۵۰ ہوں گے۔ لیکن کیا ہم اس حساب میں عورتوں کو خارج کر سکتے ہیں؟ اور کیا بغیر عورتوں کے ملک تعلیم یافتہ ہو سکتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ کانفرنس اس مسئلہ کی اہمیت پر کامل غور کرے گی۔

تعلیم کے ہر شعبہ کی اصل ابتدائی تعلیم ہے۔ اور اس لیے جہاں تک ممکن ہو اسکی ترقی و اشاعت میں سعی کرنا ہمارا سب سے بڑا فرض ہونا چاہیے۔ یہ ضرور نہیں ہے کہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم پائیں۔ لیکن ضرور ہے کہ سب معمولی لکھنا پڑھنا جانتے ہوں۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ حضور پرنور کی رعایا میں کوئی شخص ایسا نہ ہو جو ابتدائی تعلیم سے محروم رہ جائے۔ ہماری نظر میں بہت سی مثالیں ایسے شخصوں کی ہیں جنھوں نے صرف ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن وہ اپنی قابلیت اور قوت مطالعہ سے بڑے آدمی ہو گئے۔ ثروت و جاہ ہی میں نہیں بلکہ علم و فضل میں بھی۔ ابتدائی تعلیم زینہ ہے آیندہ اصلاح کا اور انفرادی و اجتماعی ترقی کا۔ ابتدائی تعلیم کو زیادہ موثر اور وسیع کرنے اور عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے ہمیں مجالس لوکل بورڈ سے کام لینا چاہیے۔ ہر مجلس میں غالباً چند ارکان ایسے ہونگے جنھیں

تعلیم سے کچھ نہ کچھ دلچسپی ہوگی اور اگر مجلس کے ارکان مہتمم تعلیمات کے مشورہ سے ابتدائی تعلیم میں سعی کرینگے تو مجھے یقین ہے کہ اسمیں بڑی کامیابی ہوگی۔ رہا یہ امر کہ اسکی کیا صورت ہوگی۔ میں اسکی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت اس موقع پر مناسب خیال نہیں کرتا۔

ابتدائی تعلیم کی اشاعت سے ایک اور بڑا مقصد میرے مدنظر ہے جو ہر طرح لائق قدر اور قابل لحاظ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حال میں ہمارے ہاں کواوپریٹو کریڈٹ (قرضۂ باہمی) کا طریقہ جاری کیا گیا ہے اسے آپ کوئی معمولی تجویز نہ خیال فرمائیں۔ یہ ایک بڑی چیز ہے اور اسکا اثر اور فائدہ دور تک پہنچنے والا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں آبادی کی تعداد کثیر زراعت پیشہ ہے اور انکی خوشحالی پر ملک کی خوشحالی منحصر ہے۔ اور اب تک کوئی تجویز کواوپریٹو کریڈٹ سے بہتر خیال میں نہیں آئی ہے لیکن اسکے فوائد سے مزارعین اسوقت تک بہرہ مند نہیں ہوسکتے جب تک کہ ان میں کم سے کم ابتدائی تعلیم نہ ہو۔ اور اس لیے اس تجویز کو کامیاب بنانے کے لیے یہ ضرور ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ابتدائی تعلیم کی اشاعت کیجائے۔ اس خیال کو آپ مدنظر رکھیں گے تو ابتدائی تعلیم کی وقعت آپ کی نظروں میں اور بڑھ جائیگی۔

حضرات۔ باوجود اس عام تعلیمی پست حالت کے جس کا ذکر میں نے اب تک کیا ہے، یہ بات کچھ کم مسرت اور فخر کی نہیں ہے کہ ہمارے یہاں علوم مشرقیہ کی تعلیم کا انتظام بہت قابل اطمینان طور پر ہو گیا ہے۔ ہمیں دارالعلوم کے لیے ایک ایسے فاضل پرنسپل مل گئے ہیں جو علوم مشرقیہ کے متبحر اور علوم مغربیہ کے عالم ہیں اور جنکے علم و فضل و کمالات اور اعلیٰ اخلاق سے ہمارے ملک کو بیش بہا فائدہ پہنچیگا۔ نصاب تعلیم کی مناسب ترمیم کی گئی ہے اور جو نقص باقی ہیں وہ رفتہ رفتہ سب رفع ہو جائیں گے۔ سائنس کی تعلیم کی ابتدا کی گئی ہے جو چند سال میں مکمل ہو جائے گی۔ اسی کے سلسلہ میں اضلاع میں بعض مقامات پر مدرسۂ فوقانیہ کے قائم کرنے کا بھی ارادہ ہے اور پہلا مدرسۂ فوقانیہ اورنگ آباد میں قائم ہوچکا ہے۔ میں ابھی حال میں اورنگ آباد گیا تھا اور مجھے یہ دیکھکر بے انتہا خوشی ہوئی کہ اگرچہ ابتدا ہے لیکن مدرسہ صحیح اصول پر چلایا جا رہا ہے اور اس میں زندگی اور ترقی کے آثار نمایاں ہیں۔ اور زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ جن حضرات کے ہاتھ میں اسکا انتظام ہے وہ اسکی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں اور اس کام کو

بڑے شوق اور جوش سے انجام دے رہے ہیں۔

میرا یہ خیال ہے اور مجھے اسپر کامل وثوق ہے کہ ہماری علمی ترقی کا اگر کوئی صحیح رستہ ہوسکتا ہے تو وہ یہی ہے۔ تقریباً ایک صدی کے تجربہ نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ خالص مغربی تعلیم ہمارے ملک کے لیے مفید نہیں ہوسکتی۔ جس تعلیم میں ملکی ضروریات کا لحاظ نہ ہو اور جسکی بنیاد ملکی اور قومی خصائص پر نہ ہو وہ کوئی تعلیم نہیں۔ اسی طرح خالص مشرقی تعلیم بھی موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے سودمند نہیں ہوسکتی۔ ایک ہمیں ملک و قوم سے بیگانہ کردیتی ہے اور دوسری ہمیں زمانہ حال کی ترقی اور روشنی سے محروم رکھتی ہے۔ دونوں الگ الگ ناقص اور ناکمل ہیں۔ اور اس لیے ضرور اور لابدہے کہ دونوں کی خوبیوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے اور ایسا نصاب تعلیم تیار کیا جائے جو حقیقی علم و اخلاق کا سرچشمہ ہو۔ لیکن اسے کامیاب بنانے کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ ایک خاص حد تک علوم اپنی زبان میں سکھائے جائیں۔ غیر زبانوں کے ذریعہ علم حاصل کرنے میں جو نقصان عظیم ہمیں پہنچاہے وہ ایسا نہیں ہے کہ اب اس سے درگزر کیجائے اور اسکی تلافی اور آیندہ کی اصلاح کا کوئی خیال نہ کیا جائے۔ اس سے نہ صرف ہمارے بچوں اور نوجوانوں کے دماغوں پر بہت بڑا بار اور بہت برا اثر پڑتا ہے بلکہ جدت طبع اور رسائی ذہن ایک حد تک معطل ہوجاتی ہے۔ یہ امر بہت قابل اطمینان ہے کہ سررشتہ تعلیم اس مسئلہ پر غور کررہاہے اور جدید نصاب کی ترتیب میں اسکے خاص طور سے ملحوظ رکھاہے۔ لیکن اسکے لیے لازم ہے کہ ہم اپنی زبان کو علمی کتب سے مالامال کردیں تاکہ علم کی تحصیل میں ہمارے طالب علموں اور اہل ملک کو دقت نہ رہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اردو اس بارے میں بہت اچھا کام کررہی ہے اور امید ہے کہ اسکی سعی سے ہماری زبان کے ذخیرۂ علوم و فنون میں بیش بہا اضافہ ہوجائے گا۔

لیکن اس سے کوئی صاحب یہ خیال نہ کریں کہ میں مغربی تعلیم یا انگریزی زبان کی تحصیل کا مخالف ہوں بلکہ میں اسکا بھی میں ویسا ہی حامی ہوں جیسا مشرقی تعلیم کا۔ لیکن میرا یہ خیال ہے کہ عام طور پر قطع نظر مستثنیات کے ابتدائی مدارج میں انگریزی کی تعلیم بجائے مفید ہونے کے مضر ہوتی ہے۔ البتہ

اعلیٰ مدارج میں اسکی تعلیم بطور زبان ضروری اور لازمی ہے اور بغیر اسکے ہم ہرگز صحیح اور حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ نہیں ہو سکتے۔ ممکن ہے کہ یہ طریقہ برٹش انڈیا میں مفید نہ ہو کیونکہ وہاں بغیر انگریزی تعلیم کے اعلیٰ ترقی ممکن نہیں اس لیے کہ وہاں کے تمام بڑے دفاتر میں نیز سرکاری خط وکتابت میں انگریزی کی ضرورت ہے لیکن بخلاف اسکے ہماری ریاست کی سرکاری اور دفتری زبان اُردو ہے اور یہاں کے حالات برٹش انڈیا کے حالات سے مختلف ہیں۔

دارالعلوم اور مدرسۂ فوقانیہ کا انتظام اسی نہج پر کیا گیا ہے۔ کتب کے متعلق بڑی چھان بین کی جا رہی ہے۔ عمدہ مدرس اور علما کے انتخاب میں بہت غور و فکر کیجاتی ہے۔ ضروری سامان بھی رفتہ رفتہ مہیا کیا جا رہا ہے اور جب یہ سب انتظامات مکمل ہو گئے اور خدا نے چاہا تو چند سال میں دارالعلوم ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو جائیگا جسکی نظیر ہندوستان بھر میں نہ ہوگی اور جس کا فیض دُور دُور پہنچے گا اور لوگ مُلک مُلک سے اس سے مستفید ہونے کے لیے آئیں گے اور حیدرآباد مرکز علوم و فنون بنجائیگا۔

اشاعت تعلیم کا ایک بڑا ذریعہ کتب خانے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مدارس کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں۔ کتب خانوں نے ہمیشہ بڑا کام کیا ہے اور بڑے بڑے لوگ پیدا کیے ہیں ہندوستان کتب خانوں کے لیے زمانۂ قدیم سے مشہور ہے۔ ہر پڑھے لکھے شخص کے گھر میں کتابوں کا مجموعہ ہوتا تھا۔ اور بعض بزرگوں اور خاندانوں کا ذخیرہ تو نہایت بیش بہا اور قابل رشک تھا۔ اور اس زمانہ میں تو اسکے بغیر چارہ ہی نہیں۔ کتابوں کی آج کل اس قدر کثرت ہوتی جاتی ہے کہ انکا جمع کرنا کسی ایک شخص کا کام نہیں۔ ایک شخص اپنے مذاق کی کتابیں جمع کر سکتا ہے۔ لیکن ہر علم و فن کی کتب کا جمع کرنا شخصی قدرت سے باہر ہے اور اس لیے ضرور ہے کہ سرکار کی طرف سے یا باہمی کوشش سے جگہ جگہ کتبخانے قائم کیے جائیں تاکہ طالب علم اطمینان خاطر سے اپنی فرصت کے اوقات میں کتب کا مطالعہ کر سکیں اور جنھیں خدا نے علمی ذوق اور ذہن رسا عطا فرمایا ہے وہ جدید تحقیقات کا ڈول ڈالیں اور اپنے اور اپنے ملک کے علم میں اضافہ کریں۔ اور جو لوگ اپنے کام دھندوں میں مصروف ہیں اُنھیں بھی موقع ملیگا اور ترغیب ہوگی کہ اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد مطالعہ کتب سے سچی خوشی اور فیض

حاصل کریں۔ ایک اچھا کتب خانہ ایسی نعمت عظمیٰ ہے کہ اسکی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ شاعت علم میں کتب خانہ مدرسوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں سے کسی طرح کم نہیں۔ بہت سے لوگ جنھوں نے صرف ابتدائی تعلیم پائی تھی، کتب خانوں کی بدولت بڑے آدمی بن گئے ہیں اور اُنھوں نے بڑی بڑی علمی خدمتیں کی ہیں۔ ہمارے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ بلدہ میں بہت اچھا کتب خانہ موجود ہے اور ہر سال اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور امید ہے کہ ایک مدت کے بعد اسکا ہندوستان کے نامی کتب خانوں میں شمار ہوگا۔ لیکن ضرورت ہے کہ اضلاع میں بھی مختلف مقامات پر کتب خانے قائم کیے جائیں جس میں خاص کر اُردو اور دیگر ملکی زبانوں کی کتب کا اچھا ذخیرہ ہو۔ کیونکہ صرف خواندہ ہونا ہی کافی نہیں بلکہ علمی ذوق بھی پیدا ہونا چاہیے۔ اور یہ ذوق بہ نسبت مدارس کے امتحانوں کے ذریعہ سے بہت اچھی طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اس لیے میری رائے ہے کہ نہ صرف بڑے بڑے مقامات میں بلکہ ہر پرائمری مدرسہ میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ ہو۔ جس میں ایسی کتابیں مہیا کیجائیں جو نہ صرف بچوں کے لیے مفید ہوں بلکہ کانوں کے اور لوگ بھی دلچسپی سے پڑھ سکیں اور اہل دیہات کو ان کتب خانوں سے کتابیں دیکر ان میں مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے تاکہ مدارس میں اور گانوں والوں میں خاص تعلقات پیدا کیے جائیں۔ جو مدارس اور اہل دیہات دونوں کے لیے مفید ہوگا۔ اور اسی طرح سے رفتہ رفتہ سفری کتب خانوں کا رواج دیا جائے۔ اور پڑھنے لکھنے اور مطالعہ کا شوق تمام ملک میں پیدا کیا جائے۔

حضرات! سرکار عالی تعلیمی پستی کی طرف سے غافل نہیں ہے۔ بلکہ کچھ عرصہ سے اسکی اصلاح کے متعلق خاص انتظام کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ آپ کو یاد ہوگا کہ چند سال پہلے ایک ماہر فن بیش قرار تنخواہ پر اسی غرض سے طلب کیا گیا تھا۔ جس نے دو سال میں تقریباً تمام ملک کا دورہ کرکے بڑی محنت اور غور و فکر سے ایک رپورٹ مرتب کی اسکے بعد سے مختلف تجاویز عمل میں آئی ہیں۔ متعدد اسکیمیں منظوری کے لیے پیش ہیں اور سررشتہ تعلیمات ہر قسم کی تعلیم کی اصلاح و ترقی میں سرگرم ہے۔ مثلاً مختلف نصابات کی ترمیم و ترتیب، دیسی زبانوں اور اُردو کی تعلیم کا صحیح انتظام، مدارس کی تعداد میں اضافہ، عہدہ

مدرسین کا انتخاب، مدارس صنعت و حرفت کی اصلاح، صیغۂ نظارت ونگرانی کی تنظیم وغیرہ - یہ ایسے مسائل ہیں جو سرکار کے زیرِ نظر اور زیرِ عمل ہیں - خصوصاً کتب نصابِ تعلیم کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کی کتابوں میں مقامی خصوصیات کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے - درسی کتب سے صرف دماغی ترقی ہی کا کام لینا نہیں چاہیے بلکہ انکے ذریعہ سے حُبِّ وطن، اتفاق، وفاداری اور خلوص وایثار کے جذبات بھی دلوں میں پیدا کرنا چاہییں - اور اس لیے میری رائے ہے کہ ہمیں اپنے مدارس کے لیے جدید کتابیں تالیف کرانی چاہییں جنمیں ان باتوں کا خیال رکھا جائے -

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں تک سرکار کا تعلق ہے، تعلیمی ترقی و اصلاح میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا جائیگا، خصوصاً ایسے زمانہ میں جب کہ خود اعلیحضرت واقدس خلد اللہ ملکہٗ تعلیم کے بڑے حامی اور سرپرست ہیں، یہ ممکن نہیں کہ اس بارے میں کسی قسم کی کوتاہی اور تساہل ہو سکے - لیکن جب تک مُلک کے روشن خیال اور تعلیم یافتہ اصحاب سرکار کے ہاتھ نہ بٹائیں گے ہمیں کامل کامیابی نہیں ہو سکتی - ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بے علمی کے معنی اب صرف جہالت ہی نہیں بلکہ اس میں افلاس رذالت اور زوال کے معنی بھی نہاں ہیں - اور اس لیے ہم سب کا فرض ہے کہ سچے جوش اور خلوص کے ساتھ اس کام کو شروع کریں مشنریوں کی طرح ملک میں جگہ جگہ تعلیم کی اشاعت کے درپے رہیں - اور جو لوگ اس مقدس کام میں مصروف ہیں اُنکی عزت و توقیر کریں تب کہیں جاکے اُس نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے جو ہمارے مُلک کو پہنچا ہے - خدا کے فضل سے اس ریاست کو ہر قسم کی آسانیاں حاصل ہیں - ملک کا رقبہ، اُسکے ذرائعِ آمدنی، اُسکی آبادی، اسکی پیداوار، اسکے قدرتی مناظر، اسکی تاریخی وقعت یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے لیے حوصلہ افزا ہیں - اور سب سے بڑھکر جو ہمیں تفوق ہندوستان کے دوسرے حصّوں پر حاصل ہے وہ یہ ہے کہ یہاں ہندو مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں - اُنکی ضروریات اور خواہشات سب ایک ہیں - اور اُنکے تعلقات باہمی ایسے ہیں کہ ہندو مسلمان کا امتیاز جو دوسرے مقامات میں پایا جاتا ہے یہاں خیال میں بھی نہیں آتا - یہ اس ریاست کے اعلیٰ خصوصیات میں سے ہے اور آج سے نہیں بلکہ صدہا سال سے ہے اور خدا نے چاہا

تو یہ خصوصیت ہمیشہ قائم رہیگی اور ہندوستان کے دوسرے صوبے اس سے ایک بڑا سبق حاصل کریں گے لیکن زمانۂ حال میں ایک اور جدید عنصر ایسا پیدا ہو گیا ہے جس نے ہمارے سابقہ تعلقات کو اور مستحکم کر دیا۔ وہ عنصر زبان اُردو ہے۔ اس سے قبل یہاں کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ لیکن وہ پھر غیر زبان تھی۔ اسکی جگہ اب اُردو نے لی ہے جو ایک ہندی اور آریائی زبان ہے اور ہندو مسلمان دونوں قوموں کی متفقہ کوشش سے پیدا ہوئی ہے اور اُسے قدیم پراکرت سے وہی تعلق ہے جو ہندوستان کی دوسری آریائی زبانوں کو ہے۔ جو شخص مرہٹی، گجراتی وغیرہ زبانیں جانتا ہے وہ جب ان زبانوں پر اصول لسان کے لحاظ سے نظر ڈالے گا تو فوراً یہ کہیگا کہ یہ بہنیں بہنیں ہیں۔ ہندوستان کو جانے دیجیے اسی ایک ریاست کو لیجیے جسمیں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں جب دو فرقوں یا مختلف مقامات کے لوگ جو ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف ہیں، باہم گفتگو کرنا چاہیں گے تو اُنکا ذریعۂ اظہار خیالات اُردو ہوگا جو ہر شخص بول سکتا یا سمجھ سکتا ہے۔ گویا اُردو ہم سب میں ایک زبان مشترک ہے جو ہمیں ہم خیال اور متفق بنانے میں بہت بڑی ممد و معاون ہے۔ میرا اس سے یہ مقصد نہیں ہے کہ مقامی زبانوں کو نظرانداز کر دیا جائے۔ بلکہ سررشتۂ تعلیمات نے جو جدید نصاب مرتب کیے ہیں اس میں انکی اہمیت کا پورا لحاظ کیا ہے اور ابتدائی تعلیم مقامی یعنی وہاں کی مادری زبان میں لازمی قرار دی ہے۔ لیکن آگے چلکر یعنی اوپر کی جماعتوں میں اُردو کی تحصیل بھی ضروری قرار دی۔ کیونکہ یہ اس ریاست کی سرکاری زبان ہے اور مجھے یہ معلوم ہُوا ہے کہ قصبات اور دیہات میں لوگ اُردو تعلیم کے بہت شایق ہیں اور مدارس میں اُردو مددگاروں کے تقرر کے لیے ہمیشہ درخواستیں پیش کرتے ہیں اور علاوہ اسکے اس سے ہمارے اتفاق و اتحاد کے برقرار رکھنے اور ترقی دینے میں مدد ملے گی۔ اُردو کی ابتدا بھی مختلف اقوام اور مختلف مذاہب والوں کو ہم زبان و ہم خیال بنانے کے لیے ہوئی تھی۔ اور اب بھی وہ یہی کام کر رہی ہے اور اگر ہمنے دوراندیشی سے کام کیا تو آیندہ اس سے زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔

لیکن ہماری توجہ صرف ذہنی تعلیم ہی تک محدود نہ رہنی چاہیے، ہمیں اُن فنون کی طرف بھی

خیال کرنا ضروری ہے جنھیں ہماری معاشرت اور اقتصادی حالت میں بہت کچھ دخل ہے۔ ملک کی ضرورتیں مختلف اور متعدد ہوتی ہیں اور اس لیے اس میں مختلف قسم کے اہل علم و اہل فن ہونے چاہییں۔

(۱) اسے جیسے علما کی ضرورت ہے ویسے ہی تاجروں اور دستکاروں کی بھی حاجت ہے۔ ہندوستان قدیم سے اپنی صنعت اور دستکاری کے لیے مشہور چلا آرہا ہے۔ اور یہ شہرت کوئی معمولی نہ تھی بلکہ ہندی دستکاری اور صنعت ایسی عجیب و غریب تھی کہ اُسوقت تو کیا اب بھی غیر ملک والے اسکا مقابلہ تو کہاں پوری نقل بھی نہیں کرسکتے۔ اس ریاست ہی کو لیجیے۔ آپ اضلاع میں جائیے۔ ہر جگہ آپ کو قدیم صنعت و دستکاری کی یادگاریں ملیں گی۔ جو ہماری بے توجہی اور ناقدری سے پڑی سسک رہی ہیں۔ میں اُن تمام اسباب پر بحث کرنا نہیں چاہتا جو ہماری قدیم صنعتوں کے تنزل کا باعث ہوئیں لیکن منجملہ دیگر اسباب کے دو بڑے سبب معلوم ہوتے ہیں ایک مشین۔ جس نے کاریگر ہاتھوں کو بے کار کردیا۔ اور دوسرے ہماری بدمذاقی۔ اور سچ یہ ہے کہ ان مشینوں نے ہماری صنعتوں پر وہ ظلم نہیں ڈھایا جو ہماری بدمذاقی سے اثر ہوا ہے۔ اورنگ آباد کا ہمرو۔ جامہ وار اور مشروع۔ ورنگل کے قالین۔ پیٹن کی ساریاں اور پگڑیاں۔ اور بیدر کا نفیس کام۔ سندی پیٹھ کے ریشمی کپڑے۔ بیمگل کی لکڑی پر نقاشی۔ نرمل کے کھلونے وغیرہ وغیرہ بیسیوں قسم کی ایسی چیزیں ہیں جو درحقیقت قابل قدر ہیں۔ اور اگر اہل ملک اُنکی قدر کریں تو اُن میں از سر نو جان پڑجائیگی۔ ۱۸۵۱ء میں ایک بڑی بھاری نمائش لندن میں ہوئی تھی۔ اسمیں ایک صیغہ قالینوں کا تھا۔ جہاں ملک ملک سے قالین آئے تھے۔ آج آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ سب سے بہتر قالین ورنگل کا قرار دیا گیا تھا۔ اگر آج دنیا میں قالینوں کی نمائش کیجائے تو کیا آپ قیاس کرسکتے ہیں کہ ورنگل کے قالین کو وہی عزت حاصل ہوگی؟ یہ سب ہماری بدمذاقی کے کُشتہ ہیں۔ ہمارے فنون لطیفہ میں سے قدیم فن مصوری اور فن تعمیر کو لیجیے جنکی تمام عالم قدر کررہا ہے اور جنکی دیکھا دیکھی شاید ہم بھی قدر کرنے لگے ہیں۔ میں ابھی حال میں ایلورا اور اجنٹہ دیکھ کر آیا ہوں۔ اُن عمارتوں کو دیکھکر آیا ہوں۔ ان عمارتوں کو دیکھ کر انسان محو حیرت رہ جاتا ہے۔ اور یہ جو عوام کہتے ہیں کہ انکے بنانیوالے

دیوتا یا جنات تھے۔ میرے خیال میں سچ کہتے ہیں۔ کیونکہ جب ہم اپنے آپ کو دیکھتے ہیں اور اُن قدیم بانیوں کا خیال کرتے ہیں تو کسی طرح یہ قیاس میں نہیں آتا کہ وہ بھی اسی مُلک کے رہنے والے تھے جس میں ہم رہتے ہیں۔ لیکن انسان کے نہائی کمال کے یہ دو نمونے صرف دیکھنے اور دیکھکر حیرت اور تعریف ہی کے قابل نہیں بلکہ یہ زندہ مدرسے ہیں جو صدہا سال سے دنیا کی تعلیم کے لیے خاموش کھڑے ہیں۔ اب وقت ہے کہ ان زندۂ جاوید معلموں سے ہم کچھ حاصل کریں اور اسکا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اورنگ آباد میں ایک آرٹ اسکول (مدرسۂ فن مصوری) صحیح معنوں میں قائم کیا جائے اور اس مدرسہ کے اعلیٰ مدارج کے ہونہار اور ذہین طالب علم اپنی عمر کا حصہ یہیں گزاریں۔ اور اس کمال کی تحصیل کریں جو کسی زندہ مصور سے دنیا میں حاصل نہیں ہو سکتا سارے عالم میں اس سے بڑھکر اس فن کی کوئی اعلیٰ درس گاہ نہیں ہے۔ اور یہ تنہا میری ہی رائے نہیں ہے بلکہ یورپ کے بڑے بڑے مبصرین اور ماہرین کا بھی یہی خیال ہے۔ اسی طرح دہلی و آگرہ جائیے تاج محل و موتی مسجد، جامع مسجد دہلی، قلعہ اور دیگر عمارات کے دیکھنے سے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس سے نہ صرف ہمیں اپنے بزرگوں کے عظمت و کمال کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ نہ صرف اس سے سبق و عبرت حاصل ہوتی ہے اور نہ صرف دلوں میں غیرت و ترقی کی ترغیب پیدا ہوتی ہے بلکہ ہمارے اخلاق اور ذوق پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اور صحیح ذوق یا احساس حُسن تعلیم کا بڑا جزو ہے جو زندگی کے ہر شعبہ اور ہر کام میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

علاوہ حرفت و صنعت کی تعلیم کے تجارتی تعلیم بھی ایسی ہی ضروری ہے۔ اور مُلک کی خوشحالی اور ترقی کا بہت کچھ دار و مدار اس پر ہے۔ حرفت و صنعت کے صحیح اصول پر سکھانے کے لیے سرکار کی طرف سے کوشش کیجا رہی ہے اور وہ وقت بھی آئے گا جب کہ یہاں تجارتی تعلیم کے لیے تجاویز عمل میں آئیں گی۔

میں اب آخر میں آپ کی خدمت میں دو تین باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اوّل یہ کہ اگر ہم صاحب جاہ و مال اور صاحب حکومت کی عزت کرتے ہیں تو اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر ہمیں

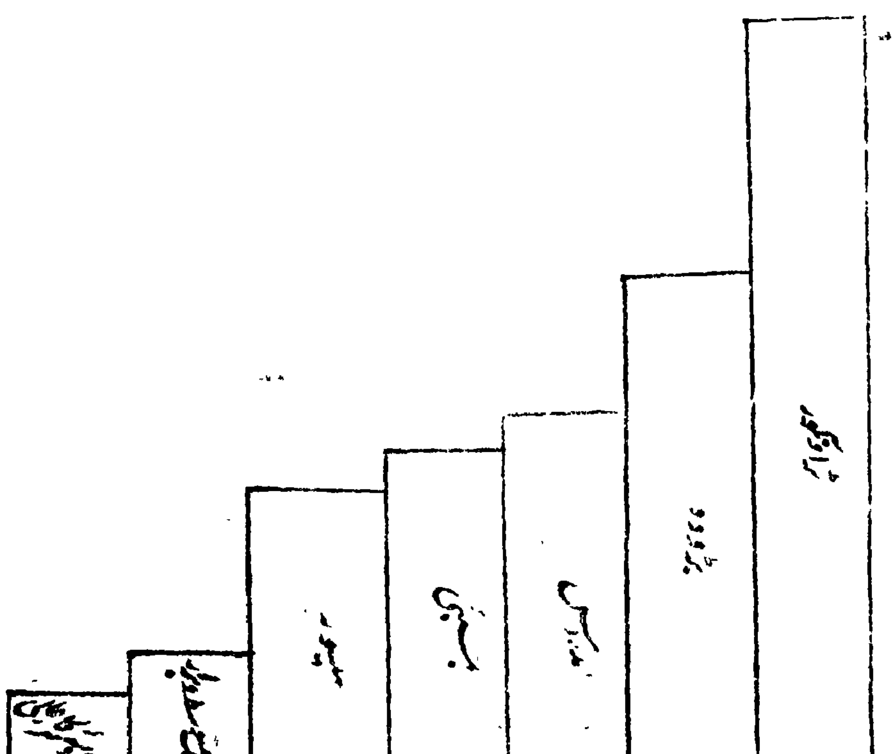
صاحب علم کی بھی عزت کرنی چاہیے - جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں اور علم کی اشاعت کرتے ہیں وہ ہماری عزت کے بدرجہا زیادہ مستحق ہیں، بہ نسبت اُن لوگوں کے جو مال و دولت کے جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ ایک مدرس خواہ وہ کتنی ہی کم تنخواہ کا کیوں نہ ہو، قابل وقعت ہے۔ اس لیے کہ وہ مُلک کی بڑی خدمت کر رہا ہے اور موجودہ اور آیندہ نسلوں کا محسن ہے۔ ہمارا مُلک اُستاد کی عزت کرنے میں شرب المثل ہے اور ہمارے ہاں اُستاد کی عزت باپ سے زیادہ کیجاتی تھی۔ اور بلاشبہ وہ اسکا مستحق ہے۔ دوسرے کم استطاعت اور ہونہار طلبا کی مدد کرنا ہمارا بڑا فرض ہے۔ انھیں کنکروں میں جواہر بھی ہوتے ہیں۔ اور کیا معلوم کہ انھیں میں سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو ہمارے مُلک کے لیے باعث فخر ہوں۔ ایسے لڑکوں کی مدد کرنا اپنے مُلک کی مدد کرنا ہے۔ تیسری بات جو میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمیشہ عام باتوں اور عام مسائل پر گفتگو کرتے رہنا کچھ بہت زیادہ مفید نہیں ہے۔ ہمیں اس سے آگے قدم بڑھانا چاہیے۔ اور جس خاص فن یا شاخ کو ہم اختیار کریں اُس میں منہمک ہو جائیں۔ اور ساری عمر اُسی میں صرف کر دیں۔ اور اس لیے ہمارے مُلک میں کچھ لوگ ایسے ہونے چاہییں جو واقعات پر غائر نظر ڈالیں، ہر ایک واقعہ کی پوری چھان بین کریں۔ اُسے جانچیں اور تولیں اور کُرید کُرید کر جزئیات و تفصیل پر قدرت حاصل کریں تاکہ وہ اپنے اپنے شعبہ اور فن میں ماہر اور باکمال ہوں اور اُسوقت اُنکے کمال سے خود بخود ایسی روشنی پھیلے گی۔ جس کا اندازہ ہم اسوقت نہیں کر سکتے۔ کانیں بہت ہیں لیکن مزدور کم ہیں اور انھیں معزز مزدوروں کی محنت اور مشقت پر ہماری کامیابی اور ہماری فلاح کا انحصار ہے۔

چوتھی درخواست میری یہ ہے کہ جہاں ہم اپنی ذات کے لیے اتنا کچھ کرتے ہیں وہاں ہم تھوڑا سا کچھ اپنے ملک کے لیے بھی کریں۔ ہم دنیا میں تنہا نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ ہماری ساری حالتیں اور ساری مرادیں اپنے مُلک سے وابستہ ہیں۔ مُلک کی فلاح میں ہماری فلاح اور مُلک کے نقصان میں ہمارا نقصان ہے۔ اس لیے ہمیں کچھ ایثار سے بھی کام لینا چاہیے۔ اگر ہم میں اپنے مُلک کی کچھ محبت ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اُن خوفناک آفتوں سے بچنے کے لیے جو جہالت سے پیدا ہوتی ہیں، خلوص و ایثار

جوش وصداقت سے کام لیں جہالت کا مقابلہ کریں اور علم کا نور تمام ملک میں پھیلائیں۔ ایثار و خلوص وہ خوبیاں ہیں کہ جس قوم و ملک میں پیدا ہو گئیں انھیں کوئی قوت ترقی سے روک نہیں سکتی

حضرات! وقت کم ہے اور کام بہت۔ راستہ کٹھن ہے اور منزل مقصود دور۔ اس لیئے آؤ اب یکزبان و یکدل ہو کر اس مقدس کام کو شروع کریں جس پر ہمارے ملک کی ترقی و اصلاح کا دارومدار ہے۔ اور خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے ارادوں اور ہمتوں میں برکت دے اور ہم سب کو نیک توفیق عطا کرے۔ اور ہمارے آقائے ولی نعمت حضور پرنور بندگان عالی متعالی خلد اللہ ملکہ کی صحت واقبال و عمر میں ترقی عطا فرمائے۔ کیونکہ انکی کامیابی میں ہماری کامیابی اور انکے عظمت و اقبال میں ہماری عزت و مسرت ہے۔ آمین۔

(نقشہ جسکا حوالہ صفحہ ۵ کی سطر ۲ میں دیا گیا ہے وہ درج ذیل کیا جاتا ہے جس سے بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے کہ قلمرو آصفیہ اور دیگر ممالک کے درمیان بلحاظ تعلیم کیا فرق پایا جاتا ہے۔)



ماتمِ شبلی

خوں می چکد ز ناصیۂ داستانِ ما — آہ از وفاتِ شبلیِ شیوا بیانِ ما
ما خستگانِ خنجرِ جورِ زمانہ ایم — غیر از متاعِ درد مخواہ از دکانِ ما
اسلامیاں با تمِ شبلی نشستہ اند — ہے ہے چو روے کفر سیہ شد جہانِ ما
زیں بزم آں مورخِ بالغ نظر گزشت — کز رفتنش برفت اثرِ داستانِ ما
آں نوبہارِ گلشنِ صدق وصفا نماند — شد پائمالِ جورِ خزاں گلستانِ ما
آں خضرِ پے خجستہ کجا رفت، ظاہر است — با منزلِ آشنا نہ شود کاروانِ ما
آں نکتہ دان بزمِ تغزل کجا شتافت — شد بے چراغ مجلسِ عشرت نشانِ ما
از قندِ پارسی کہ زلبہاشش می چکید — ایراں بہ رشک بود ز ہندوستانِ ما

صد حیف آں ادیبِ اریب از میاں برفت
وحشت نماند لذتِ کام ودہانِ ما

رضا علی وحشت

ڈھونڈ لاؤں کہاں سے اور کیا ساماں کروں — کس طرح تیری تسلی دیدۂ گریاں کروں
انکے اظہارِ محبت پر میں ہو جاؤں نثار — گر نہیں کچھ اور اتنا چارۂ احساں کروں
جی میں آتا ہے کہ پھر ہنگامہ آرا ہو بہار — میزبانی کے مزے لوٹوں اُنھیں مہماں کروں
درد ظاہر کر دیا بے درد بیگانہ ہوا — کیا علاج اب تو ہی بتلادے دلِ ناداں کروں
وہ ذرا آئیں تو دیکھوں جا سکیں گے کس طرح — رعب کیسا ضبط سارا ہیئۂ داماں کروں
ترکِ الفت پر بھی ہوں اُس فکر میں آشفتہ سر — آسماں سے کچھ کہوں یا شکوۂ جاناں کروں
دل دوا جو، جاں شہیدِ غم، محبت چارہ گر — درد کی خواہش کروں یا خاطرِ مہماں کروں
عشق تھا انکی ستمگری سے دونا ہو گیا — بات جو سچی ہے بسمل اسکو کیوں پنہاں کروں

انسانی ترقی سے تقریر کا تعلق

ماخوذ از لوئیس جٹسن ایم ڈی

نمبر ۱

مترجمہ محمد شاہ نواز خان صاحب طالب علم بی ایس سی کلاس مدرسۃ العلوم علیگڑھ

مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں علاوہ اور بہت سی انجمنوں کے ایک انجمن اردو ہے۔ یہ انجمن چند سال کی غفلت کے بعد اب جنوری ۱۹۱۴ء سے اپنا کام باقاعدہ طور پر کر رہی ہے۔ انجمن کے اعلیٰ مقاصد میں سے اہم ترین مقصد سائنٹفک یعنی علمی مضامین اور کتب کا اردو میں شائع کرنا ہے۔ انجمن کے اراکین ہر ہفتہ وار کالج میں جمع ہوتے ہیں اور علمی مضامین پڑھنے کے بعد ان پر علمی بحث مباحثہ کیا جاتا ہے۔ اس سال دس بارہ مضامین پڑھے جا چکے ہیں۔ ان میں سے چند اردو جرائد و رسائل میں اشاعت کے لیے بھیج دیے گئے ہیں بقیہ مضامین بھی تصحیح وغیرہ کے بعد انشاء اللہ العزیز عنقریب شائع کیے جائیں گے۔ سر دست انجمن مذکور نے مختصراً یہ کام کیا ہے۔ سید حسن برنی صاحب کا نہایت عمدہ عالمانہ مضمون "البیرونی" انجمن ترقی اردو کی تالیفات میں شائع ہو رہا ہے۔ سید علی اختر صاحب متعلم ایف ایس سی کلاس نے دو مضامین لکھے ہیں ان میں سے ایک جس میں رینی ڈیکارٹ Rene Descartes مشہور فرانسیسی عالم اور محقق کے فلسفہ اور سوانح زندگی پر ایک جامع و مانع تبصرہ ہے عصر جدید مطبوعہ ۱۰ اور ۱۷ اگست ۱۹۱۴ء کے دو پرچوں میں بعنوان "فرانس کے ایک فلسفی اور سائنس داں کی مختصر سوانح عمری" شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا مضمون "سائنس اور اسلام" جو کہ میرے دو مضامین Science & Islam Nos I & II مطبوعہ ہندوستان ریویو اکتوبر و نومبر ۱۹۱۲ء و مئی ۱۹۱۳ء کا ترجمہ ہے جلد ہی کسی اردو رسالہ میں اشاعت کے لیے بھیجا جائے گا۔ موجودہ

مضمون کے مرتب محمد شاہ نواز خاں صاحب متعلم بی ایس سی کلاس نے یہ مضمون نہایت محنت اور جاں فشانی سے ایک انگریزی مضمون مطبوعہ سائنس پروگریس جنوری ۱۹۱۴ء سے اخذ کیا ہے ترجمہ کی مشکلات علمی اصطلاحات کی کمی اور نفس مضمون کی ندرت کا خیال کرکے ہم مترجم موصوف کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انکا ترجمہ کیا بلحاظ سلاست اور کیا بلحاظ ادائے مطلب ایک بڑی حد تک نمایاں طور پر کامیاب ثابت ہوگا۔ شاہ نواز خاں صاحب کا ایک اور مضمون "ہندوستان میں علمی تحقیقات" جو کہ فی الاصل ہندوستان ریویو ستمبر ۱۹۱۳ء کے مسٹر ایک مضمون

"Scientific Research in India"

کا ترجمہ ہے، الناظر بابت ماہ نومبر ۱۹۱۴ء میں شائع ہو چکا ہے اور اس قابل ہے کہ تمام خواندہ اصحاب خواہ انہیں براہ راست سائنس سے تعلق ہو یا نہ ہو ضرور اسکا مطالعہ فرمائیں۔

انجمن اردو مدرسۃ العلوم کی خوش بختی ہے کہ شمس العلما مولنا مولوی خلیل احمد صاحب نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی ہے اور باوجود شہر میں واقع ہونے اور کالج سے دوری کے انجمن کے تقریباً تمام جلسوں میں آپ نے صدارت فرمائی ہے۔ جسکے لیے میں انجمن کی طرف سے اور اپنی طرف سے انکا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہمیں کافی امید ہے کہ مولنا عنقریب کسی آیندہ جلسہ میں ایک نہایت قابل قدر اور عالمانہ مضمون اراکین انجمن کے فائدے کے لیے پڑھیں گے اور ہمیں یقین کامل ہے کہ تمام وہ اصحاب جنکو مولنا کے تبحر علمی اور ذکاوت طبع کا کچھ بھی حال معلوم ہے اس جلسہ اور مضمون کا نہایت بیتابی اور خوشی سے انتظار کریں گے۔

اراکین انجمن سے ہماری استدعا ہے کہ وہ ترجمہ اور تالیف کے کام کو نہایت مستعدی سے شروع کریں۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔ انکی یہ تھوڑی سی کوشش قوم میں علمی بیداری کے لیے ایک زریں مثال قائم کردیگی۔ آج سے بیس تیس برس پہلے جو پشت گزر چکی ہے اس میں مصنفین اور مولفین کی ایک معقول تعداد تھی لیکن اب تصنیف و تالیف بلکہ ترجمہ شاید ایک ایسا دشوار اور صعب کام ہو گیا ہے کہ ہندوستان بھر میں دس کروڑ مسلمانوں میں سے سوائے

معدودے چند مستثنیات سنہ کے مصنف یا مؤلف کا نام عنقا کا حکم رکھتا ہے۔ حالانکہ علوم مغربی اور السنۂ یورپ میں اتنا وافر مواد ترجمہ و تالیف کے لیے موجود ہے۔ ہم خود تقصیر وار ہیں اور ہم معترف ہیں کہ آج تک قوم کی کوئی علمی خدمت ہم سے بن نہیں آئی۔ لیکن اب ہم نے بعض علمی تصانیف کی ابتدا کر دی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ مناسب وقت پر ان کا اعلان کر دیا جائیگا۔ سردست ہمارا ارادہ ہے کہ بارے دس بارہ علمی مضامین جو تا حال مختلف اُردو رسالوں میں شایع ہو چکے ہیں اُنکو جمع کرکے شایع کر دیا جائے۔ واللہ المعین والمستعان حسبنا اللہ نعم المولیٰ ونعم الوکیل۔

فیروز الدین مراد

گو کہ ہم یقیناً یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی تقریر کا کوئی نہ کوئی آغاز ضرور تھا۔ مگر یہ معلوم کرنا کہ اُسکی ابتدا کس طرح ہوئی ایک دقیق اور اہم مسئلہ ہے۔ ہم کو اکثر کسی چیز کے ابتدائی مشاہدہ سے اُسکی گزشتہ تاریخ کے بعض آثار معلوم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن جب ہم انسانی وجود میں تقریر کی بابت تحقیقات کرتے ہیں تو اس طریقہ سے بہت کم امداد ملتی ہے۔ کیونکہ ظاہرا اُن تمام دماغی کاموں کا سبب جو کہ چھوٹے بچوں سے ظہور میں آتے ہیں وہ نقل کرنے کی لیاقت ہے جو کہ اُن میں پائی جاتی ہے۔

تقریر کا آغاز

آیا کہ تقریر کی ابتدا صرف اُن مقرر اور متعین آوازوں کی ترقی کی وجہ سے ہوئی جو قدرتاً ادنیٰ قسم کے جانوروں میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ آوازیں بلحاظ لہجہ و تلفظ کے محدود ہوتی ہیں۔ یا ہمارے اسلاف میں آوازوں کے نقل کرنے کی قابلیت موجود تھی جسکو ہم بہت سے پرندوں اور اپنے ہی جنس کے بچوں میں پاتے ہیں۔ مگر عالم حیوانات میں ہمارے قریب ترین ومشابہ جانوروں کے مطالعہ سے ہمارے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی۔ کیونکہ تھوڑے بہت پالو ہونے کی حالت میں وہ ہمارے حرکات و افعال کی کسی حد تک نقل کرنے لگتے ہیں۔ مگر جہانتک میرا علم ہے وہ زبان کی نقل نہیں کر سکتے ہیں درحقیقت ہمارے اعلیٰ سے اعلیٰ اسلاف قدیمہ جنکی بابت ہلکو لکھتے ہیں بہت ہی خاموش تھے اور اُن میں

کسی قسم کی گویائی نہ تھی۔ اُنکی قابلیت گویائی بہت سی ایسی مخلوقات حیوانی سے کم تھی جو عقل اور ذہن وادراک کے لحاظ سے اُن سے کہیں کمتر ہیں۔ بعض اشخاص خیال کریں گے کہ چمپانزی[1] اور دوسرے مشابہ انسان بندروں میں جو بہت ہی زود فہم تیزطبع اور ذہین ہوتے ہیں، کوئی طریقہ عادتاً گفتگو کرنے کا موجود ہوگا۔ اور وہ اُنکی دماغی قوت کے مناسب مختصر یا طویل ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو علم طبیعات کے ماہر اُسکو ابھی تک نہیں دریافت کرسکے۔

ان مشابہ انسان جانوروں میں صاف تقریر کی عدم موجودگی سے ہمارا وہ رشتہ جو ہم ان بندروں کی طرف اپنے اسلاف کی شکل میں منسوب کرتے ہیں تلف ہوجاتا ہے۔ بہرحال یہ کہا جاتا ہے کہ بہ مقابلہ چمپانزی۔ گوریل[2]۔ اورنگ اٹانگ[3] کے گیبن[4] (یکے از نوع قرد) میں جسکا شمار انسان کے ادنیٰ اسلاف

[1] چمپانزی Chimpanyee (یکے از نوع قرد) یہ افریقہ میں خط استوا کے قریب جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ بہ نسبت گوریل کے اسکے کان بڑے اور سر گول ہوتا ہے۔ بچپن کی حالت میں آسانی سے پالا جا سکتا ہے۔ اسمیں غصہ کم ہوتا ہے یہ عادتاً اپنے ہاتھوں کو چلنے میں استعمال کرتا ہے اور شاذ و نادر پیروں کے بل کھڑا ہوتا ہے۔

[2] گوریل Gorrilla دنیا میں یہ سب سے بڑا قرد یا بن مانس ہے جو مشابہ انسان ہے۔ مغربی افریقہ میں خط استوا کے قریب پایا جاتا ہے۔ یہ چمپانزی کے بہت کچھ مشابہ ہے۔ یہ انسان سے بہت بڑا اور زیادہ طاقت ور ہوتا ہے مگر بہت لانبا نہیں ہوتا اسکے ہاتھ لمبے اور کندھے کشادہ جبڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ دانت ہاتھی کے دانتوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں رہتے ہیں۔ اس کا مزاج خراب اور غصہ ور ہوتا ہے۔ آسانی سے پالا نہیں جا سکتا ہے۔

[3] اورنگ اٹانگ Orang-onTang (یکے از نوع قرد) بورنیو اور سماٹرا کے جنگلوں میں رہتا ہے۔ قد اور جسم میں گوریل کے دو تہائی ہوتا ہے۔ اسکے کان چھوٹے۔ کھال بھوری۔ بال سرخی مائل بھورے اور لمبے ہوتے ہیں۔ جوان نر کی اونچائی ۴ فیٹ ہوتی ہے۔ اسکے ہاتھ لمبے اور چہرہ۔ ہاتھ۔ پیر بغیر بالوں کے ہوتے ہیں۔ بہت آسانی سے پالو ہو جاتا ہے۔ پالو ہونے کی حالت میں کپڑے پہنتا ہے اور انسان کے حرکات کی اچھی طرح نقل کرتا ہے۔

[4] گیبن Gibbon مشابہ انسان بندروں کی ایک ادنیٰ قسم میں سے ہے یہ بغیر دُم کے ہوتا ہے۔ ہاتھ لمبے ہوتے ہیں ایشیا کے جنوبی مشرقی حصوں میں پایا جاتا ہے۔ ایسٹ انڈیز میں خاص طور سے کثرت ہے۔

میں ہے اور جو انسان کے بہت کم مشابہ ہو۔ مختلف قسم کی زبانی آوازیں پائی جاتی ہیں۔ لہذا اُس رائے کو جو کسی مقابلہ کرنیوالوں نے پیش کی ہے کہ ہم کو اپنے آبا و اجداد کی تلاش میں بجائے چمپانزی گوریلا اور دوسرے بڑے بندروں کے گیبن کی طرف زیادہ متوجہ ہونا چاہیے۔ تقریر کی ابتدا سے مدد ملتی ہے۔

ایک ذرا خیال کرنے سے معلوم ہوگا کہ مصنوعی زبانی علامات ونشانات کے ایجاد ہوتے ہی جنکی وجہ سے انسان بذریعہ گوش و دہن تبادلۂ خیالات کر سکا، کس قدر ترقی ہوئی ہوگی۔ بہت سے نہ بولنے والے جانوروں میں زبانی سگنل یا اشارات دینے کا طریقہ رائج ہے، جس سے اُنکی بہت سی ضروریات رفع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ہمارے بہت سے جانوروں میں مختصر بات چیت بھی پائی جاتی ہے۔ اس گفتگو سے اُنکی موجودگی کا اعلان ہوتا ہے۔ اور وہ سوسائٹی کے چند مطلبوں کو پورا کرتی ہے مگر اُسکے معنی و مطلب بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ ان جانوروں کی آوازیں قریب قریب گھٹنے اور بڑھنے کے ناقابل ہیں اور اس وجہ سے کوئی مکمل خبر نہیں دے سکتیں۔ ان آوازوں کا موثر ہونا ان جانوروں کے صرف تیز ادراک و فہم پر منحصر ہے جنکی جان ہر وقت خطرہ میں رہتی ہے نہ کہ واقعہ کے کسی معنی و مطلب پہ جو اُن آوازوں سے نکلتا ہو۔ بہت سے ادنیٰ جانوروں کے حواس خصوصاً قوت شامہ۔ باصرہ و سامعہ بہ نسبت ہمارے اس قدر تیز و زود کار ہوتے ہیں کہ صرف ایک ذرا سا اشارہ ملنے پر بھی اُنکو دشمن کی آمد کی بابت مفصل حالات معلوم ہو جاتے ہیں جبکہ انسان کی نظروں میں اس خبر کے پہنچنے کا ممکن طریقہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنکو اُنکے ساتھیوں میں سے کسی نے اس واقعہ کی بابت اچھی طرح واقف کر دیا ہو۔

اُن تمام چرند و پرند کو جو یا تو گلہ میں رہتے ہیں یا دوسرے جانوروں کے ساتھ ساتھ رہنے کے عادی ہیں، اپنے ساتھیوں کے برتاؤ کا بہت بڑا خیال و احساس ہوتا ہے۔ اگر کوئی جانور کسی قریب کی جھاڑی سے جس میں اُسکا دشمن چھپا ہو، خوف زدہ ہوکر بھاگتا ہوا گلہ میں آئے تو تمام باقیماندہ جانور قبل اسکے کہ اُس سے اُس حادثہ کی بابت کچھ پوچھیں، پہلے اپنی حفاظت کا بندوبست کر لیتے

ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گلّہ میں رہنے والے جانوروں کے اعضا میں خاص نشانات سے اُنکے طریقۂ حفاظت میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً خرگوش ذاہوکی سفید دُم اُنکی حفاظت کے لیے بہت مفید ہے۔ جس وقت اُن میں سے کوئی دُم اُٹھاکر بھاگتا ہے تو فوراً اُسکے دوسرے ساتھی خطرہ سے آگاہ ہوجاتے ہیں۔

اکثر اس قسم کی خبروں کی آمدورفت میں بڑی ہوشیاری اور چالاکی کام میں لائی جاتی ہے مسٹر سٹوارٹ وائٹ نے غزالوں[1] کی بابت جنکی مشرقی افریقہ کے میدانوں میں کثرت ہے، ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ یہ جانور جس میں قدرتی طور پر آگے رہنے کا میلان ہوتا ہے، اپنے کو گورخر[2] (gnu) (نوز) اور دوسری قسم کے غزالوں کا جو اُسکے ساتھ پھرنے کے عادی ہیں، محافظ سمجھتا ہے۔ وہ کسی اُونچے ٹیلے پر صرف خطرہ سے آگاہ کرنے کے لیے نہیں کھڑا ہوتا ہے جو کہ اُسکا معمول ہے بلکہ وہ اس بات کے لیے تیار و مستعد رہتا ہے کہ اگر کسی درندہ کی آمد کی خبر دیجائے تو دوسرے جانور جو اُسکی نگہبانی میں ہیں اُسکے معلوم کرنے سے باز نہ رہیں۔ وہ مختلف عجیب و مخصوص جسمانی حرکتوں سے اُنکی توجہ کو اپنی طرف رجوع کرتا ہے، جبکہ اُسکو کسی قسم کی آگاہی دینا منظور ہوتی ہے۔ اور اکثر بھیڑ بکریوں کے محافظ کُتے کے مانند وہ اُنکے ارد گرد گھومنے لگتا ہے اگر وہ لگاتار اُسکی اطلاع سے لاپروائی کرتے ہیں۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ بہ نسبت میدان کے گھنے جنگلوں میں رہنے والے جانوروں کی حفاظت کے لیے قوّتِ باصرہ و شامہ کی بہت کم ضرورت ہے۔ لہٰذا اس حالت میں حفاظت کے اُن طریقوں پر جو کہ غزال اور اُسکے ساتھی استعمال کرتے ہیں، زبانی گفت و شنید سے حفاظت کرنے کے طریقہ کو

---

[1] غزال۔ یا (antelope) یہ افریقہ میں کثرت سے ملتا ہے۔ اسکے سینگ کھوکھلے اور بلا شاخوں کے ہوتے ہیں۔ بکرے سے بہت مشابہ ہے۔ صرف مثل بکروں کے اُس کے داڑھی نہیں ہوتی ہے۔ یہ اپنی چالاکی تیزی اور چستی کے لیے مشہور ہے۔

[2] نوز (gnu) یہ ایک قسم کا غزال ہوتا ہے۔ اسکے سر اور سینگوں میں ایک بھینسے کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اسکا گردن اور ایال گدھے کی گردن و ایال کے مشابہ ہیں۔ اُسکی لمبی بالوں دار دُم گھوڑے سے ملتی جُلتی ہے۔

ترجیح دیجاتی ہے۔ جنگل کے رہنے والے جانوروں میں جو اپنی خوراک تلاش کرتے وقت بوجہ جھاڑیوں کے مجبوراً ایک دوسرے سے چھپے ہوتے ہیں، متواتر آہستہ آہستہ آواز دینے کی ایک عام عادت ہوتی ہے۔ اور اسوجہ سے اُنکے ہمجنس ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونے پاتے۔ بلاشک وشبہ سُوَر کے متواتر اور خودبخود گُر گُرانے کی وجہ صرف یہی پیش کیجا سکتی ہے۔ اور یہی ثبوت اُس مختصر گفتگو کے لیے بھی دیا جا سکتا ہے جو بہت سے پرند اور دوسرے جانوروں میں پائی جاتی ہے۔ درحقیقت یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ اس مختصر بول چال کی عام عادت لیمرس[1] میں بھی پائی جاتی ہے جو لگاتار غراتے رہتے ہیں۔ مگر یہ معلوم کرنے سے کہ آیا یہ عادت اُن جانوروں میں بھی ہے جو انسان کے بہت مشابہ ہیں میں ابھی تک قاصر رہا ہوں۔

یقیناً اُس زمانہ میں کس قدر ترقی ہوئی ہوگی جبکہ ایک خوف زدہ جانور نے اپنے ساتھیوں کو خطرہ کی بابت آگاہ کرنا چاہا اور اُس نے اپنی آوازوں کو اس طرح ٹھیک ٹھاک کیا کہ اُس سے خطرہ کی اصل ماہیت اور وہ سمت معلوم ہوگئی جس طرف سے اُسکی آمد کی توقع تھی۔ مثلاً فرض کرو کہ آنے والا دشمن ایک شیر یا چیتا ہے اور آگاہ کنندہ ہمارے اسلافِ قدیمہ میں سے ایک ہے۔ اگر یہ جرد مند اپنے ساتھیوں کی جماعت میں پہنچکر صاف طور سے ظاہر کرے کہ آنیوالا حریف شیر ہے تو یقیناً کسی مضبوط درخت پر چڑھ جانے سے اُنکی جانیں قطعی محفوظ ہوجائیں گی۔ اور اگر خبر سے یہ معلوم ہوا کہ ایک چیتا ہے تو درختوں کی چوٹیوں کی خاص خاص محفوظ جگہوں میں فوراً پہنچ جانے سے جان کی حفاظت ہوسکے گی۔

اولاً اولاً آدمی اپنی خوراک تنہا تلاش کیا کرتے تھے۔ اور یہ خوراک اُن ترکاریوں اور سبزی تک محدود تھی جو جنگل میں بہم پہنچ سکتی تھیں۔ مگر اسکے بعد وہ زمانہ آیا کہ اُنھوں نے ملکر ایک

---

[1] لیمرس (Lemurs) یہ بندروں کے مشابہ ہوتے ہیں۔ انکی آنکھیں بڑی اور منھ لومڑی کے منھ سے ملتا جلتا ہے۔ اسکے بدن کے بال ملائم اُون کے مانند ہوتے ہیں۔ اور دُم لمبی اور پھولی ہوئی ہوتی ہے۔ اُسکا دماغ بہ نسبت بندروں کے چھوٹا ہوتا ہے۔ یہ جزیرۂ میڈیگیسکر اور قریب کے جزائر میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔

جماعت میں شکار کرنا شروع کیا۔ اس حالت میں کسی ایسی قوت کا ہونا لابدی تھا جس سے یہ ظاہر کیا جا سکتا کہ کسی خاص شکاری کے کیا کام سپرد ہے۔ یہ خیال ہے کہ آدمی پہلے پہل بجائے ایک کامیاب یا ماہر شکاری کے صرف ایک مبتدی اور نوسکھیا ہوگا۔ جیسا کہ تمام بچے شکاری جانور ہوتے ہیں۔ ایک شکاری کتوں یا بھیڑیوں کا گروہ ایک نہایت معمولی [illegible] کے ساتھ [illegible] کی تقلید کرتا ہے اور وہ سب آپس میں باتفاق کام کو انجام دیتے ہیں۔ مگر اس حالت تک پہنچنے کے لیے قدرت نے انکو بیشمار پشتوں سے تربیت دی ہے تب کہیں انکی تقلید [illegible] معمولی طور پر نمودار ہوئی ہیں۔ قدیم انسان کو اس نتیجہ تک پہنچنے کے لیے جو گوشت خوار جانوروں کو ایک مدت کی امیدداری کے بعد حاصل ہوا کسی ایک مختصر طریقہ کے اختیار کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ غالباً اس کام کے لیے اسکا دماغ بالکل کافی اور مکمل تھا۔ مگر ایک ایسی قوت یا طریقہ کی ضرورت تھی جس سے وہ اپنی تدبیروں اور تجویزوں کو جو اسکے دماغ میں اس کار عظیم کی بابت پیدا ہوں۔ اپنے ساتھیوں کو سمجھا سکے۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس موقع پر قدرتی آوازوں میں جو اس میں مثل اسکے حیوانی خاصیتوں کے موجود تھیں کوئی ایسی بڑی ترقی نہ ہوئی ہوگی کہ وہ اس کام کے لیے کافی ہو جاتی۔ لیکن اگر اس زمانہ کے آدمی میں خفیف سی نقل کرنے کی لیاقت اور خاص لفظی وسعت تھی تو ممکن ہے کہ انسانی تقریر کی ابتدا اسی حالت میں ہوئی ہو۔ ہر ایک زبان سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ انمیں ان آوازوں کا استعمال بہت کیا گیا ہے جو صرف قدرت کی اصلی آوازوں کی نقلیں ہیں۔

یہ سوال بہت دلچسپ ہے کہ آیا ہماری موجودہ زمانہ کی تقریروں میں وہ ابتدائی آوازیں جو قبل انسانی وجود کے تھیں اب بھی موجود ہیں یا نہیں۔ بعض ہم موضوع و صاف لفظوں سے جو تمام دنیا کی قوموں میں عام طور سے پائی جاتی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ ابتدائی آوازیں اب بھی موجود ہیں اگرچہ زمانہ گزرتے گزرتے وہ بہت کچھ درست ہو گئی ہیں۔ مثلاً ہماری زبانوں کے قواعد میں حروف ندا وغیرہ۔

قبل انسانی زمانہ کی باقیماندہ آوازوں کے ایک مکمل مجموعہ کا یہاں ذکر نہیں ہو سکتا۔ مگر

یہ مضمون بہت ہی دلچسپ ہے۔ اگر کوئی علم تشریح داں جو تمام دنیا کی سیر و سیاحت کرے اور مختلف پسماندہ غیر مہذب قوموں میں زبانی اور چھوٹے بچوں کی آوازوں کا قبل اسکے کہ انہیں نقل کرنے کی قابلیت آ جاوے، مطالعہ کرے تو اس مضمون کی بابت بہت کچھ ذخیرہ جمع کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ لہجہ کا اثر معنی و مطلب پر بہت زیادہ پڑتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ قبل انسانی زمانہ میں زبانی گفتگو کے حالات کی بابت بہ نسبت ان لفظوں کے ان لہجوں سے بہت زیادہ ملتی ہے لہجہ چونکہ ہمارے جذبات کو ظاہر کرتا ہے اسی وجہ سے اسکا اثر دل و دماغ پر پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ ادنی حیوانات بھی انکے ذریعہ سے کسی بات کو بہت جلد سمجھ جاتے ہیں۔ اور یہ اثر صرف لفظوں کے ذریعہ سے کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ قدرت میں اظہار خیال کے لیے کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے اسکی وجہ سے کہ صرف ایک مہذ زبانی آوازوں کے ذریعہ سے اپنے خیالات کے اظہار کی وسعت کو بہت کچھ بڑھا سکتا ہے۔

ترکی اور جاپانی زبانوں میں لہجہ کا استعمال بہت کثرت سے ہوتا ہے۔ بلحاظ مختلف لہجوں کے صرف ایک لفظ بارہا مختلف معنی میں استعمال کیجاتی ہے۔ ان زبانوں میں بہ نسبت مغربی دنیا کی زبانوں کے قبل انسانی زمانہ کی ابتدائی تقریر کے نشانات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

اصل تقریر کے شروع ہونے سے ایک صریح فائدہ یہ ہوا کہ تجربہ کے حاصل کرنے اور انکے جمع کرنے کی قابلیت پیدا ہو گئی۔ فرض کرو کہ ہمارے اسلاف قدیمہ میں سے ایک کا جسکی قوت گویائی قریب قریب مہمل لفظوں تک محدود تھی کسی وحشی درندہ سے مقابلہ ہوتا ہے۔ اور وہ بمشکل تمام جان بچا کر اپنی جگہ پر واپس آتا ہے۔ وہ اپنے خوف زدہ چہرہ اور خون آلودہ جسم کو دیکھکر خود بخود تکلیف دہ اور پر درد آوازیں نکالنے لگتا ہے۔ اسکی مادہ اسکو اس خراب حالت میں دیکھکر اسکے رنج و تکلیف میں شریک ہوتی ہے اور ہمدردی ظاہر کرتی ہے۔ اور اس حادثہ کے حالات معلوم کرنے کی خواہشمند ہوتی ہے۔ وہ ان واقعات کے بتانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسکے الفاظ بہت ہی کم ہیں۔ اسکے بہت عزا چیخنے اور گرجنے تیز کچھ مخصوص حرکات اور نقلوں سے اس خاص درندہ کا پتہ و نشان معلوم ہو جاتا ہے

جس نے اُسپر حملہ کیا تھا۔ بجائے اسم کے وہ نقل کی ہوئی آوازیں استعمال کرتا ہے۔ اُس کے حرکاتِ جسمانی فعل کا مقصد پورا کرتے ہیں۔ اور اسمائے صفت کے لیے جو درد اور خوف کے درجے کی توصیف کرتے ہیں وہ اپنی جگر خراش اور پُر درد آواز کو کام میں لاتا ہے۔ بہرحال اُسکے نوجوان بچے جو اُسکے اِردگرد اپنی ایڑیوں کے بل بیٹھے ہوئے تھے، ان ٹوٹے پھوٹے حالات کے سمجھنے سے جو کہ اُس نے اپنی مہم کی بابت بیان کیے قاصر نہ رہے۔ اور یہ حالات اور تجربے اُنکے لیے بہت مفید ثابت ہوئے جب کبھی اُنکو کوئی ایسے موقع کا سامنا کرنا پڑا۔

جہاں تک ہمکو اُن جنگلی اور وحشی آدمیوں کی بابت علم ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب رات کے وقت الاؤ کے اِردگرد بیٹھکر اپنے اپنے تمام دن کے واقعات بیان کرنے کے عادی تھے۔ اور یہ حالات اکثر کسی گیت یا بھجن کی صورت میں کہے جاتے تھے۔ زمانۂ حال میں بھی وحشی انسان اپنے دن بھر کے تمام واقعات و مہمات گیتوں میں کہا کرتے ہیں۔ اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حالات کے گیتوں میں کہے جانے کا کیا مطلب تھا۔ غالباً ان واقعات کے بذریعہ گیت کہے جانے کی ابتدا اسی زمانہ میں ہوئی ہوگی جبکہ فن تحریر قطعی ایجاد نہ ہُوا تھا۔ اور اس طرح یہ گیت اور بھجن آئندہ فائدہ کے لیے یاد کیے جاتے تھے۔ تاکہ زمانۂ گزشتہ کا تجربہ قائم و محفوظ رہے۔ ان بھجنوں کے لیے لفظوں کے ایک اچھے خاصے مجموعہ کا ہونا لازمی تھا۔ گو کہ بلا شک و شبہ پہلے پہل ان نصیحت آموز گیتوں کے سمجھانے میں جسمانی حرکات و سکنات کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ یہاں تک کہ ایامِ موجودہ میں جنوبی امریکہ کے بعض وحشی قوموں کی زبانِ مروجہ اس قدر ناکمل ہے کہ وہ اندھیرے میں صرف باتوں کے ذریعہ سے مطلب براری نہیں کرسکتیں۔

عصر الحجر کی بابت اگر ہمکو کچھ معلوم ہے تو وہ یہ ہے کہ آدمی چھوٹی چھوٹی علیحدہ جماعتوں میں رہا کرتے تھے اور صرف شکار کے ذریعہ سے وہ اتنے زمانہ تک بسر کرتے رہے جو تاریخی زمانہ سے سو گنا ہے۔ یہ معلوم ہونے پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ اس زمانہ کے اختتام پر ابتدائی جہالت سے باہر نکلتا ہے اور عملی طور پر اُسکا جسم اور دماغ انسان سے ملتا جلتا ہے۔

بلا کسی شک و شبہ کے اس زمانہ کے دوران میں جماعتوں اور آپس میں ہمسری و رقابت کے جھگڑے ہُوا کرتے تھے اور ہر ایک جھگڑے کا نتیجہ کسی جماعت یا کسی فرد کے ختم ہو جانے پر مبنی تھا۔ بہت سی قومیں مثلاً نیانڈر (Neander men) اس ہمسری میں ناقابل ثابت ہوئیں اور آخرکار لڑائی جھگڑے میں بالکل نیست و نابود ہوگئیں۔ زمانۂ حال میں بھی جہاں پر چھوٹی چھوٹی جماعتیں صرف شکار اور مچھلی پر گزارا کرتی ہیں وہاں شکار کے حقوق اور حدود پر ہمیشہ جھگڑے ہوا کرتے ہیں۔ اور یہ جھگڑے سر کے کاٹنے، خون کا بدلہ لینے۔ اور اپنی جماعت کی شہرت بڑھانے کی کسی قسم کی اغراض سے نہیں ہوتے اس لیے اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ اُس نہایت وسیع زمانہ میں جو تاریخی زمانہ کے قبل تھا، جماعتوں اور آدمیوں میں آئے دن کی لڑائیاں ہوا کرتی تھیں، تو کوئی حرج نہ ہوگا۔ اور یہ لڑائیاں اُنکی قسمت کا فیصلہ کیا کرتی تھیں کہ کون سی جماعت زندہ رہنے کے قابل ہے۔

یہ معلوم کرنا بہت آسان ہے کہ قوت تقریر نے ان لڑائیوں اور جھگڑوں میں بہت اہم کام کیے ہونگے۔ غالباً اس بات کے فیصلہ کرنے میں کہ کون سی جماعت یا کونسا خاص فرد زندہ رہنے کے قابل ہے۔ دماغی قوتوں کا استعمال کسی اور طرح نہ ہوا ہوگا۔ یقیناً وہ آدمی جو دوسروں کو اپنی طرف بذریعہ تقریر رجوع کرنے کے قابل تھا، ہمیشہ اپنے اُن ہمسروں پر غالب ہا جو اُس سے زیادہ وحشی تھے اور بات چیت نہ کرسکتے تھے۔ اسی طرح وہ جماعت جو اپنے میں صلاح و مشورہ کرنے کے قابل تھی، بہت آسانی سے دوسری جماعت کو مغلوب کرلیتی تھی کیونکہ دوسری جماعت میں لڑائی کے مطلب کے لیے کافی گفتگو کی لیاقت نہ تھی۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ انسانی تقریر کی روزافزوں ترقی کے دوران میں ہمیشہ دماغی خیالات کا اظہار بذریعہ اعضائے جسمانی یعنی زبان اور حرکات جسمانی کے مکمل طور پر نہ ہوسکا۔ زمانۂ حال میں بھی گو کہ ہماری لغتوں کا ذخیرہ اس قدر بڑھ گیا ہے اور ہمکو اظہار خیالات میں بہت قدرت حاصل ہے۔ پھر بھی ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم جس وقت لکھنے بیٹھتے ہیں یا کوئی تقریر کرتے ہیں تو

اپنے آپ کو دماغ کی مکمل اور بالکل صحیح ترجمانی سے قاصر پاتے ہیں۔

یہ معلوم کرنا کہ دماغ میں اندرونی خیالات کا پیدا ہونا کب سے شروع ہوا جبکہ تبادلۂ خیالات کا بذریعہ لفظوں کے نام و نشان بھی نہ تھا، ایک معما ہے۔ جس کا حل ہونا ہماری قدرت سے باہر ہے۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم سبھوں کے اندر ایک غیر معلوم زبان بولی جاتی ہے جسکا مکمل، صحیح اور قابل اطمینان ترجمہ کتنے ہی لفظوں کے ذخیرہ سے نہیں ہو سکتا ہے۔ یہی حالت علم ریاضی کی ترقی کی بابت ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ درجہ بدرجہ انسان نے اُس علم کو جو کہ قدرتاً اس میں موجود تھا علامتوں اور نشانات کی صورت میں تبدیل کر لیا۔ اور یہ علامات وغیرہ اُسکی انگلیوں کے شمار پر منحصر تھے۔ اسکو خیال کرنے سے حیرت ہوتی ہے کہ اگر اُس زمانہ میں دیکھو کوئلہ کی تہین مین پہنیں اُس پہلے حیوان کی جو کہ سب سے پہلے نمودار ہوا بجائے پانچ انگلیوں کے مچھلی کے پر کے مانند بہت سی انگلیاں ہوتیں تو تمام عالم ریاضی میں ایک بہت بڑا تغیر و تبدل ہوتا۔

ایک تھوڑے سے غور و خوض کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جانور کو ہر ایک حرکت میں مثلاً ایک بکری کو جو چٹانوں چٹانوں کودتی پھرتی ہے ایک خاص قسم کے علم ریاضی و طبعی کے سوالات درپیش آتے ہیں اور وہ اُسکی نسوں اور پٹھوں کی ساخت اور بناوٹ سے حل ہوتے جاتے ہیں۔ کسی اونچی چٹان پر پہنچنے کے لیے پہلے جانور اُس طاقت کا اندازہ کر لیتا ہے جسکی ضرورت نسوں اور پٹھوں کو اُسکے قدم کو وہاں تک پہنچانے کے لیے ہوگی۔ اور پھر مختلف نسوں اور پٹھوں کو اپنا اپنا کام کرنے کیلیے حکم دیتا ہے۔ اور اگر حرکت کیے جانے والے وزن یا متحرک شے کی قوت کے حساب یا شمار میں غلطی ہو جاتی ہے تو اکثر موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان ریاضی کے مسئلوں کا حل ہونا کسی مقررہ وزن یا پیمانے کے بغیر بالکل ناممکن ہے۔ مگر یہ کوئی شخص نہیں معلوم کر سکتا کہ ہمارے اعصاب اور پٹھے ان سوالوں کو کس طرح حل کرتے ہیں۔ ہمارے چلتے پھرتے وقت ایسے سوالات اکثر پیش آجایا کرتے ہیں اور وہ اکثر آسان اور کبھی اس قدر دقیق و پیچیدہ ہوتے ہیں کہ شاید ہمارے ہیئت دانوں نے بھی اجسام سماوی کے حرکات معلوم کرنے میں ایسے اہم سوالات نہ کیے ہوں۔ گو کہ یہ تمام

واقعات مثل ہماری زندگی کے صریحاً بہت ہی آسان معلوم ہوتے ہیں۔ مگر درحقیقت اسقدر بعید از فہم اور مخفی ہیں کہ اُسکے مقابلہ میں وہ علم الٰہیات کے مسئلے جنکے حل کرنے میں پُرانے فلسفہ داں بالکل محو ہو رہے تھے، صرف لڑکوں کے کھیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

ہماری لفظوں کا مجموعہ بہت ہی اچھی حالت میں بھی سوائے اُن آوازوں کے ذخیرہ کے اور کیا ہے جو کہ ہمنے اپنے وحشی حالت سے انسانی حالت تک پہنچنے میں جمع کیا۔ دماغ کے اندرونی خیالات جنکا ترجمہ یہ الفاظ بہت ہی ناقص طور پر کرتے ہیں۔ صرف خود ہم کو اچھی طرح سمجھ میں آتے ہیں مگر جب اُنکو کسی دوسرے شخص تک پہنچانا چاہتے ہیں تو ہم ایک گونگے آدمی سے کچھ تھوڑی ہی اچھی طرح سے سمجھا سکتے ہیں۔

آیا کہ کوئی ایسا نیا طریقہ معلوم ہوگا جس سے ہم اپنے خیالات اندرونی کا جو تعجب خیز دماغ کے خزانہ میں پیدا ہوتے ہیں، دوسرے پر مکمل طور سے انکشاف کر سکیں اور اس راستہ میں ہمارے طریقۂ اظہار خیالات پر قادر ہونے کی وجہ سے لگاتار رکاوٹ نہ پیدا ہو۔ یہ صرف قیاس کیا جا سکتا ہے۔

Thought-transference سے کچھ اس طریقہ کی بابت مدد مل سکتی ہے۔ اگر یہ ذرا اور اچھی سمجھ اور قابو میں آگیا، اگر یہ طریقۂ تبادلۂ خیالات کبھی بھی تکمیل پر پہنچ گیا تو یقیناً ہم اُن ساتھیوں سے ہل مل کر بیٹھنے کے لائق ہو سکیں گے جنکو ہم کسی حد تک گونگا کہتے ہیں۔ اور اس حد کا قیاس کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ نامعلوم زبان جو کہ ہم سبھوں کے اُن فلسفانہ ممکنات میں سے ہے جو کتاب جنگل بُک Jungle Book کے مصنف ڈکٹریال اور دوسروں نے خیال کیا ہے۔ اُسمیں انکا ہیرو جو عام طور سے ایک لڑکا ہوتا ہے درندوں پرندوں کی آواز سیکھتا ہے اور انکے ساتھ رہنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

جو کچھ میں نے ابتک بیان کیا وہ صرف خیالات و قیاسات ہیں جو کہ فی الحال جس قدر دلچسپ ہیں اُسی قدر بے سود ہیں۔ اب ہم اپنے کو اُن باتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو موجود، ضروری اور قابل حصول ہیں۔ (باقی دارد)

مکالمۂ حسن و عشق

تشبیب قصیدہ

شرم کی بات نہیں کچھ تمہیں اپنی ہی قسم
کیا کہا پھر تو کہو اہلِ وفا تم ہو کہ ہم

آنکھ تو چار کرو میری طرف تو دیکھو
میں بھی کچھ عرض کروں تم تو نہ ہوگے برہم

آج چھیڑا ہے اگر مجھکو تو انصاف ہے شرط
ورنہ جو چاہے وہ کہہ لو سرِ تسلیم ہے خم

بے زباں مجھکو نہ سمجھو فقط اتنا ہے خیال
تم خجل ہوگے کروں گا میں اگر ذکرِ ستم

کچھ زباں سے نہ کہا تم نے مرے منھ پہ مگر
تم مبادا ہوے مغموم تو ہوگا کسے غم

مسکراتے ہوے اُس آفتِ جاں نے یہ کہا
جو ترے دل میں ہو کہہ مجھکو مرے سر کی قسم

مطلع

عرض کی میں نے کہ غیروں پہ نہیں چشمِ کرم
ہنس کے فرمایا یہ سچ ہے تو وفادار ہیں ہم

عرض کی میں نے کبھی چشمِ کرم مجھ پہ نہ کی
ہنس کے فرمایا کہ ناداں ہے یہی عین کرم

عرض کی میں نے یہ کیا کیا نہ ستم مجھ پہ ہوے
ہنس کے فرمایا کہ عاشق ہے تو کر شکرِ ستم

عرض کی میں نے میں کس منھ سے کروں شکرِ جفا
بولے جس منھ سے تو کہتا ہے مجھے ظلم شیم

عرض کی ہوگا مرا عقدۂ دل وا کب تک
بولے جس وقت کہ زلفوں سے مری دور ہو خم

عرض کی میں نے غمِ عشق ستاتا ہے بہت
ہنس کے فرمایا کہ دے کاش خدا سب کو یہ غم

عرض کی میں نے خطِ شوق کا لکھا نہ جواب
بولے کر شکر کہ تیرے نہ کیے ہاتھ قلم

عرض کی میں نے یوں خوں جگر میں کبتک ؛
ہنس کے فرمایا کہ جب تک کہ ترے دم میں ہے دم

قیدِ ہستی سے جو چھٹنے کا کیا میں نے سوال
بولے کچھ دن ابھی رہ اور گرفتارِ الم

عرض کی میں نے کہ ہے حسرتِ پابوس بہت
بولے پھر خاک میں مل جا صفتِ نقشِ قدم

عرض کی رحم کی اُمید پہ کب تک میں جیوں
بولے اسکے لیے کہہ سکتے نہیں کچھ ابھی ہم

عرض کی بس ہے مجھے ایک محبت کی نگاہ
بولے کس کس پہ کریں ہم نگہِ لطف و کرم

عرض کی میں نے تو کیا رحم نہ کھاؤ گے کبھی
ہنسکے فرمایا کہ ہاں اسکی تو اُمید ہے کم

عرض کی میں نے کہ ہے بارِ گراں تن پہ یہ سر
ہنسکے فرمانے لگے تجھکو مرے سر کی قسم

عرض کی حسن کے جلوے مرے دل میں دیکھو
بولے کیا خوب ہے، دل کے بھی محتاج ہیں ہم

عرض کی میں نے یہ سب ہے مری تقدیر کا پھیر
ہنس کے فرمایا کہ پھر کر گلۂ بخت دژم

حسنِ سبزہ اب تو ہے مرغوب مجھے میں نے کہا
ہنسکے فرمایا کہ ناداں یہ ترے حق میں ہے سم

عرض کی اب تو جگر میں نہیں اک بوند لہو
ہنسکے فرمایا کہ کر اور خطِ شوق رقم

ڈبڈبا آئے مری آنکھوں میں آنسو تو کہا
تجھپہ ہنستا ہے انھیں پا تو ہے سارا عالم

عرض کی میں نے مرے دل میں ہے گہرا اک زخم
ہنسکے فرمایا کہ پھر ہو گا رہینِ مرہم

عرض کی میں نے شبِ ہجر ہے بس یا میں ہوں
بولے کر شکر ہے کوئی تو شریکِ غم و ہم

پوچھا دکھلاؤ گے اعجازِ مسیحائی کب
ہنس کے فرمایا جب آئے گا لبوں پر ترا دم

عرض کی میں نے دمِ نزع تو آؤ گے ضرور
ہنسکے فرمایا کہ ہاں شاہِ ولایت کی قسم

صدق جائسی

نزاکتِ محبت

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں تری کج ادائیاں — اتنا بھی اعتبارِ تمنا نہ چاہیے

رفیعہ، حسین نہ تھی مگر صورت بھولی پائی تھی۔ باتیں کرتے وقت اُسکا یہ انداز ہوتا جیسے شرمائی ہوئی۔ یہ ادا اُسکی ایسی دلفریب تھی کہ بتدریج، نصیر، اُسکا وارفتہ ہو رہا تھا۔ اور رفیعہ بھی نامعلوم طور پر اُ دلی جذبات کی پذیرائی کر رہی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سال کے بعد دونوں کو آپس میں محب ہونے کا احساس ہونے لگا۔ اور اب اُنکے تصورات نظارہ معاشقات میں محو رہنے لگے۔ اُن ملاقاتیں پر لطف ہوتیں، اور شوق آمیز۔ مگر زبان دلی خیالات کی ترجمان نہ بنتی۔ البتہ — آنکھیں ...... نظریں آپس میں ہمکلام ہوتیں اور راز ایک سینہ سے دوسرے سینہ میں غیر محسوس طور پر منتق ہو جاتا۔ تمنائیں باہم گلے ملتیں .... یوں چمنستان آرزو کی روشوں پر ونصیر کی روحیں گلگشت کیا کرتی تھیں۔ اور دونوں کے احساسات شمیم الفت کی نکہت بیزیوں سے معط رہتے تھے۔ یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ان دلچسپ خوابوں کی تعبیر کے لیے یہ محبت کرنیوالی ہستیاں بےچین ہو اُمنگیں پیدا ہوئیں۔ اشتیاق بڑھا۔ امیدوں نے متشکل ہونے کا میلان ظاہر کیا اور خمار تعشق کیفیت سر سے پاؤں تک چھا گئی۔

مگر عملی دنیا نسائیت کو ممتاز کرنیوالی کوششوں کا خیر مقدم کرنے کی روادار نہیں۔ اسلیے نصیرا صرف نصیر کی تخئیل متحرک بالذات ہو کر ارادہ کی کیفیت میں منتقل ہوئی اور سعی تمنا ریز نے قدم اُمید بڑھایا۔ موقع پاکر، ایسا موقع جو وقت کا مبارک ترین جز سمجھا گیا تھا۔ نصیر نے اُس بیجا نازش شفقت بز سے آلودہ ہو کر جو رفیعہ کی ماں بحیثیت خالہ ہونے کے اُسپر مبذول رکھتی تھی، اپنی استدعا کو شرف قبولیت بخشنے کی التجا کی۔ جو ایک "ہاں" کا مفہوم رکھنے والی نہیں، سے متبسم طور پر ٹالدی گئی۔ اس سے نصیر دل اور بھی گدگدایا۔ اب سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ خواہش، حسنِ طلب کی صورت میں نمودار ہونے لگی

لطافت پیرایہ کی گوناگونیوں سے بلندی ذہن کا ثبوت ملنے لگا اور تال کار۔ نفی۔ نے مجبور ہوکر۔ اثبات میں منتقل ہونا قبول کیا۔ ع۔ للہ الحمد ٹھکانے لگی محنت میری۔ لیکن۔ نصیر۔ اُسکی خالہ۔ اور رفیعہ کے سوا کوئی متنفس اس قرار داد سے واقف نہ ہوسکا۔ اس لیے کہ عدم اظہار کی پابندی کا ایک مدت غیر معینہ مشروط الاجازت کے لیے عہد لیا گیا تھا۔ لیکن بے پایانیِ شوق اسکی متحمل کیونکر ہو۔ دن نہیں گزرتے۔ گھنٹے مہینوں سے بڑھ گئے اور مہینے سالوں سے۔ آخر ضبط کی کوئی انتہا بھی۔ دل ملانے تو کس طرح۔ مجبوراً نصیر کی طرف سے تقاضا شروع ہوا۔ اور پھر تواترِ سفارش۔ اُدھر سے الزام عہد شکنی قائم ہونا لازمی امر تھا۔ اُسپر استعمالِ سکوت۔

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

اسی کے ساتھ ایک دلچسپ بات یہ ہوئی جو فطرتِ نسوانی کا اقتضائے دلکش تھا کہ اظہار مقصد کے بعد رفیعہ کا طرز عمل بالکل مغائرانہ ہوگیا اور ہر انداز میں ایک قسم کی بیگانگی پائی جانے لگی۔ مگر نصیر ہمیشہ اُس میں ایک بیتابانہ گرم جوشی مضمر پاتا۔ جسکی تصدیق رفیعہ کے غیر ارادی افعال سے ہو ہوگئی۔ اس طرح دونوں کے نہاں خانہائے دل اعتبارِ محبت کی کرنوں سے منور رہنے لگے۔ اور یہ آب وہوا نشوونمائے تمنا کے لیے اور بھی موافق ہوئی۔

دو موسم بہار انھیں پُرکیف لذتوں میں ایک پرامید جدوجہد کی بے قراریوں میں گزر گئے۔ اور زندگی میں کوئی کارآمدیات انقلاب واقع نہوا۔ اور شاید ابھی چندے اور نہ ہوتا۔ مگر معلوم نہیں کیا وجہ ہوئی کہ تھوڑے عرصہ سے نصیر کے دماغ میں ایک جدید شخص منظور کا تصور آنے لگا۔ کبھی کبھی وہ دل ہی دل میں اپنی حالت سے اُسکی حالت کا موازنہ کرتا۔ اپنے اور اُسکے رسوخ کا اندازہ لگاتا اور پھر کسی پس و پیش میں پڑجاتا۔ بلحاظ عمر کے منظور شاید نصیر سے کچھ دن چھوٹا تھا۔ مگر دنیاوی اعزاز کے لحاظ سے جو بذریعہ روپیہ کے خریدا جاتا ہے بڑا۔ صورت شکل میں تفاوت تو ضرور تھا۔ لیکن جسمانی وجاہت میں کوئی فرق نہ تھا۔ البتہ طبیعتیں دونوں کی بالکل مختلف تھیں۔ اور سب سے زیادہ مابہ الامتیاز امر اس بارے میں ایک کی بدچلنی اور دوسرے کی نیک رفتاری تھی۔ مگر نصیر کی کم مائگی کی تلافی کیرکٹر کی درستی سے نہ ہوسکتی تھی

ہاں منظور کی فراغ بالی ایک حد تک اُسکی بدخیالیوں کی پردہ پوش تھی۔ اور اسلیے اگر کسی خاص وجہ سے دونوں کا تقابل کرنا پڑے تو دولت سے مرعوب ہوجانیوالے اشخاص کے ووٹ زیادہ تر منظور ہی کے حق میں ہوں گے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ آزاد رائے رکھنے والے اشخاص کی تعداد زرپرست افراد کے مقابلہ میں ہر لحاظ و اعتبار سے جملہ سوسائیٹیوں میں بہت کمی کے ساتھ ہے۔ بلکہ بیشتر صورتوں میں انعدام کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ نصیر اس سوچ میں پڑکر اسقدر غلطاں پیچاں ہوجاتا گویا کسی سخت ذہنی افتاد میں مبتلا ہے۔ بعض اوقات اُسکے چہرہ سے نہائی مایوسی کے آثار ظاہر ہوتے۔ اور وہ غایت دلگیری سے مجبور محض ہوجاتا۔ جیسے کوئی بڑا بوجھ اُسکے قلب پر پڑا ہے۔ مگر ایک شعاعِ اُمید سے جسمیں اعتماد اور بھروسہ کی جھلک نمایاں ہوتی تھی اُسکی فضائے تخئیل میں روشنی پیدا ہوتی اور وہ ایک طمانیت آمیز لمبی سانس لیکر اس بارِگراں سے سبکدوش ہوجاتا۔ یہ ایک عجیب کشمکش تھی جو اُسکی زندگی کے ورقِ سادہ کو نقوشِ وساوس سے پُر داغ بنا رہی تھی۔ اور وہ فراوانیِ آرزو کی مسرتِ مسلسل سے روز بروز محروم اور اندیشۂ حرماں میں مبتلا ہوتا جارہا تھا۔ اُسکے خواب بھی انھیں خیالات کی تائیدیں ہوتے۔ چنانچہ ایک دن اُس نے دیکھا۔

منظور ملنے آیا۔ اور دوران گفتگو میں خواہش ظاہر کی کہ چینی کا وہ گملہ دکھاؤ جس میں سُنہری گلاب کی شاخ لگائی ہے۔ اُسمیں پھول آیا ہُوا تھا۔ بہت شوخ۔ نہایت حسین جسکی تازگی سے نصیر کی آنکھوں میں طراوت رہتی تھی۔ اُس نے ٹالنا چاہا۔ ارادہ کیا کہ "گلِ زریں" کے گملہ کو چھپا دے۔ مگر منظور نے تیزی سے بڑھکر پھول توڑ لیا۔ ناقدردان ہاتھوں میں جاتے ہی اُسکی پتیاں منتشر ہوکر گرنے لگیں منظور نے جھنجھلا کر اُسے زمین پر پٹکا اور اپنے بھاری بوٹ سے اُس نازک و نفیس شے کو پامال کر ڈالا۔ نصیر اسکی تاب نہ لاسکا۔ گھبرایا۔ اُسکا دل گھٹنے لگا۔ اور ایک دھواں سا دماغ کی طرف اُٹھکر گیا۔ تمام جسم میں گرمی محسوس ہونے لگی۔ زبان خشک۔ حلق میں کانٹے۔ پیاس کی شدت میں ہاتھ بڑھاکر بلوری گلاس اٹھایا۔ برف آمیز شربت میں کیوڑہ پڑا ہوا تھا۔ پستہ کی ہوائیاں تیرتی ہوئی۔ مُنھ تک نہ جانے پایا تھا کہ منظور۔ چالاک منظور نے مُنھ بند

زہر کی شیشی جیب سے نکالی۔ اور گلاس میں سم قاتل کا ایک قطرہ ڈال دیا۔ اُف۔ آنکھ کھل گئی۔ کس قدر خطرناک خواب تھا۔ کیا سچ مچ رفیعہ اُسکے ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ نہیں۔ نہیں۔ ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔ سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں۔

لیکن بسا اوقات بعض توہمات بھی واقعاتِ مستقبل کے رازدانِ حقیقت ہوتے ہیں۔ اور خودبخود پیدا ہونے والے اندیشے صورتِ عمل اختیار کر لیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ تنہائی تعلقِ خاطر کی حالت میں انسان چھوٹی سے چھوٹی باتوں کو گہری نگاہوں سے دیکھتا اور خفیف سے خفیف امور پہ تعمق کے ساتھ غور کرتا ہے جسکے لامحالہ دو نتیجے نکلتے ہیں۔ یا تو بدگمانی کی رو میں گم کردہ راہ ہو کر کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے یا بالکل علل و اسباب کی تہہ پر صحت کے ساتھ آ جاتا ہے۔ اور یہی جزالذ حالت نصیر کو پیش آئی۔ وہ جانتا تھا کہ رفیعہ پر اقتدار رکھنے والے افراد کا رجحان طبعی طور پر مقابلۂ اُسکے منظور کی طرف جو تمول کی پُرفریب صفت سے متصف ہے یقیناً ہوگا۔ اور حالات بھی اس قسم کے تھے کہ منظور جیسے چالاک شخص کے لیے ان لوگوں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کی وجہ تحریک موجود ہو۔ چنانچہ اب اُس نے اچھی طرح محسوس کرنا شروع کیا کہ رفیعہ کی ماں کا انداز کسی قدر استغنا سے بدلنے لگا ہے۔ اور اُسکی توجہ کسی دوسری طرف رفتہ رفتہ منتقل ہو رہی ہے۔ یہ ایک دردناک علم تھا جو منظور کی رشتہ دوانیوں کی نسبت اُسے ہوا۔ مگر کسی اندیشۂ پنہاں سے وہ اُسکی علانیہ تصدیق کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ مگر تابکے۔ ایک روز گھبرا کر کہہ ہی اُٹھا۔

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں ملجائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے

باینہمہ اُسکی اُمیدوں میں اب بھی انجمادی کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ شیشہ ٹوٹا نہیں۔ غبار آلود ہو گیا تھا اُس نے پھر اپنے دل کو ڈھارس دی۔ اور پوری قوت کے ساتھ امتحان مقابلہ میں شریک ہونے کیلیے تیار ہو گیا۔ مگر طریقۂ نامزدگی نے اس توقع کو بھی پورا نہ ہونے دیا۔ اور اُسکی تمام حسرتوں پر پانی پھر گیا ع۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ تاہم ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ اُسے پھر بھی ایک پہلی اور کمزور ذات پہ اعتماد تھا۔ تمام تر آرزوئیں اُسی سے وابستہ تھیں اور ایک زبردست اخلاقی امداد کا

اُسکی طرف سے انتظار تھا۔ وہ سمجھے ہوئے تھا کہ ہر انسان کی زبان اُسکے دلی خیالات کی ترجمان ضرور ہوتی ہے اور جس روز یہ فرض ادا کر دیا گیا اُسکی تمناؤں کے پژمردہ باغ میں ضرور بہار آجائیگی۔ مگر آہ۔ اُسنے دیکھا کہ اب رفیعہ کی نگاہیں اُسپر تاسف آمیز ہمدردی کے ساتھ پڑتی ہیں۔ .... اُن سے معذرت بھی ٹپکتی ہے۔ اور اظہار مجبوری بھی۔ نصیر اس سے نہ صرف متاثر ہوا بلکہ بہت کچھ متالم بھی اس الم میں ایک ناگوار تلخی تھی۔ جس نے حسیاتِ لطیفہ کو مسموم بنا دیا۔ اسی پر بس نہیں۔ آگے چل کر غلط انداز نظریں غرور برتری سے لبریز ہوکر پڑنے لگیں۔ بالکل ہی آسرا جاتا رہا۔ اب تاویل باطل سے بھی طبیعت کو سہارا نہیں دیا جا سکتا۔ کسی طرح کی آس ہی نہ رہی۔ حرمان اندوزیوں کی انتہا ہو گئی۔ مگر یہ صدمہ جس قدر ناقابلِ برداشت تھا اُسی قدر ناقابلِ اظہار۔ نصیر کا دل بیٹھ گیا۔ اور روح ایک بوجھ سے دب گئی۔ وہ ایک ہیولائے محض تھا۔ جو معلوم نہیں کیونکر قائم رہا۔ اور عرصۂ دراز تک معطل و بیکار۔ یوں ہی وقت گذارا گیا اور زمانہ نے ایک مدت معینہ ختم کر لی۔ مگر قدرت نے کبھی کسی چیز کو ایک حالت پر رہنے کی اجازت نہیں دی۔ نصیر کو بھی ٹھوکر کھا کر سنبھلنا پڑا۔ اُٹھا۔ اور زندگی کی منزلیں طے کرنے لگا۔ لیکن اب وہ ایک ہستی بے پروا تھا یا ایک دلِ بے مدعا۔ بشاشی مطلق سے وہ محروم ہو چکا تھا۔ اور تازگی حیات سے معذور۔ خزاں کا اثر گلشن پر اتنا نہیں ہوتا۔ وہ عارضی طور پر جوش نمو کو آرام دینے کے لیے آتی ہے اور پھر بہار کے لیے جگہ خالی کر جاتی ہے۔ مگر غنچۂ دل ٹوٹنے کے بعد کسی طرح شگفتہ نہیں ہو سکتا۔ یہی انسان کے دل کی حالت ہے۔ جو نصیر پر اچھی طرح روشن ہو چکی تھی۔ اب اسے حسنِ اتفاق سمجھا جائے یا سوءِ اتفاق کہ اوراق زمانہ کی گردش نے اُن ناممکنات کو پھر ممکنات سے بدل دیا۔ جنکے واسطے نصیر جد و جہد کر کے تھک چکا تھا۔ اور جسکی ناکامی کی تاریکیِ عمیق نے امنگوں کی سطح مرتفع تک پہنچنے کے خیال کو بھی اُسکے دل سے نکال پھینکا تھا۔ سبب یہ ہوا کہ منظور کے در پردہ عیوب حسب اقتضاے معاشرت طشت ازبام ہو گئے۔ اور وہ اپنی شہرت شرمناک سے محجوب و منفعل ہو کر خود بخود پسپا ہونے لگا۔ نہ ہوتا تو کیا جاتا۔ گویا کیا ہی گیا۔ اُسکی موافقت کرنیوالے جھینپنے لگے۔ اور اُسکو متوقع کرنیوالے پشیمان ہوے۔ رفیعہ اور اُسکے اعزاء شرمندہ تھے اور متاسف نصیر

پر نظریں اُٹھ اُٹھ کر رہ جاتی تھیں۔ مگر استقبال کا رنگ کسی طرف نہ تھا۔ فریقین ایک تذبذب پیچیدگی میں مبتلا ہو گئے۔ اور ایک توقف کثیر کے بعد تصیر نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جس شمع کا پروانہ تھا اُس میں ضیا ہی باقی نہیں رہی۔ لہٰذا افسردہ کُن اسباب کو وجہ شادمانی بنانے کی سعی باطل ہی نہ کرنا چاہیے۔ یہی سکوت و خاموشی جو طاری ہے بہتر ہے۔

ہم بھی ہوں درپے انکار تو کچھ دور نہیں　　　کہ ترے جورِ فراواں کا تقاضا ہے یہی

واقعات کچھ بھی پیش آیا کریں۔ مگر وہ محبت جو ازلی و ابدی مسرتوں میں ملفوف ہوتی ہے۔ ایک ہی دفعہ کھلا سکتی ہے۔ درخت چھانٹ دیئے جانے کے بعد بڑھتے ہیں۔ مگر انسان مرکر زندہ نہیں ہوتا۔ روپیہ بار بار ملتا ہے۔ دل ایک دفعہ ٹوٹ کر دوسری مرتبہ نہیں جوڑا جا سکتا۔ گو چاکِ زخم سی دیا جائے۔ مگر اندمال قطعی ہونا محال ہے۔ کوئی اتنا رلائے ہی کیوں جو ہنسنے کی طاقت ہی نہ رہے۔

دیکھ لے ستمِ جاناں یہ نقشِ محبت میں　　　بنتے ہیں بدشواری مٹتے ہیں بآسانی

ارشد۔ تھانوی

جوانی میں حسینوں کی ادا مستانہ ہوتی ہے　　　سیہ آنکھوں کی جنبش گردشِ پیمانہ ہوتی ہے
رہیں روشن الٰہی داغِ فرقت تا بدل ہیں　　　یہی باقی ہیں جن سے رونق کاشانہ ہوتی ہے
بنے ہیں سنگِ طفلاں سنگِ راہِ معرفت اکثر　　　یہ ذلت درحقیقت عزتِ دیوانہ ہوتی ہے
محبت اس کو کہتے ہیں ترے رندانِ میکش کی　　　نگاہِ واپسیں بھی جانبِ میخانہ ہوتی ہے
رسائی ہو نہیں سکتی ہے شمعِ بزمِ عرفاں تک　　　جو ہوتی ہے تو رہبر سوزشِ پروانہ ہوتی ہے
پتہ یہ کوچۂ جاناں کا رکھنا یاد اے قاصد　　　وہاں خلقت فدائے نازِ معشوقانہ ہوتی ہے
رقیبوں سے مراسم ترک کرنا ہم کو مشکل ہے　　　وہی کرتے ہیں جن میں ہمتِ مردانہ ہوتی ہے
ابھی کعبہ کہاں اے رہروانِ جادۂ الفت　　　کہ پہلے یہ زمینِ عاشقی بتخانہ ہوتی ہے

گدایانِ درِ کاظم کی قسمت میں عزت ہے
شررؔ یہ وہ ہیں جن پر شوکتِ شاہانہ ہوتی ہے

تذکرۂ مولانا شیخ امام الدین (قدس سرہ)

آپ کے والد ماجد حضرت شیخ شاہ غلام احمد الدین احمدؒ اور جد امجد حضرت اوحد شاہ المعروف بہ بوی بدرالدین بھی چشتی قادری حنفی کامل بزرگوں اور مشہور صوفیوں میں سے تھے۔ وطن آپ کا رہتک اور جدی نسب حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کے خاندان میں بڑے بڑے کامل ولی اور عالم و فاضل اور مرتاض ہوئے ہیں۔ جو سلسلۂ چشتی یا قادری میں منسلک تھے۔ اور لوگوں کو انھیں دو سلسلوں میں مرید بھی کرتے تھے۔ سجادہ نشینی اور درس تدریس کا طریقہ بھی جاری تھا۔

آپ نے علوم مروجہ یعنی حدیث۔ تفسیر۔ فقہ۔ اصول۔ صرف۔ نحو۔ ادب۔ منطق۔ مناظر۔ ریاضی حساب وغیرہ میں پوری دستگاہ حاصل کرکے علوم باطنی کی طرف توجہ فرمائی اور چونکہ علوم دینیہ کی تکمیل حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی خدمت میں ہوئی تھی، علوم باطنی میں بھی شاہ صاحب ہی کے شاگرد ہونے کو اپنا افتخار سمجھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں شاہ صاحب کی باطنی توجہ سے کل مدارج تصوف طے کرکے باکمال متصوفین کی بزم میں صدر نشینی کے قابل ہو گئے۔

افسوس جیسے آپ کے حالات و کمالات علمی سے لوگ ابتک ناواقف ہیں ویسے ہی آپکی نادر اور مفید تصانیف بھی گمنامی کی حالت میں گنج مخفی کے طور پر پرانے کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں اور ردی حالت میں ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے نہ آپ کی کوئی کتاب ابتک چھپی ہے نہ کسی مورخ نے آپ کا تذکرہ کسی تاریخ میں لکھا ہے۔ خود میرے کتب خانے میں آپ کی کتابوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے جن میں بعض کے نام آخر میں درج ہیں۔ آپ فارسی علم میں بھی پوری استعداد رکھتے تھے۔ نسخ۔ شفیعہ۔ شکستہ۔ عربی نستعلیق۔ نہایت پختگی اور لطافت کے ساتھ لکھتے تھے۔ انشائے فارسی میں بھی ویسی ہی قدرت حاصل تھی جیسی عربی علم ادب میں۔ اسکا ثبوت آپکی فارسی تحریر بخوبی دیتی ہے۔

آپ فتوے نویسی میں ہمیشہ اعتدالی طریقہ اختیار کرتے اور تحقیقات کا پہلو اور تطابق

مات حنفیہ بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اکثر شرعی مسائل کو طریقت کے مسلکوں کے مطابق کر کے لکھتے جو ایک اہم کام سمجھا جاتا ہے۔ آپ کی مہر کی شکل یہ تھی :-

۱۲ ۴۶
امام الدین

اور دستخط کا عام طریقہ یہی تھا :- خادم الطالبین امام الدین عفی عنہ

امرا اور وسا اور آپ کے بہتوں شاگرد آپ کی ملاقات اور خدمت کو رہنا فخر سمجھتے تھے۔ صدر مقام اگرچہ دہلی تھا لیکن چونکہ صوفیائے کرام کی صحبت آپ کو بہت پسند تھی اور سیاحت کا بھی شوق تھا اس لیے کبھی کبھی لکھنؤ اور خیرآباد بھی تشریف لاکر مہینوں قیام فرماتے اور یہاں کے اہل کمال کی صحبت سے محظوظ ہوتے تھے۔

آپ چشتی قادری مشرب خود بھی تھے اور لوگوں کو انھیں خاندانوں میں مرید بھی کرتے تھے اور انھیں گھرانوں کے ذکر و شغل وغیرہ تعلیم فرماتے تھے۔ آپ کے شاگرد بہت اور مرید کثرت سے تھے۔ مجھے دو بزرگوں کے نام معلوم ہیں جو درج ذیل ہیں :-

(۱) جناب مولوی شیخ نفضل امام ابن شیخ محمد اسلم ابن قاضی ہیبت اللہ بہرائچی۔ فاروقی۔ چشتی۔

(۲) جناب مولوی قاضی منشی سید احمد حسین حنفی چشتی قادری جعفری ہاجی نیشاپوری رئیس سیتاپور۔ قاضی تحصیل مصرکھ۔

موخر الذکر آپ کے شاگرد رشید اور مرید بھی تھے۔ ان سے آپ کو بہت محبت تھی۔ یہاں تک کہ جب آپ اپنے وطن تشریف لیگئے اور شاگرد و استاد میں بُعد ہو گیا تب بھی برابر مراسلت جاری رہی اور تمام عمر رشتۂ الفت منقطع نہ ہوا۔ ان مراسلات سے اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنے شاگرد سے کس قدر محبت تھی۔

آخر عمر میں آپ اپنے وطن تشریف لیگئے اور وہیں بقیہ عمر گزار دی اور واصل بحق ہوئے۔ ۱۲۵۹ھ تک آپ بقید حیات تھے اسکے بعد کا پتہ نہیں۔

اب میں آپ کی اُن تصانیف کا ذکر کرتا ہوں جو میرے پاس موجود ہیں اور اب تک نہیں چھپی ہیں ان کتابوں کے دیکھنے سے آپ کے تبحر علمی اور فضل و کمال کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ وہ کتابیں یہ ہیں :-

(۱) رسالۂ نکاح اُردو۔ (۲) رسالہ در بحث مسائل جبر و اختیار فارسی۔ (۳) کتاب مسائل حیض و نفاس برائے عورات اُردو۔ (۴) تقریر مولوی صاحب دربارۂ حرمت متعہ بجواب یا قہ ضیغمہ مولفۂ مولوی سید محمد ابن مولوی دلدار علی نصیرآبادی امامیہ مذہب باب حلتِ متعہ۔ (۵) اشکال اربعہ در بحث مساحت و اقلیدس عربی۔ (۶) تحیۃ المناظرین در علم مناظرہ فارسی۔ (۷) تحفۃ الناطقین در علم منطق فارسی۔ (۸) کتاب رد وہابیہ۔ اسمیں وہ سوال مع جواب کے تحریر ہیں جو مولوی عبدالحی صاحب دہلوی غیر مقلد سے اور مولوی صاحب ممدوح سے جامع مسجد دہلی میں ہوے تھے۔ اُردو۔ (۹) کتاب الذبائح۔ عربی۔ ان کتابوں کے علاوہ آپ کے خطوط سے بھی ایک چھوٹا سا فقہی رسالہ تیار ہو سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی خط ہدایات اور حل مسائل اور نصائح دینی سے خالی نہیں ہے۔

آپ کی ایک غزل اور چند اشعار آپ کے شاگرد رشید کی بیاض میں ملے ہیں جو درج ذیل ہیں۔ سخن سنجان معانی مرتبۂ شاعری کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔

یارب از تو با دلِ مشتاق یاری ہا کنم
تا در ہر دو حرم را سجدہ و ملجا کنم

ہم حریمِ مرقدِ شیخین و اطھار بقیع
ہم ضریحِ کربلا و ہم نجف مرعیٰ کنم

بر سرِ زمزم دلم خواہد کہ شور شہا کند
پس محل فخر منظر مسجد اقصیٰ کنم

وز زیارتہائے عتبات دگر گیرم شرف
کاظمین و مشہد و بغداد را ماوا کنم

سنائبِ سود در قیامت شاہد حالم بود
در صفا و مروہ و عرفات استسعا کنم

کے شود کاندر منا در مجمع و جمِ غفیر
منخرط گردیدہ در بیت عشق اسعیٰ کنم

زود باشد کیں تمنایم برآری اے خدا
تا رہِ شام و عریسطے بر سرِ دریا کنم

باز گردو آرم اے رب سوئے غربت خانۂ
سیرِ صنع پاکِ تو در بلدۂ و صحرا کنم

نیز از درگاہِ تو ایں آرزو دارم الٰہ
با احبا قطعِ راہِ یثرب و بطحیٰ کنم

دیگر ایں دارم تمنا از جناب پاک حق
ذکر علم ظاہر و باطن بہ ہر ہر جا کنم

ہر چہ اہل و عیال و اقربا و دوستاں
واگذارم دیدنش در صحت بشریٰ کنم

گر مرا خوانی بسوے حضرتِ خود اے قدیر — باشہادت در جوار جدّ و اب مثوا کنم
بندہ ام عاصی امام الدین الٰہی با ہمہ — عود با خیر تن و مال از زیارتہا کنم

اشعار مدحیہ سید سالار مسعود غازی

عارف و واصل بحق سید سالار رہند — کشتہ راہ خدا قاتل کفار رہند
ہر کہ شدہ بر درت مطلب خود یافتہ — مقصد من ہم بخواہ اے شہ دادار ہند
اصل من است از عرب سیّد و صدیقیم — باز شدم از سنین ساکن دیار ہند
چونکہ دریں روزہا پیش تو آمد امام — حاجت دنیا و دیں بخش دریں دار ہند

سید الیاس حسین حنفی

غزل جناب محشر لکھنوی

مرا جینا غم فرقت میں اعجاز محبت ہے — کہ جو جو سانس ہے اک دفتر راز محبت ہے
جفاے دوست کی ہم سے حقیقت پوچھے کوئی — وفا کی آزمایش کے لیے ناز محبت ہے
تری ہر اک ادا میں دشمنی کے سیکڑوں پہلو — مری ہر اک روش میں شان انداز محبت ہے
فراق و وصل دونوں میں حیات دل کے لالے ہیں — کوئی بچ جاے قسمت سے تو اعجاز محبت ہے
فراقِ دوست میں رونے کی تکلیفیں سر آنکھوں پر — مگر یہ کیا کریں آنسو جو غماز محبت ہے
زیارتگاہ ارباب فنا وہ سر زمیں نکلی — جہاں پر زیر گردوں قبر جانباز محبت ہے
بناتا جاتا ہوں دل کی لحد اور رکھتا جاتا ہوں — نہ جانے انتہا کیا ہو یہ آغاز محبت ہے
سمجھ میں چارہ گر کی کچھ نہیں آتا تمھیں سن لو — مریضِ غم کی جو ہچکی ہے اک راز محبت ہے
پسِ مردن کسی سے ہم نہ بولیں گے نہ بولیں گے — کہ خاموشی میں پنہاں دفتر راز محبت ہے
ہوئی برباد خاکِ دل ہوا میں جب تو وہ بولے — ابھی گھبرا ہی گیا ایسا یہ آغاز محبت ہے

کوئی پوچھے جو شرح حسن جاناں کہہ دے اے محشر
خدائی بھر میں یہی دلسوز و دمساز محبت ہے

دلگداز کی نئی شان

مولانا عبدالحلیم شرر اُن بزرگان ملک میں سے ہیں جنھوں نے تمام عمر ملک اور خصوصاً اُردو علم ادب کی خدمت میں بسر کی ہے۔ اور اگرچہ بڑھاپا اُنکے سر پر منڈلا رہا ہے مگر اُنکے قلم میں وہی زور شباب موجود ہے بلکہ متانت پختگی، اور اصابت رائے میں روز بروز زیادہ ترقی نظر آتی ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے، کہ اس قابل قدر خدمت پر کوئی صحیح رائے قائم کیجائے جو اُنھوں نے ہر حالت میں بلا توقع ستایش و صلہ اُردو زبان کی کی ہے کیونکہ ابھی (خدا اُنکی عمر میں برکت دے) اُنکے قلم کی روانی سے بہت کچھ امیدیں ہیں لیکن اس قدر ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ عام طور پر ملک میں اور خاصکر ہماری قوم میں تاریخی مطالعہ کا شوق زیادہ تر انھیں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ مولانا شرر اعلیٰ پایہ کے مورخ ہیں اُنھوں نے تاریخ کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس فن کو اس طرح نہیں پڑھا جیسے حدیث کے طالب علم صحاح ستہ اپنے اُستاد کے سامنے پڑھ جاتے ہیں۔ بلکہ رائے اور اجتہاد کا دعوے رکھتے ہیں۔ لیکن انکی تاریخ دانی اور تاریخی تصانیف اس ذوق کے پیدا کرنے میں اتنی مددگار نہیں جتنی انکے ناولوں کی ہے۔ ان ناولوں نے چپکے چپکے پڑھنے والوں کے دلوں میں گدگدی پیدا کردی اور ناول و تاریخ میں صرف ایک ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ اور اسوقت پہلی دفعہ اُنھیں یہ معلوم ہوا کہ تاریخ بھی ناول سے کچھ دلچسپ نہیں ہوتی۔ یہ بیشک بہت بڑا کام ہے، لیکن اسکے ساتھ ہی ان ناولوں نے ایک اور کام بھی کیا اور وہ یہ کہ لوگوں میں عصبیت کا احساس پیدا کیا جو ہر قوم کے لیے دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔ گزشتہ و موجودہ و آیندہ زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ جو گزشتہ سے ناواقف ہے اُسکا حال ابتر ہے اور جس نے گزشتہ سے کام لیکر حال کی اصلاح نہ کی اُسکا مستقبل تاریک ہے۔ زمانہ مسلسل ہے۔ اور اس لیے ضرور ہے کہ حال کی اصلاح اور آیندہ کی فکر میں گزشتہ کو نہ بھلا دیں۔ ورنہ کھُلی ناکامیابی ہے۔ مگر اسمیں بڑی اعانت ایک اور طرف سے بھی ہوئی ہے۔ وہ دلگداز ہے۔ جو ہمیشہ انکے خیالات کے اظہار اور اشاعت کا بہت بڑا آلہ رہا ہے۔ اسپر بہت سے حادثات نازل ہوے اور مختلف انقلابات

کا دھاوا ہوا۔ مگر یہ لڑبھڑ کر آخر غالب آیا اور اب تک زندہ ہے اور روز بروز توانا و تنومند ہوتا جاتا ہے۔ اکثر صاحبوں کو اسکے بار بار بند ہو جانے اور دیر سے پہنچنے کی شکایت رہی ہے یہ شکایت صحیح ہے۔ مگر اس شکایت کے کرنے میں ہمیں اس امر کا خیال نہیں ہوتا کہ دلگداز کی حالت دوسرے رسالوں کی سی نہیں۔ دلگداز میں ایک ایسی خصوصیت ہے کہ ہمارے ملک کے رسالوں میں تو کیا شاید دنیا کے کسی رسالہ میں نہ ہوگی کہ وہ شروع سے آخر تک اڈیٹر ہی کے قلم کا لکھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ شیر بادیۂ ادب خود ہی شکار کرتا ہے اور دوسروں کا جھوٹا نہیں کھاتا۔ وہ دوسرے اڈیٹروں کی طرح ایک ایک کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ چاہیے تھا کہ لوگ ایک ہی قسم کی عبارت پڑھتے پڑھتے اکتا جاتے لیکن معاملہ اسکے برعکس ہے۔ باوجود بار بار بند ہونے اور دیر میں پہنچنے کے جب کبھی وہ شوقین ہاتھوں تک پہنچتا ہے تو پڑھنے والوں کو مایوس نہیں کرتا۔

مولانا شرر کے اکثر احباب کا یہ خیال تھا کہ زمانہ کے لحاظ سے اسکے رنگ میں کچھ تبدیلی ہونی چاہیے۔ لیکن مولانا کو اصرار تھا بلکہ ضد تھی کہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہی تو اسکی ایک بڑی خصوصیت ہے اور جو یہ نہ رہے تو پھر وہ دلگداز ہی نہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس رنگ میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے (کیونکہ اس سے مولانا خفا ہو جائینگے) مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس زمانہ میں اسنے نمایاں ترقی کی ہے۔ اسکے مضامین زیادہ دلچسپ، زیادہ پُر مغز اور زیادہ قابل غور ہوتے ہیں۔ خصوصاً مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کے عنوان سے جو مسلسل مضامین مولانا شرر کے قلم سے نکلے ہیں وہ نہایت قابل قدر ہیں اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو اب نہ مشاہدہ سے مل سکتی ہیں نہ غور و فکر کرنے سے اور نہ کتابوں میں دستیاب ہو سکتی ہیں اور نہ کتب خانوں میں۔ اُس زمانہ کے دیکھنے والے اب نہیں رہے اور اگر ہوتے بھی تو آیا وہ ان واقعات و نکات کو آج بیان کر سکتے۔ گو مولانا شرر اُس زمانہ کے نہیں ہیں، لیکن اُنھوں نے آخری جھلک دیکھی ہے، اور کم سے کم اُن لوگوں سے ملے ہیں، جنھوں نے اُس آفتاب لب بام کا نظارہ کیا تھا۔ اس کیفیت کے بیان کرنے کے لیے مولانا شرر سے ہی ادیب کی ضرورت تھی جنکا تخیل شاعرانہ، قلم فسانہ نگار اور دماغ مورخانہ ہے۔ اس قسم کے مضامین لکھنے والا ہمارے ملک میں

اب کوئی نظر نہیں آتا۔ افسوس ہے کہ اہل ملک نے کافی قدر نہیں کی۔ جس سے عام مذاق کا پتہ چلتا ہے لیکن وہ زمانہ جلد آئیگا کہ ہم ان مضامین کے لیے دلگداز کے پرچے ڈھونڈھتے پھرینگے اور نہیں ملیں گے۔ کیا اچھا ہو اگر مولانا ان مضامین کو الگ کتاب کی صورت میں شایع کردیں۔ ہمیں اپنے اہل مُلک سے جو صحیح مذاق رکھتے ہیں توقع ہے کہ اگر اُنھوں نے ان مضامین کا مطالعہ نہیں کیا ہے تو اب ضرور منگاکر پڑھیں۔ ان میں بہت سی چیزیں نئی نظر آئیں گی۔ اکثر مقامات پر انھیں پڑھتے پڑھتے ٹھہر جانا پڑے گا۔ بہت سی جگہ افسوس و حسرت اور کہیں کہیں مسرت کے آثار نظر آئیں گے۔ لیکن جب وہ اُس زمانہ کو اپنے زمانہ سے مقابلہ کرینگے تو ایک دوسری کیفیت پیدا ہوگی۔ یہ حقیقی تاریخ ہے جس کا پتہ تاریخوں میں نہیں۔ جن لوگوں کو اپنے ملک سے محبت، اپنے وطن کی تاریخ کا شوق ا۔ اپنی قدیم تہذیب کا کچھ کھوج لگانا مقصود ہے وہ ان مضامین کو ضرور پڑھیں اور لطف و عبرت حاصل کریں۔

عبدالحق۔ اورنگ آباد

جذبات

کچھ خبر ہے تجھے اے کشتۂ غم سوختہ جاں   سوز فرقت کا فسانہ ہوا مشہور جہاں
مل چکا خاک میں جل کر دل بیتاب و تواں   ایک سناٹا ہے سینے میں نہ شعلہ نہ دھواں

سینہ ام زاتش دل درغم جانانہ بسوخت
آتشے بود دریں خانہ کہ کاشانہ بسوخت   (خواجہ حافظ رہ)

صرفِ نیرنگِ زمانہ ہوئی ہستی میری   راس آئی نہ مجھے عیش پرستی میری
موت کے ہاتھ سے اُجڑی ہی جو بستی میری   سربلندی کا نتیجہ ہے یہ پستی میری

جس پہ غرّہ تھا مجھے آہ وہ حالت نہ رہی
دل میں ہمت نہ رہی جسم میں طاقت نہ رہی

گلشن عیش کی مستانہ روی یاد کسے   نغمہ پردازیِ دل بھول کے بھی یاد کسے
لطف جو کچھ کہ اُٹھایا تھا کبھی یاد کسے   کیوں مقدر سے ہوئی بدمزگی یاد کسے

جو ابھی یاد تھیں باتیں وہ ابھی بھول گئے
بخت برگشتہ ہوا جب تو سبھی بھول گئے

لائی ہے مژدۂ جاں بخش بلا میرے لیے　　　خوب ہے خوب زمانہ کی جفا میرے لیے
رہبرِ منزلِ مقصود قضا میرے لیے　　　شمعِ کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا　(حضرت غالب ؒ)

اتفاقاً جو میں پابندِ بلا ہوتا ہوں　　　داخلِ زمرۂ اربابِ ولا ہوتا ہوں
رہروِ مسلکِ تسلیم و رضا ہوتا ہوں　　　جادہ پیمائے غمِ شاہِ ہدیٰ ہوتا ہوں
سنگِ غم سے بھی اگر شیشۂ دل ٹوٹے گا
دامنِ صبر مرے ہاتھ سے کب چھوٹے گا

مطمئن اہلِ فنا عالمِ فانی میں ہیں　　　سخت غفلت ہے اگر جوشِ جوانی میں ہیں
گو کہ سر تا بقدم خاک نشانی میں ہیں　　　کیا وہ ابھریں گے جو ڈوبے ہوئے پانی میں ہیں
چونکتے ہی نہیں طوفاں جہاں دیکھ کے بھی
سوتے ہیں قبر کا تاریک مکاں دیکھ کے بھی

دل دکھاتا نہیں کچھ منزلِ وحشت کا خیال　　　روغنِ دل سے جلاتے ہیں شمعِ اعمال
دارِ حسرت ہی کو سمجھے ہیں وہ دار المآل　　　اس تغافل کا نہیں جانتے کیا ہوگا مآل
کام آئیں گے وہاں دوست نہ مال و دولت
ہاں مگر۔ نیک عمل۔ اور خدا کی رحمت

یاد وہ ایام کہ تھا گلشنِ بیدار جہاں　　　تھا ہمارے لیے اک یارِ وفادار جہاں
آسماں برسرِ مہر اور تھا غمخوار جہاں　　　ہو گیا آہ مگر اب ستم اطوار جہاں
پڑ گئی کشمکشِ ہجر میں جانِ قدسی　　　جوش زن دیدۂ خونناب فشانِ قدسی

۱؎ از حضرت نیسر مرحوم۔

نظرے خوش گزرے

مرقع ادب

یورپ کی ہر زبان میں مشہور اور باکمال اصحاب کے خطوط جمع کر کے چھپتے رہتے ہیں اور بعض مجموعے تو اس قدر مقبول ہوئے ہیں کہ انکا شمار بہترین ادبی کتابوں میں ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں بھی مرزا نوشہ کے خطوط کا مجموعہ اسی قبیل کا موجود تھا۔ اور کچھ عرصہ ہوا جناب منشی محمد احسن اللہ ثاقب نے خطوط منشی امیر احمد بھی شایع کیے تھے لیکن زندہ انشا پردازوں کی تحریروں کا ابتک سوائے ایک مختصر رسالہ کے جو انشائے اردو کے نام سے جناب قیصر نے شایع کیا تھا کوئی قابل قدر مجموعہ نہ تھا۔ اس کمی کو ہمارے دوست منشی محمد ندر علی صفدر مرزاپوری نے حال ہی میں رفع کر دیا ہے۔ مرقع ادب میں پچاس سے زائد اصحاب کے خطوط ہیں جن میں سے بعض خود مولف کے نام ہیں ورنہ بیشتر دوسرے صاحبوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ ملک میں جتنے نامور اہل قلم اور مشہور انشاپرداز ہیں بعض خاص مستثنیات کے سوا تقریباً سب ہی کے خطوط اس میں نظر آتے ہیں جن میں سے حضرات ذیل کی تحریریں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت امیر مینائی مرحوم۔ خان بہادر سید اکبر حسین اکبر۔ جلیل القدر جناب جلیل۔ خواجہ حالی مرحوم فصیح الملک حضرت داغ مرحوم۔ حضرت ریاض خیرآبادی۔ حضرت شوق قدوائی۔ جناب شاد عظیم آبادی۔ مصنف البرامکہ و نظام الملک طوسی مولوی عبد الرزاق کانپوری۔ مسٹر ایم مہدی حسن (افادی الاقتصادی؟) جناب سید علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی۔ پروفیسر نواب علی ایم اے۔ شروع میں اُن تمام اصحاب کا مختصراً ناظرین سے تعارف کرایا گیا ہے جنکی تحریریں اس مجموعہ میں درج کی گئی ہیں۔ اور مقدمہ نویسی کا دلخوش کن فرض منشی محمد حسین نحوی سب اڈیٹر الناظر نے ادا کیا ہے۔

خطوط، قطع نظر اسکے کہ ادب کی ایک ضروری صنف ہیں اس وجہ سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز ہوتے ہیں کہ۔ راقم تحریر کو چونکہ پہلے سے اُنکے شایع ہونے کا خیال نہیں ہوتا اسلیے وہ پوری بے تکلفی کے ساتھ مختلف موضوع پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اور بعض اوقات اپنے دل کی ایسی

باتیں لکھ جاتا ہے جو اندیشۂ اشاعت کی صورت میں کبھی قلم سے ادا نہ ہوتیں۔ چونکہ اس مجموعہ کے تمام خطوط ایسے اصحاب کے لکھے ہوئے ہیں جن کو شاعری اور ادب کے سوا دوسرے مباحث سے چنداں سروکار نہیں اس لیے ملکی اور قومی معاملات کے ذکر سے مرقع ادب کے صفحات خالی ہیں اور ممکن تھا کہ اس باعث کتاب کی دلاویزی اور مقبولیت میں فرق آجاتا مگر تنوعِ خیالات بجائے خود اپنے اندر اس قدر دلفریبیاں رکھتا ہے کہ ایک ورق کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا خودبخود الٹ جاتا ہے تاآنکہ کتاب کے خاتمہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور بعض تحریریں اس قدر پُرلطف ہیں کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ جن میں مسٹر مہدی حسن کے خطوط بنام مولوی عبدالرزاق صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ دلچسپ تاریخی اور ادبی کنایات کے جن سے ذوقِ سلیم کو ایک خاص قسم کی لطیف تحریک ہوتی ہے۔ صاحب تحریر کی رنگینی خیال اور اُنکے طرزِ ادا کی ندرت و حلاوت حد درجہ لذت انگیز ہے۔

بعض اصحاب کی تحریروں کو دیکھکر یہ گمان ہوتا ہے کہ صاحب تحریر نے خاص مرقع ادب کے لیے یہ خطوط تصنیف فرمائے ہیں۔ اس قسم کی مشاطہ گری سے ادبی شان وشکوہ میں ضرور اضافہ ہوتا ہے لیکن آورد کی وجہ سے مزہ جاتا رہتا ہے۔ حضرت انجم نیشاپوری کی تحریر اور جناب نظم لکھنوی کا ایک طویل خط اور بعض دوسری تحریریں اسکی بیّن مثال ہیں۔ اور اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ جناب مؤلف کو ان خطوط کی اشاعت پر ایک حد تک ناز ہے، جیسا کہ اُنکے نوٹوں سے ظاہر ہوتا ہے لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بیساختگی تحریر کی لذت سے اُنھوں نے ہمیں ناحق محروم کردیا ہے۔

خالص ادبی تحریرات میں جہاں کہیں اشخاص کے آدابِ اخلاق معرضِ بحث میں آجاتے ہیں وہ حصہ تاریخی مواد کے لیے بہت مفید اور کارآمد ہوتا ہے۔ مثلاً ایک دوست نے اپنے دوسرے دوست کو خط لکھتے ہوئے ایک تیسرے صاحب کے متعلق نہایت آزادی کے ساتھ لکھا ہے کہ

"ایک دن ہاف بوٹ پہنے فرش پر چڑھ دوڑے۔ جہاں میں بیٹھا ہوں وہاں آئے۔ فقیر کا کمبل پڑا تھا اُس پر مع بوٹ سوار ہوگئے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ ہماری تہذیب و تمدن کو ٹھکرانے

آئے ہیں۔ ہماری شرقیت کی اس قدر توہین کرتے ہیں [illegible] ہو گئے۔ ارشاد ہوا کہ یورپین فرنیچر اپنے مکان میں رکھو ورنہ ہم سے دوستی نہ رکھو۔ اسی وقت [illegible] ہو گئے اور آج تک [illegible] گئے"

اتفاق سے پایا ایسے صاحب کا ذکر ہے جو ماشاء اللہ شاعر [illegible] ہونے کے علاوہ اصلاح معاشرت کے متعلق مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔ افسوس کہ اکثر درمیان صاحبان کی سنیئیت [illegible] اسی قسم کی لغزشوں اور خودپسندیوں کا شکار ہوتے اور ملک کی ترقی میں اپنی [illegible] کے خاطر رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔

مختلف صاحب کے خطوط اگر تاریخوار ترتیب دیے جاتے تو زیادہ اچھا تھا۔ اور امید ہے کہ آیندہ ایڈیشن میں اس ضروری اصلاح کو نظر انداز نہ کیا جائیگا۔ کتاب کی چھپائی میں اگرچہ خاصا اہتمام کیا گیا ہے مگر کثرت اغلاط کی بدنامی کا علاج نہ ہو سکا۔ اور بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ غلطنامہ ایسی عجلت اور بے توجہی سے بنایا گیا کہ بالکل نامکمل رہا۔

آخر میں ناشکری ہوگی اگر ہم اس کتاب [illegible] شوق [illegible] اور [illegible] کی تعریف نہ کی جائے جو اس ضروری مجموعہ کے وجود میں آنے کا سبب ہوئی ہے۔ اس [illegible] کتابوں کے اقتباسات نصاب تعلیم میں اگر داخل ہوتے رہیں تو طلبا کو جدید ادبی اصلاحات سے [illegible] مستفیض ہونے کا موقع رہے گا۔

کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہے اور مولف سے بمقام محلہ [illegible] مل سکتی ہے۔

ایسٹر کی تعطیل کے دوران جیسا کہ گزشتہ نمبر میں لکھا گیا تھا ندوۃ العلما کا سالانہ جلسہ بمقام لکھنؤ منعقد ہوا۔ بوجہ خاص مصروفیتوں کے ہمیں سوائے ایک اجلاس کے کسی موقع پر شرکت کا موقع نہیں ملا لیکن اسپر افسوس کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے کہ اگرچہ یہ سالانہ جلسہ کئی سال کے بعد منعقد کیا گیا تھا پھر بھی باہر سے بہت کم لوگ آئے تھے اور شہر کے لوگوں نے بھی کچھ زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ جسکا اصل سبب یہ ہے کہ ندوۃ العلما کے معاملات سے ایک عام بے التفاتی پیدا ہو گئی ہے۔ اس بے التفاتی کے وجوہ میں سب سے زیادہ نمایاں اور مؤثر وجہ وہ اختلاف عظیم ہے جسنے گزشتہ دو سالوں

نوٹ: قدر دانان الناظر کی خاطر الناظر کے عیسی لکھنوٗ نے بھی چند جلدیں منگوالی ہیں۔ خاکسار منیجر

کے اندر ندوۃ العلما کو بعض اخبارات کا خاص طور پر رہین منت رکھا ہے۔

جلسہ کے انعقاد سے پیشتر سنا گیا ہے کہ گروہ منتظمین کے نائبوں نے باہم ملکر سمجھوتہ کرلیا اور جو امر مابہ النزاع تھا یعنی مولانا خلیل الرحمن سہارنپوری کی نظامت، اسکے بارہ میں یہ طے پاگیا کہ وہ اپنی میعاد ختم ہونے کے بعد علٰحدہ ہو جائینگے اور انکی جگہ جناب مولوی حکیم سید عبدالحی صاحب نظامت کی خدمت انجام دینگے۔ حکیم صاحب موصوف کا علم و فضل، نیکی و صلح جوئی۔ ندوۃ العلما سے نہایت دیرینہ تعلقات اور اس سے انکی مخلصانہ دلچسپی۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ انھیں خاص طور پر اس عہدہ کے لیے موزوں بناتی ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ آپ سے بہت قبل متعدد دفعہ انکا نام بھی اس عہدہ کے لیے پیش کیا گیا۔ لیکن ہر موقعہ پر انھوں نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ چنانچہ اب کی دفعہ جلسہ کے انعقاد سے قبل جب اخبارات میں اس موضوع پر بحث شروع ہوئی تو انھوں نے ایک خط کے ذریعہ سے نہایت سچائی اور آزادی کے ساتھ اپنی ان معذوریوں اور مجبوریوں کو ظاہر کر دیا جنکی وجہ سے وہ اس عہدہ کو قبول کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انکی معذوریاں واقعی اور حقیقی نہیں تھیں بعض مجبوریاں عارضی یا علاج پذیر ہوا کرتی ہیں لیکن بعض جو انسانی فطرت و طبیعت کے متعلق ہوتی ہیں انکا نہ تو علاج ہی ہو سکتا ہے اور نہ وہ عارضی کہی جاسکتی ہیں۔ حکیم صاحب موصوف نے کھلے طور پر جب اس کا اعتراف کر لیا کہ وہ نہایت کمزور طبیعت رکھتے ہیں اور انتظامی امور کو انجام نہیں دے سکتے کیونکہ اسکے لیے قوت اور تحکم کی ضرورت ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بارگراں کو انکے ذمہ کیوں ڈالا گیا۔ اسکے صاف اور صریح معنی یہ ہیں کہ مولانا خلیل الرحمن کی موجودگی میں جن لوگوں کی دال نہیں گلتی تھی انھیں دسترس حاصل ہونے اور معاملات ندوہ کو عملی طور پر اپنا تابع بنانے کے لیے یہ طریقہ نکالا گیا ہے جو یقیناً ندوہ کے حق میں مضر ثابت ہوگا۔

اسوقت تو دونوں گروہ بظاہر خوش ہیں۔ منتظمین مقامی جو دو سال سے مورد مطاعن و الزامات بن رہے تھے گالیاں سنتے سنتے تھک گئے تو اسے غنیمت جانا کہ اس طریقہ پر انکو گالیوں سے بھی نجات مل جاتی ہے اور خود انھیں میں کا ایک شخص برسر اقتدار رہتا ہے اور گروہ مخالف جسکو

بتقلید علامہ شبلی نعمانی مولوی خلیل الرحمٰن کی ذات سے ایک قسم کی کاوش ہوگئی تھی جسکے ثبوت کیلیے اہلال اور وکیل کے گزشتہ فائل کافی شہادت ہیں اُس نے چونکہ اس نظامت کو توڑنے کے لیے زمین آسمان ایک کردیا تھا اس لیے گو ہر مقصود کے حاصل ہوتے ہی سارے قضیہ کی فاتحہ خوانی کردی۔ لیکن خود ندوۃ العلما پر اس تبدیلی کا کیا اثر پڑے گا اسکا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں، جن کو عملی کاموں کا تجربہ ہے یا جو باتوں کے سوا کچھ کرنا نہیں چاہتے۔

مولانا خلیل الرحمٰن مقرر، مصنف یا انشاپرداز نہیں تھے اور غالباً حریت پرستی اور ایثار کا جو معیار ہمارے دوستوں نے اپنے دلوں میں مقرر کر رکھا ہے اور جسپر واقعات نے ثابت کردیا کہ خود اُنکے ممدوح و محبوب علامہ بھی پورے نہیں اُترے۔ مولانا خلیل الرحمٰن کا دامن عمل ان سے بھی عاری ہو لیکن ان میں ایک بات تھی جو انھیں اس عہدہ کے لیے خاص طور پر موزوں بناتی تھی اور وہ یہ کہ کہ اُن میں انتظامی قابلیت اور قوت ارادی اچھی طرح پائی جاتی تھی اور یہی ایک سکرٹری یا ناظم کے لیے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ درکار ہے۔ اگر اس انتظام کے بجائے تقسیم عمل اس طور پر کیجاتی کہ مجلس ندوۃ العلما کے تمام کام متعلق کیے جاتے جناب حکیم صاحب قبلہ کے۔ اور دارالعلوم کا نظم ونسق اور بعینہ تعمیرات کی نگرانی مولانا خلیل الرحمٰن صاحب کے تحت میں دی جاتی تو غالباً سہولت اور عمدگی کے ساتھ کام چلتا۔ اور تجربہ آگے چل کر یقیناً اس اصول تقسیم کار کی سفارش کرے گا۔ بہرحال اب چونکہ جلسۂ انتظامی نے مولوی خلیل الرحمٰن صاحب کی علیحدگی اور حکیم سید عبدالحی صاحب کا تقرر منظور کرلیا ہے اس لیے ہماری دعا ہے کہ یہ انتظام مستقل، دیرپا اور مفید مطلب ثابت ہو۔ ہمیں اشخاص سے نہ کبھی بحث تھی اور نہ اب ہے۔ البتہ یہ ضرور تنا ہے کہ ندوۃ العلما اپنے مقاصد اصلی سے ہٹنے نہ پائے اور کام کام کے طریقہ سے ہوتا رہے اور یہی ہمارے خیال میں تمام ہی خواہانِ قوم کا مطمح نظر ہونا چاہیے۔

اسی اثنا میں جبکہ لکھنؤ میں ندوۃ العلما کے اجلاس ہو رہے تھے، ہمارے سب سے بڑے قومی مرکز علیگڑھ میں یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے ارکین جمع اور نہایت جوش و سرگرمی سے مصروف کار تھے

اس جلسہ کی روداد جو اخبارات میں شایع ہوئی ہے اُسے دیکھکر اس بات سے بہت اطمینان ہوا کہ ہندو یونیورسٹی بل کے اجلاس کونسل عالیہ میں پیش کیے جانے کی وجہ سے جن مسلمانوں کو یہ خیال تھا کہ مسلم یونیورسٹی کا چارٹر بھی انھیں شرائط پر لے لیا جائے جن پر ہمارے برادران وطن نے یونیورسٹی لینا منظور کیا۔ اُنکے علی الرغم اس مجلس نے صاف طور پر ظاہر کردیا کہ ایسی یونیورسٹی مسلمانوں کے درد کی دوا نہیں ہوسکتی۔ اور عالیجناب سر راجہ صاحب محمود آباد پریسیڈنٹ اور دیگر معزز و مقتدر ارکان کی اس رائے سے ہمیں پورا اتفاق ہے کہ مسلمانوں کو اپنے ہندو بھائیوں کی تقلید میں اپنے منافع و اغراض سے قطع نظر نہیں کرنا چاہیے۔ اس وقت اگر ہمنے پورے استقلال و ثابت قدمی کے ساتھ اُسطرح کی یونیورسٹی کا چارٹر لینے سے انکار کیا جو ہماری ضرورتوں اور مقاصد کے مطابق نہیں ہے اور اپنی کوششیں اور سعی اُسکے لیے ساتھ جد و جہد جاری رکھی تو ہمیں ایک نہ ایک دن ایسی یونیورسٹی ضرور ملیگی جس سے ہماری قوم کی امید اور دل کو پورے فائدہ کی توقع ہو اور اگر یہ بات کبھی بھی حاصل نہ ہو تو ہمیں خداوند تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے کہ ہمنے اپنے سرمایۂ قومی کو رائگاں نہیں کیا۔

مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی نے کالیداس کی چند نظموں کا ترجمہ جو شایع کیا ہے اور اُسکے متعلق یہ بحث جو چھڑ گئی ہے کہ آیا یہ نظمیں خود اُنکی لکھی ہوئی ہیں یا جیسا کہ ایڈیٹر صاحب زمانہ کا دعویٰ ہے سرور جہان آبادی نے اُنکے نثر ترجمہ کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ الناظر میں "مئے و دُہ تشنہ" کے عنوان سے جو مضمون ابو الرشاد صاحب کا شایع ہوا تھا اُسنے اس بحث کو نمایاں کردیا۔ مسٹر شاکر نے الناظر کے ساتھ ایک ضمیمہ شایع کیا تھا جس میں اس دعوے کی تردید کرتے ہوئے ایڈیٹر صاحب زمانہ نے بعض حسد آمیز حملے کیا تھا۔ اب زمانہ کے فروری نمبر میں خود مسٹر شاکر کے وہ چند خطوط شایع کیے گئے ہیں جو اُنھوں نے سرور صاحب کو لکھے تھے۔ چونکہ اس بحث کے متعلق ابو الرشاد صاحب کسی قدر تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں اس لیے سردست ہم اظہار رائے سے احتراز کرتے ہیں۔ آیندہ نمبر میں غالباً اُنکا مضمون اس بارے میں اور ہمارے خیالات ساتھ ساتھ شایع ہو سکیں گے۔

خوان ادب

مختصر الاصول

(حجم ۳۰۴ صفحے قیمت ۴ر دفتر نیر اعظم مراداباد)

مولانا نجم الغنی رامپوری جنکی مفصل و مبسوط تاریخ اودھ چار جلدوں میں شایع ہوچکی ہے نہایت علم دوست بزرگ ہیں اور اُردو زبان کو اُنکی قابلیت سے بہت فائدہ پہنچ رہا ہے اور پہنچنے کی امید ہے۔ آپ نے کچھ عرصہ ہوا ایک اصول کتاب اصول فقہ میں لکھی تھی جس سے اُردو زبان کا دامن ابتک خالی تھا۔ لیکن چونکہ کتاب لائق اوق اور مباحث مشکلہ کی وجہ سے عام فہم نہ تھی اور سوائے خواص کے عام طور پر اُردو داں حضرات اُس سے مستفید نہو سکتے تھے اسلیے آپ نے اب یادہ آسان پیرایہ اور سلیس عبارت میں کتاب اُس سے ماخوذ کرکے تیار کی ہے۔ [illegible] میں اکثر ضروری مذہبی کتابیں ترجمہ ہوگئی ہیں مگر اصول فقہ پر کوئی کتاب نہ تھی اسلیے اُمید ہے کہ اس کتاب سے بہت لوگ مستفید ہوسکیں گے ضخامت کے لحاظ سے کتاب کی قیمت بہت کم رکھی گئی ہے۔ البتہ چھپائی جیسی چاہیے ویسی نہیں۔ آیندہ ایڈیشن میں یقین ہے کہ اس خرابی کا دفعیہ کردیا جائیگا۔

خواتین

(حجم ۲۴۰ صفحے قیمت عہ الناظر بک ایجنسی لکھنو)

مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری کی عمدہ تالیفات اور مضامین پُر معلومات سے ملک کو پیشتر بھی مستفید ہونیکا موقع ملا ہے۔ خصوصاً آپنے خواتین اسلام کے حالات اس خوبی سے لکھے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ حال میں آپنے ۳۴ مشہور اسلامی خواتین کی سوانحعمریوں کا ایک مجموعہ مرتب کرکے شایع کیا ہے جسکے مطالعہ سے قرن سابقہ کی باکمال و مقتدر خاتون اسلام کے حالات معلوم کرکے تعلیم نسواں کی ترقی میں سعی کرنا فرض ہوجاتا ہے۔ یہ مجموعہ عورتوں کے کتبخانہ کیلیے نہایت قیمتی تحفہ ہے اور اس قابل ہے کہ تعلیم نسواں کے نصاب میں اسکے منتخب حصے شامل کیے جائیں۔ کتاب کی لکھائی چھپائی میں خاص کوشش کیگئی ہے اور کاغذ بھی عمدہ لگایا گیا ہے جسکے مقابلہ میں قیمت بہت کم رکھی گئی ہے۔

الفرائض

(حجم ۶۸ صفحے۔ قیمت ۸/ الناظر بک ایجنسی لکھنو)

اس مختصر رسالہ میں مسلمانوں کے فرقہ اہل سنت الجماعت کا قانون وراثت نہایت فصاحت و سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جسکے لیے مولوی محبوب الرحمن صاحب کلیم بی اے وکیل اعظم گڑھ خاص طور پر مستحق مبارکباد ہیں۔ اگرچہ کتاب کے مطالب زیادہ تر اُن اصحاب کیلیے مفید ہونگے جو قانونی ضرورتوں کی وجہ سے اس قسم کے مضامین کا مطالعہ کرنے پر مجبور ہیں لیکن اگر عام طور پر لوگ اس کتاب کو پڑھیں تو انھیں ہمارے اسلامی قانون کی خوبیوں کا اعتراف کرنا پڑیگا اور شرعی طریق وراثت پر عمل پیرا ہونے کی تحریک ہوگی جسکے فقدان کے باعث ہمارے یہاں بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔

الناظر

جلد ۱۲ نمبر ۷ — یکم جون سنہ ۱۹۱۵ء

ایک تندرستی ہزار نعمت

ڈاکٹر ایس کے برمن کا بنایا ہوا پین ہیر۔ یہ اندرونی اور بیرونی ہر قسم کے درد
کو دور کرنیکے لیے ایک لاجواب دوا ہی۔ موچ۔ چوٹ۔ گٹھیا کے سبب جوڑوں
یا گانٹھوں میں درد ہو۔ ریاح یا سردی کیوجہ سے کمر کولہا پیٹھ گردن
وغیرہ میں درد ہو تو اسکی مالش سے فوراً ہی دور ہو جاتا ہی دانت
مسوڑھے کے درد کو بھی یہ فائدہ کرتا ہی قیمت
فی شیشی ۱۲ محصولڈاک ۵ ۔

ڈاکٹر ایس کے برمن ۴۹۵
تارا چند دت اسٹریٹ
کلکتہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۶ جلد ۱۲ یکم جون ۱۹۱۵ء

نرگس خود پرست

(۱)

آسمان و زمین کا، بحر و بر کا، حصہ بخرہ زیس[1] (Zeus) اور اُسکے دونوں بھائیوں میں ہو چکا! دنیا سے زیس اپنی دلفریب شاعری و تخیل کے ساتھ دن دونی اور

---

[1] لکھنے والے لکھتے ہیں کہ خدایان یونان میں جنگ جدل ہوئی اور بڑی خون ریزی ہو چکی تو آخر میں (Zeus) زیس - جس کا دوسرا نام (Jove) بھی ہے - تمام خداؤں میں قوی ترین اور عظیم الشان تسلیم کر لیا گیا! اُس نے انتظام خدائی کی بنیاد ڈالتے وقت موجودات کے بے شمار حصے کیے اور ہر خدا کو ایک ایک حصہ کی خدائی تفویض کر دی: چنانچہ خود خدائے زمین و آسمان بنا، اپنے ایک بھائی پوسیدن (Posiedon) کو خدائے بحر بنایا، اور دوسرے بھائی (Pluto) پلوٹو کو خدائے تحت الثریٰ مقرر کیا۔ وغیرہ وغیرہ - (جوش)

رات جو گنی ترقی کر رہی ہے : پرومیتھیس[۵۱] کی جدت کی بدولت مرد، اور ایپی میتھیس[۵۲] کی عنایت سے عورت وجود میں آچکی ہے!

وہ دنیا اور وہ زمین ہے جو گول اور چپٹی تھالی کی صورت میں ایٹلس[۵۳] (Atlas) کے کندھے پر ٹکی ہوئی ہے، جسکی چاروں طرف، وہ شکل میں دریائے اوشنیس (Oceanus) حد بندی کرتا ہے، جسکی خشکی مشرقی جانب ہرکلیز کے ستونوں پر ختم ہو جاتی ہے اور مغربی جانب

---

۵۱ خدائے زیس سے باغی ہونے والوں میں سے ایک پرومیتھیس بھی تھا۔ اس نے مٹی سے ایک پتلا خدا کے نمونہ پر تیار کیا اور اس میں تمام حیوانوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ طاقتیں اکٹھی کیں۔ یہی پتلا وجود میں آکر مرد کہلایا گویا مرد کی تخلیق پرومیتھیس (Prometheus) یا بزبان دیگر خیالِ ماقبل۔ کے بدولت ہوئی! اسکے ساتھ ہی پرومیتھیس آسمان سے آگ کو ایک نے میں چھپا کر لایا اور وہ بھی مرد کو عنایت کر دی جسکی وجہ سے مرد کی طاقت اور زیادہ بڑھ گئی! خدائے زیس کو اسپر غصہ آنا لازمی تھا کہ ایک تاکی پتلا خدا کے نمونہ پر وجود میں آئے۔ چنانچہ پرومیتھیس اس قصور کی سزا میں کوہ قاف کی ایک چٹان سے باندھ دیا گیا۔ اور ایک عقاب متعین کر دیا گیا کہ اسکے کلیجہ کو نوچ نوچ کر ابدالآباد تک کھاتا رہے۔ (جوش)

۵۲ اس مغرور مرد کو بھی تھوڑی سی سزا دینی یا اسکی گردن میں طوقِ لعنت ڈالنا ضروری تھا چنانچہ وہ طوقِ لعنت ایپی میتھیس کے ہاتھ سے عورت کی شکل میں وجود میں آیا! یعنی عورت کی تخلیق ایپی میتھیس (Epimetheus) یا ہماری زبان میں، خیالِ مابعد، کے ذریعہ سے ہوئی اور اس لیے ہوئی کہ مرد کو اپنا گرویدہ بنا کر ہزاروں مصیبتوں اور جھگڑوں کا شکار کر دے تاکہ مرد آزاد ہو کر خدا سے لافِ ہمسری نہ مارنے لگے۔ (جوش)

۵۳ خدائے زیس سے باغی ہونیوالوں میں ایک ٹائیفن (Typhon) بھی تھا جسکی امداد پوری طور پر ایٹلس نے کی تھی! ٹائیفن کو خدائے زیس نے کوہِ اٹینا کے قید خانۂ آتشیں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قید کر دیا اور ایٹلس کو یہ سزا دی کہ دنیا کو اٹھا کر اسکے کندھے پر رکھ دیا تاکہ مطلق بھی نہ کھسک سکے اور اس بھاری پتھر کے بوجھ سے ہمیشہ جھکا کھڑا رہے۔ (جوش)

سلسلۂ کوہ قاف جسکی ایک چٹان سے پرومیتھیس بندھا ہوا ہے دیوار کی صورت میں حدِ مغربی بنا کھڑا ہے، اور جسکی نسلِ انسانی ڈیوکیلین[1] (Deucalion) اور پرہا (Pyrrha) کی اولاد ہے! وہ زمانہ اور وہ وقت ہے جبکہ دریا اور چشمے اپنی پر زور رفتار دلکش کے ساتھ تمام سرسبز زمین پر جال کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ جبکہ درخت اور بیلیں اپنی پوری شادابی کے ساتھ لہلہا رہی ہیں۔ جبکہ آسمان اپنے دلفریب تاروں کے جواہرات کا خزانہ ہر دیکھنے والے کے لیے مفت نذر کرنے کو تیار ہے۔ جبکہ خداؤں کا تعلق دنیا سے ظاہرہ طور پر موجود ہے، اور جبکہ انسان کی تعریف حیوانِ ناطق نہیں ہے بلکہ محض حیوانِ گویا ہے! وہ دیکھتا ہے، سنتا ہے، سمجھتا ہے، بولتا ہے، مگر منطقی نہیں ہے! قوی الجثہ ہے، دُھن کا پکا ہے، دل کا مضبوط ہے، سادہ لوح ہے، خوبصورت ہے، اور محبت کے جذبے سے لبالب پُر ہے! ایسا انسان ہے جو ایسی دُنیا پر آباد ہے اور قدرت کی بے شمار دلچسپیوں کا حظ اُٹھاتا، جنگلوں اور پہاڑوں پر، دریاؤں اور سمندروں کے کنارے حُسن کا متلاشی ہے؛ فطرت کی ہر چیز بڑے سچے دل اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے: نفرت یا محبت جو کچھ کرتا ہے کُھلم کُھلا اور ڈنکے کی چوٹ کرتا ہے! مختصر یہ کہ وہ "چہ میگوئی" اور "چون و چرا" سے ناواقف ہی نہیں متنفر ہے!

وہ دن بھی سفیس[2] (Cephissus) کے گھر میں ایک عجیب دن تھا جبکہ اسکے ہاں ایک

---

[1] یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ قریب قریب ہر مذہب میں طوفانِ نوحؑ کی طرح ایک عالمگیر طوفان کا تذکرہ کچھ ملتے جلتے واقعات کے ساتھ موجود ہے! چنانچہ یونان کے عہدِ قدیم میں بھی ایک عالمگیر طوفان کا مفصل تذکرہ موجود ہے! اس طوفان میں تمام دنیا کچھ عرصہ کے لیے زیرِ آب ہو گئی تھی اور تمام مخلوقات ڈوب گئی تھی! طوفان کی وجہ خدائے زیئس کا عتاب بیان کیا جاتا ہے اور بچنے والے صرف دو آدم تھے۔ ایک مرد، جسکا نام ڈیوکیلین تھا۔ اور دوسری عورت، جسکا نام پرہا-یا-پائرہا (Pyrrha) تھا! ڈیوکیلین (Deucalion) پرومیتھیس کا لڑکا تھا اور پرہا (Pyrrha) ایپی میتھیس کی لڑکی تھی! گویا اس عالمگیر طوفان کے بعد نسلِ انسان ان ہی دونوں کی بدولت از سرِ نو پھیلی۔ (جوش)

[2] سفیس (Cephissus) خدائے دریا تھا اور اُس کے ہاں عرصے تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ (جوش)

چاند سا لڑکا پیدا ہوا ۔ لکھنے والے لکھتے ہیں کہ سفسیس کی بیوی اس نوزائیدہ لال کی شکل دیکھتے ہی امتا کے جذبہ سے سرشار ہوگئی ؛ اُس نے ایسا لڑکا اس سے پیشتر کہیں نہیں دیکھا تھا ؛ اسکو ڈر تھا کہ اسکو کسی کی نظر نہ لگ جائے ؛ وہ خائف تھی کہ اسکو کوئی اُڑا نہ لیجائے ! لاکھ لاکھ سمجھا نے پر بھی امتا کا مارا دل نہ ماننے والا تھا نہ مانا ؛ اُس نے ٹائرسیس[1] سے اس لڑکے کی عمر کی نسبت دریافت کرنا چاہا اور سوال کیا کہ "کیا یہ بچہ بڑھاپے کی حد تک پہنچے گا ؟"

"ہاں بشرطیکہ اس نے اُس زمانہ کے آغاز تک اپنے کو نہ جانا !" یہ وہ الفاظ تھے جو ٹائرسیس کی زبان سے جواب میں نکلے !

(۲)

اپولو[2] (Apollo) تمام دن ۔ حسبِ معمول ۔ اپنے شیروں کی چوکڑی پر سوار روزانہ اس پاڑ کیلی دنیا کا طواف کرتا تھا ؛ سیلین (Selene) اُسکی بہن تمام رات اپنی سہیلیوں کے

۱ ـ ٹائرسیس (Tiresias) اُس زمانہ کا مشہور عالم پیشین گو تھا یہ اندھا تھا اور اسکی کوئی پیشین گوئی کبھی غلط نہیں نکلی ۔ اسی وجہ سے یونانی توہمات کے موافق وہ پیغمبر سمجھا جاتا تھا ۔ (جوش)

۲ ـ اپولو ۔ جس کا زیادہ مشہور پورا نام فوبس اپولو (Phoebus Apollo) ہے ۔ خدائے زئیس کا وہ لڑکا ہے جو اسکی بیوی لیٹو (Leto or Latona) کے بطن سے تھا ؛ زئیس کی بڑی ملکہ ہیرا (Hera) کو سوکن کا جلاپا بہت ہے ۔ اور زئیس کی معشوق نوازی کی عادت نہیں جاتی ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہیرا اُسکی ہر معشوقہ کی جانی دشمن ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ لیٹو بھی ہیرا کے دستِ تظلم سے دنیا کے گوشہ گوشہ میں چھپتی پھری اور آخر کار ڈیلوس (Delos) میں پہنچتی ہے اور وہاں اسکے بطن سے دو جڑواں لڑکے اور لڑکی پیدا ہوتے ہیں ۔ لڑکا اپولو ہے اور لڑکی آرٹیمس (Artemis) ہے ! اپولو آبِ حیات پیتے ہی فوراً جوان ہو جاتا ہے اور ایسا طاقتور ہو جاتا ہے کہ اپنی گاڑی میں چار شیر جوڑ کر روزانہ خلد بریں کے چکر کاٹتا ہے ۔ یہی بعد میں یونانی تخیل کے موافق خدائے آفتاب ہو گیا ! اور اسکی بہن سیلین (Selene) ماہتاب کہلائی ! قصہ تو بہت بڑا ہے مگر یہاں دنیاوی وطن دریافت کرنے کے لیے اسقدر بتانا ضروری ہے کہ جسوقت دنیا کی تقسیم خداؤں کے درمیان ہوئی تو اپولو موجود نہ تھا چنانچہ اُسے کچھ نہ مل سکا ۔ (دیکھیے حاشیہ صفحہ ۵)

جُھرمٹ میں دنیا پر ڈورے ڈالا کرتی تھی: اسکولیپیس (Aesculapius) کا لڑکا۔ اور ہائی جیا (Hygeia) اسکی پوتی اپنے آبائی اثر سے دُنیا کو تندرست و طاقتور بنائے جاتے تھے! اور سفیس کا لڑکا یہ تو۔ نارسِیس (Narcissus) یا ہماری زبان میں۔ نرگس۔ زمانہ کی رفتار کے ساتھ بڑھتا اور پرورش پاتا جاتا تھا!

نرگس (ہمیں اسکا یہی نام زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے) اپنے حُسنِ عالم سوز کے بدولت چشمۂ شیریں سے بدرجہا زیادہ مرجعِ خلائق ہو چلا تھا! تمام قوتِ بینائی رکھنے والی مخلوق اُسکی شمعِ حُسن پر پروانہ وار نثار ہوتی رہتی تھی! نوجوان اچھوتیاں۔ حُسن کی دیویاں۔ خوبصورتی کی جیتی جاگتی تصویریں اسکی ایک نظرِ دلفریب کے لیے سایہ کی طرح اسکے آگے پیچھے پھرا کرتی تھیں! مگر نرگس جو ویسا حُسن لایا تھا اُس سے زیادہ بلند دماغ لایا تھا! کوئی صورت اسکو دلفریب نظر نہ آتی تھی۔ کوئی حسین اسکو قابلِ محبت نہ جچتی تھی، اور کوئی عشوہ ساز کمسن۔ اپنی تمام دلربایانہ انداز و ادا کے استعمال پر بھی اُسکو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی تھی!

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱) بعد میں جب اُس نے زمین سے التجا کی تو جزیرۂ روڈس (Rhodes) کے آتش فشاں پہاڑ اسکے حصہ میں آ گئے۔ وہاں اُسکا ایک عجیب و غریب مجسمہ بھی تھا جو پرانی دنیا کے عجائبات میں سے تھا مگر زلزلوں سے برباد ہو گیا! سیلین (Selene) اسکی بہن کو اپنے بھائی سے بہت محبت ہے اور جب رات نہیں دیکھتی تو چھپ جاتی ہے، کہا جاتا ہے کہ اسکی گاڑی میں چار ربیں جوتی ہوئی ہیں! جو کچھ بھی ہو یہ تخیل کس قدر بانکا اور معنی خیز ہے! (جوش)

؎ آج کل تو متفقہ ہے کہ صحت کا دارومدار سورج پر ہے اور تمام دنیا کی دوائیں اسکی شعاعوں کا اثر پذیر ہوتی ہیں، یہ ایسے قابلِ مدح تھے پُرانے یونانی جنھوں نے اپنے تخیل میں اسکولیپیس (Aesculapius) کو اپولو کا۔ یعنی آفتاب کا لڑکا بنایا ہے اور یہ حکیموں اور ڈاکٹروں کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے! خدائے زمین اس سے ناراض ہو گیا اسلئے کہ متوفیٰ مریضوں کو اچھا کر دیتا تھا چنانچہ اُسے قتل کر دیا گیا مگر اُس نے اپنے بعد ایک لڑکی ہائی جیا (Hygeia) چھوڑی جو باپ کا اثر لیے ہوئے حفظانِ صحت کی حامی ہے۔ یہ دونوں نام دوا و حکمت میں اب تک موجود ہیں! واقعی یونانی تخیل معمولی جہالت نہیں تھا بلکہ نہایت حکیمانہ تھا! (جوش)

وہ حدِ شباب کی پہلی منزل میں قدم رکھ چکا تھا! گلِ بلوغ زمانہ کی منقلب ہوا کے اثر سے کھل چکا تھا! اور آنکھوں میں خون کی مہین تحریریں۔ یا ڈورے۔ گہرے ہوتے جاتے تھے! چاروں طرف سے شرمیلی اور دزدیدہ نظریں اسپر پڑتی تھیں، ہونٹوں ہی ہونٹوں میں ٹھنڈے سانس اُسکے سامنے لیے جاتے تھے، اور للچائے ہوئے چشم و ابرو اکثر و بیشتر اُسکی نگاہ سے دوچار ہو جاتے تھے! وہ سب کچھ دیکھتا تھا: مگر اُسکا مغرور دل ان تمام باتوں کو اپنے حسنِ ناتانی کا جائز حق سمجھتا تھا۔ تمام حسین اچھوتیوں کو اپنا باجگذار سمجھتا تھا، تمام آنکھوں کو اپنا منت کشِ حسن جانتا تھا، تمام دلوں کو اپنا لب تشنۂ محبت گردانتا تھا! کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ان باتوں کی جنکا وہ بارگاہِ حسن کی فیاضی کے بدولت فطرتاً مستحق تھا مطلق بھی پروا کرتا! اُسکا دماغ جیسی بیمثال شکل کا متلاشی تھا وہ اسوقت تک اُسکو نظر نہیں آئی تھی۔ یہ ایک ایسا مکمل تخیل تھا جسنے ہیولیٰ کی شکل اسکی آنکھوں کے سامنے ابھی نہیں لی تھی!

راوی کا بیان ہے۔ اور جھوٹ سچ کا وہ خود ہی ذمہ دار ہے۔ کہ اُسی زمانہ میں حسینانِ صحرا (Wood-nymphs) میں سے ایک اُٹھتی جوانی والی، ہر بات میں اپنی ہمجولیوں سے ممتاز تھی! عمر اسی قدر تھی جس قدر کہ نسیمِ سحر سے عنقریب کھِلنے والی کلی کی صبحِ کاذب کے وقت ہوتی ہے: صورت ویسی ہی تھی جیسی کہ رشکِ ماہِ نیم ماہ کہلائی جا سکے؛ چال ایسی ہی تھی جیسی کہ آپ نے سُنی ہو کہ ہر ہر قدم پر فتنۂ محشر کو جگا دیتی ہو؛ اور؟ اور طبیعت بالکل ویسی ہی تھی جیسی ایک بیمثل حسین کی اپنے حسن کا اثر دیکھنے کے لیے بے چین ہوتی ہے! یہ سب کچھ تو تھا لیکن ملکۂ عالم ہیرا (Juno) کے حسد نے ایسی قیامت کی پتلی کو نطق سے محروم کر دیا تھا، اور اُسکو یہ سزا دی گئی تھی کہ وہ خود کسی سے ہمکلام نہیں ہو سکتی، گفتگو کے آغاز کے لیے پیش کلامی نہیں کر سکتی تھی، اور صرف کسی کے پہلے بولنے پر جواب دے سکتی تھی! اسکا نام (Echo) یا صدائے بازگشت تھا! صدا کا مسکن جنگل تھا اور مشربِ تجسس محبت تھا!

کہا جا چکا ہے کہ نرگس اپنے زمانہ کی کم سن حسینوں سے کنارہ کش رہتا تھا، اور اُنکی محبت سے

ہمیشہ شاق گزرتی تھی! اپنی معشوقۂ تصور کی تلاش اُسے بھی تھی، اس لیے اکثر آبادی سے گریزاں، اور جنگل میں سرگرداں رہا کرتا تھا! ایک روز کا ذکر ہے کہ اسی دُھن میں ڈوبا ہُوا جنگل میں بلا کسی خاص ارادے کے، مُنھ اُٹھائے، ایک طرف چلا جا رہا تھا کہ صدا نے اوسکی شکل دیکھ لی اور بس کیوپڈ[1] (Cupid) کا تیر اسکے جگر میں ترازو ہو گیا! وہ جنگل کے درختوں کی آڑ پکڑتی، سایہ کی طرح اسکے ساتھ ہولی! وہ چاہتی تھی کہ نرگس اسکی طرف متوجہ ہو، اُسے پکارے، اُس سے بولے، اور وہ جواب میں اُسکے سامنے ظاہر ہو سکے! مگر نرگس اپنے خیال میں غرق، اپنے دماغی معشوق کے تصوّر میں ڈوبا ہُوا، برابر چلا جا رہا تھا! قاعدہ ہے کہ دل کی بےچینی حواسِ خمسہ کے استعمالِ مسرت بخش سے کسی قدر دُور ہو جاتی ہے، اور جو حواسِ خمسہ کو کوئی تکلیف ہو تو دل کی شادمانی سے اُس میں تخفیف ہو جاتی ہے! ہر مریضِ دل اپنے آزارِ باطنی کا علاج حواسِ خمسہ کے استعمال سے کرنا چاہتا ہے: وہ اچھی صورت دیکھکر قوّتِ بینائی کے ذریعہ سے سکون حاصل کرتا ہے، وہ بھینی بھینی خوشبو سونگھکر قوّتِ شامہ کے بدولت مسرت پاتا ہے: وہ کسی نہ کسی طرح اپنے حواسِ خمسہ کے سُرور انگیز استعمال سے تھوڑی دیر کے لیے اضطرابِ دل کم کرنے کی کوشش کرتا ہے! نرگس بھی اسی کلیہ کے تابع ہو کر نیچر کے دلکش نظاروں میں اکثر سکونِ قلب حاصل کر لیتا تھا۔ اور اکثر پھولوں کی خوشبو، شبِ ماہ کا اثر، سرسبز زمین کی نظر فریبی۔ اُسے متوالا بنا دیتی تھی!

نرگس جاتے جاتے، ایک دل فریب چشمہ کے کنارے ٹھہر جاتا ہے اور صدا اسکے ساتھ

---

[1] کیوپڈ (Cupid) خدائے عشق ہے۔ بھولا بھالا نوجوان ہے، خوبصورت ہے، اسکے دو پر ہیں اور تیر و کمان اُسکا مشغلۂ دلچسپی ہے، جسکے دل پر تیر مارے وہی عشق کا متوالا ہو جاتا ہے! مگر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ آنکھوں سے اندھا ہے اور بلا اچھائی برائی کو دیکھے تیر چلا دیتا ہے۔ عشق اسی وجہ سے عقل اور بینائی سے مبرا ہے! مگر خود بھی عشق سے نہ بچ سکا اور Psyche (سائیکی) کا شکار ہو ہی گیا جو اُسکی معشوقۂ دلنواز ہے یا خود اسی کے تیر کا نشانہ ہو جانے سے اسکی عاشقِ جاں نثار ہے: یہ قصہ بھی نہایت دلچسپ، معنی خیز اور لطیف ہے مگر طویل زیادہ ہے اس لیے یہاں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ (جوش)

اسکی نظروں سے پوشیدہ - درختوں کے جھنڈ میں چھپی کھڑی رہتی ہے! نرگس چشمہ کے نظر فریب نظارہ کی طرف متوجہ ہی ہوا تھا کہ ہوا سے پتوں میں غیر معمولی سرسراہٹ پیدا ہوئی! اس نے چاروں طرف دیکھا کہا "کون ہے"؟

فوراً درختوں کے جھنڈ میں سے صدا آئی۔ "ہے"!

"پھر سامنے آنے میں کس کا ڈر ہے"؟ ... نرگس نے پھر بلا دیکھے کہا۔

"ڈر ہے!" پھر اسی جھنڈ میں سے صدا آئی۔

"یہاں آؤ!" اس مرتبہ نرگس نے تعجب کے ساتھ کہا۔

"آؤ"! فوراً صدا آئی۔ اور صدا بہ ہزار ناز و انداز سامنے تھی! یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ مصور اس تصور کی صورت ایک کافر حسینہ بے باک کے موافق کھینچتے ہیں تو صدا کو لباس عریانی کے علاوہ اور کسی پوشاک میں نہیں دکھاتے! وہ یہی قطرتی لباس پہنے ہوئے عجیب شان دلربائی کے ساتھ نرگس کا دل چرا لینے کی کوشش کر رہی تھی! نرگس نے اسے دیکھا؛ اسکی جوانی کو دیکھا، اسکی بیباکی کو دیکھا، اور نہایت تنفر اور غرور کے ساتھ کہا۔ "دور ہو! یہ منھ اور عشق نرگس!"

"عشق نرگس!" صدا نے جواب دیا اور شرمندہ چشم و ابرو کے ساتھ پھر اسی جھنڈ میں واپس چلی گئی! چلی گئی مگر ٹوٹا ہوا دل لیکر گئی، یہ حسرت دل لیکر گئی! اُسکی زبان سے دل ہی دل میں یہ دعا نکل رہی تھی کہ کیوپڈ اس مغرور نوجوان کو محبت کی چاشنی چکھا دے اور بس!

(۳)

صدا کے روپوش ہوتے ہی نرگس پھر اکیلا رہ جاتا ہے اور پھر اسی چشمۂ قدرت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے! وہ جھکتا ہے اور اُسکے صاف شفاف پانی میں کسی کی صورت کو دیکھتا ہے! یہ صورت اُسکے دل لبھانے میں غضب کا انچھر مارتی ہے! وہ کنارے پر بیٹھ کر غور سے دیکھتا ہے: اور زیادہ گرویدہ ہو جاتا ہے! وہ بیقرار ہو جاتا ہے اور اوندھا لیٹ کر کنارے پہ منھ چشمہ کی طرف لٹکا دیتا ہے! ایک مشہور مصور۔ اعلیٰ درجے کے شاعرانہ تخیل کے ساتھ اسوقت کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے:

ھ میں جناب سے یہ تو عرض نہیں کرسکتا کہ یہ تصویر محرک جذبات حیوانی ہے۔ یا نیچرل شاعری کا (ملاحظہ ہو ضمیمہ صفحہ ۹)

کہ ایک سرسبز وادی ہے، دور۔ پس پشت۔ درختوں کی سبز گھٹا افق کو چھپائے ہوئے ہے؛ اونچی نیچی چٹانوں پر چشمہ سے بہہ کر آنیوالے بارش کے پانی نے نہایت خوبصورت اور بل کھائی ہوئی نالیاں بنا دی ہیں۔ چشمے کے کنارے پر ایک اونچا اور گھنا۔ سرسبز و شاداب درخت سایہ فگن ہے؛ اسی درخت کے سایہ میں، نرگس چشمہ کے کنارے، منھ لگائے اوندھا لیٹا ہے؛ اُسکی سُرخ چادر جو باندھے اور اوڑھے تھا، پوری بے پروائی کے ساتھ سکڑ کر کمر کے گرد اور سینہ کے نیچے رہ گئی ہے، باقی تمام جسم گورا، نظر فریب اور سڈول جسم کھلا ہوا ہے؛ چشمہ کے پانی پر درخت کا عکس پڑ رہا ہے؛ اسی عکس کے اوپر خود نرگس کے چہرہ کا عکس ہے جس پر وہ مفتون ہو گیا ہے؛ اور دوسرے کنارہ پر ایک کھوکھلے درخت کی جڑ کے پاس، ایک ہاتھ تنے پر رکھے اور دوسرا پتھر پر ٹکائے، پاؤں پھیلائے صدا بیٹھی ہے؛ اُسکا صرف نصف جسم چھپا ہوا ہے مگر اوپر کا نصف جسم دھوپ اور ہوا کو آزادی کے ساتھ آنے اور چھو جانے کی اجازت دے رہا ہے؛ وہ مڑی ہوئی نرگس کو غضب کی بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے، اور اس مڑنے سے اسکی توریں کمر میں ایک ناقابل بیان لچک پیدا ہو گیا ہے؛

نرگس خود بینی و خود پرستی میں متوالا ہو رہا ہے؛ صدا خود فروشی و غیر پرستی میں ڈوبی ہوئی ہے؛ اور تمام کائنات گرد و پیش سکوت کے عالم میں اس ایک جذبہ کے دو متضاد اثر دیکھنے میں مصروف نظر آتی ہے؛ یا شاید۔ زبانِ حال سے۔ نرگس سے کہہ رہی ہے:۔

او آئینہ میں دیکھنے والے جمال کے! اچھے سے سامنا ہے، ذرا دیکھ بھال کے!

نرگس بیتاب ہو کر اُس چشمہ میں ہاتھ ڈالتا ہے، پانی میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور چہرۂ زیبا کا بنا ہوا تھوڑی دیر کے لیے عکسی دنیا سے معدوم ہو جاتا ہے؛ نرگس صبر کے ساتھ انتظار کرتا ہے، مدور شکل میں دست و گریبان ہو جانیوالی نقرئی موجیں۔ کسی کی ٹکراہٹ سے دور ہو جانیوالی ہیبتِ حبیب کی طرح

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸) لاثانی مطلع! مگر اس قدر عرض کیے دیتا ہوں کہ تصویر J. W. Waterhouse R.A کے خامہ کا نتیجہ ہے اور اب تک ایک اعلیٰ صنعت کے طور پر Walker Art Gallery لیورپول میں آویزاں ہے! مجھ پر اگر گناہ ہو سکتا ہے تو محض اسکا کہ میں نے اسکو الفاظ میں بیان کیا ہے۔ (جوش)

آہستہ آہستہ دور دور ہٹتی جاتی ہیں، اور وہی دلکش چہرہ کانپتا، تھرتھراتا، پھر آموجود ہوتا ہے! نرگس اب اُسے چھوتے ہوئے ڈرتا ہے، مگر غرقِ عشق ہو چکا ہے! بولنے پر اسکو سوائے دُور سے آنیوالی صدا کے اور کچھ سنائی نہیں دیتا! وہ گھبرا کر آواز کے ساتھ "آہ"! کرتا ہے اور جھنڈ میں سے ساتھ ہی دردناک "آہ!" سُنی جاتی ہے!

زمانہ بھی سچا تھا: دنیا بھی جھوٹ اور دغا سے پاک تھی: جذبات بھی تیز اور پُر اثر تھے: اور تخیل بھی دیرپا اور تمام ہستی پر چھا جانیوالا تھا! لیل و نہار میں وارفتگی تھی، دل میں سچی محبت تھی، اور محبت میں غضب کا اثر تھا! نرگس کو اسی عالم میں گھنٹے نہیں، دن گزر گئے، اور صدا اسی طرح نگاہِ شوق کے ذریعہ سے سکونِ قلب حاصل کرتے کرتے عرصہ ہوگیا! آخرکار - لکھنے والے لکھتے - اور شاعری کے دلدادہ مانتے - ہیں کہ نرگس اُس چشمہ میں کود پڑا، ڈوب گیا، انسانی قالب سے گزر گیا: مگر خدائے زئیس کے حکم سے فوراً ایک خوب صورت خوشنما پھول میں تبدیل ہوگیا - جو عام طور پر ایک نرگس (Narcissus) کہلاتا ہے - اور جسکی مثل آنکھ اب بھی سوائے اپنے اور کسی کو نہیں دیکھتی! البتہ صدا کو یہ سزا دی گئی کہ اُسکا جسمانی ہیولیٰ بالکل ضبط ہوگیا، اب اُسکا وجود محض آواز ہے - اور وہ بھی آوازِ بازگشت!

آپ نرگس کو ڈھونڈیں - کسی چشمہ یا دریا کے کنارے پر ہی پائیں گے - کیونکہ وہ چشمہ میں ہی مشغولِ خودپرستی ہے اور صدائے دریا کا لختِ جگر ہے! آپ صدا سے ہمکلام ہونا چاہیں - وہ جنگل و ویرانہ میں ہی ملے گی اور محض آپ کے آخری الفاظ دُہرانے کی طاقت رکھتی ہے!

نہ اب وہ نرگس ہے اور نہ وہ صدا! اور وہ زمانہ بھی آنیوالا ہے جب یہ موجودہ نرگس و صدا بھی نہ ہوگی! پھر کون ہوگا؟ اسکو خود سوچیے! کوئی نہ کوئی ہوگا ضرور! وہ جذبۂ خودپرستی ضرور ہوگا جو نرگس میں پہلے تھا اور اب بھی ہے! اور؟ اور ایک ذاتِ خودبیں و خودپرست ہوگی!

اور بس!!

سلطان حیدر جوش (علیگ)

سوگوارِ آرزو

رشتۂ امید منقطع ہو جانے کے بعد کس سہارے پر دل میں کوئی آرزو رہ سکتی ہے یہ کوئی بہت پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے۔ اہل دل نہایت معمولی غور و تامل کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ امید آرزو کی جان ہے۔ امید نہیں تو آرزو مردہ یا معدوم۔ ایسی حالت میں دل بجائے اسکے کہ مسکنِ آرزو کہا جائے مدفنِ آرزو کہے جانے کا مستحق ہے۔

اسی سلسلۂ خیال نے میرے تصور میں ایک ایسے شخص کی تصویر کھینچ دی جسکی آرزوؤں کا دم نکل چکا ہے یعنی اسکی امیدیں جو نہ صرف اسکی آرزوؤں کی جان تھیں بلکہ اسکی امیدوں کا سہارا تھیں مٹ چکی ہیں۔ دنیا اسکی نظروں میں تیرہ و تار ہے اور وہ جینے سے بیزار۔ اسکی ہستی صرف اسی پر بار نہیں بلکہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ زمانہ اور ابنائے زمانہ بھی اسکے وجود کے روادار نہیں۔ خود اسکا دل بھی کسی سے ملنے جلنے یا کسی کے پاس بیٹھنے اٹھنے کو نہیں چاہتا اور وہ اکثر و بیشتر اس تلخکامی کے زمانہ میں اپنی زندگی کی دشوار گزار گھڑیاں کوچہ گردی یا صحرا نوردی کے مشغلہ میں بسر کرتا ہے۔ اسکو چاہے موت کی جستجو کہ لیجیے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنی مردہ آرزوؤں کو دن رات روتا ہے اور انکی ماتم داری اسکا بہترین شغل ہے۔

ان حالات پر نظر کرتے ہوے میں نے بیساختہ اس یاس نصیب کا نام اپنے دل میں "سوگوارِ آرزو" رکھا۔

اسکے بعد بھی اپنے اسی نام اور اسی حالت کے ساتھ یہ تصویر اکثر میری نگاہوں میں پھر جاتی تھی اور اسکے جذبات میرے دل میں گزر جاتے تھے مگر باینہمہ یہ خیال میرے دل میں کبھی نہ تھا کہ میں "سوگوارِ آرزو" پر کوئی نظم کہوں۔ کیونکہ میں ڈرتا تھا کہ اسکے جذبات کہیں تخئیل انسانی سے بعید اور لوگوں کے لیے اجنبی نہ ہوں۔

ایک صبح مجھے اپنے حبیب معظم مسٹر ملک حبیب احمد خاں پریسیڈنٹ صیغۂ اوقاف ریاست بھوپال

کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہُوا۔ آپ ایسے خوش ذوق۔ بذلہ سنج نکتہ رس۔ معاملہ فہم اور دلچسپ انسان ہیں کہ میں باوجود اپنی افسردہ دلی کے (بلا لحاظ افسردگیِ انجمن) آپ سے اکثر ملتا رہتا ہوں۔ اور سچ عرض کرتا ہوں کہ جس عالم میں ہوں اُسکے اعتبار سے میرے وقت کا بہترین مصرف آپکی ملاقات ہوتی ہے۔ غرض اس مرتبہ بعض ایسے مباحث پر گفتگو رہی کہ "سوگوارِ آرزو" کے اُن جذبات کی اجنبیت کا خیال میرے دل سے دور ہو گیا جو میرے دل میں اُسکے تصور کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ اور اسکے ساتھ ہی طبیعت کو کچھ ایسی تحریک ہوئی کہ اُسی روز میں نے ذیل کی نظم کہی اور "سوگوارِ آرزو" ہی اسکا نام رکھا۔

یوں اس تصنیف کے باعث گویا جیب ممدوح ہوے اور میں اسکے لیے انکا کمال ممنون ہوں۔

آفیؔ جائسی

مطمئن رہیے کہ اب جینا مرا ممکن نہیں — صورتِ تسکینِ جانِ مبتلا ممکن نہیں
آپ سے ایفائے پیمانِ وفا ممکن نہیں — چارہ سازیِ دلِ درد آشنا ممکن نہیں
اب مری صحت غمِ جاں کاہ کی تمہید ہے
آہ اک حسرت زدہ کی موت اُسکی عید ہے

یاں نہیں جیتے جی رہے گی جب مجھے فرقت نصیب — زندگی میں خاک ہو سکتی ہے پھر راحت نصیب
تھا مزا جینے کا ہوتی دید کی دولت نصیب — کیا جیا گر یوں جیا بھی آہ میں حسرت نصیب
میرے ارماں گھُٹ کے ظلمت خانۂ دل میں رہے
شمعِ بزم افروز بن کر آپ محفل میں رہے

وائے حسرت مٹ گئے سب میرے ارمانِ عزیز — لُٹ گیا افسوس اُمیدوں کا سامانِ عزیز
نکلیں دل سے تمنا جیسی مہمانِ عزیز — سوچیے تو کیوں نہ کھو بیٹھے گا وہ جانِ عزیز
دے گئی ہو آہ جسکو رنجِ بے حد آرزو
جسکے سینہ میں بپا ہو ماتمِ صد آرزو

تھی غرض واللہ مجھ پر راحتِ دنیا حرام   کش مکش ہائے الم میں زیست کٹتی تھی مدام
یاس آخر دائمی آرام کا لائی پیام   منتظر ہے موت اب ہوتا ہوں رخصت والسلام

بس خدا حافظ چلا ناکامگارِ زندگی
ہو مبارک آپ کو عیشِ بہارِ زندگی

دُور ہو اے رنجِ ہجر اے یادِ ایامِ وصال   اے تمناؤ نہ دو اب مجھ کو پیغامِ وصال
دل میں چُبھ جاتا ہے نشتر کی طرح نامِ وصال   صبحِ محشر کو سمجھ لو اب مری شامِ وصال

کام اپنا کر لیا ہے زہرِ غم کے جام نے
اے تصورِ عیش کی صورت نہ آئے سامنے

کچھ نہیں۔ تجھکو بھی پایا بے اثر اے جذبِ عشق   نزع میں آئے نہ وہ بالیں پر اے جذبِ عشق
میں تو اب دنیا سے کرتا ہوں سفر اے جذبِ عشق   ہو سکے تجھ سے تو اتنا کام کر اے جذبِ عشق

اُنکو دے آ مژدۂ عیش و سُرورِ جاوداں
کھینچ دے اس بیکسی کی موت کا جا کر سماں

یہ خبر سُن کر اگر شاید وہ ظاہر غم کریں   یا ذرا رنجیدہ ہو کر اپنی آنکھیں نم کریں
تو یہ کہنا آپ رنجِ مرگِ مانیؔ کم کریں   آپ کے دشمن ہوں یوں آزردہ یوں ماتم کریں

آپ کو اللہ رکھے کامگارِ آرزو
کیا ہوا اگر مر گیا اک "سوگوارِ آرزو"

اب عبث ہے یہ تاسف اور یہ اظہارِ غم   جا چکا دارِ فنا سے آپ کا بیمارِ غم
ایک جانِ ناتواں سے کیونکر اُٹھتا بارِ غم   موت کا پیغام تھا کمبخت یہ آزارِ غم

تھک گئے تدبیر کرتے کرتے چارہ گر طبیب
مرنے والے کو نہ لیکن ہو سکی صحت نصیب

زندگی بھر یوں تو اُسنے آہ دُکھ پایا بہت   ضبطِ غم کی سعیِ بیہودہ میں غم کھایا بہت

حسرتِ دیدار نے آخر جو تڑپایا بہت　　میں نے دی تسکین یہ کہہ کہہ کے سمجھایا بہت
آرزوئیں یوں اگر ہیں دشمن جانِ فراق
اک نہ اک دن چاک رکھا ہو گریبانِ فراق
تھا مگر بد بخت کی تقدیر میں ٹنا لکھا　　کھیلتی تھی اُس شکارِ موت سے سر پر قضا
کیا کہوں بس ہو چکی بدقسمتی کی انتہا　　میرا سمجھانا بھی بالکل بے اثر ثابت ہوا
اُٹھ گیا دنیا سے وہ، افسانۂ غم رہ گیا
آہ۔ لیکن مرتے مرتے آپ سے یہ کہہ گیا
میری جاں۔ میری مراد زندگی۔ آرامِ دل　　مطلقاً ناقابلِ برداشت ہیں آلامِ دل
زہرِ غم سے ہو چکا لبریز یعنے جامِ دل　　ایسی حالت میں اگر مر جاؤں میں ناکامِ دل
تو سمجھنا ایک جنسِ بے حقیقت کھو گئی ؛
یا کوئی بلبل گُلِ عارض پہ صدقے ہو گئی
واقعی میری حقیقت کیا ہے میرا کیا شمار　　میری جیسی لاکھ جانیں تیرے قدموں پہ نثار
رہتی دنیا تک رکھے تجھکو سلامت کردگار　　آئے باغِ زندگی میں کامرانی کی بہار
جب تلک عشاق ہیں عالم میں قدر افزائے حُسن
تو رہے باصد غرور و ناز بزم آرا اے حُسن
رنج کا ہے کا یہی ہوتا ہے الفت کا مآل　　ہو گیا ہے فرقتِ جاناں میں کتنوں کا وصال
خیر۔ میری موت سے تجھکو خوشی ہو یا ملال　　میری جاں رکھنا مگر میری وصیت کا خیال
خیر سے اللہ بخشے جب تجھے تیری مراد
دل سے میری نامرادی کی نہ بھولے تجھکو یاد
اس سے پہلے ہاں یہ کہنا تھا کہ اے جانِ جہاں　　تجھکو گر مانع نہو پندارِ حسنِ بے اماں
میری میّت پر چلے آنا بہ ناز جانستاں　　ساتھ چل کر دیکھ لینا پھر یہ عبرت کا سماں
بائیں پہلو میں مرے ہوگا مزارِ آرزو　　دفن ہونگا اس طرح میں سوگوارِ آرزو،،

وسعتِ اُردو

کے متعلق چند بحث طلب باتیں

اُردو زبان کو جہاں سارے ہندوستان سے وابستگی یا تعلق ہے وہاں بعض اندرونی بدمزگیوں یا بدقسمتیوں کی وجہ سے اُسکے دامنِ حُسن پر یہ داغ بھی لگایا جاتا یا لگانے کی بمختلف حیل کوشش کیجاتی ہے کہ اُسے صرف ہندوستان کی ایک ہی مری ہوئی قوم یا ہندوستان کی کسی ایک ہی حصہ سے وابستگی او تعلق ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان حالات میں اُردو کی قسمت میں کیا کچھ لکھا ہے اور اُسکی ترقی یا وسعت کہاں جاکر ختم ہوگی۔ دراصل پوچھو تو اُردو کی بدبختی یا شومیِ طالع نہیں ہے۔ یہ ہندوستان اور ہندوستان کی قوموں کی بدبختی اور شومیِ طالع ہے۔ ان اندرونی مخاصمتوں اور خرخشوں کو چھوڑ کر بھی جب ہم دیکھتے ہیں تو چند باتیں اور بھی ایسی ہیں کہ جنکا اب تک باعتبار سوالِ وسعتِ زبان کے فیصلہ نہیں ہوسکا۔

برطریق تنزل ہم مان لیتے ہیں کہ اُردو زبان سارے ہندوستان کی زبان نہیں ہے۔ کُل قومیں ہندوستان کی اُسے پسند نہیں کرتیں۔ بعض قومیں اپنی مخدود زبانوں سے مانوس ہیں۔ اُردو میں بہت کچھ کمزوریاں بھی ہیں۔ لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ جو قوم یا جو حصہ ملک کا بدقسمتی سے اسے اپنی زبان سمجھتا ہے وہ بھی اسکی جانب سے غافل رہے۔ اگر بعض دوسرے لوگ اسے پسند نہیں کرتے تو کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم اُسکی ترقی اور وسعت میں کوشش کریں؟ اس میں تنگ کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ علمی اعتبارات سے ابھی اُردو میں بہت کچھ ترقی اور وسعت کی ضرورت ہے۔ گو ایک حد تک اُسکے ذریعہ سے علمی مضامین بیان ہوسکتے ہیں لیکن پھر بھی بعض امور میں دِقّت رہ جاتی اور گونہ دقت پڑتی ہے۔ ان حالات میں اسکی وسعت زیر بحث آجاتی ہے اور یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ جب تک اُسکا دامن فراخ نہیں ہوگا تب تک علمی اعتبارات سے اُسے ترقی یافتہ اور وسیع الظرف نہیں کہا جا سکتا۔ دونوں ہی صورتیں میں

وسیع الظرف ہو سکتی ہے جب اُسکے اندر ہر ایک خیال اور منصوبہ کی گنجایش اور سمائی ہو سکے اور ہر اصطلاحی دوڑ میں وہ پوری اُتر سکے۔ جب تک اُسے یہ طاقت نصیب نہ ہو تب تک نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ترقی یافتہ زبانوں کے نقش قدم پر چلنے کا فخر حاصل کر سکتی ہے۔ یا اُسکا شمار ترقی یافتہ اور وسیع الظرف زبانوں میں بھی ہو سکتا ہے۔ جو زبانیں وسیع الظرف اور ترقی یافتہ کہی جاتی ہیں اُنھیں صرف اسوجہ سے، وسیع الظرف اور ترقی یافتہ کہا جاتا ہے کہ اُنکے اندر ہر ایک قسم کے خیال اور اجتہاد کی سمائی اور گنجایش ہو سکتی ہے۔

زبان کی وسعت سے کیا مراد ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جسپر سب سے اول بحث ہونی چاہیے - جو زبانیں وسیع الظرف اور علمی زبانیں کہی جاتی ہیں یا جن پر کسی نہ کسی حد تک وسیع اور علمی زبان ہونے کا اطلاق ہوتا ہے وہ مندرجۂ ذیل وجوہ سے وسیع اور علمی کہلاتی ہیں :-

"اُنکا ذخیرۂ لفظی نسبتاً بہت کچھ وسیع ہے"

"اُنکے الفاظ مختلف معانی کے جامع ہیں"

"ہر اُس ضرورت کے واسطے اُن میں الفاظ مل سکتے ہیں جو انسانی تمدن اور تصرفات کے واسطے لازمی ہیں"

"معانی عامتہ اور مختصہ ہر رنگ میں اطلاق پا جاتے ہیں"

"وقتاً فوقتاً جو کچھ حدودِ خیالی و اجتہادی کے اعتبار سے پیش آتا ہے اُنکے واسطے بلا کسی قسم کی دقت اور تکلیف کے ذخائر الفاظ اور معانی مہیا ہو سکتے ہیں"

"الفاظ کے تفریدی معانی پر مستقل کتابیں اور توضیحات تدوین پا چکی ہیں یا اہل زبان اُن سے ایک بڑی حد تک واقف ہیں"

"جو نئی ضرورتیں اور صورتیں پیش آتی ہیں اُنکے متعلق کافی ذخیرہ الفاظ و معانی کا موجود ہوتا ہے"

عموماً یہی صورتیں ہیں جنکے لحاظ سے کسی زبان کو وسیع الظرف اور ترقی یافتہ کہا جا سکتا ہے

محض کثرتِ ذخیرۂ الفاظ ہی سے کوئی زبان وسیع الظرف اور ترقی یافتہ نہیں کہی جاسکتی تاوقتیکہ اس میں دیگر سامان ترقی اور وسعتِ زبان کے بھی نہ ہوں۔ اس حالت میں اگر ایک حیثیت سے اُسے وسیع الظرف کہا جائے گا تو دوسری جانب وہ محدودیت رکھے گی عربی اور سنسکرت زبان باعتبار وسعت اور ذخیرۂ الفاظ بیشک وسیع الظرف اور ترقی یافتہ زبانیں ہیں لیکن موجودہ زمانہ میں دیگر ضروریات علمی کے نقطۂ خیال سے ترقی یافتہ نہیں ہیں۔

موٹے طور پر دوسری بحث یہ ہوگی کہ ان اصول کے ماتحت کس طرح کوئی زبان وسیع الظرف کہی جاسکتی یا بنائی جاسکتی ہے۔ اُسکی حسبِ ذیل صورتیں ہوسکتی ہیں:-

(الف) کثرتِ الفاظ سے۔

(ب) مختلف الفاظ اور مختلف معانی الفاظ سے

(ج) کثرت اصطلاحات علمیۂ فنیّہ سے۔

یہی تین صورتیں ہیں جن سے کوئی زبان ترقی یافتہ اور وسیع الظرف ہوسکتی ہے۔ ان مسائل کے ماتحت جلدتر کون سی زبان چولا بدل سکتی ہے جس میں ذیل کے اوصاف یا طاقت ہو۔

"سہل التلفظ ہو"۔

"سہل المعانی ہو"۔

"قوّتِ قابلہ رکھتی ہو"۔

"قوّتِ جاذبہ رکھتی ہو"۔

"غاصبہ بہ تبدیل اشکال و تبدیل معانی صراحتاً نہ ہو"۔

"السنۂ ملحقہ یا السنۂ غیر ملحقہ سے لاینفک مغائرت اور منافرت نہ رکھے"۔

"لچک دار ہو"۔

اُردو زبان میں دو خاص وصف ہیں اول یہ کہ اصل کش غاصبہ نہیں ہے بخلاف دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے جو الفاظ دوسری زبانوں کے اس میں لائے جاتے ہیں یا استعمال

پاتے ہیں وہ ہو بہو وہی رہتے ہیں جو اصل زبان میں ہوتے ہیں۔ اگر اُن میں کبھی کوئی تبدیلی بھی ہوتی ہے تو ایسی نہیں ہوتی جو اصل سے کلیتہً مغائرت رکھتی ہو۔ ذرا غور کرنے کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ اُردو زبان میں جس قدر الفاظ دوسری زبانوں کے آئے ہیں وہ ہو بہو اپنی اصل پر ہی رہتے ہیں۔ نہ تو لفظ میں فرق ہوتا ہے اور نہ معانی میں۔ اگر کبھی کسی موقعہ پر انھیں بادنیٰ تغیر اصطلاحی بنگ یا غلط العام میں لیا گیا ہے تو ایسی صورت اوّل تو شاذ و نادر ہے اور دوسرے یہ کہ اُس سے محض تبدیلی ثابت نہیں ہوتی۔

اُردو زبان کا دوسرا خاصہ یہ ہے کہ وہ دیگر زبانوں متسلمہ یا ملحقہ سے چنداں مغائرت اور منافرت نہیں رکھتی اسی واسطے اُسکا حُسن سلوک دوسری زبانوں سے ایک قابلِ تعریف وسیع الظرفی کا ثبوت ہے۔ جہاں تک میری رائے ہے ایسا سلوک کسی دوسری زبان کا دوسری زبانوں سے نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہو کہ کیا اُردو زبان بمقابلہ موجودہ علمی ترقیات اور فنی اعتبارات کے وسیع الظرف اور جامع ہے؟ منصفانہ یہ جواب ہوگا کہ ہنوز دلّی دور است۔

اگر یہ جواب صحیح ہے تو کیا پھر اُردو دانوں یا اُردو سے محبت کرنیوالوں یا اُردو کے بہی خواہوں کا یہ فرض نہیں کہ اس نقص کے دور کرنے میں کوشش کریں اور اُسے مالامال بنا دیں تاکہ وہ علمی مقابلوں میں پوری اُتر سکے اور اُس میں قوتِ جاذبہ وہی پیدا ہو جائے جو دوسری ترقی یافتہ زبانوں کو حاصل ہے۔

قبل اسکے کہ ہم اسپر بحث کریں، یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اُردو کا ذاتی ذخیرہ کس قدر ہے اور دوسری زبانوں سے وہ کہاں تک حاصل کر چکی ہے۔ اُردو کی عمر ایسی زیادہ نہیں ہے کہ اُسکی ترقی اور نشو و نما کے واقعات بہ رنگِ مورخانہ کسی دھندلے میں ہوں۔ کل کی بات ہو کہ ہندوستان کی سرزمین میں اُسکی بنیاد رکھی گئی تھی۔ ہزاروں برس نہیں بلکہ چند ہی صدیاں

اُسے جنم لیے گزری ہیں۔ ایک صدی پیچھے ہٹو تو اُسکے بانیوں کی کانوں سُنی کہانیاں سُننے میں آئیں گی۔ جن نامور معماروں نے اس عمارت کی بنیاد رکھی اور اُس میں اپنی اپنی ہمت کے مطابق چھانٹ چھانٹ کر اینٹیں لگا ئی ہیں وہ اپنے اپنے کارناموں اور ہمت کی وجہ سے گویا اب تک زمانہ کی گود میں زندہ ہیں گو زمانہ نے اُنکا لفظی نام اور ہستی مٹادی ہے مگر اُنکی معنوی زندگی بقالبِ اُردو مختلف پہلوؤں میں جلوہ نما اور ناطق ہے۔

یہ ثابت اور تسلیم شدہ ہے کہ اُردو کی علمی دوڑ ابھی ترقی یافتہ زبانوں سے لگا نہیں کھا سکتی، نہ اس وجہ سے کہ وہ کم زور ہے بلکہ اسوجہ سے کہ اُسکا نشو و نما کچھ ایسا قوی نہیں ہے۔ وہ طاقتور ہوسکتی ہے لیکن اُسے ایسا موقعہ نہیں دیا جاتا۔ اُردو زبان میں اسوقت کن باتوں اور کن امور کی کمی ہے۔

(الف) اُسکا اپنا سرمایۂ اصلی بہت ہی کم ہے۔

(ب) اُسکا مدار ہندی۔ عربی۔ اور فارسی پر ہے۔ یا یہ کہ یہ تینوں زبانیں اسکی منھ بولی مائیں ہیں اور انھیں کی چھاتیوں سے اُس نے دودھ پیا ہے بھوک پیاس میں ابتک وہی اسکی مدد کرتی ہیں

(ج) اُسکے اِردگِرد اَب بہت سی دوسری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں لیکن وہ اُن سے بہت ہی کم مستفید ہوتی ہے۔

(د) اُسے اپنے سرمایہ میں براہ راست ذاتی ترقی کا موقعہ بہت ہی کم ملتا ہے۔

(ھ) اصطلاحی ذخائر وہ یا تو رکھتی ہی نہیں اور یا ادھر اُدھر سے لے لوا کر اور یا بہت ہی ادھورے اور غیر جامع۔

(و) ذخائر معانی میں بھی ضروریات کے مقابلہ میں گونہ کمی ہے۔

اس سے ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ اسوقت تک اُردو کی ترقی میں جو کچھ کوشش کی گئی ہے چاہے وہ اِرادی ہو یا اتفاقی، قابلِ شکریہ نہیں ہے۔ وہ ہر حالت میں قابل شکریہ اور قابل تحسین ہے۔ ہر کہ دمہ سے وہ ہر وقت خراجِ تحسین لے رہی ہے۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ ترقی کے پہیے پوری

تیزی سے نہیں چلتے اور چلتے چلتے کبھی کبھی روڑا اٹکا جاتا ہے اور ناگہاں پچھلے پانوں مڑنا پڑتا ہے۔

سب سے مقدم سوال یہ ہے کہ کیا اُردو کا کوئی ذاتی سرمایہ بھی ہے؟ ہم اس سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ بہت سے الفاظ اُسکا اپنا سرمایہ کہے جا سکتے ہیں لیکن اُنکی جانچ علمی رنگ میں اب تک نہیں ہوئی ہے۔ بڑی بھاری وجہ اس کمی کی یہ ہے کہ اب تک کوئی اُردو لغت اس شرح و بسط سے نہیں لکھا گیا کہ اُسمیں باعتبار وضع الفاظ بحث اُٹھائی گئی ہو اور کھوج لگاتے لگاتے وہاں تک رسائی ہو چکی ہو کہ جس سے غور کرنیوالے یہ قرار دے سکیں کہ بانیانِ اُردو نے اسقدر الفاظِ جدید وضع کیے ہیں یا یہ کہ بانیان کی ذاتی اختراعات اس قدر ہیں۔ جس طرح احادیث کی تنقید کے واسطے علماے اسلام نے فن اسماء الرجال کی تدوین کی ہے اسی طرح تنقید الفاظ کے واسطے فن اسماء الالفاظ کی بھی ضرورت ہے۔

یہ معلوم ہونا ایک فلسفیانہ کمال ہے کہ فلاں زبان کے اس قدر الفاظ ایسے ہیں جو کسی دوسری زبان سے لیے ہوے معلوم ہوتے ہیں۔ نہ باعتبار مشتقات اُنکا سراغ ملتا ہے اور نہ باعتبار ادخال انتقال اور عاریتًا استعمال کے غور کرنے کے بعد یہ معلوم ہونا مشکل نہیں کہ اگر ہر زبان میں نہیں تو بعض زبانوں میں لزومًا ایسے الفاظ مل سکیں گے جو کسی دوسری زبان سے ٹکر نہیں کھاتے۔ رفتہ رفتہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ایسے الفاظ بھی اُسی فطرتی اصول کے ماتحت وضع ہوے جنکے ماتحت ساری زبانوں کا اکثر حصہ یا ساری زبانیں بنی ہیں۔ قرآن مجید میں آیا ہے۔

"خدائے لایزال نے حضرت آدم کو اسماء سکھا دئے"

یہ بالکل درست ہے نہ صرف بابا آدم علیہ السلام ہی کو سکھائے بلکہ اُنکی ذریات بھی اس فیض سے خیر تک خالی نہ رہی۔ میری رائے ناقص میں آدم سے مراد وہ اور اُنکی کل ذریات ہے۔ تب وہی فیض اور وہی تصرف برابر کم و بیش چلا جاتا ہے۔ آؤ آزما کر دیکھیں۔ چند چھوٹی عمر کے لڑکے لڑکیاں جمع کر کے اُن سے کہو کہ کسی لفظ کو مثلاً۔ تو۔ تا۔ او۔ جو۔ میں۔ جب۔ تب۔ اولد۔ بولڈ۔ ان۔ اور من کے مطابق مُنھ سے بلے سوچے سمجھے رٹتے جائیں۔ آپ دیکھ لینگے

کہ بیسیوں بامعنی اور بےمعنی الفاظ انہیں اوزان پر اُنکے مُنھوں سے نکلتے جائیں گے صدہا اور ہزارہا تک بھی نوبت جا پہنچیگی حالانکہ اُن لڑکوں میں قوتِ مخترعہ چنداں متصرف نہیں ہوتی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اسواسطے کہ قدرت کی جانب سے اُنکی طبایع میں یہ مادہ یا یہ ملکہ علیٰ قدرِ مراتب مودعہ ہے

تابع مہمل کیا ہے اگرچہ تابع مہمل کے معنی کچھ نہیں ہوتے جو کچھ وہ ہوتا ہے اُس سے اس قدر تو ثابت ہے کہ انسان الفاظ روزمرہ یا مستعملہ یا الفاظ لغوی کے مطابق خود بھی دیگر الفاظ بنانے کی طاقت رکھتا ہے۔ ان دونوں نظائر سے ثابت ہے کہ ہم جدید الفاظ وضع کرسکتے ہیں جو بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ

"مختلف زبانوں میں ہم بہت سے ایسے الفاظ وضع کرچکے ہیں اور اب بھی بناتے اور بنا سکتے ہیں"

جب ہم یہ ملکہ رکھتے ہیں تو پھر کون وجہ ہے کہ ہم میں سے جنھیں خدائے کریم نے اپنے فضل وکرم سے یہ مواد اور یہ ملکہ امتیازی رنگ میں دے رکھا ہے وہ کیوں نہ اس طرف متوجہ ہوں اور خود ساز الفاظ سے کیوں نہ اُردو زبان کی کیاری پُر ہی کرتے جائیں۔ یہ بات عجیب معلوم ہوگی اور شاید بعض کے خیال میں تخیلات اوہام اور جنون سے زیادہ نہ ہو لیکن میرا یقین ہے کہ ہم ایسا کرتے رہتے ہیں اور کرسکتے ہیں۔ اگرچہ بعض مشکلات ضرور حائل ہوتی ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہ ہم اسپر بوجوہ قادر نہ ہوسکیں۔ ہمارے پاس نظائر موجود ہیں اور ایسے نظائر کہ جن سے ہم کسی حالت میں بھی انکار نہیں کرسکتے۔ آخر مختلف السنہ کے الفاظ آسمان سے تو نہیں اترے فرشتے تو وضع کرکے نہیں دے گئے۔ زمین سے تو نہیں اُگے۔ انسانوں ہی نے ضرورتاً بنائے اور وضع کیے ہیں انکے موجد ہمیں تو ہیں۔ یہ ہماری ہی تو تصنیفات مخترعات اور موضوعات ہیں۔ ہم سے پہلے کیا کچھ کائنات تھی اگرچہ ہم اپنے سے پہلے کے حالات سے محض ناواقف ہیں لیکن کوئی انکا نشان بھی تو نہیں۔ ان حالات میں سمجھ لیجیے کہ لسانی کائنات کچھ بھی نہ تھی۔ ہماری ہی بدولت

قدرت نے اس کائنات کی بنیاد رکھی اور ہم ہی اسکے بانی ٹھہرے۔ بولنے والی زبان یا ناطقہ ہم ہی کو بالکمال بخشا۔ اگرچہ بعض اور خلقتیں بھی اپنے اپنے رنگ میں بولتی ہیں مگر ہماری بولی اور ہمارا ناطقہ کچھ اور ہی رنگ رکھتا ہے۔ جب ہمیں قدرت نے یہ آلہ اور یہ قوت بخش رکھی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس سے کام کیوں نہ لیں اور کیوں اردو کا خزانہ جدید لفظوں سے نہ بھر دیں۔ اگرچہ اسمیں گونہ مشکلات بھی ہیں اور بعض کے خیال میں یہ خیال دیوانگی کا دوسرا درجہ ہوگا۔ اسپر بحث کرنا اور سوچنا تو ممنوع نہیں۔ یہ بات کہ ہم اس میں کہاں تک کامیاب ہونگے، دوسرا سوال ہے جو ہر ایک شخص میں اٹھا کرتا ہے۔ اگر یہ کام ہم سے بہتر ہو سکتا یا ہم اسکے قابل نہیں ہیں، تو پھر دوسرا سوال قابل بحث ہے۔

قبل اسکے کہ ہم دوسرا سوال لیں یہ بھی بتانے کی جرأت کرتے ہیں کہ چونکہ زبانیں باعتبار تصرفات کے دو قسم کی ہیں اسواسطے ہمیشہ وہ زبانیں اُن زبانوں سے امداد لیتی آئی ہیں جو اول شق میں داخل ہوں وہ دو قسمیں یہ ہیں۔ (الف) صرفی نحوی زبانیں۔ (ب) سادہ زبانیں۔

علمی مراحل میں زیادہ تر اصطلاحات سے کام پڑتا ہے اور اصطلاحات کی ترکیب و تدوین اُنھیں زبانوں میں باقاعدہ ہو سکتی ہے جو صرفی نحوی ہوں۔ سادہ زبانوں سے یہ خدمت نہیں لیجا سکتی اس سے یہ بھی نکلا کہ اگر کوئی زبان علمی خدمات ادا کرنے کا بوجھ اُٹھانا چاہتی ہے تو اُسکی صرف و نحو مکمل ہونی چاہیے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا تب تک اُسکا کام اور تصرف ناکمل ہوگا۔ اور بصورت ناکمل ہونے صرف و نحو کے اصطلاحات بھی ناکمل رہیں گی۔

جس سوال کا ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ کہاں تک اُردو کو دوسری زبانوں سے کام لینے کا حق یا کام لینے کی ضرورت ہے؟ اس سوال کے ضمن میں بڑی بھاری بحث یہ چھڑ جاتی ہے کہ جس طرح اُردو زبان عربی، فارسی، اور ہندی الفاظ سے کام لیتی ہے کیا ضروری نہیں کہ دوسری زبانوں انگریزی فرنچ وغیرہ کے الفاظ سے بھی امداد لے۔ کیونکہ یہ زبانیں بمقابلہ ہر سہ اوپر کی زبانوں کے علمی رنگ میں زیادہ تر رنگی ہوئی اور مالا مال ہیں۔ بہت سے نامور بزرگ

اس خیال سے متفق نہیں ہیں۔ اُنکی رائے میں اُردو زبان میں انگریزی یا دیگر کسی یورپین زبان کی آمیزش درست نہیں۔ یہ پر وہ دلائل بھی رکھتے ہیں اور اُنکے دلائل میں مضبوطی اور جان بھی ہے اور معتقدانہ نظروں میں اُنھیں ایک بڑی حد تک وقعت اور عظمت بھی حاصل ہے۔ ہم انھیں اس طرف بحث کی غرض سے توجہ نہیں دلاتے بلکہ صرف ایک تجویز اُن کے غور کے لیے پیش کرتے ہیں۔

اُردو کی حقیقی ماں ہندی ہے اُسی کی گود میں وہ جنم لینے کے ساتھ ہی دی گئی اور اسی کا پہلے پہل دودھ پیا اور اُسی کی سرزمین میں پرورش پائی۔ اُسکے بعد اسکی منھ بولی مائیں عربی اور فارسی ہیں۔ عربی سب سے بڑھ کر مربّی ثابت ہوئی۔ چونکہ عربی زبان صرفی اور نحوی زبان ہے جیسی کہ سنسکرت ہے اس واسطے اُس سے اصطلاحی ذخائر کے لینے میں پوری پوری امداد ملتی ہے۔ فارسی سے بھی بہت کچھ لیا گیا لیکن نہ اُس قدر جس قدر کہ عربی سے لیا گیا۔

بیشک عربی کی اصطلاحات بہت کچھ کارآمد ثابت ہوئیں لیکن پھر بھی بعض یورپین زبانوں میں جو جو اصطلاحاتِ علمی کام دے رہی ہیں اُنکا تہیہ نہ تو عربی کرسکتی ہے اور نہ سنسکرت۔ یہ تہیدستی ان دونوں زبانوں کی بدنامی کا باعث نہیں انھیں تو اب تک ایسا موقعہ ہی نہیں ملا کہ ایسے مسالہ کے پیدا کرنے کے سامان مہیا کریں۔ ان ہرسہ زبانوں کے علاوہ دوسری یورپین زبانوں سے مندرجہ ذیل طریقوں سے اُردو امداد لے سکتی ہے۔

(۱)　بذریعۂ انتقال الفاظ

(۲)　بذریعۂ تصریف۔

(۳)　بذریعہ اخذ اصطلاحات۔

(۴)　بذریعہ اخذ طرز و بندش۔

(۵)　بذریعہ طرز استدلال۔

ان سے ایک حد تک کام لیا بھی جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ بعض الفاظ بھی اردو دائرہ میں داخل

چونکہ جانتے ہیں کہ اُن کا عمل صحیح طور پر نہ سمجھا گیا ہو مگر ایسا ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس دخل کو بُرا بتایا جاتا ہے مگر کہ اُسے دخل در معقولات نہیں کہا جاتا بلکہ دخل در زبان ہی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن مجھے تو کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ اگرچہ اسوقت تک عوام الناس کی بول چال میں ایسے الفاظ آتے پایا مگر رفتہ رفتہ خواص کے استعمال میں بھی آنے لگیں گے۔ یہ تعجب نہیں ہر زبان کی وسعتی تاریخ اسکا ثبوت دیتی ہے۔

دوسری صورت میں تصریف کے ذریعہ سے تداخل ہو رہا ہے۔ لیکن اُسمیں کچھ غلطیاں اور بے ترتیبیاں پائی جاتی ہیں۔ تصریف سے میری مراد یہاں کسی قدر توڑ مروڑ کر بعض الفاظِ زبانِ غیر کا اُردو میں داخل کرنا ہے۔ ایسا ہو بھی رہا ہے۔ بعض الفاظ رفتہ رفتہ اپنی اصل صورت چھوڑ کر اُردو میں جگہ لیتے جاتے ہیں۔ یہ زبانِ اُردو کی غلطی یا کمی نہیں بلکہ بعض بولنے والوں کی ہمارے دو زبان تو ہو بہو الفاظ لیتے میں کبھی دریغ نہیں کرتی۔ یہ ایسی دیانتدار زبان ہے کہ دنیا بھر میں ایسی کوئی نہیں۔

اخذ اصطلاحات اور طرز و بندش نے بھی بہت کچھ رفتہ رفتہ دخل پا لیا ہے۔ باوجود کراہت اور نفرت کے جو اب کم ہوتی جاتی ہے ایسے طرز دن بدن مرغوب طبائع ہوتے جاتے ہیں۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ یورپین زبانوں کا طرز یا بندش بجائے خود سب صورتوں میں احسن اور ندیا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ خود اُردو زبان کے لکھنے والے بھی جدت پسند ہوتے جاتے ہیں۔ جہاں انگریزی کی چند خوبصورتیاں لی ہیں وہاں کچھ خود بھی زیبائش اور حسنِ بیان کی جانب توجہ ہوتی جاتی ہے۔

ہر زبان کا چونکہ طرزِ استدلال کسی قدر جداگانہ ہوتا ہے اس واسطے انگریزی زبان کے طرزِ استدلال کا بھی ایک حد تک چربہ اتارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سنسکرت، عربی اور فارسی زبان کے استدلال میں بھی کوئی کمزوری نہ تھی صرف طرز کا فرق تھا بلکہ ان سب زبانوں کی شاعری کا طرزِ استدلال انگریزی اور دیگر یورپین زبانوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر رہا ہے اور اسوقت

شک ہے کیا ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُردو زبان کو دوسری زبانوں سے امداد کی ضرورت نہیں کیونکہ اور وہ عربی، فارسی اور ہندی کی امداد سے مستغنی ہو چکی ہے۔ میرا یہ خیال نہیں ہے۔ اُسے ابھی بہت کچھ امداد کی ضرورت ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ کیوں انگریزی یا کسی دیگر یورپین زبان سے امداد یا قرض حسنہ نہ لیا جائے یہ کہنا کہ اس سے اُردو کی اصلی آن بان۔ شان حرمت ماری جائے گی، میری رائے میں درست نہیں۔ اسوقت بڑی بڑی ترقی یافتہ زبانوں کو بھی اس قرض حسنہ سے چارہ نہیں۔ عربی زبان ایک بڑی وسیع الظرف زبان ہے اور شروع ہی سے اُسکا ذخیرۂ الفاظ وافر رہا ہے لیکن پھر بھی اُس میں زمانۂ موجودہ کے اثر سے چند در چند الفاظ مختلف پہلوؤں سے داخل ہو چکے ہیں۔ عرب اور عربی زبان نے خوشی سے اُنکا خیر مقدم کیا ہے اُردو زبان عربی زبان کا سا سرمایہ نہیں رکھتی کہ ایسی امداد یا ایسے قرضہ حسنہ سے انکار کرے دوسری زبانوں میں جا کر الفاظ کا قرض حسنہ صورت و شکل بدل لیتا ہے لیکن زبان اُردو میں اسی حیثیت سے رہتا ہے جس سے اخیر تک یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں زبان سے یہ لفظ منتقل ہو کر آیا ہے۔

جس طرح دنیا تمدن ہی سے نشو و نما پا رہی ہے اور جس طرح انسانی کام اور انسانی حوائج ایک دوسرے کی اعانت اور مشارکت سے انصرام پاتے ہیں اسی طرح زبانوں کا بھی ایک تمدن ہے یا یہ کہ زبانیں بھی متمدن ہیں۔ تمدنی رنگ ہی میں وہ ترقی اور نشو و نما پاتی ہیں اور تمدنی رنگ ہی میں انکی شہرت ہوتی ہے۔ زبانوں کا تمدن کیا ہے؟ ایک کے الفاظ۔ اصطلاحات۔ طرز اور خوبیوں کا دوسری میں منتقل ہونا۔ جب انسانی جماعتیں ایک دوسرے سے کم ملتی جلتی تھیں اور وسائل آمد و رفت بھی محدود تھے اُسوقت تو کوئی زبان دوسری زبانوں کے اثر اور تصرف سے محفوظ رہ سکتی تھی لیکن اس زمانہ میں یہ بات قائم نہیں رہ سکتی جب ایک طرف دنیا کی قومیں ایک دوسری قوم سے رشتہ ناتہ کرنے کو تیار ہیں تو زبانوں میں تبادلۂ الفاظ کیوں نہ ہو۔ کتنا ہی کوئی روکے، کتنا ہی کوئی بُرا سمجھے، یہ سلسلہ جنبانی ضرور ہوگی اور یہ رشتہ ہو کر رہیگا۔ یہ جدا بات ہے کہ اسکا پیمانہ اور مقدار کچھ ہی ہو کوئی زبان اس زمانہ میں دوسری زبانوں کی دستبرد

سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ اگر گزشتہ زمانہ میں بلاغت اور فصاحت کی تعریف کچھ اور تھی تو اس زمانہ میں کچھ اور ہے۔ میرا اس سے یہ مطلب نہیں کہ بیجا تداخل سے زبانوں کی اصلیت میں فرق لایا جاوے اور ایسا مواد اُن میں بھر دیا جائے کہ اُنکی حقیقت ہی اُڑ جائے۔ ہرگز نہیں۔ میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ یا تو اُردو زبان کے اندر ہی ایسی شاہراہِ ترقی کھولی جائے کہ ہمیں اور زبانوں سے دستِ سوال کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ جیسے کہ

"ہم مختلف ضروری الفاظ کی بنیاد ڈالیں"

"جدید الفاظ بنائیں"

"جدید معانی نکالیں"

"اصطلاحات میں اضافہ کریں"

"جوں جوں علمی دروازے کھلتے جائیں اندرونی امداد سے زبان بھی ترقی پاتی جائے"

یا یہ کہ دوسری زبانوں سے قرضِ حسنہ لیکر گزارہ چلائیں۔ اس شریفانہ دستِ سوال سے کوئی حرج نہیں۔ رفتہ رفتہ اسی روش سے ہماری زبان بھی شیریں مقال ہو جائے گی اور ہم بھی دوسری زبانوں کی طرح اوروں کی امداد سے صحیح معنوں میں ناطق کہلانے کا فخر حاصل کرینگے۔ دوسری زبانوں کی ضروری اصطلاحیں اپنے رنگ میں رنگ لی جائیں اُنکے ذخائر الفاظ اور ذخائر معانی اپنے کر لیے جائیں مصداق بر ضرورت روا باشد۔

اگر یہ بھی موجب حیا و شرم ہے تو پھر جو کچھ اپنے بس میں ہے اُسی کو توڑ موڑ کر مختلف صورتوں اور مختلف اشکال میں بنا بنا پیش کریں۔ صرفی نحوی ترکیبات کے ماتحت ایک ہی گردان اور ایک ہی صیغہ سے مختلف اشکال کی رفتہ رفتہ بنیاد پڑتی جائیگی۔ پہلے پہل دونوں صورتوں تجدید یا تخلیقِ الفاظ اور توڑ مروڑ میں دقت ضرور ہوگی لیکن رفتہ رفتہ اُس سے کان اور زبان دونوں مانوس ہوتے جائیں گے۔

تخلیق۔ تجدید۔ اور تحریف کے واسطے کن باتوں کی ضرورت ہے اور اُنکا علمی رنگ

ہیں کیا کچھ معیار ہے۔

(الف) حسنِ تلفظ۔

(ب) حسنِ معانی۔

(ج) حسنِ ہئیت۔

(د) حسنِ ترکیب۔

(ھ) حسنِ ترنم۔

جن الفاظ میں یہ خوبصورتیاں اور یہ باتیں ہیں وہ الفاظ فصیح بھی ہیں اور بلیغ بھی۔ اُن میں کشش بھی ہے اور اثر بھی۔ جن میں یہ سماں نہیں پایا جاتا وہ دائرہ بلاغت و فصاحت سے خارج ہیں۔

سُلطان احمد (بہاولپور)

—— : (غزل جناب مولانا رضا علی وحشت رئیس کلکتہ) :- ——

اشارہ کرتی ہے وہ چشمِ پُرخمار مجھے　　کہ تجھکو تشنہ کی حاجت ہو تو پکار مجھے

کہاں ہے جذبۂ توفیق ایک بار تو آئے　　کیا ہے نفس نے شرمندہ بار بار مجھے

سُرورِ جامِ محبت حریف تھا غم کا　　مٹا سکے نہ ستمہائے روزگار مجھے

ہر اک حسین مجھے گھورتا ہے۔ جلدی کر　　کہ تجھسے پہلے نہ کرلے کوئی شکار مجھے

تری نگاہ نے کیوں آج کر دیا مایوس　　کہ کل اسی نے کیا تھا امیدوار مجھے

میں کیا کہوں چمن آرئیاں تصور کی　　خیالِ یار ہے گویا جمالِ یار مجھے

ہر اک طرف نظر آتا ہے جلوۂ دیدار　　ہر اک سمت سے آتی ہے بوئے یار مجھے

مرا تو بیمِ خزاں سے دھڑک رہا ہے دل　　فریب دیتی ہے گلکاریِ بہار مجھے

خیال تم نہ کرو میری بے قراری کا　　ضرر ہی کیا ہے نہ آیا اگر قرار مجھے

چمن میں صبح اشارہ کیا جو نرگس نے　　تو شاخِ گل نے دیا جامِ زرنگار مجھے

عذابِ روح ہے طولِ کلام بھی وحشت　　اسی سبب سے ہے مرغوب اختصار مجھے

سعیدہ کے خطوط

خط (۱)

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

آج قلم اُٹھا تو اسی ارادہ سے ہے کہ اپنا وعدہ پورا کرے۔ مگر بہن میرا چاہا کبھی پورا نہیں ہُوا۔ ناکامیوں سے دل کی اب عادت ہوگئی ہے کہ جہاں کسی چیز کا خواہش مند ہوا، فوراً سمجھ لیتا ہے کہ بس وہ شے اسکی قسمت میں نہیں۔ بہرحال موجودہ طبیعت کا رنگ دیکھتے ہوے میں تمکو مبارکباد دیتی ہوں کہ تم اب مجھے نہایت مستعد خط لکھنے والا پاؤگی۔ سچ کہتی ہوں تمہارے پچھلے خط نے تو بےچین کر دیا۔ چوٹ کھائے ہوے دل کو ذرا سی ٹھیس تو کافی ہوتی ہے۔ اُسوقت تو دل بیساختہ یہی چاہتا تھا کہ گذشتہ زندگی پرسے پردہ اُٹھادوں، قریب تھا کہ سینہ شق ہوجائے، اور تکلیف پردہ داری زخم جگر باقی رہے، تمہارا خط مجھے شام کی ڈاک سے ملا تھا اور اب رات کے گیارہ بجے ہیں اس پانچ گھنٹے کے وقفہ نے فی الجملہ اس ہیجان میں تخفیف کردی، اور اب میری تم سے پھر وہی پرانی التجا ہے۔

سرگزشتِ بلاکشاں نہ سُنو — نہ سُنو میری داستاں نہ سُنو

اور پھر فرض کرو کہ میں نے اپنا افسانۂ حسرت شروع بھی کردیا، اور پورا نہ کرسکی، تو اور بھی بُرا۔ تمہیں رنج بھی ہُوا، پڑھنے کی زحمت بھی ہوئی، اور بالآخر مآلِ کار کو دل ڈھونڈھتا کا ڈھونڈھتا رہ گیا۔ داستانِ غم طولانی، عمر کی چند گھڑیاں باقی۔ جس مریض کے معالجین کو مایوسی ہو، خود اس مریض کی مایوسی کا کیا کہنا۔ سنتی ہوں ڈاکٹر صاحب دق کا تیسرا درجہ تجویز فرماتے ہیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو، کہیں موت آچکے قصہ پاک ہو۔

بہن پہلے میں موت سے بہت ڈرتی تھی، ذرا سی بیماری میں گھبرا جاتی تھی۔ مگر اب معلوم نہیں کیا بات ہوگئی ہے، موت کی شکل ڈراؤنی نہیں معلوم ہوتی۔ ہر وقت اپنے تئیں اسکے خیر مقدم کے لیے

بہ کمال رضا و رغبت تیار رہاتی ہوں۔

اب تم اگر مجھکو دیکھو تو پہچان نہیں سکتیں۔ اب سے دُور (میں تو یہی کہونگی) سال بھر ہوا جب تم نے مجھے ریل میں دیکھا تھا، جب تو میں بہت تندرست تھی۔ افوہ! اسوقت جو میں نے سامنے والے قد آدم آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو ڈر گئی۔ تمام علامتیں مُردے کی مجھ میں ابھی سے پیدا ہیں۔ سوائے آنکھوں کی چمک اور حرکت کے، سو وہ بھی بہت خوفناک ہے۔ میں نے ہر چند چاہا کہ ضبط کروں، مگر چیخ میرے مُنھ سے نکل ہی گئی۔ کرین گو جاگی نہیں، مگر اس نے کروٹ بدل لی۔ سنسان رات میں یہ کمرہ، خدا کی قسم ہو بہو قبر معلوم ہو رہا ہے۔ بار الٰہا تو میری مٹی جلد عزیز کر!! میرا دل اسوقت بڑے زور سے دھڑک رہا ہے۔ حلق اور لبوں کو اس اضطراب نے، اور زیادہ خشک کر دیا۔ میں تھوڑا سا عرق پی لوں، تو پھر کچھ لکھوں ....

میں نے عرق تو پی لیا، زبان خشک نہیں رہی، حلق کے کانٹے جاتے رہے، مگر دل ہے کہ برابر دھک دھک کیے جاتا ہے۔ درختوں کے پتوں کے ہلنے کی آواز جو چند منٹ اُدھر میں نے بالکل نہیں سُنی تھی، اب دھڑکن کو اور ترقی دے رہی ہے۔ کیسی ڈراونی رات ہے اُوئی! ضربہ ہوکٹی (بلّی کا نام) تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا کہیں تو ملک الموت تو نہیں۔ اگر تو موت کا مبارک فرشتہ ہے تو آ کہ میں تیری دیر سے منتظر تھی۔

ہائے میرا دل کسی طرح نہیں ٹھہرتا۔ میرے اللہ! یہ میرے دل کو پنکھے کیسے لگ گئے۔ زبان پر پھر کانٹے جم گئے۔ حلق خشک ہو گیا۔ اچھا۔ اب میں عرق کو الماری سے اُتار کر اپنے پاس میز ہی پر رکھے لیتی ہوں۔ بار بار اُٹھنا پڑتا ہے۔ میں عرق لینے اُٹھی تھی کہ آئینہ میں پھر صورت نظر پڑی۔ مگر اس مرتبہ قلب پر پہلا سا اثر نہیں ہوا۔ چہرہ کی زردی، آنکھوں کے حلقے، جسم کا دُبلا پن دیکھکر وہ خوف طاری نہیں ہوا جو پہلے ہُوا تھا۔ خیالات میں انتشار و تلاطم ہے، توجہ کو قائم رکھنے کی ہر کوشش رائیگاں جاتی ہے۔ اُف۔ اُف۔ آج کی رات نگوڑی ہوا کی سنسناہٹ اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ میں کیسا زہریلا اثر ہے۔ لاؤ یہ کھڑکی کھول دوں۔ پائین باغ کی تازہ ہوا

شاید اس اُلجھن کو دور کرے۔ میرا خیال صحیح تھا۔ میں نے اپنے داہنے جانب والی کھڑکی کھولی
عجیب دلفریب منظر میرے سامنے ہے۔ چاندنی سے سارا باغ لبریز ہے۔ گلہائے رنگا رنگ سے اس
وقت چمن کی ایک قابلِ دید زینت ہے۔ خصوصاً سفید رنگ پھولوں پر تو اس چاندنی میں عجیب
جوبن ہے۔ چاندنی کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی میں سبزہ کا نکھار بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔
سرو، اور بعض دیگر شمشاد قامت درختوں پر چمن کا سایہ ان کے اصلی قد و قامت سے بھی کہیں زیادہ
ہے عجیب رعشہ دار سایہ پڑ رہا ہے۔ کیا متانت آمیز سین ہے۔ ا! ا! ا! اس گراما فون نے
تو اس منظر میں جان ڈال دی، جو سامنے والی کوٹھی میں کسی بلا طبیعت اور تھکیروں نے بجانا
شروع کیا ہے۔ خاموشی سے اس سین پر جو رعب و متانت چھائی ہوئی تھی اور جو ایک طرح یہ
وحشت کا پہلو لیے ہوئے تھی۔ وہ اس سریلی آواز سے کائی کی طرح پھٹ گئی۔ اب مجھکو باغ کے
چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ کے نیچے زندگی کی دھمک سنائی دیتی ہے۔ اب تک تو گویا یہ منظر ایک سونے والی
پری تھا۔ جس پر پانی کی شفاف دُلائی تنی ہوئی تھی، مگر اس نغمہ سرائی نے تو وہی لطف پیدا
کر دیا جو کسی مست خواب، کسی فتنۂ خوابیدہ کے بیدار ہونے پر ہوتا ہے۔ جیسے مخمور آنکھیں کھولتے
ہی سینکڑوں ناز و انداز بیتابانہ حاضر ہو جاتے ہیں۔ چادرِ ہوا جو مختلف پھولوں کی بھینی بھینی
خوشبوؤں سے بسی ہوئی تھی۔ اب نغمہ ہائے شیریں سے تر ہے۔ کیا فرحناک منظر ہے!!!

میرا دل بس چلا تھا کہ گراما فون کی نغمہ سرائی بند ہو گئی۔ خاموشی کا ڈراپ سین پھر گرا۔
اور وہ ہوا، جسکے مشک بیز جھونکوں نے، نغمہ ہائے فرحت افزا لا لا کر میرا دل کسی قدر ٹھہرا دیا تھا
اب باغ کے پھولوں کی خوشبوؤں کا ہار گوندھ کر لانے پر اکتفا کرتی ہے۔ کاش گراما فون نے
اس منظر میں تبدیلی پیدا نہ کی ہوتی۔ پہلے تو مجھے یہی منظر پیارا معلوم ہوتا تھا، مگر اب تو عجب
وحشت کا عالم ہے۔ کیسی اداسی برس رہی ہے۔ کسی چیز کو میرے حالِ دل کی طرح قیام نہیں
ہے۔ اے دریچے! چند منٹ ہوئے کہ تو بہشت بریں کا دروازہ تھی۔ اب مجھے تجھکو بند کر دینا چاہیے۔
تو میرے دل کو دہلائے دیتی ہے!!

آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر جو چیخ میرے منھ سے نکل گئی تھی اُس سے گو کریمن بیدار نہیں ہوئی تھی مگر اُسکی نیند غفلت کی نہیں رہی تھی۔ اسکی طبیعت کا رجحان شاید اسی وقت سے بیداری کی جانب ہو گیا تھا۔ اب جو میں نے گھبرا کر کھڑکی بند کی، تو اُسکی آواز نے بالآخر اُسے جگا ہی دیا۔ مجھ سے پوچھتی ہے، بٹیا یہ کھٹکا کیسا ہوا۔ میرے اسوقت تک جاگتے رہنے پر تعجب کرتی ہے۔ مجھ سے پوچھتی ہے کہ کیا بجا ہے، مگر کلاک میرے جواب پر سبقت کرتا ہے اور ٹن ٹن دو بجا کر اُسکے سوال کا جواب دیتا ہے۔ دو بجتے سُن کر، محبت بھرے لہجے میں مجھ سے سونے کی التجا کرتی ہے۔ ہائے جس دل نے زمانہ کی تمام عمر جھڑکیاں سُنی ہوں، وہ اس التماسانہ لہجے کی کیا قدر نہ کرے تھوڑا ہے۔

کریمن کا بیدار ہو جانا، اور قیامت ہو گئی، اب تو دماغ بالکل بیقابو ہے۔ ہر چند چاہتی ہوں کہ لکھنے پر خیال جماؤں۔ مگر دماغ ایک آہوے وحشی ہے کہ کسی طرح رام نہیں ہوتا۔ رہ رہ کر یہی خیال آتا ہے کہ اب کریمن پھر گڑگڑا کر مجھ سے لیٹ رہنے کو کہے گی۔ دردِ سر آفت مستزاد۔ اللہ ری کمزوری۔ ان ہاتھوں نے صفحے کے صفحے لکھ ڈالے اور اُف نہیں کیا، یا آج یہ چند سطریں لکھنے سے درد کرنے لگیں، اینٹھ کر رہ گئیں۔

اب جا کر پلنگ پر لیٹتی ہوں، گو یہ جانتی ہوں کہ نیند کیسی، دو مہینے سے آنکھوں آنکھوں میں رات کٹ جاتی ہے، کیا ممکن کہ پلک سے پلک لگ جائے۔ خاموشی میں کلاک کے چلنے کی آواز کس قدر کرخت و ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ اسوقت مجھے بخار کی بھی زیادہ شدت معلوم ہوتی ہے۔ آنکھوں سے شعلہ، کانوں سے دھواں نکلتا معلوم ہوتا ہے۔ حکیم ڈاکٹر انھیں بخار کی علامات قرار دیتے ہیں، مگر میرے خیال میں تو یہ سارے دل کی جلن کے آثار ہیں۔

اچھا خدا حافظ!! میں اب کرسی پر نہیں بیٹھ سکتی، چکر پہ چکر آ رہے ہیں آنکھوں .... اندھیرا .... حرف .... نظر نہیں ....

ابوالاثر۔ راز

مسرت

ایک بچہ کے لیے رازِ مسرت یہ ہے — ساتھ میں دوسرے بچوں کے وہ کھیلا ہی کرے
کوئی مانع ہی نہ ہو اُسکو۔ فراغت یہ ہے — دل میں جو آئے خیال اُسکے وہ پورا ہی کرے

ایک ماں کے لیے ہے وجہِ مسرت اِس میں — ننھے بچوں کے وہ ہمراہ نظر آتی ہو
کل جہاں کی اُسے ملجاتی ہے دولت اِس میں — پیار میں بچہ کو چھاتی سے وہ لپٹاتی ہو

ایک عاشق کے لیے ہے یہ مسرت کا سبب — دیکھکر موہنی صورت کو فدا ہو جانا
چھوڑ کر (انکو میسر ہوں جو) اسباب طرب — لذت اندوزِ الم ہائے جفا ہو جانا

طالب علم کو ہوتی ہے مسرت اس سے — سچی سرگرمی سے ہر وقت وہ پڑھتا ہی رہے
اُسکے حق میں نہیں بہتر کوئی نعمت اس سے — اپنی تعلیم میں روزانہ وہ بڑھتا ہی رہے

واقعی کیا یہ مسرت کی ہیں سچی راہیں — کیا یہی مرکزِ اصلی ہیں مسرت کے لیے
نہیں ہرگز نہیں۔ ہم لاکھ مسرت چاہیں — کبھی آمادہ نہیں ہے وہ معیت کے لیے

بچے بڑھ جاتے ہیں بیفکریاں کھو جاتی ہیں — باپ ماں روتے ہیں اولاد کے مرجانے سے
جذبۂ عشق میں ناکامیاں ہو جاتی ہیں — علم بیکار ہے شیرازہ بکھر جانے سے

سُن۔ سراسر غلطی ہے یہ تری اے انسان — یوں نہیں ملنے کی دنیا میں مسرت تجھکو
کرلے اپنے کو بمنشائے خداوند جہاں — تا ہو معلوم مسرت کی حقیقت تجھکو

ارشد تھانوی

ونٹرس ٹیل

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو الناظر بابت ماہ اپریل [illegible]ء)

(۱۱)

کمیلو کی نظر بھی اُس پر پڑی، اور باوجود ثقاہت و ناقابل تسخیر پختہ خیالی کے اُس سراپا حُسن کے نظر فریب جمال جہاں آرا کی سیر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اُسکی سیاہ چمکدار زلفیں، گوری اور چاندسی روشن و تاباں پیشانی، قوس نما بھویں، نیلی اور دلستاں آنکھوں پر سایہ کیے ہوئے۔ نوکدار اور ریشم سے زیادہ نرم و نازک پلکیں۔ آنکھوں سے پاکدامنی اور دوشیزگی کا ثبوت دینے والے شرم آمیز جذبات کا ظہور، گورے اور گلاب کے پھول سے گال۔ پتلی اور سانچے میں ڈھلی ہوئی ناک گویا گل یاسمن کی ایک ناشگفتہ کلی۔ ہونٹھ گلاب کی پنکھڑیاں اور دانتوں کے موتیوں کو شبنم کے قطروں کی طرح اپنے دامن میں چھپائے ہوئے۔ چہرہ سے جنگل کی صاف ستھری آب ہوا سے پیدا ہونیوالی تروتازگی۔ اور حقیقی صحت و تندرستی کی سرخی کی جھلک۔ ایسی چیزیں نہ تھیں جو اپنی طرف دیکھنے والے کو مائل کیے بغیر رہیں اور ایک آن کے لیے محویت کا عالم نہ طاری کردیں۔

اس دلربا صورت کے ساتھ اُسکے لباس کی دہاتی سادگی اور صوفیانہ پن بھی ہزار بناوٹ کو شکست دے رہا تھا۔ بادشاہ نے اس ناز آفرینی و نازبرداری کے منظر کی جانب سے اپنی توجہ کو ہٹا کے کمیلو سے کہا کہ "گڈریہ سے پوچھو کہ نازک اندام لڑکی اور یہ نوجوان جو آپس میں مصروف گفتار ہیں کون ہیں؟"

کمیلو گڈریہ کی طرف بڑھا (جو نہایت سرگرمی سے اپنے فرائض میزبانی کے سرانجام میں مشغول تھا) اور اپنی طرف متوجہ کرکے پوچھا "میرے میزبان! کیا تم مجھے اس دوشیزہ لڑکی اور اس جواں بخت کے حال سے مطلع کرسکتے ہو۔ جو ایکدوسرے کے حق میں شمع و پروانہ ہو رہے ہیں۔"

گڈریا۔ میرے معزز مہمان! یہ دوشیزہ پرڈیٹیا نامی میری اکلوتی بیٹی ہے، اور یہ جوان حسین کا نام دوزنیکلس ہے اُسکا عاشقِ صادق ہے۔ دونوں اپنے سینوں میں دو آرزو مند دل، اور غیر فانی جذبات کا دفینہ رکھتے ہیں، اسی وجہ سے میں خیال کرتا ہوں کہ ان دونوں پُرارمان عاشق و معشوق کو جب اُس مذہبی قانون کے رشتہ سے جوڑ دیا جائیگا جو اصطلاح میں نکاح کہلاتا ہے، تو انکی مرنج و مرنجاں زندگیاں ایک عالم کے لیے ضرب المثل کارنامہ ہونگی اور محبت اور چاہ کی دنیا کا ایک دلچسپ یادگار فسانہ!

دوسرا مہمان (یعنی بادشاہ خود اُس نوجوان یعنی شاہزادہ کو مخاطب کرکے) اے نوجوان! میں تمھارے دل و دماغ کو کسی ایسی طرف متوجہ و مشغول پاتا ہوں کہ تھا، اس مجمع کے عام مشاغل کی طرف بالکل رُجحان نہیں، حالانکہ بالعموم ہر نوجوان آدمی کھیل تماشوں سے زیادہ راغب، اور تفریحی اشغال کی طرف مائل ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ جوانی میں میرا خود بھی یہی عالم تھا، کیا تم مجھے اپنے خاص مذاق سے آگاہ کر سکتے ہو۔

نوجوان (یعنی شاہزادہ) جنابِ من! میرا مذاق حقیقۃً اس حورِ وش نازنین کے مذاق کے تابع ہے، جو میری محبوبہ، اور جان سے زیادہ عزیز ہے۔ چونکہ اسے بجز میرے دل کے کھلونہ کے کسی کھیل کا شوق نہیں، اور عاشقوں کا مذاق معشوقوں کے مذاق سے مختلف نہیں ہو سکتا اس لیے مجھے بھی اس سے ہمکلامی کی نعمت حاصل ہونے کے بعد دنیا کے کسی کھیل تماشہ میں لطف نہیں آتا۔

اسکے بعد نوجوان گڈریہ سے مخاطب ہوا، اور کہنے لگا "میرے واجب التعظیم میزبان! میں امید کرتا ہوں کہ اس روزِ مسعود میں جبکہ ایک کثیر مجمع خوش و خرم مہمانوں کا آپ کے گھر موجود ہے، تہوار کا مبارک دن بھی ہے اور کوئی امر مانع بھی نہیں، ایسی حالت میں آپ اپنے عہد کا ایفاء فرمائیں گے۔ اور ہم دونوں کو ایکدوسرے کا جائز حقدار بنا کے ہمارے پُرآرزو دوارمان دلوں کو شاد کام کرنے کا اجر خدائے برتر کی بارگاہ سے حاصل فرمائیں گے۔"

اسکے بعد نوجوان نے بادشاہ کی طرف خطاب کرکے کہا "میں خیال کرتا ہوں کہ آپ
س ہماری محبت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہونگے۔ اور میری اس مبارک التجا میں میرے
اپنے معزز میزبان سے میری تائید فرماکر اور پھر اس جلسہ میں بھی شرکت کرکے میری
افزائی اور رونقِ بزمِ شادی کا باعث ہوں گے۔"
شاہزادہ کی زبان سے یہ باتیں سُن کر بادشاہ کو حیرت ہوئی۔ اُس نے خیال کیا کہ
قع پر اگر میں خاموش ہی رہتا ہوں تو یہ خاموشی رنگ لائے بغیر نہ رہے گی۔ کیوں کہ
زادہ اپنے طفلانہ جذبات سے متاثر ہو کر اپنے ذاتیات کو نقصانِ عظیم پہنچانے پر آمادہ ہے۔
یہ کی زبان سے رضا کا لفظ نکلا، پھر شاہزادہ کے لیے اس ذبحِ عظیم کے ارتکاب میں کوئی
منتظرہ نہ باقی رہے گی۔ لہذا اُس نے غضب ناک چشم و ابرو بنا کر کرخت لہجہ میں شاہزادہ
کہا "نا عاقبت اندیش شاہزادے! ذرا ہوش کی دوا کرو، اور ان خام خیالیوں سے باز
۔ تم تاجِ بوہیمیا پر کتنا بڑا ناقابلِ تلافی حملہ کرنے پر تلے ہوئے نظر آتے ہو۔ اگرچہ تمہاری
ناقابلِ آمرزش ہے۔ مگر خیر! اقرارِ گناہ، اور آیندہ ایسی لغزش اور خطاؤں سے ہمیشہ
لیے اجتناب کا سچا وعدہ اب بھی تمکو اپنا پوزیشن دلا سکتا ہے۔"
اسکے بعد بادشاہ نے گڈریہ کی طرف خطاب کرکے کہا "اگر دوبارہ پھر کبھی شاہزادہ کو وہ
گھر آتا ہُوا سُن پائے گا تو اِسکا پورا خاندان مع اس فساد کی جڑ لڑکی کے نذرِ اجل کیا
ئے گا۔" پھر بادشاہ کمیلو کو یہ حکم دیکر خود وہاں سے چلدیا، کہ وہ شاہزادہ کو جلد اپنے ساتھ
میں لائے۔
بادشاہ چلا گیا۔ تو بھولی بھالی پرڈیٹیا جسکا نازک مزاج ہرگز ان گرم الفاظ کا خوگر
تھا جو اُسکی اور نیز اُسکے پرورش کنندہ باپ کی نسبت بادشاہ نے کہے تھے۔ وہ نہایت افسردہ
طر تھی۔ یہاں تک کہ اُسکا نازک دل اس رنج و ملال کے ضبط کا متحمل نہ ہوسکا تو وہ بولی
پرڈیٹیا۔ افسوس! آج میری ساری تمناؤں کا خون، اور عیش و مسرت کی زندگی کا

خاتمہ ہوگیا۔ (گلوگیر آواز میں) میرے پیارے باپ! مجھ ایسی ناشاد و نامراد بیٹی سے تو ہمیشہ کے لیے ہاتھ اٹھا۔ گلشن عالم میں میرے حق کا آب و دانہ ختم ہو چکا۔ اس لیے زندگی کی خوش گواریوں نے بھی یکایک مجھ سے منھ موڑ لیا۔ بس، اب میں چلی۔ زیادہ کچھ کہوں، ہکی تاب نہیں۔ بے اختیار دل جوش گریہ سے بھر آتا ہے۔ اور یہی چاہتا ہے کہ پہلے خوب سا رو لوں۔ پھر .... (ذرا دیر کے بعد ضبط گریہ کرکے)

یارب کوئی ہوس نہیں جز قطع زندگی قصہ ہو پاک جلد دلِ ناصبور کا

(پھر مہمانوں کی طرف متوجہ ہوکے) میرے عزیز مہمانو! میرا اپنا آخری سلام لو، اور پھر جب کبھی تمہارا اِدھر کو گزر ہو تو میرے حق میں دعائے مغفرت فراموش نہ کرنا" یہ کہکر وہ اپنے جھونپڑے میں چلی گئی۔

(۱۲)

واقعات سے متاثر ہوکر چارۂ کار سوچنا، اور اس پر عمل پیرا ہونا جس طرح اصابت رائے کا محتاج ہے ویسے ہی اُسکے لیے حوصلہ و ہمت کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن ان سب کے لیے تجربہ بمنزلہ دلیل راہ کے ہے۔ گڈریے کے مہمانوں کی اس چھوٹی سی جماعت میں غور و فکر کے بعد نیک اور عمدہ مشورہ دینے والا اس نوگرفتارِ بلا خاندان کو اسوقت اگر کوئی تھا تو وہ نیکدل کمیلو تھا جس کے پاس دوراندیش عقل، فکر و تردد والا دماغ، نیک دل، اور کافی تجربہ سب کچھ تھا۔ پس جس ہمدردی کی اس کٹھن وقت میں کمیلو سے اُمید کیجاتی وہ بجا سے تھی۔ اگرچہ بوجہ ناواقفیت وہ حاجتمند اس علم سے بالکل خالی الذہن تھے۔

چنانچہ کمیلو کا دل پرڈیٹا کی اس رقت خیز تقریر کو سُن کر، اور اُسکی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھکر بھر آیا، اور اُسکے دماغ میں نظر بہ حالات جو فوری تدبیر اس معاملہ کے حسن انجام کی آئی وہ یہ تھی کہ جملہ اشخاص متعلقہ یہاں سے انقطاعِ توطن کرکے لیونٹس پادشاہ سسلی کے قلمرو میں جاکر آباد ہوں، کیوں کہ اُسے لیونٹس کے خیالات کے مائل بتری ہونے اور غلبۂ رقت آب کی

اطلاع ہو چکی تھی۔ اور معتبر ذرائع سے اُسے اسکی بھی خبر ہو چکی تھی کہ لیونٹس خود کردہ پر صرف ظاہری طور سے پشیمان ہی نہیں ہے بلکہ اُسنے اس رنج و ملال میں اپنی حالت خراب کر رکھی ہے۔

بہرحال کمیلو نے جب اپنی تجویز کو ظاہر کیا، تو سب نے بالاتفاق شکریہ کے لہجہ میں، اُسے قبول کیا۔ اور کمیلو کو اپنا رہبر بنا کے ہلکے پھلکے سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ البتہ گڑریہ نے چلتے وقت ایک پوٹلی لیکر اپنی بغل میں دبا لی۔

طے منازل کرتے ہوئے کئی دنوں تک یہ مختصر اور بے سروسامان قافلہ اپنے رہنما کمیلو کے پولکسن شاہ بوہیمیا کے ممالک محروسہ کو عبور کرکے لیونٹس بادشاہ سسلی کے حدود میں جا پہنچا، اور پھر وہاں سے چند ہی روز میں سب پایۂ تخت سسلی میں تھے

سب سے پہلے کمیلو۔ وہ کمیلو جو لیونٹس کے شخصی اور جبری خیالات کے مقابلہ میں بغاوت و سرکشی کرکے ایک حریف بادشاہ کے حدود میں جا کر پناہ گزیں ہوا تھا۔ حاضر دربار ہوا۔ جہاں اُسنے قہر و غضب کے بجائے لینت، رفق اور رحم کا دریا موجزن پایا۔ بادشاہ خود تاثیر مجسم ہو رہا تھا۔ اس درباری سین کو دیکھکر اُسے ہمت ہوئی۔ اور اُسنے اپنے ساتھیوں میں سے پہلے شاہزادہ کو، اور پھر ایک ایک کرکے سب کو حضوری میں پیش کیا۔ لیونٹس نے خندہ جبینی کے ساتھ سب کو خیر مقدم کہا۔ مگر ان نو واردوں میں اُس نے کوئی ایسی چیز ضرور دیکھی۔ جس سے اُسکی قوتِ متخیلہ ایک غیر منجلی یادکے ادراک کی طرف دفعۃً مائل ہوگئی جس کا اثر اُس کامیابی کی سرخی کی طرح اُسکے چہرہ پر جھلکنے لگا، جو دُرِ مقصد کی دریابی یا یوسف گم گشتہ کی نشاں یابی کے وقت پیدا ہو جاتی ہے۔

نو واردوں میں اُسکی متجسس نظر صرف پرڈیٹا پر پڑتی تھی اور اپنے جذبات کو قرائن سے مصدق نہ پاکر واپس آتی تھی مگر یہ اوّلیں احوال میں تھا۔ آخر دس بیس مرتبہ کسی غیر معمولی جذب و کشش کی تاثیر سے دیکھتے ہوئے اُسے ان الفاظ میں اقرار ہی کرنا پڑا۔

"پیارے اور وفادار کمیلو! اس حور شمائل نازنین کی شکل و شباہت مجھے اپنی پیاری

...... کی یاد دلا رہی ہو۔ اگر اُس ہیرے اور جگر کے ٹکڑے کو میرے بخت ناہموار نے مجھ سے چھین کر دستبردِ زمانہ کے سپرد نہ کر دیا ہوتا تو آج اُسکی بہارِ حُسن کا بھی یہی موسم ہوتا۔"

"ہائے کس درجہ رقت خیز افسانۂ غم ہے کہ میں نے خود اپنی جگر گوشہ اور نور دیدہ کو پنجۂ قضا میں دیدیا۔ اور لارڈ اینٹی گونس جو میرے ظالمانہ ارادوں کی تکمیل کے لیے گیا تھا ایسا گیا کہ پھر اُسے بھی واپس آنا نصیب نہ ہُوا۔ خدا جانے اُسپر کیا گزری۔"

اسکے بعد شاہزادہ کی طرف خطاب کر کے یوں گویا ہوا۔" افسوس! میں نے اپنے ایامِ طفلی کے عزیز ترین دوست پولکسن کی صحبت جاں بخش کو اپنی ناقدری سے عمر بھر کے لیے کھودیا۔ جس کا ایک موقعہ مجھے حاصل ہوجائے تو اُسکی قیمت میں نقدِ جاں سے بھی مجھے دریغ نہ ہوگا۔ مگر آہ! اب مجھے ہر طرف سے مایوسی و ناامیدی کی مہیب اور وحشت ناک صورت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ خدایا! رحم۔ زیستِ دُنیا سے میرا دل سیر ہوچکا۔ اب اختصارِ زندگی میری آخری درخواست ہے۔ جو قبول کر۔

سینۂ و دل حسرتوں سے چھا گیا بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا

(۱۳)

نیرنگِ انقلابات اور فرہنگِ حوادث کا کوئی صفحہ قدرتی دلچسپیوں اور نیچرل کارسازیوں سے معرّٰی نہیں، اس لیے ہمارے اس فسانہ کا بھی ہر صفحہ اپنی نیرنگیوں سے چشمِ تماشا کو محوِ حیرت بناتا ہوا کھلتا ہے۔ جاں بخشی اور جگر سوزی جسکے دو پہلو یا رُخ ہیں، جنکے تابع اُنکا اثر ہے۔ وہاں تاثیر کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بیداری میں تماشا وخواب نظر آ جاتا ہے۔

اس حکایت کی ٹریجڈی سے یقیناً ہمارے ناظرین اُکتا گئے ہوں گے۔ واقعہ نویس کا قلم جب کیفت سوز سے بے اثر نہیں تو دیکھنے یا سُننے والوں کے دل کیسے کہا جائے کہ غیر متاثر ہوں گے۔ مگر یہ امر باب طمانیت بخش ہے کہ سیلِ حوادث اب سکون پر آ چلا ہے۔ اور ٹریجڈی نے کمیڈی کا رنگ بدلنا شروع کر دیا ہے۔

لیونٹس اپنا فسانۂ غم سناتے سناتے جب رُک گیا، تو ایک تاثر کا عالم تمام مجلس پر طاری تھا۔ جسے بہت جلد نو واردوں میں سے دیہاتی وضع قطع کے ایک شخص کے دخل درمعقولات نے توڑا۔ جو لیونٹس کی طرف اپنی دہقانی جرأت و بیباکی کے ساتھ بڑھا، اور بڑھکر اپنی بغل سے ایک پوٹلی نکالی اور بادشاہ کے روبرو تخت پر رکھدی۔ اور رکھکر کہنے لگا۔

"جہاں پناہ! اس لڑکی کے بچپن کی حکایت بھی عجیب وغریب ہے۔ جسکی سوائے میرے اور میری عورت کے کسی کو خبر نہیں، مگر اسکی اصلیت کا راز آج تک مجھپر بھی نہیں کھُل سکا۔ جہاں سے میرا علم شروع ہوا اُسکو بھی میں نے خوف سے کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ اب اس وقت جبکہ آپ کے سایۂ انصاف میں جان کی امان پا رہا ہوں تو اُسکے عرض کرنے کی جرأت ہوئی ہے درباروالو! تم بھی سُنو! اور بہت غور سے سنو!"

"ایک روز میں اپنی قسمت کے چکر کا ٹتا ہوا، بکریوں اور بھیڑوں کا گلّہ لیے ہوے جنگل میں جا رہا تھا۔ ساحلِ بوہیمیا سے بالکل قریب جب میرا گزر ہوا تو میں نے دیکھا کہ ساحل پر ایک اسٹیمر آکر لنگر انداز ہوا۔ جس میں سے دو شخص جرنیلی لباس پہنے ہوے اُترے۔ ایک شخص کی گود میں کپڑے سے لپٹا ہُوا ایک بچّہ تھا۔ اُتر کر جنگل میں گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد جنگل سے واپس ہوے۔ مگر ہنوز ساحل تک نہ پہونچے تھے کہ راستہ میں نہنگِ اجل کا لقمہ بنے بچہ کو ایک جھاڑی کے آسرے سے لٹا آئے تھے جو یک لخت رو رہا تھا۔ میرے کان میں اسکی آواز آئی تو میں اُس آواز پر اُسکے قریب گیا۔ پہلے اُسکی خوبصورتی کا ایسا رُعب مجھپر چھایا کہ قریب جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر پھر نہ رہا گیا، اور ہمت کرکے میں نے اُسے گود میں اُٹھا ہی لیا۔ سیدھا اپنے جھونپڑے کو آیا، اور میں اور میری عورت اُسکی پرورش اور پرداخت میں مصروف ہوے۔ یہاں تک کہ وہ سنِ شعور کو پہنچی۔ اور وہ لڑکی جسکی حیرت خیز کہانی میں نے بارگاہِ معلّٰی میں عرض کی یہی ہے جو دست بستہ اسوقت حضوری میں حاضر ہے۔"

اتنا کہا اور پھر اپنی گٹھری کھول کر اُسمیں سے وہ قیمتی لباس اور جواہرات وغیرہ

ایک ایک کرکے بادشاہ کو دکھانا شروع کیا۔ پہلے لباس۔ پھر جواہرات۔ اور اسکے بعد ایک چٹھی دکھائی جسپر کچھ لکھا تھا۔ بادشاہ نے اُسے پڑھنے کے لیے ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ ایک ادھیڑ عورت صدر نشینِ (منصہ) شاہی کی طرف بڑھی۔ اور کہنے لگی۔

"بادشاہ سلامت! یہ سب سامان میرے خیال میں۔ نہیں! نہیں! بلکہ یقینی طور سے وہی ہے۔ جس سے شاہزادی کو ملکۂ مرحومہ نے آپ کی حضوری میں بھیجنے کے وقت آراستہ کیا تھا۔ اور کئی قیمتی ہیرے اپنے گلو و بازو سے لیکر شاہزادی کو پہنائے تھے۔ یہ ساری چیزیں اُسوقت کی پہنائی ہوئی اب تک میری نظروں میں ہیں۔ اور چونکہ وہ چیزیں اس سامان میں موجود ہیں اس لیے میں اس بات کا یقینی حکم لگاتی ہوں کہ ہماری گم شدہ شاہزادی یہی ہیں! اور یہ چٹھی غالباً وہی ہے جسے آپ کے درباری لارڈ مرحوم نے آپ کے حکم سے لکھکر شاہزادی کے گون میں یہاں سے لے چلتے وقت لگایا تھا۔ اب یہ سب چیزیں مجھے عطا ہوں۔ تاکہ میں انھیں غور سے بھی دیکھ لوں۔ اسکے ساتھ ہی یہ واقعہ بھی مجھ خانہ خراب کے لیے کچھ کم جانگزا نہیں کہ وہ ہلاک ہونے والا شخص جسے پنجۂ قضا میں پڑتے ہوئے بچشم خود گڈریے نے دیکھنا بیان کیا۔ یقیناً آپ کے دربار کا معزز لارڈ اینٹی گونس ہی تھا۔ جسکا عدم سراغ باوجود امتداد زمانہ بھی کبھی امید کی ایک دھندلی سی روشنی مجھے دکھا جاتا تھا کہ شاید کبھی وہ یوسف گم گشتہ کنعاں میں آرہے۔ مگر آج وہ دھندلی سی روشنی بھی خاموش ہوگئی۔ کیونکہ میرے سرکے والی وارث ہونے اور میرے کھیا کے ہلاک ہونے کا چشم دید واقعہ آج میرے سامنے بیان ہو۔ ہائے! اُف! غضب!

اتنا کہتے ہی وہ جوشِ گریہ سے بے اختیار ہوکر رو پڑی۔ مگر فوراً اُس نے استقلال سے اپنے جوش کو روکا، اور سسکیاں بھر بھر کر کہنے لگی" مجھ رنڈاپے کی قیامت ٹوٹی اور جسکا تحقیقی طور پر آج مجھے علم ہوا، بلا سے، مگر خداوند مسیح کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کلام عبرانی کے الفاظ سچے ہوئے اور ہماری کھوئی ہوئی شاہزادی مل گئیں۔"

بادشاہ ششدر و حیران تھا، بیٹھا سب کی باتیں سُن رہا تھا۔ اور خیال کرتا تھا کہ کیسا دلچسپ مگر ناپائدار خواب ہے۔ جو تھوڑی دیر کے بعد پھر حسرت و غم سے بدل جائیگا۔ آخر خموشی سے اُکتا کر اور حیرت سے تنگ آ کر بولا۔

"حاضرین! آپ مجھے اس طلسم کا راز بتائیں، کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اور سُن رہا ہوں، وہ درحقیقت واقعہ ہے یا خواب۔ کیا یہ صحیح ہے؟ کہ میں نے اپنی گم گشتہ شاہزادی کو پالیا۔ اور وہ ننھی سی جان جسے میری سنگدلی اور شوربختی نے قضا کے منھ میں دینے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی تھی، قدرتی آغوش شفقت میں نشوونما حاصل کر کے غیب سے مجھے مل گئی" یہ کہکر بادشاہ بے اختیار اپنی جگہ سے اُٹھا، اور شاہزادی کو جو اب تک بہوت کھڑی تھی گلے سے چمٹا لیا۔ اسوقت اُسکی آنکھیں خوشی کے آنسو بکھیر رہی تھیں، اور دل بانسوں بڑھ رہا تھا۔ اہل مجلس کا عالم تو پوچھیے ہی مت! جو عالم بیداری کو خواب اور اس واقعہ کو کرشمۂ خواب سمجھ رہے تھے۔ گڈر یہ سب سے زیادہ متحیر تھا، کہ میری سادہ اطلاع پر کتنا بڑا راز جسکا تعلق شاہوں کے دربار سے ہے منکشف ہو رہا ہے۔ بادشاہ کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ عجب نہ تھا جو اُسے شادی مرگ ہو جاتی۔ کامیابی کی روشنی سے اُسکا چہرہ چمک رہا تھا۔ کہ یکایک اُسکی رنگت بدلنی شروع ہوئی۔ اور بجائے مسرت کی سرخی کے غم کی پژمردگی اُسکے چہرہ پر دوڑنے لگی۔ نہ معلوم یہ کس خیال کا اثر تھا۔ مگر بادشاہ نے اسے تو دصاف کر دیا۔ اُس نے شاہزادی سے خطاب کر کے کہا "پیاری، میرے بخت خفتہ کی باعثِ بیداری! کاش! اگر آج تیری ماں زندہ ہوتی تو اُسکو اسوقت جو خوشی ہوتی اُسکا اندازہ مشکل تھا۔ آہ! ملکہ ہرمونیا! تیرا داغ جدائی کیا مدۃ العمر کے لیے ہے۔ مگر اس دل حزیں میں اب تابِ مفارقت نہیں۔ یا تو خود آ، یا جہاں میں مجھے اپنے پاس بلالے یا میرے لیے صبر و سکون کی دعا کر ؎

یا کہ تو از جہاں بیا یا بہ جہاں مرا طلب　　　یا کہ تو یا کہ ہمی صبر من از خدا طلب

مگر تیرے بعد بغیر تیرے مجھے صبر آئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔
"موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو"

(۱۴)

دربار کا نقشہ ویسا ہی جما ہوا ہے۔ پولینیا ایک پست موقد کی اب تک منتظر تھی پھر کھڑی ہو کر خدا ان شاہی سے عرض کرتی ہے "شاہِ دوراں! اٹلی کے ایک چابکدست فن مجسمہ تراشی کے ماہر نے ملکۂ آنجہانی کا ایک مجسمہ تیار کیا ہے۔ جسکی خوبیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دیکھیے تو مجسمہ کا گمان تک نہیں کیا جاتا بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملکۂ مرحومہ کسی سوچ میں کھڑی ہیں اور لبِ شیریں ہلایا ہی چاہتی ہیں۔ حضور اگر اپنے قدوم سے اس کنیز کے جھونپڑے کو رشک فردوس بناتے تو ملاحظہ فرماتے کہ ملکۂ مرحومہ کے فراق کی بیقراری کچھ دیر کے لیے کم ہو جاتی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ حضور اسے ملاحظہ فرما کر نہایت خوش ہونگے یہی دکھائی دیگا کہ خود بہ نفس نفیس ملکہ مرحومہ ایک دلکش انداز کے ساتھ سامنے کھڑی ہیں"

بادشاہ یہ سن کر خوش ہوا، کیونکہ اُسے ملکۂ ہرمونیا سے مشابہت رکھنے والی ہر چیز پر پیار آتا تھا۔ اور ایسی چیزوں کے لیے اسی وجہ سے وہ بیتاب اور ہمہ تن شوق بن جایا کرتا تھا۔ بادشاہ نے نہایت اضطرار کے ساتھ کہا کہ "پولینیا چل اور جلدی چل"

اس مجسمہ کا تذکرہ سُن کر شاہزادی کو بھی اپنی مادرِ مشفقہ کی شبیہ دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا تھا، جو ابھی تک اس عجیب غریب راز کے انکشاف سے نقشِ حیرت بنی ہوئی تھی خون کے جوش سے دل بیقرار ہوا جاتا تھا کہ کس طرح پہنچوں اور اپنی مادرِ مشفقہ کی شبیہ دیکھوں۔

غرض بادشاہ اور اسکے جلو میں سب لوگ پولینیا کے گھر کو روانہ ہوئے اور جب سب لوگ وہاں پہنچ لیے تو پولینیا نے یکایک اُس مجسمہ پر پڑے ہوئے پردہ کو اُٹھا دیا، جسے دیکھکر کسی کو اس بات کا خیال تک نہیں ہوا کہ یہی مجسمہ ہے، بلکہ ہر شخص یہی سمجھا کہ زندہ جان ملکہ خود ایک ادائے دلنوازی کے ساتھ سامنے کھڑی ہیں۔ اور اپنے ندیدوں کو محو تماشا بنا رہی

ہیں۔ پادشاہ کا سارا غم و الم کافور ہوگیا۔ اور وہ اُسکے دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ تھوڑی دیر کے لیے اُس میں بالکل حس و حرکت نہ رہی۔ پولینیا نے پادشاہ کو بالکل ساکت دیکھکر عرض کیا "اے حضور! آپ اس قدر متحیر کیوں ہیں؟ کیا لائق کاریگر نے اس مجسمہ میں ملکہ ہرمونیا کو ہو بہو نہیں دکھلایا ہے؟"

پادشاہ (چونکا۔ اور سکوت کے بعد بولا) پولینیا اسمیں شک نہیں کہ مجسمہ میں ملکہ ہرمونیا کی حالت کا پورا نقشہ صحیح صحیح اُتار دیا گیا ہے اور ملکہ کو جب پہلی نظر میں نے دیکھا ہے تو اسی لربایانہ انداز میں مثل سرو قد کھڑی تھیں۔ مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ ملکہ اس قدر سن رسیدہ نہ تھیں جیسا کہ اس مجسمہ سے ظاہر ہو رہا ہے۔

پولینیا۔ حضور بجا ارشاد ہے۔ مگر لائق تراشنے والے نے اس امر کا لحاظ رکھا ہے کہ اگر ملکہ اس وقت موجود ہوتیں تو وہ خود بھی ایسی ہی سن رسیدہ ہوتیں۔ حضور کے خیال میں وہ نقشہ ہے جو رحلت کے وقت ملکہ کا تھا۔ بھلا اتنے عرصہ کے بعد اُس نقشہ سے بالکل مطابقت کیونکر ہو سکتی تھی۔

اب میں اُمید کرتی ہوں کہ مجھے اس بات کا ایما شاہی ہوگا کہ مجسمہ پر پردہ ڈالدیا جائے کیونکہ حضور والا جس قدر محو ہو رہے ہیں میں سمجھتی ہوں کہ قوت تخیلہ اُسکے ذریعہ سے اپنا کام کر گئی۔ اور آپ تھوڑی دیر میں مجسمہ کو متحرک خیال فرمائیں گے۔

پادشاہ۔ پولینیا! ایسا غضب نہ کرنا۔ پردہ تو اسپر خدا کے لیے کبھی چھوڑو ہی مت۔ مجھے اسی طرح دیکھنے دو۔ جب تک مجھ میں دیکھنے کی تاب ہے۔"

اسکے بعد پادشاہ پھر مجسمہ کو دیکھنے لگا۔ جو لوگ وہاں موجود ہیں وہ بھی خاموشی سے تصویر پر گڑی ہوئی نظروں سے چابکدست تراشنے والے کی تراش کی داد دے رہے ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے نہ سنتا ہے۔ صرف نظر کامل محویت سے اپنا کام کر رہی ہے' اور دیکھنے والے حسنِ تراش پر محو حیرت ہیں۔ دل تصویر کی طاقت سے اُسی طرف ڈھلکا جا رہا ہے۔ اور سب پر وہ وقفہ

نہایت گراں گزرجاتا ہے جو اس کمرہ کے طاری شدہ سکون پر کسی قسم کے تموج یا تحریک کا باعث ہو جاتا ہے۔

پادشاہ دیکھتے ہی دیکھتے کہنے لگا "کیا تم اس مجسمہ میں نفس کی آمد و شد نہیں پاتے ہو؟ مجھے تو تنفس اور کبھی کبھی آنکھ کی پتلی کی گردش دونوں معلوم ہو جاتی ہیں۔

پولینیا - حضور! اب مجھے پردہ ڈالنے کی اجازت عطا فرمائیں۔ کہ لحظہ لحظہ اسکے دیکھنے سے حیرت اور قوتِ واہمہ کو ترقی ہی ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ حضور اس قالبِ بے روح کو ذی روح تصور فرمانے لگیں گے۔

پادشاہ - پولینیا! تونے اس دلکش مجسمہ کو دکھاکر مجھپر وہ احسان کیا ہے جسے میں مدۃ العمر نہیں بھول سکتا۔ یہ مجسمہ میرے مردہ خیالات اور افسردہ تمناؤں کی زندہ تصویر ہے۔ کامل اور ہنرمند صناع نے اس تصویر میں اپنے ہنر سے وہ سب ہی رنگ تو بھردیے ہیں جو میری عمر رفتہ کی عزیز اور خوش و خرم گھڑیوں، اور انکے متعلق دلپسند واقعات کو متشکل کرکے میرے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اس مجسمہ کی محض دید میری روح کو تازہ اور دل کے مسرور کرنے کو کافی ہے۔ اب مجھے ایک خوشگوار اور خمار آلود کیفیت سی اپنے دماغ میں محسوس ہو رہی ہے۔

دل اُن آنکھوں کے تصور سے مرا شاد رہے قاف پریوں سے جہاں ہو وہی آباد رہے

پولینیا! از برائے خدا مجھے دیکھنے دو۔ چھیڑو نہیں۔ اگر میں سوجاؤں تو سمجھنا کہ حیات جاودانی کے مزے لے رہا ہوں۔

پولینیا - اے آقائے نامدار! آپ پر کیفیت اضطرار طاری ہو رہی ہے۔ اس بے اختیاری کو روکنے کے لیے اگر آپ پسند فرمائیں تو اسکے لب لعلیں کے بوسے لے سکتے ہیں۔

پرڈیٹا (شاہزادی) جو اب تک نقشِ حیرت بنی ہوئی اس مجسمہ کو دیکھ رہی تھی اور اتنا دیکھنے پر بھی اُسکی نظر سیر نہ ہوئی تھی، اپنے دل میں خیال کر رہی ہے۔

"اے اللہ! کہاں تک میں اس تصویر کو دیکھوں۔ ایک حقیر صناع نے اصلیت کے تمام رنگ روپ اس میں نمایاں کردیے ہیں۔ تو صانعِ حقیقی ہے، کیا تیری قدرتِ کاملہ اُنکا تکملہ بس اتنی سی بات سے نہیں کرسکتی، کہ اس میں جان پھونک دے۔ تیری قدرت سنتی کیا ہوں دیکھتی ہوں "لاتعد و لاتحصیٰ"* ہے۔ جسکے جلوے ہر طرف نمایاں ہیں، کہ اُنکی کُنہ تو کیا اُنکے ظواہر کی خبر لائے۔ بشر کے ادراک و وجدان سے باہر ہے۔ تو ہی لبِ گور مریضوں کو شفا بخشتا ہے۔ خشک بے برگ و بار درختوں کو یدِ قدرت سے سرسبز و شاداب بناتا ہے۔ پس کیا؟ میں تیری ذات سے یہ امید منقطع کرلوں کہ اس مجسمہ میں، جو میری جنت نصیبانِ کا ہی، جان ڈالکر جاں بخشی نہ فرمائیگا؟"

(ٹھہر کر اور پھر دوسرے خیالات میں پڑ کر) "نہیں! نہیں! تیرا ہر فعل قانونِ قدرت کے موافق ہوتا ہے۔ اسکی اُمید مجھے کسی طرح نہ کرنی چاہیے۔ پھر اس مجسمہ کے خالی دیکھنے سے حاصل؟ تاہم میری آنکھوں نے اسوقت ایک بابرکت فرض ادا کیا۔ جس سے میں یقیناً دوسری صورت میں محروم رہ جاتی۔ مگر اب میرا کلیجہ مسوستا ہے۔ اس لیے میں اپنی آنکھیں بند کرلوں تو بہتر ہے۔"

پریڈیٹیا انھیں خیالات میں گُم ہے، پولینا نے بادشاہ سے پھر کہا۔

"بادشاہ سلامت! یا آپ اس سین کو ختم کرنے کی نسبت مجھے ایماء فرمائیں ورنہ اس سے زیادہ قابلِ حیرت تماشہ دیکھنے کو حضورِ عالی طیار ہو جائیں۔

ابھی حضور کو تنفس اور آنکھوں کی پتلیوں کے جنبش کرنے کا شبہ تھا۔ مگر اب آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ پلیٹ فارم (چبوترہ) سے یہ مجسمہ خود بخود نیچے آئیگا اور قریب آکر حضور کے گلے میں اپنے ہاتھ حمائل کردیگا۔ کیا مجسمہ سے اس غیر معمولی اندازِ حرکت کے ملاحظہ فرمانے کی حضورِ اقدس تاب لائیں گے؟ اور یہ سب کچھ چونکہ خارجی تدابیر سے ہوگا اس لیے مجھے یہ گزارش کرنی بھی ضرور ہے کہ جہاں پناہ کہیں یہ نہ تصور فرمالیں کہ میں خراب روحوں پر

* یعنی بیگنتی بیشمار

قابو رکھتی ہوں، جس کے ذریعہ سے یہ کرشمہ دکھا سکتی ہوں۔ نہیں! بلکہ صناع نے ایسی اسپرنگ (کل) بھی اسمیں لگا دی ہے جسکے ذریعہ سے یہ حرکت وغیرہ کر سکتی ہے"

پادشاہ (سخت متعجب اور حیرت زدہ ہو کر) کیا پولینیا تم ایسا کر سکتی ہو؟ اگر درحقیقت ایسا ہی ہے تو نہایت خوشی کے ساتھ میں اس کرشمہ کو دیکھوں گا۔ مگر کیا اسکے ساتھ ہی تم اس سے بات بھی کرا لوگی؟ شاید تمہیں اسکی بھی ترکیب معلوم ہو"

پولینیا نے فوراً چند لوگوں کو اشارہ کیا (جو پہلے سے اشارہ کے منتظر ہی تھے) جنھوں نے سُریلی اور مناسب وقت راگنی میں اپنی لوچدار آوازوں میں کچھ گیت گانے شروع کیے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اس مجمع کو اپنی سُریلی تانوں سے مست اور سرشار بنا دیا۔

جب گانے کا رنگ خوب جم گیا اور ہر شخص اسکے اثر سے جھوم اُٹھا تو یکایک اُس بیجان پتھر کی مورت کو حرکت ہوئی اور اس نے اپنی جگہ سے آگے بڑھنا شروع کیا چبوترہ سے قدم قدم اُتری۔ اور پادشاہ کے قریب پہنچ کر دونوں ہاتھ اسکی گلے میں ڈال دیئے۔ اور نہایت دردناک آوازمیں گویا ہوئی [illegible]

جب نہیں تو اب یہ معاملہ ضرور طرفہ [illegible] نظر بندی کا سارا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ اور جسے سب لوگ پتھر کا ایک بُت خیال کرتے تھے وہ ایک انسان کی شکل ظاہر ہو چکا تھا۔ [illegible] نامند ہو گیا۔ اور اُسکا رنگ تاثیر بھی لوگوں کے دلوں سے کافور ہو گیا مگر اس نئے معجزہ سے سب پر رنگ حیرت چھا گیا۔ پولینیا وفور جوش سے سجدہ میں گر پڑی کہ میری ناچیز دعا کو مستجاب الدعوات نے کیسا اثر قبول بخشا۔

جنوں کا جوش گھٹا تھا کہ پھر گُل آئی ‏‏‏‏ ‏‏‏ ‏ ‏ ابھی ہوش رکا تھا کہ تازیانہ ہوا

(۱۵)

غیب سے جو عالم ظہور میں آیا، اُسے حیرت کے مارے کچھ کہا نہیں جاتا۔ ناظرین آپ ہی نہیں ہم بھی انگشت بدنداں ہیں۔ لیونٹس پادشاہ سسلی کی کیفیت [illegible] ہو کر لہلہا اُٹھا۔

اُسکے نخلِ آرزو کا بارآور ہونا، اور اُسکے دامنِ دل کا خوشی اور مسرت کی نوبہار کلیوں سے بھرجانا اُس قادرِ مطلق کی بے نیازی اور قدرت کا ایک ادنیٰ اور نظر پر نہ چڑھنے والا کرشمہ تھا۔ یہ تو کیا ہے، ایک تِل کی اوٹ سنتے ہیں آس اور دولت کے پہاڑ مِل جاتے ہیں۔ اور یوں کہ جاتے جاتے ٹھوکر لگی، کھنک و چمک معلوم ہوئی۔ اُسکا بندۂ مفلوک کاسۂ گدائی پھینک وہاں رُک رہا، اندھیرا چھا گیا تو بچا بچا کے اُس جگہ کو کھودنے لگا۔ کھودتے کھودتے اُسمیں اُسنے گنجِ شائگاں بھی پایا اور اندر سجے سجائے محل کا دروازہ نظر آیا۔ جہاں سب اُسکے عزیز و اقارب موجود تھے۔ وہاں پہنچکر اُسے معلوم ہُوا کہ خزانہ اور محل سب اُسی کا ہے۔ سمجھ لو۔ اُسکی بے نیازی کے بس ایسے ہی کھیل ہیں۔ جسکے لیے حکم ہوا، ٹھوکر کے اشارہ سے دھرتی نے خزانے اُگل دیے۔

دامانِ نگہ تنگ گُلِ حسنِ تو بسیار　　　گُلچینِ جمالِ تو ز داماں گلہ دارد

یہ سب کچھ سہی تاہم چونکہ اُسکا قانونِ قدرت اسبابِ ظاہر سے کہیں تخلف کرتے نہیں پایا گیا اس لیے عقل ہر جگہ اسباب کی ٹوہ میں رہتی ہے۔

یہاں خود پولینیا کی زبانی جس نے حیرت اور جوش کا عالم فرو ہونے کے بعد بادشاہ کے استفسار پر اصل حال کا اظہار کیا ہے۔ یوں روایت ہے کہ

"ملکہ ابھی قید میں ہی تھیں، جہاں پناہ کا جلال و جبروت دوبالا ہو رہا تھا کہ ننھے شہزادہ کا غنچۂ حیات کھِلا جاتے پر بھی غیظ و غضب کا شعلہ کم نہ ہوا۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ الٰہی ملکۂ دوراں کی جان کی خیر کیجیو مثل ہے ہبت ا۔ میں تو یہ بھول جاتی ہے، اُس وقت کوئی تدبیر ملکہ کے حفظِ جان کی بجز اسکے مجھ سے نہ بن پڑی کہ محافظ پارٹی سے مل کر اُن کی خبرِ مرگ مشہور کر دوں۔ بارے یہ تدبیر کارگر ہوئی اور پوشیدہ طور سے ملکہ کو میں اپنے جھونپڑے میں لے آئی۔ خیریت ہوئی کہ اس خبر پر کسی قسم کا اشتباہ نہیں کیا گیا، ورنہ کیا حضور یہ بات پہنچنے سے رہ جاتی اور بہتوں کی جان پر بلا نہ آتی؟ مگر سب کچھ نہایت سوچ سمجھ کر

اور سب پہلوؤں پر غور کر کے کیا گیا۔ بات پُرانی دُھرانی ہو گئی تب میں نے خداوند مسیح کا شکریہ ادا کیا۔ وہ گھڑی تھی۔ جب ملکہ قید سے یہاں آئی ہیں۔ اور آج کا روز ہے۔ اتنی طولانی مدت میں ملکہ کے اخفائے وجود کا ایسا انتظام رہا کہ کسی بشر کی نظر ملکہ کے سایہ پر نہ پڑ سکے۔ میرے گھر میں آنے جانے والے بھی تھے۔ اور اگر بندش یا نئی بات روک ٹوک کی کیجاتی، تو بھی شبہہ پیدا ہوتا۔ اگرچہ اس بات کی پوری توقع تھی کہ جب شعلہ غضب فرو ہو جائیگا اُس وقت عالم پناہ! ملکۂ دوراں کے لیے کیسے کچھ بے قرار ہونگے۔ مگر اسوقت غیظ و غضب میں جو حکم ہو جائیگا وہ بھی ٹل نہ سکے گا۔

پہلے پیشگاہ خداوند مسیح میں میں اپنا سرِ نیاز بندگی خم کرتی ہوں۔ پھر حضور معلی کے روبرو وہی سر اطاعت سے جھکاتی ہوں کہ میں نے اپنی خدمت اور اطاعت کے نخل کو آج باثمر دیکھ لیا"

اسکے بعد اس نے انجیل مقدس کی کچھ آیتیں پڑھیں اور سر زمین پر ٹیک دیا، پھر بادشاہ کے سامنے جا کر اُس نے سر جھکا یا اور... سلسلۂ تقریر کو یوں شروع کیا۔

"ہاں! یہ بھی قابل اظہار ہے کہ آج سے پہلے میں نے اسکا اظہار کیوں نہیں کیا۔ سو پہلے کئی بار میں نے اس طلسم سے خداوانِ شاہی کو آگاہ کرنے کی جرأت کی۔ مگر پھر قاصر رہی۔ یہ عقدہ آج حل ہوا۔ کہ جو امر مشیت ایزدی میں اس مبارک اور بہتر موقع کے لیے (کہ جس سے عمدہ کوئی دوسرا موقع اسکے لیے ہو ہی نہیں سکتا) مقدر تھا۔ وہ کیسے قبل از وقت مجھ گناہ گار کی زبان پر آ سکتا تھا"

اسکے بعد پولینیا خاموش ہو گئی۔ بادشاہ نے تشکر آمیز الفاظ سے اُسکی قدر افزائی کی۔ اور اُسکی وفاداری اور اخلاص کی داد دی۔

ملکہ بادشاہ سے عفو تقصیر کرا چکیں۔ تو اپنی جگہ گوشہ ندیدہ شاہزادی کی طرف آئیں شاہزادی نے ادب سے دونوں پیر ٹیک کر دست بوسی کی اور سر قدموں پر رکھ دیا۔

ملکہ نے پیروں سے چھڑا کر سینہ سے چپٹا لیا - دیر تک دونوں بغل گیر رہیں - چشم پُرنم دونوں طرف دفورِ جذبات کا ثبوت دیتی رہیں - پھر دونوں جدا ہوئیں - اور قصہ مختصر سب لوگ خنداں و فرحاں ہشاش بشاش ایوان شاہی کو روانہ ہوئے - یہ خبر شہر میں پہلے ہی مشتہر ہو چکی تھی - دو رویہ شاہراہوں پر رعایا اُمنڈ آئی تھی - اس مجمع میں ہر طرف سے مسرت اور جوش کے نعرے بلند ہو رہے تھے - اور اسی جوش میں ہر شخص شاہی گاڑی کی طرف پھول پھینک رہا تھا - پھولوں کی یہ کثرت تھی کہ گاڑی کے ایوانِ شاہی تک پہنچتے پہنچتے کئی بار پھولوں سے خالی کرنے کی نوبت آئی - قصر معلٰی میں جب سب داخل ہوئے تو قصر تاثیر و کیفیت کا ایک نمونہ بن رہا تھا - در و دیوار بادشاہ کو مبارک باد اور افتراق بعیدہ کے بعد ملکہ کے داخلہ پر اپنی پر تاثیر زبان کیف میں خیر مقدم کہکر خوشی کے آنسو گرا رہے تھے -

ارکین سلطنت اور وابستگان دولت زر و جواہر نچھاور کر رہے تھے اور فرطِ مسرت میں جان نثار کرنے پر تیار نظر آتے تھے - یہ زر و جواہر کا مینھ برس رہا تھا کہ بادشاہ ملکہ کو سنبھالے ہوئے مع شاہزادی کے ایوان میں داخل ہو گیا۔ (باقی دارد)

سید سخاوت حسین بجنوری

چرخ کے طورِ ستم گار رہیں گے کب تک
جرم ناکردہ دل افگار رہیں گے کب تک

ہے یہی رنگ جو مایوسی و محرومی کا
تیری رحمت کے طلبگار رہیں گے کب تک

پھر بہار آئی میں صدقے ترے اے ابرِ کرم
چمنِ زیست میں اب خار رہیں گے کب تک

دیکھ ہی لینگے کبھی دل کو اُڑا ہی لیں گے
ناوک انداز ہیں بے کار رہیں گے کب تک

بزم مے - جوشِ شباب اور طبیعت حاضر
میں بھی دیکھوں کہ وہ خوددار رہیں گے کب تک

دست بر داد اثر ہوں میں بس اے آہِ رسا
مضطرب ہائے وہ بیدار رہیں گے کب تک

تھک گئے ہوں گے فرشتے تری رحمت کے ضرور
جنسِ عصیاں کے خریدار رہیں گے کب تک

عہد سے عہدہ برآ ہونے میں دشواری ہے
آپ زحمت کشِ اقرار رہیں گے کب تک

بزم معشوق میں ہو یاد بجائیں بسمل
دیکھنا ہے کہ یہ انکار رہیں گے کب تک

حمد

حمد تیری ہو ادا کس طرح مجھ ناچیز سے
فہم سے باہر ہے یارب تیری شانِ برتری

کس زباں سے میں کروں اوصاف کا تیرے ثنا
ہے تری ذاتِ ستودہ سارے عیبوں سے بری

تجھ سے صانع کی میں صنعت کا بیاں کیونکر کروں
تیری قدرت پر ہے شاہد خود تری کاریگری

بس تو اے خالق سراپا نقشِ حیرت بن گیا
تجھ سے نقاشِ ازل کی دیکھکر صورتگری

ہے زمیں چکر میں کیا کیا تیری صنعت دیکھکر
رقص میں رہتا ہے ہردم گنبدِ نیلوفری

یاسمیں نے پھول چاندی کے نمایاں کر دیے
گُل نے کھولی صحنِ بستاں میں دکانِ زرگری

لالۂ صحرا کو بخشا تو نے رنگِ دلپذیر
نرگسِ شہلا کو تو نے آنکھ دی جادو بھری

اے شہ ہر دو سرا کیا ہے نظامِ سلطنت
کارخانے میں ترے دیکھی نہ ہرگز ابتری

دن کو روشن ہے جہاں ضوگستریِ شمس سے
رات کو ماہِ مبیں کی چار سو جلوہ گری

دلنشیں گلہائے رنگارنگ سے روئے زمیں
انجم رخشاں سے ہے پُرنور سپہرِ چنبری

سبزۂ نوخیز سے کچھ اور ہی عالم ہوا
دستِ قدرت نے بچھا دی ہر طرف مخمل ہری

بندگانِ بیکس و ناچار سے پوچھے کوئی
تجھ سے منعم کی ہے کیا کیا اُنپہ بندہ پروری

کیا تری عاجز نوازی ہے کہ اے عاجز نواز
کر رہی ہے چرخِ ہفتم سے زمیں بھی ہمسری

تو ہے سلطانوں کا سلطاں تو شہنشاہوں کا شاہ
تجھکو زیبا ہے فقط اے میرے مولا سروری

ہیں تری قدرت کے زندہ شاہد اُنکے معجزات
جنکو بخشی تو نے اے رب عزتِ پیغمبری

وجد میں آکر یہ باسط کہہ اُٹھا اے ربِّ پاک
نورِ وحدت کی ترے ہر شے میں ہے جلوہ گری

باسط بسوانی

کتاب جوانی کے ایک باب کا آموختہ

(ایک رات)

جو سرے سے دل ہی نہ رکھتی ہوں اُن مردہ ہستیوں کا ذکر نہیں۔ ہر وہ شخص جو پہلو میں دل رکھتا ہے اپنی سوانح عمری میں کوئی نہ کوئی ایسی سرگزشت بھی ضرور رکھتا ہے جسکی یاد سے دل میں تڑپ پیدا ہوتی ہے اور اُس تڑپ میں بلا کی لذت بھری ہوتی ہے۔ رات کے سنسان گھنٹے اُس پُرکیف تخیل میں شبِ وصل کی طرح پلک مارتے ٹیر ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دن کا شور وشغف اور مصروفیت سلسلۂ خیالات کو منقطع کر دیتی ہے مگر وہ لذت تمام ہونے کو نہیں آتی۔

میری آج کی رات وہی پیاری رات ہے۔ کاش یہ ختم نہ ہوتی۔ جوانی گئی اُسکی کیفیتیں سدھاریں۔ مگر اُسکی پیاری پیاری یاد میں وہ لذت ہے جو شاید خود جوانی میں نہ ہوگی۔ بے خود ہو جاتا ہوں۔ محو ہو جاتا ہوں۔ نشہ سا طاری ہو جاتا ہے۔ سر سے پاؤں تک بجلی سی کوند جاتی ہے۔ دل دھڑکنے لگتا ہے۔

ہائے وہ ابتدائے جوانی اور آغازِ عشق۔ کامیابِ عشق۔ دل آیا بھی تو کس پر؟ حیا کی دیوی۔ دریائے شرافت کا موتی۔ عصمت مجسم۔ اور سراپا؟ کیا میں بے غیرت شعرا کی طرح اپنے معشوق کا سراپا کھینچکر اُس کانِ حیا کو اوروں سے انٹروڈیوس کروں؟ ہرگز نہیں۔ نہ غیرت اجازت دیتی ہے نہ زبان قلم میں یہ قدرت۔ اسکی لذت کچھ دل ہی جانتا ہے۔ اور مجھے یہی کافی ہے۔

ہائے جوانی! تیرے کرشمے بعید از فہم ہیں۔ سامنا تو میرا اُنکا عہد طفلی سے تھا دوستی سی پہلے بھی تھی۔ مگر ہائے وہ آڑی ترچھی نظریں اور نیچی نیچی نگاہیں کب سے پیدا ہو گئیں؟ یہ تیر کدھر سے برسنے لگے؟ خندۂ زیر لب کس نے سکھایا۔ رسیدگیِ آہو کہاں سے پیدا ہو گئی؟

اپنی ادا سے آپ جھجکنا۔ اپنی ادا سے آپ کھٹکنا

چال میں لغزش ۔ منھ پہ حیائیں ۔ اُف ری جوانی ہائے زمانے
اور مجھے تڑپنا ۔ لوٹنا ۔ پیچ پیچ اُٹھنا ۔ جان دنیا کہاں سے آ گیا ؟

ہائے وہ رات ! یاد کر وحضرتِ دل ۔ شوق کے تقاضے ۔ سوہانوں سے بلوانا ۔ ٹھٹھک ٹھٹھک کر، رُک رک کر، تھم تھم کر، آگے بڑھ بڑھ کر، پیچھے ہٹ ہٹ کر بصد ناز جلوہ نمائی ! سنسان رات ! حسرت دارمان کا ہجوم ! شوق کی پیشوائی ! رعبِ دوشیزگی کی گھڑکیاں ! پاکبازی کے سکّے !

ابھی کیا کیا منصوبے گانٹھے جا رہے تھے ؟ تمنائیں نکلنے کو کسقدر بیتاب تھیں ! مگر اُس آفتابِ حُسن و عصمت کے جلوہ نما ہوتے ہی سب خاموش ہو گئے ۔ محو ہو گئے ۔ مٹ گئے ۔ دل نے آنکھوں کی راہ سے نظارہ آشامی شروع کر دی ۔ گفت و شنید کے منصوبے اور ساری ترکیبیں دھری کی دھری رہ گئیں ۔ جسے سونے کی چڑیا سمجھ کر اپنے خیال میں دل اپنے دام میں لا یا میں خود اُسی کے دام میں گرفتار ہو گیا ۔ بیخودی سے افاقہ ہوا تو دل نے اُس عصمت کی دیوی کی پرستش شروع کر دی ۔ بجائے ہوسناکی کے ایک ایسا جذبہ پیدا ہوا جسے شرافت کہیے، روحانیت کہیے، الٰہیت کہیے ۔ اُس فرشتہ کا شوق ہر قسم کی جسمانی ارمانوں کی آلودگیوں سے پاک، آرزوئے ہم آغوشی سے مبرا اور عشق مجازی سے کچھ ارفع تھا ۔

یہ خدا کا شکر ہے کہ بلا استحقاق مجھ کو یہ نعمت عطا کی ۔ جس شے کا صرف دیدار میرے حوصلہ سے کم نہ تھا اب مجھے اُسکی پرستش کی اجازت بھی حاصل ہے ۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین ۔

" ایک بوڑھا عاشق "

از شبنمِ عشق خاکِ آدم گِل شد — صد فتنہ و شور در جہاں حاصل شد
صد نشترِ عشق بر رگ روح تنند — یک قطرہ فرو چکید نامش دل شد

(زلالی کاشی)

غزل

او خود نما! یہ خونِ سرِ رہگذر نہیں
دل ہے کسی غریب کا تجھکو خبر نہیں

اظہارِ حالِ دل مجھے مدِ نظر نہیں
غم سیکڑوں سہی مگر آنکھیں تو تر نہیں

دنیا میں چپ کی داد بھی ہرگز نہ مل سکی
ہم مٹ کے خاک ہو گئے تجھکو خبر نہیں

ہے جانِ زندگی خلشِ ناوکِ ستم
حیف اُس پہ جس کو لذتِ زخمِ جگر نہیں

آتا ہے دل لیے ہوئے ہر اک وجود میں
افسونِ حُسنِ یار کا کس پہ اثر نہیں

تم اپنے عاشقوں سے نہ گھبراؤ اس قدر
دنیا کی آفتوں سے کسی کو مفر نہیں

اللہ یوں بھی ہو نہ کوئی مبتلائے عشق
اپنی ہی خستگی پہ مجھے کچھ نظر نہیں

یارب نہ آنیوالی ہو نازک کوئی گھڑی
بیمار کے قریب کوئی چارہ گر نہیں

اللہ رے طلسمِ جمالِ سخن فریب
کچھ تجھسے کہنے آئے تھے یاد اب مگر نہیں

کچھ بڑھ گئی ضرورتِ اخفائے راز سے
ہو بے رُخی ضرور مگر اس قدر نہیں

یا صبر آگیا ہے مجھے یا ظرف ہے تہی
آنکھوں سے اب تراوشِ خونِ جگر نہیں

میں خوش کہ آج تختۂ مشقِ جفا بنا
وہ خوش کہ تیغِ ناز کی کوئی سپر نہیں

اس بیخودیِ عشق میں احساسِ غم کہاں
مجھپر فراقِ یار کا کچھ بھی اثر نہیں

صرف ایک روزِ حشر ہے محویؔ میں کیا کہوں
اتنی تو سرگزشت مری مختصر نہیں

محوی صدیقی

نظرے خوش گزرے

بالآخر مسٹر محمد علی (ایڈیٹر ہمدرد و کامریڈ) کے موافق و مخالف احباب کو جس بات کا اندیشہ و انتظار تھا وہی ہو کر رہا۔ یعنی چیف کمشنر صاحب دہلی کے حکم سے حسب منشاء قانونِ نوزائیدہ متعلقۂ حفاظتِ ہند اُنہیں معہ برادرم شوکت علی صاحب کے نواحِ دہلی میں قصبۂ مہرولی کو اپنا مسکن بنانا پڑے گا اور تا اختتامِ جنگ یا کم سے کم تا حکم ثانی اُس آزادی سے محروم رہنا پڑے گا جو کہا جاتا ہے کہ ہر نوع بشر کا سب سے بڑا۔ مقدس اور اولیں حق ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ اس واقعہ سے متاثر ہو کر اپنے معزز معاصر اور عزیز دوست کے ساتھ اظہار ہمدردی کریں یا اُنکو مبارک باد کہیں۔ کیونکہ بعض لوگوں کے خیال میں اگر کسی کی آزادی کا سلب ہو جانا ایک ناقابلِ برداشت اور حد درجہ غیر مطبوع تعذیر ہے تو ایک دوسری جماعت کی رائے میں اس خاص نوعیت کی سزا گویا ایک تمغائے امتیاز اور سندِ شرافت و عظمت ہے جسکے حصول پر بجا طور پر فخر و ناز کیا جاتا اور کیا جا سکتا ہے۔

مسٹر محمد علی کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے والوں یا اُنکی نظربندی پر مسرور و شاداں ہونے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس لیے ہم ان دونوں خدمات سے سبکدوشی حاصل کرتے ہیں اور چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں جن کے اظہار کے لیے یہ موقع اس وجہ سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر محمد علی کو مصروفیت و انہماک کے بجائے نسبتاً تعطل و آرام حاصل ہے اور ایسی صورت میں امید کرنا بیجا نہیں کہ جو کچھ از راہِ خیر طلبی و اخلاص ہم یہاں لکھتے ہیں اُسے وہ ٹھنڈے دل اور کمال فراغت سے پڑھیں گے۔

مسٹر محمد علی ہماری نظروں میں قوم کے ایسے جوہر بے بہا ہیں کہ اُنکی ذات پر جس قدر ہمیں نازش و افتخار ہو کم ہے۔ ایسی قابلیت اور اہلیت بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اور علی الخصوص اُس قوم کے افراد کے لیے تو ایک گراں قدر نعمت ہے جو رفعت و او ج کے

منازل طے کرکے ادبار و نکبت کی گھاٹیوں پر ٹکراتی پھر رہی ہو۔ لیکن کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ جسے خداوند تعالیٰ نے ہماری ڈوبتی کشتی کی ناخدائی کے لیے پیدا کیا تھا اور جسکی ذات سے ہمیں بجا طور پر توقعات ہو سکتی تھیں کہ وہ اس آڑے وقت میں ہماری رہنمائی کی خدمت انجام دے گا خود وہی گرداب بلا میں مبتلا اور ایک حد تک گم گشتہ راہ نظر آرہا ہے۔

ہم اُن لوگوں میں نہیں ہیں جو مسٹر محمد علی کو انتہا پسند جانتے یا انتہا پسندوں کو بُرا سمجھتے ہوں اور نہ اپنے دوست کے حاسدوں اور مخالفوں کی صف میں بیٹھ کر ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی کی نگاہ و کرم سے مستفیض ہوں لیکن واقعات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور مسٹر محمد علی کی حالت میں جو انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے اُس سے چشم پوشی کرنا ناممکن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسٹر محمد علی جب تک کلکتہ میں رہے اور اُس کار خاص میں مصروف رہے جسکے لیے دست قدرت نے انکو وضع کیا تھا وہ مُلک و قوم کی نہایت بیش قیمت خدمات انجام دیتے رہے اور حاویہ بہیں کو چھوڑ کر قوم کے تمام سمجھدار لوگوں کی آنکھوں کا تارا بنے رہے۔ انکی بے نظیر انشا پردازی۔ آزادانہ نکتہ چینی اور دلیرانہ مدافعت کے آگے نہ صرف اُن کے ہوا خواہوں اور قوم کے دردمندوں نے سر تسلیم خم کیا بلکہ وہ سپریم گورنمنٹ (حکومت اعلیٰ) کے ارکین اور غیروں سے بھی خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔ لیکن جوں ہی کہ اُنھوں نے اپنی مملکت سے آگے قدم بڑھایا لغزشوں اور آلائشوں نے اُنھیں گھیر لیا اور اب رفتہ رفتہ وہ ایسے مخمصات میں پھنس گئے ہیں کہ اُنکی قابلیتوں سے مُلک و قوم کو جس قدر نفع پہنچا اور پہنچ سکتا تھا وہ سب خواب و خیال ہو گیا۔

کامریڈ اگر ایک ایسے مضمون کی وجہ سے بند ہو گیا ہے جو صفحات تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا تو اس کا کچھ افسوس نہیں ہونا چاہیے اور آج مسٹر محمد علی اگر آزادی جیسی نعمت سے محروم ہو گئے ہیں تو اسپر بھی ماتم کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن رنج جس بات کا ہے اور رونا جس حالت پر آتا ہے وہ یہ ہے کہ مسٹر محمد علی اپنی اعلیٰ حیثیت سے گر گئے اور ایسی راہ لگ گئے

ہیں جس پر چلنے والوں کی کمی نہیں ہو سکتی۔

در اصل مسٹر محمد علی کی پہلی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے کلکتہ کو چھوڑ کر حکومت اعلیٰ کے ساتھ ساتھ دہلی میں آکر قیام کیا اور اس سے بڑھ کر یہ خام خیالی ہوئی کہ ایک اردو اخبار کی بلا اپنے سر مول لی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف انکے قیمتی وقت کا بیشتر حصہ ایسی مصروفیتوں میں بسر ہونے لگا جسکے لیے بہت سے دوسرے موزوں تر افراد قوم میں موجود تھے اور دوسری طرف مالی خساروں اور دشواریوں نے انکو طرح طرح کی لغزشوں کا شکار بنا دیا۔

مسٹر محمد علی یا انکے احباب اگر اس غلطی میں مبتلا ہیں تو ہوں کہ گذشتہ چند سال کے اندر عالم اسلامی پر جو ابر غلیظ سایہ فگن رہا اور مسلمانان عالم جس دردناک اور سخت ترامتحان میں ڈالے گئے یہ مصیبت جو آج مسٹر محمد علی پر نازل ہوئی ہے اُسی کا نتیجہ ہے۔ اگر یہی ہوتا تو اس مصیبت کو ہم ابرِ رحمت جانتے اور بجائے مسٹر محمد علی کو نصیحت کرنے کے انھیں مرحبا اور جزاک اللہ کہتے۔ کیوں کہ ابتلا کے جو مدارج بظاہر ہمارے دوست کو طے کرنا پڑے ہیں یہ نصیب کسے ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ان مصیبتوں کی ذمہ داری بہت کچھ مسٹر محمد علی پر اور ان حالات گرد و پیش پر ہے جن میں کچھ عرصہ سے وہ گھرے ہوئے ہیں۔

مسٹر محمد علی اور ہمارے بعض دوسرے گرامی قدر بھائیوں کو جو اسلام کی صداقت کے دل سے معترف اور ناموس ملت کے سچے فدائی بننا چاہتے ہیں بجائے خود اس پر غور کرنا چاہیے اور اُن عاملانِ شریعت سے مشورہ کرنا چاہیے جو اس امتحان اور کشمکش کے زمانہ میں بھی خدا اور خدا کے رسول کے سوا کسی کے آگے سر اطاعت خم کرنا نہیں جانتے کہ کیا وہ حقیقت میں جس راہ پر چل رہے ہیں اور ہمیں چلانا چاہتے ہیں اسلام کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم ہی ہے۔

بڑے افسوس اور رنج کی بات یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص نے اپنا اپنا جدا مذہب قرار دے لیا اور کلامِ ربانی اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی کو پسِ پشت ڈال کر اپنی عقل اور اجتہاد پر بھروسا کرنا سیکھ لیا ہے۔ بلکہ خود ارشادِ خداوندی کو طرح طرح

کی تاویلوں سے اپنی رایوں اور اپنے رجحانات کا تابع بنانے کی کوشش کیجاتی ہے اور اس طرح اسلام اور مذہب کی خدمت کے بہانے اپنے اپنے دلوں کے حوصلے نکالے جاتے ہیں اور یہ کوئی نہیں جانتا کہ

جناب عشق دا درگہے بالاتر از عقل است ٭ کسے آں آستاں بوسد کہ جاں در آستیں دارد

آخر میں یہ کہنا خلاف مصلحت ہو تو ہو مگر لحاظ حقیقت و واقعیت نہایت ضروری ہے کہ مسٹر محمد علی اب جس "پارٹی" یا جتھے کے ایک نمایاں فرد سمجھے جاتے ہیں اُسی کے بعض ممتاز عناصر نے مسٹر محمد علی کو اُس راہ نیک سے منحرف کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے جو اوائل میں اُنکا شعار زندگی بنی رہی اور جسکی وجہ سے اُنکی محبت بہت سے دلوں میں ایسی راسخ ہو گئی ہے کہ اُنکی موجودہ حالت پر رنج و افسوس کرنے کے باوجود وہ کبھی اُن سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ اسلام فرقہ بندیوں کا سخت مخالف ہے اور Compromise یا ہمارے الفاظ میں سمجھوتے کا اصول جو سراسر تمدن یورپ کا وارد ہے اور اسلام کی حریت پسندی کے بالکل منافی ہے اور تلون تو یا ایسی پوٹ کرنیوالے بجا طور کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی کچھ خدمت کرتے ہوں اُنھیں ورطۂ ہلاکت و تباہی میں پھنسا رہے ہیں۔ اور یہی وہ حربہ ہے جسکے استعمال میں مسٹر محمد علی کے احباب زود رس مہارت تامہ رکھتے اور جسکے ذریعہ سے وہ قوم کے اصلی اغراض کو پامال کر رہے ہیں۔

قوم کے اکثر زریں بال غداروں اور پُر فریب سرپرستوں کی قلعی زمانۂ گذشتہ میں کُھل چکی ہے اور اب اُنکی چالوں سے کوئی فریب نہیں کھاتا۔ اور غالباً وہ دن بھی کچھ زیادہ دُور نہیں، جب ان ارباب حیل کی روباہ بازیوں سے بھی قوم کو نجات ملے گی۔

ہمیں یقین ہے (اور ہماری دلی آرزو یہی ہے) کہ مسٹر محمد علی کی آنکھیں ایک روز کُھل جائینگی اور وہ اپنی پوری قوة اور اعلیٰ اخلاقی جرأت سے اس جتھے کی سنہری زنجیروں کو توڑ کر اپنی اصلی اور حقیقی آزادی و عزت حاصل کریں گے اور حقیقی طور پر امتِ مرحومہ کی خدمت میں مصروف ہو سکیں گے۔ جسکا ذوق ابتدا سے انمیں پایا جاتا تھا اور جو محض عارضی اسباب دنیٰ اُمنگوں کے پیدا کر دیے جانے کی وجہ سے اسوقت ایک دوسرے درجہ کا جذبہ رہ گیا ہے۔

ہمارے ایک لایق کرم فرمانے نفسیاتی اصول کے تحت ایک ناول لکھا ہے جس میں خطوط کے ذریعہ سارا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ ناول ابھی طبع نہیں ہوا ہے جو ہم ناظرین سے اسکا تعارف کرا سکیں۔ البتہ گذشتہ ملاقات میں مصنف سے جب اسکا ذکر آیا تو اُس حسن ظن کی بنا پر جو الناظر اور اُسکے ناظرین کرام کی خوش مذاقی کے متعلق اُنھیں ہے، بعض اجزا کو بطور نمونہ و بغرض دریافت رائے در مجان شائع کرانے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ سعیدہ کے خطوط میں سے پہلا خط رسالۂ ہذا میں درج کیا جاتا ہے۔ جسکو دیکھکر اگرچہ ہم خود قصہ کے متعلق کوئی اندازہ قائم کرنے سے قاصر رہے ہیں لیکن ممکن ہے کہ دوسرے اصحاب جو زیادہ بالغ نظر اور تیز فہم ہوں کوئی رائے قائم کر سکیں اور ہم نہایت خوشی کے ساتھ ان رایوں کو مصنف تک پہنچانے کی خدمت انجام دینے کے لیے تیار رہیں۔ ادبی حیثیت سے ہم سعیدہ کے الم آفریں طرز تحریر کو پسندیدہ خیال کرتے ہیں اور اگر آخر تک یہی رنگ نباہا جا سکے تو یقیناً مصنف کی محنت ٹھکانے لگ جائے گی اور کتاب کی اشاعت معقول ہو سکے گی۔

الحمد للہ کہ الناظر کی زندگی کا چھٹا سال آج ختم ہوتا ہے۔ ہمیں افسوس و ندامت ہے کہ اس ساری مدت میں ہم الناظر کے ذریعہ سے اپنی مادری زبان کی یا افراد قوم اور اہل ملک کی کوئی بڑی خدمت انجام نہیں دے سکے بلکہ ہماری تمام کوششیں محض الناظر کی بقا و قیام اور بوقت معینہ پر اشاعت کی فکروں میں صرف ہوتی رہیں۔ بجائے خود یہ بھی کچھ آسان کام نہ تھا اور سچ پوچھیے تو ہماری ذاتی سعی و طاقت اسکے لیے بھی ناکافی تھی مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُسکے رحم و کرم سے الناظر کے یہ مراحل زندگی طے ہو گئے اور جب کبھی مالی مشکلات یا ذاتی رجحانات سے متاثر ہو کر اُسکے بند کرنے کا ارادہ کیا تو فضل ایزدی نے ایسی خوش آیند اُمیدیں اور ہمت افزا اسباب پیدا کر دیے کہ ہمیں ہر دفعہ فسخ عزیمت کرنا پڑی۔

اپنی بے بضاعتی اور بے بسی کے خیال سے اب اسکی ہمت بھی نہیں پڑتی کہ آیندہ سال کے متعلق کسی جدید انتظام یا نئی تجاویز کی اطلاع دیں۔ محض اللہ جل شانہٗ کے لطف و کرم پر بھروسا کرکے میدان میں قدم رکھنے پر آمادہ ہیں اور نتائج و مآل کار کو اُسی رب ذوالمنن کی حکمت بالغہ پر چھوڑتے ہیں۔ وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد

کیا مرنا جینا

خود بخود ہوتا ہے یا خدا کی طرف سے

کوئی ظاہری اسباب پیدائشی بھی ہوتے ہیں جن

سے مرض پیدا ہوتا ہے؟

جن کے دور کرنے سے مرض دور ہو جاتا ہے

اس امر پر تمام دنیا متفق ہے کہ زمین پر کروڑوں نباتات معدنیات جمادات حیوانات اور مختلف رنگ مختلف اشکال کے جو پیدا ہوتے ہیں ہر ایک میں حکیم مطلق نے علیحدہ علیحدہ مزہ اور علیحدہ علیحدہ اثر بخشا ہے جنکے اثرات و فوائد سے وقتاً فوقتاً حکیموں طبیبوں کو اتفاد کے ذریعہ اپنی مخلوق کو بچانے کیلئے خداوند ظاہر فرماتا ہے پہلے زمانوں میں لوگ ملک کی دوائیاں بوقت ضرورت استعمال کیا کرتے تھے تو صحت اچھی اور عمریں بڑی ہوا کرتی تھیں۔ اب جبکہ صحت کی بربادی کے سامان ہم لوگوں نے خود پیدا کرنے شروع کر لیے ہیں پہلے کی سی نہ قوتیں نہ جسم نہ ڈیل نہ ڈول بلکہ اولاد کوتاہ قد۔ دائم المریض۔ اولاد چھوٹی عمریں کم۔ وبائی امراض ہر دن نئے نئے آ موجود ہوتے ہیں جب کامل لوگوں اور

حکیموں اور طبیبوں اور خدا رسیدہ حضرات نے

اس پر کافی توجہ و تجسس کی تو مندرجہ ذیل اسباب پیدائشی معلوم ہوئے۔ اگر لوگوں نے ان سے بچنا شروع کر دیا۔ اور غیر ملکوں کی دواؤں کو چھوڑ دیا تو پھر آباؤ اجداد کی طرح جسم مضبوط قوی جسم امراض سا دیہ سے نجات پائینگے

اسباب تنزل و تباہ کنندہ صحت یہ ہیں ۱۔ غیر

ملک کے جوہر اور پیٹنٹ ادویہ کا استعمال جو برفانی حصوں سے بنکر آتے ہیں جہاں سورج روز روشن سے بھی ہفتوں نہیں ہوتے دن کو چراغ روشن کر کے کام سرانجام کیے جاتے ہیں۔ وہ اس میں ہرگز مفید نہیں ہو سکتے +

برخلاف اسکے انڈیا میں سورج کی تیزی اور کثرت روشنی سے پیدا ہوتی ہے

اور زیادہ روشنی سے نقصان جان تو کم ہوتا ہے (۲) مذہبی خیال سے علے العموم اکثر ہوائیں ناپاک اجزا سے مرکب ہوتی ہیں (۳) آب و ہوا وغیرہ کو خصوصیت سے اثر بخشا گیا ہے ایک جڑی بوٹی جو پنجاب میں ہوتی ہے۔ وہ کوہ ہمالیہ پر نہیں ہوتی اسی طرح جو پہاڑ میں درخت ہوتا ہے وہ گرم جگہ نہیں ہوتا۔ یہ کافی دلیل اس امر کی ہے کہ مختلف ملکوں کی دوائیں مختلف اثر اپنے میں رکھتی ہیں اگر ہم اس قاعدہ کو دستور العمل بنا کر اپنے ملک کی ادویہ کو بوقت ضرورت استعمال کریں تو یقیناً ہم خدائی احکام کی تعمیل کرنے سے بعد امراض سے نجات پائینگے۔ سودیشی ادویہ جن میں کوئی مذہبی دوائی اور نہ کوئی مذہبی ممنوع چیز شامل ہو نا کامیاب۔ بعضوں کو کامیاب کرنیوالا مرکب

شربت مقوی اعصاب

اس شربت کے استعمال سے وہ قوی ہو جاتے ہیں جس کی کمی سے مرد نامرد اور پورا ہونے سے مرد کہلاتا ہے جب کثرت خواہشات اور مسکرات اور جوانی کی بدعنوانیاں۔ آپ کو بے وقت اور سن شباب میں لطف کی جگہ بے لطف کردیں تو اس مرکب کو تجربہ کریں تو ہر میدان میں آپ غالب رہیں گے آپ چاہتے ہیں کہ روزانہ ڈیوٹی اور افکار مزید اور محنت کی کثرت سے درماندہ نہ ہوں اور پیری میں جوانی کا حظ اٹھائیں تو اسکو اپنی جیب میں رکھیے یہ نامرد کو مرد مرد کو جوانمرد بنا دیتا ہے اعضاء رئیسہ دل و دماغ جگر اور معدہ کو درست کرتا ہے۔ بزدل کو صاحب حوصلہ اور صاحب حوصلہ کو ممتاز ہونیکی طاقت بخشتا ہے اعصابی طاقت اور برقی رفتار اعصاب میں اس سے پیدا ہوتی ہے جو لوگ بے وقت صرف قوت کر لیتے ہیں اور زندگی کے دیسی مزوں سے قاصر ہوتے ہیں وہ اسکے چند روزہ استعمال سے اپنی گمشدہ قوت کو واپس لا سکتے ہیں۔ جب مثانہ کمزور ہو کر مادہ زندگی تباہ ہو گیا ہو اور تھوڑے فکر اور رنج سے حاجت ادرار ہو جاتی ہے اور دماغ میں خیالات بیہودہ کا ہجوم رہتا ہو تو اسکے پینے سے دور ہو جاتے ہیں اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ طبیعت شگفتہ رہے اور امراض خفقہ سے بچے رہیں۔ نیز وہ لوگ جن کو اپنے بُرے اعمال نے ٹھنڈا کر دیا ہو یا بڑھاپا سد راہ مقصود ہو تو اسکی چند خوراک کا تجربہ کریں شہادت میں وہ لوگ موجود ہیں جو کامیاب ہو چکے ہیں اس کے چند روزہ استعمال سے حمل نرینہ قرار پاتا ہے۔

قیمت فی بوتل شربت مقوی اعصاب چار روپے (للعہ)

طلائے نادر جب اله کار اپنی بیوقوفی سے بیکار بیٹھے ہوں تو اس کی آزمائش سے کمزوری لاغری وغیرہ دور ہو کر معمولی طاقت بحال ہو جاتی ہے قیمت فی تولہ چار روپے (للعہ)

سوزاک نو و قرحہ ۲۴ گھنٹہ میں تکلیف دہ علامات درد ریم جلن دور جسم میں طاقت اور سرور حاصل ہوتا ہے + شرطیہ دوائی ہے قیمت درجہ اول پانچ روپے (صہ) درجہ دوم (سے)

حب خوش کن قابل دید ہے نہ شنید۔ دیر آید درست آید + قیمت فی درجن گولی صرف ایک روپیہ (عہ)

حب دافع آتشک ان گولیوں کے استعمال سے بلا منہ آئے و دست مرض آتشک دور ہو کر عمر بھر کا خطرہ مٹ جاتا ہے قیمت صرف چار روپے (للعہ)

حب دافعہ جریان و احتلام ان گولیوں کے استعمال سے جریان و احتلام۔ کمزوری درد کمر۔ رقت سرعت وغیرہ کا فوراً اور نسیان کا قلع قمع ہو جاتا ہے دو ہفتہ کے لیے دوائی کی قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

پتہ: مینیجر شفاخانہ حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکماء

شاہی شدیافتہ موچی دروازہ لاہور

الناظر

نمبر ۷۳ جلد ۱۳ یکم جولائی سنہ ۱۹۱۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۲۳ جلد ۱۳ یکم جولائی ۱۹۱۵ء

انتظام و تعلیم

دُنیا عالَم اسباب ہے۔ جس وقت تک کہ اسباب فراہم نہ ہوں نتائج کے مترتّب ہونے کی اُمید کرنا خلاف اقتضاے دانش مندی ہے۔ اسباب کو بالترتیب جمع کرنے کا نام انتظام ہے۔ وجودِ عالَم محض منجملۂ انتظام ہے اور وجود انسان کی پیچیدہ مشینری کی کارگزاریاں اس اعلیٰ اصول پر مبنی اور اُسکی لاانتہا قدرت کی زندہ مثال ہیں۔ دنیاوی اور اُخروی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اصول انتظام و ترتیب سے اثر پذیر اور اُسکا تابع نہ ہو۔

جب افراد و اقوام کے عالم خیال اور اصول افعال کی ترتیب و رفع پراگندگی میں اس معزز اصول سے کام لیا جاتا ہے تو اُس کو دین و مذہب کے پاکیزہ نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور جب مُلکی و سیاسی گُتھیاں اس کے ذریعہ سے سُلجھائی جاتی ہیں اور آیندہ پیچیدگیوں کے خلاف تحفظ کی تدابیر کی جاتی ہیں اُس وقت اس کو مُلک داری اور مُلک گیری کے سے معزز نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب مُلک کی بہیمی قوت کی افزونی و ترتیب میں اس سے مدد لی جاتی ہے اُس وقت اس کو قواعدِ فوجی کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

اور جب بچوں اور نوجوانوں کے عادات وخیالات کی ترتیب وشائستگی مدنظر ہوتی ہے تو تسلیم کے سے تربیتی لفظ سے اس اصول کے وجود کا اظہار کرتے ہیں۔

ازل سے اب تک عقل انسانی محض اس اصول کو عملی صورت دینے میں کوشاں رہی ہے۔ تاریخ عالم روشن حروف میں ہم کو دکھلاتی ہے کہ سلف سے اب تک افراد واقوام کی ترقی یا تنزل کی اصل وجہ اس جامع اصول کی پابندی یا خلاف ورزی ہے مسبب الاسباب وقتاً فوقتاً ایک ہادی یا رہنما کو مبعوث کر دیتا ہے جس کا فرض اپنے ابنای جنس میں پراگندگی و بدنظمی کا رفع کرنا اور اُن کی خیالی وعلمی دُنیا کو مرتب کرنا ہوتا ہے۔ جب تک کہ قوم وملت اپنے رہنما کے قدم بقدم چلتی ہے، ترقی کا دروازہ مسدود نہیں ہوتا لیکن مرورِ ایام کسی شئی کو خواہ وہ مادی ہو یا خیالی، ایک حالت پر نہیں چھوڑتا۔ گرد و پیش کے حالات میں اس قدر تغیر واقع ہو جاتا ہے اور ہر بات کے اِرد گِرد نئے واقعات کا ایسا فریب دہ حاشیہ لگ جاتا ہے کہ اُس کے متعلق قطعی حکم لگانے میں سخت دِقت اور رایوں کے اختلاف کی گنجایش ہوتی ہے۔ چرخِ کج رفتار، یا یوں کہیے کہ زمانۂ ناہنجار کو تبدیلی واقع کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ اور اپنے مقصودِ اصلی کے واسطے قوم وملت میں نفاق پیدا کرکے راستہ تیار کرلیتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے فرقے پیدا ہو جاتے ہیں اور ہر فرقہ اپنی تکریم اور دوسرے کی تذلیل کا درپے ہو جاتا ہے۔ نسیان وقدامت پسندی جسکا دوسرا نام دماغی انحطاط اور کاہلی ہے ادراک کی آنکھوں پر پردہ ڈال کر اصول کے نظر انداز کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ذرائع مطلب کی اور اصول فروع کی جگہ لے لیتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ انتظام میں برہمی ہوتا ہے۔ وہی قوم کہ ابھی کچھ روز پہلے قابلِ پیروی سمجھی جاتی تھی فوراً نشانۂ تضحیک بن جاتی ہے۔ واقعاتِ تاریخی اپنے کو دُہرانے لگتے ہیں۔ ایران۔ یونان۔ اطالیہ۔ عرب ان واقعات کی مثالیں ہیں۔ اپنی اپنی ترقی کے وقت میں حزم و انتظام میں ان ممالک کے باشندے مشہور رہے ہیں۔ لیکن جوں ہی

کسی ایک قوم نے اس مقتدر اصول کو اپنی عیش پسندی و تن آسانی پر قربان کر دیا فوراً دوسری قوم نے اس ناقابلِ عفو جرم کی سزا میں اُسکے مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔ اُس کی آزادی کو اُس سے چھین لیا اور اُس کو پامال کر ڈالا۔

اگر ہندوستان کی موجودہ حالت پر لحاظ اِس اصول کے غور کیا جائے تو یقیناً بہت سبق آموز ہوگا۔ ہندوستانی قوم تین حصص پر منقسم ہے۔ ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی۔ ہندو اور مسلمان قریب قریب ہر حالت میں یکساں ہیں۔ اگر ان کی حالت پر مختصراً مشترکہ تبصرہ کیا جائے تو نادرست نہ ہوگا۔ ایک متوسط الحال ہندوستانی خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اپنے ہر قول و فعل سے اپنی بے ترتیبی و بے انتظامی کا بدیہی ثبوت دیتا ہے۔ اگر مکان پر ملاقات کے واسطے جایئے تو خدا نے چاہا تو ایسی حالت میں ملیں گے کہ اگر ملاقات و یک جہتی زیادہ نہ ہوئی تو پہچاننے میں بھی تکلف ہوگا۔ اغلب تو یہ ہے کہ کوئی ایسی جگہ مکان میں نہ ہوگی جہاں باطمینان بیٹھ کر ملاقات اور باتیں ہو سکیں اگر ہوئی بھی تو صرف چند قسم کی کثافتیں ایسی ہوں گی جو وہاں موجود ہوں اور باقی ہر چیز کی کمی ہوگی۔ اگر کہیں خدانخواستہ گھر کے اندر زنانے میں جانے کا اتفاق ہُوا تو الحفیظ والاماں۔ باہر کا غیر مقابلہ کیا ہُوا مصداق مُشتے نظر آئے گا۔ اگر ریلوے اسٹیشن کے مال گدام میں اس قدر بے ترتیبی نظر آئے تو بیچارے گوڈس انسپکٹر کی سخت لے دے ہو۔ بفضلہ ہر چیز ضروری و غیر ضروری ہر جگہ پڑی ملے گی۔ کاہلی و سُستی ہر مقام سے اپنی موجودگی کا اظہار بہ زبان حال کرتی نظر آئے گی۔ جن گھروں کی حالت میں کسی قدر انتظامی کیفیت نمودار ہے وہ محض مستثنیات سے ہیں اور عام قاعدے کو ثابت کرتے ہیں۔ جس طرح باہر کی بے ترتیبی سے مالکِ مکان کی طبیعت کی حالت ظاہر ہوتی ہے اُسی طرح اندر کی بدانتظامی مالکۂ مکان کی بدتمیزی و بدنظمی پر دلالت کرتی ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ اگر طبیعتوں میں اس طرح کی مناسبت نہ ہو تو مملکتِ خاندان میں سخت جھگڑا پڑے اور ہر ایک کو طرفین سے مصیبت کا سامنا ہو

ع- وزیرے چنیں شہر یارے چناں-

نشست وبرخاست، رہنے سہنے کا اثر عادات وخیالات پر پڑتا ہے- اور ہر ہوشمند آدمی دوسرے کے عادات وخیالات کا اندازہ اُس کی گفتگو اور نشست وبرخاست سے کرتا ہے- لڑکے جو ایسی بدنظمی وبے ترتیبی کی حالت میں پرورش پاتے ہیں اپنی طبیعت پر ایک ایسا مُضر اثر لے لیتے ہیں کہ تمام عمر کی جد وجہد سے بھی اُسے علٰحدہ نہیں کرسکتے بی اے- ایم اے- ایل ایل ڈی- ایل ایل ایم وغیرہ کی معزز ڈگریاں بھی اس اثر کو میٹ نہیں سکتیں اور کالج چھوڑنے کے تھوڑی ہی مدت کے بعد ہمارا گریجویٹ ڈاکٹر اپنی عاداتِ قدیمہ کی طرف رجعت کرتا ہے-

ہر محبّ وطن جسے اپنے وطن کی بہبودی وفلاح وترقی مدنظر ہے ضرور اس بات کا خواہاں ہوگا کہ قبل اس کے کہ کسی قسم کی ترقی کی امید کی جائے اخلاق وعاداتِ ابنائے وطن درست ہو جائیں- لہذا اس مقصود کو حاصل کرنے کے بہترین ذرائع اور اُن کی فراہمی کی احسن تدابیر پر غور کرنا لابدی ہُوا- اگر کوئی سوسائٹی یا کمیٹی اس قسم کی قائم کی جائے کہ جس کا مقصود بوڑھے طوطوں کو پڑھانا ہو تو ظاہر ہے کہ کس حد تک کامیابی کی اُمید ہوسکتی ہے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آیندہ اُمید قوم کی تعلیم وتربیت دماغی وجسمانی میں حتی الوسع کوشش کی جائے- فی زمانہ جو طریقہ ہمارے یہاں تعلیم کا جاری ہے اُس کو دو قسموں پر تقسیم کرسکتے ہیں- پُرانا طریقۂ تعلیم (عام اس سے کہ مکتب خانہ ہو یا بھیا جی کا پاٹ شالہ)- نیا طریقۂ تعلیم (جس میں آج کل کے اسکول وکالج جو بہ سرپرستی گورنمنٹ سارے مُلک میں کھُلے ہوے ہیں اور مشن اسکول وکالج بھی شامل ہیں) طریقۂ اوّل الذکر پر مبسوط بحث کرنے اور اُس کے نقائص کو ظاہر کرنے کی جسارت میں اندیشہ کفر کے فتوے لگ جانے کا ہے جس کے مطابق ہر دیندار مسلمان پر فرض ہو جائے گا کہ اس مضمون کو جہاں کہیں پائے بے پڑھے چاک کر ڈالے- علاوہ بریں ان چند سطور کا ہرگز یہ مقصود نہیں کہ

کہ کسی خاص امر پر بلا وجہ نکتہ چینی کی جائے۔ لیکن اتنا نہ کہنا خلاف دیانت ہو گا کہ گزشتہ زمانے نے چاہے کتنا ہی فائدہ اس طرز تعلیم سے حاصل کیا ہو موجودہ ضروریات کے لحاظ سے اس سے توقع ترقی و بہبودی رکھنا لا حاصل و بے سود ہے۔ اس طرز تعلیم کے منتہی عموماً بجید تنگ خیال کٹھ ملّا اور کٹھ پنڈت ہوتے ہیں۔ اصول سے علیحدہ الفاظ کی صحت پر جان دینے اور لکیر پیٹنے کو حاصلِ زندگی سمجھتے ہیں۔ عقل ان کے واسطے ایک عضو معطل ہوتی ہے اور ایمان قدما کی آراء کا اتباع عام اس سے کہ طبیعت اُسکو قبول کرے یا نہ کرے۔ اس موقع پر ایک واقعہ کا تذکرہ جو ہندوستان کے ایک بہت بڑے شہر میں حال میں پیش آیا خالی از لطف نہ ہوگا۔

اس شہر کے ٹاون ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد تھا جس میں باستثنائے معدودے چند، جنھوں نے غیر حاضری کی معذرت کے خطوط اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ جملہ اکابر ذی وجاہت (نہ صرف بلحاظ علم و عقل بلکہ نیز بلحاظ دولت و عزت) جمع تھے ایک لائق مقرر نے ایک رزولیوشن پیش کیا جس پر حسب ذیل بحث ہونے لگی۔

مقرر ...... جس رزولیوشن کے پیش کرنے کی عزت مجھے دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ "یہ عظیم الشان جلسہ جس میں کثیر التعداد اکابرین و باشندگان شہر... جمع ہیں باتفاق آرا اپنی گورنمنٹ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے اور یہ ادب مستدعی ہے ......

اس کے پیش ہوتے ہی ایک بہت بڑے ذی علم و ذی عزت مولانا نے جن کی علمی قابلیت کا اعتراف نہ کرنا مشاہدات سے انکار کرنا ہے، صدر انجمن صاحب سے کچھ تقریر کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اجازت فوراً دیدی گئی۔ موصوف یوں گہر فشاں ہوے۔

مولانا۔ "پریسیڈنٹ صاحب و حاضرین جلسہ۔ میں اس رزولیوشن کے الفاظ میں کسی قدر رد و بدل کی تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں ...... اس جلسہ میں جو تعداد باشندگان شہر کی جمع ہے اُس پر کثیر کے لفظ کا اطلاق نہایت نادرست ہے باشندگان شہر بہت زیادہ

ہیں اور جو حضرات یہاں جمع ہیں اُن کی تعداد مقابلۃً بہت کم ہے۔ علاوہ بریں اکابرین کا لفظ بھی مبہم ہے۔ لہذا ایسی صورت میں بجائے "کثیر التعداد" کے اگر "قلیل التعداد" درج کر دیا جاے تو بہت مناسب ہوگا اور اختلاف کی گنجایش باقی نہ رہے گی۔ ......

اس کے بعد بہت طویل تقریر قلیل و کثیر پر شروع ہوئی اور بیشتر اصول شرعی کا حوالہ دیا گیا۔ جس کو حاضرین نے بلا لحاظِ عقوبتِ اُخروی نہایت کراہت سے سُنا اور کثرتِ رائے سے ترمیم نامنظور کر دی۔

یہ واقعۂ مختصر مشتے نمونہ از خروارے ہے اور قریب قریب ہر واقعہ کے متعلق اِن حضرات کی ایسی ہی رائے ہوتی ہے۔ حال کے فتاوے جو دیوبند سے وقتاً فوقتاً "الرشاد" میں شایع ہوتے ہیں اُن کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ "آگ کا بیمہ" اور "زندگی کا بیمہ" قمار اور ربوا کی تعریف میں آتے ہیں لہذا ہر مسلمان پر اس قسم کے معاہدات میں شریک ہونا یا اُس سے فائدہ اُٹھانا حرام مطلق ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ان حضرات کا کوئی قصور نہیں۔ ان کی طبیعتیں، ان کے خیالات اوائل عمر سے جس سانچے میں ڈھالے گئے وہ ترمیم طلب ہیں۔ اور اصل تو یوں ہے کہ تعلیم کو اب تک بحیثیت مسئلۂ سائنس غور کرنے کی نوبت ہی ہمارے ہندوستان میں نہیں آئی۔

نیا طریقۂ تعلیم اس میں بھی طریقۂ مسبوق الذکر کی طرح سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ بہت ضروری حصۂ عمر کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یعنی خرد سال بچوں کی تربیت و تعلیم کے واسطے کچھ انتظام نہیں۔ ۶-یا ۷ سال کی عمر تک کھیل کود۔ جاہل ماں یا دایہ کی گود میں بچہ پرورش پاتا ہے اُس کے بعد اسکول سے اُس کی تعلیم میں مدد لی جاتی ہے لیکن مدت العمر کی تعلیم بھی اُن نقوش کو جو بچپنے میں اُس کے صفحۂ طبیعت پر بن گئے ہیں مٹانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ علاوہ بریں اسکول کے وقت کے بعد طالب علم پھر اپنے گھر آتا ہے اور نہایت ناپسندیدہ اور خراب صحبتوں میں اپنا قیمتی وقت صرف کرتا ہے۔ ممکن ہے

کہ سبق کے الفاظ اُس کو یاد رہیں لیکن تربیت کا حصہ باقی نہیں رہ سکتا اور یہی وجہ ہے کہ رہنے سہنے میں ہندوستانی تعلیم یافتہ میں انتظامی قابلیت بہت کم پائی جاتی ہے۔

پُرانے ہندوستان میں بھی اس امر کا پورا خیال کیا گیا تھا اور اسی وجہ سے زمانۂ تعلیم کو خانقاہ میں یا مُعلم یا گروؤں کے ساتھ رہ کر بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ گُرو محض وہی شخص ہو سکتا تھا جو بلحاظ چال چلن، عادات و اطوار کے قابلِ اتباع ہو۔ لیکن زمانہ کے بیرحم ہاتھ نے جملہ خوبیوں کو رفتہ رفتہ دھو ڈالا۔ یہاں تک کہ اب یہ خیال بھی نیا معلوم ہونے لگا اس کمی کو موجودہ گورنمنٹ اور اُس کے افسران سررشتۂ تعلیم محسوس کرنے لگے ہیں اور اسی وجہ سے بورڈنگ ہاؤس و ہاسٹل اسکول کا ضروری جزو سمجھا جانے لگا ہے۔

یہ طریقۂ تعلیم حال میں زیر بحث رہ چکا ہے، گورنمنٹ او نیز بڑے بڑے فضلائے ہند نے اس کے محاسن و قبائح پر مبسوط تقریریں کیں اور مضامین لکھے۔ جس سے ہر متنفس مستفید ہو سکتا ہے۔ اس موضوع پر کسی نئے نقطۂ خیال سے بحث کرنا قریب قریب غیر ممکن اور بحث شدہ مسائل کا اعادہ کرنا لاحاصل ہے۔

یہ مُسلم ہے کہ اس طرز تعلیم کے نقائص اب ہر جانب محسوس کیے جانے لگے ہیں۔ اور اُسکی ترمیم کی کوشش ہو رہی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے اُس حصے کو جس کی ابتداء اسکول میں ہوتی ہے کارکنان یونیورسٹی اور دیگر مؤیدانِ تعلیم پر چھوڑ دیا جائے۔ اور وہ حصہ جسپر کہ اب تک خادمان قوم کو موقع غور کرنے کا نہیں ملا۔ اُس پر مختصراً بحث کی جائے۔

اب تک نئی اور پُرانی تعلیم نے جس امر کو ہندوستان میں قریب قریب بالکل چھوڑ دیا ہے وہ خُردسال بچوں کی تعلیم ہے۔ باوجود اس کے کہ جملہ آئندہ تعلیم کی عمارت اسی نے پر بنائی جاتی ہے۔ اس کی خوبی و مضبوطی کی طرف بالکل توجہ نہیں کی جاتی۔ ہر شخص بلا لحاظ اپنی عادات و اطوار و علمی استعداد کے چھوٹے بچوں کو تعلیم دینے کے قابل سمجھا جاتا ہے

اگر تھوڑی دیر بھی ایسی تعلیم گاہ میں بٹھایا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ تعلیم نہیں ہوتی بلکہ معصوم بچوں پر ظلم کیا جاتا ہو اور ظلم بھی ایسا سخت کہ جس کا اثر مدت العمر انکی زندگی کے ہر پہلو پر پڑے گا۔ اور باوجود ہر قسم کی کوشش کے زائل نہ ہو سکے گا۔ - اس ظلم کا نام تعلیم رکھا گیا ہے اور والدین نہایت خوش و مطمئن ہیں کہ صاحب زادے صاحب تعلیم پا رہے ہیں اور وہ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ سچ ہے "نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے"۔

زندہ اقوامِ دُنیا یعنی اہل یورپ و امریکہ نے تعلیم کے اس حصے کی اہمیت کو محسوس کرکے اُس کے واسطے مناسب تدابیر بھی کی ہیں۔ صغیر سن بچوں اور اُن کی دماغی حالت کی تحقیقات کو علمِ ہیئت کا ایک حصہ قرار دیا ہے۔ اور وقت اور روپیہ بے دریغ اُن تجربات میں صرف کیا جا رہا ہے جن سے بچوں کے دماغ۔ طبائع۔ خیالات کے نمو کے مختلف مدارج وغیرہ وغیرہ کے متعلق عام اصول معلوم کر لیے جائیں۔ پروفیسر ارل بارنس نے بہ امداد کثیر التعداد قابل معلموں اور پروفیسروں کے جنھوں نے مختلف صورتوں اور حیثیتوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ عرصے تک رہ کر کچھ نتائج اخذ کیے ہیں جن پر کہ امریکہ و یورپ وغیرہ میں عمل کیا جا رہا ہے۔ اگر اس تحقیقات کے ایک یا دو واقعات اور اُن کے نتائج کا اس مضمون میں تمثیلاً تذکرہ کر دیا جائے تو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

منجملہ حواس خمسہ کے قوتِ بینائی کو جس قدر حصہ دماغ کی ترقی اور اُسکی قوت کی افزونی میں حاصل ہے اتنا کسی اور حواس کو نصیب نہیں۔ اُن محسوسات کا جن کا اثر آنکھ پر پڑتا ہے اُن میں سے علاوہ کتابت کے رنگ ہی ایک ایسی چیز ہے جو دماغ پر مختلف قسم کے اثر پیدا کرتا ہے اور جس میں حسب خواہش بہ آسانی تغیر و تبدیلی ہو سکتی ہے۔

ایک امریکن اسکول میں اس امر کا تجربہ کیا گیا کہ بچوں پر رنگ کا کیا اثر پڑتا ہے۔ عموماً چار سال تک کے بچوں میں کسی خاص قسم کی نفرت یا محبت کسی خاص رنگ سے نہیں پائی جاتی

لیکن اس عمر کے بعد اختلافات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

ایک درجے میں جس میں کہ بہت سے خرد سال بچے جمع تھے معلم نے آہستہ آہستہ تمام دیواروں پر سرخ پردے ڈال دیے اور سرخ کاغذ کھیلنے کو دے دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہی بچے جو نہایت اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے جوشیلے ہو گئے۔ اُن کی آنکھوں سے حرکات اور باتوں سے جوش کے آثار نمودار ہونے لگے۔ ظاہر ہو گیا کہ اُن کی نزد (یعنی شریان احساسی) پر بہت زیادہ اثر پڑا۔ آہستہ آہستہ بجائے سرخ کے سبز پردے ڈال دیے گئے اور اُسی رنگ کا کاغذ کھیلنے کے واسطے دے دیا گیا۔ رفتہ رفتہ جوش کے آثار خود بخود فرو ہو گئے۔ اور بچے حسب سابق کھیل میں مشغول ہو گئے۔ اسی طرح بچوں کو مختلف رنگوں کے کارڈ دیے گئے اور ہدایت کی گئی کہ ہر ایک کو بتدریج اُن کے اختلافات سایہ کے مطابق ترتیب دے دیں اس تجربہ نے ظاہر کر دیا کہ وہ بچے جن کی پرورش منتظم گھرانوں میں ہوئی اور جن کے والدین تعلیم یافتہ ہیں وہ بہت آسانی سے ہر رنگ کے مختلف سایہ کو اپنی جگہ پر ترتیب دے سکتے ہیں برخلاف اُن بچوں کے جن کی نشو ونما اس سے مختلف حالات میں ہوئی ہے۔

اس میں بھی اختلاف کی بہت کم گنجائش ہے کہ منتظمان قضا و قدر نے خورد سال بچوں کے نمو و پرورش کے واسطے خاص قابلیتیں جنس اُناث ہی کو عطا فرمائی ہیں جس سے کہ جنس غیر بے بہرہ ہے۔ چنانچہ اہل یوروپ و امریکہ نے اس قانونِ قدرت سے حسب دلخواہ فائدہ اُٹھایا۔

ایک جاہل عورت سے اس امر کی اُمید کرنا کہ وہ بچے کی پرورش میں اُسکی دماغی قوتوں کے نمو کا پورا لحاظ رکھے گی یا بہ احسن طریق پرورش میں بھی کامیاب ہوگی لا حاصل ہے۔ ہمارا وطن ہی اس واقعہ کی زندہ مثال ہے۔

بہت بڑی تعداد بچوں کی محض اوہام پرستی میں ضائع ہوتی ہے اور بیشتر مرضوں کا علاج بذریعۂ جھاڑ پھونک ہوتا رہتا ہے جب تک مرض آخری درجے پر نہ پہنچ جائے۔

ترقی راں اقوام دنیا نے تعلیم نسواں کو اس اعلیٰ پیمانے پر رائج کیا ہے کہ ان نقائص کا قریب قریب انسداد ہو گیا ہے اسی سلسلہ میں لاتعداد اُستانیاں تیار کرتی ہیں جو قوم کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہیں۔ امریکہ میں ضرب المثل ہے کہ چھوٹے بچوں کی تعلیم کا اجارہ عورتوں نے لے لیا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں جہاں کہ تعلیم نسواں کے لیے معمولی قابلیت کی اُستانیاں نہیں ملتیں چھوٹے بچوں کی تعلیم کے واسطے ایسی خواتین کی امید کرنا جو تازہ ترین قاعدے کے مطابق تعلیم و پرورش کر سکیں ناممکن الوقوع بلند پروازی ہوگی۔ یہ بھی غنیمت ہوگا کہ چند محب وطن اس طرف توجہ فرما کر ایسے معلم فراہم کرنے کی کوشش کریں جو کہ حال کے طریقۂ تعلیم سے پورے واقف ہوں۔

مشاہدات و تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ چھوٹے بچوں کی تعلیم کا دارومدار معلم کی عقلی و عملی قابلیت پر بدرجۂ اتم منحصر ہے۔

تعلیم کا فی زمانہ نصب العین قرار دیا گیا ہے کہ قوتِ دماغی و جسمانی کے ہر حصے کو پورا موقع ترقی کا دیا جائے۔ اور کسی ایک جزو پر غیر معمولی توجہ کی وجہ سے دوسرے جزو پر ایسا دباؤ نہ پڑے جس سے اُس کے ماؤف ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

انسان دُنیا میں دو چیزیں لیکر آتا ہے (۱) جسم۔ (۲) دماغ یا تخیلات ان ہر دو حصص کے متعدد و مختلف اجزا و اعضا ہیں۔ جنکا انتظام قدرت نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے۔ اس انتظام کو قائم رکھنا اور کسی جزو کو معطل نہ رہنے دینا معلم کا فرض ہے ان دونوں حصوں میں نمو کی طرف قدرتی رُجحان پایا جاتا ہے اور اگر مناسب غذا مناسب اوقات پر ملتی گئی تو خود بخود بڑھنے پونڈنے، پھولنے پھلنے لگتے ہیں۔ حالاتِ حوالی و گردو پیش کا اُن پر بالکل ایسا ہی اثر پڑتا ہے جیسا کہ موافق یا ناموافق ہوا کا ننھے سے پودے پر۔ لیکن ان حالات کا اثر جسم پر بہ نسبت دماغ کے بہت کم پڑتا ہے۔ لاتعداد تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ بچے جنھوں نے بھیڑیے کے بھٹ میں پرورش پائی ہے بیشتر حصہ

انسانیت کا کھو بیٹھتے ہیں۔ جس طرح وہ کھڑے ہو کر چلنے سے معذور ہوتے ہیں، اُسی طرح بشرے کی وحشت سے دماغی اختلال کی کیفیت ظاہر کرتے ہیں۔

بچّے جو سات سال کی عمر میں بھٹ سے نکالے گئے مدت العمر کی کوشش کے بعد بھی انسانی جامہ نہ پہن سکے۔ جسمانی حالت میں بہ نسبت دماغی کیفیت کے اصلاح زیادہ نمایاں ہوئی۔ مثلاً۔ کھڑے ہو کر چلنا سکھلایا گیا۔ لیکن چال میں ایک خاص قسم کی لڑکھڑاہٹ قائم رہی۔ اور وہ کسی طرح دُور نہ ہو سکی۔ کھانے میں بھی تھوڑے ہی عرصے کے بعد پکائی ہوئی غذا سے بہ نسبت کچّی غذا کے زیادہ فائدہ محسوس ہونے لگا۔ وعلیٰ ہذا۔ لیکن دماغی حالت کی بہت کم اصلاح ہوئی۔ اگرچہ سات سال کی عمر کا بچّہ دوسری زبان سیکھ سکتا ہے لیکن اس بچّے کو تمام عمر نطق سے محروم رہنا پڑا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر قوتِ ناطقہ کو ایک خاص مقررہ وقت میں وہ غذا نہ پہنچ سکی جو اُسکے واسطے مخصوص ہے تو وہ ہمیشہ کے واسطے زائل ہو جاتی ہے۔ یہ غذا حالاتِ حوالی میں پائی جاتی ہے اور قوتِ نمو اس کو جذب کر لیتی ہے۔ بالکل یہی کیفیت دوسرے قواے دماغی کی بھی ظاہر ہوئی یعنی اس بھیڑیے کے لے پالک کو باوجود کوشش بلیغ کے تمام عمر مساوات دماغی حاصل نہ ہو سکا۔

اپنی بہترین حالت میں وہ کبھی ایک جنگلی جانور سے جو پالا گیا ہو اچھا نہ ہو سکا اسیطرح یہ ایک نہایت معمولی واقعہ ہے جو اُستادوں اور معلموں کو آئے دن پیش آتا ہے کہ بچہ جو کچھ روز پہلے بہت تیز و شگفتہ تھا یکایک رگی بہت سُست اور غبی ہو جاتا ہے۔

ہندوستانی معلم اول تو اس کیفیت کو سمجھتے ہی نہیں اور اگر محسوس کرتے ہیں تو بس یہی کہ "بدشوق ہو گیا ہے۔ دل نہیں لگاتا۔ تنبیہ و تہدید مانگتا ہے۔ اچھے کپڑے نہ پہنانا چاہیے۔ جیب خرچ نہ دینا چاہیے" وغیرہ۔ اور اسی طرح اسکی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ امر کس قدر قابل تاسف ہے کہ بیشتر طالب علم محض اُستاد و معلم کی جہالت کی وجہ سے پھر اپنی اصلی ذہانت و شگفتگی حاصل نہیں کر سکتے۔ بلکہ مدت العمر کے لیے کُند ذہن، غبی،

یہ شوق وقتی طور پر ہو جاتے ہیں۔

در اصل ایک زمانہ بچپن میں ایسا بھی آتا ہے کہ جسمانی نمو کے زور کی وجہ سے دماغی و روحانی قوتیں برائے چندے کسی قدر دب جاتی ہیں اور اُن کی حکومت کمزور ہو جاتی ہے تھوڑی ہی مدت کے بعد یہ کیفیت جاتی رہتی ہے اور قوائے لطیف کا پھر دَور دورہ ہو جاتا ہے لیکن اگر اُستاد کی سختی نے بچے کا دل توڑ دیا تو اُس کی آئندہ زندگی پر مہر لگ جاتی ہے اور وہ نہایت کُند، سُست مزاج، کمزور طبیعت آدمی بنتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں قطعی اس کا احساس تک نہیں ہے۔

مشاہدات مندرجۂ بالا اور دوسرے تجربوں نے اس امر کو ثابت کر دیا ہے کہ بچوں کے دماغی نمو کا تحفظ قوم کا اہم ترین کام اور بچے کی دماغی کیفیات کی نگہداشت معلم کا پہلا فرض ہے اور جو معلم اس کا احساس نہ کر سکے وہ تعلیم کے سے مشکل کام کے واسطے موزوں نہیں۔

ظاہر ہے کہ بچے میں دماغی و خیالی قوت کا سب سے پہلا اظہار گرد و پیش کی چیزوں کا احساس ہے۔ ہاتھ پیر پھیلنے سے جسمانی قوت کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ شروع شروع میں ایک مدت تک احساسات مجمل اور گڈمڈ رہتے ہیں اُسکے بعد قوتِ مدرکہ زور پکڑنے لگتی ہے اور اُسکی مدد سے احساسات میں تفریق شروع ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ جملہ قوائے دماغی و جسمانی اپنے اپنے افعال پر قادر اور اپنے دائرۂ امکان کے حاکم بسر کر دگی عقل و ادراک ہو جاتے ہیں۔ لیکن جسمانی قویٰ کا نمو بہ نسبت دماغی قوائے کے بہت جلد ہوتا ہے۔ قبل اسکے کہ بچے ہر امر دقت کو سمجھ سکیں، کھیلنے کودنے دوڑنے دھوپنے لگتے ہیں۔

حکمائے یورپ نے پورے طور سے سمجھ لیا کہ عقل کی افزونی تجربات سے ہوتی ہے۔ اور تجربات کا حاصل کرنا اُس شخص کے لیے جو چلتا پھرتا ہو بہ نسبت اُسکے جو اس سے قاصر ہو بہت آسان ہے۔ اس لحاظ سے قانون قدرت نے قوائے جسمانی کی بالیدگی کو دماغی ترقی

سے پیشتر رکھا ہے۔ اور اول الذکر کو آخر الذکر کا ذریعہ قرار دیا ہے

فرڈرک فربل نے اسی راستہ پر چل کر ایسا طریقۂ تعلیم ایجاد کیا جس کو تمام دنیا نے قابل اتباع مان لیا۔ اس علامۂ روزگار نے ایک کورس یا نصاب کھیلوں کا مرتب کیا۔ یہ کھیل نہایت سادے اور دلچسپ ہیں۔ ان کی خوبی و ترتیب اپنے موجد کی عقل و فراست کا پتہ دیتی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے بچے کو ۲ گیند مختلف رنگ (یعنی نیلے۔ زرد۔ سرخ) کے دیے جاتے ہیں۔ گیندسے ہر بچہ خوش ہوتا ہے اُن کا اثر اُس پر کتاب کے اثر سے بالکل مختلف پڑتا ہے۔ معلم بچہ کے ساتھ گیند خود کھیلتے ہیں اور اس طرح اُسکو گیند کے رنگ۔ شکل اور حرکت سے پوری طور سے واقف کر دیتے ہیں۔

تیسرے درجے کے کورس میں بچے کو مسدس اور بیلن وغیرہ دیے جاتے ہیں لیکن ان کی ساخت اس قسم کی ہوتی ہے کہ وہ مختلف حصوں میں علیحدہ کیے جاسکتے ہیں۔ اس ساخت میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ تین برس کی عمر کے بچے میں عموماً چیز کی ماہیت جاننے اور اُسکو مختلف اجزا میں علیحدہ کرنے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اپنے کھلونے کے اجزا کو علیحدہ کرنے اور پھر اُن کو جوڑنے میں عام اس سے کہ بچہ اپنے قدرتی رجحان کے موافق کام کرتا ہے اُسکو اقلیدس کے سادے اصول خود بخود مستحضر ہو جاتے ہیں چونکہ ان سطور میں (۱) پسٹلوزین Pestalozian (۲) لنکاسٹرین Lancastrian (۳) فربلین Froebelean یا (۴) مانٹیسوری Montessori طرق تعلیم پر کسی مبسوط پیمانے پر بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ محض اتنی ہی مراد ہے کہ برادران وطن اُس نقطۂ نظر سے جس سے کہ دیگر اقوامِ دنیا اس حصہ تعلیم کو دیکھتے ہیں واقف ہو جائیں اُسکی تفصیل معلوم کرنے کی کوشش اور اُسکے رائج کرنے کی تدابیر کریں لہذا ہم فربل یا مانٹیسوری کے نصاب تعلیم کی تشریح کو قلم انداز کرتے ہوئے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ اس موضوع کو زیادہ مشرح صورت میں ناظرین کے سامنے پیش کرنے کا انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ موقع ملے گا۔

اس نصاب نے اُن جملہ نقائص کے جو مروجہ طریقۂ تعلیم میں اُس وقت تھے اور ہندوستان میں اب تک قائم ہیں انسداد کی کوشش کی ہے۔

شروع کے تین چار سال جو اُن ممالک میں ان ایجادوں کے قبل تک اور ہمارے یہاں اب تک بچوں کے خراب ہونے کے لیے مخصوص کردیے گئے ہیں نہایت خوبی کے ساتھ عادات و اطوار سنبھالنے میں صرف ہوتے ہیں۔ اور اسکول میں داخل ہونے پر اسکی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ کافی وقت اُنکی وحشت، بے توجہی، بدشوقی، بے خیالی کے رفع کرنے میں صرف کیا جائے۔ اور اُس کے بعد تعلیم کا اصلی کام شروع ہو۔ آیا باوجود اس وقت و کوشش کے صرف کرنے کے کامیابی ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ اور اگر ہوتی ہے تو کس حد تک۔ ان سوالوں کے جوابات ہم ہر شخص کے تجربے و مشاہدے پر چھوڑتے ہیں۔

علاوہ بریں چھوٹے چھوٹے بچوں کی تعلیم کو مجردات محض AHSHACTSIDIA سے شروع کرنا ہی صریحًا نانص ہے۔ وہ بچے جن کے دماغ، گردوپیش کی اشیا کے سمجھنے کے نا قابل ہیں اُن سے امید کی جاتی ہے کہ خیالات کی باریک تفریق کو سمجھیں اور یاد کرلیں حروف تہجی کا ہرگز ایسا مفہوم نہیں کہ دنیا میں کوئی بچہ بھی نہایت خوشی کے ساتھ اپنے دل و دماغ پر اُسکے سمجھنے اور یاد کرنے میں زور دے۔ یہ بات دوسری ہے کہ تنبیہ کے ڈر اور سدیوں کی تعلیم کے اثر سے جس نے کہ دماغ کو اس طریقۂ تعلیم کا عادی بنا دیا ہے اُس قدر دقت جتنی کہ واقع ہونا چاہیے تھی، نہ پڑے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس طریقے سے دماغ پر زیادہ دباؤ اور بہت خراب اثر پڑتا ہے۔ بچہ تخیلات کا عادی اور عملی دنیا سے علحدہ ہوتا ہے اور سن شعور کو پہنچنے پر یہ عادت قائم رہتی ہے۔ وہ منصوبے اور خیالات جو ایک ہندوستانی نوخیز اپنے دل میں عمومًا باندھتا ہے اگر کاغذ کے سپرد کردیے جائیں تو طلسم ہوش رُبا کی سی ایک ضخیم کتاب کا مرتب ہوجانا تعجب کی بات نہ ہوگا۔ لیکن اگر اسکی جانچ کی جائے کہ ان میں سے کتنے خیالوں نے عملی صورت اختیار کی تو مشکل سے

چند ایسے نکلیں گے کہ جن کو عملی پوشاک پہنانے کی کوشش کی گئی ہو۔

اُن تجاویز، تصورات و افکار کا تذکرہ جو کہ ہمارے ہندوستانی بھائی مسٹر کا اپنے مُلک قوم یا ذات کی بہبودی کے واسطے کرتے ہیں اور جو محض عملی قابلیت نہ ہونے کی وجہ سے بالآخر چھوڑ دیے جاتے ہیں، فضول ہے۔ اس وجہ سے کہ اُن سے ہر شخص واقف ہے۔

فربیل اور مانٹساری کے طریقہ جات متذکرۂ بالا میں اسکا لحاظ رکھا گیا ہے کہ خیالی اور عملی حصہ ہائے دماغ کی پوری پوری اور برابر ترقی ہو۔ اس انتظام کا نتیجہ ہے کہ ایک یورپین تعلیم یافتہ بہ نسبت ایک ہندوستانی کے عموماً زیادہ صحیح دماغ رکھتا ہے اور ہر مسئلہ کو سوچنے اور اُس پر عمل کرنے پر زیادہ قادر ہوتا ہے۔ یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ بلحاظ کتابی قابلیت کے ایک ہندوستانی گریجویٹ۔ انگریز گریجویٹ سے ہوشیار ہوتا ہے۔ لیکن کالج چھوڑنے کے چند روز کے بعد فرق ظاہر ہونے لگتا ہے۔

جوں جوں عملی دنیا کی پیچیدہ گتھیاں اُسے سلجھانا پڑتی ہیں آخرالذکر کی صحت دماغ اور صحت خیال میں روز افزوں ترقی ہوتی ہے۔

لیکن اول الذکر کی حالت روز بروز دگرگوں ہوتی ہے۔ روزمرہ کے تجربات اس امر کو ثابت کر دیتے ہیں کہ تعلیم و تربیت نے اُن کے دماغ کو اتنا صحیح و مضبوط نہیں بنایا کہ وہ حادثات و سوانحاتِ دنیا کے جنبش دہ جھٹکے کو بہ اطمینان برداشت کر سکے۔

اہل یورپ نے بھی اس حصہ تعلیم کی اہمیت کا پورا احساس گزشتہ صدی یعنے قریب قریب سنہ ۱۸۴۰ء یا سنہ ۱۸۵۰ء سے کیا ہے۔ لیکن چونکہ جوانی کا خون ابھی اُنکی قوم کے جسم کی رگوں میں سرعت کے ساتھ دوڑ رہا ہے انھوں نے فوراً اپنے خیالات و تدابیر کو عملی صورت دے کر فائدہ اُٹھانا شروع کیا۔

سنہ ۱۸۵۰ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک جو حیرت انگیز ترقی جرمنی نے تجارت وغیرہ میں کی ہے وہ محض اسی طریقہ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ انگلستان۔ فرانس اور امریکہ بھی اپنی ترقی کا بیشتر حصہ اسی طریقۂ تعلیم پر محمول کرتے ہیں۔

سب سے مشکل سوال ہمارے ملک کے متعلق یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسکا نفاذ یہاں کیونکر کیا جا سکتا ہے جہاں کہ تعلیم نسواں ابھی ترقی کے پہلے زینہ پر بھی نہیں آئی اور جہاں اس قسم کے معلموں کا وجود نہیں ہے جو اس نئے طریقۂ تعلیم کو سمجھ سکیں۔ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں ان نقائص کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کیجائے اور جا بجا اسکول معلموں کی تعلیم کے واسطے قائم کیے جائیں کیا عجب ہے کہ ضرورت کے وجود کے احساس کے بعد۔ حسب قانون قدرت معلم بھی پیدا ہونے لگیں۔ اصل تو یہ ہے کہ بچے کے واسطے بہترین کنڈرگارٹن[1] (باغ طفلاں) اُسکا گھر اور افضل ترین معلمہ اُسکی ماں ہے۔ لیکن ہمارے مُلک میں ماں ایک دوسری ہی چیز ہے۔ خدا ہماری حالت پر رحم کرے۔

ہر اس شخص پر جسکو کہ پروردگار عالم نے بچے کی پرورش کا اہم ترین فرض سپرد کیا ہے لازم اور واجب ہے کہ اپنے فرائض کی ماہیت کو قرار واقعی سمجھے اور اُسکے ادا کرنے کی کوشش باحسن وجوہ کرے۔ کیونکہ ایک دن وہ بھی آنیوالا ہے جبکہ ہر شخص اپنی اپنی ذمہ داریوں کا حساب دینے پر مجبور کیا جائے گا۔ ہر رُوح اپنی خامی ضلالت و گمراہی کے اصلی سبب کو ایسے حاکم حقیقی کے روبرو پیش کریگی جسکا نہفتہ شہادت کا محتاج نہیں وہ حضرات جو اُس دن کے آنیکے قائل نہیں ہیں اُنکو یاد رکھنا چاہیے کہ اُنکا ہر خیال و قول و فعل آیندہ نسلوں کیلیے نتیجہ خیز ہے چہ جائیکہ وہ افعال جنپر قوم کے بننے بگڑنے کا انحصار ہو اگر وہ اس فرض کی انجام دہی میں تساہل و سستی سے کام لینگے تو آیندہ نسلیں اُنکے نام کے گرد سیاہ ہالہ کھینچینگی جو ابدالاباد تک اُنکے نام کو بدی کیساتھ ختم رکھے گا۔ عیسائی بھائیوں کی تعلیم کے متعلق کسی بحث کی ضرورت نہیں اُنکی تعلیم نہایت روشن خیال پادریوں کے ہاتھ میں ہے جو اپنے فرائض کو پورے طور سے سمجھتے اور اپنی عزیز زندگی کو اُسپر قربان کیے ہوئے ہیں۔

اس موقع پر یہ بیان کرنا بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان میں جس شخص نے سب سے پہلے ہندوستانی بچوں کو مانی ٹوریل[2] طریقۂ تعلیم پر پرورش کرنا چاہا وہ ایک مدراس کا صحیح الدماغ پادری ڈاکٹر بل تھا۔ جس نے سب سے پہلے ۱۷۹۵ء میں مدراس کے ایک یتیم خانہ میں اس طریقۂ تعلیم کو رائج کیا۔ جسکے نتائج و تفصیل یہاں غیر متعلق ہونگے۔ فقط

محمد عبدالحق

---

[1] (Kindergarten) نام ہے جو فریڈرک فربیل نے اپنے اسکولوں کو دیا تھا۔ —

[2] Monitorial System اس طریقۂ تعلیم میں بچے اپنے ہم سبق لڑکوں کو پڑھاتے ہیں

لڑکیوں کی انشا

مذکورۂ بالا نام سے کچھ خطوط سید عبد الراشد الخیری صاحب ایڈیٹر رسالۂ عصمت و تمدن نے عرصہ ہوا شایع کیے تھے۔ جو ہماری عزیز بہن بیگم صاحبہ مسٹر مقدر علی بی اے اکزیکٹیو انجنیر کو جو ایک نہایت ہی روشن خیال اور بامذاق خاتون ہیں ناپسند ہوے اور اسی ناپسندیدگی کو ظاہر کرنے کے لیے اُنھوں نے اس مجموعہ پر ایک ریویو تحریر فرمایا جو الناظر بابت ماہ نومبر ۱۹۱۲ء میں شایع ہوچکا ہے۔ اس کے بعد اُنھوں نے خود اس جانب توجہ کی اور خطوط ترتیب دینا شروع کیے۔ اور جب اچھا خاصہ سواد فراہم ہوگیا تو چند خطوط ہمیں اور اسی طرح ایڈیٹر صاحب ظل السلطان و خاتون کو بہ غرض استصواب راے بھیجے۔ لیکن بوجہ اس کے کہ بسا اوقات ذاتی تعلقات انسانی راے کو متأثر کردیتے ہیں بجاے اسکے کہ ہم اپنی طرف سے کوئی نوٹ لکھکر یہ خطوط ناظرین الناظر کی خدمت میں پیش کرتے، مناسب معلوم ہوا کہ کسی دوسرے صاحبِ نظر کی راے کے ساتھ انھیں شایع کریں۔ خوش قسمتی کہیے یا حُسن اتفاق کہ ہماری نظر انتخاب ایسے لائق اور ذوق سلیم رکھنے والے دوست پر پڑی جنھیں گہرے تعلقاتِ دیرینہ اور مراسم کی بناپر چاہیے تو اس سے بہت پہلے الناظر کے اوراق کی زینت افزائی کرنا تھا مگر خاص اسباب کی بنا پر ہم اب تک اُن کی قلمی امداد سے محرومِ رہے۔ سید محفوظ علی صاحب بی اے (علیگ) جنھوں نے ان خطوط پر تبصرہ لکھا ہے اُن باکمال اصحاب میں ہیں جو اپنی قابلیت کو ہمیشہ چُھپانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اور اگر اسے تسلیم کرنے میں وہ کچھ عذر فرمائیں تو اس کو ماننے کے لیے شاید وہ بھی تیار ہوں گے کہ اپنی اعلیٰ قابلیتوں سے مُلکی و قومی جرائد کی زینت افزائی فرمانے میں وہ ہمیشہ کوتاہی کرتے رہے ہیں۔ اس سے پہلے دکن ریویو۔ پنجاب ریویو۔ اور اولڈ بواے میں اُنکے بے نظیر مضامین کبھی کبھی شایع ہوے ہیں۔ اگرچہ بیشتر حصہ اُن کی تحریروں کا فرضی ناموں ہی کے تحت میں چھپتا رہتا ہے۔ اُن کی تحریر میں ایک خاص قسم کی شگفتگی اور طبیعت میں ایک

عجیب طرح کی اُپج ہے جو اُن کی ذات سے مخصوص اور اُنھیں تک محدود ہے۔ اور خطوط نویسی میں تو اُنھیں وہ کمال حاصل ہے کہ اس صنف میں ہمارے نزدیک مرزا غالب کے بعد اُنھیں کا درجہ ہے۔ راقم سطور کے پاس میر صاحب کے کثیر التعداد خطوط تھے جو اگر بدبختی سے ضائع نہ ہو جاتے تو اردو علم ادب کے لیے مایۂ ناز ثابت ہوتے۔ اب بھی کچھ جواہر ریزے ہمارے قبضہ میں ہیں جو انشاء اللہ کسی وقت شایع ہو کر اُردو داں اصحاب سے خراجِ تحسین وصول کرینگے۔ ہمارے حبیبِ صادق نے اب وعدہ فرمایا ہے کہ آیندہ وہ الناظر کے حقوق کو نظرانداز نہ فرمائیں گے اور اگرچہ وہ اسکے لیے کبھی راضی نہیں کیے جا سکتے کہ اُنکے تمام مضامین کے ساتھ اُن کا نام نامی ظاہر کیا جائے تاہم اُن مضامین کی مہک ایسی ہوتی ہے کہ سخن شناس ناظرین سے یقیناً اُن کی شخصیت کبھی پوشیدہ نہ رہ سکے گی۔

اب پہلے ہم اُن کا تبصرہ درج کرتے ہیں اور اُسکے بعد بیگم صفدر علی صاحب کے اصلی خطوط اور اُس اعتراف حقیقی اور مخلصانہ خیر مقدم کے بعد جو ہمارے بالغ نظر اور دقیقہ سنج دوست کی طرف ان خطوط کا کیا گیا ہے غالباً یہ توقع قبل از وقت اور نامناسب نہیں کہ تمام خطوط کو بصورتِ کتاب مرتب کر کے جلد شایع کیا جائیگا تاکہ ہماری قوم کی لڑکیوں کی خطوط نویسی جیسے ضروری کام میں پوری رہنمائی ہو سکے۔

ایڈیٹر

سید محفوظ علی صاحب کا تبصرہ

جس مُلک یا حصۂ ملک میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ وہاں کے مَردوں اور عورتوں دونوں کی مشترکہ زبان ہوتی ہے۔ لاریب۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اسی مشترکہ زبان میں طرز ادا کے اعتبار سے دونوں جنسوں کی خصوصیات بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوتی ہیں۔ بعض زبانوں میں ضمائر کے سوا مَردوں اور عورتوں کے اظہارِ خیال کے عام پیرائے میں کوئی بیّن تغیر نظر نہیں آتا مگر ان میں بھی دونوں جنسوں نے خاص خاص الفاظ۔ خاص خاص محاورے اور خاص خاص ترکیبیں اپنے لیے مخصوص کرلی ہیں۔

جب ان زبانوں تک میں جن میں تذکیر و تانیث کا چنداں لحاظ نہیں جنسی خصوصیات موجود و مقرر ہیں تو ہماری اُردوے معلّٰی کا کیا کہنا اور کیا پوچھنا جس میں خیر سے اسماء میں جنسی فرق۔ صفات میں جنسی فرق۔ افعال میں جنسی فرق۔ متعلقات افعال میں جنسی فرق اورمحاورات میں جنسی فرق ہے۔ ان فرقوں کے متعلق ذرا سی بے توجہی کرنے سے نحو غلط انشا غلط املا غلط ہو جاتا ہے۔"

ایک سادہ سا نصف درجن لفظوں کا فقرہ ہے۔" اصغر اچھا خاصا سیانا ہو گیا ہو گا" لیکن جب یہی فقرہ اصغر کی سگی بہن اصغری کے لیے بولا جائے تو یوں بدل جائے گا۔" اصغری اچھی خاصی سیانی ہو گئی ہو گی"۔ اب چاہے بھائی بہن شکل صورت میں عین مین ایک ہی سے ہوں لیکن ان کے لیے جو دو چھوٹے چھوٹے فقرے بولے گئے ہیں اُن کے ہر ہر لفظ میں فرق ہے

اُردو میں جنسی خصوصیات کی افراط اسکی مقتضی تھی کہ جس طرح مردوں اور عورتوں کی بول چال میں فرق ہے اسی طرح اُنکی لکھ پڑھ میں بھی فرق ہو سردار ارسلاں خاں پوپل زئی، اگرچہ ولایتی پٹھان اور کابلی سردار ہیں مگر عرصہ سے دلی میں رہنے سہنے سے ایسی ہی صاف اور صحیح اردو بے تکلف بولتے ہیں جیسی دِلی کا کوئی پشتینی پُرانا رئیس۔ وہ عموماً تذکیر و تانیث کی غلطی نہیں کرتے اور بخلاف دوسرے غیر مُلکیوں کے "گھوڑی دانہ کھا چکی"۔ اور گھوڑا دانہ کھا چکا"۔ کو اپنے اپنے صحیح موقعوں پر بولتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنی بی بی یا لڑکی یا کسی اور مؤنث ذی رُوح یا غیر ذی رُوح کا قول نقل کرتے ہیں تو ہمیشہ اُردو کے اہم ترین قاعدے کی گردن مروڑ ڈالتے ہیں:۔

قاتم کہتی ہیں خاتوں سٹور سے برقع منگا دیجیے آج خدام کعبہ کے جلسے میں جاؤں گا"

گھوڑی کہتی ہے ریل سے پہلے پہنچا دوں گا۔ آپ گھبراتے کیوں ہیں۔

ہوا کہتی ہے میں آج نہیں تھمونگا۔

ایسے موقعوں پر جس منطق سے وہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرتے ہیں اُس کا ملخص یہ ہے؛

"ہم مرد اور پٹھان ہیں اس لیے ہم سے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اپنے مردانہ اور افغانانہ تشخص کا تعقل کرتے ہوئے ضمیر متکلم کو چاہے بارز ہو یا مستتر کسی صیغۂ تانیث کے ساتھ استعمال کریں۔ مانا کہ وہ ضمیر متکلم کسی عورت کے قول کی نقل ہے - ہُوا کرے - ضمیر متکلم تو ہے - اور ضمیر متکلم اپنے لیے بولتے ہیں - اور ہم بفضل خدا مرد ہیں لہذا ہم صیغۂ تانیث کیوں بولنے لگے تھے"

سردار صاحب ٹھوس اور سپاٹ پٹھان ہیں اس لیے جو دل میں تھا اُس پر عمل بھی کیا اور وقت پر صاف کہہ بھی دیا۔ لیکن سچ پوچھو تو دِل میں ہم سب مَردوں کو لفظ مَیں کے ساتھ آؤں گی۔ جاؤں گی۔ بولنا ایسا ہی گراں بلکہ ہلکا معلوم ہوتا ہے جیسے گُلڑُوں کُوں بولنا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم دِل کا حال ظاہر نہ کریں۔

جب مردوں کے دِل کی یہ کیفیت ہے تو کیا اُن لڑکیوں کے دِل میں بھی ایسا ہی خیال نہ آتا ہوگا جو لڑکوں کے پڑھنے کی کتابیں یاد کرتی ہوں گی؟ - اصل میں یہی خیال اس امر کا داعی و محرّک ہوا کہ لڑکیوں کے پڑھنے کی کتابیں علٰحدہ تیار کی جائیں اور یہی خیال اُردو کے سرمائے میں روز بہ روز اُس خزانے کا اضافہ کر رہا ہے جسے زنانہ لٹریچر کہتے ہیں۔ اس کی فراہمی میں سب سے زیادہ حصہ پہلے مَردوں ہی نے لیا ہے۔ شکر ہے کہ اب عورتیں بھی شریک ہوتی جاتی ہیں۔

مَرد ہو کر عورتوں کی بولی بولنے والے پہلے سعادت یار خاں[۵۱] اور اُن کے بعد میر یار علی[۵۲] تھے۔ مگر افسوس کہ دونوں نے یہ رُوپ اس بُری طرح بھرا کہ اس سلسلے میں اُن کا نام لینے کو جی نہیں چاہتا۔ زنانہ لٹریچر کی شاندار عمارت کا سنگِ بنیاد اُسی وقت رکھا گیا تھا جب رنگین کے دماغ نے ریختی ایجاد کی۔ مگر اُن کی تصانیف اور اُن سے زیادہ دوسرے صاحب کی تصانیف (جن کے تخلص لکھنے کی قلم تک کو ہمت نہیں پڑتی) اُردو کے دامن پر گندی چھینٹیں ہو گئیں۔ اور اُن کا دیکھنا عورتوں کو کیا مَردوں تک کو جائز نہیں۔

اب عورتوں کی زبان میں اور عورتوں کے پڑھنے کے لیے سب سے پہلے اور میری رائے

یں اس وقت تک سب سے بہتر جو کتابیں لکھی گئیں وہ مولانا نذیر احمد مرحوم کی ہیں۔ مرحوم نے یہ کتابیں لکھ کر عورتوں پر جو احسان کیا ہے اُس کی شکر گزاری کی اگر کوئی صورت ہوسکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ ہر لڑکی جب وہ عبارت پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جائے چاہیے کہ ایک دفعہ اُن کی ہر کتاب (جو عورتوں کے لیے لکھی گئی ہے) اول سے آخر تک پڑھ جائے۔

مولانا نذیر احمد مرحوم کے بعد بلکہ اُن کے زمانۂ حیات ہی سے اُن کے عزیز اور اُردو کے مشہور انشا پرداز عبد الراشد الخیری صاحب ان کے نقش قدم پر چل کر زنانہ لٹریچر کی بہت کچھ خدمت کر رہے ہیں۔ وہ کئی کتابیں ملک میں شایع کر چکے ہیں اور ایک چھوڑ دو اُردو ماہوار رسالوں کی ایڈیٹری بھی کرتے ہیں۔ صاحب موصوف جو کچھ لکھتے ہیں ٹھیٹ عورتوں کی زبان میں لکھتے ہیں۔ محاورے خاص دلی کے مستند۔ زبان ٹکسالی۔ جس میں مٹھاس بھی اور نمک مرچ بھی۔ لیکن قصور معاف ہو تو میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ بسا اوقات مٹھاس کی اس قدر کثرت یا نمک مرچ کی اس قدر شدت ہوتی ہے کہ زبان پناہ مانگنے لگتی ہے۔

مسلمانوں میں بہت سے مردود مَردوں کی بد مذہبی اور بے علمی کی وجہ سے بہت سی عورتوں پر ظلم۔ جبر۔ بے رحمی اور ناانصافی ہوئی اور ہوتی ہے جس کا نتیجہ اُن بیچاری عورتوں کے حق میں مفلسی۔ کس مپرسی۔ تباہ حالی۔ پریشانی اور افسردگی ہُوا اور ہوتا ہے اور اسی سے اُن بدنصیبوں میں رنج۔ غصہ۔ خواہش انتقام۔ بے صبری۔ ناشکری۔ بدزبانی اور بدمزاجی آ گئی اور آ جاتی ہے۔ صاحب موصوف چونکہ سوسائٹی کے اس تاریک رُخ کے خاکے کثرت سے کھینچتے رہے ہیں اس لیے مجھے خوف ہے کہ اُن کے قلم کی زبان میں یہ اثر سرایت کر گیا ہے اور اس لیے اُن کی تصویروں میں بھی خوش خُلقی۔ شگفتگی۔ نیک مزاجی۔ خندہ روئی۔ محبت پاس ادب اور حفظ ادب کے مراتب کے خط و خال مشکل سے نظر آتے ہیں۔

مجھے تسلیم ہے کہ سوسائٹی کا یہ رُخ نہایت تاریک۔ نہایت بھیانک۔ نہایت نفرت انگیز

اور نہایت شرم آور ہے۔ مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ اس رُخ کی تصویریں کھینچنی بھی نہایت ضروری ہیں اگر میری رائے ہے کہ یہ تصویریں صرف مَردوں کو دکھائی جائیں اور جس طرح ولایت میں بعض کتابوں اور البموں پر لکھا ہوتا ہے کہ "صرف مَردوں کے لیے" اسی طرح ان پر بھی یہی لکھا ہو۔ بلکہ اس قدر عبارت اور ہو "پڑھو۔ سوچو اور شرماؤ کہ تم نے اپنے ظلم جبر۔ بے رحمی اور ناانصافی سے اپنی رفیقِ زندگی کی حالت کیا سے کیا کر دی ہے"۔ عورتوں کو اِن تصویروں کے دکھانے میں میری رائے میں یہ خرابی ہے کہ اپنی ہم جنسوں میں رنج۔ غصہ۔ خواہشِ انتقام بے صبری۔ ناشکری۔ بدزبانی اور بدمزاجی دیکھتے دیکھتے یہ خود بھی ان عادتوں کو اختیار کرنے لگیں گی دوسرے ڈر ہے کہ کہیں بلا وجہ ذاتی عام جنس ذکور سے نفرت۔ عداوت اور بے تعلقی نہ پیدا ہو جائے جس سے نظام خانہ اور طمانیتِ خاطر ہی رخصت ہو۔

راشد الخیری صاحب نے لڑکیوں کے لیے جو انشا لکھی ہے عرصہ ہُوا اسے میں نے بھی دیکھا تھا۔ اگرچہ اُس میں بعض خطوط اعلیٰ درجے کے ہیں لیکن زیادہ تر ایسے ہیں جن کی بنا پر مجھے افسوس کہ اُس سے مایوسی ہوئی۔ اُنھیں دنوں ایک خاتون نے الناظر میں اسی انشا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ میں یہاں اُنکے طرزِ تحریر کی داد دینی نہیں چاہتا مگر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے یہ دیکھکر ایک نہایت خوش گوار تعجب ہُوا تھا کہ ہماری بہنوں اور بیٹیوں میں ماشاءاللہ تمیز و تنقید کا مذاق پورے طور پر موجود ہے اور وہ خود محسوس کرتی ہیں کہ ایسی کوئی کتاب جس سے تعدیۂ رذائل کا خفیف سا بھی احتمال ہو لڑکیوں کے ہاتھ میں قطعاً نہ جانے پائے۔

اب مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ اُنھیں خاتونِ محترم نے لڑکیوں کے لیے خود ایک انشا ترتیب دی ہے جس میں کے چار خط اُنھوں نے الناظر میں اشاعت کے لیے دیے ہیں۔ اگرچہ مٹھی بھر نمونے سے خرمن یا خروار کی نسبت رائے قائم کرنی محض خوش عقیدگی ہے لیکن ہمت افزائی کی غرض سے نہیں کہتا اس لیے کہ اس کی اُنھیں حاجت نہیں۔ خوشامد کی

راوسے نہیں کہتا اسلیے کہ اسکی مجھے عادت نہیں) جہاں تک میں ان چار خطوں سے اندازہ کرسکا، میرے ناقص خیال میں یہ انشا انشاء اللہ لڑکیوں کے لیے بہت مفید ہوگی اور زنانہ لٹریچر کی ایک شدید ضرورت کو پورا کرے گی بشرطیکہ اور خطوط بھی ایسے ہی بلکہ اس سے اچھے ہوں۔

زبان کے متعلق تو میں کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ شاید بیگم صفدر علی خود لکھنؤ کی رہنے والی ہیں[۱]۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان خطوں کے الفاظ لکھنے والی اور خیالات سوچنے والی سچ مچ ایک عورت ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ مولانا نذیر احمد ہوں یا مسٹر راشد الخیری عورتوں کی زبان سے جو کچھ وہ ادا کریں گے محض آورد۔ تصنع اور غیر واقعیت ہوگی چاہے وہ کتنی ہی قابل تعریف کیوں نہ ہو۔ لڑکیوں کی انشا اگر کسی مرد کی تصنیف ہو تو جو خط نصیر کی طرف سے زاہدہ کے نام ہوگا وہ چاہے کتنی ہی قابلیت اور واقفیت (یعنی حقیقت میں کتنی ہی نقالی اور فریب دہی) سے لکھا گیا ہو پھر بھی وہ اُس قلم کی جنبش کا نتیجہ ہوگا جو نصیر کی نہیں بلکہ نصیر خاں کی انگلیوں میں دبا تھا۔ اور اس لیے اُس خط کا انداز تحریر چاہے کتنا ہی زنانہ ہو لیکن انداز تخیل ضرور مردانہ ہوگا۔ ہم عورتوں کی زبان مستعار لیکر زنانی بات چیت ضرور کرسکتے ہیں مگر ہم عورتوں کا دماغ مستعار لیکر زنانہ خیالات ہرگز نہیں سوچ سکتے۔ سوسائٹی کی عام خوبیوں اور عام برائیوں پر ہماری نظر کتنی ہی وسیع اور عمیق ہو لیکن جو صنفی خوبیاں اور جنسی برائیاں عورتوں میں۔ اُن کے دل میں۔ اُن کے دماغ میں مضمر ہیں اُن کا صحیح اندازہ اور ٹھیک پتہ ایک عورت ہی لگا سکتی ہے اور وہی دوسری عورت کو اپنے ناقابل ادراک اور ناقابل تقلید طریقے سے سمجھا سکتی ہے۔

بیگم صفدر علی نے مسٹر راشد الخیری کی انشا کو اُس کے اقتباسات خطوط کے طعن و تشنیع

---

[۱] لکھنؤ کی تو نہیں مگر نواح لکھنؤ کی ضرور رہنے والی ہیں۔ منشی امیر احمد مینائی مرحوم و مغفور۔ منشی ممتاز علی آہ۔ منشی احمد علی شوق قدوائی اور منشی واحد علی آبر قدوائی کے سے اُستادانِ فن اور شعرائے باکمال سے فیض یاب ہونے کا جسے موقع ملے اُس کی زبان کا کیا کہنا۔ کیونکہ یہ چاروں حضرات موصوفہ کے بزرگ و عزیز خاص ہیں۔ ایڈیٹر

زبان درازی و فقرہ بازی۔ عامیانہ محاوروں اور سوقیانہ روزمروں کی بنا پر ناپسند کر کے اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ لڑکیوں کے لیے جو کتاب لکھی جائے اُس میں "مہذب الفاظ اور سنجیدہ عبارت کا لحاظ رکھنا لازمی ہے تاکہ لڑکیوں کی زبان پر بیہودہ الفاظ نہ آنے پائیں اور خیالات میں کمینہ پن نہ پیدا ہو جائے"۔ میں نے اسی تنقید کی خُردہ بیں عینک سے چاروں خطوں کو پڑھا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان میں کوئی لفظ یا خیال ایسا نہیں جس سے خود اُن کی تکذیب و تبکیت ہو سکے۔

مجھے اُمید ہے کہ حکیم صفدر علی اسی روش پر اور اسی رنگ میں ساری کتاب ترتیب دیکر شایع کر دیں گی جس سے لڑکیاں اور نیز لڑکیوں کے والدین اُنکے شکرگزار ہوں گے۔

از بمبئی		**خط (۱)**		۱۷۔ جون ۱۹۰۳ء

پیاری سلیمہ تمہارا خط پہنچا۔ خیریت پا کے میں خوش ہوئی۔ اب میں بالکل اچھی ہوں۔ اماں جان کو مطمئن کر دو۔ سعید کو البتہ پرسوں سے حرارت ہے۔ یہاں آج کل چیچک کا بڑا زور ہے۔ اور میں اس موذی مرض سے بہت ہی ڈرتی ہوں۔ ٹیکا تو ابھی بیس بائیس ہی دن ہوئے سب بچوں کے دلا چکی ہوں۔ بیچے موتی بھی تین تین دن سب کو کھلا دیے ہیں۔ اور بائیں ہاتھ کی چھنگلیا والی گائی میں جونکیں بھی لگا دی گئی ہیں مطلب یہ کہ احتیاط اور تدبیر تو حتی الامکان کر چکی ہوں۔ آگے جو اللہ کی مرضی۔ سعید کو حرارت کسی وقت ہو جاتی ہے اور کسی وقت بالکل نہیں ہوتی۔ اس سے چیچک کا اندیشہ نہیں کل تک اور دیکھ لوں۔ پرسوں بھی اگر خدا نہ کرے حرارت ہوئی تو عمل دوں گی۔ اکثر معدہ صاف نہ ہونے سے بچوں کو اس قسم کی شکایتیں ہو جایا کرتی ہیں۔ تم نے کٹھ پتلی کے تماشے کا حال لکھتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ "اماں جان تو بجائے خوش ہونے کے رونے لگیں۔ تماشے میں ہم سب سے زیادہ دلچسپی اُنھیں کو ہوئی۔ ہم لوگ تو کبھی کبھی اُٹھ بھی گئے۔ مگر وہ

اُس وقت نہ اُٹھیں جب تک کھیل ختم نہ ہو لیا۔ میں حیران ہوں کہ اماں جان کو بچوں کے کھیل میں ایسی کیا بات نظر آئی جس سے اُنکو اتنی تو دلچسپی ہوئی۔ اور پھر روتی بھی جاتی تھیں"۔ سلیمہ۔ کٹھ پتلی کا تماشا۔ بچوں کا کھیل ہی نہیں ہے۔ عبرت کا قصہ ہے نصیحت کی داستان ہے۔ صوفیوں کو اکثر اس میں لطف آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کٹھ پتلی کا تماشا ہو بہو دنیا کا نقشہ ہے۔ اگر غور سے دیکھو اور سمجھو تو یہ تماشا ہمکو بتاتا ہے کہ دنیا فانی ہے۔ دل لگانے کی جگہ نہیں۔ دنیا کی مثال بالکل اس تماشے کے چھوٹے اسٹیج اور اُسکے ننھے مُنّے ایکٹروں کی سی ہے ایک دن ایسا آنے والا ہے جب یہ دنیا اور اس میں چہل پہل پیدا کرنے والے انسان یوں ہی مٹ جائیں گے۔ جیسے یہ اسٹیج اور ایکٹر۔ ہماری سانس کا تار بھی ہمارے بنانے والے کے ہاتھ میں اُسی طرح ہے جس طرح اُن گڑیوں کا تار ان کے نچانے والے کے ہاتھ میں ہے۔ اور جس طرح محض اس تار کے کٹ جانے پر یہ چلتی پھرتی تصویریں گر گر کے اسٹیج کو حسرت کا گھر بنا دیتی ہیں اسی طرح ہم بھی ایک دن نفس کا تار ٹوٹ جانے پر یوں ہی بیجان ہو ہو کے دنیا کے اسٹیج پر گر جائیں گے۔ پھر جیسے یہ تماشا گاہ بغیر ان پتلیوں کے بیکار سمجھکر اُکھاڑ پھینکا جاتا ہے ویسے ہی تماشا گاہ عالم بھی ہمارے بعد فنا ہو جائیگا۔ اگر ان باتوں پر نظر کر کے کٹھ پتلی کا تماشا دیکھا جائے۔ تو وہ فی الحقیقت دلچسپی کے ساتھ عبرت کو بھی لیے ہوے ہے۔ مگر جو لوگ محض تماشا یا بچوں کا کھیل سمجھ کر دیکھتے ہیں، اُنکی نظر کسی نتیجے تک نہیں پہنچتی۔ اس لیے اُن کو دلچسپی ہوتی ہے مگر عبرت نہیں ہوتی۔ ہم لوگ عموماً کسی چیز کو غور کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم خدا کو اور اپنے فانی ہونے کو بھولے ہوے ہیں۔ دنیا کی ہر چیز ذرّے سے آفتاب تک فنا ہونے کا سبق اور خدائے واحد کے موجود ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔ اسپر بھی ہم نہ سمجھیں اور نہ دیکھیں تو ہماری سمجھ اور آنکھوں کا سراسر قصور ہے۔ پیاری سلیمہ۔ خدا کی قدرت کے کرشمے ہر چیز میں نظر آتے ہیں۔ وہ کون سی شے ہے جس میں اُسکا ظہور نہیں۔

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

ذرا اس جگمگاتے ہوے سورج کو دیکھو۔ اس چمکتے ہوے چاند پر نظر کرو۔ اِن جھلملاتے ہوے چھوٹے بڑے ستاروں پر نگاہ جماؤ۔ اور دل کے کانوں سے سُنو۔ کہ یہ سب زبان بےنکلے کیا کہتے ہیں ؟۔ کہ رہے ہیں کہ اے دیکھنے والے ہم پر سرسری نگاہ ڈال کر ہماری تحقیر نہ کر ہمیں رُوح کی آنکھوں سے دیکھ۔ ہم میں وہ چیز ہے جو کتابوں کے صفحوں میں نہیں۔ ہماری آب وتاب میں خدا کی قدرت اور صنعت کا جلوہ دیکھ۔ اور ہمارے فنا ہو جانے سے ہر چیز کے فانی ہونے کا سبق لے۔ ہم کو دیکھ۔ اور اُس لازوال وجود پر ایمان اور یقین لا۔ جس کے زبردست ہاتھ ہم کو اور ہماری سی بے شمار خوش نما اور بکار آمد چیزوں کو بنانے بگاڑنے پر قادر ہیں۔ اے غافل اور فانی ہستی۔ یعنی انسان۔ نادان نہ بن۔ بصیرت کی آنکھیں کھول۔ ذرہ ذرہ قطرہ قطرہ۔ صبح اور شام۔ پھول اور پھل۔ غرض ہر شے تجھکو فنا کی تعلیم دے رہی ہے۔ چندروزہ زندگی پر نہ بھول۔ یاد رکھ کہ تجھے بھی ایک دن فنا ہے۔ اور خوب سمجھ لے کہ

سب کے لیے راہ ہے فنا کی
باقی اک ذات ہے خدا کی (شوق قدوائی)

پیاری سلیمہ اگر تم نے غور سے کام لیا ہوتا تو تم کو اس بات پر تعجب نہ ہوتا۔ کہ امّاں جان تماشے میں محو ہو گئیں۔ بلکہ تم خود وہی لُطف اُٹھاتیں۔ جو امّاں جان نے اس بچّوں کے کھیل سے حاصل کیا۔

میری طرف سے عابدہ کو پیار کرلینا۔ اور امّاں جان کے حضور میں تسلیم عرض کرنا سعید۔ حمید۔ اور نعیمہ آداب گزار ہیں۔

فہیمہ

خط (۲)

از بنارس ۱۳ر اگست ۱۹۱۰ء

پیاری انجمن آرا۔ اللہ تم کو خوش رکھے۔ تھارا خط پہنچا۔ چچا صاحب کی ترقی سے

تم جانتی ہو کہ فضول رسموں سے مجھے دلچسپی نہیں۔ اُدھر رات بھر ڈھول پر ڈھول ٹوٹے۔ کڑھائی چڑھی۔ گلگلے پکے۔ میراثنیں چیخیں۔ اور اِدھر میں نے اپنے سونے کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے دو راتوں میں یہ کھرّا لکھا۔ تمھیں چھوٹا سا خط لکھ کر میرا جی ہی نہ بھرتا اور گھر میں اتنی مہلت ملنے کی امید نہ تھی کہ دل میں جو باتیں بھری تھیں وہ سب قلم سے اُگلتی ایک خفیف سی وجہ میرے خط نہ لکھنے کی یہ بھی ہوئی۔ اپنے دولھا کو میرا سلام کہنا اور مزاج پوچھنا۔ بچے تسلیم کہتے ہیں۔ تمھاری دُور اُفتادہ بہن۔ زہرا

خط (۴)

نشاط محل۔ حیدرآباد۔ یکم جولائی ۱۹۱۴ء

میری اچھی زُہرا۔ خوش رہو۔ پہلے تمھاری محبت کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور پھر اپنے خط نہ لکھنے کی بہت بہت معافی مانگتی ہوں۔ تمھاری شکایت میرے سر آنکھوں پر۔ مگر للہ زہرا پہلے میرا حال سُنو اور پھر شکایت کرو۔ میں نے مانا کہ تم اکیلے گھر کی ہو لیکن بہن۔

میری طرح بلا میں کوئی مبتلا نہ ہو

خدا کا شکر کرو کہ اُس نے تم کو نیک اور خوش مزاج شوہر دیا ہے۔ تم مجھ پر رشک کرتی ہو کہ میں چھپّر چھٹانک ہوں۔ حالانکہ میرے لیے یہی ستم ہو گیا۔ سارا گھر بیزار۔ میاں خفا۔ کس قصور پر۔ کہ بے اولادی ہے بانجھ ہے۔ صبح اُٹھ کر میرا مُنھ دیکھنا نحس خیال کیا جاتا ہے۔ اور تو اور میرا پڑھا لکھا ہونا بھی غضب ہو گیا۔ جہاں کتاب ہاتھ میں لی یا کچھ لکھنے کا ارادہ کیا اور کسی کی نظر پڑ گئی بس آفت کا سامنا کہ اسی سے تو یہ نحوست ہے۔ بھلا مسلمان عورت قلم پکڑے اور کتاب کا کیڑا بنی رہے تو گھر میں برکت کاہے کی ہو۔ خدا بھی کہتا ہے کہ مَردوں کے سے کام کرو تو مردوں کی طرح رہو (یعنی جس طرح مَردوں کے بطن سے اولاد نہیں ہوتی اسی طرح لکھنے پڑھنے والی عورت بھی بے اولاد رہتی ہے)۔ پہلے مجھے ان خیالات پر ہنسی آتی تھی اب رونا آتا ہے۔ ہاں وہ مجھے لکھنؤ لے گئے تھے مگر کیوں؟ علاج کے لیے۔ اُن کی ماں ساتھ تھیں۔ سُنا تھا کہ عیش باغ کے پاس ایک کامل فقیر رہتے ہیں۔ اُن کی دُعا سے اولاد ہوتی ہے

اس ملک میں وہ بھی ساتھ آئیں کہ اُن سے دعا منگوائیں۔ یقین مانو زہرا جتنا مجھے لکھنؤ جانے اور ساتھ والیوں سے ملنے کا حوصلہ تھا سب مٹی ہو گیا۔ جب تک وہاں رہی مبہوت رہی۔ کسی کو یاد کرنا کیسا میں اپنے ہی کو بھول گئی۔ گئی تھی علاج کرانے کو مگر موئی باؤلی وہ تو مجھے پہنچا کے اور اپنی اماں جان کے سپرد کرکے واپس آئے مگر کہاں کی دوا اور کیسا علاج۔ اُنھوں نے سب چھوڑ چھاڑ ٹونے ٹوٹکے۔ جھاڑ پھونک اور فال تعویذ میں روپیہ لُٹانا شروع کیا۔ میری کیا مجال تھی کہ اُن کو زیادہ روکتی ٹوکتی۔ دو چار بار دبی زبان سے کہا بھی۔ کہ اماں جان یہ لکھنؤ ہے۔ یہاں کے ہتھکنڈے مشہور ہیں۔ آپ ان لوگوں کے کرشموں سے ابھی واقف نہیں۔ بیکار روپیہ برباد نہ کیجیے۔ اتنا ڈاکٹروں اور حکیموں کو دیجئے تو کچھ فائدہ بھی ہو۔ ان جالبازوں کے گنڈوں تعویذوں میں اگر کچھ اثر ہوتا تو حکیم ڈاکٹر کو کون پوچھتا۔ مگر ہر دفعہ یہی جواب پایا کہ بس بس اپنی انگریزیت رہنے دو۔ تم میم صاحب ہو تو اپنے لیے۔ ہم تو مسلمان ہیں۔ ہم کو اپنے تعویذوں ہی پر عقیدہ ہے۔ آخر کار میں چپ ہو رہی۔ پھر کیا تھا۔ فلیتوں چراغوں اور دھونیوں کی وہ بھرمار ہوئی کہ الاماں۔ پلنگ میں اتنی کیلیں ٹھونکی گئیں کہ پلنگ کی لکڑی اسپنج کی طرح سوراخ دار ہو گئی۔ میرے بدن پر گنڈے تعویذوں کی وہ بہتات ہوئی کہ میں آدمی سے ردّی کی ٹوکری اور گودڑ کی بقچی بن گئی۔ تین مہینے بہ قول اُن کی اماں کے۔ ہزاروں جتن کیے لاکھوں پاپڑ بیلے۔ اور روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ (جو میرے نزدیک نہایت نادانی سے خاک میں ملایا گیا) مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ میں نے اُن کو بھی لکھا۔ کہ فضولیات میں روپیہ کیوں برباد کراتے ہو۔ یا تو میرا علاج کراؤ۔ یا مجھے واپس بلا لو۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ مجھے عورتوں کے معاملات میں دخل نہیں۔ تم جانو اور اماں جان جانیں۔ میں اپنا سا منھ لے کر رہ گئی۔ اور تین مہینے لکھنؤ میں جھک مار کے چھوٹے بھیا کے ساتھ حیدرآباد واپس آئی۔ لکھنؤ میں گھر سے نکلنے کا موقع ہی کب ملا۔ مزار پر جانے کی تو اجازت نہ تھی۔ ہاں

نصرت منزل اور "زُہرا پسند" باغ دیکھنے ایک بار گئی تھی۔ کیا بتاؤں کیا حالت دیکھی۔ تھوڑی دیر رو کے چلی آئی۔ ایک دن عائشہ اور سلمیٰ سے بھی ملنے گئی تھی۔ دونوں کو دیکھ کر جی خوش ہُوا۔ ماشاءاللہ اپنے گھروں میں چین سے اور خوش تھیں۔ وہ میری حالت دیکھ کے رو دیں۔ اور میں تمھیں یاد کرکے۔ پیاری زُہرا اچھا ہی ہُوا کہ ہم تم دُور ہیں۔ تم مجھے دیکھ کے بہت کُڑھتیں۔ تمھاری شاگرہ اب وہ نہیں رہی جس کو تم چنچل شاگرہ کہا کرتی تھیں۔ آہ زُہرا۔ میری قسمت نے ایسے لوگوں سے میرا پالا ڈالا۔ جن کے یہاں میرے سارے ہُنر عیب گنے گئے۔ اور جن کے یہاں کہنے کو سونے کے محل کھڑے ہیں مگر مجھ بد نصیب کے لیے آرام نہیں۔ تم جانتی ہو مجھے روپے سے اُنس نہ تھا۔ مسرت اطمینان۔ یک جہتی اور اتفاق کی خواہش مند تھی۔ ان کے۔ یہاں لالے پڑے ہیں۔ میرے لکھنؤ سے پلٹنے کے بعد ہی اولاد کی تمنا میں۔ اُنکی ماں نے اُن کی دوسری شادی اپنے خاندان میں کرادی۔ وہ اور اُن کے سب عزیز۔ نئی دُلھن سے خوش ہیں۔ اس لیے کہ وہ انھیں لوگوں کی ہم خیال ہیں۔ اب سُنتی ہوں کہ اُن کے اولاد ہونے والی ہے۔ چار مہینے ہوئے میں اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ نہ وہ اِدھر آئے۔ نہ یہ پوچھا کہ جیتی ہے یا مرگئی۔ دَوَا ظہورن ہیں میں ہوں۔ اور میرا کمرا ہے۔ خدا مجھے مَوت دے تو جی جاؤں۔ اب اس دنیا میں میرے لیے باقی ہی کیا رہا ہے۔ بس۔

مرجانے کی اب تو آرزو ہے

گر نہ جانے اور کیا مصیبت سہنی بدی ہے جو زندگی ختم نہیں ہوتی۔ بہن۔ میں پچھلے دنوں کو یاد کروں یا آج کی حالت پر روؤں۔ سب سے بہتر یہی ہے کہ یہ سمجھ کر صبر کرلوں۔

میرے لیے نہیں ہے لطفِ بہارِ ہستی

دامانِ آرزو ہے اور خارزارِ ہستی

لو میری بپتا سُن چکیں۔ مگر دیکھو۔ رونا دھونا نہیں میرے لیے دعائے خیر کرو۔

اور اپنی حالت پر خدا کا شکر کرو کہ تم بہت آرام سے ہو۔ گھر کے دھندے گھر والیوں کو ہوتے ہی ہیں۔ کوئی نوج ہماری طرح ہو۔ جس کو گھر تک نصیب نہیں۔ کہ اُس کے دھندوں میں پھنس کر غم غلط کرے۔ تم کو اور ہر ایک کو اپنے سے بدتر کی حالت پر نظر کرنی چاہیے۔ تاکہ خدا کا شکر ادا کرسکو۔ محض اسی لیے میں نے یہ غم کا دفتر تیا۔ کیا کہ میری اور اپنی حالت کا تم مقابلہ کرسکو۔ تم میں ابھی کچھ اُمنگ اور حوصلہ باقی ہے۔ جو پچھلے دنوں کی واپسی کی آرزومند ہو۔ یہاں دل ہی نہیں تو آرزو کیا ہو۔

آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

اچھا خدا حافظ۔ پھولو پھلو۔ بہت سُکھ دیکھو۔ تمہاری بدنصیب شاکرہ

رشک حقیقی

ایک دن منصور شیدائے خدائے دوجہاں جا رہا تھا عشق کی مستی میں کیا جانے کہاں

راہ میں آئی نظر اک شوخ دوشیزہ حسیں دلربا و دل ستان و دل فریب و نازنیں

کچھ پڑی تھیں رُخ پہ زلفوں کی لٹیں کچھ دو شِکن حُسن آفت کا، جوانی کا زمانہ جوش پر

جو نگہ تھی تیر بن کر دل جگر کے پار تھی جو ادا تھی جان لینے کے لیے تیار تھی

جان لیوا ناز تھے ہر نازنیں انداز تھا موہنی تھی آنکھ میں جادو تھا یا اعجاز تھا

مست آنکھیں ڈال کر مستانہ دل کو کر دیا پیار سے دیکھا جہاں دیوانہ دل کو کر دیا

اتفاقاً پڑ گئی منصور کی اُس پر نظر
غیر پہ مائل ہوئی وہ آنکھ جو تھی حق نگر

دیکھتی رہتی تھی نورِ کبریائی جو نگاہ جلوۂ حُسنِ مجازی پہ ہوئی گم کردہ راہ

پھنس گیا ظلمت میں جو محوِ جمالِ ماہ تھا بندے کا بندہ ہُوا جو آشنائے شاہ تھا

غیب سے آئی ندا منصور جاتا ہے کدھر ہم سے کب اچھا ہے جس پر ڈالتا ہے تو نظر

مبتلا ہے تو ہمارے نام پر مرتا ہے تو — کیوں بھی دعوے ہمارے عشق کا کرتا ہے تو
دور تجھ سے ہو گئے ہم ہو گیا تو ہم سے دُو — جان لیکر بھی بڑی مشکل سے بخشیں گے قصور

پھر معشوقِ حقیقی کو جو دیکھا جوش میں
بیخودی سے آ گیا منصور بیخود ہوش میں

عرض کی اے جان والے ایمانِ منصورِ حزیں — تو نہ آزردہ ہو عاشق موت سے ڈرتا نہیں
جان کو قربان کرنا کیا ہے مشکل اے خدا — لاکھ جانیں تو اگر دے سب کروں تجھ پر فدا
تو کہے گا جس طرح اے دوست مر جاؤنگا میں — بخشنے والوں میں تیرے نام کر جاؤنگا میں
جوشِ عشقِ حق نے اُسکو مست و بیخود کر دیا — شورِ الفت جان میں دل میں جگر میں بھر دیا
کہہ اُٹھا آخر انا الحق عاشقِ سینہ فگار — دار پر چڑھ کر ہوا اُس جانِ جاں سے ہمکنار
جان دے کر عاشقِ صادق ہلا دلدار سے — جان لے کر کم ہُوا غصہ مزاجِ یار سے
جان قرباں کرکے عاشق جانِ جاں سے مل گیا — قطرۂ ناچیز بحرِ بیکراں سے مل گیا
گالیاں کھائیں بلا سے سنگ باری بھی سہی — دار پر چڑھ کر وہی تیور وہی ہمت رہی
عشق کی تلوار سے اعضائے تن جب کٹ گئے — بیچ میں پردے دوئی کے جو پڑے تھے ہٹ گئے
آزمایش کے لیے ڈھائے ستم دلدار نے — جان لیکر دی حیاتِ جاوداں اُس یار نے

صورتِ منصور دُنیا میں جگر وہ فرد ہے
امتحانِ عشق میں پورا جو اُترے مرد ہے

جگر۔ صدیقی

شانِ وحشت ہی نرالی ترے دیوانوں کی — دھجیاں ہاتھ میں لپٹی ہیں گریبانوں کی
شمع کے آنسوؤں سے دل کی لگی کیا بجھتی — جان جل جل کے گئی بزم میں پروانوں کی
دیکھنا حشر کیا حشر میں پُرزے پُرزے — بات رکھ لی ترے دیوانہ نے دیوانوں کی
دیکھیے ہوتا ہو کیا جورِ بتاں کا انجام — عرش تک پہنچی ہے فریاد مسلمانوں کی
کس طرح لوگ جگر تجھکو مسلماں سمجھیں — شان کچھ بھی تو نہیں تجھ میں مسلمانوں کی

جاپانی بچوں کی تعلیم وتربیت

یوں تو ہر ملک اور ہر قوم میں بچہ کی پیدائش اُس خاندان کے لیے خدا کی دی ہوئی برکتِ عظیم سمجھی جاتی ہے، جس میں وہ بچہ پیدا ہوا ہے، لیکن مشرقی ممالک میں عموماً اور شاید جاپان میں خصوصاً خدا کی اس بخشش کا نہایت مسرت سے استقبال ہوتا ہے۔ اگرچہ جاپان نے خصوصیت کے ساتھ مغربی تہذیب کی بہت کچھ پیروی کی ہے، لیکن جاپانیوں نے ایک بڑی حد تک دُور اندیشی اور سمجھ سے کام لے کر صرف مغربی تہذیب کے روشن پہلوؤں کو اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ جاپانی مَردوں اور عورتوں نے رفتہ رفتہ یورپین لباس و معاشرت کی بہت کچھ نقل شروع کر دی ہے، لیکن اسی کے ساتھ اُنھوں نے اپنی مخصوص قومی روایات کو بھی برقرار رکھا ہے۔ مثلاً آج ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ میں ہزارہا عورتوں نے، محض متاہل زندگی کے قیود، اور اولاد کی پرورش کی ذمہ داریوں سے گھبرا کر رسم شادی کے خلاف مقاطعہ شروع کر دیا ہے، اور ان ممالک میں بہت سی انجمنیں اور جماعتیں ایسی قائم ہو رہی ہیں جنھیں (ANTIMARRIGE LEAGUE) (یعنی انجمن مخالف شادی) کہتے ہیں، اور جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کو متاہل زندگی کے نقصانات سے آگاہ کریں، اور اُن کو شادی کرنے سے باز رکھیں۔ (شاید موجودہ جنگ کے بعد یورپ میں ایسی جماعتوں کا سختی کے ساتھ استیصال کیا جائے۔ کیوں کہ اس وقت اپنے حریف سے انتقام لینے کا جوش، ہر یورپین حکومت کے دل میں اپنے ملک کی آبادی بڑھانے کی فکر پیدا کر دے گا) برخلاف اس کے جاپانی عورتوں میں اولاد سے بڑھ کر کسی چیز کی قدر نہیں ہوتی۔ اور اُن کی شادی کا مقصود ہی دراصل اولاد ہوتی ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو اولاد سے خلقی محبت ہے اور کچھ یہ کہ جاپان میں ایسی عورت اپنے خاندان میں سخت حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے، جس کے کوئی اولاد نہ ہوئی ہو اور طلاق کے خوف سے

خود اسکی زندگی نہایت تلخ ہو جاتی ہے یہی سبب ہے کہ جب جاپانی عورت کو اپنے حاملہ ہونے کا علم ہوتا ہے تو اُس کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

جاپانی عورتیں بچے کی پیدائش سے قبل اُس کے لیے دو کپڑے تیار کرتی ہیں۔ ایک زرد رنگ کا چمکدار کُرتا ہوتا ہے (کیوں کہ جاپانی عورتوں کے عقیدے میں زرد رنگ بچے کی تندرستی کے لیے شگونِ نیک ہے) اُس پر ایک سرخ کوٹ ہوتا ہے (سرخ رنگ مبارک بادی کی دلیل سمجھا جاتا ہے) کچھ عرصے تک بچہ ایسے ہی کپڑے پہنے رہتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ لڑکا ہے تو اُسے نیلے رنگ کے کپڑے پہنائے جاتے ہیں، اور اگر لڑکی ہے تو سُرخ رنگ کے کپڑے۔ پھر وہ مختلف رسوم ہوتی ہیں جو کسی قدر فرق کے ساتھ قریب قریب تمام مشرقی ممالک میں رائج ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں جس طرح چھٹی، چِلا، عقیقہ وغیرہ کی رسومات جاری ہیں یہی رسوم جاپان میں بھی جاری ہیں۔ جاپانی بچہ جب تین روز کا ہوتا ہے، تو اُسے گاؤں کے مندر میں لے جا کر اس خاندان کے مخصوص دیوتا کی نذر کیا جاتا ہے، جہاں مندر کا مجاور بچے کی تندرستی اور خوش حالی کے لیے دیوتا سے دعا کرتا ہے۔ اس قسم کی رسوم کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کہ بچہ دو تین برس کا نہیں ہو جاتا۔

جاپانی بچوں کے لیے اُس وقت تک کسی قسم کی تنبیہ جائز نہیں رکھی جاتی، جب تک کہ وہ سنِ شعور کو نہیں پہنچ جاتے۔ بلکہ آٹھ نو برس کے سن تک تو جاپانی بچہ اپنے خاندان کا خود مختار بادشاہ ہوتا ہے، جس کے حکم کی تعمیل ہر چھوٹے بڑے پر فرض ہوتی ہے۔ اس طرح گویا جاپانی بچوں میں آزادی اور حکومت کی روح بچپنے ہی سے پیدا ہو جاتی ہے۔ جاپانی بچوں کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے رونے کی آواز کوئی نہیں سُن سکتا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انکو رونے کا موقع ہی نہیں ملتا بلکہ اُن کی ہر ضد فوراً پوری کر دی جاتی ہے، برخلاف اس کے ہمارے یہاں ہندوستان میں یا تو معمولی معمولی باتوں پر مار پیٹ کر بچوں کو چِڑچِڑا کر دیا جاتا ہے، یا ڈرا دھمکا کر بچپنے ہی سے اُنھیں بُزدل اور ڈرپوک بنا دیتے ہیں، اور پھر یہ

کمزوریاں ان میں ہمیشہ پائی جاتی ہیں، کیوں کہ یہی وہ زمانہ ہے جب معصوم طبیعتیں ہرنیک و بد اثر کو بہت جلد قبول کرلیتی ہیں۔ جیسا کہ ایک مشہور فلاسفر کا قول ہے کہ بچے کی تعلیم و تربیت ماں کی گود میں ہوتی ہے۔ جاپان میں دو برس تک ماں بچے کو کسی وقت بھی اپنے جسم سے علیحدہ نہیں کرتی۔ بلکہ ماں کے اوورکوٹ سے لپٹا ہوا وہ ہروقت ماں کی پشت سے چمٹا رہتا ہے۔

جاپانی بچہ جب سات برس کا ہوجاتا ہے تو اُسے مدرس کے سپرد کردیا جاتا ہے، اور اب اُس کی تعلیم و تربیت کی تمام ذمہ داری اُستاد پر عائد ہوجاتی ہے۔ والدین کا فرض اب صرف بچے کی نگرانی کرنا ہوتا ہے، ماں باپ خود بچے پر کوئی تنبیہ نہیں کرتے بلکہ وہ اُستاد سے اُس کی شکایت کرتے ہیں۔ اسکول میں بچے کو صرف پڑھنا لکھنا ہی نہیں سکھایا جاتا، بلکہ اُسے اسکول کے قواعد و قوانین کی پابندی کرنا بھی بتایا جاتا ہے، اور اس طرح مُلکی قوانین کی پابندی کا سبق جاپانیوں کو اسکول ہی میں سکھایا جاتا ہے۔

جاپانی کنڈرگارٹن اسکولوں میں، جہاں بچوں کو کھیل کود اور گانا بجانا سکھایا جاتا ہے، وہاں مختلف دلچسپ قصے اور حکایتیں سُنا کر اُنھیں حب الوطنی، ایثارِ نفس اور بادشاہِ وقت کی وفاداری کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ دنیا کے مشہور بہادروں کے کارنامے سُنا کر اُن میں سپاہیانہ جوش پیدا کیا جاتا ہے، اور بچپنے ہی سے اُن میں مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ کام کرنے کی عادت پیدا کی جاتی ہے۔ مغربی تہذیب و تعلیم کے کرشمے جو ہم فرانس و بلجیم کی سرزمین پر دیکھ رہے ہیں، جہاں مغلوب دشمن کے لیے فاتح کے دل میں کوئی رحم نہیں ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان ممالک کے بچوں کو بچپنے ہی سے خود غرضی اور تعصب کی تعلیم دی جاتی ہے، برخلاف اس کے گزشتہ جنگِ روس و جاپان میں، جاپانیوں نے جس تہذیب اور شرافت کا برتاؤ اپنے مغلوب دشمن کے ساتھ منچوریا کے میدانوں میں کیا، وہ درحقیقت اسی تعلیم کا نتیجہ تھا، جو جاپانی بچے اسکولوں ہی میں حاصل کرتے ہیں۔ جاپانی بچوں کو

میدان جنگ کے زخمیوں کی تیمارداری کا کام بھی اسکولوں ہی میں سکھایا جاتا ہے۔ کھیل کود میں جب کوئی بچہ چوٹ کھاتا ہے، تو دوسرے بچے فوراً اُس کی تیمارداری میں مشغول ہو جاتے ہیں، اور بعض اوقات بچے نمایشی طور پر زخمی بنائے جاتے ہیں تاکہ دوسرے بچے تیمارداری کرنا سیکھیں۔

جاپانی لڑکوں کو اپنے بادشاہوں کے کارنامے سُنا کر اُنھیں بادشاہ کی عزت کرنا اور اُس سے محبت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ یوں تو تمام مشرقی لوگوں کے خمیر میں بادشاہ پرستی کا مادہ بھرا ہوتا ہے، لیکن جاپان میں شاید قومی بادشاہ ہونے کی وجہ سے، اس سے بعید محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اسکول میں داخل ہوتے ہی پہلے جاپانی لڑکوں کو شہنشاہ کی تصویر کے سامنے اُس کی اطاعت و فرماں برداری کا حلف اُٹھانا ہوتا ہے۔ یہ اس طرح کہ لڑکوں کی مختلف جماعتیں زرق برق پوشاکوں میں، یکے بعد دیگرے شہنشاہ کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر، کوچ کرتی ہیں اور اُس کی وفاداری و محبت کی قسم کھاتی ہیں اسطرح جاپانی بچوں کا پہلا سبق شہنشاہ کی وفاداری ہوتا ہے۔

اسکول میں داخل ہونے کے بعد ایک عرصے تک لڑکوں سے صرف فوجی ورزش کا کام لیا جاتا ہے۔ جس طرح جرمنی میں فوجی تعلیم اسکولوں میں لازمی ہے، شاید اسی طرح جاپان میں بھی بچوں کے لیے فوجی قواعد سیکھنا ضروری ہے۔ جاپانی بچے نہایت چست اور تیز فہم ہوتے ہیں۔ وہ اُستاد کے اشارے پر نہایت پھرتی کے ساتھ اپنا کام کرنا سیکھتے ہیں، اور یہی بچے، جب فارغ التحصیل ہو کر کسی ملکی یا فوجی صیغۂ ملازمت میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں بھی اپنے فرائض نہایت مستعدی اور قاعدے کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

جاپانی اسکولوں میں ابتدائی تعلیم لڑکوں اور لڑکیوں کی قریب قریب یکساں ہوتی ہے۔ صرف اس قدر فرق ہوتا ہے کہ لڑکوں سے دماغی محنت کے علاوہ جسمانی محنت کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ مثلاً، جیسا کہ ہم پیشتر کہہ چکے ہیں جاپانی بچوں کے لیے فوجی قواعد

سیکھنا بھی ضروری ہے۔ ایک مدتِ معینہ تک لڑکیاں بھی لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں شامل ہوتی ہیں، اسکے بعد پھر لڑکیاں غیر جنس سوسائٹی میں داخل نہیں ہوسکتیں۔ اس سن میں لڑکے زندگی کی اُن دشوارگزار منازل کو طے کرنا شروع کرتے ہیں، جنھیں طے کیے بغیر اس دنیا میں مفر نہیں، اور لڑکیوں کو زوجیت کے وہ تمام فرائض بتائے جاتے ہیں جو ایک سلیقہ مند بیوی بننے کے لیے ضروری ہیں۔ چونکہ جاپانی لڑکوں کے پیش نظر عموماً فوجی ملازمت ہوتی ہو اس لیے اسکول ہی سے وہ اس بڑی خدمت کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔

ابتدائی اسکولوں میں، لڑکوں کے لیے جس طرح فوجی قواعد سیکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح لڑکوں کے لیے اخلاقیات کی تعلیم بھی لازمی ہے۔ بظاہر یہ مضمون کم سن بچوں کے لیے خشک اور غیر دلچسپ معلوم ہوتا ہے، لیکن جس طریقہ سے اسکی تعلیم دی جاتی ہے، وہ اس قدر دلآویز اور موثر ہے۔ کہ بچے اُس سے صرف متاثر ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے اُستاد کی تقریر کو نہایت دلچسپی اور شوق سے سنتے ہیں۔ مدرس، بڑی بڑی رنگین تصویروں کی مدد سے چھوٹی چھوٹی نتیجہ خیز اخلاقی کہانیوں کو اسقدر موثر پیرایہ میں بیان کرتے ہیں کہ اُنکا اثر ہمیشہ اُنکے دلوں پر قائم رہتا ہے۔ اسکے علاوہ لڑکوں کو نقشہ کشی اور دیگر دستکاریاں سکھائی جاتی ہیں اور لڑکیوں کو سینا پرونا، اور کپڑے بُننا سکھایا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ کچھ کچھ پڑھنا لکھنا بھی ۔

جاپانی والدین صرف اسکول ہی کی تعلیم کو اپنے بچوں کی تربیت کے لیے کافی نہیں سمجھتے بلکہ فرصت کے وقت مکان پر بھی مختلف طریقوں سے لڑکوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ جاپانی والدین، جب خاندانی یا مُلکی فلاح وبہبود کے اسباب پر بحث کرتے ہیں، تو وہ اپنے لڑکوں کو اپنے پاس بٹھلاتے ہیں تاکہ ان میں ان باتوں کے سمجھنے کی قابلیت اور روشن خیالی کا مادّہ پیدا ہو۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک ہندوستان کی معاشرت میں جہاں اور بہت سی نرالی اور تباہ کُن خصوصیات ہیں وہاں یہ بات بھی کچھ کم قابل افسوس نہیں کہ لڑکوں کے لیے پالٹیکس میں دخل دینا خواہ وہ مُلکی ہو یا خاندانی، قطعاً ناروا ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ ہندوستان کے بہت سے خوش حال خاندان محض نالائق اور کوتاہ بیں اولاد کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوگئے، جسکی ذمہ داری بالواسطہ اُنکے والدین ہی پر عائد ہوتی ہے، جنھوں نے نہ صرف انکی تعلیم و تربیت سے غفلت کی بلکہ اگر اُنھوں نے کبھی اپنے مفید مطلب باتوں کے سننے کی کوشش کی بھی، تو "دخل در معقولات" کہکر اپنے پاس سے اُٹھا دیا۔ ہندوستان میں ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ والدین یا دیگر اعزا، جب کبھی مُلکی یا خاندانی معاملات پر بحث و گفتگو کرتے ہیں، تو یہی نہیں کہ لڑکوں کو "دخل در معقولات" سے منع کرتے ہیں۔ بلکہ اُنکو اپنے پاس بٹھانے کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ پس حقیقت میں خاندان کی تباہی انھیں کی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہے۔ اسکے برخلاف جاپانی والدین اپنے لڑکوں کے لیے اخلاقی اور سیاسی (یا اقتصادی) تعلیم کو دیگر علوم و فنون کی تعلیم پر ترجیح دیتے ہیں، تاکہ جوان ہوکر انکے بچے خاندانی عزت و وقار کو قائم رکھیں۔

جاپان میں شہنشاہ پرستی کے بعد دوسرا درجہ اسلاف پرستی کا ہے۔ اپنے اجداد کی عزت کرنا، اور اُنکے شاندار کارناموں سے سبق حاصل کرنا جاپانی بچوں کا فرض ہوتا ہے۔ اسکی تعلیم بھی باقاعدہ ہوتی ہے۔ یعنی رات کو گھر کی سن رسیدہ عورت اپنے گرد تمام بچوں کو جمع کرتی ہے، اور اُن کے اسلاف کے کارناموں کو قصوں اور کہانیوں کے طور پر بیان کرتی ہے، جنھیں بچے نہایت ذوق و شوق اور توجہ سے سنتے ہیں۔ یہ قصے بھی نتیجوں سے خالی نہیں ہوتے فرض کرو کہ کسی بچے سے اُس روز کوئی ناشایستہ حرکت سرزد ہوئی ہے، تو وہ بوڑھی ماں ایسا نتیجہ خیز قصہ بیان کریگی کہ اُس بچے کو تنبہ ہو اور وہ آیندہ ایسی غلطی کرنے سے احتراز کرے، یا اگر کسی بچے نے اُس روز کوئی اچھا کام کیا ہے، تو وہ ایسا قصہ بیان کریگی، جس سے اُس بچے کو خوشی اور آیندہ ایسے ہی کام کرنے کا شوق ہو۔

مشرقی بچوں کی تعلیم اپنے مغربی ہمسنوں سے بہت کچھ مختلف ہوتی ہے۔ خصوصاً جاپانی لڑکوں کی تعلیم و تربیت میں تو اسلاف پرستی اور حب الوطنی کا اثر اس قدر نمایاں رہتا ہے کہ

دیگر مشرقی ممالک کو بھی اس پر رشک کرنا چاہیے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ جاپان کی تمام اخلاقی اور قومی تعلیم کے نظام کی بنیاد شہنشاہ جاپان کے اس فرمان پر ہے، جو ۱۸۹۰ء میں جاری ہوا۔ اور جو اب تک ہر اسکول میں کم از کم چار مرتبہ طلبہ کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے، جس کا مضمون حسب ذیل ہے۔

"ہماری عزیز رعایا کو معلوم ہو کہ:۔

ہمارے دولت کے بزرگوں نے اس سلطنت کو ایسے وسیع اور دائمی بنیاد پر قائم کیا، اور اپنی عزیز رعایا کے دلوں کو شہنشاہ کی وفاداری کی حبل المتین سے اس طرح متحد کر دیا کہ اس اتفاق و اتحاد کی برکات نسلاً بعد نسلٍ ظاہر ہوتی رہی ہیں۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس میں ہماری سلطنت کی ترقی اور خوش حالی کا راز مضمر ہے اور یہی ہماری قومی تعلیم کا منبع ہے۔ ما بدولت کی دلی خواہش ہے کہ ہماری عزیز رعایا کا ہر بچہ اپنے والدین کی عزت اور اپنے بھائی بہنوں سے محبت کرے، زن و شو میں باہم اتفاق و اتحاد ہو، دوست باہم سچے غمخوار و ہمدرد ہوں ہماری رعایا کا ہر فرد منکسر المزاج و اعتدال پسند ہو اور ہر شخص کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرنا اپنا فرض سمجھے، علوم و فنون کی تحصیل سے اپنی قوتِ دماغی و ذہنی کی نشو و نما کرے۔ محب وطن ہو اور عوام کے حقوق کا محافظ اور انکی ترقی اور خوشحالی کا خواہاں جمہوری حکومت کی عزت و حرمت اور ملکی قوانین کی پابندی کو اپنا فرض سمجھے، بوقت ضرورت ملک پر اپنی جان فدا کرنے کو طیار رہے، ما بدولت کے تخت کی حفاظت اسکا مقدس فرض ہو۔ اور ملک کی ترقی اس کا نصب العین ہو۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ ہماری عزیز رعایا صرف نیک چلن اور وفادار ہی نہ ہو بلکہ اسکا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ہمارے محترم اسلاف کے شاندار کارناموں کو دنیا میں شہرت دے۔ اسکی بہترین صورت یہ ہے کہ جو طریقۂ تعلیم ہمارے اسلاف نے ہمیں ودیعت کیا ہے ہم بحیثیت انکے سچے جانشین ہونے کے اسپر کاربند ہوں اور ہماری رعایا ہر وقت اور ہر جگہ عملاً ہماری تائید کرے۔ ما بدولت کی تمنا ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کے فرمان کو عزت کے ساتھ اپنے دل میں جگہ دیں تاکہ ہماری رعایا اخلاق اور کیرکٹر کا بہترین نمونہ ہو۔"

جس وقت اسکول کا ہیڈ ماسٹر (صدر مدرس) اس شاہنشاہی فرمان کو بلند آواز سے پڑھنا شروع کرتا ہے، تو اسکول کے تمام طلبہ تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں اور فرمان کے ہر لفظ کو نہایت غور و توجہ سے سُنتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ جاپان کا کُل نظام تعلیمی اسی فرمانِ شاہی پر منحصر ہے، اور جو کسی قدر تغیر و تبدل کے بعد اب تک جاری ہے۔ اگرچہ جاپان میں طلبہ کی آزادی روزبروز محدود ہوتی جاتی ہے، جسکی شاید یہ بھی وجہ ہو کہ جاپانی نظام تعلیمی میں فوجی عنصر کا دخل بڑھتا جاتا ہے، اور زمانہ کی حالت کو دیکھتے ہوئے اگر جاپانی مدبرین نے دور اندیشی سے کام لیکر فوجی طرز تعلیم کو اپنے یہاں بھی رائج کیا تو کچھ قابل اعتراض نہیں ہے۔

اسکا اندازہ کرنا کسی قدر مشکل ہے کہ جاپان نے امریکن اور یورپین طریقۂ تعلیم کو کہاں تک پسند کیا ہے، لیکن اس قدر ظاہر ہے کہ مغربی اثر سے مرعوب ہو کر جاپانی والدین بھی اب اپنے بچوں کی تعلیم میں رفتہ رفتہ آزادی حاصل کر رہے ہیں۔ اور جیوں جیوں جاپانیوں میں چینی کتابیں پڑھنے کا ذوق زائل ہو رہا ہے، اسی نسبت سے عملی تعلیم حاصل کرنے کا شوق بڑھ رہا ہے، جو جاپان کی ترقی کے لیے فال نیک ہے۔ فقط

انیس احمد۔ عباسی (کاکوردی)

آخری دیدار ہو ارماں یہ ہر بسمل کا ہے
سب اُدھر آئے تڑپ کر منہ جدھر قاتل کا ہے

آج مرجھایا ہُوا ہر زخم میرے دل کا ہے
کس طرف جھلکا ہوا ہے دامن قاتل کا ہے

اُسکی محفل میں چلو جلدی تڑپنے کے لیے
شام ہی سے یہ تقاضا اضطراب دل کا ہے

کیا بگولے سے تسلی قیس کو ہو دشت میں
عشق محمل کا نہیں ہے صاحب محمل کا ہے

کوئی سرگرم عنایت سب پہ تھا میرے سوا
میں جہاں شب بھر جلا یہ ذکر اُس محفل کا ہے

اودے اودے گھٹا دل کو لطف دیتے ہیں بہت
زخم خوردہ تیغ دست نازک قاتل کا ہے

دھوپ میں دوڑا تو لیلےٰ نے یہ چپکے سے کہا
چل اُدھر اے قیس سایہ جسطرف محمل کا ہے

ہاتھ کی سرخی کا کیا کہنا مگر یہ تو بتا
کسکی حسرت کا لہو ہے خوں کس کے دل کا ہے

اے قضا جو ہے نظر آتا ہے وہ حیرت زدہ
کون آیا ہے کہ نقشہ اور ہی محفل کا ہے

آثارِ عبرت

کیا جانے کوئی موت کی لذت کیا ہے
اور رُوح نکلنے کی صعوبت کیا ہے
دنیا والوں سے کچھ کہو تو آخر
اے اہلِ عدم تمھاری حالت کیا ہے

منزل ہے یہ ویران اسے کیا دیکھیں گے
ہاں بعد فنا دَور بقا دیکھیں گے
دنیائے دنی کی ابتدا دیکھ چکے
اب جا کے ہم اُسکی انتہا دیکھیں گے

دیکھا نہ کبھی عدم کا رستا خالی
پایا نہ کبھی دام اجل کا خالی
غافل ہشیار رہ اے عبرت ہے یہ گھر
ہوتی جاتی ہے روز دنیا خالی

معلوم ہے دنیا کی حقیقت کیا ہے
سمجھا کوئی۔ طلسمِ خلقت کیا ہے
چلتی ہوئی سانس پر ہے ہستی کا مدار
پھر موت سے بے خبر۔ یہ غفلت کیا ہے

سب ہو گئے آخر دَمِ آخر رخصت
اور روح بھی ہو گئی بظاہر رخصت
کس یاس سے کہتے ہیں سرِ قبر احباب
اے منزلِ غربت کے مسافر رخصت

قدسی۔ جائسی

جپسی

جپسی سکاٹ لینڈ میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات عام ہے کہ یہ عجیب غریب قسم کے انسان یورپ کے تمام حصص میں ابھی تک اُسی ابتدائی حالت میں ہیں اور وہی زبان بولتے ہیں۔ اور گو وہ اپنے آس پاس کے ترقی یافتہ انسانوں کے بہت سے طور وطریق برتتے ہیں تاہم یہ لوگ اپنی چند خصوصیات کی وجہ سے ایک علٰحدہ قوم شمار کیے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے اُن لوگوں کا ظہور یورپ میں پندرہویں صدی کے آغاز میں ہُوا جبکہ ان لوگوں کے گروہ کے گروہ یورپ کے مختلف حصوں میں داخل ہوئے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو مصری النسل بتاتے تھے اور انکے خط وخال سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ مشرق کے باشندے ہیں۔ ان لوگوں کا بیان یہ تھا کہ ہمیں کو نفس کُشی کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ چند سالوں تک سیاحت میں رہیں۔ ان لوگوں نے یہ عذر غالباً اسلیے اختیار کیا تھا کہ جن ملکوں سے انکا گزر ہو وہاں کے اہل پرست اشخاص انکو تعجب سے دیکھیں۔ بہر کیف انکی صورتیں اور انکے طور وطریق اس بات کی شہادت دیتے تھے کہ وہ کسی مذہبی غرض سے سفر کر رہے ہیں۔

اُنکا لباس اور انکا اسباب وغیرہ تمام کا تمام نہایت بھڑکیلا اور روغنی تھا۔ جو لوگ کسی گروہ کے کپتان یا پیشوا ہوتے تھے، ہمیشہ نہایت ہی شوخ رنگوں کے کپڑے پہنتے تھے جیسے سرخ رنگ یا ہلکا سبز۔ یہ سردار گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے اور ڈیوک یا کاؤنٹ وغیرہ کے خطابوں سے مفتخر ہوتے تھے۔ گروہ کے باقی لوگ شکل وصورت سے بہت ہی ناپاک معلوم ہوتے تھے جو بغیر کسی خیال کے بیماری سے مرے ہوئے جانوروں کا گوشت کھالیتے تھے اور لباس کی بجائے چند پھٹے پُرانے چیتھڑے لگائے ہوتے تھے۔ انکا رنگ بالکل مشرقی اقوام کا سا تھا قریب قریب ہندؤوں کا سا۔

انکے رسم ورواج بھی ایسے ہی خراب تھے جس میں انکی شکل وشباہت کمینہ اور فقیرانہ

معلوم ہوتی تھی - عام طور سے تمام مرد چور ہوتے تھے اور اُنکی عورتوں کا چال چلن ذلیل ترین قسم کا ہوتا تھا - چند ہنر جو اُنھوں نے کامیابی کے ساتھ حاصل کیے وہ معمولی اور سستی کے تھے ان لوگوں نے لوہے کا کام بھی شروع کیا مگر کبھی کسی بڑے پیمانے پر نہیں - ان میں بہت سے لوگ عمدہ شکاری اور عمدہ مغنی تھے - اور مختصراً اُن تمام ہنروں کے کامل، جنکی مشق محض سُستی سے کچھ ہی زیادہ اچھی سمجھی جاتی ہے - اُنکی ذکاوت اور فکر کسی حرفت کی طرف منعطف نہیں ہوتی - معلوم ہوتا ہے کہ دو یا تین خصوصیتوں نے انکو تمام ملکوں میں ممتاز بنا دیا ہے - ان کا یہ بیان کہ ہم ہاتھ دیکھ کر یا نجوم کے ذریعہ سے لوگوں کی قسمتوں کا حال بتا سکتے ہیں - اس بیان سے کبھی تو انکی بڑی عزت ہوتی تھی اور کبھی انپر جادوگر ہونے کا شبہہ کرکے لوگ انکو بھگا دیتے تھے - ایک اُنپر یہ الزام عام تھا کہ یہ لوگ اپنی جماعت کو دوسرے آدمیوں کے بچے چُرا چُرا کر بڑھاتے ہیں - ان باتوں سے یہ ہوا کہ انکا یہ عذر کہ ہم نفس کُشی کے لیے سفر کر رہے ہیں، جو پہلے عام طور پر قبول کر لیا گیا تھا اور جن جن ملکوں سے یہ گزرے تھے وہاں کی حکومتوں نے انکی حفاظت اپنے ذمہ لی تھی، بعد کو بالکل ناقابل قبول قرار دیا گیا اور یہ لوگ سخت بد معاش اور آوارہ گرد شمار کیے جانے لگے - جسکا اثر یہ ہوا کہ ہر مقام سے انکو جلا وطنی کی سزا دیگئی اور جہاں کہیں کہ یہ مقیم بھی رہے وہاں بجائے قانونی حفاظت میں ہونے کے جور و ستم کا نشانہ بنے رہے -

ان لوگوں کے فرانس میں داخل ہونے کا تعجب خیز اور صحیح حال ایک معلم دینیات کے رسالہ میں درج ہے جسکو مشہور عالم پاسکوائر نے شایع کیا ہے اُسکا اقتباس حسب ذیل ہے :-

"۲۷ ر اگست ۱۴۲۷ء کو پیرس میں بارہ مرتاض فقیر داخل ہوئے یعنی ایک ڈیوک ایک ارل اور دس دوسرے آدمی - یہ سب کے سب گھوڑوں پر سوار تھے اور اپنے آپ کو نیک عیسائی بیان کرتے تھے - یہ لوگ مصر زیریں کے باشندے تھے اور انھوں نے بیان کیا کہ تھوڑا عرصہ ہوا کہ ہمارے مُلک کو عیسائیوں نے فتح کر لیا تھا اور ہمکو موت کا خوف دلا کر مذہب

عیسوی قبول کرنے پر مجبور کیا۔ جن لوگوں کو بپتسمہ مل گیا تھا وہ اپنے ملک میں بڑے امیر تھے اور انکا ایک بادشاہ اور ایک ملکہ بھی تھی۔ عیسائیوں کے بعد ہی عربوں نے انکے ملک کو مغلوب کرلیا۔ اور وہاں کے باشندوں کو مجبور کیا کہ وہ مذہب عیسوی کو چھوڑ دیں۔ جب شہنشاہ جرمنی اور شاہِ پولینڈ اور دوسرے عیسائی شاہزادوں نے اس واقعہ کو سُنا تو اُن سب نے وہاں کے باشندوں کو چھوٹے بڑے سب کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنے ملک کو چھوڑ کر پاپائے روم کے حضور میں جائیں۔ چنانچہ یہ لوگ گئے تو پاپائے روم نے انکو بغیر کہیں قیام کیے ہوے سات سال تک دنیا میں سفر کرنے کی ریاضت کا حکم دیا

"انکو سفر کرتے ہوے پانچ سال گزر چکے تھے جب وہ پیرس میں آئے۔ انکے بیان کے مطابق انکے گروہ کے صرف سو یا ایک سو بیس آدمی کل تعداد میں سے جو قریباً ایک ہزار یا بارہ سو کے تھی زندہ تھے۔ باقی لوگ راستہ میں مع اپنے بادشاہ اور ملکہ کے اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ ان لوگوں کو پولیس نے شہر سے تھوڑے فاصلہ پر سینٹ ڈنیس کے گرجا میں ٹھہرایا۔

"قریب قریب ان تمام آدمیوں کے کان چھدے ہوے تھے جنمیں چاندی کی دو دو بالیاں دونوں کانوں میں پڑی ہوئی تھیں جنکی نسبت ان لوگوں نے بیان کیا کہ یہ ہمارے ملک کا ایک مرغوب زیور ہے۔ مردوں کا رنگ سیاہ تھا اور انکے بال گھونگر والے تھے۔ عورتیں اور بھی زیادہ کالی تھیں۔ انکا لباس ایک لانبا بغیر سیا ہُوا کپڑا ہوتا تھا جو کندھوں کے قریب کسی کپڑے یا رسّی سے بندھا ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ ان سے زیادہ غریب اور قابلِ رحم مخلوق ان سے پہلے کبھی فرانس میں نہیں دیکھی گئی تھی۔ انکی عورتیں آدمیوں کے ہاتھ دیکھ کر انکی قسمت کا حال بتلاتی تھیں۔ اور اس طرح ایک باطل طریقہ سے دوسرے آدمیوں کی جیبیں خالی کرکے اپنی جیبیں پُر کرتی تھیں "

پیرس کے بشپ نے ایک پادری لی ینٹیٹ جیکوبن سے کہا کہ وہ اُن تمام مردوں اور عورتوں کے درمیان وعظ کہے جو اپنے مستقبل کا حال دریافت کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ

دکھاتے ہیں تاکہ ایسے تمام لوگ ان سے قطع تعلق کریں۔ ماہ ستمبر میں یہ لوگ پان ٹوائز کی طرف مراجعت کرگئے۔

پاسکوائر اس رسالہ کے بیان پر یہ ریمارک کرتا ہے کہ ان لوگوں نے ریاضت کا بہانہ کیا تھا اور یہ لوگ کھلے بندوں اور مجسٹریٹوں کے علم سے قریب ایک صدی تک فرانس میں گشت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۵۶۱ء میں انکو جلا وطنی کی سزا دیگئی۔

ان مصریوں کے یورپ کے مختلف حصوں میں داخل ہونے کا وہی زمانہ ہے جو تیمور کے ہندوستان پر فوجکشی کرنے کا، جو ہندوستانیوں کو مسلمان ہونے یا قتل کیے جانے پر مجبور کرتا تھا۔ اس بات کے یقین کرنے میں (بموجب تحریر عالم پاسکوائر) بہت کم تنک ہوسکتا ہے کہ۔ لوگ ہندوستان کے قبائل سے تعلق رکھتے ہیں جو مسلمانوں کے جور و ستم سے تنگ آکر بغیر اسکے معلوم کیے ہوے کہ وہ کس طرف کو جارہے ہیں، ملک سے فرار کرگئے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ اب یہ لوگ یورپینوں سے بہت زیادہ میل کھاگئے ہیں اور انکے رسم و رواج کو برتتے ہیں تاہم انکی عادتیں مفقود نہیں ہوئی ہیں۔

اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب یہ لوگ آپس میں ملتے ہیں تو اپنی ہی زبان بولتے ہیں جو دیگر اشخاص کے لیے بمنزلۂ راز کے ہے۔ اس میں بہت کم شک ہوسکتا ہے کہ یہ زبان ہندوستانی قسم کی زبانوں میں سے ایک ہے جیسا کہ گرل مین، ہوئے لینڈ اور دوسرے مصنفوں کے نمونوں سے جنھوں نے اس مبحث پر کتابیں لکھی ہیں، معلوم ہوتا ہے۔

اب ان میں سے بہت سے اشخاص کی زندگیوں میں عظیم الشان تغیر شروع ہوگیا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ مہذب سوسائٹیوں میں نشست و برخاست رکھتے ہیں اور انکا چال چلن نہایت ہی شریفانہ ہے۔

محمد ابراہیم خاں تجلی

سندیلہ کا سالانہ مشاعرہ

جس پیمانہ پر ہوتا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ بیشتر اربابِ کمال جو اپنی معجز بیانی سے ملک میں کافی شہرت رکھتے ہیں، اس بزم ادب کی زینت ہوتے ہیں۔ صاحبِ مشاعرہ جناب سید التفات رسول صاحب ہاشمی تعلقدار سندیلہ ان معزز مہمانوں کی خاطر و تواضع میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے۔ اب کے سال بھی ۱۴؍جون سنہ ۱۵ء کو حسب معمول یہ ادبی جلسہ منعقد ہوا، اور ایک شبانہ روز برابر صحبتِ مشاعرہ گرم رہی۔ تمام شعرانے اپنی سخن وری کے جوہر خوب خوب دکھائے۔ مصرعہ طرح یہ تھا۔ ادھر پھٹنا گریباں اُس طرف بیدادگر ہونا

ذیل میں دو غزلیں جو اس مشاعرہ میں پڑھی گئی تھیں درج کی جاتی ہیں جن میں سے ایک ہمارے جدید اسسٹنٹ حضرت صفدر مرزاپوری کی ہے جو شرکت مشاعرہ کے لیے خاص طور پر یہاں سے گئے تھے۔ اور دوسری جناب انجم کی جو لکھنؤ کے کہنہ مشق اور ممتاز سخنور ہیں۔ ایڈیٹر

از حضرت انجم نیشاپوری یادگار جناب اسیر مرحوم

مجھے منظور تیرا اور بھی بیدادگر ہونا — انھیں ہاتھوں پہ ہے میری دعاؤں کا اثر ہونا
ابھی سے گردنیں اللہ اکبر سیکڑوں خم ہیں — مبارک تیغ کو پہلے پہل زیبِ کمر ہونا
تجھے کیا عاشقوں پر مشق سفاکی کی حاجت ہے — جگر پر خط لگاتا ہے ترا نازک کمر ہونا
جگہ گلزار ہے ہم رہ گئے کوچہ میں قاتل کے — یہ جنت ہے یہاں سے اب نہیں ممکن سفر ہونا
چلو یوں ہی سہی مرتے ہیں اپنی موت سے عاشق — تمھارے سن پہ کھپتا بھی نہیں بیدادگر ہونا
ہماری بھی یہ عادت ہے کہ چھیڑے جائیں گے تم کو — جو شیوہ ہے تمھارا عاشقوں سے بے خبر ہونا
سدھارو تم، مجھے کیوں روکتے ہو زہر کھانے سے — تمھیں کیا ڈر ہے تم پچھلے پہر سے اپنے گھر ہونا

ہلالِ عید کیا جلدی چھپا ہے آج شرما کر — یہ حسنِ اتفاق اُس مہر کا بھی بام پر ہونا
لفافہ پر بنا دوں دیدہ ہائے منتظر قاصد — مجھے منظور ہے آنکھوں سے تیرا ہمسفر ہونا
کبھی غیروں کی تیغوں میں مرے آڑے نہ آیا تُو — جوانی لاکھ سکھلاتی رہی سینہ سپر ہونا
یہ چکر کچھ ہمیں جلدی پتا دیتا ہے منزل کا — کبھی تھک کر ٹھہر جانے میں بھی دَورانِ سر ہونا
یہ کیا اے آہ وہ روتے ہوئے آئے ہیں تربت پر — خدا کی مار چاہا ہو اگر اتنا اثر ہوتا

شرارِ آہ سے انجم اسے ہم بھی جلائیں گے
جو عادت ہے فلک کی دشمنِ اہلِ ہنر ہونا

از جناب صفدر مرزاپوری

گیا اب آفتابِ حشر کا بھی جلوہ گر ہونا — شبِ فرقت ہماری ہے یہ کیا جانے سحر ہونا
وہاں جا کر مرے نالوں کا یارب بے اثر ہونا — قیامت تھا کسی کا رات کو دشمن کے گھر ہونا
دلِ بیمار کا جانا نہ تھا کم موت سے مجھکو — پھر اُسکے ساتھ جانِ ناتواں کا ہمسفر ہونا
ہزاروں نشتر پیوست ہوں جسکی رگِ جاں میں — اُسے دشوار ہے مرہونِ سعیِ چارہ گر ہونا
بہت ہی عبرت انگیز اور حسرت خیز منظر ہے — لحد پر ایک بیکس کی کسی کا نوحہ گر ہونا
یہ کیا کم ہے ملی قیدِ قفس سے مجکو آزادی — مرے کام آگیا آخر مرا بے بال و پر ہونا
خیالِ اک نازنیں کا دل میں پھر رہ رہ کے آتا ہے — ذرا سینہ میں اب تھم تھم کے اے دردِ جگر ہونا
رہی کب شام سے تا صبح روشن میری تربت پر — میسر کب ہوا ہے شمع کو شمعِ سحر ہونا
یہ سب گھاتیں تمہاری نوجوانی نے بتائی ہیں — مرے ہاتھوں نے سیکھا حلقۂ طوقِ کمر ہونا
بہت اچھے ہیں جن پر ظلم ہوتے ہیں حسینوں کے — اسی کو اہلِ دل کہتے ہیں منظورِ نظر ہونا"
سرِ محفل مرا لینا بلائیں چاند سے مُنھ کی — اُدھر اُڑ اُڑ کے پروانوں کا صدقے شمع پر ہونا

ارے او خشک زاہد حوضِ مے ہو جائینگے خالی
کوئی آساں ہے اے صفدر ترے دامن کا تر ہونا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۴ جلد ۱۳ — یکم اگست سنہ ۱۹۱۵ء

قوت باہ کی گولیاں

جیسا نام ویسا کام

ڈاکٹر برمن کی تیار کردہ قوت کی گولیاں ۳۰ سال سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو رہی ہیں۔ طاقت دینے والی مشہور دوائیں فاسفورس۔ اسکنا ڈ انٹا ملا کر یہ گولیاں بنی ہیں مغز ریڑھ۔ رگ اور خون کو طاقت دینے کا دعوے رکھتی ہیں زیادہ محنت۔ جوانی کی خرابی اور بے اعتدالی خواہ کسی وجہ سے ہو۔ منی پتلی ہو گئی۔ ان گولیوں کے استعمال کے اول روز سے فائدہ ظہور ہو جاتا ہے ان میں قوت اور مزاج میں گرمی معلوم ہونے لگتی ہے۔ چہرہ رونق اور جوانی اور ضعیفی کی حالت سے ٹوٹے ہوئے جسم میں دوبارہ جوش لاتی ہے

۳۰ گولیوں کی شیشی دو ہفتے کی خوراک کا ایک روپیہ

محصولڈاک ایک سے چار شیشی تک ۵/

امتحاناً نمونہ کی گولیاں مفت دیجاتی ہیں

امتحان کے اول ہی روز سے اپنا فائدہ دکھاتی ہیں۔ ضرور امتحان کیجیے۔ اگر آپ بلا قیمت انکی آزمایش کرنا چاہیں تو صرف محصولڈاک کے لیے دو پیسہ کا ٹکٹ بند لفافہ میں بھیجیے۔ اور اُس لفافہ میں دس شریف آدمیوں کے نام معہ صاف پتہ روانہ فرمائیں۔

کولا ٹانک

ہر ایک کے لیے طاقت بڑھانے کی دوا

کولا طاقت کو بڑھاتا ہے زیادہ فکر کی وجہ سے یا محنت غم۔ بیماری تبدیلی آب و ہوا کی وجہ سے بدن کمزور ہو گیا ہو تو کولا استعمال کرو اس سے طاقت پیدا ہوتی ہے کولا بدن کو بڑھاتا ہے۔ گھوڑے کی سواری۔ پہاڑ کی چڑھائی۔ ورزش۔ کشتی۔ ناچ گانا۔ پڑھنا پڑھانا اور دیگر دماغی کاموں میں پہلے کولا پیو۔ دم جلدی نہیں پھولے گا ہول دل۔ دھڑکن۔ کلیجہ کی کمزوری کو فائدہ کرتا ہے اگر کام یا کسی وجہ سے رات کو جاگنا ہو تو کولا پیو اس سے حرارت نہیں رہے گی۔ کولا شراب کو چھڑاتا ہے اگر زیادہ شراب پی ہو تو ایک یا دو خوراک کولا پی جاؤ اچھی نیند آ جائے گی۔ تھوڑے دن کی استعمال سے شراب سے نفرت ہو جاتی ہے۔ کولا کے سہارے افیون چھوٹتی ہے کولا کھاؤ افیون کی مقدار کم کرو۔ تھوڑے دن میں بغیر کسی تکلیف کے افیون چھوٹ جائے گی۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ

محصول ڈاک ۵/

کلوروڈائن

یہ انگریزوں کی خانگی دوا ہے۔ ریاحی درد۔ مروڑ۔ خواہ کسی صورت سے ہو۔ اس کی ایک دو خوراک سے جاتی ہے۔ آؤں۔ دست اور ہیضہ کے لیے نہایت مفید ہے۔ ڈاکٹر برمن نے انگلینڈ کے ایک نامی دواخانہ سے منگوایا ہے اور دیگر قیمتی کلوروڈائنوں سے بہتر ہے اسلیے بازاری کلوروڈائن نہ خرید کرکے اس کلوروڈائن کو خریدیں

قیمت ۲/ اور ایک درجن کا چار روپیہ

محصول ڈاک ۵/

داد کا مرہم

کھجلانے سے آرام کرنا بہتر ہے

اس کے لگانے سے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی ایک مرتبہ لگانے سے کھجلی اچھی ہو جاتی ہے اور دو تین مرتبہ کے استعمال سے ایکدم جاتا رہتا ہے۔ جب کسی دوا سے فائدہ نہیں ہو تو اسکو بھی ایک بار آزما دیکھیے جناب مہاراجہ کمار سرمان وشیشور سنگھ رست نگر پورہ ضلع بھاگلپور سے لکھتے ہیں یہ دوسرا موقع ہے کہ آپ کے داد کے مرہم نے جادو کا اثر دکھایا جس سے سخت تر تکلیف پریشانی سے نجات پائی میں آپکا تہ دل سے مشکور ہوں۔ قیمت فی ڈبیہ ۲/ محصول ایک سے ۲ تک ۵/

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تارا چند دت اسٹریٹ۔ کلکتہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

النّاظر

نمبر ۴۷ جلد ۱۲ یکم اگست ۱۹۱۵ء

علم المعیشت

مشفقی و کرمی دام الطافکم السّلام علیکم

علم الاقتصاد پر جو کتاب لکھنے کا میں نے سال گزشتہ وعدہ کیا تھا اُسکا ابتدائی حصہ نمونۃً برائے اشاعت مرسلِ خدمت ہے۔ لکھنے میں جو اصول پیشِ نظر رکھا گیا ہے اُسکو یہاں پر مختصراً عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

علوم جدیدہ پر اُردو کتابیں لکھنے کے متعلق ہمیشہ سے میرا یہ خیال ہے کہ اگر ہم صرف ترجمہ کرنے کے بجائے علوم پر کامل دستگاہ حاصل کرکے بطور خود کتابیں لکھیں تو ہماری کوشش یقیناً زیادہ بارآور ثابت ہوگی اور نتائج ضرور خاطرخواہ نکلیں گے۔ ایسی کتابیں لکھنے میں یہ لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ انکے پڑھنے والے اکثر مضمون سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اگرچہ تمام ترقی یافتہ ممالک میں جہاں علوم کے متعلق زبان کے صحیح مصرف سے لوگ واقف ہیں بالعموم سادگی وسلاست کو دقّت ورنگینیِ عبارت پر روز افزوں ترجیح حاصل ہو رہی ہے۔ لیکن بالخصوص ابتدائی کتابوں میں غیرمانوس طبیعتوں کی دلبستگی کے واسطے انکا التزام لابد ہے۔ چونکہ میرا مقصد سردست اُردو داں اصحاب کے واسطے ایک نئے علم پر کتاب لکھنا ہے۔ اس لیے حتی الوسع صفائی اور سلاست بیان کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ایک مبتدی بھی دلچسپی سے اسکا مطالعہ کرکے مستفید ہوسکے۔

جو حضرات زبانِ اُردو کے حامی ہیں اور جنکو اس علم سے واقفیت اور دلچسپی ہے اُنکے واسطے اسکا

صحیح نام قرار دینا ایک قابل توجہ مسئلہ ہے۔ کیونکہ ابھی تک یہ علم زبانِ اُردو میں تقریباً مفقود ہے۔ وہ غیر صحیح اصطلاحات بھی جو اخباری مضامین کے ذریعہ سے رائج ہو چلی ہیں ابھی ترک کیجا سکتی ہیں۔ البتہ کچھ دنوں بعد اُنکا بدلنا دشوار ہوگا۔ گو عموماً لفظ اقتصاد مروج اور مشہور ہے لیکن میں نے اسکا نام علم المعیشت تجویز کیا ہے اور اسکے انتخاب کے وجوہ دکھانے کی بھی کوشش کی ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ والسّلام

خاکسار۔ محمّد الیاس برنی

علم المعیشت

المعروف بہ

علم الاقتصاد

مقدمہ

[تجزیہ] ۱۔ قدرت اور ضروریات کی کفالت۔ ۲۔ قدرت پرورشِ انسانی کی افزونی اور اُسکی وسعت۔ ۳۔ ہندوستان کی بے اتفاقی اور محرومی۔ ۴۔ اصطلاح افادہ۔ ۵۔ اصطلاح استبدال۔ ۶۔ دولت کی تعریف۔ ۷۔ دولت کے اقسام۔ ۸۔ دولت کی مختلف شکلیں۔ ۹۔ قابلیت اور خدمت کا فرق۔ ۱۰۔ استبدال اور انتقال کا تعلق۔ ۱۱۔ ایجادات کا تعلق بالا پیداوار۔ ۱۲۔ دولتِ مجموعی کا تخمینہ۔ ۱۳۔ اصطلاحِ جد و جہد اقتصادی۔ ۱۴۔ علم الاقتصاد کی تعریف۔ ۱۵۔ اقتصاد میں تقسیم مباحث۔ ۱۶۔ اقتصاد اور دیگر علوم متجانسہ۔ ۱۷۔ علم الاقتصاد کی نوعیت۔ ۱۸۔ لفظ اکانمی کی تحقیق۔ ۱۹۔ اقتصاد کی مختصر تاریخ۔ ۲۰۔ اس علم کا اُردو نام۔ ۲۱۔ اقتصاد کی اہمیت اور اُسکا مستقبل۔

۱۔ قدرت اور ضروریات کی کفالت | اللہ جل شانہٗ جیسے خالقِ اکبر اور حکیم مطلق نے کوئی چیز فضول اور بے کار

پیدا نہیں کی۔ خواہ ہم واقف ہوں یا نہ ہوں یقیناً ہر ایک چیز کسی نہ کسی کام آسکتی ہے اور ہر ایک کام کسی نہ کسی چیز سے نکل سکتا ہے۔ اکثر چیزوں میں ایسے خواص ضرور موجود ہیں جنکی وجہ سے وہ براہ راست یا بالواسطہ۔ بحالتِ قدرتی یا مصنوعی۔ ہمارے واسطے مفید اور کارآمد ہوسکتی ہیں۔ تحقیق اور تجربہ سے آئے دن نئی نئی چیزیں اور چیزوں کے عجیب و غریب خواص دریافت ہوتے رہتے ہیں۔ ہیرے سے کہیں زیادہ سخت اور سونے سے بہت زیادہ قیمتی ریڈیم جیسی چیز پائی گئی ہے۔ جس سے وہ کام لیے جاتے ہیں جو کبھی ناممکن خیال کیے جاتے تھے۔ یہی بجلی کہ جسنے ہزارہا سال تک بے شمار جان و مال کو جلا جلا کر خاک کرنے کے سوائے انسان کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کی۔ اور جو اسی وجہ سے غضب الٰہی کا نمونہ بنی رہی۔ اب ہماری اسقدر مطیع اور خدمتگزار ہوگئی ہے کہ ہمارے ہر کام کے واسطے کمربستہ نظر آتی ہے۔ گرمیوں میں ہمارے پنکھا جھلتی ہے جاڑوں میں ہمارا حمام گرم کرتی ہے۔ ہمارا مکان روشن کرتی ہے۔ چشم زدن میں ہوا سے بھی جلد خبریں لاتی اور سارے عالم میں پہنچاتی ہے۔ کبھی کرۂ ہوا میں کبھی سطح زمین پر اور کبھی سمندر کی تہ میں ہماری سواری کا کام دیتی ہے۔ اور فرصت کے وقت اپنے حیرت انگیز کھیل تماشوں سے ہمارا دل بہلاتی ہے۔ اب ہم اسکی کڑک اور چمک کی دھمکیوں میں بھی نہیں آتے۔ کیونکہ اسکی قدیم ظالمانہ عادت چھڑا دی گئی ہے۔ وہ اب نقصان رسانی کی جرأت نہیں کرسکتی۔ ہمنے اسکے واسطے ایسی سیڑھی بنا دی ہے جسکے ذریعہ سے وہ اگر چاہے تو بآسانی زمین پر اُتر سکتی ہے۔ اسکو اوپر سے گرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اس عنایت کے شکریہ میں اُس نے قدیم تندخوئی اور مضرت رسانی چھوڑ دی۔ جب چاہتی ہے زمین پر اس طرح اُتر آتی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی۔ آگ اور پانی جو ہزارہا سال تک نہایت ادنیٰ کاموں میں لگے رہے اب طلسم و سحر سے بڑھکر اپنے عجیب و غریب کرشمے دکھا رہے ہیں۔ لق و دق میدان ہوں یا طوفان خیز سمندر برفستان ہوں یا ریگستان۔ سربفلک پہاڑ ہوں یا گہری گہری کھائیاں۔ غرضکہ تمام روئے زمین پر گرم و تر ہوا یعنی بھاپ کی طاقت شب و روز کروڑہا من سامان اور لاکھوں انسانوں کو شل کے بگولے

اُڑائے اُڑائے پھرتی ہے۔ سفر تو ایسا آسان اور مختصر ہو گیا ہے کہ گویا زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں سوئی سے لیکر عالیشان محلات۔ پُلوں۔ سرنگوں اور فلک نما جہازوں تک کون سی چیز ہے جسکے بنانے میں وہ حصہ نہیں لیتی۔ کھانے پینے سے لیکر کوہ کنی۔ ریل کشی اور جہازرانی تک وہ کونسا کام ہے جس میں وہ ہمارا ہاتھ نہیں بٹاتی۔ لوہے۔ لکڑی بلکہ مٹی کی سونے سے زیادہ قیمتی چیزیں بنتی ہیں۔ پھٹے پُرانے چیتھڑوں۔ روئی کی کاتنی۔ سن کی گُھٹی۔ ایکھ کی چھونچھ اور درخت کی چھالوں سے جن کی ہمارے ہاں کچھ بھی قدر نہیں۔ ایسے ایسے نفیس کاغذ تیار ہوتے ہیں جن پر بیش بہا کتابیں چھپتی ہیں اور عالیشان دفتروں کی الماریوں کو زینت بخشتی ہیں۔ کوئلہ کی راکھ سے کیسے خوشنما رنگ نکالے جاتے ہیں۔ گلی کوچوں کی خاک سے کیسے ہلکے۔ دیرپا اور خوشنما المنیم کے برتن بنتے ہیں۔ حتیٰ کہ فضلاتِ حیوانی بھی جن سے ہر شخص کو طبعی نفرت ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں اس طور پر کام میں لائے جاتے ہیں کہ لاکھوں روپے کا منافع حاصل ہوتا ہے۔ غرضکہ سائنس کی جدید تحقیقات اور صنعت و حرفت کی موجودہ ترقیات کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان خدا داد نعمتوں سے روز افزوں فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ جو چیزیں وہم و گمان میں بھی نہیں گزرتی تھیں وہ ہماری ناگزیر ضروریات میں داخل ہیں۔ معمولی چیزیں نہایت بیش بہا اور نفع رساں ہوتی جاتی اور ردی سے ردی چیزیں کم و بیش مفید اور کارآمد بنتی جاتی ہیں۔

۲۔ قدرت پر دسترس انسانی کی افزونی اور اُسکی وسعت

لیکن موجودہ ترقیات کے بھروسہ پر یہ اُمید کرنا بیجا نہیں کہ ہم قدرت کے تمام خزانوں پر کبھی قابض ہو سکیں گے کیونکہ قدرت کی لاتعداد نعمتوں کے مقابلہ میں ہماری ہزارہا سال کی تحقیق اور تجسس کا سرمایہ سمندر کے ایک قطرہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اسوقت نباتات میں چودہ لاکھ انواع کا تو پتہ لگ چکا ہے اور خدا جانے کتنی بے شمار انواع اور ہیں جو معلوم نہیں۔ مگر ہم اب تک تین سو سے زیادہ کو کام میں نہیں لا سکے ہیں۔ حیوانات کی بیشمار قسموں سے صرف تقریباً دو سو ایسی ہیں جو ہمارے کام آرہی ہیں۔ اور جمادات پر تو ہماری دسترس اس سے بھی زیادہ محدود ہے۔ پھر ہم کیسے ایک دن ساری خدائی

کے مالک بننے کی اُمید کر سکتے ہیں۔ البتہ ترقیِ علوم کے ساتھ نسبتاً ہماری دسترس ضرور بڑھتی جائیگی لیکن وہ ایک خاص حد سے تجاوز نہیں کر سکتی۔

۳۔ ہندوستان کی بے اتفاقی اور محرومی

قدرت نے سب ملکوں میں اپنی نعمتیں یکساں تقسیم نہیں کیں نہ سب ملک یکساں زرخیز ہیں نہ سب میں قیمتی معدنیات پائے جاتے ہیں نہ سب کی آب و ہوا اور قدرتی وسائل صنعت و حرفت کی ترقی کے واسطے یکساں موزوں ہیں۔ لیکن تھوڑی سی تحقیق سے ظاہر ہوگا کہ بحیثیتِ مجموعی قدرت نے ہندوستان کو دُنیا کے کسی مُلک سے کم حصہ نہیں دیا بلکہ اکثر سے بہت زیادہ۔ گر وہ اپنی خداداد نعمتوں سے بمقابلہ دیگر مہذب ممالک کے بہت کم مستفید ہو رہا ہے۔ نہ اسکو اپنی نعمتوں کا پورا علم ہے نہ اُن سے مستفید ہونے کے اُسکے پاس کافی وسائل ہیں۔ باوجود اسکے ہندوستان دُنیا کے تخت پر سونے کا ٹکڑا اور تاجِ برطانیہ کا سب سے قیمتی جگمگاتا ہیرا مانا جاتا ہے۔ اور اسی سے قدرتی نعمتوں کی کثرت ثابت ہوتی ہے۔ کاش اگر وہ اس طرح پر لاچار نہ ہوتا اور اپنی کوشش سے عطیاتِ قدرت کی قدر کر سکتا۔ تو خدا جانے ممالکِ عالم میں آج اسکا کیا رُتبہ ہوتا۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ ایسا زرخیز مُلک۔ اور وہ شکر جیسی ضروری چیز کے واسطے جرمنی اور آسٹریا کا محتاج ہو جو گھاس اور پتوں اور غلہ تک سے شکر نکالتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ شکر یہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ ہزارہا من شکر قند پیدا ہوتی ہے۔ جو سوائے کھانے کے کسی کام نہیں آتی۔ ریاستِ حیدرآباد میں شریفہ کے کیسے کیسے وسیع جنگل موجود ہیں۔ اور شریفہ بھی کیا گویا مصری کا کوزہ کہ دُس سے چٹکیوں شیرہ ٹپکے۔ مگر کسے توجہ ہے جو اس خداداد شکر کو نکلوائے۔ کچھ لوگ تو جنگلوں سے مفت چھکڑے بھر بھر کر فروخت کرنے کے لیے شہر میں لے آتے ہیں۔ اور ہر سال ہزارہا من جنگلوں ہی میں گل کر خاک ہو جاتے ہونگے۔ یہ گنگا جمنا کی چاندی جیسی سفید ریتی! اگر کوئی خدا کا بندہ اس میں لوچ پیدا کر کے چینی کے برتن بنا سکے تو اسی ریتی پر گنگا جمنی چاندی سونے دریا بہنے لگیں۔ رنگ جیسی چیز میں ہمارا ملک جرمنی کا ایسا محتاج ہے کہ جب سے جنگ چھڑی ہے۔ بہ وجہ بندشِ درآمد اُسکی قیمت دس گُنی ہو گئی ہے

حالانکہ کُسُم - ہارسنگھار - ہلدی - اودی گاجر - پتنگ - آل - بد قسمت نیل - اور ایسی بہت سی چیزیں مہیا ہوسکتی ہیں جن سے ہر قسم کا عمدہ رنگ تیار ہوسکے - غرضکہ بہت سی خداداد نعمتیں جنکی ہمکو اشد ضرورت ہے، ہمارے قدموں کے نیچے پامال ہو رہی ہیں اور اُنکا کوئی پُرسانِ حال نہیں - البتہ کچھ عرصہ سے ہندوستان بھر میں ریاستِ میسور اقتصادی معاملات میں قابلِ فخر و مبارکباد بیداری اور مستعدی کا اظہار کر رہی ہے - حال ہی میں وہاں ایک اقتصادی کانفرنس بھی قائم ہوئی ہے جسکا مقصد واحد ریاست کی صنعت و حرفت کو زندہ کرنے اور اُسکو بدرجۂ اعلیٰ ترقی دینے کی باقاعدہ کوشش کرنا ہے - یہ کانفرنس نہایت سرگرمی سے اپنے حصول مقصد میں مصروف ہے - اور عنقریب تمام ہندوستان کے واسطے قابلِ تقلید نمونہ بنجائے گی - خلافِ انصاف ہوگا اگر یہ نہ مان لیا جائے کہ ہندوستان کی اس بے اتفاقی اور کس مپرسی کا باعث ہندوستانیوں کی کاہلی اور غفلت کے علاوہ اور بھی چند زبردست غیر اختیاری اسباب ہیں - جن سے ہم آیندہ مناسب موقع پر انشاء اللہ تعالیٰ بالتفصیل بحث کریں گے -

۴ - اصطلاحِ افادہ | جب ہم کسی چیز کو مفید اور کارآمد کہتے ہیں تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ وہ ہمکو آرام پہنچاتی ہے یا ہماری تکلیف رفع کرتی ہے - یا بالاختصار، اُس سے ہماری ضرورت پوری ہوتی ہے - یہ جاننا ضروری ہے کہ اقتصادیئے لفظ ضرورت کو نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے - ہم کو اس سے بحث نہیں کہ وہ ضرورت حقیقی ہے یا فرضی - دائمی ہے یا عارضی - قدرتی ہے یا رسمی - طبعی ہے یا غیر طبعی - قوی ہے یا ضعیف - اختیاری ہے یا غیر اختیاری - جائز ہے یا ناجائز - بھلی ہے یا بُری - ضرورت کسی قسم کی بھی ہو - اُسکا لحاظ کیا جائیگا - اور جو چیز اُسکو پورا کریگی وہ مفید سمجھی جائیگی - مثلاً پانی پیاس بجھاتا ہے - آگ گرمی اور روشنی پہنچاتی ہے - چھتری دھوپ اور بارش کی تکلیف سے بچاتی ہے - عمدہ لباس اور زیور خود نمائی کی خواہش پوری کرتے ہیں پھولوں کی مہک اور باجوں کے سُریلے راگ دماغ کو فرحت اور دل کو سُرور بخشتے ہیں - قدیم کرم خوردہ کتابیں - زنگ آلودہ سکے - بدرنگ تصویریں - ٹوٹے پھوٹے برتن محققین آثار قدیمہ کے نزدیک بیحد

قیمتی ہوتے ہیں۔ دوا ازالۂ مرض کرتی ہے۔ اور شراب جیسی مخربِ صحت چیز سے بھی شرابی کو ایک خاص لذت حاصل ہوتی ہے۔ اور چونکہ مذکورۂ بالا چیزیں ایک نہ ایک ضرورت پوری کرتی ہیں۔ اقتصادکے نزدیک یہ سب مفید ہیں۔ اور ضرورت پورا کرنے کی صلاحیت جو ان سب میں پائی جاتی ہے اصطلاحاً **افادہ** کہلاتی ہے۔ اس صفت یعنی افادہ کی اہمیت آگے چل کر **دولت** کے بیان میں ظاہر ہوگی۔

۵۔ اصطلاح استبدال یہاں تک ہمنے چیزوں کا مفید ہونا ظاہر کیا۔ اب ہم اُنپر ایک دوسری حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں۔ چند چیزیں تو ایسی ہیں کہ ہم اُنکا کسی دوسری چیز سے مبادلہ کرہی نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ ہمارے قبضہ اور تصرف سے باہر ہیں۔ مثلاً چاند۔ سورج۔ ہوا۔ سمندر اور بعض چیزوں کے مبادلہ کو ہم فضول سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ بکثرت دستیاب ہوتی ہیں اور کسی کی ملک خاص نہیں۔ مثلاً لب دریا پانی۔ خودرو جنگلوں کے پھل پھول اور لکڑی۔ اور بہت سی چیزوں کا مبادلہ ہم کر بھی سکتے ہیں اور ایسا کرنا مفید اور ضروری بھی سمجھتے ہیں۔ مثلاً غلہ کپڑا گھوڑا۔ مکان۔ اور ہر قسم کی اشیاے منقولہ وغیرمنقولہ۔ آخری قسم کی چیزوں سے اقتصاد کو خاص تعلق ہے اور ہم اُن خصوصیات کو جنکی وجہ سے انکا تبادلہ مفید اور ضروری سمجھا جاتا ہے مختصراً بیان کرنا چاہتے ہیں۔ افادہ کے اصطلاحی معنی اوپر بیان ہوچکے ہیں۔ یہاں مبادلہ سے اُسکا تعلق بتانا ضروری ہے۔ افادہ کے واسطے تو مبادلہ شرط نہیں۔ مثلاً چاند۔ سورج۔ ہوا میں افادہ موجود ہے مگر انکا مبادلہ ممکن نہیں۔ لیکن مبادلہ کے واسطے افادہ لازمی ہے۔ کیونکہ اگر اشیاے تبدلہ سے فریقین کی ضروریات ہی رفع نہ ہوسکیں گی تو پھر اُنکے مبادلہ کی تکلیف کوئی خواہ مخواہ کیوں گوارا کریگا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کارآمد چیزوں ہی کا لین دین ہوسکتا ہے۔ ردی اور نکمی چیزوں کا مبادلہ کون کرتا ہے۔ اسی واقعہ کو اصطلاحی زبان میں یوں کہیں گے کہ مبادلہ کے واسطے افادہ لازمی ہے۔

یہاں پر یہ نکتہ سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ کسی چیز میں محض مفاد کا وجود مبادلہ کے واسطے

کافی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اُس مفاد کا انسان کو علم ہو اور اُسپر دسترس بھی ہو۔ مثلاً جب تک کہ مشہور دوا کُنَین کے خواص معلوم نہیں ہوے تھے۔ وہ محض نکمی چیز سمجھی جاتی تھی۔ کوئی اسکا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ اور نہ اسوقت کوئی اسکا مبادلہ کر سکتا تھا۔ حالانکہ فی نفسہ اسمیں وہ افادہ اُسوقت بھی موجود تھا۔ جسکے دریافت ہونے پر وہ قابلِ مبادلہ ہوگئی۔ اسی طرح پر وہ چاندی۔ سونا۔ جو نہایت ہی گہری کانوں میں دبا پڑا ہے ہمارے نزدیک ایسا ہی ہیکار ہے جیسے مریخ کی خیالی دولت۔ گو ایسے چاندی، سونے میں مفاد موجود ہے مگر ہماری دسترس سے باہر ہونے کی وجہ سے وہ ہمارے نزدیک مٹی کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ نکمے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ انکا مبادلہ ممکن نہیں۔ پس مبادلہ کے ساتھ افادہ میں یہ دو شرطیں پوری ہونی لازمی ہیں۔

مبادلہ کے واسطے علاوہ افادہ کے اور دو شرطیں بھی ضروری ہیں۔ یعنی کم از کم مابین فریقین تعینِ مقدار۔ اور تملیکِ کُلی ہو۔ اور یہ دونوں شرائط خود بھی ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ کیونکہ تملیکِ کُلی۔ تعینِ مقدار پر منحصر ہے۔ کسی چیز کا غیر متعین مقدار میں دستیاب ہونا ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی خاص شخص کی ملک نہیں۔ اور ہر کسی کو بلا تعرض دیگرے میسر ہو سکتی ہے۔ گنگا کے کنارے نہ پانی کی کمی، نہ وہ کسی کی ملک۔ جو جتنا چاہے پانی بہائے۔ پیے۔ اور گھر لیجائے۔ مبادلہ کی ضرورت ہی نہیں۔ مگر دُور دراُفتادہ مقامات میں خوش اعتقاد ہندو دل کھول کر گنگا جلی کی قیمت اس وجہ سے دیتے ہیں کہ وہاں گنگا تو بہتی نہیں۔ صرف اتنا ہی تھوڑا سا پانی جو بیچنے والے کے پاس ہے۔ دستیاب ہو سکتا ہے۔ لہذا بوجہ تعینِ مقدار اور تملیکِ کُلی کے گنگا جلی قابلِ مبادلہ ہو جاتی ہے۔ تحقیق طور پر سُنا ہے کہ سیب۔ انار۔ اور انگور جیسے قیمتی میوے افغانستان میں اس قدر کثرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ جو چاہے ہر روز بلا قیمت گرد و نواح کے درختوں سے جی بھر کر کھا سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ چونکہ کثرتِ پیداوار کے سبب سے ان میں تعینِ مقدار اور تملیک کلی کی صفت کم پائی جاتی ہے انکا مبادلہ بھی کم ہوتا ہے۔ بڑے بڑے جنگلوں میں لکڑی کی

کوئی قیمت نہیں لی جاتی۔ یہ ایک عام اصول ہے کہ کسی شے میں مذکورۂ بالا ہر دو صفات کی کمی یا زیادتی کی نسبت سے مبادلہ کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ اسی اقتصادی اصول کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

مذکورۂ بالا تیسری قسم کی چیزوں کی یہ صفت کہ انکا مبادلہ ممکن بھی ہو اور ضروری بھی سمجھا جائے۔ اور جسکی ماہیت کو ابھی سمجھا چکے ہیں۔ اصطلاحاً **استبدال** کہلاتی ہے۔

۶۔ دولت کی تعریف | **دولت** کا مفہوم ان چند مسئلوں میں سے ہے کہ جن پر اقتصاد میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر اب تک کوئی قطعی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ بہت سی چیزیں ہیں کہ جن کے دولت شمار کرنے نہ کرنے پر اب تک اختلافِ رائے موجود ہے۔ لیکن اس اصطلاح کے بہترین معنے کینس صاحب نے بیان کیے ہیں جنکے نزدیک **دولت** میں وہ تمام چیزیں اور صرف وہی چیزیں شامل ہیں جن میں افادہ اور استبدال کی دونوں صفتیں موجود ہوں۔ دولت کی اس قدر مختصر مگر جامع تعریف کی تشریح، افادہ اور استبدال کے مذکورۂ بالا بیان سے بخوبی ظاہر ہوگی۔

۷۔ دولت کے اقسام۔ | دولت کی خاص تعریف ابھی بیان کیجا چکی ہے۔ جس سے معلوم ہوگا کہ تنہا لفظ دولت سے مراد **شخصی دولت** ہے۔ لیکن خود اقتصادیون نے بہ تقضائے ضرورت دولت کے اصطلاحی معنوں میں کچھ کچھ ترمیم بھی گوارا کی ہے۔ مثلاً انسان کے ذاتی صفات و خصائل، جیسے شرافت۔ عزت۔ ہر دل عزیزی اور اعتبار۔ جو کاروبار میں مدد دیتے ہیں، **ذاتی دولت** کہلاتے ہیں۔ اسی طرح پر بڑے بڑے دریا جیسے گنگا جمنا۔ اور سر بفلک پہاڑ جیسے ہمالیہ۔ جو ملک کی زرخیزی اور سرسبزی اور آب و ہوا پر اپنا گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ ملک کی وہ عمدہ چیزیں جنکا کثرتِ پیداوار کی وجہ سے مبادلہ کم ہوتا ہے۔ مگر جو لوگوں کے کام آتی ہیں جیسے جنگلوں کی لکڑی۔ خوشگوار موسم۔ صحت افزا آب و ہوا۔ دلکش مناظر۔ عمدہ سوسائٹی۔ روشن خیال حکومت وغیرہ جو اقتصادی ترقیات کے واسطے لازمی ہیں، **قومی دولت**

کہی جاتی ہیں۔ چنانچہ دریائے ٹمیس انگلستان کی دولت کا ایک بیش بہا حصہ شمار کیا جاتا ہے۔ اور وہ ساتوں سمندر۔ بھی جو بذریعہ بارش و جہازرانی دنیا کی مالی بہبودی کے بہترین معاون ہیں بین الاقوامی دولت کہے جاتے ہیں۔ اگرچہ مذکورۂ بالا تینوں آخری قسم کی دولتوں میں سوائے افادہ کے استبدال نہیں پایا جاتا مگر اقتصاد کو مجبوراً انکا لحاظ کرنا پڑا۔ کیونکہ یا درست یا بالواسطہ خاص اقتصادی دولت کی پیدائش میں اُن سے قابلِ قدر بلکہ اکثر ناگزیر امداد ملتی ہے۔

۸۔ دولت کی مختلف شکلیں۔ دولت کی ماہیت اور اسکے اقسام بیان کرنے کے بعد اب اُن چیزوں کی تفصیل کرنی باقی ہے جو دولت میں شامل ہوسکتی ہیں۔ انکی حسب ذیل چار قسمیں ہیں:۔

(۱) مادی اشیا خواہ منقولہ یا غیرمنقولہ۔ مثلاً غلہ۔ کپڑا۔ گھوڑا۔ درخت۔ زمین اور ہر قسم کی ملک و جائداد۔

(۲) مادی اشیا کی ملکیت اور استعمال کے حقوق۔ مثلاً کتاب کا حق تصنیف۔ آلات کا حق ایجاد۔ کاشت کار کے قبضۂ مستقل کی میعاد۔ اور ایک معین لگان کی شرح پر حق کاشت۔

(۳) ذاتی خدمات۔ خواہ انکا نتیجہ بشکل مادی ظاہر ہو یا نہ ہو۔ مثلاً لوہار۔ بڑھئی۔ معمار۔ درزی۔ باورچی اور حجام کا کام یا گانا بجانا یا ورزشی کرتب۔ اور کھیل تماشے جو عموماً تھیٹر اور سرکس وغیرہ میں دکھائے جاتے ہیں۔

(۴) ذاتی خدمات کرانے کا حق مثلاً ریلوے کمپنی کا ملازمان پر۔ تھیٹریکل کمپنی کا ایکٹروں پر ٹرسٹیانِ کالج کا پروفیسروں پر۔ جب کبھی ہم ان حقوق کے ذریعہ سے نہ کہ براہِ راست اِن خدمات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں، تو اس حق کے معاوضہ میں حقداران یعنی مالکان کمپنی یا ٹرسٹیانِ کالج کو کچھ روپیہ کرایہ یا فیس کے طور پر ادا کرتے ہیں۔

مذکورۂ بالا چار قسموں میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو ٹھیٹھ اقتصادی معنوں میں دولت کہی جاسکتی ہیں۔ قسم اول و دوم تو صاف ہیں۔ انکا دولت ہونا بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ لیکن آخری دو قسمیں قابلِ تشریح معلوم ہوتی ہیں۔

۹۔ قابلیت وخدمت کا فرق اول یہ جاننا چاہیے کہ قابلیت اور خدمت دو جداگانہ چیزیں ہیں خدمت کے واسطے قابلیت شرط ہے مگر قابلیت سے خدمت لازم نہیں آتی۔ مثلاً عمدہ گانے کے لیے خوش گلوئی اور بلند آوازی شرط ہے۔ عمدہ معلم یا مصنف ہونے کے لیے علمیت ضروری ہے لیکن ہر خوش گلو اور بلند آواز شخص گانا نہیں جانتا۔ اور نہ ہر صاحب علم مصنف یا معلم ہوتا ہے۔ ان دونوں کا فرق جتانا اس وجہ سے ضروری ہے کہ خدمت تو دولت کی ایک قسم ہے۔ مگر قابلیت دولت میں نہیں شمار کیجا سکتی۔ کیونکہ اگرچہ وہ خدمت کی شرط اور بنا ہے لیکن بذات خود اس میں دولت کے صفات نہیں پائے جاتے نہ استبدال نہ افادہ۔ مثلاً کوئی شخص گو وہ اپنے فن میں کیسا ہی کامل کیوں نہ ہو۔ کوئی طبیب خواہ وہ کیسا ہی حاذق کیوں نہ ہو۔ کوئی وکیل چند ہر کہ وہ کیسا ہی قانون دان کیوں نہ ہو۔ ہم ان میں سے کسی کو بھی محض قابلیت کی وجہ سے کچھ نہیں دیتے۔ البتہ جب وہ اپنی قابلیت کو عمل میں لاکر ہماری خدمت کرتے ہیں۔ یعنی بیماری کا علاج کرتے ہیں۔ یا مقدمہ کی پیروی۔ تو ان خدمات کے صلہ میں ہم خوشی خوشی انکو بھر بھر فیس دیتے ہیں۔ قابلیت نہ صرف فریق ثانی کے واسطے بلکہ خود صاحب قابلیت کے واسطے بھی خالی از افادہ ہے مثلاً کسی کو اپنے عمدہ گوّیے ہونے سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ جب تک کہ وہ گائے نہیں۔ البتہ یہ اختیار ہے کہ وہ اوروں کو بھی سنائے یا خود ہی لطف اٹھائے۔ علیٰ ہذا تری علمیت کس کام کی ہے جب تک وہ عالم کے خیالات میں جدّت۔ وسعت۔ باریک بینی اور بلند پروازی پیدا نہ کرے البتہ یہ امر اختیاری ہے کہ عالم اپنے خیالات کے لطف میں دوسروں کو بھی بذریعہ تحریر یا تقریر شریک کرے یا نہ کرے۔ چنانچہ جو علمیت سے کام نہیں لے سکتے انکو چارپائے بروکتابے چند سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ جس سے مذکورہ بالا اقتصادی اصول بخوبی ثابت ہوتا ہے۔ ایسی علمیت جس سے کام نہ لیا جائے۔ عالم کے واسطے اُسی قدر بیکار ہے جس قدر کہ چوپائے کے واسطے کتابیں۔ وہ عالم پر محض ایک بار ہے اور کچھ نہیں۔

برائے نہادن چہ سنگ وچہ زر

پس صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ خداداد یا اکتسابی قابلیت سے کام نہیں لیتے وہ دیدہ ودانستہ بہت بڑی دولت ہاتھ سے کھو دیتے ہیں۔

افادہ کی طرح دولت کی دوسری صفت استبدال بھی قابلیت میں مفقود ہے۔ گویّا اپنے گانے سے سامعین کو محظوظ کر سکتا ہے۔ دوسروں کو فنِ موسیقی بھی سکھا تا ہے مگر اپنی خوش گلوئی اور بلند آوازی کو کسی قیمت پر منتقل یا فروخت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایسا کرنا اسکی قدرت سے باہر ہے۔ مصور تصویر بنا کر دے سکتا ہے اور شاگردوں کو اس فن لطیف کی تعلیم بھی دے سکتا ہے مگر اُسکی قوتِ تخیلہ اور ہاتھ کی صفائی ایسی چیزیں ہیں کہ بیشمار قیمت ادا کرنے پر بھی دوسرے کے قبضہ و تصرف میں نہیں آسکتیں۔ جب پروفیسر طلبا کو تعلیم دیتا ہے تو گو وہی طلبا پروفیسر کے برابر بلکہ اُس سے بڑھ کر علم حاصل کریں۔ مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ پروفیسر نے اپنی علمیت طلبا کو فیس لے معاوضہ میں دے دی۔ علم کو دولتِ لازوال اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ انسان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ بعض قابلیتیں محض خداداد ہُوا کرتی ہیں کہ وہ کسی دوسرے ذریعہ سے میسر نہیں آسکتیں۔ مثلاً فہم و ذکا۔ حُسن و ظرافت وغیرہ۔ اور بعض قابلیتیں ایک دوسرے سے اس طرح پیدا ہوتی ہیں جیسے چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ مگر مبادلہ کسی کا بھی ممکن نہیں۔

پس ثابت ہُوا کہ قابلیت اور خدمت اقتصادی حیثیت سے بالکل دو جداگانہ چیزیں ہیں اور خدمت کی طرح قابلیت کو ہم دولت اس وجہ سے نہیں کہہ سکتے کہ نہ اس میں افادہ ہے نہ استبدال۔

۱۰- استبدال و انتقال کا تعلق | قابلیت اور خدمت کا فرق بتانے کے بعد استبدال اور انتقال کا رشتہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ گو مبادلہ میں انتقال اکثر شامل ہوتا ہے مگر لازمی نہیں۔ مبادلہ بغیر انتقال بھی ممکن ہے مادی اشیا کے مبادلہ میں انتقال موجود ہوتا ہے۔ مثلاً کتاب کے بدلے میں قلم۔ مکان کے بدلہ میں باغ۔ روپیہ کے بدلہ میں غلّہ اور کپڑا۔ مگر خدمات کے کے مبادلہ میں کبھی انتقال ممکن ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ جن خدمات کا نتیجہ بشکل مادی ظاہر ہوتا ہے

مثلاً معمار۔ بڑھئی۔ اور لوہار کا کام۔ انکے مبادلہ میں انتقال مانا جا سکتا ہے۔ گویا ایسی خدمات بشکل نتیجہ مادی اشیا میں مقید رہتی ہیں۔ مگر جن کا نتیجہ بشکل مادی ظاہر ہوتا ہی نہیں مثلاً تھیٹر میں گانا بجانا۔ یا سرکس میں جرأت اور طاقت کے کرتب دکھانا۔ تو وہ بوجہ سریع الفنا ہونے کے ناقابل تملیک ہیں اور اسی وجہ سے انکے مبادلہ میں انتقال ممکن نہیں۔ اگر ایسی خدمات کا مبادلہ کسی مادی چیز سے کیا جائے تو انتقال محض یکطرفہ ہوگا۔ اور اگر آپس میں ایک دوسرے سے کیا جائے تو کسی جانب بھی انتقال نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جب ہم تھیٹر دیکھنے جاتے ہیں تو ایکٹروں کی خدمات کے مبادلہ میں ہم ٹکٹ کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ اس حالت میں صرف یکطرفہ انتقال ہوتا ہے۔ جب ہم تھیٹر سے لوٹتے ہیں تو کمپنی کے مینیجر کا بکس تو ٹکٹ کے داموں سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور سب تماشائی خالی جیب، ہاتھ ہلاتے چلے آتے ہیں۔ تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم روپیہ کھو آئے؟ نہیں۔ بلکہ جو چیز ہمنے مبادلہ میں لی وہ بوجہ سریع الفنا ہونے کے ناقابلِ انتقال تھی۔ اور پیدا ہوتے ہی ناپید ہوگئی۔ اگر سوال کیا جائے کہ لوگ تھیٹر کیوں جاتے ہیں تو جواب ملے گا کہ لطف اٹھانے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی ایسی چیز کا مبادلہ ضرور ہوتا ہے جس میں افادہ اور استبدال موجود ہے۔ بالفاظِ دیگر جو دولت ہے۔ مگر مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر چونکہ اسکا انتقال ممکن نہیں اس وجہ سے تماشائی خالی ہاتھ نظر آتے ہیں۔

اسی طرح فرض کرو کہ ایک شخص گانا اچھا جانتا ہے۔ اور دوسرا شخص بانسری بجانا۔ اور وہ باری باری اپنے کمال سے ایک دوسرے کو محظوظ کرتے ہیں۔ تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ انکا یہ فعل مجنونانہ یعنے عبث اور بیکار ہے۔ نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کی خدمت سے بیحد لطف حاصل کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، دونوں کی خدمتوں میں افادہ موجود ہے۔ اور باری باری گا، بجا کر وہ اپنی خدمات کے استبدال کا بھی ثبوت دیتے ہیں۔ پس وہ اپنی دولت کا ایسا ہی مبادلہ کرتے ہیں جیسا کہ قلم کا کتاب سے۔ یا مکان کا باغ سے۔ یا روپے کا غلّہ اور کپڑے سے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بوجہ سریع الفنا ہونے کے انکی دولت کے مبادلہ میں انتقال ممکن نہیں۔

۱۱- استقبال انتقال کے متعلق نئی ایجادات کا اثر

یہاں یہ بتانا خالی از لطف نہ ہوگا کہ زمانۂ جدید کی ایجادات نے بعض غیر مادی خدمات کو بھی قابلِ انتقال بنا دیا ہے۔ مثلاً فونوگراف نے گانے میں انتقال پیدا کر دیا ہے۔ اکثر گوّیے اپنے گانے ریکارڈ کی شکل میں کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ جس سے وہ کمپنی کی مستقل مالک ہو جاتی ہیں۔ یہی صفت تمام جسمانی ذرائع میں بائیسکوپ نے پیدا کر دی ہے گاما اور زبسکو کی شہورِ عالم کشتی جس کے دیکھنے کو ہزاروں نے سینکڑوں روپیہ خرچ کیا ہوگا، تمام بائیسکوپ کمپنیاں دکھاتی پھرتی ہیں۔

۱۲- دولت کا مجموعی تخمینہ

کسی ملک یا گروہ کی مجموعی دولت کا تخمینہ کرنا علم الاقتصاد میں ایک بڑا دقیق اور دشوار فن مانا جاتا ہے۔ اس کام میں طرح طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں جن کی تفصیل کرنا یہاں ہم قبل از وقت خیال کرتے ہیں۔ ذاتی اور قومی دولت جن کو اقتصاد نظر انداز نہیں کر سکتا، انکی قیمت قرار دینا کس قدر مشکل ہے۔ اور پھر دولت کے بے شمار اجزا پر نظر رکھنا کس قدر وسعتِ معلومات چاہتا ہے۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں امریکہ کی محض دولتِ مجموعی کا تخمینہ علاوہ ذاتی اور قومی دولت کے ۹۲ ارب ۸۰ کروڑ اور ۶۰ لاکھ ڈالر یعنی پونے تین کھرب سے زیادہ روپیہ قرار پایا تھا۔ اب صرف امریکہ کی مجموعی دولت کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ اس سے ہمالیہ پہاڑ کی دنیا میں سب سے بلند چوٹی مونٹ ایورسٹ سے بھی آٹھ گنا بلند، دس گز مربع، چاندی کا ٹھوس منارہ بنایا جا سکتا ہے یا کرۂ زمین کے گرداگرد ایک فٹ مربع چاندی کا ٹھوس حلقہ ڈالا جا سکتا ہے۔ حالانکہ امریکہ کے علاوہ دنیا میں اور بھی چند نہایت دولت مند ملک موجود ہیں۔ مجموعی دولت کے تخمینہ کو آبادی سے تقسیم کر کے فی کس دولت کا اوسط معلوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء کے تخمینہ کے مطابق چند ممالک میں فی کس دولت کا اوسط حسبِ ذیل تھا۔

(۱)	انگلستان	۱۵۴۹ ڈالر
(۲)	آسٹریلیا	۱۳۱۲ "

(۳)	امریکہ	۱۰۳۰	ڈالر
(۴)	فرانس	۱۰۲۵	"
(۵)	جرمنی	۷۹۹	"
(۶)	اسپین	۶۵۲	"
(۷)	آسٹریا	۵۳۳	"
(۸)	اٹلی	۵۱۸	"
(۹)	روس	۳۱۳	"

لیکن جہاں تک ہم کو علم ہے ہندوستان کی مجموعی دولت کا تخمینہ اب تک نہیں کیا گیا۔ اسکی ایک وجہ یہ ہے کہ بوجہ اقتصادی پسماندگی کے یہاں واقعات و اعداد کا معلوم کرنا نہایت دقت طلب اور دشوار ہے۔

۱۳۔ اقتصادی جد و جہد۔ دولت کی ماہیت۔ اسکی اقسام اور اسکی مختلف اشکال کو واضح کرنے کے بعد ہم اصل موضوعِ اقتصاد کو سمجھانے کے لیے ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ نظرِ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ سوائے اُن معدودے چند خاص کاموں کے جو انسان مذہبی اثر سے بغرض فلاحِ آخرت کرتا ہے۔ باقی جس قدر کام ہیں وہ براہِ راست یا بالواسطہ ہماری ایک نہ ایک موجودہ یا آیندہ ضرورت کو رفع کرتے میں مدد دیتے ہیں۔ یا بالفاظِ دیگر ہمارے اکثر کام کسی نہ کسی طرح پر دولت سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور ایسے تمام کام اصطلاح میں **اقتصادی جد و جہد** کہے جاتے ہیں۔

۱۴۔ تعریف علم الاقتصاد۔ افادہ اور استبدال سے دولت کی ماہیت اور دولت کے ذریعہ اقتصادی جد وجہد کے معنی سمجھانے کے بعد اب ہم **علم الاقتصاد** کی تعریف یوں کرسکتے ہیں کہ اقتصاد وہ علم ہے جو انسان کی تمام اقتصادی جد وجہد سے بحث کرتا ہے۔ اور اس مجمل تعریف کی تفصیل یہ ہے کہ اقتصاد انسان کی اقتصادی جد وجہد سے بحث کرتا ہے اور اقتصادی جد وجہد سے مراد انسان کے وہ کام ہیں جو دولت سے متعلق ہوں اور دولت میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں

جن میں افادہ اور استبدال موجود ہو۔ یعنی جن میں ضرورت پوری کرنے کی صلاحیت پائی جائے اور جن کا مبادلہ ہوتا ہو۔ اقتصاد کی مختصر تعریف علم دولت بھی ہے۔ گر بیان بالا سے ظاہر ہے کہ اقتصاد کا اصلی موضوع انسانی ضروریات اور انکے پورا کرنے کی کوشش ہے۔ اور دولت سے وہ محض بالواسطہ بحث کرتا ہے۔ اس مختصر تعریف سے اقتصاد کے موضوع کے متعلق زمانۂ گزشتہ میں نہایت خطرناک غلط فہمی پیدا ہوچکی ہے جسنے اس علم کی راہ ترقی میں تعصب اور مخالفت کی ایسی رکاوٹیں پیدا کردیں جو سالہا سال کی کوشش سے رفع ہوسکیں۔ لیکن اگر تشریح بالا کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس مختصر تعریف کے صحیح معنی صاف نظر آجائیں گے۔

۱۵۔ علم الاقتصاد کی تقسیم مباحث

یہ تو معلوم ہوگیا کہ اقتصاد کا موضوع کیا ہے۔ اب یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ انسان کی جد و جہد چار صورتیں اختیار کرسکتی ہے۔ یا تو وہ پیدایش دولت سے متعلق ہوگی۔ یا تقسیم۔ یا مبادلہ۔ یا صرف دولت سے۔ اور ان چاروں صورتوں میں حسب ترتیب بالا ایک رشتۂ تعلق بھی قائم ہے۔ اول دولت پیدا کی جاتی ہے۔ پھر جو لوگ پیدا کرنے میں شریک ہوتے ہیں وہ اُسے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ بعدہٗ بمقتضائے ضرورت اپنی چیز کا دوسروں کی چیز سے مبادلہ کرتے ہیں اور بالآخر اُسکو کام میں لاتے ہیں۔ مثلاً کاشتکار اپنے ہل، بیل، کھاد اور بیج لگا کر کچھ مزدوروں کی مدد سے زمیندار کے کھیت میں غلہ پیدا کرتا ہے۔ جب وہ اس تیار ہوتی ہے تو وہ کاشتکار، مزدور اور زمیندار کے درمیان منافع۔ مزدوری اور لگان کی صورت میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ اس میں سے ہر ایک اپنا کُل حصہ یا اُسکا ایک جزو بازار میں فروخت کرکے حسب ضرورت کپڑا، جوتہ۔ اور ضروری سامان خریدتا ہے۔ جن کو وہ اپنے گھر لاکر استعمال کرتا ہے۔ پس ہم اپنی کتاب میں انھیں چار صورتوں یعنی پیدایش، تقسیم، مبادلہ، اور صرف دولت کے تحت میں حسب ترتیب مذکورۂ بالا بحث کریں گے۔

۱۶۔ اقتصاد اور دیگر علوم متجانسہ

اوپر کے بیان سے واضح ہوگیا ہوگا کہ اقتصاد انسان کی کوششوں اور کاموں کے ایک خاص پہلو سے بحث کرتا ہے۔ اسکی نظر میں تمام انسان کاروبار میں مصروف

اور اپنی ضروریات زندگی کے رفع کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ اسی طرح بعض دیگر علوم انسانی افعال پر دوسرے نقطۂ خیال سے نظر ڈالتے ہیں۔ مثلاً علمِ قانون کے نزدیک تمام لوگ اپنے اپنے حقوق کی حفاظت اور حق تلفی کے معاوضہ یا سزا کا مطالبہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ علمِ سیاست کے خیال میں سب آدمی سلطنت کا نظم و نسق اور حکومت کی کل چلانے میں مصروف ہیں۔ علمِ تمدن انسان کی مختلف طرز ہائے ماند و بود، اسکے عجیب رسم و رواج، اور عادات و روایات کا تماشا دیکھتا ہے۔ اور علمِ دین کی نظر میں انسان خدا کا بندہ ہے اور اُسی کی پرستش اور اسکے احکام کی تعمیل کو سب کاموں پر مقدم سمجھتا ہے۔ غرضکہ کئی علوم ایک ہی چیز یعنی افعال انسانی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے نہایت کار آمد بلکہ اکثر ناگزیر مدد لیتے ہیں۔ ایسے علوم کو اصطلاحاً **علوم متجانسہ** کہتے ہیں۔

۱۷ - علم الاقتصاد کی نوعیت | علما میں مدتوں یہ بحث چھڑی رہی کہ آیا اقتصاد محض **علم** ہے یا فن بھی اور اگر علم ہے تو آیا **علم الحقیقت** (Positive Science) ہے یا **علم الہدایت** (Normative Science) بالفاظِ دیگر آیا وہ محض واقعات کی تشریح و توجیہ اور قوانین اساسی کی تحقیق ہی کرتا ہے یا وہ ترقی اور مرفہ الحالی کے اصول اخذ کرکے انکی تلقین بھی کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ بحیثیت فن کے وہ اُن اصول پر کاربند ہونے کے طریقے اور تدابیر بھی سکھاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مذکورۂ بالا تینوں کاموں میں نہایت قریبی رشتہ اور تعلق ہے۔ محض تشریح و توجیہ واقعات اور تحقیقِ قوانینِ اساسی بے سود ہے۔ اگر اُس سے بہبودی اور مرفہ الحالی کے اصول اخذ نہ کیے جائیں اور نیز اُنپر عمل پیرا ہونے کی تدابیر نہ بتائی جائیں۔ لیکن تقسیمِ عمل کے زریں اصول کے مطابق تقریباً یہ مسلّم ہو چکا ہے کہ اقتصاد فی نفسہ علم الحقیقت ہے۔ یعنی واقعات کی تشریح و توجیہ اور قوانین اساسی کی تحقیق اُسی سے متعلق ہے۔ اصولِ بہبودی کا اخذ و تحقیق اور تدابیرِ عمل کی تعلیم یہ دونوں بھی اس علم سے تعلق ضرور رکھتے ہیں لیکن ایسا ہی جیسے علمِ ریاضی سے فنِ انجنیری، اور علم الابدان سے فنِ طب۔ مگر فی نفسہ یہ دونوں

فلسفۂ تمدن اور وضعِ قانون کے حسبِ ترتیبِ بالا جداگانہ موضوع ہیں۔ اور اُن تینوں موضوع کے باہمی تعلق کی وجہ سے جیساکہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں۔ اقتصاد۔ تمدن اور قانون علومِ متجانسہ کہے جاتے ہیں۔ اکثر مسائل ایسے ہیں جو مختلف حیثیتوں سے ان تینوں سے متعلق ہیں۔ مثلاً ٹیکس کا مسئلہ۔ کہ اُسکی ماہیت اور اُسکے نتائج کی تشریح و توجیہ تو اقتصاد کا کام ہے۔ مفید ٹیکس کے اصول دریافت کرنا فلسفۂ تمدن سے متعلق ہے اور مفید ٹیکس عائد کرنے کی غرض سے اُن اصول پر کاربند ہونے کی تدابیر نکالنا قانون کے ذمہ ہے۔ جب ہم ٹیکس کے مسئلہ سے مفصل بحث کرینگے تو انشاء اللہ تعالیٰ یہ تقسیمِ عمل بخوبی واضح ہو جائے گی۔ یہاں صرف مثالاً اسکا ذکر کر دیا گیا۔

اوپر کے بیان سے ظاہر ہوگیا ہوگا کہ علم الاقتصاد بذاتِ خود نہ کفایت شعاری کی تلقین کرتا نہ فضول خرچی سے منع کرتا ہے۔ نہ دولتمند بنانے کی تدابیر بتاتا ہے۔ نہ مفلسی دور کرنا سکھاتا ہے بلکہ محض انسان کی اقتصادی جد و جہد کی تشریح و توجیہ کرتا ہے۔ لیکن ساتھ اس کے علوم متجانسہ یعنے فلسفۂ تمدن اور قانون کو اصول بہبودی کی تحقیق اور اُنپر کاربند ہونے کی تدابیر معلوم کرنے میں ناگزیر مدد دیتا ہے۔ چنانچہ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص ان تمام امور سے بحث کرتا ہے لیکن اس صورت میں اسکی تین جداگانہ حیثیتیں ہوتی ہیں۔ یعنی جہاں وہ عالمِ اقتصاد کہا جاتا ہے وہاں اُسے فلسفۂ تمدن کا عالم اور مقنن بھی کہتے ہیں۔ محض اول الذکر حیثیت میں وہ ان تینوں کاموں کو سرانجام نہیں دے سکتا۔

۱۸۔ لفظ اکانمی کی تحقیق | مذکورۂ بالا مباحث کا ذمہ دار خاص طور پر لفظ اکانمی ہے۔ جو اس علم کے معروف نام پولیٹکل اکانمی میں داخل ہے۔ اس لفظ کی سرگزشت نہایت دلچسپ ہے جسکو ہم یہاں مختصراً بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ ایک یونانی لفظ ہے۔ اسکے لغوی معنی ہیں گھربار کا انتظام یعنی ضروریاتِ خانہ داری کی بہم رسانی اور آمدنی اور خرچ کا حساب۔ اصطلاحاً اسکو تدبیرِ منزل سے تعبیر کرتے ہیں۔ یورپ میں انقلابِ فرانس سے قبل حکومت لوگوں کے اقتصادی معاملات میں اسی طرح مداخلت کرتی تھی جیسے کوئی استبداد پسند بڈھا بوڑھا اپنے

گھر کے کاموں میں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ مثلاً ایسے قانون وضع کیے گئے تھے کہ کوئی مزدور ایک قصبہ سے دوسرے قصبہ میں جا کر بغیر اجازتِ خاص محنت مزدوری نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی پیشہ ور اپنا کاروبار بے اجازت جاری نہیں کر سکتا تھا۔ قیمتی دھاتوں کی برآمد قطعاً ممنوع تھی اور ایسے ہی بہت سے قانون جاری تھے جنھوں نے اقتصادی جد وجہد کو طرح طرح کی ناقابل برداشت بندشوں سے جکڑ دیا تھا۔ اور ناواقفیتِ علم الاقتصاد کی وجہ سے یہ طرزِ عمل ملکی بہبودی اور رفہ الحالی کا معاون سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ انتظامِ خانہ داری اور اقتصادی معاملات کی سرکاری نگرانی میں ایک مشابہت پائی جاتی ہے۔ لہذا محض اِکانمی یا تدبیرِ منزل سے مشابہت اور نیز فرق ظاہر کرنے کے لیے اس علم کا نام اکانمی پر اسم صفت یعنی پولیٹکل کا لفظ اضافہ کر کے پولیٹیکل اکانمی یا تدبیرِ مدن قرار دیا۔ اور چونکہ طلبِ منفعت ایسے کاموں کی خصوصیت ہے۔ لہذا لفظ اکانمی سے کفایت شعاری کا خیال پیوست ہو گیا اور بالآخر ایسا حادثہ ہُوا کہ لوگ اصلی معنی کو یعنی انتظام خانہ داری۔ یا اقتصادی جد وجہد کی نگرانی کو بھلا بیٹھے اور مدت تک اچھے اچھے اس مغالطہ میں مبتلا رہے کہ یہ علم کفایت شعاری، دولت پرستی اور حد درجہ کی خود غرضی سکھاتا ہے۔ چنانچہ اکثر پاک طینت علما نے اس علم پر بہت زہر اُگلا ہے اور دل کھول کر اسے صلواتیں سنائی ہیں۔ مگر در اصل ناواقفیت اور غلط فہمی کی وجہ سے وہ بھی حق بجانب اور اس لیے قابل معافی ہیں۔

۱۵۔ اقتصاد کی مختصر تاریخ یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ کسی زمانہ میں حکومت اقتصادی معاملات میں بکثرت جا و بیجا مداخلت کیا کرتی تھی۔ لیکن انقلابِ فرانس کے بعد فرانس میں حکما کا ایک زبردست گروہ پیدا ہوا جس نے سرکاری مداخلت کی بڑے زور سے مخالفت کی۔ اسکو بے حد مضر ترقی وبہبود ثابت کیا۔ اور اصول غیر مداخلت کی اس شد ومد سے منادی کی کہ گھر گھر اسکا چرچا ہونے لگا اور وہ بہت ہر دل عزیز ہو گیا اور بالآخر حکومت کو بھی اسکے مطابق اپنی پالیسی تبدیل کرنی پڑی۔ اور روز بروز اقتصادی معاملات قانونی بندشوں سے آزاد ہونے لگے۔ چنانچہ جب آدم اسمتھ نے اس اصول کی انگلستان میں اشاعت کی تو قانون غلہ جو درآمد غلہ کو

رو کتا تھا۔ منسوخ کر دیا گیا۔ اور درآمد و برآمدِ غلہ میں پوری آزادی مل گئی۔ اصولِ غیر مداخلت کے اثر سے سرکاری نگرانی گھٹتے گھٹتے تقریباً بالکل مفقود ہو گئی اور اقتصادی معاملات قانون کی اطاعت سے بالکل آزاد کر دیے گئے۔ کچھ تو انسان بالطبع نگرانی کا محتاج ہے۔ اور کچھ کلوں کی ایجادات نے ملک کی اقتصادی حالت میں ایسا انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اور اس انقلاب کی ہم مناسب موقع پر کافی تشریح کریں گے۔ کہ سرکاری نگرانی کی ضرورت بشدت محسوس ہونے لگی غیر مداخلت کا طرزِ عمل بالکل تو متروک نہیں ہوا۔ لیکن اس میں مناسب ترمیمات ضرور کر دی گئیں اور بہ مقتضائے ضرورت سرکار نے پھر اقتصادی معاملات کی نگرانی کے واسطے قوانین پاس کرنے شروع کر دیے۔ چنانچہ بنک کا قانون۔ قانونِ کارخانجات۔ وغیرہ اسی تبدیلی کا نتیجہ ہیں۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حکومت کی گزشتہ اور موجودہ مداخلت و نگرانی میں بہت بڑا فرق ہے۔ اُس زمانہ میں مداخلت عام طرزِ عمل تھا اور بوجہ اقتصادی ناواقفیت کے اس کے کثرتِ استعمال سے بہت سی صورتوں میں مداخلت غیر ضروری اور مضر ہوتی تھی۔ برخلاف اس کے آج کل غیر مداخلت عام طرزِ عمل ہے۔ اور اگر بہ مقتضائے ضرورت کبھی مداخلت کی بھی جاتی ہے تو بہ وجہ واقفیتِ علمِ اقتصاد وہ حق بجانب اور مفید ہوتی ہے۔

ہ اور درآمد کی ممانعت ضروری و مفید خیال کیا جاتا تھا

اس بحث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی حیثیت سے ابتداءً اول بشکل فن نمودار ہوا۔ اور ترقی کرتے کرتے اُس نے ایک علم کی شان حاصل کر لی۔ یہاں ایک یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم سے فن پیدا ہونا چاہیے نہ کہ فن سے علم۔ لیکن یہ بحث بعینہ ایسی ہے جیسے کہ "انڈا پہلے پیدا ہوا یا مرغی" واقعہ یہ ہے کہ اول انسان تجربۃً اپنی ضروریات رفع کرنے کی تدابیر نکالتا ہے۔ اور کامیاب ہونے پر وہی تدابیر علم و فن کی بنیاد ڈالتی ہیں۔ کچھ عرصہ تک علم و فن ایسے ملے جلے رہتے ہیں جیسے دودھ میں گھی لیکن ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں جدائی شروع ہونے لگتی ہے۔ اور بالآخر علم فن سے بالکل ممیز اور ممتاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فنِ طب اور علم الابدان۔ نجوم اور ہیئت کے تاریخی رشتہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ غرضکہ اقتصاد میں بھی ترقی ہوتے ہوتے فن سے جداگانہ

ایک علم الحقیقت کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اور من حیث العلم افعالِ انسانی کے ایک خاص نقطۂ خیال سے مطالعہ کرنا اُس کا مقصدِ اعلےٰ قرار پایا ہے۔

چونکہ لفظ پولیٹکل اکانمی سے غلط فہمی کا اندیشہ باقی رہتا ہے۔ اس لیے اب یہ علم زیادہ تر **اکنامکس** کے سیدھے سادے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۲۰۔ اس علم کا اُردو نام اس علم کے اصلی موضوع کے متعلق جو جو غلط فہمیاں پیدا ہو چکی ہیں اُنکی جھلک اسکے اُردو ناموں میں بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ علمِ ثروت۔ اصول دولت۔ اقتصاد۔ اصولِ تونگری۔ اور مُلکی کفایت شعاری وغیرہ جیسے مختلف خطابات اسکو دیے جا چکے ہیں۔ اور لفظ اقتصاد کو تو اخبار اور رسالوں نے اس قدر رواج دے دیا ہے کہ اسپر اُنگلی اُٹھانے کی جرأت کم ہو سکتی ہے۔ لیکن اس علم کے مباحث کی ماہیت اور وسعت سے واقف ہو جانے کے بعد جو بہترین نام نظر آتا ہے وہ **علم المعیشت** ہے۔

۲۱۔ اقتصادی اہمیت اور اسکا مستقبل ترقیِ تہذیب کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی میں روز افزوں پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں جن کو سُلجھانے کے لیے ناخنِ علم ناگزیر ہے۔ زندگی کے متعدد شعبوں میں سے صرف ایک اقتصادی جد و جہد ہی پر ذرا غور کیا جائے کہ اب اسکا حلقۂ اثر شہروں۔ صوبوں۔ بلکہ ملکوں سے نکل کر تمام عالم پر محیط ہو گیا ہے۔ زمانۂ جدید کی ایجادات تار۔ مطبع۔ ریل۔ جہاز اور طرح طرح کی کلوں نے تمام دنیا کو کیسے کیسے قوی تعلقات اور مضبوط رشتوں سے جکڑ دیا ہے۔ کبھی ہماری ضروریات انگلیوں پر گنی جا سکتی تھیں اور انکو پورا کرنے کے وسائل کیسے سیدھے سادے اور مختصر تھے۔ ہر قصبہ و شہر اپنے اپنے باشندوں کی ضروریات کا بیشتر کفیل ہوتا تھا اور رفعِ ضروریات کے واسطے اپنے مُلک سے باہر کوئی نظر بھی نہیں ڈالتا تھا۔ مگر آج مہذب اور متمول طبقہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ دنیا کا وہ کون سا مُلک ہے جہاں کی کوئی نہ کوئی چیز انکے محل یا کوٹھی کے سامان میں داخل نہیں۔ آپ ایک غریب اور جاہل گنوار کے جھونپڑے میں بھی کم از کم روس یا برہما کا مٹی کا تیل۔ امریکہ یا جرمنی کی لالٹین۔

جاپان یا آسٹریا۔ ناروے یا سویڈن کی دیا سلائی کا بکس اور انگلستان کا کپڑا ضرور موجود پائیں گے۔ ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ سوئٹزرلینڈ کی سستی گھڑیوں۔ امریکہ کے سگریٹ انگلستان کے قلم، چاقو اور چھتریوں کا رواج بھی گانوؤں کے اسکول جانے والے بچوں میں بکثرت پھیلتا جاتا ہے اس سے ہم کو یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک طرف تو ہماری ضروریات میں اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف اُنکے پورا کرنے کے وسائل وسیع ہو رہے ہیں۔ اور یہ تہذیب کی ترقی اور آبادی کی فراوانی کا مقتضا ہے۔ جس کی توضیح ہم آیندہ مناسب موقع پر کریں گے۔ یہاں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اس عالمگیر رُجحان کو روکنا نہ ممکن ہے نہ مفید۔ البتہ اسکو چند اصول کا پابند بنانا ضروری ہے۔ جس کی تفصیل تجارتِ بین الاقوامی کے تذکرہ میں کی جائے گی۔ دُنیا کا کوئی مہذب اور نیم مہذب مُلک ایسا نہیں جو اپنی تمام ضروریات کو خود پورا کر سکے اور دوسرے ممالک کا کم و بیش دست نگر نہ ہو۔ کسی مُلک میں اشیائے صنعتی کی درآمد ہے جیسے ہندوستان میں اور کسی میں پیداوارِ خام کی مانگ ہے جیسے انگلستان میں۔ لیکن دنیا کے تمام ممالک اپنی ضروریات کے رفع کرنے میں کم و بیش اسی طرح محتاج ہیں۔ جس طرح کسی چھوٹے سے گانوں میں ایک پیشہ ور دوسرے کا محتاج ہوتا تھا۔ رفعِ ضروریات کے وسائل نہ صرف وسیع ہو گئے ہیں بلکہ انکی حالت میں بھی انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا ہے۔ ذرا جُلاہے کے کرگھے۔ یا موچی اور لوہار کی دوکان کا مانچسٹر یا بمبئی اور کانپور کی ملوں۔ نارتھمپٹن یا کانپور اور گوالیار کی فیکٹریوں اور شیفیلڈ یا علی پور اور ٹاٹا ورکس کے کارخانوں سے مقابلہ تو کرو۔ کوئی بھی نسبت ہے؟ حالانکہ انکے کام اب بھی یکساں ہیں۔ سب سے زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بہت سے ایسے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں جو عام ملکی اور قومی بہبودی اور مرفہ الحالی کے سنگ بنیاد ہیں اور جن کا حل ہونا علم اور تجربہ کی مدد کے بغیر محال ہے۔ سکہ۔ نوٹ۔ بنک۔ مل اور فیکٹری۔ ریل۔ نہریں۔ معدنیات و جنگلات۔ تعلیم۔ صحت۔ ٹیکس۔ تجارتِ درآمد و برآمد۔ اور عام مرفہ الحالی وہ چند جدید اور اہم مسائل ہیں جن کو حل کرنے میں آج دنیا کے بہترین دماغ براہِ راست یا بالواسطہ

مصروف ہیں۔ اور یہی وہ مسائل ہیں جو تمام مہذب سلطنتوں کی داخلی و خارجی پالیسی کے رُوح رواں بنے ہوئے ہیں۔ واقعات شاہد ہیں کہ عرصہ سے اقتصادی اغراض جنگ کے محرّک ہُوا کرتے ہیں۔ اور اقتصادی تسلّط اکثر ملک گیری کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ ہندوستان۔ فارس۔ مصر۔ مراکش۔ سب اسی مہلک راز کا زبانِ حال سے اعلان کر رہے ہیں۔ اور ٹرکی کی بیچارگی اور جاپان کی خودداری سے اقتصادی تسلّط اور آزادی کا کیا افسوس ناک فرق ظاہر ہوتا ہے۔ پس جب کہ انسانی زندگی کا اقتصادی شعبہ اس قدر پیچیدہ اور وسیع ہو گیا ہے اور اسکا اثر ہماری بہبود پر اس قدر حاوی ہے تو علم الاقتصاد کا جاننا ہم پر لازم ہے۔ تاکہ ہم زندگی کے جدید۔ ناہموار۔ پیچیدہ اور طویل رستوں سے آسانی گزر کر منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں اور میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مُردہ جسم میں اقتصاد ہی ایک دن نئی روح پھونکے گا اور مسیحائی کا سہرا اسی کے سر بندھے گا۔

محمد الیاس برنی

برسات

گھٹا گھر کر چلی آتی ہے برساتی ہوئی پانی
کسی چھاگل کی چھم چھم ہے صدا پانی کی یہ چھم چھم
گھٹا ٹوپ اُٹھا ہے بادل اندھیرا ہر طرف چھایا
بدلتا رنگ ہے بادل مزاجِ یار کی صورت
کنارے ابر کے ہے کہکشاں کی آج یہ صورت
اِدھر چمکی اُدھر چمکی اِدھر تڑپی اُدھر تڑپی
عجب گلشن پہ خیمہ بادلوں نے آج تانا ہے

اُٹھا ہے شور مے خانہ سے ہر تہنیت خوانی
حسینوں کی یہ چھل بل ہے نہیں بجلی کی جولانی
دکھاتی پھرتی ہے مشعل مگر برقِ درخشانی
کبھی نیلا کبھی پیلا کبھی اُودا کبھی دھانی
کہ جیسے پَن بھری پنگھٹ پہ بھرتی ہو کوئی پانی
کوئی چنچل ہے پردہ میں نہیں برقِ درخشانی
طنابیں جس کی بیلیں اور چوبیں سروِ بستانی

جوانانِ چمن نے بھی نئی بدلی ہیں پوشاکیں
ہری پہنے ہوئے کوئی کوئی اُودی کوئی دھانی

بہار آئی تو عصمت کی بھی چادر ساتھ ہی لائی
نظر پتوں پہ پڑتے ہی چھپی شاخوں کی عُریانی

اثر یہ نامیہ کا ہے عوض کانٹوں کے گل نکلے
چھڑی پھولوں کی ہر اک بن گئی شاخِ مغیلانی

جو سنبل زلفِ جاناں ہے تو گل رخسارِ معشوقاں
صفت مژگاں کی رکھتا ہے ہر اک خارِ بیابانی

عجب عالم نیاز و ناز کا ہے آج گلشن میں
صبا کے چھیڑنے پر ہنستے ہیں گلہائے بستانی

چمن میں کس مزے سے سبزۂ خوابیدہ سوتا ہے
نسیمِ صبح خادم بن کے کرتی ہے مگس رانی

نہیں شبنم کے قطرے دہنِ گل میں ہیں یہ موتی
نہیں برسات کا بادل یہ ہے اک ابرِ نیسانی

لیے بھرتی ہے شبنم دوش پر پانی کے مشکیزے
بجھانے گر کرے کچھ آتشِ گل شعلہ افشانی

نہ کیونکر باغ میں اب رات دن برسائے کنچن
ہے شبنم کی دُرافشانی زرِ گل کی زرافشانی

شمیمِ جاں فزا لا کر معطر کرتی ہے کیا کیا
نسیمِ صبح کرتی ہے دماغِ جاں کی مہمانی

چمن میں دیکھتے ہیں جب کسی شمشاد قامت کو
اکڑ جاتے ہیں تن جاتے ہیں یہ سروِ گلستانی

زباں دھوئی ہوئی کوثر سے مرغانِ چمن کی ہے
نہ ترکی ہے نہ انگریزی نہ ایرانی نہ عبرانی

اُٹھا کرتی ہے دل میں درد سن کر قمری کی کو کو
جگر میں چٹکیاں لیتی ہے بلبل کی خوش الحانی

عنادل شاخِ گل پر شادیانے گانے ہیں بیٹھے
چٹک غنچوں کی دیتی ہے صدائے تہنیت خوانی

یہ منت لی ہے بلبل نے نہ اب کی گر خزاں آئے
کروں گا جگنوؤں کی گل کی شاخوں پر چراغانی

عجب عالم مزے کا ہے کہ موتی بھی اُبل اُٹھے
گئے اک رنگ ہی میں ڈوب دونوں شیخ و رندانی

وہ آیا گھر کے پھر بادل وہ پھر بجلی چمک اُٹھی
قمرؔ بس کن سمندِ فکرِ خود را رو بگردانی

سید قمر الدین احمد قمرؔ سندیلوی

شیخ ایسی بھی گھٹا جھوم کے اُٹھتی ہے کہیں
کہیں ایسی بھی بہارِ چمن ہوتی ہے

خرمنِ صبر پہ دیکھو وہ گری پھر بجلی
توبہ توبہ مری توبہ شکنی ہوتی ہے

سنسر؟

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش: من اندازِ قدت را می شناسم!

دنیاے جدید اختراعات وجدت سے پُر ہے! قدامت پسند پیرزالِ زمانہ چرخِ کج رفتار کی نظر نہ آنے والی چال کی بدولت کم ازکم ہماری کُرۂ زمین سے اپنا بوریا بدھنا سنبھال کر مدت ہوئی کہ ہَوا ہوگئی! اب اس کی نظرفریب جانشیں دنیاے جدید اپنی ترقی کی برقی شعاعوں سے ایک ایک چپہ کو منور کر رہی ہے! قدامت پسندی فی الحقیقت نام ہے "تھک کر ایک جگہ ٹھہر جانے کا"! اور جدت آفرینی نام ہے "روزنئے دلکش باتوں کے وجود میں لانے کا"!

دنیاے جدید نے جہاں امریکا جیسی نئی دنیا دریافت کی: قیصرِ جرمنی جیسا نیا خون خوار انسان پیدا کیا: ریوٹر جیسی راست گو مخبر ایجنسی قائم کی: پٹروگراڈ جیسا صحیح اعدادِ اسیرانِ جنگ بیان کرنے والا خطہ بنایا: وہاں اور بہت سی کارآمد و بے مثال چیزوں کو بھی جامۂ وجود پہنایا! ان نوزائیدہ اشیاے ضروری میں ایک دلفریب ذات وہ ہے جو سنسر کے نام سے ملقب ہے!

جدید انسائیکلوپیڈیا کے مؤلف نے اس لفظ کو دو طرح سے لکھا ہے! یعنی ایک تو Censer کی طرح E کے ساتھ اور دوسرے Censor کے مانند 'O' کے ساتھ! اول الذکر کو خوشبو پھیلانے والا عود یا اگردان کہتا ہے اور آخرالذکر کو اخلاق و افعال کا محتسب بیان کرتا ہے!

ہماری محدود عقل۔ جو پُرانے زمانہ میں ناقص بھی تھی۔ کام نہیں کرتی کہ موجودہ ہستیٔ عجیب عود دان ہے یا محتسب؟ وجہ یہ ہے کہ اس جدید شخصیت کی ذاتِ والاصفات عود دان کی طرح اپنے جوہرِ ذاتی کی خوشبو سے ہر دماغ کو معطر بھی کر رہی ہے، اور محتسب کی طرح محاسبۂ غیر محدود میں بھی منہمک ہے! محققانِ نوخیز تو اس ذاتِ نوزائیدہ کو محض زمانہ جدید کی جدت آفرینی سے منسوب کرکے داد کے خواہاں ہیں؛ لیکن حاجی بلغ العلیٰ صاحب جیسے عالمِ متبحر اس ذات کا ورود قریب قریب اُس دن سے بیان کرتے ہیں جب علم الملکوت کی خدمات۔ خداے واحد کے

حکمِ مطلق میں ناجائز محاسبہ کرنے کے بدولت۔ فردوسِ بریں سے ہماری زمین کی طرف منتقل کردی گئی تھیں! واقعہ یہ ہے کہ محتسبِ جدید یا سینسر کی ڈیوٹی۔ بالفاظِ مختصر۔ قطع و بُرید ہے، اور تاریخ بتاتی ہے کہ دُنیا کی ہر چیز روزِ اوّلیں سے قطع و بُرید کے قانون کے زیرِ عمل چلی آتی ہے! دُنیا متحرک ہے اور اُس کی ہر چیز متحرک ہے۔ وہ بڑھ رہی ہے اور اُس کی ہر چیز۔ سوائے حماقت قدامت پسندی کے۔ بڑھ رہی ہے! قاعدہ ہے کہ زمین سے اُگنے والا پودا اگر آفتاب و ہوا پر ہی چھوڑ دیا جائے اور دستِ انسانی اُس کی غذاے بالیدگی کو چوس لینے والی گھاس کو اُس سے دُور نہ کرتا رہے، تو وہ کبھی درخت نہیں بنے گا اور نہ بارآور ہوگا! ہر وجود میں آنے والی چیز جو مائل بہ بالیدگی ہو فطرتاً قانونِ قطع و بُرید کی محتاج ہے! حاجی صاحب مدظلہ اس قطع و بُرید کرنے والی شخصیت کا وجود روزِ ازل سے ثابت کرتے ہیں اور ہر شعبۂ زندگی میں ثابت کرتے ہیں! اس سے کون منکر ہو سکتا ہے کہ ریشِ خودرَو کا سینسر زمانہ جاہلیت سے اپنی قطع و بُرید میں حسبِ آب و ہوا مصروف چلا آتا ہے! کبھی اُس کی مقراضِ سُبک، ریشِ مبارک کو اسی حد تک سینسر کرتی ہے کہ بِلا خوفِ احتساب بڑھنے والے بال، یک مشت و چہار انگشت کی سدِ سکندری پر رُک جاتے ہیں: اور کبھی اُسکا تیز اُسترہ بیک گردشِ دستِ جاروب کش، ایک دن کی ننھّی جان۔ سبزۂ دوشینہ۔ کو پیدا ہوتے ہی عدم کو پہنچا دیتا ہے: اس زندہ مثال کو دیکھتے ہوئے ماننا پڑے گا کہ ڈاڑھی کا سینسر زمانہ دراز سے چہرۂ کتابی پر حکم رانی کرتا چلا آتا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے ناخنِ پا سے لے کر، موے بدن (یعنی؟ یعنی؟) موے سر تک، تمام اُگنے یا بڑھنے والی چیزیں سینسر کے دستِ قطع و بُرید کی تختۂ مشق چلی آتی ہیں! اور اُن کا سینسر قوتِ نمو کے لحاظ سے ہفتہ میں ایک مرتبہ، روزانہ، یا تمام عمر میں ایک مرتبہ، علیٰ قدرِ مراتب اپنے فعلِ اصلاح پر برابر کاربند نظر آتا ہے!

کل کے برخودار آج کے پدرِ بزرگوار ہیں! ہر چیز ترقی کے رنگ میں کینچلی اُتارتے رہنے کی عادی ہے یا سینسر کی شخصیت نے بھی زمانہ کے قدم بقدم چل کر۔ حسبِ حاجت۔ ہمیشہ نئے قالب اختیار

کیے ہیں! جس وقت نئے اسکول اور نئی یونیورسٹی نے جنم لیا، سنسر کی ذات نے بھی اُس دائرہ میں شکلِ مُمتحِن میں جلوہ فرمایا! جس قدر تعلیم کی تیز رَوی کے ساتھ طلبا کی تعداد بڑھتی گئی، اُسی نسبت سے جُزوِ سنسری مُمتحن کی ذات وصفات پر غالب آتا گیا! چنانچہ فی زمانا اگر تعلیم اِس حد پر پہنچ گئی ہے کہ قلی بھی انٹرنس پاس سے کم نہیں لیا جاتا، تو مُمتحن کا فعلِ قطع و بُرید بھی اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ اگر سَو لڑکے انٹرنس میں شامل ہوں تو ایم۔ اے پاس کرنے تک بلا مبالغہ صرف ایک ذاتِ واحد رہ جائے گی؛ اور اگر اس سے آگے قدم بڑھایا گیا تو شاید سنسر تعلیم کی جُوعِ قطع و بُرید کو سیر کرنے کے لیے فردوسِ بریں کی رہنے والے تعداد کو پورا کرنے کی خاطر طبقۂ اسفل کی طرف تشریف لے جاکر شریکِ امتحان ہوں گے!

ہاں: اس سے پیشتر سنسر کی رُوح پُرانے زمانہ میں ایک اہم ترین جذبۂ انسانی کی بھی اصلاح کرتی رہی ہے! ظاہر ہے کہ تعلقِ مَرد و زن ایک نیچرل تعلق ہے، اور کہنے والے کہتے ہیں کہ۔ مائل بہ کثرت ہے: اس لیے سنسر کی ذاتِ والا صفات نے قاضی صاحب یا پنڈت جی کی شکل میں زمانۂ جاہلیت کی کثرتِ ازواج کو ایک حد تک بہت کچھ محدود کردیا، اور بالآخر یادری صاحب کی نوزائیدہ صورت میں۔ ظاہرہ طور پر ہی سہی۔ صرف ایک کے عدد تک کم کردیا!

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کے لیے ایک خاص حد مقرر ہے۔ اور جب کوئی چیز اپنی حدِ مقررہ سے متجاوز ہوجاتی ہے تو سنسر کی ذاتِ قاطع، موزوں شکل میں جلوہ گر ہوکر ضروری اصلاح کا فرض پورا کردیتی ہے!! انسانی آبادی ہمیشہ سے رُو بترقی ہے اس لیے جب کبھی اور جہاں کہیں۔ یہ آبادی مردُم شماری کے معیّن حدود سے بڑھ جاتی ہے فوراً حسبِ رفتارِ ترقی اس کی قطع و بُرید ہوجاتی ہے! "حسبِ رفتارِ ترقی" سے یہ مطلب ہے کہ جس حصّۂ مُلک میں دو افرادِ انسانی کی باہمی کوشش سال بھر میں صرف ایک تیسرے وجود کو پیدا کرسکے وہاں سنسر کی روح محض وبائے موسمی کے رنگ میں تھوڑے سے اجسام کا قلع قمع کرکے اعداد کی اصلاح کردیتی ہے، اور جس طبقۂ مردُم خیز میں ایک اور ایک مِل کر گیارہ ہوجاتے ہوں وہاں سنسر کی ذات بھی جنگِ تباہ کُن کی شکل

میں بلائے آسمانی کی طرح نازل ہو کر درجن کے درجن لمحوں میں فنا فی الحرب کر ڈالتی ہے!

جس طرح اور چیزوں کے لیے ایک خاص حد مقرر ہے اسی طرح لازمی ہے کہ اخبار و رسائل کے لیے بھی ہو! اجرائے اخبار و رسائل کی وبا موجودہ زمانہ میں اس قدر عالمگیر ہے جس قدر طاعون یا مرض مُلک گیری! اوّل اوّل تو محض اس خیال سے اخبار کے لیے سِنسَر کی ضرورت لاحق نہیں ہُوئی کہ ان کی ہستی کا قیام برساتی حشرات الارض سے زیادہ دیرپا نہ تھا؛ لیکن جب یہ ثابت ہُوا کہ اِن میں سے بعض اس قدر سخت جاں ہیں کہ باوجود بے التفاتیٔ زمانہ و نادہندیٔ خریداراں، مارے نہیں مرتے اور بعض اوقات اپنے حدود سے باہر پھلانگ جاتے ہیں تو لازم ہوا کہ سِنسَر کی ذاتِ والاصفات دُرّۂ محتسب کا پورا پورا استعمال شروع کر دے! چونکہ روزانہ و ہفتہ وار اخبار کی ترقی ماہواری رسائل سے سریع تر اور خوفناک تر ہے اس لیے جنابِ سِنسَر کی توجہ پہلے ان ہی کی جانب مبذول ہُوئی! اب یہ شکایت کہ بعض اوقات سِنسَر کا دستِ قطع و بُرید عبارت کے ساتھ مطلب پر بھی چھُری پھیر دیتا ہے محض مہمل ہے! مانا کہ بعض اوقات ہمدرد کے آج کل چھپنے والے پرچے۔ بلا روے رعایت۔ کسی ایسے شخص کے چہرے کے مانند ہوتے ہیں جس کو نیچر نے داڑھی کے بال۔ خال خال۔ یا دُو دُو اُنگل کے تفاوت پر۔ عطا کیے ہوں: مگر اس سے سِنسَر کی ہمہ فہم و ہمہ داں شخصیت پر کوئی بدنما نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا!

دراصل کسی چیز کے سِنسَر کرنے کے لیے ایک ایسی لیاقتِ معاملہ فہمی کی ضرورت ہے جیسی صدر خزانچی کو سِکّہ ہائے رواں کے۔ بہ یک نظر۔ کھوٹے اور کھرے پہچاننے کی ہوتی ہے! جس طرح خزانچی جی کے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر تیزی کے ساتھ پھسل کر جانے والے روپے، صرف اپنی آواز سے اپنی حقیقت ظاہر کر دیتے ہیں: بالکل اسی طرح کسی اخبار کی عبارت۔ باوجود اپنی روانی اور سُنانے والے کی تیز خوانی کے۔ سِنسَر کے ایک کان سے دوسرے کان تک جانے میں فوراً کھٹک جاتی ہے!

"خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد" کے موافق تمام قابلِ اصلاح اشیائے عالم بھی۔ اپنی

قوتِ بالیدگی وکیفیت مزاج کے لحاظ سے۔ مختلف طور پر محتاج قطع وبرید ہیں! بعض اشیاے عالم "آپ شریف راچاہ کجے بس است" کی مانند۔ سگِ زرد کی دُم خمیدہ کی طرح۔ صرف ایک مرتبہ کی اصلاح سے کبھی اپنی حدِ معینہ سے تجاوز کرنے کی جرأت نہیں کرتیں: لیکن بعض مادۂ فاسد سے پیدا ہونے والی چیزیں۔ سبزۂ خودرو کے مثال۔ باوجود استعمال سنسری۔ نوجوانوں کی ریش سکبال کی مانند۔ ہر چوبیس گھنٹے کی مدت میں اپنی مقررہ حدود سے باہر نکل جاتی ہیں! ان واقعات کو مدنظر رکھ کر سنسر کو شوریدہ سر کہنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے ؟

اب یہ سب کچھ سُن کر۔ جو ایک ذاتِ بابرکات کی مجمل داستان ہے۔ آپ فرمایئے کہ سنسر کیا ہے؟ ممکن ہے کہ آپ ہمارا مافی الضمیر سمجھنے میں عجلت سے کام لیکر۔ سنسر کو محتسب دُرّہ بدست۔ وبائے عالمگیر، جنگِ مغلوبہ۔ یا۔ ۔ زبان دقیانوسی وعام فہم۔ محض حجام کہ دیں! لیکن ہمارا یہ مطلب نہ کبھی تھا نہ ہے: اور اپنی غلط فہمی کے آپ ہی ذمہ دار اور جواب دہ ہیں!

"جان بُل"

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

میں بن گیا اڈیٹر سے مخبرِ وفادار　　اور نیشن کیس سے میرے چیخ اُٹھے سارے اخبار
ہمدرد۔ الہلال۔ اور کامرڈ۔ زمیندار　　پر ہونے کو ہے سرکار اس راز سے خبردار
دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدا را
درداکہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

اسپیچیں دیں دھواں دھار اور پمفلٹ بھی لکھے　　اور یوں دلوں پہ ہم نے پہلے بٹھائے سکے
گلچھرّے خوب اُڑائے پھر جمع کر کے چندے　　اب قوم مانگتی ہے اُن کا حساب ہم سے
دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدا را
درداکہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

"نقارۂ خدا"

تبسم

کلی کو مسکراتے اُس نے بے شک بارہا دیکھا
گلِ رعنا کو بھی گلشن میں ہنستے جا بجا دیکھا

نسیمِ صبح کی اٹکھیلیاں دیکھیں درختوں سے
گل و بلبل کی الفت کا بھی اُسنے ماجرا دیکھا

مئے خوش رنگ سے دیکھا چھلکتا رند کا ساغر
نمازِ فجر میں زاہد کے سر کو بھی جھکا دیکھا

غزالِ دشت کو دیکھا چھلانگیں مارتے اکثر
نشاط و شوق سے بچوں کا اُس نے کھیلنا دیکھا

چمک الماس میں دیکھی وہ جس سے آنکھ خیرہ تھی
دُرِ خوش آب دیکھا اور لعلِ بے بہا دیکھا

شبِ مہتاب میں نظارہ دیکھا شاخِ زریں کا
اور اُس نے تاج[1] کی صنعت کا نقشِ دلربا دیکھا

تڑپ بجلی کی دیکھی۔ آبشاروں کی روانی بھی
شفق کو وادیِ کشمیر سے حیرت فزا دیکھا

طلوعِ شمس دیکھا اور ہلالِ عید کا منظر
شبِ تاریک میں زہرہ کو اُس نے پُرضیا دیکھا

دکھائے اُس کو نظارے ہزاروں بزمِ ہستی نے
بہت کچھ آئینہ خانہ میں اُس نے خوشنما دیکھا

مگر یہ جلوہ ہائے حُسن ہیں سب ماند نظروں میں
تبسم جب تمہارا اے حبیبِ دلربا دیکھا

تبسم: جس کا جلوہ ہے لبوں پر اور آنکھوں میں
تبسم۔ جس کو اُس نے سر سے لیکر تا بپا دیکھا

تبسم۔ جو نشانی ہے محبت اور صداقت کی
چھپا سایہ میں جس کے اُس نے قلبِ باصفا دیکھا

تبسم۔ جو بشارت ہے خوشی اور شادمانی کی
تبسم۔ جس کو اُس نے کچھ عجب جادو ادا دیکھا

تبسم۔ جس کو خالق نے دیا ہے صرف انساں کو
تبسم۔ جس میں اُس نے جلوۂ خود کبریا دیکھا

مشیرِ عشق پر وہ بھول بیٹھا سارے عالم کو
جب اس جلوہ کو اُس نے آنکھ اُٹھا کر اے خدا دیکھا

مشیر حسین قدوائی (از لندن)

[1] تاج محل آگرہ۔

الناظر کی پالیسی

(صنفِ نازک کے حقوق کو نظر انداز کرنے کی شکایت)

ایک تعلیم یافتہ خاتون نے الناظر کی پالیسی میں تبدیلی واقع ہونے کے متعلق حسبِ ذیل شکایتی مراسلہ بھیجا ہے جسے اُن کی خواہش کے مطابق ہم یہاں شایع کرتے ہیں اور اُن کی شکایت کے بارے میں ہمارا جو جواب ہے اُسے مراسلہ کے ختم پر درج کرتے ہیں تاکہ اُن کو اور دوسروں کو ہمارے خیالات و عزائم کی اطلاع ہو جائے۔ ایڈیٹر

لاہور۔ ۶ر جولائی ۱۹۱۵ء

جناب ایڈیٹر صاحب رسالۂ الناظر

میں نے الناظر کے چند ابتدائی پرچے ایک خاتون سے مستعار لیکر پڑھے۔ آج کل الناظر کو جو میرے پاس آتا ہے نہایت شوق سے دیکھتی ہوں۔ مگر مجھے ان پرچوں کو اُن پرچوں کے ساتھ مقابلہ کر کے بہت افسوس ہُوا۔ اُس زمانہ میں الناظر ایک عجیب و دلفریب پرچہ تھا (زنانہ نکتۂ نگاہ سے) کیونکہ اُس میں صنفِ نسواں کی بابت کئی ایک چوٹی کے بہترین مضامین شایع ہو چکے ہیں۔ آج کل بمشکل کوئی ایک آدھ مضمون نظر آجاتا ہے۔

آپ نے آل انڈیا مُسلم لیڈیز کانفرنس پر جس دل سوزی اور دلی ہمدردی سے روشنی ڈالی اور اُس کی ضرورت کو مختلف نامہ نگارانِ الناظر نے جس خوبی سے پیش کیا ہے سب مضامین کو پڑھ کر میرا دل بے حد مسرور ہُوا۔ مگر افسوس اور تعجب تو اس بات کا ہے کہ وہی رسالہ جس میں ہماری اس کانفرنس کی ضرورت پر اِس شد و مد سے بحث کی گئی ہے اب تک اُس میں کانفرنس کے انعقاد اور دو زبردست جلسوں کی اطلاع تک شایع نہیں کی گئی کوئی دلچسپی نہیں لی گئی۔ لکھنؤ سے ایک خاتون بھی جلسہ میں شریک نہیں ہوئیں۔ جو انتہائی غفلت کا نتیجہ ہے۔ ایڈیٹر صاحب الناظر کو اگر اپنی قوم کی صنفِ نسواں اور زنانہ تحریک کے ساتھ

کچھ بھی دلچسپی ہے تو امید ہے کہ وہ مسلم لیڈیز کانفرنس کی ترقی کی تدابیر سوچنے اور اس پر عمل درآمد کرنے میں اب بھی ویسی ہی دلچسپی لیں گے کہ جس کا آج سے تین برس قبل اظہار کر چکے ہیں اور کانفرنس کے مقاصد کی اشاعت میں بحیثیت ایک مؤید کانفرنس کے حصہ لیں گے۔ کیسے افسوس کی بات ہے کہ سکرٹری کانفرنس نہایت مایوسی سے اس بات کا اظہار اکثر کرتی رہتی ہیں کہ جب وہ اخبارات کے دفتروں میں کانفرنس کے ماہانہ جلسہ کی روئداد بھیجتی ہیں تو عموماً اڈیٹر صاحبان تعصب سے اندھے ہو کر انھیں شایع نہیں کرتے۔ بہت سے اخبار زنانہ کانفرنس کا ذکر اپنے اخبار میں لکھنا بے عزتی اور کسر شان سمجھتے ہیں۔ ساقعہ مسلم لیڈیز کانفرنس کی ایک ممبر

ہمارا جواب

خاتون محترم! آپ کی شکایت ایک حد تک بجا و درست ہے۔ واقعی الناظر میں ابتداً کئی سال تک فرقۂ اناث کے لیے علمی غذا کا سامان مہیا کیا جاتا رہا اور اب کچھ عرصہ سے یہ شعبہ بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لیکن آپ جانتی ہیں کہ انسان کے سب ارادے کبھی پورے نہیں ہوا کرتے ۱۹۰۹ء میں جب الناظر جاری کیا گیا ہے تو اُس کے پہلے نمبر میں الناظر کے اجرا کی ضرورت سے ایک تمہیدی مضمون لکھا گیا تھا جس میں اس شعبہ کے متعلق حسب ذیل خیالات ظاہر کیے گئے تھے:۔

"تعلیم نسواں کی ضرورت کو ملک میں عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے اور ہر مقام پر مستورات کو موجودہ کس مپرسی اور جہالت کی حالت سے نکالنے کی بانواعِ مختلفہ جد وجہد ہو رہی ہے۔ صوبۂ اودھ میں یہ تحریک کچھ نئی نہیں۔ مولانا عبد الحلیم صاحب شرر۔ اور ان کے ہم خیال حضرات کے طفیل سے یہاں کے باشندے تعلیم نسواں کی ضرورت اور اہمیت سے ناآشنا نہیں۔ لیکن یہ فرقۂ اناث بھی اُسی بے شغلی۔ کم توجہی اور ملکی وقومی اغراض سے بے اتفاقی کے مرض میں مبتلا ہے جس میں ہمارے ہاں کے ذکور گرفتار ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم نسواں کا مسئلہ باوجودیکہ اس کو چھیڑے ہوئے سال ہا سال گزر گئے۔ تا دم حال خشتِ اول سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا اگر زمانہ کے پلٹے ہوئے رُخ اور تہذیب نسواں اور عفت خاتون کے اڈیٹروں کی ناملس کوششوں نے بہتیرے خاندانوں میں مستورات کی تعلیم کا خاطر خواہ پرچار نہ کر دیا ہوتا۔ اس لیے ہمارے خیال میں وقت آگیا ہے کہ ہم بھی اپنے ہاں کی

مستورات کے علمی ذوق کو پورا کرنے کا سامان کریں۔

اگرچہ یہ کام ایسا ہے کہ بغیر مستقل نسوانی اعانت (اڈیٹریں) کے باحسن وجوہ سرانجام نہیں ہو سکتا لیکن جب تک ویسی اعانت نہ مل سکے اُس وقت تک کے لیے ہو سکتا ہے کہ مستورات کے واسطے علمی غذا مہیا کرنے کا کام چند تعلیم یافتہ خواتین کی وقتی امداد سے ضمنی طور پر شروع کر دیا جائے "۔

جس وقت ان خیالات کا اظہار کیا گیا تھا اب اُسے چھ سال سے زائد گزر گئے ہیں اور اس عرصہ میں جو تلخ اور ناخوشگوار تجربات ہمیں ہوئے ہیں اور جو جو موانع اور مشکلات حائل راہ ہوئی ہیں اُنکی تفصیلی داستان اگر سنانے کی کوشش کی جائے تو آپ کی طبع نازک پر گراں گزرے گا۔ لیکن اب کہ آپ خود برسرِ حساب ہیں۔ جواباً اگر کوئی اجمالی تذکرہ ان واقعات کا کیا جائے تو امید ہے کہ آپ ہمیں معذور پا کر معاف فرمائیں گی۔

واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک صوبۂ اودھ یا شہر لکھنؤ کا تعلق ہے اجرائے الناظر کے چند ہی روز بعد ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہاں ہماری کوششیں بارآور نہیں ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ علمی امداد تو درکنار، یہاں کوئی الناظر جیسے پرچوں کا پڑھنے والا بھی تو میسر نہیں آتا۔ وہ خواتین، جو لاٹ صاحب کی میم صاحبہ سے ہاتھ ملانے کی عزت حاصل کرنے۔ فرنگی عورتوں کی وضع قطع کا بہ تہ اُتارنے اور یورپین طریقوں سے اپنے بچوں کی پرورش کرنے کے لیے ہر قسم کی مالی قربانی گوارا کرتی ہیں اُن کی دلچسپی اور توجہ کا اس سے اندازہ کیجیے کہ وہ الناظر کی قیمت تک خوشی خوشی نہیں دے سکتیں۔ ہاں کوئی قوم فروشی کرکے اُن کے آنریبل شوہروں کے ہاتھ پر بیعت کرے ان کی ثنا و صفت میں رطب اللسان رہے اور اُن کے کونسل کے کارناموں پر تحسین و آفریں کرتا رہے تو البتہ ممکن ہے کہ اُنکے دسترخوانِ کرم کی زلّہ ربائی کر سکے۔ مقامی طبقۂ نسواں کی اس عدم توجہ کے باوجود محض اس خیال سے کہ غیرمقامی خواتین ہماری تحریک پر مضامین بھی

لکھتی ہیں اور رسالہ کو شوق اور توجہ سے پڑھتی ہیں ہمنے اس سلسلہ کو جاری رکھنا اپنا فرض سمجھا اور یہاں کی اکثر خواتین کو محض بنظر تشویق و ترغیب عرصہ تک بلاقیمت پرچے دیتے رہے۔ لیکن جب ۱۹۱۱ء میں ہم نے عورتوں کی عزت کے عنوان سے جو ایک مضمون شایع کیا اُس کی وجہ سے بیرونی خواتین کی ہمدردی سے بھی ہم محروم ہوگئے۔ ایک مقتدر خاتون نے جن کی لیاقت کا ملک بھر میں شہرہ ہے اور جو شروع میں ہمیں بہت کچھ امداد دیتی رہی ہیں اور جس کے لیے ہم اُن کے ہمیشہ شکرگزار رہے اور رہیں گے۔ اُس پرچہ کو پُرزہ پُرزہ کرکے ہمارے پاس واپس بھیجدیا۔ ایک خودمختار رئیس کے شکوے ملے جن میں ہدایت ہوئی کہ آیندہ رسالۂ الناظر کو اُس آستانۂ والا کی جبہہ سائی کی عزت نہیں حاصل ہو سکتی۔ لاہور کے ایک معزز اخبار نویس نے جن کی کوششوں کے اعتراف میں پہلے بھی اور اب بھی ہمیں کبھی تامل نہیں ہوا، پرائیویٹ خطوط لکھ لکھ کر بیرونی خواتین کو اس رسالہ کے خلاف بھڑکایا اور اس کی خریداری بند کرنے کا مشورہ دیا۔ اور کچھ دنوں بعد حضور بیگم صاحبہ بھوپال نے بھی اس رسالہ کو اپنے دربار میں حاضری کے افتخار سے محروم کردیا (یہ واضح رہے کہ سرکارِ عالیہ کے یہاں سے رسالۂ ہذا کو کبھی کوئی مالی امداد نہیں ملتی تھی) ان تمام اسباب کی وجہ سے رفتہ رفتہ یہ شعبہ خودبخود ہمارے نظامِ عمل سے خارج ہوگیا۔ اور چونکہ ہم ذاتی طور پر اور اپنے خاص رجحانات۔ خیالات اور رایوں کی بنا پر اس بات سے قاصر تھے کہ طبقۂ اناث کی اس بیزاری کو رفع کرسکیں اور جیسی کہ ہماری خواہش تھی کوئی مستقل نسوانی اعانت ہمیں مل نہ سکتی تھی اس لیے ہم نے اسی کو غنیمت جانا کہ اپنی ساری توجہ الناظر کے دوسرے مقاصد کے حصول میں صرف کریں۔ (اگرچہ تجربہ شاہد ہے کہ اس بارہ میں بھی ہمیں چنداں کامیابی نہیں ہے، لیکن یہ کیا کم ہے کہ دو چار تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دلوں میں اپنی مادری زبان کی خدمت کرنے کا ولولہ اسی ذریعہ سے پیدا ہوگیا ہے اور ملک کے بعض اربابِ ذوق کو الناظر کے ساتھ ایک قسم کی وابستگی اور دلچسپی ہے، جسے اب تک ہم اپنی تمام محنت۔ مصیبت اور مالی خسارون کا کافی سے زیادہ معاوضہ خیال کرتے رہے ہیں)

اصولاً اگر غور کیا جائے تو ہمارے نظام عمل میں ایک طرح کا تناقض پایا جاتا تھا یعنی ایک طرف تو ہم الناظر کو ایک علمی رسالہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے جس کی وجہ سے طبقۂ ذکور میں بھی صرف خالص علمی ذوق رکھنے والے حضرات اُسے پسند کر سکتے ہیں اور دوسری طرف اُس طبقہ کی دلچسپی کا سامان فراہم کرنے کی فکر رکھتے تھے جن کا ذوق علمی عام طور پر تہذیب النسواں کی سطح سے بھی ہنوز لبند نہیں ہونے پایا ہے۔ (چند مستثنیات کا یہاں ذکر نہیں ہے) جس کا نتیجہ لازمی یہ تھا کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک گروہ کو راضی نہیں رکھ سکتے تھے۔ لہذا جب تھوڑے دنوں کے تجربہ کے بعد اپنے طرزِ عمل کی غلطی محسوس ہونے لگی اور اتفاق سے ایک طرف ہو رہنے کا موقع بھی ہاتھ آ گیا تو ہم نے اُس سے فائدہ اُٹھا کر اس ضمنی شعبہ کو خیرباد کہا۔

لیکن اب بھی ہم کبھی کبھی خواتین کے ایسے مضامین شایع کرتے رہتے ہیں جو ادبی حیثیت سے اگر قابل پسند ہوتے ہیں تو عورتوں کی دلچسپی کا سامان بھی اُن میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ مگر فی الاصل یہ مضامین الناظر کے علمی۔ ادبی یا معاشرتی مضامین کے زمرہ میں شمار ہونے کے قابل ہوتے ہیں، صنفِ نسواں کے لیے مخصوص نہیں ہوتے۔

آپ جانتی ہیں کہ اخبارات و رسائل کے قبضہ و تصرف میں مالک و اڈیٹر کے علاوہ پبلک بھی شریک رہتی ہے۔ اور مالک و اڈیٹر کا جہاں یہ فرض ہے کہ پبلک کی رہنمائی اور اُس کے مذاق کی اصلاح کرتا ہے وہاں وہ اس کے لیے بھی مجبور ہے کہ اپنے ناظرین کی دلچسپی اور اُنکی ضرورتوں کا لحاظ رکھے۔ تہذیب النسواں کو اگر سب عورتیں پڑھنا چھوڑ دیں اور صرف مرد ہی اُس کے خریدار رہ جائیں تو سید ممتاز علی صاحب کو بھی اُس کے مضامین کی نوعیت بدل دینا پڑے گی۔ اسی طرح اگر زمانہ یا معلومات کو کثرت سے عورتیں خریدنے لگیں اور مردوں کی توجہ کم ہو جائے تو نگم صاحب اور مسٹر عبد الوالی مجبور ہوں گے کہ اپنے رسالہ کو خواتین کی دلچسپی کا ذریعہ بنا دیں۔ یہی کیفیت ہماری ہے۔ الناظر کے پڑھنے والے زیادہ تر ایسے صاحب ہیں جو

اُردو میں علمی مضامین اور اعلےٰ درجہ کی انشا پردازی کے نمونے دیکھنا چاہتے ہیں اور اگرچہ ان کی تعداد کم ہے اور ہمیں اسی سبب سے ہر سال کافی مالی نقصان اُٹھانا پڑتا ہے لیکن ہم اپنا فرض جانتے ہیں کہ ان اصحاب کے ذوق علمی کو پورا کرتے رہیں اور تا امکان اس فرض کی ادائی سے دریغ نہیں کرتے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

آپ کی کانفرنس سے ہمیں جو ہمدردی پہلے تھی وہی اب بھی ہے۔ اور اگر ذاتی ترفع اور شہرت طلبی کے مقاصد اس کے علمی کارناموں میں نمودار نہ ہوے تو شاید اس ہمدردی میں کبھی فرق نہ آئے گا۔ البتہ اپنا احوال یہ ہے کہ

جس سے مطلب نہیں رکھتے ہیں ستاتے بھی نہیں

اور چونکہ الناظر کے مقاصد سے شعبۂ نسواں خارج ہو چکا ہے اس لیے یہی کافی سمجھا گیا کہ نظرے خوش گزرے کے تحت میں اس کا ذکر کر دیا جائے فقط

غزل

آنکھ اچھی نگہِ ہوش رُبا بھی اچھی ‏ تیرے انداز بھی اچھے ہیں ادا بھی اچھی
تو نہ پہلو میں ہو تو جینے سے مرنا اچھا ‏ سامنے تیرے جو آئے وہ قضا بھی اچھی
زہر دیتے ہیں تسلی نہیں دیتے ہم کو ‏ دردمندوں کی وہ کرتے ہیں دوا بھی اچھی
دل جو توڑو گے تڑپ جاؤ گے سنکر فریاد ‏ شیشہ ٹوٹے گا اگر ہے گا صدا بھی اچھی
لے کے چٹکی کسی بیباک کا ہنس کر کہنا ‏ دل میں ہے درد تو آتی ہے دوا بھی اچھی
آئے جو کچھ ترے دل میں ہمیں کہہ لے کافر ‏ بد دعا بھی تری اچھی ہے دعا بھی اچھی
آستانے سے جو اُٹھوایا ہی اُس بت نے جگر
سر جھکانے کو ہے درگاہِ خدا بھی اچھی

جگر صدیقی (سیوانی)

حمد

حمد خالق میں عندلیبِ قلم گُل فشاں ہے زہے نصیبِ قلم
غنچے دیتے ہیں یوں چٹک کے صدا وحدہٗ لاشریک ہے وہ خدا
بیل بوٹوں میں رنگ قدرت کا پتّا پتّا گواہ صنعت کا
کوئی سمجھا نہ آج تک یہ راز سرو و قمری میں کیوں ہے ناز و نیاز
کرتی ہے نالہ و بکا بُلبُل گُل تر ہے کیوں فدائے بُلبُل
لالہ و گُل کے روئے رنگیں سے سرخ مخمل کے ہیں کھلے طاقے
ڈھنگ نرگس میں چشمِ مردُم کا رنگ غنچوں میں ہے تبسّم کا
سر اُٹھائے ہوے پہاڑ کہیں بُلبُل و گُل میں چھیڑ چھاڑ کہیں
اُس کی قدرت کا کچھ حساب نہیں اُس کی صنعت کا کچھ جواب نہیں
کیسے کیسے حسیں کیے پیدا نازنیں مہ جبیں کیے پیدا
باغِ عالم کو زیب و زینت دی لوٹ ہو جائیں دل وہ صورت دی
کیا تاروں کا خوش نما ہے چمن آسماں کو بنا دیا ہے چمن

ہر جگہ ہے غرض وہی مستور
چاند سورج میں ہے اُسی کا ظہور

دیکھ کر جلوہ اُس کی قدرت کا ہے فرشتوں میں شورِ صلِّ علٰے
حمد کرتے ہیں اُس کی جن و بشر اُس کے اوصاف ہیں زبانوں پر
ایسی آنکھیں کہاں سے لائیں ہم جس کی قدرت کو دیکھ پائیں ہم
آنکھیں بینا مری اگر ہو جائیں آئینہ صنعتیں گر ہو جائیں
ذاتِ باری کو کوئی کیا جانے آپ اپنے کو وہ خدا جانے

محوِ حیرت ہے چشمِ اہلِ نظر
خامشی یاں سخن سے ہے بہتر

رسا ہمدانی

نگم و سرور و شاکر

اڈیٹر صاحب زمانہ کہتے ہیں کہ "کہیر سخن" کے نام سے جو مجموعۂ نظم شاکر نے شایع کیا ہے وہ سرور مہروری کی موزونی طبع کا نتیجہ ہے۔ اور شاکر صاحب شاکی ہیں کہ میرے نتیجۂ افکار کو حوالۂ سرقہ کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۰ء کے زمانہ اگست نمبر میں ایک مختصر نوٹ من جانب اڈیٹر شایع ہوا تھا جس پر یہ بحث چھڑی۔ اس کا جواب ضمیمہ لعصہ ۱ دسمبر ۱۹۱۰ء میں بعنوان ذیل نکلا:

زمانہ مجکو برا کہہ رہا ہے کہنے دو ۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں زمانہ کا اعتبار نہیں

اسپر ہمنے دسمبر مذکور کے الناظر میں "کہیر سخن" پر تنقید کرتے ہوئے اڈیٹر صاحب زمانہ سے خواہش کی تھی کہ

اگر اڈیٹر صاحب زمانہ اس تہمتی کو جو اُنھوں نے (الخ) دی ہے ثابت کرنے کی طرف التفات فرما کر اس ثبوت کو پیش کر دیں جس کی بنا پر انھوں نے حضرت شاکر کو متہم کرنے کی جرأت کی ہے تو یہ اُن کا احسان نہ صرف انکے متوفی دوست سرور پر ہوگا بلکہ پبلک کو بھی ایک بری غلط فہمی سے نجات ملے گی

اس بحث کے خاتمہ کا فیصلہ کن طریقہ طلب ثبوت ہی تھا۔ جس پر نگم صاحب نے جنوری سنہ رواں کے زمانہ میں مسٹر پریم چند کا ایک خط شایع کیا ہے اور فروری نمبر میں "سرور و شاکر" کے عنوان سے چار صفحے بھرنے کے بعد (۱۰) وہ خطوط جو شاکر نے سرور کے نام لکھے تھے، بطور ثبوت درج کیے ہیں جن کے ملاحظہ سے واضح ہوتا ہے کہ وقتاً فوقتاً شاکر صاحب نے اکثر انگریزی اور سنسکرت نظموں کے ترجمے۔ بعض شاعرانہ مفاہیم کے خاکے اور ۔۔ دے اور بعض دیگر نثر مضامین کے تراجم بغرض تنظیم سرور صاحب کو بھیجے۔ اُن کے معاوضے ادا کیے۔ اور نظمیں تیار کرا کر منگائیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان خطوط میں کا پیدا اس کی نظموں کے متعلق "جز" اور "ن کی رت" کے اور کسی نظم کا عنوان یا نام تحریر نہیں ہے۔ حالانکہ دوسری اور کثیر التعداد نظموں کے عنوان جو ۔۔ ر صاحب سے لکھائی گئیں یا اُنکے لکھنے کے لیے تحریک کی گئی بالصراحت درج ہیں۔ مثلاً میری ان کی قبر

آسمانی گھر۔ آج۔ خاتمہ۔ میں کیوں زندہ ہوں۔ ڈائری لاسٹ وغیرہ۔ اس لیے صحیح طور پر یہ پتہ نہیں چلتا کہ کالی داس کی کون سی نظموں کے متعلق یہ مراسلت ہے۔ نہ وہ مزید خطوط شایع کیے گئے جن میں سرور کی مرسلہ نظموں کی رسید شاکر صاحب نے دی ہو۔ اور اُن سے پایا جاتا ہو کہ شاکر صاحب نے ان نظموں کو اپنے نام سے شایع کرنے کے لیے تیار کرایا ہے۔ کالی داس کی ایک نظم "اوس کی رت" کا نام اس مراسلت میں آیا ہے مگر وہ "اکسیر سخن" میں نہیں ہے۔ اکسیر سخن والی نظموں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) گرشبم۔ (۲) برکھا (۳) شرد۔ (۴) ہیمنت۔ (۵) ششر (۶) بسنت۔

البتہ خط نمبر۲ میں خریف (شرد) کے متعلق شاکر صاحب نے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں۔

موسم خریف میں مجھے امید ہے کہ آپ نے جابجا تبدیلیاں کر دی ہوں گی۔

اور خط نمبر ۱ میں ہیمنت کے متعلق یہ عبارت ہے۔

زمانہ نے ہیمنت کو شایع کیا۔ مگر نہ معلوم چھ بند کیوں چھوڑ دیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے تحریری کاغذ کا ایک صفحہ گم ہو گیا۔ میں نے ہر صفحہ پر ۶ بند لکھے تھے اور ایک ہی صفحہ کے ۶ بند شایع نہیں ہوے....

تمام خطوط میں اکسیر سخن کی نظموں کے متعلق صرف اسی قدر عبارت ہے جس سے اس تنقیح کا فیصلہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اکسیر سخن والی نظمیں شاکر صاحب کی لکھی ہوئی نہیں ہیں بلکہ سرور کی موزوں کردہ ہیں۔ اور ہم کو اس بحث میں صرف اکسیر سخن والی نظموں کے متعلق فیصلہ کرنا ہے نہ کہ دوسری نظموں کے متعلق۔ اس لیے اصولاً یہ سلسلہ یہیں ختم ہو گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ نظم ہاے مذکور کے متعلق فیصلہ کرانا کوئی قطعی شہادت نہیں دے سکتے اور موجودہ ثبوت نگم صاحب کے دعوے کے ثابت کرنے کے لیے غیر کافی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اکسیر سخن والی نظمیں نہ سہی، دوسری نظمیں تو شاکر صاحب نے سرور سے لکھا کر اپنے نام سے شایع کی ہیں۔ تو واقعات سے اس کی بھی تردید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہوں اقتباسات ذیل۔

خط نمبر ۱ (۱) گرو گوبند سنگھ کے لڑکوں کا استقلال (۲) میں کیوں زندہ ہوں۔ ان دونوں نظموں کا انتظار

کر رہا ہوں۔ میرے پاس دلچسپ مضامین علاوہ کالی داس کی نظموں کے ترجمے تیار ہیں۔
چند ایک سرخیاں یہ ہیں۔ (۱) میری ماں کی قبر (۲) آسمانی گھر (۳) امداد بیکساں (۴) آج
(۵) خاتمہ بالخیر۔ شروع کے تینوں عنوان انگریزی نظم ہیں۔ آج اور خاتمہ بالخیر نثر ہیں۔ مگر
انگریزی خیالات ان میں موجود ہیں۔ خصوصاً خاتمہ بالخیر تو انگریزی ہی مضمون کا ترجمہ ہے۔ مگر
نہایت دلچسپ۔ اب آپ کے جواب کا بیحد انتظار ہے جو ایسی تحریر فرمائیے۔

خط نمبر۳ "آنے والی گھڑی" اور "خاتمہ" کا انتظار ہے اُمید کہ جلد ارسال فرمائیے گا۔ آنے والی گھڑی اور
خاتمہ کا میں بے دلی سے انتظار کر رہا ہوں۔

خط نمبر۴ آنے والی گھڑی کا تو نہیں البتہ خاتمہ کا مجھے افسوس ہے مگر اس کی وجہ خاص ہے ایک تو
وہ مذہبی نکتۂ خیال سے لکھا گیا تھا دوم اس پر ۳-۴ مصنفین کے خیالات سے مدد لی گئی تھی۔ مگر جو
ہو گیا سو ہو گیا۔ اس کا کچھ خیال نہ فرمائیے۔

خط نمبر۶ اسکے ساتھ ... امداد بیکساں کو بیں۔ اور جس قدر جلد ممکن ہو میرے نام ارسال کر دیجیے۔
امداد بیکیاں" اُسی قسم کے ترجیع بند کی صورت میں جیسا کہ آپ نے "یارانِ رفتہ" (مندرجۂ مخزن)
کہا تھا، کہیں۔ "خاتمہ" بہت عمدہ رہا اور تنویر المشرق میں اس کو دیکھ کر طبیعت بے حد متاثر ہوئی۔

ان عبارتوں سے ظاہر ہو گا کہ مسٹر شاکر نے کس قدر اصرار اور دلچسپی سے ان نظموں کو لکھایا اور خود ان کا میٹریل مہیا کیا۔ مگر شایع یہ سرور ہی کے نام سے ہوئیں۔ اور مسٹر شاکر ہی نے انکو سرور کے نام سے شائع کرایا۔ اگر مسٹر شاکر کے خطوط کا یہ مفہوم ہوتا جیسا کہ نگم صاحب سمجھے ہوئے ہیں کہ شاکر صاحب کا نظمیں لکھانا اپنے نام سے شایع کرنے کے لیے مقصود تھا، تو۔ آنے والی گھڑی۔ امدادِ بیکساں۔ گرو گوبند سنگھ کے لڑکوں کا استقلال۔ خاتمہ۔ ایک آرزو۔ وغیرہ سرور صاحب کے نام سے کیوں چھاپی جاتیں۔ دراصل یہ مسٹر شاکر کی ایک خاص عادت ہے کہ وہ مؤلفین اور شعراء سے خاص طور پر فرمائش کرکے نظم ونثر لکھایا کرتے ہیں۔ اسکے لیے مسالہ دیتے ہیں۔ معاوضہ پیش کرتے ہیں اور عمدہ چیزیں تیار کرا لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی قابل تعریف بات ہے جس کی مثالیں بہت کم

مل سکتی ہیں - چنانچہ اُنھوں نے مسٹر پریم چند کو بھی لکھا تھا کہ

اگر آپ میرے دیے ہوے میٹرل سے کچھ مختصر قصے لکھدیں تو میں ایک باتصویر مجموعہ قصوں کا چھاپ دونگا

لیکن کاپی رائٹ طے نہ ہوا اور یہ معاملہ معرضِ التواء میں پڑ گیا - اس واقعہ سے یقیناً پریم چند صاحب کو بھی انکار نہ ہوگا - مجھے اس خط و کتابت کا پورا علم ہے - اس میں نہایت وضاحت سے ظاہر کر دیا گیا تھا کہ یہ قصے پریم چند صاحب ہی کے نام سے شایع ہوں گے اور شاکر پبلشر رہیں گے - اکسیر سخن کا مقدمہ لکھنے کی حالت میں بھی پریم چند صاحب کو مسٹر شاکر نے اس قدر میٹرل بھیجدیا تھا جس کی مدد سے ایسے ایسے دو مقدمے بآسانی لکھے جا سکتے تھے -

سید محمد فاروق شاہ پوری سے اساتذۂ اُردو کے متعلق شاکر نے تنقیدیں لکھائیں جو کسی وقت کتابی صورت میں شایع ہوں گی - ان میں سے بہت سے مضامین ادیب و العصر میں صاحب موصوف ہی کے نام سے شایع ہو چکے ہیں - ان کے لیے بھی شاکر نے بہت سا میٹرل دیا تھا - آرشد تھانوی سے چار سال ہوے کچھ نظمیں شاکر نے بچوں کے لیے نمونے اور خاکے بھیجکر منگائیں جو عنقریب صاحبِ نظم ہی کے نام سے انگریزی طرز پر باتصویر کتابی صورت میں چھپنے والی ہیں -

اسی طرح سُرور مبرور سے بھی وقتاً فوقتاً میٹرل اور خاکے دے دے کر نظمیں لکھائی گئی تھیں جن کا تذکرہ ان خطوط میں ہے - اور حال میں شاکر صاحب نے اپنے مضمون میں اس کی صراحت کرتے ہوے ضمیمۂ العصر میں لکھا ہے کہ

> سُرور مرحوم کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام میرے پاس اب تک موجود ہے - بعض نظمیں میں نے ادیب میں شایع کیں اور بعض العصر میں چھاپیں - ان کے علاوہ ابھی کافی ذخیرہ ہے جس کی اشاعت کا حق مرحوم کے برادرِ کلاں نے تحریر کے ذریعہ سے مجھے مرحمت فرمایا ہے - یہ مجموعہ کم و بیش دس بارہ جز کا ہوگا - کچھ نظمیں ان میں ایسی ہیں جو جناب سُرور نے بزمانۂ قیام الہ آباد کہی تھیں - اور جامِ سُرور (جلد دوم) کے لیے مجھے دی تھیں - بعض وہ نظمیں ہیں جو خاص میری فرمایش پر کہی گئی تھیں -

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ضرور یہ نظمیں جن کا خطوط میں ذکر ہے شاکر کے پاس موجود ہیں اور وہ مسٹر سروری کے نام سے شایع ہوں گی جیسا کہ ادیب و العصر میں کئی غیر مطبوعہ نظموں کی اشاعت سے ثابت ہوتا ہے مگر با ہمہ یہ رائے قائم کرنا کہ سرور کی نظموں کو شاکر نے اپنے نام سے شایع کیا ہے سوءظنی نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم کو واقعات کی تنقیح کرنے میں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ نتیجہ کس کے خلاف مترتب ہوگا۔ غلطی کرنے والا شخص عام اس سے کہ کوئی ہو ہر حالت میں مستوجبِ سرزنش ہے اور اُس کی رسوائی پر کسی کو ہمدردی نہ ہونا چاہیے۔ ہماری پہلی تحریر کا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ فریقین میں سے کسی ایک کی طرف داری یا حمایت کی جائے جیسا کہ مسٹر حق پسند نے اکسیر سخن پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ہم کو شاکر صاحب کے فیور میں سمجھا ہے اور ایڈیٹر صاحب الناظر کی کمزوریِ رازداری سے فائدہ اُٹھا کر ہماری شخصیت سے اطلاع حاصل کرنے کے بعد ہمیں لفظ دوست سے عزت بخشی ہے بلکہ ہم صحیح تحقیقات کے بعد اس امر کو طے کرنا چاہتے ہیں کہ اصلیت واقعہ کیا ہے اگر حقیقتاً مسٹر شاکر نے سرور کا کلام اپنے نام سے شایع کیا ہے تو گم صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک بہت بڑی غلطی کی اصلاح کر دی لیکن بصورت ثانی اس معاصرانہ دل آزاری کے لیے وہ بھی کسی طرح قابلِ معافی نہیں ہو سکتے۔ اور اس لیے اُن کو کافی و واضح ثبوت اپنے دعوے کی تائید میں پیش کرنا چاہیے۔ ہمنے بجاے زمانہ یا العصر کے اپنی تحریرات کی اشاعت کا بار الناظر کے صفحات پر اسی لیے ڈالا ہے کہ دونوں میں سے ایک کی غیر صحیح موافقت کا خفیف سا رُجحان بھی ہمارے ذہن میں پیدا نہ ہو۔ تاہم ہماری خواہش یہ ہے کہ چونکہ مسٹر گم ہمکو شاکر صاحب کا "گوادچیت" لکھ کر اپنے دل کو تسکین دینا چاہتے ہیں اس لیے کوئی اور صاحب اس تمام مواد کو ملحوظ رکھکر ایک مدلل و منصفانہ مضمون لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ اگر خان بہادر میرزا سلطان احمد صاحب ممبر مال بھاول پور تکلیف کرنا پسند فرمائیں تو زیادہ بہتر ہوگا جو معمولی تحریرات میں بھی منطقی مسائل اور تنقیحات کو استعمال فرمانے کے خوگر ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ عرض کر دینا بھی بیجا نہ ہوگا کہ اگر شاکر صاحب کی نسبت یہ ثابت ہو جائے کہ ان نظموں کو انھوں نے سروری سے لکھایا تو مسٹر گم بھی اخلاقی گناہ سے

بڑی نہیں ہو سکتے کہ اُنھوں نے دانستہ اس میں مدد کی۔ جبکہ جنوری سنہ ۱۹ء کے زمانہ کی اشاعت کے بعد ہی اُن کو معلوم ہو گیا تھا کہ حضرتِ سُرور ہی اکسیرِ سخن کی نظموں کے مصنف ہیں تو کیوں اُنھوں نے پبلک کو دھوکہ میں رکھا۔ سُرور کا انتقال ۳ دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء کو ہُوا ہے اور نگم صاحب نے بقول خود یہ وعدہ سُرور سے کیا تھا کہ ان کی حیات میں یہ راز افشا نہ کریں گے۔ لیکن ۱۴ دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء کو نگم صاحب نے شاکر کو خط لکھ کر اکسیرِ سخن کی نظمیں بغرض انطباع طلب فرمائی تھیں۔ پھر ۱۳ اپریل سنہ ۱۹۱۱ء کو ان نظموں کو کتابی صورت میں شایع کرنے کے لیے طلب فرمایا ہے اُس وقت بھی اس راز کا افشا کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ مبلغ ۱۰ روپیہ اور ۲۵ جلدیں معاوضہ میں شاکر صاحب کو دے کر کتاب کو باتصویر چھاپنے کا خیال ظاہر فرمایا۔ جبکہ مسٹر شاکر رضامند نہیں ہوئے۔ بہت ممکن ہے کہ اب یہ افشائے راز ذاتی تکدر پر مبنی نہ ہو۔ لیکن کوئی دوسری وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بہر کیف۔ ع۔ ہم سخن سنج ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔

(ابوالرشاد)

اللہ دشمنوں پہ گماں دوستی کا ہے　　اُنکی نظر میں اب یہ بھرم عاشقی کا ہے
اے دل جو کرب درد ہے بس آج ہی کا ہے　　بیمار ہجر اور گھڑی دو گھڑی کا ہے
کیفیتِ جراحتِ دل پوچھتے ہیں وہ　　مدِ نظر علاج مری خستگی کا ہے
اللہ، میری شامِ الم کی اُداسیاں　　جس سمت دیکھتا ہوں سماں بیکسی کا ہے
رخصت طلب ہیں وہ دلِ حسرت نصیب سے　　منظر مری نگاہ میں کیا بیکسی کا ہے
آرایشِ جمال ہے گو باعثِ فروغ　　عالم مگر کچھ اور تری سادگی کا ہے
پابندِ دامِ حسرتِ دل ہوں میں نامراد　　اب حوصلہ کہاں مجھے وارستگی کا ہے
اندوہ آفریں ہے تصور بھی عیش کا　　مجھ کو کہاں دماغ اب آسودگی کا ہے
جرأت طلب ہے کوششِ اظہارِ آرزو　　کیا رنگ اُن کے سامنے دل کی لگی کا ہے
ماتم ہے رات دن دلِ حسرت پرست کا　　اب آہ و نالہ میرے لیے ہر گھڑی کا ہے
میں ایک شمع کشتہ محفل ہوں دہر میں　　کیا پوچھنا حضور مری زندگی کا ہے

کیا قومیں بھی بچہ، جوان اور بوڑھی ہوتی ہیں

چارلس ڈارون کے مسئلہ ارتقاء نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے اور مشاہدات بھی بتلا رہے ہیں کہ دُنیا میں کوئی چیز بھی ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہتی۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے "عالَم تغیر پذیر ہے" ایک سکنڈ کے ہزارویں حصہ پہلے، ایک شے کی جو حالت رہتی ہے وہ ایک سکنڈ کے بعد نہیں رہتی۔ ہلال روز بروز بڑھتا ہی رہا اور بدر کو ہمیشہ گھٹنا ہی نصیب ہُوا۔ پھولوں کے رنگ و بو جو کل تھی وہ آج نہیں۔ انسان کی کل کی طبیعت اور ارادے آج عنقا ہیں۔ یہاں تک کہ مادوں کے اجسام میں بھی لمحہ بہ لمحہ تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ یہی تبدیلیاں اور تغیرات ہیں جو انسان اور دوسری مخلوق کی زندگی کو خوش گوار اور مزہ دار بناتے ہیں۔ ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو دُنیا والوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی۔ اس مختصر سی بحث کے بعد ہم اس نتیجہ پہ پہنچتے ہیں کہ دُنیا تغیر پذیر ہے۔ جب دنیا تغیر پذیر ہے تو یقیناً قومیں جن کا تعلق دنیا سے ہے متغیر ہیں۔

قومیں کیا ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جو اس وقت دل میں خود بخود پیدا ہوتا ہے اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں یہاں تھوڑا سا ذکر کر دیا جائے۔

یہ بات تو مسلّم ہے کہ انسان کو خداوند تعالیٰ نے کچھ اس طرح بنایا ہے جو ہمیشہ مِل جُل کر رہتا اور متمدّنہ زندگی بسر کرتا ہے۔ چند انسانوں کا آپس میں مِل جُل کر رہنے کا نام خاندان ہے۔ بہت سے خاندان مِل کر ایک فرقہ کہلاتا ہے اور بہت سے فرقوں کا مجمع قوم ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بہت سارے فرقے ایک سرزمین کے ہوں اور خواہشات، رسم و رواج، اور زبان ایک ہی قسم کے رکھتے ہوں۔ وغیرہ" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوم کا جوہر فرد ایک انسان ہی ہے۔

دنیا کی تغیر پذیر حالت اور قوم کی تعریف پیش نظر رکھ کر اب جب ہم قوم کی زندگی پر نظر

ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اور دوسری مخلوقات کی طرح قومیں بھی عدم سے وجود میں آتی ہیں۔ یعنی چند خاندان، فرقے وغیرہ مل کر ایک نئی قوم بناتے ہیں۔ جب کوئی چیز عدم سے وجود میں آتی ہے تو وہ اُس کا پیدا ہونا ہے اور یہاں سے بچپن کی مالا کی پہلی لڑی شروع ہوتی ہے۔ جب ایک درخت پہلے پہل اُگتا ہے تو ہم کہتے ہیں یہ ابھی "بچہ" ہے یعنی اسکو پیدا ہوئے تھوڑے ہی دن ہوے۔ ایسا ہی انسان ہو یا حیوان، ذی روح ہو یا غیر ذی روح سب کو بچپن کے اسٹیج پر قدم رکھے بغیر مفر نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس قومیں بھی اس سے علٰحدہ نہیں رہ سکتیں۔ انکا عدم سے وجود میں آنا ان کا پیدا ہونا ہے اور یہیں سے ان کے بچپن کی ابتدا ہوتی ہے۔

جوں ہی کہ کوئی چیز دنیا میں پیدا ہوتی ہے وہ ترقی کرنے لگتی ہے اور دن بدن ترقی کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح قومیں بھی بچپن کے عالم سے ترقی کرتی جاتی ہیں اور دن دونی ترقی کرتی ہیں۔ جس طرح ایک بچہ اپنے بچپن کی حالت سے روز افزوں بڑھتا جاتا ہے اور آخرکار بڑھتے بڑھتے ایک ایسی حالت پر پہنچ جاتا ہے کہ اُسکے آگے بڑھنا یا ترقی کرنا محال ہے۔ جب وہ آگے ترقی نہ کر سکے تو یقیناً اُسکو گھٹنا چاہیے۔ کیونکہ دنیا تغیر پذیر ہے۔ اس لیے اس کی حالت میں بھی تغیر ہونا چاہیے اور وہ تغیر کیا ہے زوال ہے۔ بچپن سے جوانی تک ترقی اور جوانی سے بڑھاپے تک زوال اور زوال کا انتہائی درجہ موت ہے۔ گویا زندگی کی (Maximum Density) (کمال و بازت) جوانی ہے۔ یہی حالت اور دوسری دنیاوی چیزوں کی ہے۔ لہذا قوم جو دنیا میں ہے کس طرح اس قانون سے علٰحدہ ہو سکتی ہے۔ وہ بھی پیدا ہوتی ہے اور ترقی کرتی جاتی ہے۔ اور اُس کی یہ دن دونی ترقی کرنا گویا اُس کا بچپن ہے۔ اور ترقی کرتے کرتے عروج کی حالت کو پہنچ جانا اس کی جوانی ہے۔ عروج سے زوال پانا اس کا بڑھاپا اور انتہائی زوال اسکی موت پس معلوم ہوا کہ دنیا کی تمام چیزوں کی تین حالتیں ہیں اور قومیت کا قانون ہے جو شکست نہیں ہو سکتا

تاریخ کے صفحے اُلٹنے سے پتہ چلتا ہے کہ رومی قوم عدم سے وجود میں آئی۔ ترقی کے اعلےٰ زینے (جوانی) پر پہنچ گئی اور پھر معرض زوال میں آکر دنیا کو اس بات کا سبق دیتی ہوئی چل بسی کہ "ہر ایک چیز فنا ہونے والی ہے"، یونانی قوم پیدا ہوئی۔ بچپن کے گہوارے میں پلی۔ جوانی کے عالم سے گزر کر بڑھاپے کی گود میں جا آرام کیا۔ مصریوں نے بھی ان تینوں ماؤں یعنی بچپن جوانی، اور بڑھاپے کو دیکھا۔ آخرکار ان کی بھی وہی حالت ہوئی جو اوروں کی ہوئی۔ قوم آریہ کا ہندوستان میں ورود گویا اُس کا زمانہ طفلی ہے۔ یہیں اپنا بچپن گزارا اور انتہائے ترقی کو پہنچ کر دنیا کو اپنی معلومات سے مالا مال کر دیا۔ آخر ان کو بڑھاپے کے پنجہ ستم نے نہ چھوڑا۔ ایرانیوں نے بچپن سے گزر کر جوانی کے پُرشان و شوکت زمانہ میں کیا کچھ کیا ان کو بھی کمبخت بڑھاپے سے پالا پڑا اور زوال میں آگئے۔ یورپ کی بڑی بڑی قومیں جن کا چند صدیوں پہلے نام و نشان بھی نہیں تھا وجود میں آگئی ہیں اور بچپن سے گزر کر جوانی کے فضائے سعادت میں آئی ہیں اور چند دنوں بعد دنیا دیکھ لے گی کہ کس طرح "قومیں بچے، جوان اور بوڑھی ہوتی ہیں"۔

خواجہ احمدؐ۔ محمدآباد بیدر (دکن)

غزلیات

میں باز آیا یہی ہے گر محبت کا اثر ہونا — وہاں سو کر سحر کرنا یہاں رو کر بسر ہونا
ترقی پر ہیں شوقِ دید میں بیتابیاں دل کی — ابھی اچھا نہیں ہے شوخیوں کا پردہ در ہونا
کہیں اُس مجمع محشر کی رسوائی سے بہتر ہے — کسی جا فیصلہ آپس کا تنہا بیٹھ کر ہونا
تمنائے ہم آغوشی بنی پیغام رخصت کا — گلے ملنے کو ہاتھ اُٹھنا کہ آغازِ سحر ہونا
ذرا سی چوٹ بھی دل کو بہت تکلیف دیتی ہے — جب اک امید پر ہو زندگانی کا بسر ہونا
یہ ہیں رازِ و نیازِ عشق کوئی ان کو کیا سمجھے — نگاہیں اُس طرف مڑنا اِدھر دردِ جگر ہونا

جوانی کی اُمنگیں چھین سے کیا بیٹھنے دینگی
زمانہ خود سکھائے گا اُنھیں بیدادگر ہونا

وہ زنجیریں کھڑکتی ہیں کہ زنداں کانپا جاتا ہے
غضب ہے وحشیوں کو موسم گل کی خبر ہونا

یہی ہیں وہ جناب آرزو اے ہاشمی دیکھو
کیا تسلیم اک عالم نے جن کا باہنر ہونا

دل محزوں کو مدت ہوگئی قید تمنا میں
رہے کب تک الٰہی اس خیال روح فرسا میں

ہمیشہ مہر تاباں پردۂ شب سے نکلتا ہے
نہاں ہے روشنی امید کی داغ سویدا میں

کہاں ذوق حقیقی اور کہاں بدمستیاں دل کی
ہُوا جاتا ہے غائب جوش اصلی جوش صہبا میں

دل بیتاب کی ہر ہر کھٹک امید افزا ہے
ہماری آرزوئیں ہیں نہاں خار تمنا میں

عدو کیوں اس قدر مست شراب جور ہے آخر
بھرا ہے عاشقوں کا خون ناحق اسکے مینا میں

نہ ہو مست مئے پندار ظالم ان سے ڈرتا رہ
یہ آہیں کر دیا کرتی ہیں روزن سنگ خارا میں

ہمارے قلب مضطر کی الٰہی شرم رکھ لینا
نہیں معلوم کیا کیا کہہ گیا جوش تقاضا میں

بہت مشکل ہے اے دل شاہد مقصود کا ملنا
تجھے معلوم ہے مجنوں کی کیا حالت تھی صحرا میں

ابھی سے کیا کروگے پوچھ کر تم دل کی حالت کو
ابھی خم ڈالتے جاؤ ذرا زلف چلیپا میں

اگر تقدیر سیدھی ہے اگر دن اپنے اچھے ہیں
وہ دامن آہی جائے گا کبھی دست تمنا میں

فلک بھی اس کی رفعت سے کہیں بدظن نہو جائے
کھٹکتی ہے ہماری آرزو چشم ثریا میں

یہ دیکھیں عارض پُر نور مقصد کب نظر آئے
نگاہ منتظر گھبرا رہی ہے چشم بینا میں

عنصر مختلف ہیں ان میں نبھنا غیر ممکن ہے
مرے شوق فراواں میں ترے امروز و فردا میں

کسی کا جلوۂ بے پردہ دیکھیں کیا دکھاتا ہے
چلا ہے خاطر بیتاب گو شوق تماشا میں

دل محروم کو میرے جلا کر خاک کر ڈالا
غضب کی آگ پنہاں تھی مری برق تمنا میں

عمل الفقر فخری پر الٰہی اس کا ہو جائے
نہ دیکھے فرق ہادی بوریے میں اور دیبا میں

آرام کے تھے ساتھی کیا کیا جب وقت پڑا تو کوئی نہیں سب دوست ہیں اپنے مطلب کے دنیا میں کسی کا کوئی نہیں
ہو چشم بصیرت تو دیکھے کس گھر میں نہیں جلوے اُسکے ظاہر کے ہیں یہ سارے جھگڑے کعبہ نہ کلیسا کوئی نہیں
گلگشت میں حسن منھ پہ ڈالو نرگس سے حیا کیا ہے تمکو اُس آنکھ سے پردہ کرتے ہو جس آنکھ میں پردا کوئی نہیں

(قطعہ مبنی بر عبرتِ دُنیا)

جو باغ تھا کل پھولوں سے بھرا اٹکھیلیوں سے چلتی تھی صبا اب سنبل و گُل کا ذکر تو کیا خاک اُڑتی ہے اُس جا کوئی نہیں
آئینہ و ساغر یہ باہم حیرت میں ہے دل آنکھیں پُر نم یاد آتے ہیں اسکندر و جم اب محوِ تماشا کوئی نہیں
کل جنکو اندھیرے سے تھا حذر رہتا تھا چراغاں پیشِ نظر اک شمع جلا دے تربت پر جُز داغ اب اتنا کوئی نہیں
جو اونچے مکانوں والے تھے سب خاک کے نیچے جا کے چھپے رہتے تھے جہاں ہر دم جلسے اب دیکھو تو اُس جا کوئی نہیں
ہر ایک نمایش کو دیکھا اک جھونکے میں کچھ بھی تو نہ تھا ہستی ہے حبابِ بحرِ فنا اس دَم کا بھروسا کوئی نہیں
بیٹھے ہیں کہاں اہلِ مسند آغاز وہ نیک انجام یہ بد یا بزمِ طرب یا کنجِ لحد یا وہ مجمع یا کوئی نہیں
جب بند ہوئیں آنکھیں تو کھُلا دو روز کا تھا سارا جھگڑا تخت اسکا نہ اب ہے تاج اُسکا اسکندر و دارا کوئی نہیں
قتالِ جہاں معشوق جو تھے سوتے ہیں پڑے مرقد اُنکے یا مرنیوالے لاکھوں تھے یا رونے والا کوئی نہیں

اے آرزو اسکا فخر نہ کرو شعر کا فن ہے نازک تر
اُس کام میں کیوں کی عمر بسر جسکا کہ نتیجا کوئی نہیں

رفتہ رفتہ شادیاں وحشت کا ساماں ہوگئیں بستیاں جب بڑھ گئیں حد سے بیاباں ہوگئیں
سختیاں طولِ مرض کی مجھپہ آساں ہوگئیں جس قدر تم نے جفائیں کیں سب احساں ہوگئیں
اِس طرف میرے دلی جذبات کو جنبش ہوئی اُس طرف اُس شوخ کی زلفیں پریشاں ہوگئیں
میری آنکھیں جانتی ہیں رازِ افراطِ خوشی خندہ زن دیکھا کسی کو اور گریاں ہوگئیں
حالتیں ہیں دل شکستوں کی بھی کوئی حالتیں جب پریشاں کر دیا تم نے پریشاں ہوگئیں
رہ گئی تھیں سر میں باقی چند بوندیں خون کی آج وہ بھی سُرخیِ دیوارِ زنداں ہوگئیں
اُس نے مجھ سے بات کی اور دل اُمنڈ آیا مرا باوجودِ ضبط، آنکھیں اشک افشاں ہوگئیں

اے گزشتہ صحبتو، تم قابلِ افسوس ہو — دیکھتے ہی دیکھتے خوابِ پریشاں ہوگئیں
جو صدائیں گونجتی تھیں پیکرِ ہستی میں کل — آج وہ خاموشیِ گورِ غریباں ہوگئیں
ہائے میری مشکلو، تم نے بھی کیا دھوکا دیا — عین دلچسپی کا عالم تھا کہ آساں ہوگئیں
تم کو اے دنیا کے نظارو! سلامِ آخری — میری آنکھیں محوِ حسنِ روئے جاناں ہوگئیں
اے نسیمِ صبح کے جھونکو، یہ تم نے کیا کیا! — میرے مستِ خواب کی زلفیں پریشاں ہوگئیں
سوچنا تو اے تغافل کیش! اگر فرصت ملے — کون سی باتیں مرے مرنے کا ساماں ہوگئیں

دل سے جو باتیں کہی تھیں رات بھر شبیر نے
مسلکِ روحانیت میں جزوِ ایماں ہوگئیں

کسی کو کیا پڑی ہے جو کسی کا مدعا جانے — دلِ بیتاب کی تسکین کب ہوگی خدا جانے
برابر چھیڑ رہتی ہے دلِ دیوانہ سے مجھ سے — نہ میں اُس کی دوا جانوں نہ وہ میری دوا جانے
ہماری آرزومندی کو پوچھ اپنے تغافل سے — وفائیں ہنسنے کی ہیں یا نہیں تیری جفا جانے
غبار اپنا تو کب کا اُڑ چکا صحنِ گلستاں سے — چمن کا اندنوں کیا رنگ ہے بادِ صبا جانے
مری بیجا توقع ہی سے ہیں محرومیاں میری — یہ ظاہر ہے وفا کی قدر کیا وہ بے وفا جانے
دل آزاری اُسے آتی ہے دلداری نہیں آتی — اثر بیداد کا وہ بانیِ بیداد کیا جانے
تجھے فرصت کہاں آرائشِ گیسوئے مشکیں سے — کسی کی جان پر کیا بن گئی تیری بلا جانے
شکارِ ناامیدی ہو رہا ہوں کاش اے ظالم — مری کوتاہ دستی کو تری زلفِ رسا جانے
جفا بھی ہے وفا بھی ہے توجہ بھی تغافل بھی — تری عاشق فریبی کو کوئی جانے تو کیا جانے
نہ گھبرا تو مرے آفت طلب دل کی خرابی سے — یہ وہ درد آشنا ہے درد ہی کو جو دوا جانے
نہیں محفل میں واقف کوئی میرے رازِ پنہاں سے — اگر جانے تو شاید وہ نگاہِ آشنا جانے
وہ دل یا رب نہ ہو ذوق آشنا لطفِ اسیری سے — سوادِ گیسوئے دلبر کو جو شامِ بلا جانے

یہاں تو دوستوں سے بے ہنسے بولے نہیں بنتی
گزرتی رہتی ہے جو دل پہ وحشت کوئی کیا جانے

جناب مولوی امیر علی صاحب امیر سیتاپوری مرحوم

آپ سیتاپور کے محلہ بنگلہ میں رہتے تھے۔ فارسی میں آپ کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ تاریخ، سجع اور مختلف اصنافِ شاعری میں لاجواب تھے۔ کیمیا بنانے کا بے انتہا شوق تھا مگر ہمیشہ ایک آنچ کی کسر ہی رہی کبھی کامیابی نہ ہوئی۔ مفلسی میں عمر گزری اور افلاس جو اہل کمال کا غمخوار و ہمدم ہے، آپ کا بھی انیس رہا۔

ایک بار کسی شاہی تقریب میں آپ نے ایک تاریخ کہی تھی۔ بادشاہ نے ایک دوشالہ اور صہ۵ر انعام تجویز فرما کے تحویل دار کو حکم دے دیا مگر اہلکاروں نے اس میں بھی تغلب و تصرف کیا اور آپ کو بہت کم حصہ ملا۔ تمام عمر میں آپ کو شاعری سے صرف اسی قدر نفع ہوا۔ غزل اور قصیدے بھی کہتے تھے اور سب میں امیر تخلص فرماتے۔

خوشنویسی میں یاقوت رقم خاں لکھنوی کے شاگرد تھے۔ تیس قسم کے خط جو اس زمانے کے خوش نویسوں میں شہرت رکھتے تھے اور مسلّم تھے اور ان کی تحریر کے مختلف طریقے اور مختلف نام تھے جن میں سے بعض مشہور خطوں کے نام ہیں۔ نسخ نستعلیق۔ طغرا۔ شفیعہ۔ شکست۔ ریحانی۔ شجری۔ غبار۔ ثلث۔ توام وغیرہ وغیرہ۔ ان سب پر آپ کو پوری دستگاہ حاصل تھی۔ سیتاپور کی آبادی کی تاریخ سے آج تک اس جامعیت اور کمال کے ساتھ کوئی خوش نویس اس سرزمین میں نہیں پیدا ہوا۔ اور اب چونکہ زمانہ کی ہوا بدلی ہوئی ہے اس لیے امید نہیں کہ آئندہ بھی کوئی خطاط اس قسم کا اس خاک سے پیدا ہو۔ باوجود اس قدر کمال کے نہایت کس مپرسی اور گم نامی اور مفلسی میں زندگی بسر ہوئی۔ حکیم فن حضرت شیخ سعدیؒ کا کیا سچا مقولہ ہے

اگر بہر سر موے تو صد ہنر باشد   ہنر بکار نہ آید چو بخت بد باشد

بعض روایات سے آپ کا حنفی ہونا معلوم ہوتا ہے اور بعض واقعات اسکے خلاف بھی بتائے جاتے ہیں۔ آپ کی نسبی حالت ناقابل ذکر ہے اور ہمارے موضوع سے خارج۔ غدر سے

تھوڑے عرصہ کے بعد آپ یہیں اپنے وطن میں فوت ہوے اور یہیں آپ کی قبر بنی جو تھوڑے ہی مدت کے بعد خام ہونے کے باعث سے مٹ گئی۔

قضیارہ کے بڑے امام باڑہ کے پھاٹک پر سورۂ اخلاص بخط طغرا آپ کی دستکاری کی شہادت زبانِ حال سے دے رہا ہے۔ آپ کی تمام نظموں میں سے صرف ایک سجع کالے خاں کا بچا ہے جو آپ نے نظم فرمایا تھا وہ درج ذیل ہے اور کلام آپ کا تلف ہوگیا اور کتبے بھی ضائع گئے ؎

سوختم چنداں کہ کالے خاں شدم

آپ کے صاحبزادے مولوی واجد علی بھی قابل شخص تھے۔ فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ خوش نویس بھی تھے۔ مگر وہ باپ کی ایسی لیاقت کہاں۔ عرصہ تک سیتاپور کے ہائی اسکول میں مدرس رہے اُسکے بعد یہیں وفات پائی اور آگے نسل نہ چلی۔ انھیں پر خاتمہ ہوگیا ان کی مذہبی حالت بھی انکے باپ کی مذہبی حالت سے مشابہ تھی۔

سید الیاس حسین۔ دیباجی حنفی

پریم پچیسی

کے

متعلق انجمن ترقی اُردو کے فاضل سکرٹری مولنا عبدالحق صاحب فرماتے ہین

مین نے پریم پچیسی کو پڑھا حقیقت مین بڑی دلچسپ کتاب ہے۔ ہمارے ملک مین ناول نویس تو چند پیدا ہو گئے ہین مگر جہان تک مجھے علم ہے چھوٹی چھوٹی کہانیان لکھنے والا (جسکا لکھنا ناول سے کچھ کم مشکل نہین) ابھی تک کوئی پیدا نہین ہوا تھا۔ نہایت خوشی کی بات ہے۔ کہ اس کمی کو منشی پریم چند نے پورا کیا اور بڑا کام کیا۔ اور ایسا ڈول ڈالا ہے کہ آیندہ لوگ اس کی تقلید کرین گے۔ بعض بعض مقام پر ان کا قلم فسانہ نگاری کا عجیب جوہر دکھاتا ہے۔ جذبات کے دکھانے مین بھی منشی صاحب موصوف نے کمال کیا ہے۔ بعض مقامات اس کتاب مین ایسے آتے ہین۔ کہ وہان دل تھام کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ اُن کہانیون مین حب وطن کی بو آتی ہے۔ ملک کو اس بے بہا تحفہ کے لیے منشی صاحب کا ممنون ہونا چاہیے ان کی کہانیان اُردو زبان کا زیور ہین۔ ملنے کا پتہ

الناظر بک ایجنسی۔ چوک۔ لکھنؤ

نظرے خوش گزرے

ملک کے تمام ارباب مذاق عموماً اور الناظر کے سخن شناس ناظرین خصوصاً اس خبر سے صددرجہ افسردہ خاطر ہوں گے کہ ساتویں رمضان المبارک مطابق ۱۲ر جولائی یوم چہارشنبہ کو وقت سحر حضرت خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی نے انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

فارسی زبان کا اگرچہ اس ملک میں رواج نہیں رہا پھر بھی ایسے بہت سے بزرگ خدا کے فضل وکرم سے موجود ہیں جو اس کا ذوق رکھتے ہیں اور موجودہ نسل میں بھی چند صاحب ایسے نکلیں گے جنھیں فارسی شاعری سے پوری دلچسپی ہے اور یہ دونوں گروہ خواجہ صاحب مرحوم کے شاعرانہ کمالات کے یکساں طور پر معترف تھے جو اُنکی مقبولیت وعظمت کی بین دلیل ہے۔

خواجہ صاحب کو اکثر اربابِ کمال کی طرح شہرت وناموری کی طرف سے کچھ ایسا استغنا تھا کہ اس زمانہ میں جبکہ صدہا ایسے اصحاب صاحبِ دیوان نظر آتے ہیں جنھیں دو مصرعوں کو موزوں پڑھنا بھی معلوم نہیں۔ اُن کے کلام کا بیشتر حصہ غیر مطبوعہ ہے۔ چند قصیدے اور بعض غزلیات کے سوا تمام تر ذخیرہ پبلک کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ تمام واقفان فن اور ذوق سلیم رکھنے والے اصحاب اُن کو ایک شاعر یگانہ اور اُستادِ فن مانتے تھے لیکن دنیاے ادب میں اُن کے مداحین کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ بلکہ غالباً بہت سے پڑھے لکھے اور غالباً فارسی میں شعر کہنے والے ایسے بھی ملیں گے جنھوں نے حضرت خواجہ کا کبھی نام بھی نہ سُنا ہو۔

ہمنے کئی دفعہ خواجہ صاحب سے عرض کیا کہ اپنے ذوق کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے نیازمندوں اور عقیدت کیشوں کی خاطر سے اپنا تمام کلام جو تلف نہ ہوا ہو یکجا کر دیں مگر یہ تمنا کبھی پوری نہ ہوئی۔ آخر آخر میں یہ ایک صورت نکل آئی تھی کہ مرحوم نے اپنے ایک پوتے کو خوشنویسی کی تعلیم دلانا شروع کی تھی اور گھر پر مشق کرنے کے لیے اپنے بعض مسودات عنایت

فرما دیے تھے جس سے اُمید بندھی تھی کہ رفتہ رفتہ ایک مجموعہ تیار ہو جائے گا مگر افسوس کہ دستِ اجل نے اس آرزو کو بھی خاک میں ملا دیا۔

خدا کرے کہ اب اُن کے صاحبزادوں اور دوستوں کی کوشش سے یہ گراں قدر ذخیرہ طبع ہو کر دستِ بُردِ زمانہ سے محفوظ و مامون ہو جائے۔

قطع نظر کمالات شاعرانہ کے مرحوم کی پرائیوٹ (خانگی) زندگی ایسی پاکیزہ تھی کہ لکھنؤ میں اور باہر بھی شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو اُنکی نیکیوں کا مداح نہ ہو۔ اور یہ وہ خصوصیت ہے جو ہمارے خیال میں حضرت خواجہ کو خاص طور پر ممتاز کرتی ہے۔ کیونکہ اس وقت "پرائیوٹ زندگی" کی خوبیاں ایسے اشخاص میں جن کا تعلق کسی نہ کسی نہج سے پبلک سے ہو مفقود نظر آتی ہیں۔

مرحوم کو الناظر کے ساتھ ایک خاص لطف تھا اور اگرچہ ہم اُن کے کلام کی زیادہ اشاعت نہیں کر سکے لیکن رسالہ ابتدا سے اس وقت تک برابر حاضری کی عزت حاصل کرتا رہا۔ اور ہمیں یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ خواجہ صاحب اُس کے مضامین کو بڑی دلچسپی سے ملاحظہ فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی بارگاہ میں دلی دعا ہے کہ حضرتِ خواجہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور اُن کے تمام اعزا و احباب کو توفیق صبر۔ آمین۔

معزز ہمعصر "ہندوستانی" (لکھنؤ) کے ایڈیٹر پنڈت کشن پرشاد صاحب کول ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ وہ اودھ پنچ کے مالک و ایڈیٹر اور اُسکے سربرآوردہ مضمون نگاروں کی تحریروں کا مجموعہ منشی سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ کی یادگار کے طور پر شائع کرنے والے ہیں۔ اسکی دو جلدیں ہوں گی جس کا حجم تخمیناً ۱۰۰۰ صفحات ہو گا۔ چنانچہ ۵۰۰ صفحے کی پہلی جلد زیرِ طبع ہے اور غالباً اسی ماہ اگست میں قدردانوں کے ہاتھوں میں ہو گی۔ منشی صاحب مرحوم کے انتقال پر جو نوٹ ہمدرد میں شایع ہوا تھا اُس میں اسی کا اشارہ کیا گیا تھا۔ مقامِ شکر ہے کہ اُن کے مداحوں میں سے چند صحاب نے اسے عملی صورت میں لانے کی کوشش کی اور کامیابی کے آثار

نظر آرہے ہیں۔

ہمارے دیرینہ کرم فرما منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ حال ہی میں آنریری مجسٹریٹ بنائے گئے ہیں۔ جس پر اپنے اور اپنے ناظرین کی طرف سے ذاتی حیثیت و مراسم کی بنا پر ہم نے اپنے دوست کو مبارکباد بھی دی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس خبر کو پڑھ کر ہمیں بجائے خوشی کے افسوس ہوا۔ اس لیے کہ جو اخبار نویس عام طور پر اس قدر عدیم الفرصت رہے کہ اپنے پرچہ کو ہمیشہ وقت پر شایع نہ کر سکتا ہو، جب اُس کے سر سرکاری خدمات ڈال دی جائیں گی تو ظاہر ہے کہ وہ کیا کام کر سکے گا۔ زمانہ غالباً فروری کے بعد سے اب تک شایع نہیں ہو سکا ہے اور ہم اس کے متوقع تھے کہ اُس کے کئی نمبر یکجا کر کے شایع ہو جائیں گے اور آیندہ کے لیے زیادہ پابندیِ وقت کا انتظام کرنے کی امید دلائی جائے گی۔ لیکن خوش خبری جو ملی ہے اُس سے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ اب زمانہ ماہوار کے بجائے چھ مہینے کے بعد شایع ہوا کرے گا۔ اور یہ منشی صاحب کے مفاد کے لحاظ سے نہیں مگر ہمارے قومی و ملکی نقطۂ نگاہ سے کسی طرح پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ ایڈیٹر صاحب مشرق نے جو خود بھی اس کرسی عزت پر رونق افروز رہ چکے ہیں، اس بارہ میں بڑی صداقت سے کام لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> "آزاد خیال ایڈیٹر اخبار کو جہاں تک ممکن ہو آنریری عہدوں اور خطابات سے دُور بھاگنا چاہیے اس وجہ سے نہیں کہ گورنمنٹ کے یہ عطایا قابل نفرت اور قابلِ پذیرائی نہیں ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ جو خدمت وہ کرتا ہو محض وطن پرستی اور حکومت کی بقا کی وجہ سے کرتا ہو، اس میں دنیا کا لوث شامل ہونا چاہیے۔"

ہم اس میں اپنی طرف سے کچھ بڑھانا نہیں چاہتے۔ البتہ اُن الفاظ کی طرف اپنے دونوں دوستوں کی توجہ منعطف کرانا چاہتے ہیں جن پر خطوط دے دیے گئے ہیں اور استدعا کرتے ہیں کہ اپنے اپنے متعلق خود سمجھ لیں کہ ہم کیا کہہ سکتے ہیں اور دنیا کیا سمجھتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اخبار نویسی کا معیار بلند ہونے کے بجائے روز بروز پست ہوتا جاتا ہے اور آزادی کے معنی و مفہوم میں اس قدر وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے

کہ اب آزاد خیال اور خوشامدی میں کوئی فرق ہے نہ وطن پرست اور دشمن ملک میں کوئی امتیاز۔ دنیا کا لوٹ اور آنریری مجسٹریٹی کا جو تعلق ہے اس کی تفسیر اگر ہمارے آنریری مجسٹریٹ معاصرین میں سے کوئی صاحب بیان کریں تو یقیناً زیادہ موزوں ہوگا۔ کیوں کہ ہمیں شاید اس کا علم بھی نہ ہو۔

بعض حریت پرست معاصرین کو حال ہی میں اپنی روش میں تبدیلی کرنے کا اشتہار دینا پڑا ہے۔ جن لوگوں کو اُن تمام حالات و واقعات کا علم ہے جو گزشتہ سالوں میں ان غریبوں پر گزر رہے ہیں وہ اس تغیر کو خیر متوقع نہ جانیں گے۔ لیکن وہ جماعت اخبارات جس نے جنم لیتے ہی اپنے پاؤں کے نیچے وفاداری کا ہمالیہ دیکھا اور اپنے اس افتخار پر نازاں رہتی ہے اپنے کامیاب رقیبوں کی درماندگی سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یعنی وہ قوم کو یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ مدعیانِ حرّیت کا ہتھیار ڈال دینا گویا اس بات کے برابر ہے کہ جن بے اصولیوں کی وہ تلقین کرتے ہیں اُنھیں پر چلنے میں قوم کی نجات ممکن ہے۔

ہمیں اگرچہ اپنے مصیبت زدہ بھائیوں سے اکثر باتوں میں اختلاف رہا ہے اور ہم اپنے بعض خیالات کسی گزشتہ پرچہ میں ظاہر بھی کر چکے ہیں مگر اپنے خوش حال معاصرین کی خدمت میں دلی افسوس کے ساتھ یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اب اِن ابلہ فریبیوں کا نہ وقت ہے اور نہ ان سے کوئی منفعت بخش نتیجہ مترتب ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں نے ہندوستان کی سیاسی پیچیدگیوں کو سلجھانے کی خاطر اپنا مذہب۔ اُسکے اخلاقی اصول اور اپنے قدیم تمدن تک کو نثار کر دیا اور اب جو وہ لبِ دریا نظر آتے ہیں تو دو گھونٹ سے بھی اُنکی تشنہ کامی دفع کرنا گوارا نہیں کی جاتی۔ اور ازیں سو راندہ وازاں سو درماندہ" بنانے کی پوری کوشش ہو رہی ہے اس کے بعد کیا حشر ہوگا؟ واللہ اعلم بالصواب۔

خوان ادب

معارج الدین

(حجم ۱۳۰ صفحہ قیمت ۱۲ النا ظر ایجنسی)

مصنفہ مولوی سید نواب علی صاحب ایم اے پروفیسر بڑودہ کالج (گجرات) اس کتاب میں لائق مصنف نے روح اور معاد سے ایک تفصیلی بحث کی ہے۔ مسائل سائنس کا ایک نقشہ خاکہ کھینچا ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ ہر طرف سے مذہب اسلام پر طرح طرح کے حملے کرکے شکوک اعتراضات کیے جا رہے ہیں ان سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک ایسی جامع کتاب کی نہایت ضرورت تھی جسے ہمارے محترم دوست حضرت نواب تمنوی نے پورا کردیا۔ اس نادر کتاب کا دوسرا حصہ بھی زیر طبع ہے۔ مفصل ریویو ہم اس کتاب پر آیندہ کسی نمبر میں کریں گے۔

حضرت امام غزالی قدس سرہٗ کا اپنے شاگرد کے نام ایک خط

(حجم ۲۰ صفحے۔ قیمت ۲ر۔ حاجی محمد محی الدین تاجر کتب متصل مسجد ابراہیم دوکان نمبر ۳۹۹ لشکر بنگلور)

یہ خط نہایت پاکیزہ اور قابل دید ہے

اخلاق النبی

(حجم ۲۴ صفحے قیمت ۲ر حاجی محمد محی الدین تاجر کتب لشکر بنگلور)

اس کتاب میں حضور سرورکائنات صلعم کے محاسن اخلاق کھانے کے آداب۔ عفو اور بخشایش کے بیان سخاوت شجاعت۔ صورت و شمائل کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔

سراپاے رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

(حجم ۱۱۶ صفحے۔ قیمت ۲ر حاجی محمد محی الدین تاجر کتب لشکر بنگلور)

یہ ایک پاکیزہ نظم ہے جسے حضرت مولانا سید شاہ فقیر محی الدین چشتی نے نہایت خوبی سے نظم فرمایا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپا ایسا لکھا ہے کہ درود پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

سوانح عمری حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی

مع عقائد اہل اسلام ماخوذ از قرآن کریم

(حجم ۳۶ صفحہ۔ قیمت ۲ر۔ حاجی محمد محی الدین تاجر کتب لشکر بنگلور)

اس کتاب میں مختصراً حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی سوانح عمری بیان کی گئی ہے۔

کملا

(حجم ۱۲۲ صفحہ۔ قیمت ۱۰ر۔ منشی صادق علی۔ گولہ گنج لکھنؤ)

یہ ایک ناول ہے جس میں پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی نے قوم راجپوت کے ایک وسیع خاندان کا ہوبہو خاکہ کھینچا ہے اور دیہاتی شرفا کی زبان بعض بعض موقع پر بیساختہ لکھی ہے۔ مفصل ریویو ہم اس کتاب پر آیندہ نمبر میں کریں گے۔

تاریخ غزالہ

(حجم ۴۴ صفحے۔ قیمت ۸ر سید وصی بلگرامی۔ بلگرام)

اس نادر مجموعہ میں مرحوم شاہ اودھ المتخلص اختر کے وہ نادر انمول خطوط جو کلکتہ فورٹ ولیم سے نواب ملکہ غزالہ کے نام لکھے گئے۔ بعض خط نظم میں خوب ہی لکھے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۵ جلد ۱۲ — یکم ستمبر ۱۹۱۵ء

ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے — "ایڈیٹر" — عبد سر ورق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۵ جلد ۱۳ یکم ستمبر ۱۹۱۵ء

مقصدِ حیات

مدعا کی عدم خصوصیت، خیالات کی آشفتگی اور ارادے کے تزلزل کے باعث اس دُنیا میں کتنی شخصیتیں ہیں جن کی ہستی معدوم نما اور جن کا وجود بے معنی ہے۔ اپنی زندگی کا کوئی مقصود قرار دینے کے قبل اُس کے درست اور عاقلانہ ہونے کا تعین نہایت ضروری ہے۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ بالواسطہ تمھارے امکان میں ہونے کے علاوہ مسلسل کوششوں سے حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس قرارداد کے بعد جدھر جاؤ وہی ایک میدان اور صرف اُسی کا خیال دل پر محیط رہے۔ اس سعی میں اگر پہلے ہی شکست نصیب ہو تو اس سے اپنے اُس ارادہ سے کہیں باز نہ آجانا جس کی تکمیل کو تم نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لیا ہے۔ ایک ہی دفعہ شکست کھاؤ یا ہزیمتیں مسلسل ہوتی رہیں مگر عزم کی متانت اور ارادہ کی پختگی میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ تم اپنے مقصود کے جویاں اور مطلوب کے طالب بنے رہو اور اس اصول کو خوب ذہن نشین کرلو کہ کسی مقررہ مقصدِ زندگی کے حصول میں کامل انہماک، سچی سرگرمی اور پوری لَو سے مصروف

رہنے میں ہی دنیا میں اوقات بسری کی خوبی اور زندگی کی اعلیٰ کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔
گیرڈینی مشہور بین باز سے کسی نے پوچھا کہ بین بجانے میں پوری مہارت پیدا کرنے کے لیے کتنا عرصہ درکار ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ روزانہ بارہ گھنٹے کی مشق مسلسل بیس برس تک جاری رہنا چاہیے۔ گیرڈینی کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ اُس نے روزانہ بارہ گھنٹے کی مشق عمر بھر جاری رکھی۔ لارڈ بروہم کی نظیر ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ایسے افراد بہت کم ہوتے ہیں جن کے ساتھ فطرت اس قدر فیاض ثابت ہوتی ہو اور ایسی مثالیں معدودے چند ہیں جنکی دماغی قابلیتوں کا معیار اس قدر اعلیٰ ہوتا ہو یا جن میں جوہر عقلی کی اتنی فراوانی ہوتی ہو جتنی کہ بروہم میں پائی جاتی تھی۔ وہ عمدہ مقرر بڑا صائب الرائے اور مشہور انشاپرداز تھا۔ جو شخص تحریر کا دھنی ہو تقریر میں اُسکی سحر طرازیاں کمتر بارآور ہوتی ہیں۔ مگر بروہم ایک جامع الصفات شخص تھا۔ بحیثیت مقنن اُس نے اپنے فن کے اعلیٰ درجہ کو طے کیا اور سائنس داں ہونے کی حیثیت سے اُس نے علمائے سائنس سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ واقعاتِ متذکرہ سے اس کا کامیاب لوگوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مگر کثیر الاشغال ہونے کے باعث وہ قوتیں جو صرف ایک دو اشغال پر صرف ہونی چاہیے تھیں متفرق اور منقسم ہوگئیں جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ فی الجملہ اُسکی زندگی ناکام رہی حتیٰ کہ اپنے مُلک کی تاریخ یا وہاں کے علم ادب پر اُس نے کوئی پائدار اثر نہیں چھوڑا۔ عجیب تر یہ ہے کہ اُسکی زندگی میں ہی لوگ اُس کو فراموش کرگئے تھے۔

کارِ دنیا کسے تمام نکرد ہرچہ گیرید مختصر گیرید

پر عمل کرنے کے بجائے اُس نے اپنی ذہانت کو متعدد اور مختلف مشاغل پر منقسم کردیا تھا حالانکہ مدرسہ کا ہر لڑکا اتنی بات ضرور جانتا ہے کہ آفتاب کی پوری تاثیر سے استفادہ منظور ہو تو اُسکی شعاعوں کو کسی ایک مرکز پر جمع کردینا چاہیے۔

انجام کار کامیاب ہونے کے لیے اکیلا و صرف ایک کام اختیار کرنا چاہیے۔ اگر عطار بننا چاہتے ہو تو عطار ہی رہو۔ معمار۔ نجار۔ ساہوکار۔ آہن گر۔ بقال نہ بنو۔ مدعا کی خصوصیت اور مقصود

کا تعین اگر ارادہ کی پختگی کے ساتھ ہو تو یہ کامیابی کا زینۂ اولین ہے۔ کئی اشغال اختیار کرکے سب میں ناکام یا ادھورے رہنے سے بہتر ہے کہ صرف ایک شغل میں کمال حاصل کیا جاسے۔ کسی ایک شغل میں کامل انہماک کی عادت پیدا ہونے کے لیے مستقل مزاجی کی بجد ضرورت ہے۔ یہی صفت دنیا میں کامیاب لوگوں کی زندگی کا جزو اعظم رہی ہے۔ ہم اپنی قوتوں کے حلقہ کو پراگندہ کر دیں تو اُس میں بجز کمزوری کے اور کوئی چیز پیدا نہ ہوگی۔ ہم جس قدر پھیلیں گے اُسی قدر عمق میں کمی پیدا ہوتی جائے گی۔ حالانکہ عرض سے گہرائی زیادہ گراں بہا ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ دنیا میں جس قدر کامیاب اور بڑے لوگ گزرے ہیں وہ سب بزرگی اور کامیابی کے مراتب سے اُسی مناسبت سے ہم آغوش ہوے ہیں جس لحاظ سے کہ اُن کے ساعی کا سلسلہ کسی مدعاے خاص پر منتہی ہُوا ہے۔ مگر جن کی کوششیں متعدد مقاصد کے حصول پر صرف ہوئیں وہ بالآخر ادھورے رہے یا ناکام۔ طلب الکل فوت الکل۔ ہمہ دانی اور ہمہ گیری کی بیجا خواہش میں اکثر قابل دماغ رائگاں گئے ہیں۔ اور دس بیس باتوں میں ناموری پیدا کرنے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہُوا کیا ہی کہ کم وبیش سب میں خامی باقی رہ گئی ہے حالانکہ دس چیزوں میں خام رہنے سے کسی ایک میں کامل ہونا بدرجہا افضل ہے۔

متلوّن المزاج ہمیشہ سطحی لیاقت والے ہی ہُوا کرتے ہیں۔ وہ کسی ایک بات پر قائم رہنے کے بجاے ہر بات میں دوسروں کی تقلید۔ نقالی اور خوشہ چینی کو اپنا شعار کرلیتے ہیں۔ چنے چبانا اور شہنائی بجانا ایک ساتھ نہیں ہو سکتا۔ سر جوشوا رینالڈز نے اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ ایک عمدہ قلمکار مصور کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے مُنہ کو سی لے اس لیے کہ یہ امر ممکن نہیں کہ وہ اپنے فن میں کمال حاصل کرنے کے علاوہ ایک عمدہ مقرر کی حیثیت بھی پیدا کرسکے۔ چارلس ڈکنس کہا کرتا تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں جس بات کے کرنے کی کوشش کی اُسکو ہمیشہ دلدہی اور عمدگی سے کیا اور جس بات کا میں نے ارادہ کیا بس میں اُسی کا ہو رہا۔ میں نے کبھی ایسی چیز کو اختیار ہی نہیں کیا جس کی تکمیل میرے امکان سے خارج تھی یا جس پر میں اپنی پوری توجہ نہ صرف کر سکتا تھا۔

ہمہ دانی کی مثالیں جو اکثر پیش کی جاتی ہیں وہ بعید غلط نما ہیں۔ مثلاً لارڈ لٹن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس نے پالیٹیشن۔ ناول نویس۔ ڈراما نگار اور شاعر ہونے کی حیثیت سے ناموری حاصل کی علاوہ اسکے تاریخ اور مضمون نگاری میں بھی اُسکی جولانیٔ طبع نمایاں رہی۔ ہم اس وقت اس امر پر بحث نہ کریں گے کہ لٹن صرف فسانہ نگاری کی جانب اپنے زورِ طبیعت کو صرف کر دیتا تو اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا مگر یہ بات مسلمہ ہے کہ لٹن کی جو کچھ ناموری ہے اُسکا دائرہ ادبیات تک محدود ہے اس لیے کہ سیاسی حیثیت سے اُسکے کارنامے بمنزلۂ صفر کے ہیں۔ میکائیل انجیلو بُت تراشی اور مصوری میں مشہورِ آفاق ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں ایک ہی فن کے دو شعبے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سسرو، منطق، علم الافلاک، علم الاخلاق اور ما بعد الطبیعیہ میں کامل ہونے کے علاوہ موسیقی، ہندسہ اور فنونِ لطیفہ میں بھی مہارتِ تام رکھتا تھا بایں ہمہ ہم سسرو سے صرف مقرر اور فلسفی ہونے کی حیثیت سے رُوشناس ہیں بجز اسکے اور کسی چیز میں اُس نے کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑا۔ مرحوم مولوی سید علی بلگرامی سولہ سترہ قدیم وجدید زبانوں میں مہارت تامہ رکھنے کے علاوہ بیرسٹر اور علم معدنیات وطبقات الارض وغیرہ میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ باوجود اس تجرِ ہمہ دانی کے اُنکی حیثیت جس شعبہ میں سب سے زیادہ نمایاں رہی وہ صرف فرنچ زبان کا تاریخی حصہ ہے۔ اُن کی مدۃ العمر کا بس یہی کارنامہ ہے۔ محسن الملک مدبر بھی رہے اور محقق بھی بنے مگر صرف ایک جادو بیان مقرر کی حیثیت سے اُن کی یاد مدتوں تازہ رہے گی۔

کمزور اور طاقت ور، بڑے اور معمولی انسانوں میں جو شئے مابہ الامتیاز ہے وہ ہر شخص کا ذاتی مادہ ہے۔ اکثر معمولی عقل کے لوگ مختلف مقاصد اور متعدد دلچسپ مشاغل کی جانب مصروف رہتے ہیں مگر وہ دماغ جس کی تربیت کسی عمدہ ضابطہ اور دستور کے مطابق ہوئی ہو وہ صرف ایک مقصد کو اپنی آہنین گرفت میں اس قدر مضبوط پکڑتا ہے کہ موت کے سوائے کوئی چیز اُسکے ارادہ میں تزلزل ڈال سکتی ہے نہ اُسکے قبضہ سے اُس مقصد کو چھین سکتی ہے۔ خیالی پلاؤ پکانے والا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا کس لیے کہ اُسکی پوری سرگرمی اور قوت اُن باتوں میں صرف ہو جاتی ہے جو کبھی

عملی صورت اختیار نہیں کر سکتیں ایک فلسفی کا قول ہے کہ اگرچہ تجربہ کے مدرسہ میں تعلیم گراں ملتی ہے مگر بے وقوف کہیں نہیں سیکھتا۔ بدقسمتی سے ایسے لوگوں کی افراط ہے جو کبھی ٹھیک نہیں ہوتے۔ ہم ذاتی تجربہ اور مشاہدہ سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں لیکن ہمارا رشتۂ حیات اس قدر طولانی نہیں ہے کہ ہم ہر شئی پر ذاتی تجربہ کر سکیں۔ ایسی حالت میں پسندیدہ بات یہ ہے کہ ہم بزرگوں کے افعال اور سابقین کے کارناموں سے سبق حاصل کریں۔

جن لوگوں کا کوئی مقررہ مدعاے حیات ہوتا ہے وہ اپنی زندگی میں جو کام کرتے ہیں اُس کو ہمت، سرگرمی اور دلی شوق سے انجام دیتے ہیں اُنکی نگاہ گھڑی کی طرف نہیں ہوتی بلکہ کام کی جانب رہتی ہے۔ کام کا وقت ختم ہونے سے پہلے وہ مقررہ کام ادھورا نہیں چھوڑتے بلکہ اُن کاموں کو بھی مقررہ وقت کے اندر ختم کر لیتے ہیں جن کی انجام دہی کے لیے وہ مجبور نہیں ہیں۔

سرگرمی ایک جلتی ہوئی آگ ہے جس کی حرارت دل کو گرم کر کے رُوح میں شریفانہ کاموں کی خواہش پیدا کر دیتی ہے اور اپنی نورانی شعاعوں سے اُسکے راستہ کو منور کر دیتی ہے۔ جس طرح پانی کا ریلا کسی چیز سے نہیں رُکتا اُسی طرح سرگرمی ہر مزاحمت پر غالب آتی اور ہر بار مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔ دُنیا میں پست ہمت اور بیقاعدہ کوشش کرنے والے بہت ہیں اور اُنکو خود یہ معلوم نہیں کہ وہ دنیا میں بیدار ہیں یا خواب غفلت میں سو رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگوں میں اس بات کی کافی قابلیت موجود ہے کہ اپنے آپ کو ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچائیں مگر مجہولیت اور غیر منضبط کوششوں کی وجہ سے اُنکی ہمتیں چھوٹی اور ارادے پست ہو جاتے ہیں۔ جان ہنٹر کہتے ہیں کہ "ایسا کوئی شخص ہے جس کو مشکلات دل شکستہ کر دیں اور باایں ہمہ وہ طوفانِ ناکامی کا مقابلہ کرنے کو طیار ہو" ہم کو ایسے لوگوں سے اکثر سابقہ پڑتا ہے جو اس بات کے شاکی ہوتے ہیں کہ دنیا اُنکی اوصاف کی قدرداں نہیں ہے۔ حلقۂ احباب میں اُنکی خوبیوں کا اعتراف نہیں ہوتا۔ وہ ہوشیار اور عقلمند مشہور نہیں ہوتے، اور لوگ اُنھیں معتبر اور قابل اعتماد نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں کو اپنی قابلیت و استعداد کے مفروضہ جوہروں کے اظہار کا کبھی موقع نہیں ملتا اگر ہم نے دنیا کو اپنی

اُن خوبیوں کی آزمائش کا معقول موقعہ دیا ہے جن کا ہم خود کو سزاوار بتاتے ہیں اور باوجود اسکے وہ خوبیاں لوگوں پر اپنا مفید اثر ڈالنے سے قاصر رہی ہوں تو ہم کو سمجھ لینا چاہیے کہ ہمنے اپنی قابلیت کے متعلق رائے قائم کرنے میں غلطی کی تھی اور درحقیقت ابھی ہماری ذات میں اُن ہی اوصاف کی کمی ہے۔ ترقی کی دوڑ اور مسابقت کے میدان میں زمانہ نے آج تک کسی شخص کو خواہ مخواہ پیچھے نہیں رکھا۔ اگر کسی ذات میں معنوی اوصاف موجود ہیں تو دیر یا سویر وہ لوگوں پر ظاہر ہو کر رہیں گے پس ایسی حالت میں کامیابی کا تعاقب کرنے کے بجاے اپنے ذاتی جوہروں کو کمال پر پہنچانا اور اُن کی پرداخت میں سرگرم رہنا چاہیے۔ یہ بالکل ناپسندیدہ بات ہے کہ ایک معمولی اوصاف کا شخص اپنی عزت اور نام و نمود کا اعتراف خواہ مخواہ لوگوں سے کرائے۔ کوئی شخص دنیا میں بغیر محنت ہاے شاقہ اُٹھائے اعلیٰ اوج وعروج پر نہیں پہنچا۔ وہ بقاے دوام اور شہرتِ عام کے دربار میں محض سفارشی اثر سے ہرگز جگہ نہیں پا سکتا۔ اگر اُس میں کچھ معنوی کمالات ہیں تو خود بخود اُس کا زور واثر تسلیم کیا جائے گا۔ افلاطون کی رائے میں "اشرف الناس وہ ہے جس کو ذاتی خوبیوں نے شریف بنایا ہو، نہ وہ کہ اضافی خوبیوں سے اکتسابِ شرافت کرے۔ جس شخص میں ذاتی خوبیاں ہیں اُسکی تو وہی شرافت ہے اور جس کی خوبیاں عارضی اور مستعار ہیں وہ اُنکی ملمع کاری سے شریف بنا چاہتا ہے لیکن وہ اُسکو شریف الجوہر نہیں بنا سکتیں اور اصل ونقل کا فرق باقی رہ جاتا ہے"

غیر مہذب اقوام کی خصوصیت یہ ہے کہ اُنکا کوئی مقصدِ حیات نہیں ہوتا وہ ابتدا ہی سے اس فیصلہ سے قاصر رہتی ہیں کہ دنیا میں اُنکو کیا کرنا چاہیے اور وہ آیندہ کیا ہونگی۔ مگر متمدنہ ممالک میں ہر شخص کا کچھ نہ کچھ مقصدِ زندگی بھی ہونا چاہیے جس کے قرارداد کا اصلی وقت بدو شعور ہے۔ مدعا کے تعین میں طبعی میلان، گرد وپیش کے حالات اور مواقعِ احول کا لحاظ نہایت ضروری ہے مقصد ایسا ہونا چاہیے جو بالواسطہ ہر شخص کے امکان میں ہو اور وہ مسلسل کوششوں سے حاصل ہو سکتا ہو۔ جب ایسا مدعا قرار پا جائے جس میں کسی کی بہترین کوشش صرف ہو سکتی ہے تو اُسکے حاصل کرنے میں پوری پوری قوت صرف کر دینا چاہیے اور تمام جائز وسائل مثل سرگرمی، استقلال، ارادی قوت، اخلاقی جرأت،

اور عملی قابلیت کو کام میں لانا مناسب ہے۔

مقصدِ حیات کے تعین کے بعد غیر مغلوب عزم کے بغیر بام ترقی پر رسائی حاصل نہیں ہو سکتی، یہ اُسکے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے۔ کامل غور کے بعد جب ایک ارادہ قائم ہو گیا تو بس اُس میں فتح ہو یا مَوت۔ جس شخص کے عزم میں ایسی پختگی آجائے تو سمجھ لو کہ اُس میں دنیا کے ہر کام میں سُرخ رو رہنے کی قابلیت پیدا ہو گئی ورنہ بغیر اسکے سارا عقل و شعور، سارے مواقع اور ساری امیدیں بیکار ہیں۔

بقاعدگی اور غیر منضبط کوشش کا زمانہ حال کی عالمگیر بُرائیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ کوئی کام پورا نہیں کیا جاتا ہے۔ یہ مرض ہمارے مدارس میں زیادہ ساری ہے اور وہیں سے ہماری اولاد اس مذموم عادت کا سبق سیکھتی ہے۔ وہاں کے نصابِ تعلیمی میں مختلف علوم و فنون کی تعداد اس قدر کثیر ہوتی ہے جن کا صرف ادراک حاصل کرنے کے لیے عمر طویل درکار ہے۔ اُردو۔ فارسی (عربی، سنسکرت، گجراتی، مرہٹی، تلنگی، ہندی) فرنچ۔ لاطینی۔ انگریزی۔ قدیم و جدید تاریخ ہندو انگلستان۔ جغرافیۂ عالم۔ سائنس۔ حساب۔ صرف و نحو۔ حفظانِ صحت۔ جبر و مقابلہ۔ اقلیدس۔ منطق۔ فلسفہ۔ ڈرائنگ وغیرہ۔ ایک مبتدی دماغ کے لیے یہ امر کہ ممکن ہے کہ اتنے مختلف علوم و فنون کا بار اُٹھا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس کثیر اور ناقابل برداشت بار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم جبراً قہراً سب سے بقدرِ خفیف واقفیت تو ہو جاتا ہے مگر یہ واقفیت سراسر ناقص ہوتی ہے اور طالب علم کا وقت اس قدر مختلف فیہ مضامین پر تقسیم ہو جانے کے باعث کامل اطمینان اور انہماک کی روح اُس میں مُردہ ہو جاتی ہے۔ گویا ورقِ طلا اتنے وسیع رقبہ پر پھیلا دیا جاتا ہے کہ اُسکے نیچے جو سیاہ تار چھپے ہوتے ہیں وہ نظر آنے لگتے ہیں، حالانکہ اس ساری تگ و دَو کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جوہرِ اصلی مجلّا ہو جائیں۔ اس بے اصول طرزِ تعلیم کا نتیجہ یہ ہُوا ہے کہ حقیقی طالبعلموں کا زمرہ مفقود ہوتا جاتا ہے اور قدرتی طور پر زمانۂ حال کی نئی پَود کا میلان غوّاصی کے بجائے سطح شناوری پر کتفا کرنے کی جانب زیادہ پایا جاتا ہے۔ اسی طریقۂ عمل کے تواتر سے طالب علمی ایک قصۂ ماضی ہو گئی ہے اور ہماری یونیورسٹیوں کے پاس شدہ لوگوں میں سے دو چار بھی ایسے نظر نہیں آتے جو آیندہ زندگی میں اُن مضامین پر تھوڑی سی توجہ

کرنا بھی پسند کرتے ہوں جن میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اُن کو ساعی موفور کرنے پڑے تھے۔ یہی علم دوستی کا اقتضاء ہے کہ تخریب ماضی کے رائج الوقت طریقوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے۔

خیالات کی یکسوئی زمانۂ حال کی اہم ضروریات میں سے ہے۔ آج کل اخباروں کا بھی یہی طریقہ ہے کہ اپنے ناظرین کی ضیافت طبع انواع واقسام کے مختلف و تر مضامین سے کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کسی شعبہ کی بابت کوئی پختہ رائے پیدا کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ خیال ایک عنوان سے دوسرے عنوان پر بھٹکتا پھرتا ہے مگر کوئی مطلب پوری طرح ذہن نشین نہیں ہونے پاتا۔

کاروباری طبقہ میں تم کامیاب شخص کو ہمیشہ کسی مدعائے خاص کا دلدادہ پاؤگے وہ جانتا ہے کہ اُسکی موجودہ کامیابی کا یہی راز ہے اور آئندہ بھی اُسکے بقا و قیام کی صورت، مدعا کی خصوصیت اور امکانی کوششوں کو ایک سمتِ خاص کی جانب رجوع کر دینے میں پوشیدہ ہے۔ تجارت ہو یا ساہوکاری و دلالی۔ انجنیری ہو یا جہاز سازی و بیلداری ایک خاص میدان عمل میں اپنے کُل ذرائع اور تمام وسائل کو مصروف بکار رکھ دینا چاہیے۔ ہر کام کی ایک ابتدا اور انتہا ہوا کرتی ہے، حصول مقصد کی کوشش میں ہم کو انتہا سے ابتدا نہ کرنی چاہیے۔ یعنی جن کاموں کا ہم کو آخر میں سرانجام کرنا چاہیے، کافی استعداد اور پوری صلاحیت کے بغیر آغاز کار ہی میں ہمکو اُن کے انصرام کی کوشش نہ کرنی چاہیے بلکہ شروع میں ہم کو چھوٹی حیثیت اور معمولی کاموں ہی پر اکتفا کرنا لازم ہے۔

لوگ ایک خیال والے کا خوب مضحکہ اُڑایا کرتے ہیں اور ہمارا مقصد بھی یہ نہیں ہے کہ لوگ ایک ہی خیال کے دُمنی رہیں البتہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اُن کا مقصد و مدعا ایک ہو۔ مارٹن لوتھر ایک خیال کا شخص نہیں تھا البتہ اُسکا مدعا ایک تھا۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ اُس نے اپنے مقصد کی تکمیل کیسی کامیابی کے ساتھ کی۔ ولیم پٹ کی زندگی اور موت کا خلاصہ پولیٹکل عروج رہا ہے۔ اس میں اُسکو اس درجہ انہماک حاصل تھا کہ دوست احباب، محبت، نیکنامی، ضبط مصارف، غرض کسی چیز کی اُسکو پرواہ نہیں تھی۔ بحالت تجرد دس ہزار پونڈ سالانہ آمدنی کے باوجود وہ مقروض مَرا۔ اپنے کسی

تقریر کو ضبط تحریر میں لانے کی زحمت اُس نے کبھی گوارا نہ کی۔ ہاں شب و روز قوم کے عروج و ناموری کی دُھن اُسکو رہا کرتی تھی۔

ایک ارادہ یا ایک مقصدِ زندگی بس کامیابی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ ذہنی استعداد اور دلی کوشش کو اپنے معہودِ ذہنی سے حصول پر منحصر کرا لینے سے یہ ضرور نہیں کہ اور ضروریات زندگی کو پس پشت ڈال دیا جاوے۔ یہ سچ ہے کہ مسافر جب اپنی منزل مقصود کی جانب عزم صمیم کے ساتھ سفر کا ارادہ کرتا ہے تو جو راستہ سب میں سیدھا ہوتا ہے اُسی کو وہ اختیار کرتا ہے اور داہنے بائیں جو سڑکیں ملتی ہیں اُنکی طرف مڑ جانے پر اعتنا نہیں کرتا مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ راستہ میں پھولوں کی خوشبو اور باغ و بہار کے لطف سے وہ بہرہ اندوز نہ ہو یا منزل کی درازی کے باوجود آرام و آسایش کے لیے راستہ میں قیام نہ کرے۔ جو امور کہ صعوباتِ راہ کو کم کرنے والے ہیں یا جن سے کشمکش حیات میں سہولتیں پیدا ہو جاتی ہیں اُن کی طرف سے چشم پوشی کی جاوے تو کامیابی کا راستہ اور دشوار گزار ہو جائے گا۔ فیرے ڈے نے اگرچہ علم کیمیا کو اپنے مساعی کا جولاں گاہ بنا رکھا تھا مگر سائنس کے دیگر شعبوں کی پرداخت سے وہ غافل نہیں رہا۔ جان اسٹوارٹ مِل کا میدان تلاش اگرچہ علم الاقتصاد اور مابعد الطبیعۃ تھا مگر نباتات اور فن موسیقی کی دلچسپیوں سے اُس نے خود کو محروم نہ رکھا۔ گلیڈ اسٹن قدیم شاعری کا بجید دلدادہ ہونے کے باوجود عظیم الشان مدبر بھی ہو گزرا ہے۔ وہ وقت قریب آرہا ہے جبکہ ہم کو کامل انسان پیدا کرنے کے لیے ایک سے دماغ، دوسرے سے دل، تیسرے سے حواس اور چوتھے سے ہاضمہ مستعار لینا ہوگا۔ صرف ایک خیال پر اپنی عمر عزیز ہرگز ضائع نہ کرنا چاہیے۔ بشپ ٹبلر نے مذاہب عالم کے تطابق پر کتاب لکھنے میں اپنی عمر کے بیس برس صرف کر دیے تھے یہ اُسکا مقصودِ زندگی تھا مگر ساتھ ہی وہ اپنے تبلیغی کام سے غافل نہیں رہا۔ بلکہ وہ اپنی استعدادِ ذہنی کی افزائش میں بھی برابر مشغول رہا۔ رؔوما کے عروج و زوال پر کتاب تصنیف کرنے میں اڈورڈ گبن کی زندگی کے بیس سال صرف ہو گئے۔ مگر اس سے سوسائٹی کے حقوق اور اُسکی ضروریات کی تکمیل کو اُس نے

پسِ پشت نہیں ڈال دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تحقیق کے نئے میدانوں میں وقتاً فوقتاً طبع آزمائی کرتے رہنے سے دماغ کو ایک نوع کی فرحت و تقویت حاصل ہوتی ہے بلکہ اس سے مدعاے اصلی کے حصول کا راستہ آسان تر ہو جاتا ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تعددِ مقاصد سے جو خرابیاں رونما ہوتی ہیں اُس سے لوگ باخبر رہیں اس لیے کہ یہ بات روزمرہ مشاہدہ میں آرہی ہے کہ ہماری نئی پود ایک فن سے دوسرا پیشہ اور اُس سے تیسری چیز کی جانب رجوع ہوتی ہے اور یہی عیب اکثر قابل جوہروں کی بربادی کا باعث ہو جاتا ہے۔

ایک چیز پر قائم ہو جاؤ۔ "یک شے گیر و محکم گیر" کو اپنا دستورالعمل بناؤ۔ موہوم امیدوں فرضی مایوسیوں اور احمقانہ بلند پروازیوں کے دھوکہ میں نہ آؤ۔ سجن مشہور مقنن جو آخر میں لارڈ لیونارڈ ہو گیا تھا اُس نے اپنی کامیابی کا رازیہ بتایا تھا کہ جب میں نے قانون پڑھنا شروع کیا تو یہ طے کر لیا کہ جو کچھ پڑھوں گا اُسکو بالکل اپنا کر لوں گا اور جب تک پہلے مطلب پر حاوی نہ ہو جاؤں اُس وقت تک دوسرے کو خیال میں بھی نہ لاؤں گا۔ میرے اکثر ہم سبق طالبعلموں کا یہ حال تھا کہ جو کام میں ایک ہفتہ میں پورا کرتا تھا اُسی کو وہ ایک روز میں کر لیا کرتے تھے مگر ختم سال پر پچھلے معلومات کی نسبت میری یاد ایسی تازہ ہوتی تھی گویا کہ میں نے اُس مطلب کو کل ہی یاد کیا تھا حالانکہ میرے ساتھی اُسکا ایک کثیر حصہ بھول چکے ہوتے تھے۔ بعض غیر معمولی طبّاع اور ذہین لوگ متعدد السنہ اور اکثر علوم میں اپنی طبعی ذکاوت کی وجہ سے ماہر ہو جاتے ہیں گو ایسی مثالیں شاذ ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ باوجود ہمہ دانی کے اُن لوگوں کی باقیات الصالحات بہت کم چیز ہوا کرتی ہے۔

اکثر نوجوان اُن دقتوں اور مشکلات کے شاکی پائے گئے ہیں جو ترقی کی سنگِ راہ ہوتی ہیں۔ مگر دریافت پر مقاصد کا تعدد اور توجہ کی عدم یکسوئی اس شکایت کی بہت کچھ جواب دہ ثابت ہوتی ہے زندگی میں سب سے بڑی عقلمندی یکسوئی خیال ہے اور سب سے بڑی حماقت پراگندہ دلی ہے۔ دنیا میں ناکامی کا راز خیالات کی آوارگی ہے جس سے ہماری اخلاقی اور ذہنی قوتیں مختلف اور متعدد مقاصد پر ضایع ہو جاتی ہیں۔ کسی ایک چیز کو بطریق احسن کرنے کے لیے دلی توجہ کی بہت ضرورت ہے گویا

تھوڑی دیر کے لیے سوائے اُس ایک کے سب چیزیں بُھلادی جائیں۔ ورنہ اُس جنرل کا سا حال ہوگا جس نے اپنی فوجوں کو اطرافِ مُلک میں منتشر کرکے شکستِ فاحش اُٹھائی اس لیے کہ جو اپنی قوتوں اور ذرائع کو مجتمع اور یک جا کرنے کے بجائے چاروں طرف منتشر اور منقسم کردیگا۔ وہ ذرائع کی قلت اور عام کمزوری کی وجہ سے کسی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ انسانی دماغ کی مثال آتشی شیشہ کی سی ہے۔ جس پر شعاعیں اُسی وقت اپنا اثر دکھاتی ہیں جبکہ کسی مرکزِ خاص پر اُنکا اجتماع کردیا جائے۔ پس جس طرح کہ آتشی شیشہ شعاعوں کی ہم مرکزی کے بعد شعلہ ریز ہوتا ہے اُسی طرح انسان بھی سائنس، ادب اور کاروباری دنیا کے آسمانِ کمال پر اُسی وقت مہرِ نیمروز بنکر چمکتا ہے جبکہ وہ کسی شعبۂ خاص کی تلاش میں اپنی عمر کو بسر کردے۔ آسمان پر ابر کے ٹکڑوں کو مشاہدہ کرو جب وہ بکھرے ہوے ہوتے ہیں تو کسان کی نگاہیں اُنپر کس قدر مایوسانہ پڑتی ہیں مگر وہی ابر جب ایک جگہ جمع ہوجاتا ہے تو اُسکے نتائج کسان کے توقعات سے بھی بالاتر ثابت ہوتے ہیں۔ یا اُس ناچیز دُخان کو دیکھو جو انجنوں سے پیہم نکلا کرتا ہے۔ مگر وہی جب کسی اسٹیم بائلر میں جمع ہوجاتا ہے تو چٹانوں کو پاش پاش اور پہاڑوں کو ہلا دینے کی قوت اُس میں پیدا ہوجاتی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ نئی دنیا کے باشندوں کو ہمارے دروازہ پر پہنچا سکتا ہے۔

المختصر اپنی زندگی کا مقصود قرار دینے کے بعد اپنی امکانی طاقت اور پوری سرگرمی اُسکے لیے صرف کردو اور اپنے فرض سے چپ راست ایک انچ بھی نہ ہلو۔ مدعا کی خصوصیت دنیا میں کامیاب لوگوں کا ایک ممتاز خاصہ رہا ہے۔ دیکھو ٹیپو سلطان، دادا بھائی نوروزجی، کیشب چندرسین، سرسید احمد خاں، جسٹس راناڈے اور مسٹر گوکھلے نے ایک خاص مقصد کے پیچھے اپنی عمر کے بہترین حصہ کو صرف کردیا تھا، یہ سب غریباں باپ کی اولاد تھے، مگر تعینِ مقصود کے بعد غیر مغلوب عزم نے اُنھیں ایسے اوج وعروج پر پہنچایا کہ بڑے بڑے تاجداران پر رشک کرتے تھے۔ فقط

سید علی اصغر بلگرامی

سے ابھی بقید حیات ہیں مگر معرکۂ ہستی کو فتح کرکے خوابِ راحت میں مصروف ہیں۔

نظم شبلی

ایک نظم، اُستاذی شمس العلما علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی، جو ۱۸۹۲ء میں تصنیف فرمائی تھی اور اسی زمانہ میں ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھی گئی تھی۔ مجھے دستیاب ہوئی ہے علاوہ دیگر حیثیات کے، وہ آج بھی قوم و رہبران قوم کے لیے اُسی طرح کارآمد اور قابل عمل ہے جیسی کہ زمانۂ تصنیف میں تھی، ناظرین الناظر کے سامنے پیش کرتا ہوں، اور چونکہ میں علامہ مرحوم کا تمام کلام منظوم جمع کرکے طبع کرانا چاہتا ہوں، اس لیے خواہش ہے کہ جن اصحاب کے پاس علامۂ مغفور کی کوئی غزل، نظم، قصیدہ فارسی یا اُردو موجود ہو، یا کسی دوسرے سے حاصل کرسکتے ہوں، اور بشرطیکہ وہ "دیوان شبلی" وغیرہ میں طبع نہ ہوچکی ہو، میرے پاس ارسال فرمائیں، باعث تشکر و امتنان ہوگا۔ اور جو حضرات مجھپر اس قسم کی مہربانی فرمانا چاہیں مجھکو اس پتہ سے مخاطب کریں:-

معین الدین احمد، قدوائی (ندوی) پل فرنگی محل بمکان نمبر ۱۱ لکھنؤ

بجا ہے، آج اگر اس بزم میں یہ بے ساماں ہیں — یہ اُنکی بزم ہے جو یادگار نسل عدناں ہیں
خلیل اللہ سے مہماں نوازی جنکو پہونچی ہے — ہزاروں کوس سے آ آکے وہ اس گھر میں مہماں ہیں
فقط اک جذبۂ قومی انھیں واں کھینچ لایا ہے — جہاں زور حکومت ہے، نہ حاجب ہیں، نہ درباں ہیں
ہماری خدمتوں کا وہ اُٹھانے آئے ہیں احساں — کہ اسلامی جماعت پہ ہزاروں جنکے احساں ہیں
ہنر میں، علم میں، اخلاق میں، مجد اور شرافت میں — یہی وہ صورتیں ہیں جن پہ ہم تم آج نازاں ہیں
خدا نے اُنکو بخشی ہے حکومت اور سطوت بھی — کہ جسم سلطنت کے یہ جوارح اور ارکاں ہیں
مگر انکو کسی عزت پہ نازش ہے تو اس پہ ہے — کہ یہ اسلام کے ہیں نام لیوا اور مسلماں ہیں
نہ عہدوں کا تفاوت ہے، نہ کچھ فرق مراتب ہے — یہاں جس سادگی سے یہ شریک بزم اخواں ہیں
معمر بھی ہیں ان میں، نوجواں بھی اور کمسن بھی — مگر شان اخوت میں یہ آج سب کے یکساں ہیں
یہ وہ ہیں جن میں ہے اسلام کا اب تک اثر باقی — یہ وہ ہیں جن میں جوہر نسل عدنانی کے پنہاں ہیں

انھیں کے بازوؤں میں زور تھا کشورستانی کا
انھیں کی یادگاریں جا بجا اب تک نمایاں ہیں

یہ وہ ہیں جان و دل سے جو فدائے قوم و ملت ہیں
یہ وہ ہیں نام پر اسلام کے جو دل سے قرباں ہیں

نہ ہوگا ایک بھی دل، دردِ قومی سے جو خالی ہو
بظاہر گرچہ سب مسرور ہیں، خرم ہیں شاداں ہیں

انھیں احساس ہے آئین و ملت کی تباہی کا
یہ واقف ہیں کہ بیڑے قوم کے اب غرقِ طوفاں ہیں

انھیں معلوم ہے جس تاک میں ہے گردشِ گردوں
انھیں محسوس ہے جس گھات میں ایامِ دوراں ہیں

خبر ہے ان کو جس آزار میں چھوٹا بڑا ہے اب
یہ واقف ہیں کہ پہلے قوم کیا تھی اور کیا ہے اب

علاج اپنا ہم اب تک تو سمجھتے تھے کہ آساں ہے
مگر وہ درد نکلا جس کو ہم سمجھے تھے درماں ہے

دوا ہر بار جب اپنا اثر الٹا ہی دکھلائے
تو بس سمجھو کہ اب بیمار کوئی دم کا مہماں ہے

جو سچ پوچھو تو ہے اسلامیوں کی اب یہی حالت
مرض دونا بڑھا دیتی ہے خود وہ شے جو درماں ہے

سلف کا تذکرہ جو ہمت و غیرت کا ہے افسوں
ہمارے حق میں وہ سرمایۂ خوابِ پریشاں ہے

یہ افسانے بڑھاتے ہیں ہماری نیند کی شدت
یہ افسوں حق میں اپنے اور مدہوشی کا ساماں ہے

ہمیں احساس تک ہوتا نہیں اپنی تباہی کا
کہ سب پیشِ نظر اسلاف کی وہ شوکت و شاں ہے

ہماری کلفتیں سب دور ہو جاتی ہیں یہ سن کر
کہ "دنیا آج تک اسلام کی ممنونِ احساں ہے"

مزے لیتے ہیں پہروں تک کسی سے جب یہ سنتے ہیں
کہ یورپ دولتِ عباس کا اب تک ثنا خواں ہے

نہیں رہنے کو یاں گھر تک مگر چرچے یہ رہتے ہیں
کہ اب تک قصرِ حمرا قبلہ گاہِ رہ نورداں ہے

ہیں خود ان پڑھ، مگر اس زعم میں اترائے پھرتے ہیں
کہ دنیا میں ہمیں سے زندہ اب تک نام یوناں ہے

نظر آتے ہیں ہم کو عیب اپنے خوبیاں بن کر
ہم اپنے جہل کو بھی یہ سمجھتے ہیں کہ عرفاں ہے

میسر ہوتی ہے گر اوقات فیاضی پہ غیروں کی
تو سمجھے ہیں کہ بس زہد و توکل کی یہی شاں ہے

حمیت اور خودداری نہیں ہے گر طبیعت میں
تو اچھا ہے کہ مسکینی تو اول شرطِ ایماں ہے

طبیعت میں اگر ہیں فتنہ پردازی کے کچھ جوہر
تو دعویٰ ہے کہ تدبیر اور سیاست فنِ انساں ہے

وہ قوم اور وہ جماعت جس میں یہ اخلاق محکم ہیں
بلائیں ایسے جو آئیں وہ کم ہیں اور بہت کم ہیں

یہ جو کچھ سُن چکے ہو قوم کی تم حالت ابتر
نہ سمجھو یہ کہ ہے اس داستاں کا خاتمہ اس پر

ہماری سب سے بڑھ کر بدنصیبی جو ہے وہ یہ ہے
کہ بے پروا ہیں وہ بھی قوم کے جو آج ہیں لیڈر

گیا وہ وقت جب تھا بس اسی کا نام ہمدردی
کہ دو آنسو بہا لیں قوم کی درماندہ حالت پر

گیا وہ وقت ہمکو ناصحوں کی جب ضرورت تھی
فلک نے کر دیا اک اک کو آپ اپنا نصیحت گر

گئے وہ دن کہ ہم محتاج تھے عبرت دلانے کے
ہمارا حال خود عبرت فزا ہے آج سرتاسر

ضرورت اب ہے گر ہمکو تو بس ہے اُن بزرگوں کی
کہ جن میں خیر سے کچھ کر دکھانے کے بھی ہوں جوہر

فقط باتیں نہ ہوں کچھ کام بھی بن آئے ہاتھوں سے
کہیں جو کچھ وہ مُنہ سے کر دکھائیں اُس سے کچھ بڑھکر

نہیں گر یہ، تو بس اک گرمیِ صحبت کے ساماں ہیں
یہ قومی مرثیے یہ وعظ یہ اسپیچ یہ لکچر

طلب اور سعی سے کچھ کام بن آئے تو بن آئے
فصاحت اور بلاغت کا بس اب چلتا نہیں منتر

تمھیں جو کام ہیں در پیش گو مشکل سے مشکل ہیں
مگر کرنے پہ آ جاؤ تو آساں سے ہیں آساں تر

ابھی تک تم میں ہے اسلاف کا کچھ کچھ اثر باقی
شرر گو بجھ چکے پر گرم ہے اب تک وہ خاکستر

ابھی کچھ کچھ مہک باقی ہے ان مرجھائے پھولوں میں
ابھی کچھ کاٹ ہے اس تیغ میں گو مٹ چکے جوہر

کمی جس بات کی یا نقص جو تم میں ہے وہ یہ ہے
کہ تم ان قوتوں کو صرف بیجا کرتے ہو اکثر

وہی فیاضیاں تم میں ہیں جو تھیں معن و حاتم میں
مگر بیہودہ رسموں کے لیے وہ وقف ہیں یکسر

کچھ اس سے کم ہُوا تھا صرف تجہیزِ اُسامہ میں
لُٹا دیتے ہو تقریبوں میں جتنا تم زر و زیور

فقط آپس کے جھگڑوں میں تم اُس سے کام لیتے ہو
وہ جودت اور ذہانت جس میں اب بھی تم ہو نام آور

سنبھلنا اب بھی گر چاہو تو ہے وقت اور ضرورت بھی
وگرنہ پھر نہیں رہنے کی جو کچھ ہے یہ حالت بھی

سوتا سنسار

(نمبر ۱)

اہا! ہم وہاں ہیں!

ہمارے ایک دوست اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں، کہ ایک افیونی عموماً شام کو جب جاسے سرور کو جاتے تو اپنے ساتھ لال ٹین لے جاتے اور قدمچہ پر اپنے پاس ہی اُسے رکھ دیتے اور جیسا کہ اس شریف فرقہ کی عادت ہے، اکثر وہاں دیر تک تشریف رکھتے۔ ایک دفعہ ایک لڑکے کو شرارت سوجھی اور جس وقت کہ حضرت پینک میں تھے، لڑکے نے لالٹین اٹھا کر دور ایک کونے میں رکھ دی۔ میاں افیونی جب پینک سے ہوشیار ہوے تو لالٹین کو دُور کونے میں دیکھکر بیساختہ فرمانے لگے۔

اہا! ہم وہاں ہیں!

بعینہٖ یہی حال جدید تہذیب کے دلدادہ نوجوان کا ہے۔ جب وہ آئینہ میں اپنی ٹیڑھی مانگ اور خوش وضع بالوں کو ٹھیک کرکے، کالر اور نکٹائی کو درست کرتا ہے اور آہستہ سے ہیٹ (انگریزی ٹوپی) سر پر رکھتا ہے اور پھر ایک نظر اپنے فیشن ایبل سوٹ اور اپنی وضع قطع پر ڈالتا ہو تو دل میں سمجھتا ہے کہ

اہا! ہم وہاں ہیں!

کہاں؟ جو فیشن کا گھر اور نت نئی ایجادوں کی بستی ہے۔

وہ کلب میں جاتا، برج اور بلیارڈ کھیلتا اور خوش گپیاں کرتا ہے۔ کلب کے ممبر اُس سے اور وہ اُن سے خوش ہے اور شام کا وقت بڑے مزے سے بسر کرتا ہے۔ وہ اُنکو کبھی کبھی ڈنر دیتا ہے۔ یہ رات اُسکے لیے شب قدر سے کم نہیں۔ اس شب کو وہ حق مہمان نوازی ادا کرتا ہے۔ طرح طرح کے ولایتی کھانے پکواتا اور کھلاتا ہے۔ شراب کا دَور چلتا ہے۔ لیڈیز اور جنٹلمین سے خوش فعلیاں کرتا ہے اور اُن کی ہنسی اور قہقہوں سے ڈنر روم گونج اُٹھتا ہے۔ وہ اس جوش مستی میں اردو اور فارسی

کی غزلیں انگریزی دُھن میں گاتا ہے اور ہر طرف سے واہ واہ سنتا ہے۔ ہال میں پریزادوں کے ساتھ ناچتا اور اس فن لطیف کی داد دیتا ہے اور عین مسرت و لطف میں اُسے بیساختہ یہ خیال آتا ہو کہ

اہا، ہم وہاں ہیں!

کہاں؟ جو زندہ دلی کا ایمان اور فیشن و کامرانی کی جان ہے۔

شام کو کلب سے واپس آتا ہے۔ میز پر ولایتی ڈاک رکھی ہے۔ اُن عزیز دوستوں کے خط کھول کھول کر پڑھتا ہے، جن کے ساتھ اُس نے کئی سال بڑے لطف سے بسر کیے ہیں۔ خط کھولتا جاتا ہے اور مزے لے لے کر پڑھتا جاتا ہے۔ اور وہاں کی پُرلطف صحبتیں، یاروں کے جلسے، مصفا گلی کوچے، پُرلطف پارک، حیرت انگیز تھیٹر، راحت افزا سٹارینٹ، مہ جبینوں کے جھگھٹے۔ دوستوں کا البیلے گیلے پھرنا، یہ سارا سماں اُسکی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ اسکے بعد وہ ولایتی اخبار کھولتا ہے اور اُن میں محو ہو جاتا ہے۔ سوسائٹی کے جدید حالات، مزیدار لطیفے، پارلیمنٹ کی بحثیں، آزادی کی تقریریں پڑھتے پڑھتے یکایک اُس کا دل بول اُٹھتا ہے کہ

اہا، ہم وہاں ہیں!

کہاں؟ جو آزادی کا بیت المقدس اور حریت کا مدینہ ہے۔

وہ اپنے ڈرائنگ روم پر نظر ڈالتا ہے، ہر چیز اُسے کہیں اور کی یاد دلاتی ہے۔ وہ دیواروں کو دیکھتا ہے تو طرح طرح کے نفیس فوٹو اور تصویریں اُسے کہیں اور لے جاتی ہیں۔ اور وہ صورتیں اور منظر اُسکے دل پر عجیب کیفیت طاری کر دیتے ہیں، اور وہ اُن میں ایسا منہمک ہوتا ہے کہ خیال ہی خیال میں یہ سمجھتا ہے کہ

اہا، ہم وہاں ہیں!

کہاں؟ جو صفائی اور پاکیزگی کا نمونہ اور صنعت و حرفت کا گھر ہے۔

یکایک زمانہ کا رنگ بدلتا ہے۔ ہوا کا رُخ ادھر سے اُدھر ہوتا ہے۔ جس بندے کی خوشی اور کامیابی کا انحصار چند صاحبوں کی نظرِ کرم پر ہو، اُسے بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ صاحب لوگوں

کی نظریں اسکی طرف سے پھر گئی ہیں۔ ایک طرف اسکی خودداری، دوسری طرف اسکی نقالی اُسے کہیں مطلق نہیں بھاتی۔ اسکی خوش فعلیاں اب بدتمیزی کی حرکتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اب وہ ڈنروں اور بالوں میں نہیں بُلایا جاتا۔ اس لیے اُسے خود ڈنر دینے کی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ کلب میں جاتے ہوے جھجکتا ہے۔ اسکی مہذب خوشامد اور جاسوسی سے بدگمانی پیدا ہوگئی ہے۔ اور اب اس کا دل بھی ان لوگوں سے کھٹا ہوگیا ہے۔ ولایت سے بھی عزیزوں کے خط کم آتے ہیں اور کبھی کبھار آتے بھی ہیں تو اُن میں وہ پیار اخلاص نہیں۔ اب وہ یکہ وتنہا ہے اور دل ہی دل میں غصّے اور رنج سے گھُٹا جاتا ہے۔ وہ اہل وطن کی طرف جھکنا چاہتا ہے، لیکن کس منہ سے۔ وہ اسکی حرکات اور برتاوے سے پہلے ہی آزردہ خاطر اور بدگماں ہیں۔ وہ اُن کی طرف قدم بڑھانا چاہتا ہے، لیکن ہمت نہیں پڑتی۔ وہ اپنے کیے سے خود نادم ہے۔ وہ گزشتہ کی تلافی کرنا چاہتا ہے، مگر اُس کا وقت نکل گیا۔ وہ اُن دیسی اخباروں کو جن کا پڑھنا وہ ذلت سمجھتا تھا اٹھاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ یہاں رنگ ہی اور ہے۔ دُنیا کہیں سے کہیں نکل گئی ہے۔ وہ زمین نہیں وہ آسمان نہیں۔ لوگوں کے مطالبات اور خواہشات کچھ کے کچھ ہوگئے ہیں۔ اُنکے مضامین سے حُریّت کی بو آتی ہے۔ چاہتا ہے کہ وہ بھی میدان میں آئے، لیکن کس برتے پر۔ اس نے کبھی مُلک کے حالات کا مطالعہ کیا، یہاں کے واقعات پر غور کیا۔ کم سے کم اس نے اپنے ملک کو دیکھا بھی؟ وہ ایڈنبرا، لندن، پیرس اور برلن کی سوسائٹی سے زیادہ واقف ہے بہ نسبت اپنے ملک کی سوسائٹی کے۔ تاہم وہ کچھ کرنا چاہتا ہے، لیکن اُس وقت جبکہ ہاتھوں میں سکت اور دماغ میں قوّت نہیں، جبکہ وہ اپنے مُلک سے بالکل بے خبر اور بیگانہ ہے۔ افسوس وہ عمر بھر یگانوں کو بیگانہ اور بیگانوں کو یگانہ سمجھتا رہا۔ اب کفِ افسوس ملتا ہے اور اپنی زندگی پر تُف کرتا ہے۔ لیکن اب کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت۔ وہ اسی عالمِ تنہائی میں حسرت و افسوس کے ساتھ اس دنیا سے کوچ کرتا اور شہر خموشاں کو جا بساتا ہے۔

جن لوگوں کا گزر اس قبرستان کی طرف ہوگا تو اس حسرت زدہ کے لوحِ مزار پر یہ مصرع

لکھا ہُوا دیکھیں گے۔

من نہ کردم شما حذر بکنید

شاید اسے پڑھ کر کسی کے دل پر چوٹ لگے، شاید اسے دیکھ کر کوئی اُس غلطی اور دھوکے سے بچے۔ شاید کوئی اس سے سبق حاصل کرکے اپنے بدنصیب مُلک کی خدمت پر کمربستہ ہو جائے۔ اور کیا تعجب ہے، کہ جسکی ساری زندگی یوں بکار اور لہو ولعب میں صرف ہوئی اُسکی **موت** کسی کے لیے باعث عبرت ورہنمائی ہو! یہ بھی کچھ کم نہیں!

"سائیں"

فقر کے پردے میں پنہاں ہے غنا میرے لیے   مسندِ شاہی ہے مرا بوریا میرے لیے
اُس نے کی تجویز کچھ ایسی دوا میرے لیے   دوست میرے کر رہے ہیں اب دعا میرے لیے!
تو نہ کر افسوس اے جانِ وفا میرے لیے   عشق تھا شرط اور محرومی جزا میرے لیے
کوے جاناں کے لیے میں ہی نہیں ہوں مضطرب   کوے جاناں بھی ہے آتش زیرِ پا میرے لیے
وہ نگاہیں کاہیکو ہوتیں مروّت آشنا   رہ گئی سر پیٹتی میری وفا میرے لیے
کعبۂ مقصود ہے مجھکو کسی کا رہگزر   ہے گُلِ امید ہر ہر نقشِ پا میرے لیے
غنچۂ گُل کے چٹکنے سے مجھے صدمہ ہُوا   تھی شکستِ دل کی اک یہ بھی صدا میرے لیے
اب خفا ہونے لگے ہو مجھ سے ہر ہر بات پر   تم کہ ہو جاتے تھے دشمن سے خفا میرے لیے
فیضِ قسامِ ازل سے کوئی بے بہرہ نہیں   گر جفا تیرے لیے ہے تو وفا میرے لیے
دل دھڑکتا ہے اِدھر اور تُند اُدھر اُنکا مزاج   کس قدر مشکل ہے عرضِ مدعا میرے لیے
کھُل گیا ہے مجھکو اب اُسکی مشیّت کا جو راز   رنج بھی ہونے لگا راحت فزا میرے لیے
جامِ مے دینے کی کیا حاجت ہے مجھ وارفتہ کو   کون کم تھی میرے ساقی کی ادا میرے لیے
کوے جاناں میں نکر برباد میری خاک کو   خاک چھانے گی پھرلے باد صبا میرے لیے!
محفلِ اغیار میں وحشت نہیں ہیں نامُراد   مضطرب ہے وہ نگاہِ آشنا میرے لیے

مساحت کرۂ ارض اور مسلمان

موجودہ عہد علمی میں کرۂ ارض کی پیمائش کا کام ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتا ہے، جو جیاڈیسی (Geodesy) کے نام سے مشہور ہے۔ اس فن کے ماہر پیمائش کے ساز و سامان لیے سارے زمانہ میں زمین پیمائی کرتے اور حبامتِ ارض کی مقداریں معلوم کرتے پھرتے ہیں۔ متعدد انجمنیں اور سوسائٹیاں ہیں، جو محض جیاڈیسی کی تحقیقات کے لیے مخصوص ہیں۔ پیمائش کے واسطے مختلف وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔ مثلثات کی پیمائش، پنڈولیم اور تار برقی وغیرہ کے ذریعہ سے مقداریں معلوم کرنے کے جداگانہ طریقے ہیں[1]۔ قاعدۂ کلیہ یہ ہے کہ دَورِ زمین (محیط یا دائرۂ عظیمہ) کی تقسیم ۳۶۰ حصوں میں فرض کی جاتی ہے اور ہر حصہ کا نام درجہ یا جزو ہوتا ہے۔ ان مفروضہ اجزا میں سے کم و بیش ایک جزو کا طول معلوم کرکے پورے دَور کا حساب لگا لیا جاتا ہے۔ رہا جزو یا درجہ کا دریافت کرنا، اُسکے لیے ہیئت کے قاعدے ہیں، جن کے رُو سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں مقام سے فلاں مقام تک کتنا حصۂ دَور (یعنی جزو یا درجہ) ہے۔

(۲) جیاڈیسی کے ماہرین نے اس وقت تک دُنیا کے بڑے بڑے موقعوں پر بڑی بڑی جاں فشانی کے ساتھ پیمائشیں انجام دی ہیں، لیکن درجہ کی مقدار میں ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے[2]۔ اور یہ اختلاف ایک خاص ترتیب کا پابند ہے۔ اختلاف کی کیفیت یہ ہے کہ خط استوا سے جتنا شمال یا جنوب کی جانب بڑھتے جائیں اُتنا ہی فرق بھی بڑھتا جائے گا، یعنی محیطِ زمین کے ایک درجہ کی مقدار سب سے زیادہ قطبین کے قریب ہوگی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ زمین ایک جسم مستدیر ہے یعنی اُسکی شکل

---

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانکا ایڈیشن نہم جلد ہفتم صفحہ ۵۹۹-۶۰۸ و جلد ۲۷ سلسلہ جلد ہائے جدید New Volumes صفحہ ۵۹۸-۶۰۲

[2] دیکھو جلد ۲۷ صفحہ ۶۰۱ انسائکلوپیڈیا برٹانکا، جہاں مختلف پیمائشوں کے رو سے نصف قطر ارض کی مقدار کے اختلاف کی ایک فہرست درج ہے، جسے ہم نے بخوف طوالت نقل نہیں کیا۔

گردش ہے، نہ کہ بالکل مدوّر قطبین پر کرہ کی سطح کسی قدر دبی ہوئی ہے، جس سے حوالی قطبین کی سطح اُبھری ہے اور بتدریج خط استوا کی طرف ڈھلتی ہوئی آئی ہے۔ مختلف موقعوں کے لحاظ سے دائرۂ نصف النہار (یہ دور کا ایک اصطلاحی نام ہے) کے درجوں کی مقداروں کا فرق اعدادِ مندرجۂ ذیل سے معلوم ہوگا:-

عرض البلد کے درجۂ صفر یعنی خط استوا پر	۳۶۲۷۴۶۶، ۴ فٹ
۴۵ عرض البلد پر ————————	۳۶۴۶۰۵ ″
۹۰ عرض البلد (یعنی حوالی قطبین) میں	۳۶۶۴۷۸، ۸ ″

(۳) اگرچہ جسم زمین کی مساحت بذاتِ خود ایک نہایت دلچسپ جغرافیائی مشغلہ ہے لیکن اسکی اہمیت ایک خاص وجہ سے بہت زیادہ ہے اور غالباً اسی وجہ سے علما نے اس مسئلہ کی طرف خاص توجہ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ فضاے افلاک میں مختلف اجرامِ سماوی کے بُعد و فصل اور جسامت و وزن کا دریافت کرنا علم ہیئت کا اہم ترین بحث ہے۔ اس لا انتہا پیمایشِ سماوی کے لیے فٹوں اور گزوں کا کیا ذکر میل و فرسنگ بھی کچھ بساط نہیں رکھتے۔ کرۂ زمیں کا پورا قُطر بطور پیمانہ کے فرض کیا جاتا اور مساحتِ افلاک کا ایک گز مانا جاتا ہے، تب کہیں فضاے محیط میں اس مساحتِ بے نہایت کی بسم اللہ ہوتی ہے۔

(۴) مساحتِ کرۂ ارض کے متعلق ایک نہایت دلچسپ قصہ تاریخ میں مذکور ہے، جس سے اس فن کی اہمیت پر گہری روشنی پڑتی ہے۔ لکھا ہے کہ جب نیوٹن اپنے مہتم بالشان مسئلۂ قانونِ کشش کے حل و عقد میں منہمک تھا تو اُس نے یہ معلوم کرکے کہ زمین سے چاند کی دوری قطرِ زمیں سے تیس گُنا ہے، از روے حساب عملاً یہ تحقیق کرنا چاہا کہ آیا یہ قانون صحیح بھی ہے یا محض خیال و گمان ہی ہے۔ پہلی دفعہ ایسا ہُوا کہ نیوٹن نے قطرِ زمیں کی اُس مقدار سے حساب لگایا، جو اُس زمانہ کے فضلاے یورپ کے نزدیک مسلّم تھی۔ یہ مقدار صحت سے کہیں دُور تھی اور نیوٹن نے جو حساب نکالا

[1] انسائکلوپیڈیا برٹانکا اڈیشن نہم حصۂ ہشتم مضمون جغرافیہ (صفحہ ۱۹۹) اور نلسن کی انسائکلوپیڈیا جلد ۹ صفحہ ۱۲۱۔

تو اُسے تخمینہ اور اعداد مطلوبہ کے خلاف پایا۔ بیچارے کو اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اُسکا نظریہ یعنی قانونِ کشش عالمگیر نہیں ہے۔ نہایت حسرت ویاس کے ساتھ اس کام کو ناممکن اور سعی بے سود سمجھ کر چھوڑ دیا۔ کئی سال اسی طرح گزر گئے۔ لیکن نیوٹن کی معرکۃ الآرا تصنیف شایع ہونے سے پہلے طالعِ بخت نے یاوری کی۔ اُسی دَوران میں ملک فرانس میں کسی عالم نے دائرۂ نصف النہار کے ایک جزو کی پیمایش کرکے قطر ارض کا حساب نکالا تھا، جو اقرب بصحت تھا۔ نیوٹن نے جدید تحقیق کی رُو سے جو حساب لگایا تو تقریباً ٹھیک ہوتا تھا اور اس بات کی تصدیق کرتا تھا کہ قانونِ کشش کا عمل دیگر اجرامِ سماوی میں بھی ایسا ہی دائر و سائر ہے جیسا کرۂ ارض میں۔ کہتے ہیں کہ ہنوز حساب مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ اُسے یقین ہوگیا کہ اُس حساب سے قانون کی تصدیق ہوتی ہے۔ جوشِ مسرت سے وہ ایسا بیتاب ہوگیا کہ حساب کے کاغذات ایک دوست کے حوالہ کیے اور اُس سے باقی حساب پورا کرایا۔*

(۵) کرۂ ارض کی پیمائش کا کام، اگرچہ ہمارے زمانہ میں بہت ترقی پاگیا ہے، محض عصر جدید کا مخصوص کارنامہ نہیں ہے۔ پیمانۂ فطری، جس کا اوپر ذکر ہوا، قدیم ماہرینِ ہیئت کا بھی آزمائی گزرا تھا۔ یونانیوں میں، جنھیں بجا طور پر دنیائے تمدن کی معلمی میں اولیت کا فخر حاصل ہے، دخیر خوس Dichearchus (۳۲۰ قبل مسیح) Eratosthenes ارانسطانیس (۲۹۵ ق م) اور ابرخوس Hipparchus (۱۶۰ ق م) نے دائرہ کی مقدار تحقیق کرنے کی کوشش کی تھی۔

ارسطو نے لکھا ہے کہ ہندسیین نے زمین کا دَور چار لاکھ استادیا معلوم کیا ہے ارانسطانیس نے ڈھائی لاکھ استادیا، اور پاسی دانیوس Poseidonius (۱۵۱ ق م) نے دو لاکھ چالیس ہزار استادیا نکالے۔ بطلیموس Ptolemy (۱۵۱ء) مؤلف "المجسطی"

---

* منقول از تاریخ ہیئت مولفۂ جارج فاربس (G. Forbes) مطبوعہ مطبع واٹسن اینڈ کو (Watts & Co) لندن (۱۹۰۹ء) صفحہ ۵۴۔

نے ایک درجہ کی مقدار پانسو استادیا لکھی ہے، یعنی بحساب بطلیموس کُل دَور ایک لاکھ اسی ہزار استادیا کا ہوتا ہے[1]۔ ان مختلف اعداد پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یونانیوں کے نتائج کی کیا کیفیت تھی اور اُنکی تحقیقات میں کیسا شدید اختلاف تھا۔

(۶) یونانیوں کے بعد دنیا میں پورے طور پر جنبشِ علم اور تحریکِ حکمت جس قوم میں پیدا ہوئی وہ مسلمینِ عرب تھے۔ تحقیق و تفحص کا کوئی ایسا شعبہ معلوم نہ تھا، جسکی طرف انھوں نے پوری توجہ نہ کی ہو۔ اور ترقی کے زبردست آثار اپنی یادگار نہ چھوڑے ہوں۔ مامون الرشید کے عہدِ امن و اقبال میں، جو عربوں کے نشأہ علمیہ کے حیرت انگیز نشو و نما کا زمانہ تھا، سب سے پہلے مسلمانوں نے مساحتِ کرۂ ارض کا اہتمام کیا۔ اُسوقت بھی پیمانہ اُستادیا کا، جس سے یونانیوں نے اپنی پیمایشیں انجام دی تھیں، حساب کسی کو معلوم نہ تھا، اور اگر معلوم بھی ہوتا تو ایسے شدید اختلافات کی حالت میں، اسکے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ مسلمان اس اہم مسئلہ علمی کو خود تحقیق کریں۔ بنابریں علم پرست مامون کے حکم سے براہ یقین میں پیمایش کا اہتمام شروع ہوگیا۔ دشت سنجار اس کام کے لیے منتخب ہوا۔ جہاں علماے ہیئت کا جم غفیر جمع ہوا۔ ان میں خالد مروزی، ابو البختری مسّاح اور علی ابن عیسیٰ اصطرلاب گر کے نام خاص طور پر ذکر کیے جانے کے لائق ہیں[2]۔ قرار پایا کہ جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ ایک گروہ شمال کی طرف روانہ ہوا اور دوسرا جنوب کی طرف: تدمُر اور رَقّہ کے درمیان اذراع (عربی فٹ) سے ناپتے جاتے تھے، یہاں تک کہ ہر گروہ نے ایک ایک درجہ ناپ لیا۔ یہ پہلی پیمایش تھی جو مسلمانوں نے انجام دی۔

(۷) فضلاے مغرب کو خود پسندی اور جدید پرستی کے بدولت یقین نہیں آتا کہ یہ پیمایش جس کا عہد ماضی کے مسلمانوں سے واسطہ ہے، حسن و خوبی اور صحت و درستی سے انجام پائی ہو۔ جنکی موجودہ دَور کے دشوار و پیچیدہ علمی کارناموں پر نظر ہے اور بادۂ پندار سے مست ہیں، وہ جو کہیں زیبا ہے۔

[1] انسائکلوپیڈیا برٹانکا جلد ہفتم صفحہ ۵۹۴

[2] دیکھو کتاب التفہیم ابوریحان بیرونی نسخہ نواب ضیاءالدین خاں نیر درخشاں صفحہ ۴۰ موجودہ لٹن لائبریری۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ۔

ایک جلیل القدر فاضل، جنھوں نے انگریزی خزینۃ المعارف انسائکلوپیڈیا برٹانکا میں تشکل زمین کے متعلق بسیط مضمون لکھا ہے، اس پیمایش کا ذکر کرتے ہوے لکھتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کچھ زیادہ قابل اطمینان نہیں معلوم ہوتا[۵۱]۔ یہ رائے کس بنا پر قائم کی گئی ہے؟ کیا پیمایش کے حساب کی جانچ پڑتال کی گئی ہے؟ حاشا جانچ پڑتال کا کیا ذکر لکھنے والے کو اُس حساب تک کا پتا نہیں مگر واہ رے بدگمانی، یہ مسلمان کب اس قابل تھے کہ کچھ کرتے اور اس قابل کرتے کہ اُسے قابلِ اعتبار سمجھیں!

آگے چل کر فاضل مذکور خیال فرماتے ہیں کہ مامون کے بعد پندرہویں صدی عیسوی کے اختتام تک کسی کو اس مضمون کی جانب التفات کرنے کی توفیق نہیں ہوئی، یعنی اُس وقت تک جب یورپ میں دَورِ جدید کا آغاز ہوا اور چند اربابِ فضل و ہمت نے چند پیمایشیں کیں جو قدرے قریب صحت ہونے کی وجہ سے بحیثیت تاریخی مستحقِ ستایش اور مایۂ نازش تصور کی گئی ہیں[۵۲]۔

(۷) تھوڑی دیر کے لیے ان اربابِ تحقیق کو اُنکے حال پر چھوڑیے اور دو اسلامی پیمایشوں کی تفصیل سنیے، جن میں سے دوسری مامون سے سوا دو سو سال بعد انجام دی گئی تھی اور پہلی سے بھی بڑھ کر صحیح اور تحیّر خیز ہے۔ غالبًا تاریخی حیثیت سے یہ پہلا موقع ہے کہ ان پیمایشوں کی موجودہ صحیح تفصیل کو دنیاے علمی کے سامنے پیش کیے جانے کی مسرت حاصل کی جاتی ہے[۵۳]۔

---

[۵۱] دیکھو انسائکلوپیڈیا مذکور جلد ہفتم صفحہ ۵۹۷ اصل فقرۂ انگریزی حسب ذیل ہے۔
But—The result of this measurement does not appear to have been very satisfactory

[۵۲] مثلاً ۱۶۳۶ء میں، یعنی عہد مامونی سے آٹھ صدی بعد، انگلستان میں رچرڈ نارووڈ نامی ہندسی نے ایک درجہ کی مقدار ۳۶۷۱۷۶ فٹ معلوم کی تھی۔ اسے فاضل محقق نے واقعی مقدار سے قریب ہونیکی وجہ سے حیرت انگیز اور تعجب خیز خیال کیا ہے حالانکہ (جیسا آگے چلکر معلوم ہوگا) علماے مامونی کا حساب اس سے کہیں بڑھ کر صحیح ہے۔ اور بیرونی کی پیمایش سے تو اُسے کوئی نسبت ہی نہیں۔

[۵۳] مامون کے زمانہ کی پیمایش کا ذکر اکثر تواریخ میں آتا ہے لیکن اسکی تفصیل سے لوگ بالکل ناواقف ہیں بیرونی کی پیمایش کا آجتک کسیکو حال معلوم نہیں، انسائکلوپیڈیا آف اسلام میں، جسکا آگے کئی جگہ ذکر آئیگا، مامون کی پیمایش کیطرف اشارہ کیا ہے لیکن حساب جو نکالا ہے ؎

؎ وہ پورے طور پر ٹھیک نہیں ہے۔ انشاءاللہ اپنے موقع پر یہ بحث نظر سے گزرے گی۔

(۲)

یادش بخیر، چوتھی پانچویں صدی ہجری بھی کیا مبارک عہد علمی تھا، جس کے اندر مسلمانو میں ابوریحان بیرونی جیسا متبحر پیدا ہوا۔ اُس نے اُسی عہد کی آب و ہوا میں پرورش پائی تھی اُس کی ممتاز شخصیت کو اُسی دَور کے ترقیِ علوم کا ایک مظہر سمجھنا چاہیے۔ واہب العطایا کی دین کہ اُسے علم و عمل کی وہ قوتیں عطا ہوئی تھیں، جنکی بدولت معاصرین میں کوئی معیارِ ہمسری پر پورا نہیں اُترتا، ورنہ یہ وہ زمانہ تھا جب بوعلی سینا اور دیگر بشمار متبحرین عصر دنیائے اسلامی کے گوشہ گوشہ میں تحصیل علم کے لیے مثلِ شمع گھُل رہے تھے اور مملکتِ اسلام اُنکی تجلیات سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی یہاں نہ کوئی موقع ہے اور نہ چند سطریں بیرونی کے تذکرہ کے لیے کفایت کرسکتی ہیں۔ اسوقت ا بتانا مقصود ہے کہ اُس متبحر نے علاوہ اور حیرت انگیز کتابوں کے ہیئت میں ایک خاص کتاب تالیف کی تھی، جس کا نام "قانونِ مسعودی" ہے۔ متقدمین و متاخرین کا اسپر اتفاق ہے کہ اُسکی تمام تصانیف میں (جو بقول بیہقی و شہرزوری بار فیل سے زیادہ تھیں) یہ کتاب سب سے گراں پایہ ہے۔ سلطان مسعود بن محمود غزنوی نے، جس کے نام پر یہ کتاب معنون ہے، ہاتھی بھر چاندی بطور انعام کے بھیجی تھی مگر اللہ رے استغنا مولف نے قبول نہیں کی اور شکریہ کے ساتھ خزانۂ شاہی کو واپس کرا بھلا وہ اس چاندی کی کیا قدر جانتا، جس نے علم کے سوا دنیا کی کسی چیز کو عزیز نہیں رکھا، ا فلسفۂ معیشت کا لب لباب اس قول کو قرار دیا کہ

"آنچہ لائق امروز است دراں حاضر است وآنچہ از برائے فرد است بفردا آمادہ است"

زمانہ کی ناقدری دیکھو، بیرونی کی طرح اُس کی یہ بیش قدر تالیف بھی، محض ایک نام ہی نام رہ گئی

---

۱ جن صاحبوں کو اس بے نظیر عہد علمی کی مختصر داستان سننا مقصود ہو وہ راقم کے ناچیز رسالۂ البیرونی کے پہلے باب ملاحظہ فرمائیں۔ اسمیں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ بیرونی کی شخصیت کو اس دور سے کیا تاریخی تعلق ہے اور اُسکے ہمہ گیر مذاقِ حکمت کی نشو و نما زمانہ کے علمی روح کے اثرات کی کس حد تک رہین منت ہے۔

۲ بیہقی لکھتا ہے کہ میں نے بیرونی کی تصانیف میں سے اکثر اُسکے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی تھیں۔

مرور دہور اور عہد ما بعد کے علمی جمود کے باعث آج نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ سارے زمانہ کی خاک چھاننے سے قانونِ مسعودی کے چند ہی نسخے ملیں گے، اکثر اغیار کے یہاں بعد آثار و نوادر۔ تشکر کا مقام ہے کہ مدرستہ العلوم علی گڑھ کی لٹن لائبریری میں، جہاں اور بھی چند نادر قلمی کتابیں ہیں، اس وقت "قانون" کے دو نسخے اور بوڈلین لائبریری کے نامکمل مگر سب سے قدیم نسخہ کے فوٹو موجود ہیں۔ ان کے موجودہ نسخوں میں ایک، سوا آٹھ سو برس کا ہے، جو ۵۶۲ھ (۱۱۶۶ء) یعنی بیرونی کی وفات سے سوا سو برس بعد لکھا گیا تھا۔

(۳) قانون کے پانچویں مقالے کے ساتویں باب (فی معرفۃ الدور الارض باجزاء الاصطلاحیۃ) میں مذکورۂ صدر پیمایشوں کا ذکر ہے[1]۔ پہلی پیمایش تو وہی ہے جسے مامون کے عہد میں علما کے جمِ غفیر نے ۲۰۴ھ (۸۱۹ء) میں دشت سنجار میں انجام دیا تھا۔ دوسری وہ پیمایش ہے، جس کا مہتمم اور منتظم خوارزم کا وہ غریب الوطن طالبِ علم تھا جو پچاس سال کی عمر میں سنسکرت اور علوم ہند کی تحصیل کے شوق میں غربی اقطاعِ ہند میں خانہ بدوش پھر رہا تھا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ فضلاے مامونی نے ایک جزو یا درجہ کی مقدار ۲۲۶۶۶۶ ۲/۳ اذراع یا ۵۶ ۲/۳ میل (عربی) یا ۱۸ فرسخ (فرسنگ) ۵۳ ۱/۳ دقیقہ اور پورے دور کی مقدار ۸۱۶۰۰۰۰۰ اذراع یا ۲۰۴۰۰ میل عربی یا ۶۸۰۰ فراسخ معلوم کیے تھے۔ چونکہ بیرونی کی طبیعت ایسے معاملاتِ علمی میں جن کا مدار مشاہدہ و محاسبہ پر ہے' (بقولہ) "بربناے شدۃ حرص" بغیر تصدیق کے اعتبار و اطمینان نہ ہوتا تھا۔ وہ اس خیال میں تھا کہ کسی طرح پیمایشِ کرۂ ارض اپنے آپ بھی کرنا چاہیے۔

---

[1] یہاں اتنا بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی نے جیاڈیسی پر ایک مستقل رسالہ بھی لکھا تھا جس کا نام ہے۔ "مقالہ فی استخراج قدر الارض برصد انحطاط الافق عن قلل الجبال" یہ رسالہ ایک سو بیس صفوں (۶۰ ورقوں) میں تھا اور جیسا کہ نام سے معلوم ہوتا ہے اس میں یہ بتایا تھا کہ پہاڑ کی چوٹی سے افق کا نشیب نکال کر زمین کی مقدار کیسے معلوم کی جائے۔ بیرونی نے کرۂ ارض کی وہ پیمایش، جس کا قانون میں ذکر ہے، اسی قاعدہ سے کی تھی۔ کیا عجب ہے کہ جیاڈیسی میں تاریخی حیثیت سے یہ سب سے پہلی مستقل کتاب ثابت ہو۔

ایک مرتبہ ارضِ دہستان واقع جرجان میں کوشش کی، لیکن مقام کی ناموزونی کی وجہ سے کامیابی نہ ہوئی۔ بیرونی کا استمرارِ تفحص دیکھو، (اور اُسکے حالات میں توغلِ علمی کے ایسے بیشمار نظائر ملینگے) پچیس سال بعد جب وہ ہندستان میں پہنچا تو ایک مرتبہ اسکی نظر سے ایک سطح میدان گزرا جو پہاڑ کے نیچے دور تک پھیلا ہُوا تھا۔ وہیں بیرونی نے نئے طریقہ سے، جس کی پوری تفصیل قانونِ مسعودی میں درج ہے[۵۱]، ایک درجہ کی مقدار تحقیق کی اور شکرِ خدا بجالایا کہ مدتوں کا خیال آج پورا ہُوا۔ کتاب التفہیم میں بھی پیمایش مامونی کا ذکر کرتے ہوے لکھا ہے :-

"من نیز بزمین ہندوستان آں را بدیگر طریقہا آزمودم۔ بے خلاف نیافتم از یں مقدار (یعنی مقدار جزو بحساب علماے مامونی) کہ حکایت کردم۔"

(۶) بیرونی کی تحقیقات سے ایک درجہ ۸۸۳۴۲۲ یا ۵۶ میل (عربی) ۵۵ دقیقہ ۵ ثانیہ اور ۰ ثالثہ کا، پورا دور ۸۰۰۸۰۰۳۹ اذراع کا اور نصف قطرِ ارض ۱۲۸۵۱۳۶۹ اذراع کا ہوتا ہے۔

(۷) آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس پیمانہ کی رُو سے یہ پیمایشیں کی گئیں وہ کس اندازہ پر مقرر تھے۔ یہ تفصیل یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اکثر قدیم اسلامی پیمایشوں کا مدار اسی پیمانہ پر تھا[۵۲]۔

عرض ۶ تار موے یال اسپ	=	ایک جو۔	
عرض ۶ جو معتدل	=	ایک اصبع	
۱۲ اصبع	=	ایک وجب	
۲ وجب	=	ایک ذراع	(فٹ عربی)

۵۱ چونکہ رسالہ ہٰذا کا مضمون اعلیٰ ریاضی سے واقف نہیں ہے، اُس نے بالقصد بیرونی کی پیمایش کی تفصیل ہندسی کو نقل نہیں کیا ہے اور بعض نتائج پر اکتفا کیا ہے۔ عام طور پر غالباً نتائج کو صحیح طور پر جان لینا کافی ہے، اس لیے کہ جب تک تفصیل مذکورہ کے سمجھنے کی پوری قابلیت نہ ہو، اُس میں دلچسپی حاصل نہیں ہوسکتی۔

۵۲ دیکھو کتاب التفہیم نسخہ ضیاء الدین خاں۔ صفحہ ۱۴۰۔ (۵۳) ماخوذ از قانونِ مسعودی، کتاب التفہیم و جامع بہادر خانی۔

۲۴ اصبع (انگشت) = ایک ذراع (فٹ عربی)

چار ہزار ذراع (ارش سودا) = ایک میل (عربی)

تین میل = ایک فرسخ (فرسنگ)

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدیم پیمانہ کی مطابقت کسی موجودہ پیمانہ سے کس طرح کی جائے؟ تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ عربی میل (یعنی چار ہزار اذراع یا عربی فٹ) ۶۴۷۳ فٹ انگریزی کے برابر ہے[۱]۔ چونکہ انگریزی میل ۵۲۸۰ فٹ کا ہوتا ہے، اربعہ متناسبہ کے قاعدے سے نہایت آسانی سے یوں حساب لگ سکتا ہے کہ چار ہزار اذراع برابر ہیں ۶۴۷۳ فٹ انگریزی کے۔ تو اتنے اذراع کتنے فٹ کے برابر ہوں گے۔ جب فٹ کی تعداد نکل آئے تو ۵۲۸۰ فٹ سے اُن معلوم شدہ فٹوں کو تقسیم کر دینے سے انگریزی میل معلوم ہو جائیں گے۔

(۸) اسی طریقہ پر حساب لگا کر ہمنے پیمائشہائے ماموني و بیروني کے حسب ذیل فٹ اور میل انگریزی معلوم کیے ہیں:-

حساب از روئے پیمائش ماموني	حساب از روئے پیمائش بیروني
ایک جزو = ۲۲۶۶۶۶ ۲/۳ ذراع	ایک جزو = ۲۲۴۳۸۸ ذراع
= ۳۶۶۹۰۲ ۱/۳ فٹ[۲]	= ۳۶۳۱۱۵ فٹ
کُل دَور = ۸۱۶۰۰۰۰۰ ذراع	کُل دَور = ۸۰۷۸۰۰۳۹ ذراع
= ۲۵۰۰۹ ۲/۷ میل	= ۲۴۷۷۸ ۱/۲ میل
نصف قطر ارض = ۱۲۹۷۹۵۰۰ ذراع[۲]	نصف قطر ارض = ۱۲۸۵۱۳۶۹ ذراع
= ۳۹۷۸٫۰۴۴ میل	= ۳۹۴۰٫۷۷۴ میل

۱ دیکھو انسائکلوپیڈیا آف اسلام (زیر طبع باہتمام ڈاکٹر ا۔ نلڈ وغیرہ) صفحہ ۴۹۰ بحوالہ مستشرق نالینو۔

۲ صفحہ ۸۲ میں یہ حاشیہ درج ہے۔

(۹) اس سے پہلے کہ ان پیمائشوں کی صحت و خوبی کا اندازہ ہو سکے، یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ یہ پیمائشیں کن عروض البلاد میں انجام دی گئی تھیں۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ درجوں کی مقداریں مختلف عروض کے لحاظ سے کسی قدر فرق پایا جاتا ہے۔ بدیں وجہ پوری پوری مطابقت اُسی وقت ہو سکتی ہے، جب از روے معلوماتِ موجودہ صحیح مقداریں درجوں کی نکال کر اور مامون و بیرونی کی پیمائشوں کے پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھا جائے۔

تدمر اور رقہ کا میدان ۳۴ اور ۳۶ عروض شمالی کے درمیان میں واقع ہے اور بیرونی کی سیاحتِ ہند کا رقبہ (جیسا کہ کتاب الہند صفحہ ۱۶۰ سے معلوم ہوتا ہے) ۳۴ اور ۳۹ عرضوں کے مابین ہے[۵]

حاشیہ صفحہ ۲۷۔ [۱] انسائکلوپیڈیا آف اسلام (محولۂ صدر) میں پیمائش مامونی کا ذکر کیا ہے اور ایک جزو کا اوسط حساب ۵۶ ⅔ میل عربی لے کر ۳۶۶۸۴۲ فٹ نکالے ہیں۔ ہمیں چونکہ قانون مسعودی سے بالکل صحیح اعداد حساب مامونی کے معلوم ہوے ہیں، لہذا ہم نے اذرع کی فٹوں میں تحویل کی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے حساب سے تقریباً ۱۴ فٹ اور کم ہوتے ہیں۔ (دیکھو انسائکلوپیڈیا مذکور حرف اے مضمون اسٹرانومی (ہیأت) صفحہ ۴۹۸)

[۲] قانون مسعودی میں پیمائش مامونی کی تفصیل میں صرف جزو اور دَور کے اعداد دیے ہیں اور قطرِ زمین کے عداد نہیں ہیں۔ لیکن کتاب التفہیم میں بیرونی نے (بحسابِ مامونی) قطرِ زمین کو ۳۱۶۳ ⅔ فرسنگ لکھا ہے۔ ہم نے اسی بنا پر نصف قطر ارض کا حساب بھی جیسا کہ علماے مامونی نے معلوم کیا تھا شامل کر دیا ہے۔

[۵] انسائکلوپیڈیا آف اسلام میں جہاں پیمائش مامونی کی طرف اشارہ کیا ہے میدانِ بینِ تدمر و رقہ کو ۳۶ اور ۳۸ عروض کے بیچ میں مان کر درجہ کی مقدار ۳۶۳۹۶۵ فٹ قرار دی ہے۔ ہم نے بنظرِ احتیاط جغرافیوں اور نقشوں کو بغور دیکھا تو ثابت ہوا کہ یہ میدان فی الحقیقت ۳۴ اور ۳۶ عروض کے بیچ میں ہے۔ علاوہ ازیں درجہ کی جو مقدار بلحاظ عروض مذکور انسائکلو پیڈیا میں مانی گئی ہے، وہ ہمارے حساب سے کم ہوتی ہے۔ اگر اس مقدار کو صحیح مانا جائے تو درجہ بحسابِ مساحتِ مامونی ۲۸۰۰ فٹ زیادہ ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں ہم نے اتباع کو نظر انداز کرکے اپنی تحقیقات پر بھروسہ کیا ہے۔

مندرجۂ ذیل جدول کے دیکھنے سے پیمائشہائے مذکورہ کی کیفیت ظاہر ہوگی۔

	عروض جن کے مابین پیمائشیں کی گئیں	عروض مذکورہ میں مقدارِ درجہ بحساب تحقیقاتِ موجودہ	مقدارِ درجہ بحساب مامونؔ بیرونی	فرق
عرضِ پیمائش مامونی ([illegible])	۱- ۲۴	تقریباً ۳۶۴۱۵۰ فٹ	فٹ ۳۶۶۸۰۲	فٹ ۱ × ۲۶۵۲
	۲- ۲۶	۳۶۴۲۳۳ "		۲ × ۲۵۶۹
	۳- ۳۰	۳۶۴۳۲۶ "		۳ × ۲۴۷۶
عرضِ پیمائش بیرونی ([illegible])	۱- ۲۴	" ۳۶۴۱۵۰	۳۶۳۱۱۵	۱ - ۱۰۳۵
	۲- ۲۹	" ۳۶۴۶۰۵		۲ - ۸۲۹

اعدادِ بالا کو بہ غور دیکھنے سے ثابت ہوگا کہ پیمائشِ مامونی میں ۶۹ میل انگریزی میں جو درجے کی اوسط مقدار ہے، زائد از زائد آدھا (½) میل زیادہ ہے، اور پیمائشِ بیرونی میں تقریباً ½ سے ⅕ میل کم ہے۔ فی الحقیقت یہ ایسا خفیف اختلاف ہے جو آج بھی (باوجود آلاتِ جدیدہ کی حیرت انگیز باریکی اور معلوماتِ موجودہ کی بےحد ترقی کے) متفرق پیمائشوں میں واقع ہوتا ہے اور بہترین صحیح پیمائشوں میں ہمیشہ ہوتا رہیگا۔

درجہ کی مقدار جانچ لینے کے بعد اب دَور اور قطر کا حساب لکھنا باقی ہے۔ موجودہ تحقیقات کے رو سے کرۂ ارض کا پورا دَور تقریباً ۲۴۸۵۰ میل ہے[۵] مقابلہ سے ظاہر ہوگا کہ بحسابِ مامونی دَور تقریباً ۱۵۲ میل اور نصف قطر تقریباً ۲۸ میل زیادہ ہے، اور بحسابِ بیرونی

(حاشیہ: اور نصف قطر تقریباً ۳۹۵۰ میل ہے)

عہ۵ دیکھو کتاب الہیئت (.......) مصنفہ آرتھنکس (جلد ۳ سوم یونیورسٹی لائبریری) صفحہ ۱۵۶۔

"نصف قطعہ ۶۳ کلومیٹر کا ہے" چونکہ ایک کلومیٹر برابر ہوتا ہے ۶۲۱ء میل کے، لہٰذا نصف قطر ۳۹۵۰ء۲۸ میل کا ہوا۔

دور تقریباً ،، میل اور نصف قطر تقریباً ۱۲ میل کم ہے۔

(۱۰) اِن اعداد کے پیشِ نظر ہوتے ہوئے مزید تبصرہ تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں یونانیوں کی پیمائشوں کی جو حالت ہے، وہ معلوم ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اُن مختلف پیمائشوں میں کوئی بھی کامیابی کی حد تک پہنچتی ہے یا نہیں۔ موجودہ لاعلمی کی حالت میں اُن کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا سراسر خلافِ عقل ہے۔ لیکن جہاں تک علم و یقین ہماری دست گیری کرتے ہیں بلاخوفِ تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ متقدمین میں جس کامیابی کے ساتھ جیاؤیسی کے اعمال فضلائے اسلام کے ہاتھوں سرانجام ہوئے وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ اور صحت کے لحاظ سے تعجب سے دیکھے جانے کے لائق ہیں۔ درستی کے لحاظ سے یہ وہ نتائج ہیں جو موجودہ عہد ترقی کی بہترین پیمائشوں کے پہلو بہ پہلو رکھے جانے کے مستحق ہیں۔ واحسرتا! مسلمانوں کی علمی بیاں فشانیوں کے بحر بیکراں میں ایسے اور اس سے بڑھ کر چمکنے والے بیشمار موتیوں کے انبار تھے جو بیشتر حوادث کی موجوں سے گردابِ فنا کا پیوند ہو گیا، جو بچا وہ بازار بے قدری میں متاعِ ہیچ میرز کی حیثیت رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قوم اپنے شاندار ماضی سے حقیقت میں بیخبر ہے، اور علم و حکمت کی نہیں ترقی کے جذبات ایک قوی تحریک کے محتاج ہیں۔ یہ تحریک تلف شدہ سرمایۂ علم کے باقیات کی رونمائی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ جب دیکھیں گے ضرور شرمائیں گے۔ عبرت ہوگی۔ سوچیں گے ہم کیا سے کیا ہو گئے۔ ہلیں گے اور روایاتِ اسلامی کو زندہ کرنے کے لیے ہمت کی کمر باندھیں گے۔ خدا کی مدد درکار ہے، اور وہ ضرور ملیگی اگر قوم اپنی مدد آپ کرنے اور اپنے دن بدلنے پر تُل جائے۔

(۱۱) اس وقت ہمیں صرف مذکورۂ بالا دو پیمائشوں کے حالات معلوم ہوئے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ چار سو سال میں جب علمِ ہیئت کا شوق مسلمانوں میں اس قدر ترقی پر تھا اور فضلائے عصر کے گروہ کے گروہ مشاہدات اور تحقیقات میں مستغرق تھے، کتنی مرتبہ اس قسم کی پیمائشیں انجام دی گئی ہوں گی۔[عـه]

سید حسن برنی۔ بی۔ اے۔ (علیگ)

عـه ہیأت کے مختصر رسالہ تو تجی میں جس کا مولف الغ بیگ کا استاد ہے سیوت اور تحقیقات ہیأت کا تذکرہ (باقی بر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) علی بن محمد قوشچی تھا، خاتمہ پر معرفت ابعاد و اجرام کے تحت میں لکھا ہے :-

"برصد و حساب معلوم کردہ اند کہ دَورِ عظیم یعنی محیطِ عظمیہ کہ بر زمیں فرض کنند ہشت ہزار فرسخ است و ہر فرسخ سہ میل و ہر میل سہ ہزار گز و ہر گزے سی و دو اصبع و ہر اصبع مقدار عرض شش جو معتدل و عرض ہر جوے معتدل شش تارموے یال اسپ باشد و قطرِ زمیں دو ہزار و پانصد و چہل و پنج فرسخ است"

جس پیمانہ کی رو سے یہ پیمائش مندرج ہے وہ اُس پیمانہ سے مختلف ہے جس سے مامون و بیرونی نے تحقیقاتِ مساحتِ ارض انجام دی تھیں۔ پیمانۂ مذکورۂ قوشجی نویں صدی ہجری میں سمرقند و اور دیگر ممالکِ وسطِ ایشیا میں مروّج تھا۔ ہر حال اصبع کی مقدار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق اتنا ہی ہے کہ عربی ذرع ۲۴ اصبع کا اور عربی میل ۴۰۰۰ (چار ہزار) ذراع کا ہوتا تھا، لیکن سمرقندی گز ۳۲ اصبع کا اور میل ۳۰۰۰ (تین ہزار) گز کا ہے۔ قوشجی کی تحریر سے محیط اور قطر کی مقدار حسبِ ذیل ثابت ہوتی ہے :-

محیط	قطر
۸۰۰۰ (فرسخ)	۲۵۴۵ (فرسخ)
× ۳	× ۳
۲۴۰۰۰ (میل)	۷۶۳۵ (میل)
× ۳۰۰۰	× ۳۰۰۰
۷۲۰۰۰۰۰۰ (گز)	۲۲۹۰۵۰۰۰ (گز)
× ۳۲	× ۳۲
۲۳۰۴۰۰۰۰۰۰ (اصبع)	۷۳۲۹۶۰۰۰۰ (اصبع)

مامون کی پیمائش سے اصبع کی تعداد حسبِ ذیل نکلتی ہے :-

محیط	قطر
۸۱۶۰۰۰۰۰ (ذراع)	۲۵۹۵۹۰۰۰ (ذراع)
× ۲۴	× ۲۴
۱۹۵۸۴۰۰۰۰۰ (اصبع)	۶۲۳۰۱۶۰۰۰ (اصبع)

اگرچہ قوشجی کا لکھا ہوا حساب اتنا صحیح نہیں ہے جتنا مامون یا بیرونی کا ہے، لیکن اس بات کو صریح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ یہ حساب مامون یا بیرونی کی پیمائشوں کی نقل نہیں ہے، بلکہ کسی تیسری پیمائش کا نتیجہ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ الغ بیگ اور قوشجی کی ذاتی تحقیقات سے ہو۔ رسالۂ قوشجی لٹن لائبریری میں میری نظر سے گزرا ہے۔ جہاں اُس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔

"ہلالِ عید"

اے مومنو مبارک۔ دیکھو ہلال چمکا　　وہ ماہ عید چمکا۔ وہ خوش جمال چمکا
فرخندہ پے وہ چمکا۔ فرخندہ فال چمکا　　وہ بے نظیر چمکا۔ وہ بے مثال چمکا
رہ رہ کے کر رہا ہے کیا کیا وہ جلوہ ریزی
مطلع ہے سارا روشن اللہ ری نور ریزی

نازک بدن وہ دیکھو۔ ننھی سی جان دیکھو　　لیکن ہے کس قیامت کی آن بان دیکھو
شوکت ہے اُسکی اعلیٰ۔ ارفع ہے شان دیکھو　　وہ ہے ہلالِ سیمیں تم آسمان دیکھو
جلوہ ہے کیا منور کیا ہے جمال اُسکا
ہے بدر سے بھی بڑھ کر باسط کمال اُسکا

اے ماہِ نو یہ تجھ میں کیا شانِ دلبری ہے　　کہتا ہے اک زمانہ تو حور ہے پری ہے
تیرا ہزار جاں سے ہر ایک مشتری ہے　　ہر شاخِ دل جہاں میں تجھ سے ہری بھری ہے
تو چرخ پر ہے لیکن کِشتِ اُمید ہے تُو
نزدیک ہے دلوں کے گرچہ بعید ہے تُو
ظاہر ہے تیرے خَم سے بے تنک نشانِ ابرو　　کس مہ جبیں کی تو ہے۔ بتلا۔ کمانِ ابرو
پاتا ہوں ہر طرح کی مَیں تجھ میں شانِ ابرو　　تشبیہ اور اب سُن روحِ روانِ ابرو
بن کر ہلال چمکا تو چرخِ چنبری میں
کشتی رواں ہے سیمیں یا بحرِ اخضری میں
حسن و جمال اپنا اک دو گھڑی دکھا کر　　نظروں سے چھپ گیا تو آخر کو جھلملا کر
کوئی غزالِ رعنا جس طرح آگے آکر　　چُھپ جائے دم زدن میں حدِ نظر سے جا کر

کیسی سرور افزا یہ نور کی جھلک تھی
مومن ہیں مست و بیخود کیا طور کی جھلک تھی؟

اہلِ جہاں نے تجھ کو بیشک حسیں بتایا　　مہ وش تجھے بتایا ہاں مہ جبیں بتایا
زاہد نے تجھکو دیکھا تو حورِ عیں بتایا　　عشاق نے جو دیکھا محمل نشیں بتایا

دیدار سے ہے تیرے ہاں شاد سارا عالم
شیریں ادا تو اک ہے فرہاد سارا عالم

عنوانِ شادمانی۔ تمہیدِ عید ہے تو　　قفلِ درِ خوشی کی بیشک کلید ہے تو
تو جانِ آرزو ہے۔ دل کی امید ہے تو　　لیکن یہ کیا قیامت ہم سے بعید ہے تو

بڈھ پاس آجا اے میرے دُور والے
تجھ کو گلے لگا لوں نور و ظہور والے

اے عید کا تو ہم تک پیغام لانیوالے　　اچھی گھڑی کا ہم کو مژدہ سنانے والے
در پردہ ہم کو اپنی شوخی بتانے والے　　چھپ کر شفق میں ہمکو جھلکی دکھانے والے

ہوتا رہے تجھے یوں حسن و جمال حاصل
بعد از زوال تجھکو پھر ہو کمال حاصل

باسط۔ بسوانی

ستم روز اک نیا ایجاد کرنا　　ہمیں تم کاش یونہیں یاد کرنا
کلیجا تھام لوں ہاتھوں سے پہلے　　تو پھر لے دل کسی کو یاد کرنا
کھنچے جاتے ہیں غیروں کی طرف وہ　　ذرا اے جذبِ دل امداد کرنا
کیے بیٹھے ہیں ضبط ایسا کہ گویا　　ہمیں آتا نہیں فریاد کرنا
خدا کو منھ دکھانا ہے ستمگر　　ذرا کچھ سوچ کر بیداد کرنا
نہ آنا قبر پہ غیروں کو لے کر　　مری مٹی نہ تم برباد کرنا
تمھارے شعروں میں ہوتا ہے درد آہ　　ذرا اس وقت کچھ ارشاد کرنا

لڑکیوں کی انشا

(۱)

از لاہور۔ ۲۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء

پیارے بھائی صاحب۔ آداب عرض کرتی ہوں۔ آپکا خط ۲۸ ستمبر کا لکھا ہوا آج چھٹے اکتوبر کو مجھے لاہور میں ملا۔

لفافے پر مرادآباد کا پتہ لکھ دیا تھا۔ میں آپ کو لکھ چکی تھی مگر شاید اُس وقت خیال سے یہ بات اُتر گئی کہ میں بھی ۲۹۔ ستمبر کو ابا جان کے ساتھ لاہور کا ارادہ کیے ہوے ہوں۔ لکھنؤ کی چکن کے دو تھان جو پچھلے ہفتے میں آپ نے بھیجے تھے، اُن میں تیپچی کا مجھے پسند نہیں ہوا۔ البتہ مُرّمی کا اچھا تھا، وہی چھن گیا۔ عایشہ بہن دیکھ کر للچا اُٹھیں تو مجھے دینا ہی پڑا۔ جب آپ آئیں تب ویسا ہی ایک تھان لیتے آئیں۔

یہاں پہنچ کے راہ کے تکان سے خالہ اماں کی طبیعت کچھ بے لطف ہو گئی تھی۔ اب اچھی ہیں۔ امی جان کچھ تو اُن کے علاج میں مصروف رہیں، اور کچھ ملنے والیوں میں گھر گئیں۔ ابھی تک بیبیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ ابا جان بنک میں پرامیسری نوٹوں کی خرید و فروخت کے جھگڑوں سے فرصت نہ پاسکے ان وجوں سے ابھی مجھے سیر کا پورا موقع نہیں ملا۔

کل سب کے ساتھ میں نے صرف مسجد دیکھی تھی۔ دہلی کی سی تو نہیں مگر اچھی ہے۔ آج صبح کو شالامار باغ دیکھا۔ خالہ اماں پہلے دیکھ چکی ہیں۔ وہ آج نہیں گئیں۔ میں پچھلے سال کشمیر کا شالامار باغ دیکھ آئی ہوں۔ دونوں کی شکلیں کسی قدر ملتی جلتی ہیں۔ یہاں کئی تختے ہیں اور ہر تختہ ایک دوسرے سے نیچا ہے۔ یہ اُسکی نسبت ذرا آراستہ بھی ہے۔ کشمیر کا باغ تو اُس زمانے میں ایسا اُجاڑ پڑا تھا کہ کہنے کو باغ تھا اور دیکھنے کو جنگل۔ (اب سنتی ہوں کہ مرمت ہوئی ہے) مگر وہاں کے شالامار کو قدرت نے جو حُسن دیا ہے وہ اِسے کہاں میسر ہے۔ سبزے سے لہلہاتے ہوے زمردیں پہاڑ۔ چنار کے عالیشان درخت۔ برفستانی جھرنے۔ کوہستانی چشمے اور مختلف رنگوں کے خودرو پھول، یہاں کہاں

اس وقت دن کے تین بجے ہیں - اور چار بجے کچھ خاتونیں آنے والی ہیں - میں نے خانہ باغ میں گارڈن پارٹی کا انتظام کیا ہے اس سبب سے خط کو ختم کرتی ہوں - پھر دوسرے خط میں اور حالات لکھوں گی - ابا جان - امی جان - اور خالہ اماں دعا کہتی ہیں - بھائی جان سے میری تسلیم کہیے گا

آپ کی کنیز - فاطمہ

(۲)

از لاہور - مورخہ ۹ / اکتوبر ۱۹۰۹ء

پیارے بھائی جان　　بندگی عرض　　بھائی صاحب کو جو خط لکھا ہے اُس میں لاہور کے شالامار باغ کی مختصر کیفیت لکھ چکی ہوں - کل ہم جہانگیر کا مقبرہ دیکھنے گئے تھے - مقبرے کی خوبصورتی - نفاست - نزاکت - کس کس بات کی تعریف کروں - ان سب پر طرّہ اُسکا استحکام ہے - وہ کیسے کاریگر تھے جنھوں نے اسکو بنایا - اور کتنے باہمت اور نازک خیال تھے وہ لوگ جنھوں نے بنوایا - آج بہت سے لوگ اُنکا نام بھی نہیں جانتے - لیکن دردمند دلوں میں اُنکی یاد ہمیشہ رہے گی - آہ - آمیں کس کا جسم ہے ؟ ہندوستان کے عظیم الشان بادشاہ - شاہ جہاں کے باپ - اور اکبر کے سے مدبر شہنشاہ کے بیٹے ، نور الدین جہانگیر کا ! جس نے ایک اشارے میں سیکڑوں کو صاحبِ تاج و نگیں کر دیا وہ آج بے تخت و تاج اور فاتحے کو بھی محتاج ہے - فاعتبروا یا اولی الابصار -

یہاں سے فاصلے پر شاہ درے کے قریب ، نور جہاں بیگم کے مقبرے کا ٹوٹا پھوٹا برج نظر آرہا ہے ریل کی سڑک کو طے کرتے اور جھاڑیوں جھنکاریوں میں اُلجھتے ہوے اس مشہورِ زمانہ ملکہ کی قبر دیکھنے کو بھی پہنچے - نہ پوچھیے کہ قبر دیکھ کر دل پر کیا گزر گئی - وہ نازپروردہ نازک دماغ اور نازنین ملکہ اس ٹوٹے پھوٹے کھنڈر اور اُجاڑ مقام پر ہزاروں من مٹی کے ڈھیر کے نیچے دبی پڑی ہے - گنبد کی ٹوٹی ہوئی دیواروں پر کسی نے کوئلے سے یہ لکھ دیا ہے :-

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

اس گنبد میں تین قبریں ہیں۔ تینوں ٹوٹی ہوئی۔ جن پر لوحِ مزار تک باقی نہیں۔ خبر نہیں ان میں سے کون اُس عالیجاہ ملکہ کا مسکن ہے۔ میری تو یہ حالت ہوگئی کہ بید کی طرح کانپتی تھی۔ اور روروکے فاتحہ پڑھتی جاتی تھی۔ ہمارے ساتھ ایک میم صاحب بھی تھیں۔ مجھے روتا دیکھ کر پوچھنے لگیں "تم کیوں روتا ہے اس کبر میں تمارا کون ہے"

جواب تو نہایت اچھا ممکن تھا۔ لیکن کچھ سوچ سمجھ کے اور دل تھام کے میں نے اتنا ہی کہنے پر اکتفا کی۔ کہ اس سے زیادہ آپ کو میں کیا بتاؤں کہ اس میں ہماری زنانی قوم کی عزت اور دولت کی بادشاہ ہندوستان کی مشہور ملکہ دفن ہے۔ اور اس قبر کو دیکھ کر مجھ کو اپنا پچھلا وقت یاد آرہا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی خیال ہے کہ ایک دن ہمارے واسطے بھی یہی زمین اور یہی مٹی کا ڈھیر ہے۔

وہ تو ملکہ تھی۔ اس وجہ سے ٹوٹا پھوٹا ہی سہی۔ مگر کچھ نہ کچھ نشان تو باقی ہے۔ ہم جو اتنا اکڑتے اور غُرور کرتے ہیں تو کس برتے پر۔ ہمارا نام و نشان تو چند روز بھی قائم رہنے والا نہیں۔ قریب تین بجے کے گھر واپس آئے۔ زیب النسا کی قبر بہت تلاش کی مگر کہیں پتہ نہ چلا۔

امید ہے کہ آپ اور بھائی صاحب خیریت سے ہوں گے۔ میری طرف سے چچا میاں کو تسلیم کہہ دیجیے گا۔

آپ کی فاطمہ

(۳)

از علی گڑھ۔ مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۰۹ء

پیاری بہن تمھاری محبت کا شکریہ کہ تم نے لاہور کے حالات ہم دونوں بھائیوں کو لکھ کر گویا ہمکو بھی سیر میں شریک کرلیا۔ خدا نے چاہا تو آیندہ سال چھٹیوں کے زمانے میں ہم لوگ تمھارے ساتھ کشمیر چلیں گے۔ اور واپسی میں لاہور کی سیر بھی ہوگی۔ تب ہم، زیب النسا کا مزار بھی تمکو دکھلا دیں گے جو لاہور سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ ہمارے امتحان کا نتیجہ تو تمکو معلوم ہوا ہوگا۔ بھائی صاحب نویں درجے میں گئے اور میں آٹھویں میں آیا۔ اللہ نے تمھاری دعائیں قبول کرلیں۔ اور کیوں نہ ہوتیں۔ جو دعا۔ سچے اعتقاد کے ساتھ دل سے کی جاتی ہے وہ ہمیشہ قبول ہوتی ہے۔ تم نے یہ نہ لکھا

کہ امی جان کا مزاج کیسا ہے۔ ہم لوگ اُنکی خیریت معلوم کرنے کو بیچین رہتے ہیں۔ انکی کیفیت مفصل لکھا کرو۔ حضور اباکی شفقت نامے آتے رہتے ہیں۔ اُن سے سب اعزا کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ ہماری طرف سے امی جان کے حضور میں آداب عرض کرنا اور خیریت کہ دینا ابا صاحب تو یقین ہے کہ دہلی تشریف لے گئے ہوں گے۔ اور واپسی میں حسبِ وعدہ اپنے کالج کے دوستوں سے ملنے ضرور آئیں گے۔ بھائی صاحب تم کو دعا کہتے ہیں۔

تمھارا بھائی صغیر احمدؔ

پرائی عید

"عید الفطر" ۱۹۱۵ء "کُمبل"

دکن سے دُور منانی پڑی پرائی عید
یقین آئے کو ہی سنتے ہیں ہم کہ آئی عید

تو اچھے اچھوں کو جا کر گلے لگا آئی
کہاں کہاں نہیں ہوتی تری رسائی عید

نہ شوخیاں ہیں نہ زیبائشیں ہیں ہوش رُبا
یہ کس نے پھیکی سی اس مرتبہ بنائی عید

گلُو نوازنہ بانہیں کسی کی ہیں نہ کوئی
قسم ہے ہم کو تو اک آنکھ بھی نہ بھائی عید

منا تو لا کسی روٹھے ہوئے ستمگر کو
کسی کے واسطے اتنی تو کر بھلائی عید

کسی نے یاد کیا دل میں بن سنور کے مجھے
کرونگا عید اگر یہ پیام لائی عید

پری بنا تی تھی آتی تھی جب کسی کے پاس
تجھے بھی یاد ہے وہ اُنکی دلربائی عید

مجھے تو یاد ہے بسمل سے اُنکا میل ملاپ
تجھے بھی یاد نہ ہو گی کبھی رُکھائی عید

بدگمانی

(ماخوذ از انگریزی)

(۱)

"آپ مجھے یقین دلاتی ہیں۔ کہ گاڈفرے ایسا نہیں۔ لیکن بات سے تو انکار نہیں ہو سکتا؟ میں ایک ماہ سے برابر یہ حال دیکھ رہی ہوں"

"موبل! تم بیوقوف ہو۔ گاڈفرے پیشہ ور شخص ہے۔ اور وہ اپنے پیشہ سے مجبور ہے۔ کہ دوسروں کے کام میں دلچسپی لے"

موبل:- خالہ جان! آپ کچھ ہی کہیے۔ میرا دل گاڈفرے کی طرف سے بدگمان ہے۔ ہر روز چار چار گھنٹے ایک نوجوان بیوہ کے ساتھ بیٹھے رہنا میں نہیں سمجھ سکتی کیا معنی رکھتا ہے؟"

خالہ:- "چار چار گھنٹے ہر روز!"

موبل- جی ہاں! اور تنہائی میں!!-

خالہ:- تم یقیناً کہتی ہو کہ تنہائی میں؟

موبل:- میرا دل گواہی دیتا ہے"

خالہ- میری جان موبل! یہ تمہارا قصور نہیں تمہاری عقل کا قصور ہے ورنہ تم اس طرح کی باتیں نہ کرتیں۔ گاڈفرے نہایت ہی رحم دل شخص ہے۔ وہ اپنے پیشۂ بیرسٹری میں بھی پورا دیانتدار ہے۔ مسز جیک پر جو جو مصائب واقع ہوئیں، اس کا اندازہ کرو۔ نہ صرف یہ کہ مسٹر جیک فوت ہوا۔ بلکہ بہت سے جھگڑے ادھورے چھوڑ گیا۔ یہاں تک کہ جس گھر میں رہتی ہے اسکے مالک نے بھی ایک ہفتہ کا نوٹس دیا ہے۔ کہ گھر خالی کر دیا جائے۔ اور گھر میں نام کو کوڑی نہیں۔ گاڈفرے ایک تو انکا مشیر قانونی ہے۔ دوسرے متوفی مسٹر جیک کا قدیمی دوست اگر ایسی حالت میں وہ مسز جیک کے معاملات میں گہری دلچسپی لے تو تعجب ہی کیا ہے؟"

موبل:- بے شک اس میں تعجب ہی کیا ہے؟ کہ گاڈفرے رات دن مسز جیک کے گھٹنے کے ساتھ گھٹنا لگا کر بیٹھا رہے"

خالہ:- پاگل لڑکی! تم مسز جیک سے واقف نہیں۔ تم ایک بار اُسکے گھر پر ملنے گئیں۔ وہ موجود نہ تھی۔ وہ بازدید کے لیے تم سے ملنے آئیں۔ اتفاق سے تم بھی گھر میں نہ ملیں۔ صرف راہ چلتے بھیڑ یا گرجا میں، یاد نہیں رہا تم نے کہاں کہا تھا؟ تم اُس سے ملی ہو۔ مجھے اسکی حالت پر رحم آتا ہے۔ وہ بڑی شریف عورت ہے۔ کیا تمھارے دل میں اُسکی اس مصیبت پر ذرا بھی رحم نہیں۔ اور تم اُسکی بدنصیبی کا کچھ بھی خیال نہیں کرتیں"

موبل:- گاڈفرے کیا کم اُسکا خیال کرتا ہے؟ کہ اب میں بھی اُسی میں ڈوبی رہوں خدا میری طرح بدقسمت کسی کو نہ بنائے!

خالہ:- دیکھو موبل! میں نہ کہتی تھی۔ کہ تم نے گاڈفرے سائیکس کے ساتھ شادی کرنے میں غلطی کی۔ اول تو عمر کے لحاظ سے وہ تم سے بہت بڑا ہے۔ پھر وہ ایک پیشہ ور شخص ہے۔ تم خوش رہتیں اگر کسی دیہاتی باشندے سے شادی کرتیں۔ جو ہر وقت تمھارے ساتھ سایہ کی طرح رہتا۔ اور تمھاری ہر ایک بات کا آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایمان لاتا"

موبل:- بے شک میں نے گاڈفرے کے سمجھنے میں غلطی کی۔ لیکن کیا اس حالت میں گاڈفرے مجاز ہے؟ کہ مجھے چھوڑ کر اس طرح ایک نوجوان بیوہ کے ساتھ گلچھرے اُڑائے۔ (کرسی سے اُٹھ کر) اچھا میں جاتی ہوں"

خالہ:- موبل پیاری موبل! جو الفاظ تمھارے مُنھ سے نکلتے ہیں، کیا تم اُنکو سمجھتی بھی ہو؟"

موبل:- میں جو کچھ کہتی ہوں خوب سمجھ کے کہتی ہوں۔ اور جو کچھ کہتی ہوں ٹھیک کہتی ہوں"

خالہ:- میری جان تم غلطی پر ہو۔ تم گاڈفرے جیسے نیکدل شخص پر بدگمانی کرتی ہو

جاؤ گھر جاؤ۔ اور آرام سے اپنے کام میں مشغول ہو جاؤ۔ لیکن خبردار گاڈفرے پر اپنی بدگمانی ظاہر کرکے بیوقوف نہ بنا۔"

موبل۔(غصہ سے لال پیلی ہوکر) "اچھا میں جاتی ہوں خدا حافظ!"

(۲)

ایک متوسط درجے کے مکان کی بیٹھک میں جو معمولی فرنیچر سے آراستہ ہے۔لیکن جسکی صفائی اور قرینے سے مالکِ مکان کی خوش انتظامی کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ دو شخص قریب قریب دو کرسیوں پر بیٹھ کر کسی اہم معاملہ میں شائستگی کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں۔ ان میں ایک سیاہ لباس پہنے ہوئے عورت ہے۔ اور دوسرا آنکھوں پر ایک خوش نما عینک چڑھائے ہوئے مرد۔

عورت۔"گاڈفرے تم کس قدر میرا خیال رکھتے ہو۔ لیکن جب میری قسمت ہی میرے برخلاف ہو۔ تو کوئی کیا کرسکتا ہے؟"

گاڈفرے۔"ایک بیوہ جس پر چاروں طرف سے مصائب کی گھٹائیں چھا رہی ہوں جسکا خاوند ایک حبہ بھی نہ چھوڑ گیا ہو۔ جسکے لیے کوئی وسیلہ زندگی بسر کرنے کا دنیا میں موجود نہ ہو۔ جسکے رہنے کے مکان کو بھی خالی کرنے کا نوٹس مل چکا ہو اُسکے ساتھ جس قدر سلوک کیا جائے، کم ہے۔ مجھے تو افسوس ہے کہ میں زیادہ تمہارے کام نہیں آسکتا......"

بیوہ۔"ہاں گاڈفرے میں تم کو ایک ضروری اطلاع دینا چاہتی ہوں۔ میری جو حالت ہے اُس سے اب بظاہر کوئی صورت ایسی نہیں نظر آتی کہ میں آئندہ اطمینان سے اپنی زندگی بسر کرسکوں۔ اس لیے میں نے آئندہ کے لیے ایک قطعی فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ لو تم بھی دیکھ لو۔ (یہ کہ کر بیوہ نے اُس دن کا اخبار مسٹر گاڈفرے کو دیا اور انگلی سے ایک پیرگراف کی طرف اشارہ کیا۔)

گاڈفرے (پیرگراف کو مطالعہ کرنے کے بعد) "میری پیاری مسز جیک۔ کیا اب اسپر نوبت آگئی؟ کیا اسکے سوا اب کوئی اور چارہ نہیں؟"

مسز جیک: "تمھیں بتاؤ۔ اگر کوئی صورت ہوسکتی ہو"۔

(گاڈفرے تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔)

مسز جیک: "یقین مانو اب سوائے اسکے کوئی چارہ نہیں! تم سوچو یا نہ سوچو سوائے اسکے کوئی صورت ممکن نہیں"۔

گاڈفرے: "کیا اس موقعہ پر میں تمھارے کسی کام نہیں آسکتا؟ میری مراد یہ ہے۔ کہ اگر کوئی بہتر صورت پیدا ہونے تک تم ہمارے ہاں اُٹھ آؤ۔ تو یقیناً نہ صرف میں بلکہ موبل بھی ازحد خوش ہوگی۔ مجھے افسوس ہے کہ تم اُس سے ابھی تک نہیں ملیں۔ اگر ایک دفعہ اُس سے ملو تو ہمیشہ کے لیے تمھاری دوستی مستحکم ہو جائے۔ وہ بہت ہی نیک لڑکی ہے"۔

مسز جیک: "پیارے گاڈفرے! اگرچہ میں نے موبل سے باضابطہ ملاقات نہیں کی لیکن اُسکے بشرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ مجسم رحم اور نیکی ہے۔ لیکن گاڈفرے سوچو! کیا اس طرح پر گزارہ ہو سکتا ہے؟ اور کہاں تک؟ اور بعد میں پھر کون سی صورت پیدا ہوسکتی ہے اب جو کچھ ہوتا ہے، ہونے دو۔ اور مجھے اپنے فیصلہ پر قائم رہنے دو"۔

گاڈفرے: "کیٹی! (کیتھرائن کا مخفف مسز جیک کا اصلی نام) تم عورت ہوکر مردانہ ہمت رکھتی ہو۔ خدا تمھیں اور بھی ہمت دے۔ تاکہ ان مصائب کو صبر کے ساتھ برداشت کرسکو! اب تمھارا ارادہ کب یہاں سے جانے کا ہے؟"

مسز جیک: "ہاں تو سن لو! میرا ارادہ ہے۔ کہ آج شام کو خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلدوں۔ یہاں تک کہ نوکروں کو بھی خبر نہ ہو۔ نام تو میں اپنا تبدیل کر ہی لونگی۔ کسی کو میرا پتہ نہ ہوگا، اور نہ مجھے شرمندہ ہونے کا موقع ملیگا۔ لو اب تم جاؤ۔ تم اس قدر اپنا وقت میرے ہاں صرف کرتے ہو۔ کہ مجھے بیچاری موبل پر رحم آتا ہے۔ اور تعجب ہوتا ہے کہ وہ کیوں رشک نہیں کرتی۔۔"

گاڈفرے: "ہا! موبل!! میری جان موبل!!! کیٹی! اسکا وہم بھی نہ کرو۔

اُسے مجھ پر بدگمانی نہیں ہو سکتی۔ وہ مجھے خوب پہچانتی ہے؛

(گاڈفرے جانیکے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور مسز جیک سے ہاتھ ملاتا ہے)

مسز جیک (گاڈفرے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر) دیکھو! پیارے میں تم پر بھروسہ کرتی ہوں۔ سوائے تمہارے اس راز سے واقف نہیں۔ تم بھی اسے محفوظ ہی رکھنا"

گاڈفرے: اسکے متعلق بالکل وہم نہ کرو۔ اور سمجھ لو کہ تمھارے راز کی کیپٹن کسی کو خبر ہی نہیں"

مسز جیک: اچھا یہ تو بتلاؤ۔ کہ اس نئی حالت میں اگر اتفاقاً کسی محفل میں میرا تمھارا سامنا ہو تو شرمندہ تو نہ ہوگے"

گاڈفرے۔ آہ شرمندہ! کس بات پر؟ اس لیے کہ تم نے مردانہ وار ان مصائب کا مقابلہ کیا۔ جو بہت کم عورتیں کرتی ہیں۔ مجھے تمھاری دوستی پر فخر ہوگا۔ اچھا رخصت"

مسز جیک۔ تم نے کپتان رویرٹ کا قصہ سنا؟

گاڈفرے: نہیں تو۔ کیا ہوا؟

مسز جیک: اُسکی پلٹن کی تبدیلی سوتھ افریقہ کو ہوئی ہے۔ اور وہ کل یہاں سے روانہ ہوجائے گا"

گاڈفرے: آج کل مجھے کام زیادہ رہتا ہے۔ اسلیے اخبار اچھی طرح سے پڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ خدا حافظ!"

مسز جیک: بظاہر یہ آخری ملاقات ہے۔ اور میں کس قدر خوش ہوئی کہ تم سے آخری موقع پر مفصل گفتگو کا موقع ملا۔ خدا حافظ!"

(۳)

گاڈفرے یہاں سے نکل کر سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ چونکہ کام بہت تھا جاتے ہی کتب خانہ میں چلا گیا۔ اور اپنی میز پر جسپرسلوں اور دوسرے کاغذات کا انبار تھا کام میں مشغول ہوگیا۔ اور

نوکر سے تاکید کرگیا کہ اسوقت اُسکی تنہائی میں کوئی خلل انداز نہ ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد جلی بھنی "موبل" بھی اپنی خالہ کے ہاں سے گھر کو لوٹی۔ اور نوکر سے یہ سُن کر کہ گاڈفرے کتب خانہ میں موجود ہے، سیدھی اُسکے پاس پہنچی۔ اگرچہ گاڈفرے کاغذات کے مطالعہ میں بالکل محو تھا۔ لیکن دروازہ کے زور سے کھُلنے کے سبب سے اس طرف متوجہ ہُوا اور موبل کو کمرہ میں آتے دیکھ کر پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

موبل۔ (قریب آکر غصہ سے) "گاڈفرے!"

گاڈفرے (بمشکل اپنے خیال کو کاغذات سے ہٹا کر) "او۔ ہاں۔ موبل تم کہو کیا کہتی ہو غالبًا باورچن کا جھگڑا ہو گا۔ میرے خیال میں اُسے علیحدہ کر دو ورنہ تمکو چین نصیب نہ ہو گا۔"

موبل: "نہیں مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔"

گاڈفرے: "تو کیا دوسرے نوکر نے کچھ کیا؟"

موبل: "مجھے نوکروں کی پرواہ نہیں۔ اور نہ مجھے انکی شکایت ہے!"

گاڈفرے: "تو غالبًا تمھاری خالہ نے کچھ کہا ہوگا۔ تم وہاں گئی تھیں وہ اچھی تو تھیں نا؟"

موبل: "ہاں وہ اچھی اور تندرست ہیں۔ سنو! مجھے تمھاری ذات سے شکایت ہے۔ اور میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ مہربانی کرکے اُسکا صاف صاف اور سچا جواب دو!"

گاڈفرے۔ (کاغذات کو ایک طرف کرکے اور اپنی کرسی کو موبل کی طرف گھما کر) "مجھ سے شکایت۔ پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو!"

موبل: "تم مجھے یہ بتاؤ اسکے کیا معنی ہیں؟ کہ تم ایک ماہ سے زائد ہُوا کہ چار چار گھنٹے ہر روز مسز حنیک کے ساتھ گزارتے ہو۔ اور رات دن اُسکے گھر میں موجود رہتے ہو؟"

گاڈفرے۔ (مسکرا کر) "بس اتنی سی بات پر یہ تمام جوش وخروش تھا؟ اچھی لڑکی! اگر تمکو اس قصہ کے سننے کا شوق ہے تو شام تک صبر کرو۔ اور بھلے مانسوں کی طرح یہاں سے چلی جاؤ۔ میرے پاس کام بہت ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح سے یہ ختم ہو جائے۔ (یہ کہکر

گاڈفرے پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا)

موبل ایک سکنڈ تک کچھ سوچتی رہی۔ پھر اُس کمرہ سے نکل کر ملاقات کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ درمیانی میز پر اُسدن کا اخبار رکھا تھا۔ اُسے اُٹھالیا۔ اور ایک پاس کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ نظر تو اخبار پر تھی، لیکن اُسوقت وہ پڑھ نہ سکتی تھی۔ بلکہ وہ انھیں خیالات میں اپنے دل سے یوں باتیں کرتی تھی۔

موبل۔(اپنے دل میں)"اب نوبت باینجا رسید! مجھ سے کہا جاتا ہے کہ یہاں سے چلی جاؤ۔ اورجب اُس بدذات عورت سے ملنے کا سبب پوچھتی ہوں تو کہا جاتا ہے کہ شام تک صبر کرو۔ تاکہ اس مہلت میں کوئی فرضی قصہ گڑھنے کا موقع ملجائے۔ کیونکہ اتنی جلدی میں جھوٹ کیسے تیار ہو سکتا تھا؟ کہ میرے سوال کا جواب دیا جاتا۔

کیوں نہ میں ہمیشہ کےلیے اس گھر سے چلی جاؤں؟ اورگاڈفرے کو مسزجیک سے ملنے میں کوئی رُکاوٹ نہ رہے۔ اب یہ معاملہ میری برداشت سے باہر ہے۔ (اخبار کے اشتہارات میں ایک سطر پر نگاہ جما کر) یہ بالکل ٹھیک ہے۔ کسی مسٹر ویلنگٹن کو نوکروں کی ضرورت ہے۔ کیا وہ مجھے گھر کی صفائی کے لیے نہ رکھے گا۔ یقیناً میں اپنی ملازمہ سے تو کام اچھا کرونگی۔ یہاں قسمت آزمائی کرنا چاہیے (یہ کہکر اخبار سے مسٹر ویلنگٹن کے اشتہار کو کاٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیا) پھر خیال آیا کہ اس ارادہ کی تکمیل سے قبل میں ایک بار مسزجیک کے گھر پر نجاؤں۔ اور اگر ہو سکے تو اُس سے نہ کہوں کہ وہ میرے حال پر رحم کرے اور گاڈفرے کو مجھ سے نہ چھینے۔ مسزجیک کی شکل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اتنی بےرحم نہیں۔ یہ کوشش بھی کرلوں تو اچھا۔ اگر کامیابی نہ ہوئی تو ویلنگٹن والی نوکری تو کہیں گئی نہیں ...."

(۴)

دوسرے دن علی الصباح موبل مسزجیک کے مکان پر پہنچی۔ دروازہ پر دستک دی۔ ملازمہ نے دروازہ کھولا۔ جسکی زبانی معلوم ہوا کہ کل شام سے مسزجیک غائب ہے۔ اور اُسکے

لکھنے کی میز پر ایک خط بھی پایا گیا ہے۔ جس میں تحریر ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس گھر سے رخصت ہوتی ہے اور نوکروں کو انعام دینے کے لیے گھر والے کے نام سفارش ہے۔ (یہ کہکر مسز جیک کی ملازمہ زار زار رونے لگی)

موبل تھوڑی دیر تو دروازہ پر کھڑی سوچتی رہی۔ اور پھر اپنی خالہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

خالہ: "کہو موبل اسوقت کیسے آئیں۔ خیریت تو ہے؟"

موبل: "خیریت کیسی؟ آپ مجھے جھٹلاتی تھیں۔ لیجیے اب بھی آپ کو کچھ شک ہے؟ گاڈفرے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا"

خالہ: "یعنے؟"

موبل: "یعنی مسز جیک کل شام سے غائب ہے۔ میں اسوقت اُسی کے ہاں سے آتی ہوں۔ نوکر کی زبانی معلوم ہُوا کہ لکھ کر چھوڑ گئی ہے کہ وہ ہمیشہ کیلیے غائب ہوتی ہے"

خالہ: "لیکن اس معاملہ سے گاڈفرے کا تعلق؟"

موبل: "تعلق نہیں تو اور کیا؟ یہ سب اُسی کا کیا دھرا ہے!!!"

خالہ: "کیا تمھیں شک ہے کہ گاڈفرے کا ہاتھ مسز جیک کے غائب ہونے میں ہے؟"

موبل: "جی شک نہیں یقین ہے۔"

خالہ: "بچی موبل! مجھے سخت افسوس ہے۔ تم غلطی پر ہو۔ مسز جیک پر حادثات کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ کچھ تعجب نہیں کہ اُس نے ہمیشہ کے لیے رہائی حاصل کر لی ہو۔ گاڈفرے کو تم خواہ مخواہ درمیان میں لاتی ہو"

موبل: "معاف کیجیے خالہ! ایسی عورتیں خودکشی نہیں کیا کرتیں۔ اور رہا گاڈفرے اُسکے متعلق آپ کا حُسنِ ظن انتہائی درجے پر پہنچ گیا ہے۔ ورنہ ایسی بدیہیات سے تو انکار نہیں ہو سکتا"

خالہ: "تم عقل کی کچی ہو۔ اور تمھاری رائے ہمیشہ غلط ہوتی ہے"

موبل:"کون سے معاملہ میں میری رائے نے خطا کی ؟"

خالہ:"ہر ایک معاملہ میں تم خطا پر ہوئی ہو"

موبل:"مثلاً ؟"

خالہ:"مثلاً کپتان روبرٹ کے حق میں تمہاری رائے کس قدر غلط تھی۔ تم دل میں تو ضرور شرمندہ ہوئی ؟"

موبل:"خالہ جان! یہ معاملہ دوسرا ہے۔ میں نے کپتان روبرٹ کو کبھی حد سے زیادہ نہیں سراہا اور میں اُسکی پروا نہیں کرتی کہ وہ کیا ہے ؟ لیکن ساتھ ہی اتنا کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتی کہ کپتان روبرٹ اتنا بُرا نہیں جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ اب کبھی جبکہ گاڈفرے کو میرے ساتھ سیر یا تھیٹر میں جانے کی فرصت نہیں ہوتی تو یہی کپتان روبرٹ آ کر مجھے اپنے ساتھ لیجاتا ہے۔ اور میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس معاملہ میں کپتان روبرٹ کو کیوں بیچ میں لایا گیا ؟"

خالہ:"میرا مطلب تمہارا دل دُکھانا نہیں تھا۔ لیکن میں زور کے ساتھ کہتی ہوں کہ گاڈفرے اور غریب مسز جیک کے معاملہ میں تمہاری بدگمانی وہم سے بڑھ کر درجہ نہیں رکھتی۔ اگر گاڈفرے کو معلوم ہو جائے تو فوراً تمہاری تسلی کردے۔ لیکن یہ اچھا نہیں کہ اُسپر تنک ظاہر کرکے اُسکے دل کو دُکھایا جائے۔ اور نہ تم کو لازم ہے کہ ایسا کرو"

موبل:"جی نہیں۔ میں اُسکے دل کو ہمیشہ کے لیے راحت دونگی۔ اور اس طرح سے پیش آؤنگی کہ وہ ان تکالیف سے بالکل چھوٹ جائے۔ لیکن کیا آپ مجھے اس معاملہ میں کسی قسم کی مدد ملنے کی امید ہے ؟"

خالہ:"انسان کو چاہیے کہ اپنے معاملات کو خود سدھارے۔ اور کسی سے کسی قسم کی اُمید نہ رکھے۔ پھر اس موقع پر، کہ تم سراسر غلطی پر ہو"

موبل:"بہت اچھا! خالہ جان!! آپ صحیح فرماتی ہیں۔ بیشک مجھے اپنے مصائب کا خود ہی مقابلہ کرنا چاہیے۔ تو اب میں رخصت ہوتی ہوں"

خالہ۔ جاؤ بیٹی! لیکن خبردار گاڈفرے پر یہ نسک ظاہر کرکے بیوقوف نہ بننا"۔

موبل یہاں سے رخصت ہوکر سیدھی اشتہار کے پتہ کے مطابق مسٹر ولنگٹن کے مکان پر پہنچکر دستک دیتی ہے۔ جہاں اسے ایک نوکر لیجاکر مسٹر ولنگٹن کے سامنے پیش کرتا ہے۔

ولنگٹن (موبل کے حسن خداداد اور جوانی کے رعب میں آکر) "تشریف رکھیے۔ کیا میں آپ کے لیے کچھ کرسکتا ہوں؟"

موبل "آپ نے نوکروں کے لیے اشتہار دیا ہے اور میں اسی کام کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنے آئی ہوں"۔

ولنگٹن (دل میں سخت شرمندہ ہوکر) اوہ۔ تم نوکری کرنا چاہتی ہو۔ کل میں نے گھر کی منتظمہ رکھ لی ہے۔ صفائی کے نوکر کی جگہ خالی ہے!"

موبل "میں بہت خوشی سے یہ کام کروں گی"۔

ولنگٹن (دل میں) "یہ عورت کوئی شریف زادی معلوم ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اپنے گھر سے کسی بات پر خفا ہوکر بھاگ آئی ہے۔ لیکن ایسی خوبصورت نوکر ہے تو اور کیا چاہیے؟" (موبل سے مخاطب ہوکر) "غالباً تمھارے پاس اسناد ہونگے۔ میں اُنکو دیکھ سکتا ہوں؟"

موبل "اسناد!"

ولنگٹن "ہاں جہاں تم نے اس سے قبل کام کیا ہے اُنکے سرٹفکیٹ۔ یا یہ کہو کہ ایک قسم کی ضمانت!"

موبل "مجھے اس کا خیال بھی نہ تھا کہ آپ اسکا مطالبہ کرینگے!"

ولنگٹن "مجھے معلوم ہوگیا کہ تم اپنے گھر سے بھاگ آئی ہو۔ لیکن تمھاری جیسی نوجوان لڑکی کے لیے بہتر تو یہی ہے کہ اپنے گھر کو واپس چلی جاؤ"۔

موبل "آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں گھر سے بھاگ آئی ہوں" (اس اقرار پر نادم ہوکر) "کیا آپ مجھے نوکری دیکر میری امداد نہیں کرینگے؟

ولینگٹن:"اگرچہ تمھاری جیسی عورت کے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے گھر بار کو نہ چھوڑے لیکن اگر تم جانا نہیں چاہتیں تو مجھے کام دینے میں عذر نہیں۔ لیکن کیا تم کام کرسکوگی؟

موبل:"کیوں نہیں؟ میں نے کام کرتے ہوے........"

ولینگٹن:"(بات کاٹ کر) اپنے نوکر کو دیکھا ہے۔"

موبل:" اور یقیناً اُس سے اچھا کام کروں گی۔"

ولینگٹن:(کرسی سے اُٹھ کر)"بہت اچھا۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں گھر کی منتظمہ مسز ہنری کو بھیجتا ہوں۔ وہ تم سے سب معاملہ طے کرے گی۔(دروازہ سے نکل کر زور سے)"مسز ہنری! مسز ہنری!! مسز ہنری!!!"

موبل تھوڑی دیر کے لیے اس کمرہ میں اکیلی رہ گئی۔ اور سوچنے لگی کہ معلوم نہیں کہ یہاں بھی کامیابی ہوتی ہے یا نہیں؟ کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور مسز ہنری کمرہ میں داخل ہوئی۔

موبل:"(حیرت زدہ ہوکر) مسز جیک تم؟"

مسز جیک:" اور تم مسز (گاڈفرے) سائیکل؟"

موبل:"تم یہاں کیسے؟"

مسز جیک:"میری تو قسمت پھوٹی ہے۔ میں نوکری نہ کروں تو اور کیا کروں؟ لیکن تم اپنا گھر بار خاوند چھوڑ کر یہ کس لیے کر رہی ہو؟"

موبل:"تمھارے لیے!"

مسز جیک:"میرے لیے؟ (دل میں۔ معلوم ہوتاہے کہ میاں بیوی میں کچھ رنجش ہوئی ہے) آؤ آؤ میرے کمرہ میں۔ وہاں بیٹھ کر مفصل گفتگو کریں گے" موبل مسز جیک کے ساتھ ساتھ اُسکے کمرہ میں داخل ہوئی۔

(۵)

دوسرے دن صبح سویرے ہی گاڈفرے خالہ کے گھر میں داخل ہوتاہے۔

خالہ۔" ایں! گاڈفرے اسوقت اتنے سویرے کیسے آنا ہُوا؟"

گاڈفرے۔" کیا وہ یہاں ہے؟"

خالہ۔" وہ کون؟"

گاڈفرے۔" موبل!"

خالہ۔" یہاں کیسے ہوتی؟ کیا وہ گھر میں نہیں ہے؟"

گاڈفرے۔" نہیں تو۔ کل سے غائب ہے۔"

خالہ۔" کل سے!!!"

گاڈفرے۔" کل صبح کو اُس نے گھر چھوڑا اور اس وقت تک واپس نہیں لوٹی۔ کیا آپ کو اُسکا کچھ پتہ ہے؟"

خالہ۔" مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ کل صبح کو وہ مسز جیک کے گھر پر گئی تھی۔ اُسے غائب پاکر میرے پاس آئی اور تمھاری اور مسز جیک کی شکایت کرنے لگی۔ میں نے اُسے سمجھا بجھاکر واپس کر دیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھر نہیں گئی۔"

گاڈفرے۔" میری اور مسز جیک کی شکایت یعنی چہ؟ اُسکا اصلی پتہ کیا آپکو معلوم نہیں؟"

خالہ۔" چند روز سے جو تم مسز جیک کے ہاں زیادہ آتے جاتے رہے، موبل کو تمھاری طرف سے بدگمانی ہو گئی ہے۔ میں نے ہرچند سمجھایا لیکن وہ نہ سمجھی۔ کل صبح کو مسز جیک کے غائب ہونے کا حال سُن کر اور بھی زیادہ مشتعل تھی۔"

گاڈفرے۔" اہا۔ اسی لیے اُسنے پرسوں مجھ سے اسکے متعلق کچھ پوچھا تھا۔ لیکن مجھے کام سے بالکل فرصت نہ تھی۔ اس لیے اسکی باتوں کی طرف زیادہ دھیان نہ دیا۔"

خالہ۔ گاڈفرے! مجھے تعجب ہے کہ تم کو اپنی بیوی سے بات کرنے تک کی فرصت نہیں ہوتی آخر اسکی وجہ کیا ہے؟ جب دوسروں کے ہاں گھنٹوں بیٹھتے ہو۔ بیچاری موبل کا بھی کیا قصور ہے؟

گاڈفرے (خالہ کی باتوں پر کان نہ دھر کر) لیکن کیا آپ مجھے اُسکا پتہ نہیں بتا سکتیں؟"

خالہ۔ مجھے اُسکا پتہ کیا معلوم؟ تم مسز جیک کے گھر پر جاؤ۔ شاید وہاں کچھ پتہ مل جائے۔"

گاڈفرے:۔ وہاں تو خیر کیا پتہ ملے گا؟ میں نے آج تک آپ سے نہیں کہا۔ موبل کی کی محبت میرے دل میں ایسا گھر کر گئی ہے کہ اُسکے سوا میں رہ نہیں سکتا۔ آپ کی بڑی عنایت ہوتی اگر آپ مجھے اُسکی حالت سے آگاہ کرتیں۔"

خالہ:۔ گاڈفرے! تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟ اور اس سے تمھاری کیا مراد ہے؟

گاڈفرے:۔ میری مراد کپتان روپرٹ کے جانے سے ہے۔"

خالہ:۔ اوہ اب میں سمجھی۔ اسکا نام بھی نہ لو۔ میری موبل ایسی لڑکی نہیں ہے۔ تم مطلق اس کا خیال نہ کرو۔ اور جاؤ موبل کو تلاش کرو مجھے تو اُسکی جان کی فکر پڑ گئی۔"

گاڈفرے:۔ کیا آپ کو جہاز کے ڈوبنے کا شک ہے؟"

خالہ:۔ ہوش میں آؤ۔ تم دونوں کو کیا ہو گیا؟ اُسے تم پر بدگمانی ہے اور تمھیں اُس پر! ممکن ہے وہ پھر مسز جیک کے ہاں گئی ہو۔ اور اُسکا تازہ پتہ مل گیا ہو اور اُسکے پیچھے پھر رہی ہو۔ اس لیے تم اُسکو مسز جیک کے ہاں تلاش کرو۔ کیا تمکو مسز جیک کا نیا پتہ معلوم ہے؟"

گاڈفرے:۔ جی ہاں مجھے معلوم ہے۔"

خالہ:۔ یوں! تو کہو موبل بالکل ہی دیوانی نہ تھی جو تیری بدگمانی کر رہی تھی۔"

گاڈفرے:۔ پیاری خالہ! کیا آپ بھی مجھ پر الزام دینے لگیں۔ لیجیے! پورا قصہ سُنیے۔ پرسوں جو میں مسز جیک کے ہاں گیا تو اُس نے مجھے اپنا راز بتلا دیا کہ وہ دنیاوی معاملات سے تنگ آ کر گھر سے غائب ہو کر اپنا نام تبدیل کر کے مسٹر ویلنگٹن کے ہاں نوکری کر کے پیٹ پالیگی۔ اور مجھے ویلنگٹن کے گھر کا پتہ بھی دے دیا۔ اب اس میں میرے ذمہ کیا الزام آتا ہے؟"

خالہ:۔ مجھے پہلے ہی سے خیال تھا کہ مسز جیک ایک شریف عورت ہے۔ ضرور ہے کہ شرمندگی اور افلاس سے بچنے کے لیے اُس نے روپوشی اختیار کی ہو۔ بہرحال تم اُسکے ہاں جاؤ۔ ممکن ہے کہ اُسی سے موبل کا بھی کچھ پتہ مل جائے۔"

گاڈفرے:" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسکے ہاں کیسے پتہ چلے گا؟ لیکن آپ کو کپتان روپرٹ۔ ...."

خالہ:" بس۔ بس! اُسکا نام نہ لو۔ اسکا خیال بھی نہ کرو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ایسا معاملہ نہیں۔ اور جاؤ مسز جیکب کے ہاں سے کچھ پتہ چلاؤ۔"

گاڈفرے:" آپ کہتی ہیں تو میں مسز جیکب کے ہاں جاتا ہوں۔ لیکن بظاہر وہاں کامیابی کی کوئی امید نہیں۔" (گاڈفرے رخصت ہوگیا)

(۶)

تھوڑی دیر کے بعد گاڈفرے سائیکل نے مسٹر ویلنگٹن کے گھر پہ جاکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ ویلنگٹن کی نئی ملازمہ نے دروازہ کھولا۔ جیسے کھلتے ہی گاڈفرے کی زبان سے بے اختیار "موبل" نکل گیا۔ دونوں پہ سکتے کا سا عالم طاری ہوگیا۔ اتنے میں مسٹر ویلنگٹن ناشتہ کرکے اپنے کھانے کے کمرہ سے نکل کر جارہا تھا کہ دروازہ پہ یہ سین دیکھا۔ مسٹر ویلنگٹن نے اپنے دل میں سوچا۔ کہ یہ شخص "کندۂ ناتراش" معلوم ہوتا ہے کہ اس لڑکی کا پتہ لگاکے اسکو واپس اپنے گھر لیجانے کے لیے آیا ہے لیکن ایسے بیرحموں سے حتی المقدور اس لڑکی کو بچانا چاہیے۔

ویلنگٹن (گاڈفرے سے مخاطب ہوکر)" ارے میاں! کیا تم اس لڑکی کے گھر سے اسکو واپس لینے کے لیے آئے ہو؟"

گاڈفرے:" جی ہاں"

ویلنگٹن:" تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ میرا گھر ہے۔ اور لڑکی میری حفاظت میں ہے اور تم اس لڑکی کو بغیر میری اجازت کے چھو بھی نہیں سکتے۔ اور اگر زیادہ چھیڑ کروگے تو میں پولیس کے حوالہ کردوں گا۔"

گاڈفرے:" آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے؟"

ویلنگٹن:" جی ہاں! میں جانتا ہوں۔ یہ میری نوکر ہے۔"

گاڈفرے" اور میری بیوی !!!"

ویلنگٹن (حیران ہوکر) "بیوی؟" (موبل کی طرف متوجہ ہوکر) کیا یہ سچ کہہ رہا ہے؟"

موبل (دبی زبان سے۔ گاڈفرے کی طرف پیار سے دیکھ کر) جی ہاں!"

ویلنگٹن "خدا بچائے۔ ارے کوئی مسز ہنری کو بلا لاؤ۔ وہی اس جھگڑے کا تصفیہ کرےگی مجھ سے نہ ہو سکےگا۔ مسز ہنری۔ مسز ہنری!!!"

مسز ہنری" آتی ہوں" (پہونچ کر) گاڈفرے! تم یہاں کیسے آئے؟ کیا تمھیں میرا تار مل گیا؟"

گاڈفرے" تار تو نہیں ملا۔ لیکن میں خود ہی تم سے ملنے کے لیے آیا"

ویلنگٹن (دل میں) "کیا میرے تمام نوکر اس شخص کے رشتہ دار ہیں۔ معاملہ کیا ہے؟" (گاڈفرے کی طرف مخاطب ہوکر) کیوں میاں! ابھی تو تم اپنی بیوی کو لے جانے کے لیے آئے تھے۔ اور اب میرے گھر کی منتظمہ سے ملنے کے لیے آئے ہو۔ کیا یہ بھی تمھاری بیوی ہے؟"

مسز ہنری۔ (یعنی مسز جیک) "مسٹر ویلنگٹن! مسٹر سائکل میرے قدیمی دوست ہیں۔ میں آپ کو اطلاع دینے والی تھی کہ مسز سائکل کے دل میں اپنے خاوند کی طرف سے بدگمانی ہوگئی تھی۔ اس لیے وہ اپنا گھر چھوڑکے آپ کے ہاں نوکری کرنے آئی تھی۔ چنانچہ میں نے اُس کی تسلّی کردی۔ اور آج صبح مسٹر سائکل کے نام تار بھی دے دیا۔ لیکن اس تار سے قبل ہی مسٹر سائکل یہاں پہنچے میرا تار ابھی راستہ ہی میں ہوگا"

ویلنگٹن" احمق جوڑا" (مسز جیک سے اشارہ پاکر) "جاؤ دونوں اس سامنے والے کھانے کے کمرے میں جاکر اپنی صفائی کرلو"

موبل" مسٹر ویلنگٹن! تم کیسے سخت دل ہو کہ میرے گاڈفرے کو پولیس کے حوالے کرتے تھے"

(موبل اور گاڈفرے کمرے میں داخل ہوگئے)

موبل" تم کس طرح میرے پیچھے یہاں آگئے؟ (ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر) گاڈفرے کیا میں

اس قابل ہوں کہ تم مجھے معاف کرو؟ میں نے سخت بدگمانی سے کام لیا۔ مسز جیک واقعی بڑی شریف عورت ہے۔ اگر وہ تمھاری بیوی ہوتی تو تمکو مجھ سے زیادہ آرام ملتا۔ گاڈفرے! مجھے معاف کرو۔"

گاڈفرے:" کیا معاف کروں؟ میں خود تم سے معافی چاہتا ہوں کہ تم میری خطا سے درگزر کرو۔"

موبل:" میں نے تم پر بدگمانی کی۔ جس کے لیے میں معافی کی خواستگار ہوں۔ تم نے میرے خلاف کیا کیا؟ جو میں معاف کروں؟"

گاڈفرے:" میرے دل میں بھی تمھاری طرف سے شک تھا۔"

موبل:" وہ کیا؟

گاڈفرے:" یہ کہ تم کپتان روبرٹ کے ساتھ چل دیں۔

موبل۔(قہقہہ لگاکر)"چلو خوب ہُوا۔ میں شرمندگی سے بچ گئی۔ اب ہم دونوں برابر ہوگئے اور ایک دوسرے کا گلا نہ رہا۔ تم نے سُنا؟ مسٹر ولنگٹن نے ہم کو" احمق جوڑے" کا خطاب دیا۔"

گاڈفرے:۔ اور اس میں شک ہی کیا ہے۔ کہ ہم دونوں احمق ہیں۔ آؤ! اب گھر کو چلیں۔"

تھوڑی دیر کے بعد دونوں میاں بیوی ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوے مسٹر ولنگٹن کے گھر سے رخصت ہوے۔

" بڑا مزا اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر"

راقم "داؤد"

ہماری آنکھ سے اُنکو حجاب کیا ہوگا	ترِ نقاب رُخِ آفتاب کیا ہوگا
ادا سمجھ کے وہ آنچل سے مُنھ چھپاتے ہیں	حجاب ہے جو یہی تو حجاب کیا ہوگا
جواب ہے تری شوخی کا دل کی بیتابی	اب اور اس سے سوا اضطراب کیا ہوگا
کسی حساب میں ٹھہری نہ زندگی اپنی	بروز حشر ہمارا حساب کیا ہوگا

نہ کوہ پر ہے ٹھکانا نہ دشت میں **سفدر**
تری طرح کوئی خانہ خراب کیا ہوگا

سنگم کی سیر

مولوی سید نواب علی نواب ایم اے پروفیسر بڑودہ کالج گزشتہ گرمیوں کی تعطیل میں جب اپنے شفیق قلبی جناب قاضی سید زاہد حسین صاحب نیتنوی اہلکار عدالت العالیہ لکھنؤ سے الہ آباد ملنے کے لیے آئے تو حضرت زاہد نے اپنے معزز مہمان کے آرام و دلبستگی کے جہاں اور سامان کیے تھے وہاں اپنے چند احباب یعنی جناب شفیق الحسن علوی کاکوروی و جناب احسن و حمید الہ آبادی وغیرہ کے ہمراہ حضرت نواب کو جمنا کی سیر بھی دکھائی۔ کشتی پہ شکار۔ نغمہ سرائی۔ نظر بازی۔ غرضکہ مختلف دلچسپیاں پیدا کی گئی تھیں۔ جن کا فوٹو اس نظم میں حضرت نواب نے نہایت عمدہ الفاظ میں کھینچا ہے۔

کشتیِ عمرِ رواں پھر سوئے جمنا ہو رواں
نگہِ شوق دکھا پھر مجھے سنگم کا سماں

وہ شفیق آتے ہیں مانندِ نسیمِ سحری
زاہدِ خشک ہے بلبل کی طرح زمزمہ خواں

یاد آتا ہے بہت نغمۂ جاں بخشِ حمید
وہ تماشا نہ ترا احسن کہ قضا کا فرماں

لو وہ سنگم نظر آتا ہے عجب رنگ سے واہ
چاک گنگا کا گریباں ہے جمن کا داماں

نیلگوں رنگِ جمن، اگرئی رنگِ گنگا
دیویاں حسن کی شاید ہیں تہِ آب نہاں

"ملتے بھی جاتے ہیں اور ملنے سے انکار بھی ہے"
وصل میں فصل کی اک صورتِ دلکش ہے عیاں

چھپ کے ملتے ہیں نظر آتے ہیں ظاہر میں الگ
کہیں واعظ سے نہ سیکھی ہوں یہ ترکیبیں ہاں

گرچہ ہیں دست و بغل پھر بھی کنارہ ہے مگر
دل میں بیٹھے ہیں نکلتے نہیں دل کے ارماں

واہ کیا عالمِ برزخ کا کھنچا ہے نقشہ
آئے یلتقیان[1] کیوں نہ ہو یاں وردِ زباں

اپنی ہستی کو مٹا دیتے ہیں سچے عاشق
مل کے گنگا سے جمن ہو گئی بے نام و نشاں

دلِ مضطر تری بیتابیاں اب حد سے بڑھیں
سیکھ اس راہ میں جمنا سے ذرا ضبطِ فغاں

زاہد و احسن و نواب و شفیق آؤ ادھر
ناؤ منجدھار میں ہے ہمتِ مرداں یاراں

ڈگمگاتی ہے بہت کشتیِ ایامِ شباب
ناخدا مست ہے فتنوں کا اٹھا ہے طوفاں

---

[1] اشارہ ہے اس آیت پاک کی طرف مرج البحرین یلتقیان بینہما برزخ لا یبغیان۔

چھنٹے لڑنا ہو حسینوں سے تو لڑلو اچھا
ہاں مگر دامنِ تر کا نہ ہو سر پہ احساں

شوق سے جلوۂ قدرت کا تماشا دیکھو
لیکن اس راہ میں ہونا نہ کہیں سرگرداں

مثلِ آئینہ رہے صاف دل اپنا ہردم
گرچہ ہوں جلوہ فگن سیکڑوں تمثالِ بتاں

پاکبازی کا تجھے شیخ جو دعوےٰ ہو تو ہو
ہم تو انسان ہیں ہردم ہیں خطادار انساں

سر کے بل چلتے ہیں ہم گنگ و جمن کے مانند
سیل کی طرح رواں، خاک بسر، نالہ کناں

زندگی جسم کا اور جاں کا ہے سنگم نوّاب
دیکھ گر دیدۂ باطن سے یہ پُر لطف سماں

وعدہ تو کر گئے ہیں مگر اعتبار کیا
دیکھیں دکھائے صبحِ شبِ انتظار کیا

ہے رازِ ہچکیوں میں دمِ احتضار کیا
کرتا ہے یاد کوئی تغافل شعار کیا

تم چاہتے اگر تو نہ آتا قرار کیا
کہتے ہو تیرے دل پہ مجھے اختیار کیا

ڈھاتی ہے قہر دیکھیے اب چشمِ یار کیا
لاتا ہے رنگ سرمۂ دنبالہ دار کیا

مجھ کو مٹا کے خاک اُڑاتے ہو کس لیے
میری طرف سے دل میں ابھی ہے غبار کیا

صفا و خوشدلی میں ہے کچھ زندگی کا لطف
افسردہ خاطروں کی خزاں کیا بہار کیا

کافی ہے اُن کا نام ہی اُن کے نشان کو
کشتوں کو تیرے حاجتِ سنگِ مزار کیا

جانے بھی دو نوشتۂ تقدیرِ دل ہے یہ
پڑھ کر کرو گے کتبۂ لوحِ مزار کیا

کل سے ضرور آج طبیعت بحال ہے
عاشق کے رنگِ رُخ کا مگر اعتبار کیا

آنکھیں تمھاری کہتی ہیں کچھ آج اے کلیم
دیکھا ہے تم نے جلوۂ دیدارِ یار کیا

کرتے کچھ اور وعدۂ فردا پہ صبر ہم
اے موت زندگی کا مگر اعتبار کیا

بیٹھا ہو کھو کے جو دل و جاں اک نگاہ پر
وہ دے سکے گا قیمتِ تصویرِ یار کیا

اے ساکنانِ شہرِ خموشاں کہو تو کچھ
کیسے ہو تم گزرتی ہے زیرِ مزار کیا

یادش بخیر تھا ابھی کل تک شریکِ حال
اے صدق دل پہ آج مگر اختیار کیا

نظرے خوش گزرے

مسٹر عبد الرحمٰن بجنوری بیرسٹرایٹ لا مراد آبادنے جو مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے نہایت ہی قابل فرزندوں میں ہیں ایک مبسوط رسالہ "مسلم یونیورسٹی" پر لکھ کر مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے اراکین کے ملاحظہ وغور کے لیے شایع کیا ہے اور ازراہ عنایت ایک نسخہ بغرض اظہار رائے ہمارے پاس بھی بھیجا ہے۔ ہم نے باوجود کثرتِ مشاغل کے اسے بالاستیعاب پڑھنے کی کوشش کی اور ایکدفعہ پڑھ جانے کے بعد ہماری رائے یہ قائم ہوئی کہ دوبارہ زیادہ غور سے دیکھ کر اسپر بہ تفصیل تبصرہ لکھا جائے، مگر کچھ تو ماہِ صیام کی مہمان داری اور کچھ اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے جس کے باعث بہت ضعف پیدا ہوگیا اور روزمرہ کے معمولی کاموں کا سرانجام بھی فی الحال دشوار ہے، اس خیال کی تکمیل نہ ہوئی اور شاید ابھی کچھ دنوں ہم اور معذور رہیں گے۔ اسی اثنا میں ہم نے اپنے اخی المعظم منشی سخاوت علی صاحب سے جن کی محبت و فیاضی اب تک الناظر کے تمام مالی نقصانات سے ہمیں بے پروا بنائے رہی اور جو مسلم یونیورسٹی کے ایکٹیو ہونے کی وجہ سے اور نیز اپنے عام رجحان اور معاملات قومی و ملکی میں دیرینہ انہماک کے لحاظ سے "یونیورسٹی" کے معاملات میں بغایت دلچسپی رکھتے ہیں، تحریک کی کہ وہ اس رسالہ کے متعلق بہ تفصیل اپنی رائے قلم بند فرماکر عنایت فرمائیں۔ چنانچہ انھوں نے اسکا وعدہ بھی فرمایا ہے اور غالباً آیندہ نمبر میں ہم اُنکے قیمتی خیالات کی اشاعت کر سکیں گے۔

البتہ یہاں اس قدر عرض کردینا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ قومی اخبارات اور مسلم یونیورسٹی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات حتیٰ کہ خود مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے اراکین نے اس رسالہ پر اب تک کافی توجہ نہیں فرمائی ہے۔ حالانکہ جس محنت، دل سوزی اور واقفیت کی بنا پر مسٹر عبد الرحمٰن نے یہ ضخیم رسالہ تیار کیا اور اپنے ذاتی صرف سے چھپواکر تقسیم فرمایا ہے وہ اس بے التفاتی اور سرد مہری کے سلوک کا کسی حال میں مستحق نہیں ہو سکتا۔

ہمیں امید ہے کہ ہماری اس کم زور صدائے احتجاج کے بعد کم سے کم قومی اخبارات تو ضرور ہی لائق مصنف کے مشوروں پر غور فرماکر اس رسالہ کے مطالب پر بہ وضاحت بحث کریں گے تاکہ مسلم یونیورسٹی کے اس اہم مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر پوری روشنی پڑ سکے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۶ جلد ۱۳ — یکم اکتوبر ۱۹۱۵ء

مختصر رپورٹ انجمن ترقی اُردو بابت ماہ اگست ۱۵ء (ضمیمہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

جلد ۱۳ ... یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۵ء

ہربرٹ اسپنسر
کی
کتاب العدل کا ایک ورق

انجمن ترقی اُردو کی سالانہ رپورٹ بابت سنہ ۱۹۱۴ء کے صفحہ ۱۵ پر شفقی مولوی عبد الحق صاحب نے فرمایا تھا کہ

مولوی حافظ علی صاحب ہماری قوم میں اُن بزرگوں میں سے ہیں جو صحیح معنوں میں طالب علم اور عالم کہلانے کے مستحق ہیں اور جو قدیم و جدید فلسفہ میں بڑی دستگاہ رکھتے ہیں۔ بہت ہی کم لوگ ہیں جو آپ کے نام سے واقف ہیں۔ لیکن جس قدر وہ عزلت نشیں اور تنہائی پسند ہیں اُسی قدر آپ کا علم پختہ اور گہرا ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے انجمن کے لیے انگلستان کے نامور حکیم ہربرٹ اسپنسر کی کتاب (Ethics) علم الاخلاق کا ترجمہ شروع کر دیا ہے اور چند ابواب ترجمہ کرکے میرے پاس بھیج بھی دیے ہیں۔ میں نے جب اس ترجمہ کا اصل سے مقابلہ کیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ ہم میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ایسے مشکل اور کٹھن مضامین کا ترجمہ اس سلاست اور خوبی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ میری رائے میں اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ مولوی صاحب ہی کا

کا حق تھا۔ جب کتاب چھپ کر تیار ہوگی تو معلوم ہو گا کہ مولوی صاحب کس پایہ کے شخص ہیں۔"

ناظرین الناظر یہ سن کر محظوظ ہوں گے کہ مولوی حافظ علی صاحب بالقابہ آج کل اسپنسر کی کتاب "العدل" کا ترجمہ کر رہے ہیں اور حال میں جو گرامی نامہ ہمارے پاس آیا ہے اُس کے ساتھ اس ترجمہ کا ایک ورق، بھی نقل فرما کر بطور نمونہ ہمیں مرحمت فرمایا ہے، جسے ہم ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے درج ذیل کرتے ہیں تاکہ اس مختصر کے مطالعہ سے اربابِ نظر کو کام کی اہمیت و دقت اور مولوی صاحب کی کوشش و قابلیت کا کسی قدر اندازہ ہو سکے مولانا موصوف نے اپنے بعض مسودات بھی ہمیں مرحمت فرمائے ہیں جو رفتہ رفتہ الناظر میں شایع ہوتے رہیں گے۔ ان عالمانہ تحریرات کے پڑھنے والوں کی تعداد اگرچہ ہمارے مُلک میں ابھی بہت کم ہے اور اس وجہ سے اسکی توقع نہیں کہ مولوی صاحب کی مساعی جمیلہ کی اس زمانہ میں پوری قدر ہو سکے گی لیکن جب ہمارا مذاق سنور جائیگا اور علوم کی نشر و اشاعت زیادہ عام ہو جائے گی اُس وقت یقین ہے کہ ایسے باکمال اصحاب کی کوششوں کی پوری پوری داد ملے گی، اور اہل ملک اُن کی جاں فشانیوں اور جگر کاویوں کی اچھی طرح قدر کر سکیں گے۔

الناظر کو چونکہ ایک علمی رسالہ بنانے کی کوشش ہے اس وجہ سے اُسکے ناظرین میں (جو مقدار میں اگرچہ زیادہ نہیں) بڑی تعداد اُنھیں اصحاب کی ہے جو اُردو زبان میں ہر قسم کے علمی مضامین کی اشاعت کے بدل خواہاں ہیں اور اسی بنا پر ہمیں توقع ہے کہ ان اجزا کو اکثر ناظرین بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور لایق مترجم کی اس عنایت و توجہ کے لیے جو الناظر کے حال پر صاحب ممدوح نے مبذول فرمائی ہے، ہماری طرح بدل ممنون ہونگے۔ **ایڈیٹر**

قانون "مساواتِ حُریّت" کا یہ ایک واضح ترین اور مستغنی عن البیان نتیجہ ہے کہ، قطع نظر دوسرے قیود و موانع کے، ہر شخص کے افعال میں ایسی روک تھام لازم ہے کہ کسی دوسرے شخص کو اُن افعال سے ضرر جسمانی شدید یا خفیف نہ پہنچے۔ اس حد سے گزر کر افعال کا عمل میں آنا دلالت اس بات پر کرتا ہے کہ ایک جانب آزادی دوسری جانب سے زیادہ اختیار کی گئی۔ اور اس صورت میں فعل بغرض انتقام ہو۔ اور ہم بیان کر آئے ہیں کہ قانون مذکور، صحیح معنوں میں، نہ تعدّی کو جائز رکھتا ہے اور نہ انتقام تعدّی کو۔ علاوہ بریں، یہ قانون، اس اعتبار سے کہ توضیح ایسی شرط

کی کرتا ہے جس کی تعمیل سے قوم کا مبلغ راحت و آسایش تا امکان زیادہ سے زیادہ ہو، مانع اُن کُل افعال کا ہے جو موجبِ تکلیف جسمانی وباعث ضجرت طبع ہوں۔

۲۸۵۔ اس عام عنوان کے تحت میں محض اسکے "حق حیات" و بالزم بہا امتناع قتل کی صراحت کی ضرورت ہے۔ قتل جو مہذب اقوام میں شنیع ترین گناہ متصور رہے اگر دانستہ نہیں تو نا دانستہ ایسا بُرا اس وجہ سے سمجھا جاتا ہے کہ اشد درجہ قانونِ مساوات حریت "کے منافی ہے۔ کیونکہ قتل دوسرے کی قدرت فعل میں محض رُکاوٹ ہی نہیں پیدا کرتا بلکہ ہمیشہ کے واسطے اس قدرت کو معدوم کردیتا ہے۔ اگرچہ قانون مساوات آزادی کے اس نتیجۂ اول یعنی "حرمتِ حیات "کے باب میں چنداں اصرار وتاکید کی حاجت نہیں. مگر اس امر کا ملاحظہ کہ کس طرح اس حرمتِ حیات کے اعتراف نے بتدریج ترقی کی، خالی از نفع نہ ہوجائے گا۔

اس باب میں سب سے پہلے جزائر فیجی کے وحشیوں کی انتہائی حالت قابل ملاحظہ ہے جن میں قتل انسان مایۂ فخر ومباہات متصور تھا۔ ان سے گزر کر اُن صحرائیوں کے حالات لایق ذکر ہیں جو اپنی قوم کے بڈھوں، مریضوں اور از کار رفتہ افراد کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ یورپ کی بعض قدیم اقوام میں بھی یہی طریق رائج تھا۔ گرِم کا بیان ہے کہ قوم ونڈ (Wend) میں لڑکے اپنے بوڑھے والدین وذوی الارحام اور دوسرے رشتہ داروں کو ونیز اُن کو جو جنگ ومحنت کے لایق نہ رہتے تھے مار ڈالتے اور پکا کر کھا لیتے تھے، یا زندہ دفن کر دیتے تھے۔ زمانۂ مابعد جرمنی کی شمالی اقطار میں بوڑھوں اور مریضوں کے قتل کیے جانے کے رسم کے آثار پائے جاتے ہیں۔

قوم کے عاجز اور از کار رفتہ افراد تو عمداً ہلاک ہی کیے جاتے تھے جسکے واسطے عموماً یہ عذر تھا کہ قابل کار افراد کے بچانے کی ضرورت اس سنگدلی کی متقاضی ہے۔ اسپر طرہ یہ ہے کہ قتل عمد کو عام طور پر جرم ہی خیال نہ کرتے تھے۔ قاتل کو اگر کوئی خوف تھا تو مقتول کے اعزا واحباب کے انتقام کا تھا۔ یہ لوگ بھی مقررہ خوں بہا دے کر راضی کیے جاسکتے تھے۔ قوم کے سردار کو ایسے امور میں صرف یہی فکر کرنا پڑتی تھی کہ ایفائے معاہدہ عمل میں آئے۔ زمانۂ مابعد میں تمام یورپ میں یہی خیالات یہی رسوم وعادات جاری تھے۔

علم المعیشت

مسئلۂ کارکردگی

مشفقی و مکرمی دام الطافکم السلام علیکم

کتاب علم المعیشت برابر لکھی جارہی ہے۔ اطمینان فرمائیے گا۔ مگر چونکہ اس کی ضخامت تخمیناً چار سو صفحے سے کم نہ ہوگی، تکمیل کے واسطے ابھی کچھ وقت درکار ہے۔ کل کتاب تو سلسلہ وار الناظر میں شائع نہیں کی جاسکتی۔ البتہ وقتاً فوقتاً ناظرین کی ضیافت طبع کے واسطے کچھ اجزا پیشکش ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ محنت کے بیان کا ایک جزو یعنی کارکردگی مرسل خدمت ہے۔ اگر پسند ہو تو شایع فرمادیجیے گا۔ والسلام محمد الیاس۔ برنی۔

تجزیہ۔ کارکردگی اور اُسکے اسباب (۱) آب ہوا (۲) خوراک (۳) لباس و مکان (۴) آزادی و سیاحت (۵) معاشرت و اخلاق (۶) تعلیم۔

سخت محنت خواہ جسمانی ہو یا دماغی بلا اکراہ و تکان دیر تک برداشت کرنا کام میں سمجھ معاملہ فہمی اور ہوشیاری دکھانا، غرضکہ طاقت، چستی، استقلال، تندہی اور ہوشیاری جیسی صفات جو عمدہ مزدور کا امتیاز ہوتی ہیں مجموعاً کارکردگی کہلاتی ہیں۔ مہارت اور کارکردگی دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ جو قابلیت کسی ایک کام سے مخصوص ہو مثلاً جراحی، مصوری۔ انجینیری یا درزی کی فیشن ایبل تراش مہارت کہلاتی ہے۔ مگر جو صفات ہر کام کی عمدگی کے واسطے لازمی ہیں وہ کارکردگی میں شامل ہیں۔

کارکردگی کا کسی قوم کی عام جسمانی و دماغی صحت اور اخلاقی و معاشرتی حالت سے نہایت قریبی تعلق ہے۔ کارکردگی محنت کی جان اور قومی ترقی کا سنگ بنیاد ہے۔ چنانچہ جاپان کا موجودہ عروج اسی کارکردگی کی تازہ ترین تفسیر ہے۔ اسکی سی آزادی اور خود مختاری آج دنیا میں کم

ملکوں کو میسر ہے۔ رہی معاشی حالت سو اُس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ہندوستان میں جو مصنوعات خارجہ کی سب سے بڑی منڈی ہے وہ جرمنی کا جانشین ہوتا جاتا ہے۔ کچھ نہیں تو ساٹھ فی صدی مصنوعات ہندوستان میں جرمنی سے آتے تھے۔ اور اگر آج کسی دوکاندار سے دریافت کیجیے کہ فلاں چیز موجود ہے تو اکثر جواب ملتا ہے کہ جرمنی سے تو آمد بند ہوگئی البتہ جاپان سے آئی ہیں لیکن بعینہٖ جرمنی کی سی اور قیمت اُس سے بھی کم۔ ہمارا سخن پرست اور کام چور ہندوستان جس نے سودیشی کی منادی سے آسمان سر پہ اُٹھا لیا تھا، آج موقعہ ملنے پر اپنا گھر بار کیوں نہیں سنبھالتا۔ کیوں نہیں مُردہ صنعت و حرفت میں جان ڈالتا۔ کل تک جرمنی کا محتاج تھا، کل کو جاپان کا دست نگر ہو جائے گا۔ ہم نہیں کہتے کہ نعوذ باللہ کُن فیکون کر دکھائے مگر یہ اصرار بیجا نہ ہوگا کہ وہ ہاتھ پھیر ہلائے۔ پیداوار خام پر نظر ڈالے۔ اور موجودہ علم و آلات سے جو چیزیں تیار کر سکے زیادہ نہیں تو تھوڑی تیار کرے۔ محبان وطن اور حامیان قوم کے امتحان کے واسطے خدا نے ہندوستان کو یہ موقعہ دیا ہے تاکہ خلوص و نمایش، دلسوزی و خودغرضی، نیک نیتی و فتنہ انگیزی کہنے۔ اور کرنے میں پورا پورا فرق ظاہر ہو جائے۔ معاشی حالت کی اصلاح اور ترقی کا اس سے بہتر موقعہ ملنا دشوار ہے۔ جبکہ قومی تر مقابلوں سے میدان خالی ہے اگر سودیشی کے رواج میں دل توڑ کر کوشش کیجائے تو ممکن ہے کہ بیکاری و افلاس کا تسلط ہندوستان سے نہ اُٹھ جائے؟ خدا نہ کرے کہ اغیار طعن دیں۔

بہت شور سُنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا حالات خاص طور پر کارکردگی کے واسطے موزوں اور مساعد ہیں۔

(۱) سب سے مقدم آب و ہوا اور موسم کا اثر ہے۔ انتہا درجہ کی گرم اور سرد آب و ہوا، اور موسموں کا جلد جلد تبدیل ہونا کارکردگی کو مضرت پہنچاتا ہے۔ منطقۂ حارّہ میں سخت محنت خصوصاً جسمانی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیجا سکتی۔ اور محنت کی وہاں ضرورت بھی کم ہے۔ بوجہ کثرتِ نباتات زمین کی پیداوار سے بلا مشقت غذا حاصل ہو جاتی ہے۔ گرمی میں اتنا کپڑا کافی کہ بدن

ڈھک جائے۔ گھنے درختوں کے ٹھنڈے سائے سے زیادہ آرام کہاں مل سکتا ہے۔ مختصر جیز نسبت رکھنے کو ایک جھونپڑا کافی ہے۔ گرم خشک ممالک کی زندگی بھی نہایت سادہ ہوتی ہے۔ بہ وجہ قلتِ پیداوار وہاں کی ضروریات بھی ما یحتاج زندگی سے آگے کم بڑھ سکی ہیں۔ چنانچہ منطقۂ حارہ کی معاشی زندگی ہمیشہ سے ایسی ہی چلی آتی ہے اور غالباً کبھی قابلِ لحاظ تغیر واقع نہ ہو سکے گا۔ اسی طرح پر منطقۂ بارد میں بہ وجہ شدتِ سردی وکثرتِ برف نہ زمین سے پیداوار ہوتی ہے نہ باشندوں کو محنت کا موقعہ ملتا ہے۔ ہفتوں جھونپڑوں میں بندرہ کر خدا جانے جانوروں کے گوشت پر کیوں کر بسر کرتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ریگستان اور برفستان کبھی زراعت صنعت وحرفت تجارت اور دیگر معاشی ترقیات کے مرکز بن سکیں۔ موسم جلد جلد تبدیل ہونا کارکردگی کے واسطے مضر ہے۔ کبھی تڑاقے کی گرمی کبھی کڑاکے کا جاڑا اور کبھی موسلادھار بارش۔ طبیعت ایک موسم کی عادی نہیں ہونے پائی کہ دوسرے کی پیروی عائد ہو جاتی ہے اور دوسرے کی طرف متوجہ ہوئی کہ تیسرا موسم آ پہنچا۔ غرضیکہ تمام سال اسی ردوبدل کی نذر ہو جاتا ہے۔ طبیعت کو کبھی سکون اور یک رنگی میسر نہیں آتی۔ نتیجہ کمزوری اور اضمحلال ہوتا ہے۔ چنانچہ علاوہ دیگر اسباب کے تغیراتِ موسم بھی ہندوستانیوں کی آرام طلبی کا باعث خیال کیے جاتے ہیں۔ یہ تو عام تجربہ ہے کہ تبدیلی موسم کے زمانہ میں کم ازکم ہفتہ عشرہ طبیعت کُند اور کسل مند ضرور رہتی ہے۔ اور بارش اور سرما کے وسطی زمانہ میں بہ وجہ گرمی اور رطوبت ملیریا اور ہیضہ اکثر مقامات میں بلاناغہ ہر سال پھیلتا ہے۔ چونکہ طبیعت پورے طور پہ عادی نہیں ہوتی، ہر موسم کی شدت سے مغلوب ہو جاتی ہے۔ جون جولائی میں ہاتھ سے پنکھا اور گلاس نہیں چھوٹتا۔ ہر شخص کسی تاریک کوٹھری میں دن بھر خاموش پڑا رہنا پسند کرتا ہے۔ صبح کی ٹھنڈ میں سب ضروری کام کر لیے جاتے ہیں، یا غروبِ آفتاب کے قریب لوگ باگ گھر سے نکلتے ہیں۔ دوپہر کو شہر بھر میں ہُو کا عالم ہوتا ہے۔ بارش کے زمانہ میں سوائے زراعت کے کھلے میدان کے اکثر کاروبار بند ہو جاتے ہیں۔ نیز آب و ہوا کی خرابی محنت سے مانع ہوتی ہے۔ البتہ جاڑے کے چار مہینے کام کاج کے واسطے نہایت موزوں ہیں۔ اسی موسم میں عدالتیں، دفاتر، سکول، کالج، فیکٹریاں، کارخانے، منڈیاں، اور بازار آباد اور

مصروفِ کار نظر آتے ہیں۔

اسکے برعکس منطقۂ معتدل خصوصاً شمالی حصّے کے ممالک میں خوش گوار آب و ہوا اور یکرنگ موسم بدن کو چُست اور طبیعت کو قوی اور بشاش رکھتے ہیں۔ نہ پسینہ آئے نہ بدن ٹھٹھرے۔ بہت دیر تک محنت کا تکان محسوس نہیں ہوتا۔ موسمی تغیرات نہ طبیعت پراگندہ کریں نہ محنت میں حایج ہوں سال بھر کا روبار ایک رفتار پر چلتا ہے۔ پیداوارِ زمین کی نہ اس قدر کثرت کہ آدمی قناعت کر بیٹھے نہ اس قدر قلت کہ لاچار بن بیٹھے۔ بلکہ اسکی مقدار ایسی مناسب ہوتی ہے کہ عمل پیدائش میں محنت اور اصل کو بھی حصہ لینے کا کافی موقعہ مل جاتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ منطقۂ معتدل کارکردگی کی نشو ونما اور معاشی ترقیات کے واسطے بغایت موزوں ہے، منطقۂ حارّہ کم تر اور منطقۂ بارد سب سے کم۔ چنانچہ واقعات اس اصول پر بالاتفاق شاہد ہیں۔

(۲) آب و ہوا اور موسم کا اثر کم و بیش تمام ضروریات زندگی پر پڑتا ہے۔ سب سے اول خوراک کو لیجیے کہ وہ زمین سے پیدا ہوتی ہے اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے پیداوارِ زمین کی نوعیت بیشتر آب و ہوا اور موسم سے وابستہ ہے۔ ہندوستان کا آم افغانستان میں نہیں پھلتا اور نہ کاشمیر کا سیب ہندوستان میں۔ برار کی سی عمدہ روئی ہندوستان بھر میں کہیں نہیں ہوتی۔ سَن کی کاشت مشرقی بنگال تک محدود ہے۔ کھجور ریگستان کی نعمت ہے اور یہی حال تمام قسم کی نباتات کا ہے۔ ہماری خوراک نباتات سے مرکب ہے اور نباتات کے خواص مختلف۔ بعض میں مادۂ نشوونما بہت زیادہ بعض میں معتدل اور بعض میں بہت کم ہے۔ اسی طرح بعض مفید اور معاونِ صحت ہیں اور بعض مضر او مخرّب افغانستان میں میوہ جات کی وہ کثرت کہ کھاتے بن نہیں پڑتا اور قریب ہی راجپوتانہ میں جوار باجرہ نعمت عظمیٰ سمجھا جاتا ہے اور ان دونوں غذاؤں کا فرق باشندوں کی حالتِ جسمانی سے صاف ظاہر ہے۔ بنگال اور مدراس کی غذا عام طور پر چاول مچھلی ہے۔ یہ دونوں پانی کی مقدار بڑھا کر خوں کو رقیق اور اُسکی حرارت کو کم کر دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ گندھک کا جزو غالب ہے دماغ کو خاص طور پر تقویت پہنچاتی ہیں۔ چنانچہ بنگالی نہایت ذہین وطبّاع، دیکھنے میں جسیم مگر جسمانی محنت سے کترانوس ہوتے ہیں

برعکس اس کے پنجاب کی خوراک گیہوں اور گوشت دونوں چیزیں خون میں فولادی اثر پیدا کرکے حرارت کو بڑھاتی ہیں اور جسم کو قوی کرتی ہیں۔ چنانچہ پنجابی لوگ ذہین تو کچھ ایسے نہیں مگر اکھڑ غصہ ور۔ جفاکش خاص طور سے ہوتے ہیں۔ ترشی اور نشاستیات کی کثرت سے دکن میں اکثر لوگ ضعیف اور ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ عرب دیکھنے میں کیسے دبلے پتلے۔ مگر چونکہ انکی غذا عموماً گرم خشک ہوتی ہے، انکے پٹھے فولاد جیسے مضبوط اور دل شیر جیسے قوی ہوتے ہیں۔ اسکے برعکس سرد تر چیزوں کی کثرت استعمال سے بنیوں کے جسم خمیرے مانند پھول کر کس قدر بے قابو ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ صحت و قوت کا دار و مدار خاص طور سے خوراک پر ہے اور خوراک مقامی آب و ہوا اور موسم سے مخصوص ہوتی ہے۔

پس آب و ہوا کارکردگی پر بذریعہ خوراک بھی بہت قوی اثر ڈالتی ہے۔ اور کسی ملک میں عمدہ نباتات کی کثرت خدا کی بڑی نعمت ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان خاص طور پر خوش قسمت نظر آتا ہے متعدد چند عمدہ نباتات ایسے ہیں جو کم و بیش یہاں پیدا نہ ہوتے ہوں۔ آم، امرود، خربزہ جیسے عمدہ پھل اس قدر کثرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ ہندوستان بھر میں شاید ہی کوئی شخص ان سے محروم رہتا ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ جو پھل اور میوے فصل کے زمانہ میں یہاں کے غربا بھی جی بھر کر کھا لیتے ہیں انکے چکھنے کی تمنا دوسرے ملکوں کے اچھے اچھوں کو مدتوں بے چین رکھتی ہے۔ آم کی تعریف میں ایک تازہ ولایت پروفیسر نے نہایت صاف گوئی سے اعتراف کیا کہ آم تو ولایت میں بھی شیشوں میں میں بند دیکھے تھے اور انکے ذائقہ کا دل میں اشتیاق بھی بہت تھا مگر کبھی خریدنے کا موقعہ نہیں ملا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ تمام دنیا کے کاشتکاروں میں ہندوستانی کسان بہترین غذا کھاتا ہے۔ اس کے دودھ، دہی۔ جو، چنے کی روٹی اور مکئی یا باجرے کے مالیدے کی سامنے دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں اور حقیقۃً معدے میں اگر قوتِ ہاضمہ کافی ہو تو یہ چیزیں قیمتی حلووں سے کہیں بڑھ کر مقوی ہوتی ہیں۔ یورپ میں اکثر کاشتکاروں کی غذا ابلے ہوئے آلو اور پیاز ہے جس کو نمک مرچ ملا کر وہ بہت رغبت سے کھاتے ہیں۔

ریل اور جہاز نے ہر ایک پیداوار تمام دنیا پر پھیلا دی ہے۔ گوشت جیسی جلد سڑنے والی

چیز کو طرح طرح کے مصالحے لگا کر اور پھل جیسی گلنے والی چیز کو شہد اور شراب میں ڈال کر ہزاروں میل لے جاتے ہیں اور مہینوں رکھ کر کھاتے ہیں۔ علم نباتات کے زور سے غیر ملکوں کی چیزیں بھی پھلتے ہیں چنانچہ ولایت میں گرم ملکوں کے پھل اور ترکاریاں شیشے کے مکانات میں عارضی گرمی کی مدد سے پیدا کر لیتے ہیں۔ مگر ان ترکیبوں سے قدرتی پیداوار کی سی کثرت کہاں سے ہو سکتی ہے۔ صرف امرا اور دولتمند اپنا اشتیاق پورا کر لیتے ہیں۔ عوام کو تو خواب خیال میں بھی وہ چیزیں میسر نہیں آتیں۔

(۳) خوراک کے بعد لباس اور مکان قابل غور ہیں۔ سرد ممالک میں ان کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کافی میسر نہ آسکیں تو بیماری کا اندیشہ قوی ہو جاتا ہے گرم ممالک میں کپڑا صرف بقدر ستر پوشی درکار ہوتا ہے۔ اگر گھنے درختوں کی کثرت ہے تو جنت کا لطف آتا ہے ورنہ دھوپ سے بچنے کے لیے جھونپڑے کافی ہیں۔ انکو سرد ممالک والوں کے برابر محفوظ اور مضبوط مکان کی ضرورت نہیں لیکن اگر موسم معتدل ہو تو لباس و مکان اس قدر لابد نہیں کہ اگر میسر نہ آسکیں تو جان پر آبنے اور صحت تباہ ہو جائے۔ جب بارش نہیں ہوتی اور سردی نہیں پڑتی تو بہت سے محتاج ومفلس ہمارے قصبوں اور شہروں کی کشادہ سڑکوں کے کنارے اور دھرم شالوں، سافرخانوں کے پختہ چبوتروں پر خواب راحت کا وہ لطف اٹھاتے ہیں جو امرا کو نرم بستروں پر خواب میں بھی میسر نہیں آسکتا۔ انھیں نہ بچھونے کی ضرورت نہ اوڑھنے کی۔ ایک کپڑا جو جسم ڈھانکے ہوئے ہے ہر حال میں کافی ہے۔ غریب لوگ بھی مکان اور لباس میں زیادہ صرف کرنے پر مجبور نہیں۔ دھوتی کرتا اور ٹوپی، وہ بھی اونی نہیں بلکہ سستی گاڑھی مارکین کی، ہمارے مزدور کا ضروری لباس ہے اور ایک چھوٹا سا چھپر کا کچا مکان اسکی آرام گاہ ہے۔ جوتا، وہ صرف بیاہ شادی یا عید تیوہار کے موقعہ پر پہنتا ہے۔ مگر چونکہ محض تکلف ہے، راستہ بھر ہاتھ میں لٹکا کر لے چلتا ہے اور صرف منزل مقصود کے قریب اسکو زیر باری کی تکلیف دینا گوارا کرتا ہے۔ سرد ملکوں کی حالت اس سے مختلف ہے۔ وہاں پر غربا جن کا کوئی ٹھکانا نہیں آکر اپنی بھیک میں سے کم ازکم ایک پیسہ بچا لیتے ہیں تاکہ کرایہ دیکر کسی پینی بڈ میں رات بسر کر سکیں ورنہ شدت سردی سے ٹھٹھر کر مرجانا یقینی ہے۔ اب ان پینی بڈوں کی کیفیت سنیئے۔ یہ عموماً زمین دوز

کوٹھریاں یا تہ خانے ہوتے ہیں جن میں نلوے جیسی کوئی گھانس پھی ہوتی ہے۔ اکثر میں بجز فاسری ہوا کی آمد و رفت کے واسطے کافی دریچے بھی نہیں ہوتے۔ شام کو صدہا غریب ہر ایک پینی بیڈ میں کھچا کھچ بھر جاتے ہیں۔ بوڑھے، بچے، جوان مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں ہوتی، سب اُسی گھاس پر پال کے آموں کی طرح ایک دوسرے سے اڑ کر سو رہتے ہیں اور صبح کو پھر منتشر ہو جاتے ہیں خیال کرو کہ ہمارے یہاں کے غربا کی رات بمقابلہ اُن کے کس قدر راحت سے کٹتی ہے۔ اور اس فرق کا باعث آب و ہوا اور موسم نہیں تو اور کیا ہے۔ اب مزدور کی حالت سُنیے کہ تمام جسم کو گرم اونی لباس سے ڈھانکنا اُسکے واسطے لازمی ہے۔ نہ صرف جوتا بلکہ اُونی موزے بھی سردی سے محفوظ رہنے کے واسطے ضروری ہیں۔ مکان بھی اس قدر پختہ ہونا چاہیے کہ برف باری کا مقابلہ کر سکے اور سرد ہوا کو کافی طور پر روکے۔ غرضیکہ لباس و مکان جن کا صحت سے قریبی تعلق ہے آب ہوا و موسمی حالت کے مطابق ہوتے ہیں۔ کہیں وہ لابُد ہوتے ہیں اور کہیں راحت کا سامان خیال کیے جاتے ہیں۔ کہیں اپنی کمائی کا معقول حصّہ صرف کرنا پڑتا ہے اور کہیں بہت کم۔ لیکن ہر مُلک کی ضروریات کے مطابق کافی مکان و لباس ملنا کارکردگی کے واسطے ضروری ہے اگر کمی ہوگی تو صحت کمزور نشو و نما ادھوری اور کارکردگی ادنٰے درجے کی ہو جائے گی۔

(۴) آزادی اور سیاحت کی اُمنگیں بھی کارکردگی کے لیے از حد موزوں اور موافق ہیں۔ اُمنگ ہی تمام ترقی کا منبع ہے۔ آزادی کام کو آسان اور خوش گوار بنا دیتی ہے۔ علم النفس سے ثابت ہے کہ آدمی جو کام شوق سے کرتا ہے اُس میں تکان بہت کم محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ تفریح، کھیل، کود اور مزدوری کے کاموں کا طبیعت پر مختلف اثر ہوتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ بطور چہل قدمی چار میل جانا اتنا گراں نہیں گزرتا جتنا کہ کسی ضروری کام سے دو میل جانا۔ غلام جو کوڑے کے ڈر سے کام کرے اور آزاد مزدور جو کمائی کے شوق میں جان کھپاتا ہے اُنکی کارکردگی میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ رہی سیاحت، اس سے اول تو معلومات میں اضافہ، خیالات میں وسعت اور حوصلے میں بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر قسم کے حالات آنکھ سے دیکھ کر انسان بُرائی بھلائی اور اُن کے اسباب

سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ سفر تعلیم کا لازمی جزو مانا جاتا ہے۔ انسان کتنا ہی کتابی علم حاصل کرلے جب تک سفر کے تجربوں اور مشاہدات سے اپنے علم کی تصدیق اور اصلاح نہیں کرے گا اُسکی تعلیم ناقص ہوگی اور وہ کنوئیں کے مینڈک سے کچھ زیادہ بہتر نہ ہوگا۔

دوسرے ایک عجیب بات یہ ہے کہ وطن میں انسان کی ہمیشہ نسبتاً کم قدر ہوتی ہے۔ ہندی کی مثل ہے "گھر کا جوگی جوگنا اور ان کا نوں گا سادھ" اسی مضمون کی ضرب المثلیں تقریباً دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ انسان کا عام تجربہ ہے اور کسی ملک و قوم کی خصوصیت نہیں۔ احباب اعزہ پر قابلیت و کمال کا اثر اور رعب اتنا نہیں پڑسکتا جتنا اغیار اور نا واقف لوگوں پر۔ چنانچہ بالعموم بڑے بوڑھے ترقی یافتہ نوجوانوں کو جتایا کرتے ہیں کہ اب پڑھ لکھ کے قابل بن گئے تو اوروں کے لیے، ہماری نظر میں تو وہی ہو جو بچپن سے تھے۔ تمہارے بھولے پن اور نادانی کی باتیں سب یاد ہیں۔ دوست احباب کو بھی ترقی و امتیاز کا اثر ناگوار معلوم ہوتا ہے اور وہ بھی کسی کا قدیم سطح سے بلند ہونا کم از کم اپنے مقابلہ میں ناپسند کرتے ہیں۔ ان وجوہات سے قابل آدمی اپنے وطن میں زیادہ نہیں اُبھر سکتا۔ اور غیر جگہ ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ طبیب، وکیل جیسے پیشہ ور جن کو حُسنِ ظن اور رُعب کی ضرورت ہوتی ہے ہمیشہ وطن سے دُور جا کر کامیاب ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہر شہر اور قصبہ کی معزز پیشہ ور جماعتوں میں سربرآوردہ لوگ اکثر باہر والے ہوتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر وطن میں بھی اُن کو یہی ترقی و امتیاز نصیب ہو سکتا تو احباب اعزہ کو چھوڑ کر دُور کیوں بستے۔ سفر کے متعلق عربی کی یہ مشہور مثل ہے "السفر وسیلۃ الظفر و مونۃ السقر" انقلابات زمانہ سے سفر نے ظفر کے تو صدہا نئے راستے نکال لیے مگر اب وہ سقر نہیں رہا اور قیام سے بدرجہا پر لطف و راحت رساں بن گیا ہے۔

ہندوستان میں صدہا برس کی فرقہ بندی اور مذہبی رسم و رواج نے اُنگلیں اسدرجہ پامال کردی ہیں کہ ان کے سرچشمے اَٹ گئے۔ معاشی آزادی سلب کرتے کرتے اس کی خواہش و خیال دل سے محو ہوگئے۔ ہر ایک کا پیشہ اور اُسکی ترقی کا معیار نسلاً نسل کے واسطے مقرر کردیا کہ اس سے

سرمو تجاوز کسی طرح ممکن نہ تھا۔ رہا سفر آج تک پابندِ مذہب ہندوؤں کو سفر میں بیجد دقتیں پیش آتی ہیں۔ البتہ جو مذہب کو پس پشت ڈال چکے ہیں اُن کا ذکر نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت کچھ خدا داد استعداد او۔ ذہانت قدیم استبدادی نظام سے ضائع ہوتی رہی۔ البتہ کچھ دنوں سے جو جدید اثرات نے پُرانی بندشیں توڑ ڈالیں۔ تو ادنیٰ طبقوں میں کچھ جان پڑنے لگی ہے۔ انکو اپنے انسانی حقوق یاد آنے لگے۔ انکو اپنی استعداد کا پتہ چلتا جاتا ہے۔ آزادی کی ہوا سے ان کے دل میں بھی ترقی کی پھریری آگئی۔ ادنیٰ طبقوں کی بیداری نہ صرف اُنکو فائدہ پہنچائے گی بلکہ اعلیٰ طبقوں کی غیرت وحمیت پر بھی جو جیس ہوگئی ہے تازیانہ لگا کر خوابِ خرگوش سے بیدار کرے گی اور سب کو شاہراہ ترقی پر لے چلے گی۔

(۵) عام معاشرت اور اخلاقی حالت کا بھی کارکردگی پر نہایت اہم اثر پڑتا ہے۔ صحبت کا اثر مشہور ہے۔ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اور پھر بچوں کی طبیعت موم جیسی نرم ہوتی ہے جس سانچے میں چاہو ڈھال دو۔ پس جس فرقہ کا طرز معاشرت ہمت افزا اور جدید پرور ہے، وہ لوگ بالعموم لبن خیال۔ عالی حوصلہ اور مرفہ الحال ہوتے ہیں۔ چنانچہ تجارتی مرکزوں کے مصروف کار اور پس ماندہ قصبوں کے کاہل پسند باشندوں کی حالت کے موازنہ سے معاشرت کا اثر بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ ہندوستان کے سکون پسند نوواردکو انگلستان کی ہلچل سب سے زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ جسے دیکھو چیونٹی اور شہد کی مکھی کی مانند اپنے کام میں پوری تندہی اور توجہ سے مصروف۔ لمحہ لمحہ جان سے زیادہ عزیز۔ ہفتہ میں ایک روز اتوار آرام کے واسطے مخصوص اور اُس روز کاروبار قانوناً ممنوع۔ وہ کام کے شوق میں لوگ صحت قربان کر گزرتے ہیں۔ ہندوستان میں اس گرم جوشی کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا۔ اور نووارد یورپین کو یہاں کی سہل انگاری افسردہ دلی اور وقت کی ناقدری کچھ کم عجیب معلوم نہیں ہوتی۔ کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ شہر شہر اور قصبہ قصبہ میں بہبودی کی امنگ اور کاروبار کا شوق پیدا کرنا ہندوستان کی ترقی کا پہلا قدم ہے۔

اخلاق و عادات کا اثر بھی تندرستی وصحت پر نہایت قوی اور دیرپا پڑتا ہے۔ آج کل بدقسمتی سے

بہت سے نوجوانوں کی پس ماندگی، خستہ حالی اور دائم المرضی کا باعث خود اُنکی غلط کاریاں، بے اعتدالیاں اور اخلاقی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ نہ معلوم بعض لوگوں کی یہ شکایت کہاں تک درست ہے کہ مشرقی اقوام کو مغلوب اور پسپا کرنے کی غرض سے ترقی یافتہ قومیں قصداً اخلاقی کمزوری کا خوفناک آلہ اپنے مفید مطلب استعمال کر رہی ہیں۔ اور خصوصاً بادہ نوشی و آوارگی کا رواج جو قوموں کو دیمک کے مانند کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ جونک کے مانند خون چوس لیتی ہیں۔ اُنکی سیاسی پالیسی کا جزو بنا ہُوا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ عاداتِ ملعونہ شعلہ کی طرح ہر چہار طرف پھیل رہی ہیں۔ اکثر شہروں کی حالت اخلاقی لحاظ سے تشویش ناک ہو چلی ہے۔ اسکول اور کالجوں کی حالت ابھی تک تو غنیمت ہے مگر اثرات وہاں بھی راستہ پیدا کر رہے ہیں۔ اور اگر جلد مدافعت و حفاظت کا کافی اہتمام نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ قوم کا بہترین حصّہ جس کی ذات سے ملک کی بیشمار امیدیں وابستہ ہیں، ان موذی اثرات کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دے گا۔ لہٰذا بہی خواہانِ ملک کا اولین فرض ہے کہ اس آتش جاں سوز کو جلد بجھائیں۔ لوگوں میں نہ صرف اپنی تحریر و تقریر بلکہ اپنے عمل اور ذاتی مثال سے اعتدال پسندی، پاک بازی، بلند خیالی اور جدو جہد پسندی کی مستقل عادتیں پیدا کر کے اُن کو شاہراہِ ترقی پر لگا لائیں۔ اگر اخلاق کی نگہداشت نہ کی گئی تو عاداتِ خبیثہ جن کا طوفان ہر طرف بڑھ رہا ہے دیکھتے دیکھتے اس بدبخت ملک کو زنگ خوردہ لوہے کے مانند از کار رفتہ کر دیں گی۔

بد اطواری کی ابتدا ہمیشہ نادانی اور اشتیاق سے ہوتی ہے۔ مبتدی کو مضرت کی تو کچھ خبر ہوتی نہیں دوسروں کی مثال یا ترغیب سے تقلید کا شوق پیدا ہوتا ہے اور چند قدم بڑھاتے ہی ایسی دلدل میں جا پھنستا ہے کہ صحیح سالم نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ بچے سب سے زیادہ والدین پر اعتماد کرتے ہیں اُنھیں کی بات وہ سب سے زیادہ مانتے ہیں۔ اگر والدین اس معاملہ میں مروجہ مُہرِ سکوت توڑ ڈالیں اور سب سے اول خود عاقلانہ طریقہ سے بچوں کو تمام ضروری باتوں سے آگاہ کر کے اُن کے اچھے بُرے نتائج بخوبی ذہن نشین کر دیں تو ممکن نہیں کہ جس طرح بچے کی نرم طبیعت اور باتوں سے متاثر ہوتی ہے اس سے نہ ہو۔ اور اس اثر کا زنگ افعال و عادات پر نہ چڑھے۔ یہ عام خیال صحیح نہیں کہ اس قسم

کی آگہی سے بچے بگڑ جائیں گے۔ موزوں وقت پر یعنی قبل رسائیِ اثراتِ بد اگر مناسب طور سے صحیح واقفیت بچوں کے ذہن نشیں کردی جائے تو محفوظی کا اس سے زیادہ کارگر کوئی طریقہ نہیں۔ چنانچہ ایک ماہرِ تربیت نے والدین کی موجودہ خاموشی اور بے التفاتی کو سراسر خلاف عقل و مصلحت قرار دیکر مذکورۂ بالا طرز عمل کی بہت تاکید کی ہے اور ہم بھی اس رائے سے پورا اتفاق کرتے ہیں۔

چو کارے بے فضولِ من بر آید — مرا در وے سخن گفتن نشاید
وگر بینم کہ نابینا و چاہ است — اگر خاموش بنشینم گناہ است

(۶) اس زمانہ میں ہر قسم کے کام اور پیشوں کے واسطے تعلیم کس قدر ضروری ہے اور ہوتی جاتی ہے؟ ہر سمجھدار آدمی خود اندازہ کرسکتا ہے۔ مولانا حالیؔ مرحوم نے علم کی ضرورت کا فوٹو اپنی مشہور نظم میں کس خوبی سے کھینچا ہے :۔

گیا دَورِ حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری — جہاں میں چار سُو علم و عمل کی ہے عملداری
جنھیں دُنیا میں رہنا ہے رہے معلوم یہ اُن کو — کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری
ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن اور صناعت میں — نہ چل سکتی ہے اب بے علم بجاری نہ معماری
جہاں علمِ تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر — تجارت کی نہ ہوگی تا قیامت گرم بازاری
نہ آئے گی پسند اُن نوکروں کی خدمت و طاعت — جنھیں پائیں گے آقا زیورِ تعلیم سے عاری
اگر چاہیں گے کرنی آدمی گھوڑوں کی سائیسی — تو دینا ہوگا اُن کو امتحانِ علم بیطاری
کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز — نہ فصادی نہ جرّاحی نہ کحّالی نہ عطاری

جہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرماں روائی ہے
جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے

اب غور کیجیے کہ موجودہ طریق تعلیم کہاں تک ہمارے درد کی دوا اور ہماری ضروریات کا کفیل ہے پنجاہ سالہ کوششوں کے پھل کرورہا روپیہ تعلیمی مصارف کے ماحصل ترقی کے زندہ آثار۔ سرمایۂ نازو افتخار ہمارے نوجوانوں کے کمالات پر ذرا ایک نظر دوڑائیے۔ ایک انبوہِ کثیر سرگرداں و حرماں نصیب

سائلوں اور امیدواروں کا۔ ایک جم غفیر سپاس گزار و فرماں بردار محرروں کا۔ ایک روز افزوں گروہ نزاع پرور وجدال پسند وکیلوں کا۔ دو فرقے آزاد کیش اور مصلحت اندیش وکرم جو معزروں کے اور سب سے چھوٹی جماعت خوددار و متانت شعار کارگزاروں کی جو صنعت و حرفت۔ زراعت و تجارت کو ترقی دیکر صحیح اصول کے مطابق ملک کی بہبودی اور مرفہ الحالی کے وسائل پیدا کرنے میں مشغول ہیں۔ مطالبات جیسے چاہو اعلیٰ، ہمت جتنی چاہو پست۔ قول بغایت فصیح و بلیغ، عمل نہایت بدسلیقہ و بے ترتیب۔ نہ خیالات میں تمکنت نہ جدوجہد میں استقلال۔ جذبات سریع الاشتعال، ارادات سریع الزوال اکثر منصوبے کڑھی کا اُبال بقول حضرت اکبر:۔

ضعفِ مشرق نے تو رکھا پاؤں کو جکڑا وہی
مغربی فقروں نے لیکن مُنھ کو انجن کر دیا

ہمارے جیسے بے اصول اور نامکمل طریق تعلیم سے اور کیا نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ جسم کے تمام اعضا کو معطّل کرکے دماغِ مجسم بننے کی کوشش کا نتیجہ اضمحلال، مرض اور مَوت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کامل صحت اور تندرستی کے واسطے تمام اعضاء کا قوی ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح قومی عروج بھی اخلاقی، معاشرتی اور بالخصوص معاشی حالت کی عمدگی بغیر محض دماغی ترقی پر قائم نہیں ہوسکتا۔ افراد کیا ہیں۔ جسم قوم کے بمنزلہ اعضاء اور ہر عضو کا کام جداگانہ و مخصوص ہے۔ اگر کسی عضو کو معطل کیا جائے یا کار مخصوص کی بجائے اُس سے دوسرا کام لینے کی کوشش کی جائے تو ممکن نہیں کہ جسم قوم کی صحت و قوّت کو مضرت نہ پہنچے۔ کیسے ممکن ہے کہ تمام لوگ ادیب زباں داں، مورخ، فلسفی، ھندسی، طبیعی یا عالم آلہیات بن جائیں۔ اور اگر ایسا ہو بھی تو اس کا نتیجہ نظام عالم کی برہمی نہیں تو اور کیا ہوگا۔ بہت سے بدقسمت نوجوان اپنا قیمتی وقت اور بہت سا روپیہ مروجہ تعلیم میں ضائع کرکے ناکام و نامراد رہ جاتے ہیں۔ لیکن ان میں بہت سے صنعت و حرفت کے واسطے ایسی موزوں طبیعت اور اس قدر وافر استعداد رکھتے ہیں کہ اگر اُنکو ٹیکنیکل تعلیم میسر آسکتی تو بہت بڑی کامیابی اور نام و نمود حاصل کرتے۔ بجائے بار کے سہارا اور بجائے عار کے سرمایۂ افتخار بن جاتے۔ ان لوگوں کی خداداد قابلیتیں

کا خون اور انکی بربادی کا گناہ ہمارے ناقص طریقۂ تعلیم کی گردن پر نہیں تو اور کس پر ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ یورپ کا عروج و اقتدار ادنیٰ مزدوروں، صناعوں، پیشہ وروں اور تاجروں کی کارگزاری کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ طبقے ہیں جو بجا طور پر قومی ریڑھ کی ہڈی کہلاتے ہیں۔ حکومت اور سوسائٹی میں ان کا روز افزوں رسوخ و احترام ان کی اہمیت کا بیّن ثبوت ہے۔ لیکن ہمارے طریق میں ان کی ضروریات کو خدا جانے کیوں اس قدر نظر انداز کیا گیا ہے۔ لبرل تعلیم تو بُری بھلی میسر بھی آجاتی ہے لیکن ٹکنیکل تعلیم بجد نایاب ہے۔ ہم لبرل تعلیم کو غیر ضروری اور غیر مفید نہیں سمجھتے لیکن قومی تعلیم کو اسپر ختم کرنا سخت مہلک خیال کرتے ہیں لہذا جب تک کافی اہتمام نہ ہو جائے ہم کو تمام تر کوشش اور روپیہ ٹکنیکل تعلیم کی بہم رسانی اور ترویج پر صرف کرنا لازمی ہے، تاکہ قومی ترقی کے تمام شعبوں میں ضروری نسبت قائم ہو جائے اور کوئی ایک بھی کمزوری اُسکی باقی تمام قوتوں کو بیکار نہ کر سکے جس طرح کہ مضبوط زنجیر کے تمام حلقے فرداً فرداً مضبوط ہونے لازمی ہیں قومی قوت کے واسطے بھی ادنیٰ سے لیکر اعلےٰ تک تمام فرقوں کا حسب ضرورت خوشحال اور اپنے کاروبار میں ہوشیار ہونا ضروری ہے پس صاف ظاہر ہے کہ نام نہاد مروجہ لبرل تعلیم سے ٹکنیکل تعلیم کی ہمارے ملک کو کہیں زیادہ ضرورت ہے اور اسکے اہتمام میں کوشش کرنا ہر ایک خیرخواہِ قوم کا فرض ہے۔

ہندوستان میں جیسی کمتر مفید تعلیم مروّج ہے ظاہر ہے۔ اور اُسپر طرہ یہ کہ وہ بھی روز بروز گراں اور کمیاب ہو رہی ہے۔ فیس میں اضافہ، کورس میں ہر سال تبدیلی، ہر کلاس میں طلبا کی تعداد مقرر۔ معلموں میں ضروری قابلیت کی قلّت، تعلیم میں عدم توجہی، امتحانات میں سخت گیری، بمشکل ناکامیابی اخراج، ملازمت سے انکار، عمر دولت محنت سب برباد، خستہ حالی و تلخ کامی ماحصل۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ۔ خود یورپ میں تعلیم خانقاہوں سے پھیلی۔ جاپانیوں نے بھی جھونپڑوں برآمدوں اور سرِراہ دوکانوں میں تعلیم حاصل کی۔ مگر ہماری تعلیم کے واسطے عالیشان عمارات، بیش بہا سامان اور امیرانہ ٹھاٹھ لابُد ہیں۔ حضرت اکبرؔ نے ہماری بیش قیمت تعلیم کا کیا نقشہ کھینچا ہے

قومی ترقی کی رادھا پیاری
بیٹھی ہے پہنے جوڑا بھاری

نو من تیل کی فکر ہے طاری		چندے کی تحصیل ہے جاری

ہم کو کالجوں سے زیادہ پرائمری مدارس کی ضرورت ہے تاکہ عوام حرف شناس اور شُدبُد سیکھ کر اپنے سیدھے سادھے کام بطریق احسن سرانجام دے سکیں اور اعلیٰ تعلیم کے واسطے بھی میدان وسیع ہو جائے زیادہ مصارف کی ضرورت نہیں۔ صرف کوشش اور اہتمام درکار ہے۔ مقامی امداد سے ایسے مدارس بہ آسانی چل سکتے ہیں۔ مسٹر گوکھلے مرحوم کو جنھوں نے نمایشی اور دلاویز باتوں سے بچ کر اپنی تمام عمر مفید تجاویز کی تکمیل میں صرف کی پرائمری تعلیم کا خیال پیدا ہُوا تو اُنھوں نے پرائمری ایجوکیشن بل کا ایک نہایت قابلانہ مسودہ امپیریل کونسل میں پیش کیا اور گو انکا بل رد ہوا اور ہونا تعجب نہیں لیکن اگر زندگی وفا کرتی تو مرحوم کی کوشش کا کوئی نہ کوئی مفید نتیجہ ضرور نکلتا۔ اور یہ نتیجہ کیا کم ہے کہ عام لوگوں کو پرائمری تعلیم کی ضرورت اور اُسکے اہتمام کا طریقہ مرحوم کی تحریروں اور تقریروں سے ذہن نشین ہو گیا۔ اور نیز بعض بیدار مغز ریاستوں مثل بڑودہ و میسور میں پرائمری تعلیم کا رواج خاص اہتمام سے شروع ہو گیا اور انشاءاللہ تعالیٰ اُسکے نتائج بھی جس سے خوشامدی یا خود غرض لوگ منکر ہیں، چند ہی روز میں ظاہر ہو جائیں گے۔

کاش ہمارے لیڈر جو محض سیاسی قیل و قال کو اپنا ورد بنائے ہوئے ہیں اور دھواں دھار تقریریں اور فلک رسا پیرز جن کے دلوں کو محو کیے ہوئے ہیں اس نکتہ پر غور کریں کہ عالیشان عمارت کے واسطے مضبوط بنیاد، اور بار آور درخت کے واسطے زرخیز زمین لازمی ہیں۔ سیاسی آزادی حریت کے نعرے لگانے سے نہیں ملتی۔ بلکہ علمی ترقی، ارادی قوّت، اخلاقی جرأت اور معاشی استحکام اُسکے شرائط اولیں ہیں۔ اور بحالتِ پابندی و محکومی اُنکو پورا کرنا ہی تو جوانمردوں کا کام ہے۔ گرما گرم تقریروں سے فوری جذبات کو جس قدر جی چاہے اُبھاریے۔ اُجرتِ تحسین نقد وصول کیجیے۔ مگر عملی کوشش کی تکالیف و محنت برداشت کیے بغیر محض باتوں سے تعلیم نہیں پھیلتی۔ اخلاق درست نہیں ہوتے۔ زراعت۔ صنعت و حرفت اور تجارت ترقی نہیں کرتے۔ جو لوگ نام و نمود کی بجائے ملک کی بہبودی کے خواہاں ہیں ان میدانوں میں کمر باندھ کر اُتریں اور قومِ لنگ پاکی دستگیری

کریں۔ اسوقت قدر نہ ہو، مگر آیندہ نسلیں یقیناً اُنکی شکرگزار اور احسان مند ہونگی۔ اور حقیقی محبان وطن کی مختصر فہرست میں اُنکا نام آبِ زر سے لکھا جائیگا۔ تالاب کے کنارے خواہ کتنے اونچے اور مضبوط ہوں، پانی کی سطح بلند کیے جاؤ، ایک نہ ایک دن پانی بالآخر اُبل پڑے گا اور اپنا رستہ آپ بنالے گا۔

کام کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ ہر شخص مناسب و موزوں کام اپنے اپنے ذمہ لیکر خموشی اور تندہی سے مصروف ہوجائے۔ چنانچہ سمجھدار فرقوں کا کچھ دنوں سے یہی طرزِ عمل نظر آتا ہے۔ خدا دوسروں کو بھی توفیق دے

محمد الیاس برنی

***

"ہمارا جھوپڑا"

راحت و عیش کے ساماں ہیں میسر تجھ میں
خوب آرام ہے اے پھوس کے چھپر تجھ میں

فصلِ باراں میں حفاظت کا سہارا تُو ہے
قصرِ بلند سے زیادہ ہمیں پیارا تُو ہے

لوگ محلوں میں بصد ناز و نعم سوتے ہیں
تیرے سائے میں پڑے چین سے ہم سوتے ہیں

بس راحت ہے جو تجھ میں وہ گلستاں میں نہیں
سادگی تجھ میں ہے جو وہ کسی ایواں میں نہیں

جس گھڑی چرخ پہ گھنگھور گھٹا آتی ہے
شب کے سنّاٹے میں راحت تری بڑھ جاتی ہے

کاٹی کٹتی جو نہیں ہجر کی راتیں ہم سے
شمعِ بالیں سے ہوا کرتی ہیں باتیں ہم سے

بے قراری دلِ بیتاب کی کھو دیتی ہے
اشک بہتے ہیں ہمارے تو وہ رو دیتی ہے

ہم جو کہتے ہیں کہ تُو کس کے لیے جلتی ہے
رو کے کہتی ہے کہیں آئی ہوئی ٹلتی ہے

شمع کے ساتھ جلا کرتے ہیں شب بھر تجھ میں
آگ لگ جائے نہ اے پھوس کے چھپّر تجھ میں

رات بڑھ جاتی ہے سو جاتے ہیں سونیوالے
شمع اور ہم یہی دو رہتے ہیں رونیوالے

دل خدا جانے کسے یاد کیا کرتا ہے — جانِ برباد کو برباد کیا کرتا ہے
جو مقدر کی طرح ہم سے خفا رہتا ہے — دھیان اپنا اُسی کافر میں لگا رہتا ہے
ڈھونڈھتے خاک اُسے وہ ہمیں کیونکر ملتا — جو تصور میں نہیں ہم سے ستمگر ملتا
اُس کو نفرت ہوئی جو سب سے ہے پیارا ہم کو — آنکھ وہ پھر گئی جس آنکھ نے مارا ہم کو

حسن کا چاند بنائے گا کبھی گھر تجھ میں
کبھی آئے گا وہ اے پھوس کے چھپر تجھ میں

پھیل جائے گا سرِ چرخ جو کالا بادل — لوٹ لیتا ہے شبِ مہ کا اُجالا بادل
رعد کا شور ہے رہ رہ کے زیادہ اُٹھتا — پی کہاں کہہ کے پپیہا بھی ہے چلا اُٹھتا
بھر دیے ابر نے جل تھل ہُوا عالم شاداب — روئے جاناں سے رُخِ دہر نہیں کم شاداب
راستوں میں کوئی آتا نہ کوئی جاتا ہے — عالمِ آب زمانے میں نظر آتا ہے
بیٹھنے والے نہ تھے قصر مگر بیٹھ گئے — ایسی برسات ہوئی سیکڑوں گھر بیٹھ گئے

جگرِ خستہ جگر کو جو ملا گھر تجھ میں
بچ گئی جانِ حزیں پھوس کے چھپر تجھ میں

حکیم جگرؔ صدیقی

حسرتیں رخصت ہوئیں سب عاشقِ دلگیر سے — دل بھی نکلا جان بھی نکلی لپٹ کر تیر سے
پہلے شوخی سے لگائے زخم پر ہنس ہنس کے زخم — اب کھڑے ہیں منھ چھپائے دامنِ شمشیر سے
کچھ کمر میں آ گئے کچھ زلف پُر خم بن گئے — بل حسینوں نے لیے کیا کیا مری تقدیر سے
کس ادا سے قہر سے ترچھی نگہ سیدھی ہوئی — بچ گیا جب یہ دلِ وارفتہ اُن کے تیر سے
آ گیا زنداں میں شاید کوئی آتش زیرِ پا — آج شعلے اُٹھ رہے ہیں خانۂ زنجیر سے
مہرباں اپنے تغافل سے ذرا تم پوچھ دو — کیا کوئی اُمید اب رکھوں نہ میں تقدیر سے
بام پر آتے نہیں فریاد سننے کے لیے — وہ بھی کیا ڈرتے ہیں صفدرؔ آہ کی تاثیر سے

مستانی جوگن اور اورنگ زیب

ریلوے اسٹیشن جیسا ویرانہ آبادنما مقام چاہے وہ لکھنؤ شریف ہی کا ہو اور پھر اُس پہ سردی۔ تنہائی اور بیکاری جیسے ایک چھوڑ تین تین دشمنانِ سکونِ خاطر! نتیجہ یہ کہ میں پریشان تھا اور سخت پریشان۔ ویٹنگ روم میں جاکر آرام کرنے اور ریفریشمنٹ روم میں بیٹھ کر ناشتہ کھانے کے لیے روئے بایدو فیشنے شاید۔ لیکن میرے پاس چھٹی داڑھی اور میلی اچکن کی وجہ سے نہ یہ نہ وہ۔ وھیلر کمپنی کی دوکان بند۔ ہیوٹ اسکول کی دوکان بند۔ بائبل سوسائٹی کی دوکان بند۔ عجائبات لکھنؤ کی دوکان بند۔ چار و ناچار وہی آہنی تپائی یا پلیٹ فارم پیمائی۔ کچھ وقت اسٹیشن کی دیواروں کے کالے پیلے تجارتی اشتہاروں کی دیکھ بھال میں گزرا اور کچھ ٹائم ٹیبلوں کی جانچ پڑتال میں لیکن اب بھی تین گھنٹے باقی ہیں۔ اُف وہ! یہ کالا پہاڑ کیسے کٹ پائے گا!!

"حضور۔ کچھ کتابیں ملاحظہ فرمائیے گا؟"

اگر میں کتابوں کا کیڑا نہ بھی ہوتا تب بھی اُس شخص کے لیے جو ایک سو اسّی منٹ کے خلیج حائل کو دیکھ دیکھ کر بدحواس ہو رہا ہو یہ آواز جس حد تک ایک نغمۂ سکون آور اور نوید روح پرور کا کام دے سکتی ہے اُس کا اندازہ آپ فرما سکتے ہیں۔

"نہایت خوشی سے۔ دکھائیے کیا کیا کتابیں ہیں"

(کتابوں کا پشتارہ کھول کر) "یہ ملاحظہ کیجیے۔ کپتان کی لڑکی۔ دو جورو کا شوہر۔ ایک بی بی چار میاں۔ شیطان کا غلام۔ لنگڑا بیرا۔ لولا صاحب۔ جنٹلمین بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی۔ بنگالہ کی مینا۔ اُلّو اور اُلّو کا پٹھا۔ ٹائیں ٹائیں فش۔ اڑا اڑا دھم۔ چوں چوں کا مربا۔ غنچۂ ناٹک۔ قانونِ اکلیسریا۔ موئیم"۔

"معاف کیجیے۔ یہ کتابیں میرے لائق نہیں"۔

اچھا سرکار یہ لیجیے۔ خنجرِ ہجر۔ تیغِ فراق۔ لذتِ وصل۔ تمھیں پہ پہلے مرتے تھے تمھیں پر اب بھی مرتے ہیں

حُسنِ بے پردہ۔ بمبئی کی ساری۔ بنارس کا لہنگا۔ لکھنؤ کا پائجامہ۔ پیرس کا گون۔ بتان خلخ لعبتانِ فرنگ۔ خوبانِ زردشتی۔ سبزہ رنگان بنگالہ۔

"معاف کیجیے۔ میں اِنکے لایق نہیں"۔

"اچھا حضور۔ یہ رُسوا صاحب کے ناول ہیں۔ یہ عاشق صاحب کے ناول ہیں یہ اودھ پنچ صاحب کے ناول ہیں یہ دلگداز صاحب کے ناول ہیں"۔

"یہ سب دیکھے ہوے ہیں"

اگرچہ وقت کا معتد بہ حِصہ اس طرح ختم ہُوا لیکن مجھے افسوس تھا کہ اِس تُودۂ مطبوعات۔ اس انبارِ مُصنفات میں ایک کتاب بھی ایسی نہ نکلی جو سود مندی کے لحاظ سے نہ سہی احسان مندی کے اظہار کے لیے ہی خرید لیتا۔ کتب فروش کے مایوس چہرے نے مجھے بھی متاسف کیا۔

"یہ باقی دو کتابیں کیا ہیں؟ کام کی ہوں تو لاؤ یہی خرید لیں"

اِس ایک ذرا سے فقرے۔ اس ایک شعاعِ امید نے اُس کی آنکھوں اُس کے ہونٹوں بلکہ اُس کے دل میں ایک ابتسامی اور ابتہاجی کیفیت پیدا کر دی۔

"حضور یہ مستانی جوگن ہے۔ بڑا بانکا ناول ہے۔ اور یہ حیات اورنگ زیب ہے۔ نہایت عمدہ کتاب ہے سویرے سویرے کچھ تو خرید لیے"۔

(دل میں) "مستانی جوگن! اس نام کا حافظہ پر ایک ہلکا سا نقش ہے مگر یاد نہیں کہاں سُنا یا دیکھا! یاد آگیا۔ جنوری کے الناظر میں اشتہار تھا جسے میں نے نادیدہ چھوڑ دیا تھا"۔

چنانچہ دونوں کتابیں نکلوا کر دیکھیں۔ حیاتِ اورنگ زیب کا مبحث و مضمون تو نام ہی سے ظاہر ہے لیکن یہ دیکھ کر ایک نہایت خوشگوار تعجب ہُوا کہ مستانی جوگن بھی اُس زمانہ کا قصہ ہے جب شاہجہاں کے چاروں بیٹوں نے تختِ ہندوستان کی بازی بدکر چوسر کھیلنی شروع کی تھی۔ مجھے عرصہ سے جنون ہے کہ جہاں تک دست رس ہو ہر اُس کتاب کو جس میں مرحوم و مظلوم اورنگ زیب اعلی اللہ مقامہٗ کا مُوافق یا مخالف خفیف سا بھی تذکرہ ہو ایک نظر دیکھ ضرور لوں۔ لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دونوں کتابیں

بیتابی کے ساتھ خرید لی گئیں۔ اب پڑھنے کی جلدی پڑی اور اب اس ہندوستانی ٹھگی کینی۔ اس کشتی کتب خانہ کا منٹ بھر ٹھیرنا دو بھر ہوگیا۔ چنانچہ بچارے کو کسی قدر کج خلقی کے ساتھ جس کا مجھے بہت افسوس ہے، رخصت کر دیا گیا۔

(۲)

یہ بالکل سچ ہے چاہے درست نہ ہو کہ مصنف کی شخصیت کو کتاب کی وقعت کے اندازہ میں بڑا دخل ہے۔ مجھے اورنگ زیب کے حالاتِ زندگی کی تلاش و تجسس ہے۔ میری عمر نہیں کہ نظیر آباد ناول ایجنسی یا لاہور بک ڈپو کے ٹکے گز کے ناول پڑھ پڑھ کر زندگی کے سوکھے درخت کو ہرا کروں۔ لہذا مجھے چاہیے تھا کہ اگر ایک ناول خرید بھی لیا تھا تو خیر مگر ہاتھ پہلے حیاتِ اورنگ زیب ہی کو لگاتا اور جب تک اُسے ختم نہ کر چکتا مستانی جوگن کی طرف آنکھ نہ اُٹھاتا۔ مگر مجھے خجالت آمیز اعتراف ہے کہ **مسٹر رومیش چندر دت** کی جلالتِ قدر نے مجھے مرعوب و مسحور کر دیا۔ اور اجازت نہ دی کہ مادرِ ہند کے ایسے بلند پایہ فرزند کو زحمت کشِ انتظار چھوڑ کر کسی غیر مشہور آدمی سے تکلم و تخاطب کروں۔

ابتدائی چند اوراق کا میدان رہرو نگاہ نے نہایت عقیدت مندانہ مرعوبی و مسحوری کے عالم میں طے کیا۔ اصل ناول چونکہ بنگالی حرف و لغت میں تھا اور یہ اُسکا ترجمہ ہے۔ اس لیے زبان کے متعلق جہاں کہیں راستے میں پستی و بلندی اور خس و خاشاک پایا اُسکا ذمہ دار مترجم و کاتب کو قرار دے کر آگے بڑھ گیا۔

اب کہیں کہیں خیالات کے چھوٹے چھوٹے ذرے جو باعتبارِ حقیقت اعتراضات کے اجزاء دیمقراطیسی ہیں راستے میں حائل ہو ہو جاتے ہیں مگر رہرو اُنھیں منتشر کر کر دیتا ہے باہمدگر متحد ہو کر تشکل نہیں ہونے دیتا۔

میم لتا چپ تھی۔ اُسکے چہرے پر انتہائی درجے کی اُداسی برس رہی ہے۔ جھکی ہوئی آنکھوں میں ڈبڈبا آنے والے آنسو اُس زمین پہ گر رہے تھے جہاں دو حرماں نصیب .... کھڑے ہوئے ہیں۔

ہیم لتا: "پیارے نریندر۔ کیسی باتیں کرتے ہو کیا ہیم کو چھوڑ دوگے۔ کیا تم نے آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی ..... کیا آپ کا ارادہ ہے رادلیجا کر عشق کی دشوار گذار گھاٹیوں اور پیچیدار راستوں میں

گم کردہ راہ بنا کر چھوڑے گا۔ کیا ہیم کی جان آپ کی قیمتی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اور اسکا گوشت پوست آپ کا نہیں؟ ہیم کی جان آپ کے ساتھ ہے جہاں جائیں گے سائے کی طرح رہے گی جس راہ کو اختیار کر رہے ہو میرے خیال میں کسی طرح مناسب نہیں۔"

زیب ار۔" آہ تمھارا خیال سر سے نہیں جاتا۔ تمھاری یاد دل سے نہیں جاتی۔ طبیعت سنبھلی اور پھر تمھاری موہنی مورت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اس کمبخت دل کو لاکھ لاکھ سمجھاتا ہوں مگر یہ تمہارا ایسا طرفدار ہو گیا ہے کہ میری ایک نہیں سنتا۔ ہائے تمھاری مفارقت وہ نوکیلی سنان ہے جو دل پر لگی اور جگر کو چھیدتی ہوئی پار نکل گئی۔ میں جاتا ہوں۔ جنم بھر کے لیے جاتا ہوں۔ رخصت کردو۔ زمین کا کز بنوں گا۔ کوہ و صحرا کی خاک چھانوں گا اور تمھاری یاد میں سر دھن دھن کر عدم کی راہ پکڑوں گا ایشور چاہے گا تو پرلوک میں ملیں گے۔"

ہیم کا صبر یارا نہ رہا چیخ اٹھی۔ گلے میں باہیں ڈال دیں۔ "پیارے نرنیدر مجھے جیتے جی مارے جاتے ہو ہیم تمھاری ہے۔ تمھارے سوا کوئی اس کا ہاتھ چھو نہیں سکتا۔" ہیم کے آنسو جاری ہیں۔ سسکیاں بھرتے بھرتے ہچکیاں آنے لگیں۔ نرنیدر نے ہیم کا ہاتھ نہایت پریم سے سینے پر رکھ کر چھوڑ دیا۔......

ہیم ہائے ہائے کر رہی ہے۔ مرضِ عشق کی سودائی ہے کوئی سمجھاتا نہیں۔ سر دھنتی ہے کوئی سنبھالتا نہیں۔ "پیارے نرنیدر کہاں جاتے ہو۔ خانہ برباد نرنیدر ادھر تو دیکھو تمھاری داسی ہیم بلک رہی ہے سمجھاتے نہیں۔"

کیا یہ شعلہ پوش تصویریں ایک بارہ تیرہ برس کی کنواری کنیا اور ایک چودہ پندرہ سال کے ناتجربہ کار لڑکے کی تصویریں اور کیا یہ گرم جوش تقریریں دو ٹھنڈے خون والے بھولے بھالے معصوموں کی تقریریں ہوسکتی ہیں؟ دبستانِ محبت میں ان بچوں کا پہلا سبق اور اس روانی سے منتہی کتابیں فرفر سنائیں کہ دلی لکھنؤ کے کہنہ مشق و اسوخت نویس اور ریختہ نگار شاعر بھی عش عش مان جائیں! مگر شک و شبہہ کی گنجایش نہیں۔ مصنف عالی مرتبت خود بنگالی سوسائٹی کا رکن فاعل اور ساتھ ہی اسکے انسانی جذبات و احساسات کا مصورِ کامل ہے۔ جب وہ یقین دلائے تو کیوں نہ باور آئے۔ یقیناً کامروپ دیس میں پریم کا روکھ پھولنے سے آگے پیدا ہوگا۔ اس خدشہ کو دفع کرکے میں نے پڑھا

شروع کیا۔

شاہ شجاع (صوبیدار بنگال اپنے دار الحکومت ڈھاکہ میں) یاران جلسہ کی صحبت میں بیٹھا ہے۔ امرا و رؤسا۔ افغان بمغل۔ فوجی جرنیل۔ بہادر راجپوت مودب بیٹھے ہوئے ہیں۔

عتیق خاں "اڑیسہ کی لڑائی میں نریندر کی بسالت و شجاعت دیکھی تھی۔ اس دربار میں بہت سے زور آور قوی پٹھان اور مغل بہادر ہیں مگر نریندر سے زیادہ جوان مرد اور قوی جوان غلام کی نظروں سے آج تک نہیں گزرا۔"

حضار مجلس عتیق خاں کی باتوں سے برگشتہ طبیعت ہو گئے۔ ایک کافر کی اس قدر تعریف داخل کفر سمجھا۔ چہرے لال ہو گئے۔ ڈاڑھیوں کے بال دانتوں میں۔

شاہ شجاع (مسکرا کر) "تم نے کافر کی بہت تعریف کی۔"

....

(نریندر زخمی ہو گیا اور جے سنگھ کے کیمپ میں بغرض علاج رکھا گیا۔ یہاں شہزادی جہاں آرا کی سہیلی زلیخا خدا جانے کیسے آئی اور نریندر پر عاشق ہو گئی۔ مسرور نریندر کو قتل کرنا چاہتا ہے)

زلیخا "......... بے قصور کو مارنے سے کیا تم کو خوشی ہو گی!"

مسرور "کس لیے اس کافر کو یہاں لائی۔ زلیخا کیا اس کا یہ قصور نہیں۔"

یہ اور اسی قسم کے اور خیالات دیکھ کر میرے پائے عقیدت کو لغزش ہوئی اور مولانا روم کا وصل و فصل والا شعر گنگنا کر آگے پڑھنا شروع کیا۔

اورنگ زیب نے جام زریں مئے لالہ فام سے بھر کر پیش کیا۔ مراد بے عقل و غش چڑھا گیا۔

اورنگ زیب "آج آپ کی خدمت کر کے آپ کو آسودہ کر چکا ہوں۔ آج ہماری مراد بر آئے گی۔"

مراد "تم سا فرماں بردار برادر نہیں پا سکتا......."

اورنگ زیب "......... پروردگار عالم اور حضرت رسول خدا کمیں میری ہوس پوری کر دیں تو اس زندگی میں فقیری لے کر کے چلا جاؤں۔" (یہ کہہ کر ایک گلاس بھر کر مراد کو دیا)

مُراد:۔ "اورنگ زیب! تم حقیقت میں بڑے ایمان دار اور خدا دوست ہو۔"

اورنگ زیب:۔ "معزز برادر! آج تو جاتا ہوں جنگ کے موقعہ پر ملاقات ہوگی۔"

مُراد:۔ "جائیے ...... تمہاری سعادت اور برادرانہ سلوک سے دل ازحد مسرور ہے۔"

اورنگ زیب کے مراد کو شراب پلانے کے تاریخی جہل کو گھناؤنے بہتان اور کمینہ طوفان سے قطع نظر کرکے۔ کیا ہندوستان کی قدیم و جدید تاریخ کے مصنف و ماہر کو اتنا بھی علم نہیں کہ اورنگ زیب مُراد سے ایک برس نہیں دو برس نہیں پورے چھ برس بڑا ہے؟ اور اگر یہ علم ہے تو کیا اتنی بھی خبر نہیں کہ بڑا بھائی چاہے کتنا ہی مکار و عیار اور چھوٹا بھائی کتنا ہی مغرور و سرشار کیوں نہ ہو پھر بھی مسلمان شہزادے تو درکنار مسلمان پڑھے لکھے معمولی درجے کے آدمی بھی بالمشافہ تقریریں بڑے بھائی کے لیے "تم سا فرماں بردار" "اورنگ زیب! تم ایمان دار ہو" "تمہاری سعادت سے دل مسرور ہے" اور چھوٹے بھائی کے لیے "آپ کی خدمت" اور "معزز برادر" استعمال نہیں کرتے؟ یہ تصویر صحیح تو نہ اُتری! خیر آگے پڑھنا شروع کیا۔

پرتاب تو دھنّ ہے۔ دنیا میں تیری مثال کوئی نہیں۔ تو دیوتا ہے یا انسان۔ شہنشاہ اکبر کی فتوحات کا سیلاب بھارت ورش میں پھیل چکا تھا ..... مارواڑ کے بڑے بڑے راجے سرِ اطاعت خم کرچکے تھے ہندو راجوں کی لڑکیاں شاہی حرم سرا میں داخل ہوتی جاتی ہیں۔ راجہ مان سنگھ کی بہن جودھا بائی محل خانۂ شاہی کی زینت بن چکی .... مہاراجہ مان سنگھ اکبر کے سالے اور شہزادۂ سلیم کے سُسرے تھے .... اکبر نے اس ممتاز شخص کو مہارانا پرتاب سنگھ کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ وہ اور ریاستوں کی طرح شاہی تعلقات بڑھائے۔ مان سنگھ چاہتا تھا کہ پرتاب سنگھ کے ساتھ صحبت گرم ہو۔ ایک ہی تھالی میں کھانا کھائے۔ لیکن مہارانا پرتاب کی طبیعت گوارا نہ کرتی کہ ملکشوں کے سالے مان سنگھ سے باہمی خورد و نوش ہو .... واہ رے دھرم کے پکّے پرتاب دھنّ ہے۔ تو نے چھتریوں کا نام ڈوبنے نہیں دیا۔

خدا کی شان! سب سے پُرانا ہندوستان زاسولین جو عرصہ تک ہندو مسلمان رعایا کا راعی رہا ہو جو

ہندی قومیت متحدہ کی نامور مجالس کی صدر نشینی کر چکا ہو۔ جو اتحاد و اتفاق کے مفاد اور اختلاف و افتراق کے مضار سے کما حقہٗ واقف ہو ایسی باتیں لکھ لکھ کر مسلمانوں کی منافرت کی خلیج کو اپنے قلم کی نوک سے کھود کھود کر اور چوڑا اور گہرا کرے! در ہند چو اُو کیے و آں ہم مُفسد!!

جس درجہ مرعوب و مسحور ہو کر کتاب شروع کی تھی مجھے اعتراف ہے کہ اُسی درجہ مایوس و منغض ہو کر ختم کی۔ ریویو نگاری یا نقائص شماری منظور نہیں۔ آزاد رائے یہ ہے کہ مصنف نے جس تصویر کو کھینچنا چاہا ہے یہی نہیں کہ وہ ہو بہو کھنچ نہ سکی بلکہ کہیں مکھی سے بھینسا ہو گئی، کہیں ہاتھی سے چیونٹی۔ ترتیب تسلسل مفقود ہے اور توازن و تناسب معدوم۔ نہ تاریخیت کی بُو ہے نہ واقعیت کا رنگ۔

شاہجہاں کی دِلّی میں درک شاہیوں کے دُود کشوں سے دھواں اُٹھ رہا ہے! اِک تاتار کا چارڈ سالہ مسلمان فقیر دھونی رمائے لمبی لمبی جٹاؤں کا جوڑا باندھے آسن مارے بیٹھا ہے۔ سامنے پیسے پڑے ہیں! شاہزادی جہاں آرا کے زنانے دربار میں زنیدزنا تھ جی دندناتے گھُس جاتے ہیں، جہاں نازنینیں شانِ دلربائی کے ساتھ آمیں آمیں کہتی ہوئی تخت کے پاس سربسجود کھڑی نظر آتی ہیں!

دل کسی طرح قبول نہیں کرتا کہ یہ مسٹر رومیش چندر دت کی تصنیف ہے۔ لیکن اگر اس بھیانک اور کاواک تصویر کا کیمرا حقیقتاً بکنگھم آشیانی کا دماغ ہی تھا جس میں ہمیں یقین ہے کہ یورپ کے ہزارہا بہتر سے بہتر ناولوں کے عکس پڑ چکے ہونگے تو اقتصادیات ہند۔ خطوط موسومہ لارڈ کرزن۔ اور تاریخ تمدن ہند قدیم کے فاضل مصنف کی، فسانہ نگاری کے کوچے میں واماندگی دیکھ کر دلگداز کے بڑھے ناولسٹ کی وقعت و عظمت ہماری نظر میں دہ چند بلکہ صد چند بلکہ ہزار چند ہو جاتی ہے کہ وہ غریب نہ سول سروس پاس ہے نہ لندن کی یونیورسٹی کالج میں پروفیسر رہ چکا ہے نہ برِ اعظم یورپ میں سالہا سال توطن و اقامت کر چکا ہے نہ ولایت کے نامور مدبّروں اور انشا پردازوں سے ہمسرانہ و دوستانہ مراسم رکھتا ہے پھر بھی جو تحریر اُس کا دست و قلم لکھ جاتا ہے اُسپر فوٹوگراف کی بے جان تصویر نہیں بلکہ سینوٹوگراف کی چلتی پھرتی تصویر کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہ جس مُلک اور جس زمانے کے جن لوگوں کا نقشہ کھینچ جاتا ہے پڑھنے والا اگر تنقید کی عینک اور تاریخ کی دُوربین لگا کر بھی دیکھے تو سچ مُچ یہی پائے گا کہ وہ اُسی ملک میں

چل پھر رہا ہے، اُسی زمانے میں رہ سہ رہا ہے، اُنھیں لوگوں سے مل جل رہا ہے۔ وہ ٹھیک اُنھیں کے خیالات و معتقدات کو سُنتا اور اُنھیں کے تمدن و معاشرت کو دیکھتا ہے۔ شرر کی اُستادی، قبولیت اور کامیابی کا اصلی راز یہی ہے کہ وہ اپنے ہر فقرے، ہر جملے بلکہ ہر لفظ کو قصے کے ملک، قصے کے لوگوں اور قصے کے زمانہ کی عین مطابقت اور مناسبت سے ڈھالتا ہے ورنہ طول و عرضِ ہند میں ایسے ناول نگاروں کی کمی نہیں ہے جن کا جاپانی ہیرو خواجہ حافظ کی زبان مستعار لیکر اظہارِ عشق کرتا ہے اور اپنی لنڈنی محبوبہ کے پان خوردہ اور مسی مالیدہ لب کے بوسے لے کر داغ کے اشعار میں اپنی خوش نصیبی پر اتراتا ہے۔ اب میں دوسری کتاب شروع کرتا ہوں۔

(۳)

کتاب کے ابتدائی اوراق پڑھتے ہی اسٹینلی لین پول کی ایک چھوٹی سی نیلی جلد والی کتاب کی صورت اُسی طرح آنکھوں میں پھر گئی جس طرح کسی جانے پہچانے شخص کی سڑی گلی لاش کو دیکھ کر اُس کے زمانۂ حیات کی شکل و صورت آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ پہلے سات صفحوں پر اکبر اعظم کی مدح وثنا میں قصیدۂ منثور پڑھا گیا ہے۔ مناقب و فضائل کی خوشبو اس قدر اُڑی ہے کہ معائب و رذائل کی بدبو دب کر رہ گئی۔ میں خوش ہوں کہ ممدوح ایک مسلمان پادشاہ ہے۔ چاہے وہ مسلمان پادشاہ آذر افروز، ہون سوز، بُعد راساز، ناقوس نواز، راکھی بیرا، قشقہ آرا، درشن دہ، مُکٹ نہ، سنگھاسن سوار، پوجا گزار، تثلیث سرا، بادہ پیا۔ اور اللہ شناس، رسول شناس، اسلام شناس، شرع شناس، کلمہ داں، قرآن داں، ختنہ داں، نکاح داں، روزہ گزار، نماز گزار، حج گزار، زکوٰۃ گزار ہی کیوں نہ ہو۔ خدا کرے مصنف صاحب پردادا کی نیکیوں کے طفیل میں پرپوتے کی بُرائیوں کو بخش دیں۔ ہائیں یہ کیا قصہ!

دارا شکوہ کے طرزِ عمل، چال چلن اور خیالات سے یہ بات ٹپکتی ہے کہ وہ استحکام سلطنت کیلئے ہر ضروری بات کو روا رکھتا۔ وہ اکبر کے قدم بہ قدم چلنا چاہتا تھا۔ اگر وہ وارثِ تاج وتخت ہوتا تو یقین کیا جاتا ہے کہ مغلیہ خاندان کی حکومت کو ہندوستان میں اِس قدر جلد زوال کی رُو نمائی نہ ہوتی جس قدر جلد کہ اورنگ زیب کے ہاتھوں سے تباہی آئی۔ شجاع تیز فہم اور دور اندیش جیت و چالاک در ہا در تھا

اُسے ہندو سرداروں پر موہنی ڈالنی آتی تھی۔ اُس نے مارواڑ کے راجہ جسونت سنگھ کو جو اُس زمانہ میں سرآمد راجگان ہند کہلاتا تھا اپنا حامی مددگار بنا لیا تھا۔ وہ ایرانیوں کو اپنا گرویدہ بنانے کے لیے اپنے کو شیعہ کہا کرتا تھا لیکن اُسکی ذات میں بڑا نقص یہ تھا کہ وہ عیش پرستی کو اپنا شعار سمجھتا تھا۔ وہ زنان خانہ کے اندر جاکر متعدد بیویوں میں رات رات اور دن دن بھر رقص و سرود اور مینوشی میں گزار دیتا تھا اس لیے کاروبار سلطنت میں اکثر ابتری واقع ہوتی تھی۔"

یہ سارے کے سارے فقرے ذہن میں ایسے تازے ہیں جیسے ابھی پڑھ چکا ہوں۔ مگر آج تو صرف مستانی جوگن ہی پڑھی ہے۔ لاؤ اُسی میں دیکھوں۔ ورق گردانی کرتے کرتے پچیسواں صفحہ۔ یہ لو یہ کیا ہے۔

> دارا شکوہ کے طرز عمل۔ چال چلن اور خیالات سے یہ بات ٹپکتی ہے کہ وہ استحکام سلطنت کے لیے ہر ضروری بات کو روا رکھتا۔ وہ اکبر کے قدم بہ قدم چلتا۔ اگر وہ وارث تاج و تخت ہوتا تو یقیناً مغلیہ خاندان کی سلطنت اس قدر جلد زوال کی رونما نہ ہوتی جس قدر جلد اورنگ زیب کے ہاتھوں سے تباہ ہوئی۔ شجاع تیز فہم اور دور اندیش چست و چالاک اور بہادر تھا۔ اُسے ہندو سرداروں پر موہنی ڈالنی آتی تھی۔ اُس نے مارواڑ کے راجہ جسونت سنگھ کو جو اس زمانہ میں سرآمد راجگان ہند کہلاتا تھا اپنا حامی مددگار بنا لیا تھا۔ لیکن اُسکی ذات میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ وہ عیش پرستی کو اپنا شعار سمجھتا تھا وہ زنان خانہ میں جاکر متعدد بیویوں میں رات رات اور دن دن بھر رقص و سرود اور مینوشی میں گزار دیتا تھا اس لیے کاروبار سلطنت میں اکثر ابتری واقع ہوتی تھی۔

فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میں" قدم بہ قدم چلنا چاہتا تھا" ہے اور دوسرے میں" قدم بہ قدم چلتا"۔ پہلے میں "یقین کیا جاتا ہے کہ" دوسرے میں "یقیناً"۔ پہلے میں" حکومت کو ہندوستان میں اس قدر زوال کی رُونمائی" ہے دوسرے میں" سلطنت اس قدر جلد زوال کی رُونما"۔ پہلے میں" تباہی آئی" ہے دوسرے میں" تباہ ہوئی"۔ پہلے میں" وہ ایرانیوں کو...... شیعہ کہا کرتا تھا" دوسرے میں یہ فقرہ حذف کر دیا گیا ہے۔ پہلے میں "کے اندر" ہے دوسرے میں" میں"۔ پہلے میں" رقص و سرود" ہے دوسرے میں" رقص اور سرود"۔ باقی

جوں کا توں ۔ الٰہی یہ توارد ہے یا ۸ ۷ ۳ ۔ لیکن رائے قائم کرنے میں جلدی نہ چاہیے
چنانچہ میں نے ٹھنڈے دل سے کتاب پڑھنی شروع کی ۔ جہاں جہاں ایسے فقرے ملے جن کا
نقش لوحِ حافظہ پر تازہ تھا اُن پر نشان کرتا گیا ۔ اور ختم کرنے کے بعد پہلی کتاب سے مقابلہ کیا ۔
میری اس تفتیش کا نتیجہ حسب ذیل ہے :-

حیات اورنگ زیب	مستانی جوگن	حیات اورنگ زیب	مستانی جوگن
ص ۱۳ سطر ۷ و ۸	ص ۲۵ سطر ۸ و ۹	ص ۲۶ سطر ۱ تا ۱۷	ص ۱۱۲ سطر ۲ تا ۱۶
ص ۱۳ سطر ۱۳ تا ۲۵	ص ۲۵ سطر ۹ تا ۱۹	ص ۲۶ سطر ۱۸ تا ۲۲	ص ۱۱۲ سطر ۱۹ تا ۲۲
ص ۱۴ سطر ۷ و ۸	ص ۲۵ سطر ۸	ص ۲۶ سطر ۲۳ و ۲۴	ص ۱۱۲ سطر ۲۴
ص ۱۴ سطر ۹ تا ۱۵	ص ۶۳ سطر ۱۴ تا ۱۸	ص ۲۷ سطر ۲ تا ۴	ص ۱۱۲ سطر ۲۵ و ص ۱۱۳ سطر ۱ و ۲
ص ۱۴ سطر ۱۹ تا ۲۱	ص ۶۳ سطر ۲۵ و ص ۶۴ سطر ۱ و ۲	ص ۲۷ سطر ۸ تا ۱۱	ص ۱۱۳ سطر ۲ تا ۵
ص ۱۹ سطر ۱۶ تا ۲۵	ص ۲۹ سطر ۱۲ تا ۱۸	ص ۲۷ سطر ۱۲ و ۱۳	ص ۱۱۳ سطر ۵ و ۶
ص ۲۰ سطر ۲ تا ۸	ص ۲۹ سطر ۱۸ تا ۲۳	ص ۲۷ سطر ۱۳ تا ۱۵	ص ۱۱۳ سطر ۶ تا ۸
ص ۲۰ سطر ۱۹ تا ۲۱	ص ۳۰ سطر ۲ تا ۴	ص ۲۷ سطر ۲۲ و ۲۳	ص ۱۱۳ سطر ۹ و ۱۰
ص ۲۰ سطر ۲۴ و ۲۵	ص ۳۰ سطر ۴ تا ۶	ص ۲۷ سطر ۲۴ و ۲۵	ص ۱۱۳ سطر ۱۰ و ۱۱
ص ۲۱ سطر ۱ تا ۸	ص ۳۰ سطر ۶ تا ۱۲	ص ۲۸ سطر ۳ تا ۷	ص ۱۱۳ سطر ۱۴ و ۱۵
ص ۲۱ سطر ۹ تا ۲۵	ص ۶۲ سطر ۱۲ تا ۲۵	ص ۳۵ سطر ۲۰ و ۲۱	ص ۱۱۳ سطر ۲۰ و ۲۱
ص ۲۲ سطر ۱ تا ۱۲	ص ۶۲ سطر ۲۵ و ص ۶۳ سطر ۱ تا ۱۳	ص ۳۵ سطر ۲۲ تا ۲۵	ص ۱۱۳ سطر ۲۱ تا ۲۴
ص ۲۲ سطر ۱۳ تا ۱۹	ص ۵۶ سطر ۷ تا ۱۳	ص ۳۶ سطر ۱ و ۲	ص ۱۱۳ سطر ۲۴ و ۲۵
ص ۲۳ سطر ۱ تا ۸	ص ۵۶ سطر ۱۳ تا ۲۰	ص ۳۶ سطر ۴ و ۵	ص ۱۱۳ سطر ۲۵ و ص ۱۱۴ سطر ۱
ص ۲۳ سطر ۹ تا ۲۵	ص ۶۷ سطر ۱۰ تا ۲۱	ص ۴۳ سطر ۴ تا ۹	ص ۱۱۴ سطر ۲۲ تا ۲۵ و ص ۱۱۵ سطر ۱
ص ۲۴ سطر ۱ تا ۴	ص ۶۷ سطر ۲۱ تا ۲۵	ص ۴۴ سطر ۲۴ و ۲۵	ص ۴۹ سطر ۱۲ و ۱۴
ص ۲۴ سطر ۱۶ تا ۲۵	ص ۱۱۰ سطر ۱۲ تا ۲۰	ص ۴۵ سطر ۱ تا ۶	ص ۴۹ سطر ۱۴ تا ۱۹
ص ۲۵ سطر ۴ تا ۷	ص ۱۱۰ سطر ۲۳ تا ۲۵ و ص ۱۱۱ سطر ۱	ص ۴۵ سطر ۷ و ۸	ص ۴۹ سطر ۱۹ و ۲۰
ص ۲۵ سطر ۱۲ تا ۱۴	ص ۱۱۱ سطر ۶ و ۷	ص ۴۶ سطر ۱ و ۲	ص ۵۰ سطر ۳ و ۴
ص ۲۵ سطر ۱۵ تا ۲۵	ص ۱۱۱ سطر ۸ تا ۲۵ و ص ۱۱۲ سطر ۱ و ۲	ص ۴۷ سطر ۱۲ تا ۱۵	ص ۱۱۵ سطر ۲ تا ۴

غضب خدا کا! ڈیڑھ سو صفحے کی ایک کتاب اور چھہتر کی دوسری، اور دونوں میں چالیس جگہ تو اُردو جن میں اکثر مقامات پر بجز چند لفظی اُلٹ پھیر کے صفحے کے صفحے نقل مطابق اصل۔ میں نیک نیتی سے مان لیتا کہ تاریخی واقعات دونوں نے ایک ہی کتاب سے لیے ہوں گے لیکن مستانی جوگن تو مسٹر رومیش چندر دت کی اصل بنگالی تصنیف کا اُردو ترجمہ ظاہر کیا جاتا ہے اور حیاتِ اورنگ زیب کسی صاحب سا آغر الہ آبادی کی مستقل اُردو تالیف کی حیثیت سے پیش کی جاتی ہے اس لیے اگر کسی فارسی یا انگریزی مشترک ماخذ سے تاریخی واقعات لیے بھی گئے ہوں تو ضرور ہے کہ ایک طرف تو بخط مستقیم بنگالی میں اور دوسری طرف براہِ راست اُردو میں لیے گئے ہوں اور جب عرصہ بعد بنگالی سے اُردو میں ترجمہ ہوا تو معنوی یکسانی رہتی تو رہتی، ایسی لفظی یکسانی کہ وہی اسماء، وہی افعال، وہی صفات، وہی ترتیب و تقسیم فقرات، وہی مرکباتِ اضافی وہی مرکباتِ توصیفی، وہی اشعار! یہی نہیں بلکہ جو غلطیاں لفظی یا معنوی یا تاریخی یا جغرافی ایک میں ہیں وہی دوسری میں جن کی نہایت موٹی موٹی چند مثالیں ملاحظہ ہوں "عیش پرستی کو اپنا شعار سمجھتا تھا" (۱۳/۴۵م) بجائے "عیش پرستی کو اپنا شعار کر لیا تھا"۔ "مراد کو خط لکھا جس میں اُسے سوات پر قبضہ کر لینے پر بارک باد دی" (۲۱/۴۴م) مراد نے اُس زمانے میں سورات پر قبضہ نہیں کیا تھا۔ "آیا وہ واقعی وعدے کو نباہے گا اُس کا بیڑا منجدھار میں غرق کر دیگا" (۲۲/۶۲م) دونوں جملوں کے بیچ میں "یا" رہ گیا ہے۔ "اورنگ زیب نے اپنے وعدے کے موافق آخیر ۱۶۵۸ء برہان پور سے مع فوج کے چل دیا" (۲۲/۶۴م) اس میں ایک غلطی تو زبان کی ہے اور ایک تاریخ کی۔ پنجاب میں جہاں حیاتِ اورنگ زیب چھپی ہوئی ہے ممکن ہے کہ "اورنگ زیب نے مع فوج کے چل دیا" بولتے ہوں مگر اُس شہر میں جو زبان کی اہلیت کے متعلق دلی کا رقیب ہو شاید ہی کوئی کہے کہ "منّے صاحب نے مع نوکر کے چل دیا"۔ تاریخ کی غلطی یہ ہے کہ تمام مورخ متفق ہیں کہ اورنگ زیب نے ۲۵ رجمادی الثانی ۱۰۶۸ھ کو برہان پور سے کوچ کیا ہے۔ مابعد کے مورخین نے جنھوں نے ہجری عیسوی سنین کا تطابق کیا ہے صاف ۲۵ رجمادی الثانی ۱۰۶۸ھ ہجری مطابق مارچ ۱۶۵۸ء عیسوی لکھا ہے (دیکھو ذکاء اللہ)۔ اس لیے مارچ ۱۶۵۸ء کو آخیر ۱۶۵۸ء نہیں کہتے۔ یہ صریح غلطی ہے۔ "اُس نے دارا کی فوج کے سپہ سالاروں کے پاس خفیہ پیغام بھیجے کہ اگر وہ اُس کا ساتھ دیں تو دولت و منصب مالا مال

اور نہال کر دیے جائیں گے۔ اور جو لوگ اسیر زیادہ ہو گئے اُنکو میانہ کے طور پر تھوڑی تھوڑی رقمیں بھجوا دی گئیں" (ح۲۲۳/م۱۰۹) یہ زبردستی کا بیانہ تھا۔ "فوج کی سرغنائی" بجائے "سرداری یا سرکردگی"۔ "سپہر شکوہ شاہزادہ محمود پر جا پڑا" (ح۲۲۵/م۱۱۱)۔ دونوں میں اورنگ زیب کے ایک بیٹے کا نام شاہزادہ محمود دکھایا گیا ہے مگر کوئی تاریخ اورنگ زیب کے کسی بیٹے کا نام محمود نہیں بتاتی۔ "خیال کیا کہ چپکے سے اپنے ہاتھی سے اُتر کر اورنگ زیب کے ہاتھی کی زنجیر کاٹ دے (ح۲۲۶/م۱۱۲)۔ باعتبارِ واقعہ غلط ہے۔ چپکے سے اُتر کر ایسی آسانی سے زنجیریں کچے دھاگے کی طرح کیسے کاٹ دیا؟" "اُس نے آواز نکالی" (ح۲۲۷/م۱۱۲) پنجاب میں تو بولتے ہیں لیکن کیا لکھنؤ بھی پنجاب کا مقلد ہو گیا؟۔ "وزیر آصف خاں کے بیٹے شایستہ خاں اور ممتاز محل کے بھائی نے اُس کی طرفداری کا وعدہ کیا" (ح۲۲۶/م۱۱۲) اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ آصف خاں کا بیٹا شایستہ خاں اور تھا اور ممتاز محل کا بھائی کوئی اور شخص تھا جس کا نام نہیں لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ طرزِ ادا کی غلطی ہے۔ آصف خاں کا بیٹا اور ممتاز محل کا بھائی ہی شایستہ خاں تھا۔ اِن حالات میں کیسے یقین کروں کہ یہ یکسانی اتفاقی ہے۔

حیاتِ اورنگ زیب بجائے خود تاریخ ہے اور مستانی جوگن تاریخی قصہ۔ اس لیے کیا یہ مانا جائے کہ مسٹر رومیش چندر دت جیسے تاریخ کے دریائے ذخار کا منبع و مخرج ایک چھوٹا سا ساغر ہے یا یہ سمجھا جائے کہ اورنگ زیب کی سوانح عمری لکھنے میں فرضی قصہ کہانیوں سے کام لیا گیا ہے۔ اصل ناول کا سنہ تصنیف تو معلوم نہیں لیکن ترجمہ کی یہ کیفیت ہے کہ ۱۴ راگست سنہ ۱۹۱۴ء کو سید علی عباس خوش نویس نے آخری صفحہ ختم کیا اور سنہ ۱۹۱۴ء ہی میں پہلی بار ترجمہ بنام مستانی جوگن شایع ہوا۔ لیکن حیاتِ اورنگ زیب سنہ ۱۹۱۲ء ہی میں چھپ چکی تھی۔ اس لیے اس بات کو ماننے کے سوا چارہ نہیں کہ جن چالیس مقامات پر عبارت یکساں ہے وہ اگر لی گئی ہے تو حیاتِ اورنگ زیب ہی سے لی گئی ہے لیکن میں نہیں مان سکتا کہ مسٹر رومیش چندر دت نے انگریزی فارسی مستند تاریخیں چھوڑ کر ایک غیر مشہور مؤلف کی پچہتر صفحے کی کتاب سے مدد لی ہو جسکا کاغذ قابلِ افسوس، جس کی چھپائی قابلِ شکایت، جس کی اُردو قابلِ اعتراض اور جس کے واقعات قابلِ اشتباہ ہیں اور مدد بھی اس طرح کہ بنگالی زبان کے ناول میں اس کتاب کی اصل اُردو عبارت بخط بنگالی لکھدی ہو ورنہ ناممکن ہے کہ بنگالی سے اُردو میں ترجمہ کرنیوالے نے حیاتِ اورنگ زیب دیکھے بغیر وہی الفاظ لکھے ہوں جو ساغر صاحب کے قلم

سے نکلے تھے۔

میری بڈھی عقل کے گھسے ناخن تو اس گتھی کے سلجھانے سے قاصر ہیں ممکن ہے کہ کوئی تیز طبع جوان اس عقدے کو حل کر سکے۔ اب رہی حیاتِ اورنگ زیب، اُسکے متعلق میں مطلق کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا کیونکہ جس کتاب کی تاریخی صداقت کی یہ کیفیت ہو کہ

(۱) اُس (یعنی شاہجہاں) کی وفات کے بعد بھی داراشکوہ اور اورنگ زیب کی تخت نشینی میں جہاں آرا اور روشن آرا نے بڑی مدد کی۔ صفحہ ۱۵

(۲) شاہجہاں کی وفات ۱۶۵۸ء میں ہوئی۔ صفحہ ۱۸

(۳) شاہجہاں کی وفات ۱۶۹۶ء میں ۷۶ برس کی عمر میں۔ صفحہ ۲۷

(۴) ۱۶۶۶ء میں شاہجہاں کا انتقال ہوگیا۔ صفحہ ۳۵

(۵) اورنگ زیب نے شرع میں ایک کتاب لکھی جسے فتاوےٰ عالمگیری کہتے ہیں۔ صفحہ ۱۶

(۶) مسلمانوں نے اورنگ زیب کے حالات ہی قلمبند نہیں کیے ہیں۔ صفحہ ۳۱

(۷) شاہجہاں نے اپنے باپ جہانگیر کو قتل کر کے تخت و تاج حاصل کیا۔ صفحہ ۳۲

(۸) میر جملہ جو دراصل بہمنی خاندان کی ایک شاخ عادل شاہی میں سے تھا۔ صفحہ ۵۶

(۹) عبدالرزاق لاری اورنگ زیب کی فوج سے مقابل ہوتے ہی مارا گیا۔ صفحہ ۵۶

اس میں اورنگ زیب کی نسبت عیار، مکار، گندم نما جو فروش، چال باز، بے اعتبار، قاتل، چنگیز اور قبلائی خاں تیمور اور یلدرم اور بوناپارٹ سے بدتر، مثیل نیرو قیصر روما اور اسکے سوا جو کچھ بھی لکھا ہو سب صحیح ہے۔ ایسی کتاب کے متعلق کچھ بھی لکھنا (چاہے وہ اعتراضاً ہی ہو) اُسکی شہرت و وقعت کو بڑھانا ہے اور اس گناہ کو میں اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔

مسافر

اس میں کیا شک ہے کہ عاصی ہوں گنہگار ہوں میں
شب تاریک سے بھی بڑھ کے سیہ کار ہوں میں

ہے خوشی اس کی کہ ہے نام ترا ربِ غفور
اس کا کچھ غم نہیں مجکو کہ گنہگار رہوں میں

باسط بسوانی

"طوفانِ باراں"

کیا زباں سے کہیں کیا نقشۂ باراں دیکھا آنکھیں کہتی ہیں کہ ہاں نوح کا طوفاں دیکھا
رہبرِ دہر کا بھی حال پریشاں دیکھا خضر کو محوِ الم۔ سر بگریباں دیکھا
کس کے دامن میں چھپیں ہائے زمانے والے
گم ہوئے آپ ہی جب پار لگانے والے

دردِ دل نے ہمیں اس دردِ جگر نے مارا کیا کہیں اپنی ہی آہوں کے اثر نے مارا
رو کے۔ ہم کو فلکِ شعبدہ گر نے مارا گردشِ شمس نے یا دورِ قمر نے مارا
پردۂ رحم میں اس قہر نے کھویا ہم کو
آبِ رحمت کے تلاطم نے ڈبویا ہم کو

فلکِ پیر نے کی خوں کی روانی دیکھو ظلم کرتا ہے۔ بڑھاپے میں جوانی دیکھو
شعلۂ برق کی بھی شعلہ فشانی دیکھو کیا تماشہ ہے کہ ہے آگ میں پانی دیکھو
کشتِ امید کو جب ابر بہا کر چھوڑے
برق کیوں خرمنِ حسرت نہ جلا کر چھوڑے

ہائے محشر کا نمونہ تھی یہ برسات نہ تھی ڈوب جاتا جو جہاں سارا کوئی بات نہ تھی
نام کو دن تھا مگر روشنی ہیہات نہ تھی نقشۂ پردۂ ظلمات تھی بس رات نہ تھی
کہہ سکے کون کہ کب شام و سحر ہوتے تھے
نہیں معلوم کہاں شمس و قمر ہوتے تھے

آج رونق پہ یہ کیوں گلشنِ ایجاد نہیں صحنِ گلزار میں گلچیں نہیں صیاد نہیں
نغمہ سنج آج یہ کیوں مرغِ چمن زاد نہیں خود فراموش ہیں۔ پھولوں کی انھیں یاد نہیں
ہوش اڑتے ہیں مگر قوتِ پرواز نہیں

بلبلِ زار بھی اب زمزمہ پرداز نہیں

عالمِ آب ہوا چار طرف جلوہ فگن ایک حالت میں ہوے سارے بیاباں گلشن
خیر سے لطف سے گزرا تھا مہینا ساون ہُوا آغاز جو بھادوں تو اُڑا رنگِ چمن

کام قاتل کا کیا اس نے مسیحا ہو کر
خونِ حسرت کا کیا دل کی تمنا ہو کر

ایسی بارش ہوئی ایوان و مکاں بیٹھ گئے دل کے سو ٹکڑے ہوے اہلِ جہاں بیٹھ گئے
کیا کہیں اے دلِ برباد کہاں بیٹھ گئے نام اُٹھنے کا نہیں لیتے جہاں بیٹھ گئے

چلتے چلتے ہی مُڑے۔ دُور سے در کو دیکھا
نگہِ یاس سے گرتے ہوے گھر کو دیکھا

چرخِ ظالم نے کیا اہلِ زمیں کو برباد خاک چھنوائی کیا قصر نشیں کو برباد
گھر کو ویران کیا اور مکیں کو برباد داغِ غم سے کیا ہر ماہ جبیں کو برباد

سرِ بازار جو یوسف سے حسیں بھی نکلے
نگہِ شرم بنے پردہ نشیں بھی نکلے

لوگ گھر سے جو نکلتے ہیں تو اُفتاں خیزاں سر پہ اسباب لیے گھر کا بغل میں ساماں
ننھا بچہ کبھی رہ رہ کے ہے نالاں گریاں دل میں کہتے ہیں کہ خالق کرے مشکل آساں

پردے پردے میں فلک نے نہیں دیکھا جن کو
کوچہ گردی کریں اس طرح حسیں وہ دن کو

اُف ری مجبوری کہ گرتے ہوے گھر کو چھوڑا لاش بھائی کی وہیں چھوڑی پدر کو چھوڑا
گھر کو سامان کو دیوار کو در کو چھوڑا خاک میں ملتے ہوے نورِ نظر کو چھوڑا

پیرہن جسم کا اُترا نہیں تکفین ہوئی
گوشۂ قبر میں پہنچے نہیں تدفین ہوئی

اودھ دریا کے کنارے کہیں کیا کیا دیکھا حشر انگیز عجب سیل کا نقشا دیکھا
کا تیوری تھی فضا۔ ساحلِ گنگا دیکھا گومتی کا یہاں بڑھتے ہوئے دریا دیکھا

لکھنؤ! تیری صدا کانوں میں ایسی گونجی
پانی پانی ہے ترے ذکر سے چیراپونجی[۱]

گنگ ہو گنگ، ترا اور سماں ہے اسدم تیرا ساحل بھی تو نظروں سے نہاں ہے اسدم
اب پرستش کو تری کون یہاں ہے اسدم جمگھٹا ہائے حسینوں کا کہاں ہے اسدم

جل بجھے آپ چراغوں کے جلانے والے
تیرے دامن میں چھپے پھول چڑھانے والے

چاہنے والے ترے تہ بہ فنا گوش ہوئے وصل تھا مدِ نظر کھنچ کے ہم آغوش ہوئے
حشر تک اب یہ نہ چونکیں گے وہ مدہوش ہوئے تیرے دامن میں چھپے ایسے کہ روپوش ہوئے

ڈوبنے والوں کو دم بھر کو اچھالا ہوتا
لا کے ساحل پہ انھیں پیار سے مارا ہوتا

رنگ دیکھو نہ مرے دیدۂ تر کا باسط حال پوچھو نہ مرے دردِ جگر کا باسط
کیا گلہ ہے فلکِ شعبدہ گر کا باسط قول سچا ہے کسی اہلِ نظر کا باسط

"چرخ کوکب ہے سلیقہ یہ ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"

باسط۔ بسوانی

قیامت سے بھی کچھ نکلتے ہوئے وہ آتے ہیں دل سب کے ملتے ہوئے
تری آرزو بھی ہے پردہ نشیں کہ دیکھا نہ اسکو نکلتے ہوئے
ملے تیرے ابرو گلے کٹ گئے غضب کے یہ جادو ہیں چلتے ہوئے
نہیں آنے والے جو جاتے رہے اب آئے ہو کیا ہاتھ ملتے ہوئے
لگا دو نہ آہ آرزو کا شجر نہ دیکھا کبھی اسکو پھلتے ہوئے

---

[۱] چیراپونجی واقع آسام اس ملک میں سب سے زیادہ بارش ہونے کا مقام ہے۔

ہندوستان میں صغیر سنی کی شادیاں

دُنیا میں شاید چند ہی ممالک ایسے ہوں (مثلاً جزائر سنک، سیام و کمبوڈیا) جہاں صغیر سنی کی شادی کا رواج اس قدر عام ہو، جیسا ہمارے مُلک ہندوستان میں۔ ہندوستان میں یہ رسم بہت قدیم زمانہ سے رائج ہے اگرچہ اکثر ہندو بر فارمر س، پردے کی طرح، اس رسم کے اجرا کا باعث بھی مسلمانوں ہی کو قرار دیتے ہیں لیکن جن لوگوں نے ہندوستان کی قدیم تاریخ کا بغور مطالعہ کیا ہے، وہ یقیناً اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ بیہودہ رسم بھی منجملہ دیگر فضول رسومات کے قدیم زمانہ جہالت کی نشانی ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ اسکے موجد وہ قدیم آریہ لوگ ہوں جنھوں نے ذات پات اور فرقہ بندی کی بنیاد ڈالی۔ ہندوستان کی معاشرت میں مغربی تعلیم و تہذیب کا اثر اگرچہ روز بروز ترقی کر رہا ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ ابھی اس قسم کی فضول اور قبیح رسومات کی گرفت سے سوسائٹی کو اب تک آزاد نہ کر سکا۔

ہندوستان میں یہ رسم اب بھی قریب قریب ویسی ہی رائج ہے جیسی زمانہ قدیم میں۔ اور اس براعظم میں بعض قومیں تو اس سختی سے پابند ہیں کہ اُنکے متعلق شاید یہ کہنا بیجا نہ ہو کہ اس رسم کو انھوں نے اپنے مذہبی فرائض میں داخل کر لیا ہے۔ یوں تو ہندوستان کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اس رسم کی کسی نہ کسی حد تک پابند نہ ہو (بجز اُن چند لاکھ دیسی عیسائیوں کے، جنھوں نے صرف تبدیل مذہب ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ مغربی طرزِ معاشرت کو بھی بہت کچھ اختیار کر لیا ہے) لیکن ہندوؤں میں خصوصیت کے ساتھ اسکی پابندی کی جاتی ہے۔ شاید بیس کرور ہندوؤں میں بمشکل چند سو ایسے تعلیم یافتہ اور روشن خیال اصحاب ملیں، جنھوں نے مغربی تعلیم و تمدن کے اثر سے مرعوب ہو کر اس مضر رسم کی پابندی قطعی چھوڑ دی ہو۔ کم و بیش یہی حالت ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں بھی پائی جاتی ہے، بلکہ مسلمانوں میں بعض ایسے جاہل فرقے موجود ہیں جو اس رسم قبیح کی پابندی ویسی ہی سختی سے کرتے ہیں جیسی کہ انکے برادرانِ وطن۔ گو یہ لوگ اُن مسلمانوں میں شمار کیے جاتے ہیں جو ہندو معاشرت کے رنگ میں ایسے رنگے ہوئے ہیں کہ انکا مذہب صرف ہندوانہ رسومات کی پابندی کرنا رہ گیا ہے، یا زیادہ سے زیادہ گائے کا گوشت کھا لینا

اور خدا اور رسول کا نام جاننا۔ لیکن ان سے قطع نظر اگر ہم اُن مسلمان شرفا و معززین کی حالت دیکھیں جو تعلیم یافتہ اور روشن خیال کیے جاتے ہیں اور جن پر ہندو معاشرت کا اثر نسبتاً کم پڑا ہے، تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی اِن فضول رسومات کی پابندی سے بَری نہیں کیے جا سکتے۔ کم سنی کی شادی کے اگرچہ وہ سختی کے ساتھ پابند نہیں، لیکن اسے بہتر و ضروری جانتے ہیں، اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے لڑکیوں کے پورے سنِ بلوغ کا بھی انتظار نہیں کرتے بلکہ فوراً ہی اُنکی شادی کر دیتے ہیں، اور اس طرح جو دماغ ابھی اپنی ہی بھلائی اور بُرائی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے، اُنپر زوجیت کے بھاری فرائض کا بوجھ ڈال دیا جاتا ہے حالانکہ نہ مسلمانوں کی تاریخ میں اس رسم کی قدامت کا پتہ چلتا ہے، اور نہ مذہب ہی اُنھیں صغیر سنی کی شادی پر مجبور کرتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس رسم میں کوئی عیب نہیں معلوم ہوتا، بلکہ ایک بڑی حد تک قوم کے نوجوان طبقے کو بدچلنی، آوارگی اور اسی قبیل کی دیگر بداخلاقیوں سے روکنے کی ایک اچھی صورت معلوم ہوتی ہے، لیکن اسکے نتائج پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف طبّی حیثیت سے لڑکوں اور لڑکیوں کے قواے دماغی و جسمانی کی نشو و نما کے لیے مضر ہے بلکہ اقتصادی حیثیت سے بھی ہندوستان کی ترقی میں کچھ کم مزاحم نہیں ہے۔

یورپ کے حکما، اور خصوصاً علم یوجنکس[۱] (eugenics) کے مقلدین کی رائے میں لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی عین سنِ بلوغ کی حالت میں کر دینے سے، اُنکے نظامِ جسمانی کی اجتماعی طاقت پر سخت مُضر اثر پڑتا ہے، خصوصاً انکی دماغی قوت پر۔ اُنکے نزدیک ماں باپ کا اپنی اولاد پر اس سے

[۱] علم یوجنکس وہ جدید سائنس ہے، جو نسل انسانی بہتر کرنے کے اصول بتاتی ہے۔ اس علم کا رجحان چونکہ زیادہ تر لا مذہبیت کی طرف ہے اس لیے لوگوں نے اسکی طرف زیادہ توجہ نہیں کی، بلکہ اکثر حالتوں میں اس کی سختی سے مخالفت کی گئی ہے۔ اس علم کے موجد سر فرانسس گیلٹن ہیں۔ صاحب موصوف نے نہ صرف اسپر بہت سی کتابیں لکھیں بلکہ اُنھیں کی کوشش سے اس کی ایک شاخ لندن یونیورسٹی میں کھولی گئی، اور شوقین طلبہ کے لیے وظائف بھی منظور ہوے، لیکن بظاہر اُسے کچھ کامیابی نہ ہوئی۔

(انسائیکلوپیڈیا برٹینکا قدیم ایڈیشن)

بڑھ کراو، کوئی ظلم نہیں ہو سکتا کہ وہ اُنکی شادی کمسنی کی حالت میں کر دیں (اُنکی رلے میں سن بلوغ کا زمانہ بھی کمسنی میں شامل ہے)۔ امریکہ کے مشہور ڈاکٹروں کی رلے ہے کہ لڑکیوں کی بیس سال سے کم عمر میں شادی کر دینے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ تیس ہی برس کے سن میں اُنپر ضعیفی کے تمام آثار نمودار ہو جاتے ہیں، مثلاً اُنکے چہروں پر عالمِ جوانی کی آب و تاب، رونق باقی نہیں رہتی بلکہ اُنکے بجائے اضمحلال و افسردگی پائی جاتی ہے۔ اسکے برخلاف بیس پچیس برس کے درمیانی سن میں اگر شادی کی جائے، تو اُنکے قوا ے جسمانی و دماغی کی قوت و چستی، اور اُنکے چہروں پر بشاشت و رونق عرصہ تک قائم رہتی ہے۔ اُنکے تجربہ میں اس عمر کی شادی شدہ عورتوں کی ضعیفی کا زمانہ ۵۰ برس کے سن کے بعد شروع ہوتا ہے۔ کمسنی کی شادی کے مضر نتائج کا سبب اُنکے نزدیک یہ ہے کہ بیس برس کے سن تک لڑکیوں کے نازک و ناتجربہ کار دماغ اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ متاہل زندگی کے تفکرات اور خانگی انتظامات کی دشواریوں کی متحمل ہو سکیں اور اگر ایسی حالت میں اُنپر ناقابلِ برداشت بوجھ ڈالا جائے تو اُنکی صحت و تندرستی کا خراب ہو جانا لازمی ہے۔

اُنکی رلے میں لڑکیوں کا سن کسی حالت میں ۲۲ سال سے کم نہ ہو، اور لڑکوں کی عمر پچیس سال سے متجاوز ہو۔

حکماے یورپ و امریکہ کی متفقہ رلے ہے کہ اولاد جس قدر والدین کی کمسنی میں پیدا ہوگی، اُسی قدر وہ جسمانی و دماغی حیثیت سے کمزور ہوگی۔ امریکن حکماء نے تو یہ بھی تحقیق کی ہے کہ اس ملک میں جس قدر مشہور آدمی پیدا ہوے، عموماً اُنکے باپ کی عمر اُنکی پیدایش کے وقت پچیس سال سے متجاوز تھی اور یہ خصوصیت کچھ امریکہ ہی پر موقوف نہیں بلکہ دنیا کے زیادہ تر مشاہیر اپنے باپ کی کبر سنی ہی میں پیدا ہوے، جیسا کہ نقشۂ ذیل سے معلوم ہوگا۔

	مشاہیر عالم	انکے باپ کی عمر انکی پیدایش کے وقت	
۱*ؔ	شیکسپیر	۴۰ سال	ماں کے سن اکثر حالتوں میں پچیس سال سے متجاوز تھے۔
۲ؔ	فرانکلن	۵۱ سال	
۳ؔ	ملٹن	۵۴ سال	

* حواشی بر صفحۂ آیندہ۔

۴ف بسمارک	۴۴ سال	
۵ف جوزف اڈیسن	۴۳ سال	
۶ف کنفوشیش	۴۵ سال	
۷ف واشنگٹن	۳۸ سال	
۸ف ویبسٹر	۴۲ سال	

ان میں بعض حکما، تو ایسے ہیں کہ اُنھیں اپنی اس تحقیق کی صداقت پر اس قدر عقاد ہے کہ کچھ عرصہ ہوا اُنھوں نے ۴۰ پونڈ کا ایک انعام ایسے شخص کے لیے مقرر کیا، جو ایسی کوئی مثال پیش کرے کہ دنیا کے کسی مشہور معروف خاندان کی چار پشتیں ایک ہی صدی میں گزری ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف ایسی ہی حالت میں ممکن ہے کہ اُس خاندان میں کمسنی کی شادی کا رواج ہو، اور یہ اُنکے نزدیک ناممکن ہے کہ کمسن والدین لائق اولاد پیدا کر سکیں۔ اسکے ساتھ یہ بھی تحقیق سے معلوم ہوا کہ والدین کی شادی کے سن کا اثر اولاد کی عمر پر بھی پڑتا ہے، چنانچہ امریکہ میں ڈیڑھ ہزار آدمی ایسے انتخاب کیے گئے، جن کی عمریں ۶۵ سال سے زائد ہوئیں، کیونکہ اُنکے والدین کی عمر شادی کے وقت ۲۵ اور ۴۰ سال کے درمیان تھی۔ اور اسی قدر آدمی ایسے ملے، جن کی عمریں ۷۰ سال سے متجاوز تھیں اور انکے والدین کی عمریں شادی کے وقت ۳۰ اور ۵۰ سال کے درمیان تھیں۔ ہم اگرچہ ان یورپین و امریکن حکماء کی اس رائے سے قطعی اتفاق نہیں کر سکتے کہ صرف بوڑھے والدین ہی میں لائق و ذی عمر اولاد پیدا کرنے کی استعداد

ف۱ شیکسپیر۔ انگلستان کا مشہور ڈراما نویس۔ ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا، ۱۶۱۶ء میں فوت ہوا۔ ف۲ فرانکلن۔ امریکہ کا مشہور فلاسفر و اخبار نویس ۱۷۰۶ء میں پیدا ہوا ۱۷۹۰ء میں فوت ہوا۔ ف۳ انگلستان کا مشہور نابینا شاعر ۱۶۰۸ء میں پیدا ہوا ۱۶۷۴ء میں فوت ہوا ف۴ جرمنی کا مشہور وزیر اعظم جو جدید سلطنت جرمنی کا بانی تھا ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوا، ۱۸۹۸ء میں فوت ہوا ف۵ انگلستان کا مشہور فلاسفر ۱۶۳۲ء میں پیدا ہوا، ۱۷۰۴ء میں فوت ہوا ف۶ چین کا مشہور ریفارمر و پیغمبر جو چینیوں کے مذہب کا بانی تھا ۵۵۱ برس قبل مسیح پیدا ہوا اور ۴۷۸ برس قبل مسیح وفات پائی ف۷ امریکہ کا پہلا پریسیڈنٹ ۱۷۳۲ء میں پیدا ہوا، ۱۷۹۹ء میں فوت ہوا ف۸ امریکہ کا سب سے بڑا مدبر، ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوا، ۱۸۵۲ء میں فوت ہوا۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جدید اڈیشن)

ہوتی ہے، لیکن اس قدر تو یقینی ہے کہ کمسنی کی شادی کا اثر نہ صرف ماں باپ کی صحت پر مضر پڑتا ہے بلکہ بچے بھی جسمانی اور دماغی حیثیت سے نسبتاً زیادہ کمزور ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں جسمانی انحطاط کا مرض ترقی کر رہا ہے، اسکی وجہ بھی منجملہ دیگر اسباب کے (مثلاً سخت پردہ کی وجہ سے عورتوں کی روزافزوں کمزوری، ہندوستان کی غیر معتدل آب و ہوا کا اثر وغیرہ وغیرہ) ایک صغیر سنی کی شادی کا رواج بھی بتایا جاتا ہے۔ صوبجات بمبئی و مدراس کے برہمنوں کی دماغی وجسمانی کمزوری کا سبب شاید یہی ہے کہ انکے یہاں بہت ہی صغیر سنی میں بچوں کی شادی کر دی جاتی ہے۔

طبی حیثیت سے اگر ہم یورپ و امریکہ کے فاضل ڈاکٹروں کی رائے سے اتفاق نہ بھی کریں تو کم ازکم اقتصادی حیثیت سے تو یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ صغیر سنی کی شادی ہندوستان کی ترقی کیلئے سخت نقصان دہ ثابت ہوئی ہے۔ مثلاً ہندوستان میں ہر شخص اپنے ہی ذاتی مشاہدہ سے ہزارہا مثالیں ایسے ہونہار نوجوانوں کی پیش کرسکتا ہے جو کمسنی میں شادی ہوجانے کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ گئے، جس کا سبب صرف یہی نہیں کہ وہ متاہل زندگی کے افکارات میں پھنس کر رہ گئے بلکہ اسکی اصلی وجہ، جیسا کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے، یہی ہوسکتی ہے کہ چونکہ اُنکے دماغ کا وہ بہترین جوہر جو قوتِ ذہنی کی جان ہے، بجائے مطالعۂ کتب میں صرف ہونے کے، نوجوان بیوی کی پُرلطف صحبتوں کے نذر ہوجاتا ہے۔ پس اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُنکی قوتِ حافظہ روز بروز زائل ہوتی جاتی ہے اور جب یہ حالت ہوئی، پھر تو مطالعۂ کتب میں دل ہی نہیں لگتا، اور اگر بجبر محنت کی گئی تو غباوت، کُند ذہنی یا کسی دوسرے مرض کا پیدا ہوجانا یقینی ہے۔ مختصر یہ کہ حصولِ علم سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور جب یہ نوبت پہنچی تو ظاہر ہے کہ بغیر علم حاصل کیے اقتصادی ترقی کی کیا امید ہوسکتی ہے، خصوصاً ہمارے ملک میں جہاں بغیر اعلیٰ سرٹیفکٹ حاصل کیے، کسی قسم کی ترقی کرنا صرف محال ہی نہیں بلکہ قریب قریب ناممکن ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں بدقسمتی سے تعلیم کا مقصد ہی یہ سمجھا جاتا ہے کہ گورنمنٹ سروس میں اعلیٰ عہدے حاصل کریں، حالانکہ یہ تو علم الاقتصاد کا ایک معمولی طالب علم بھی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ گورنمنٹ کی ملازمت میں اعلیٰ مناصب حاصل کرنے سے مُلک کی اقتصادی و تمدنی ترقی ہرگز ممکن نہیں۔

بہرحال، اگر ہم ملک کی اجتماعی ترقی سے قطع نظر کرلیں اور صرف انفرادی حیثیت ہی سے دیکھیں تو بھی بغیر اعلیٰ تعلیم حاصل کیے چارہ نہیں، کیونکہ معاش حاصل کرنے کا ذریعہ اگر صرف ملازمت ہی سمجھا جائے تو بھی کوئی شخص بغیر اعلیٰ سرٹیفکیٹ آرام سے زندگی نہیں بسر کرسکتا۔

کمسنی یا قبل از وقت کی شادیوں سے جس طرح طالب علموں کی زندگیاں خراب ہوتی ہیں اور اُنکی اُمیدوں اور تمناؤں کا جو حسرتناک انجام ہوتا ہے، اُس کا اندازہ صرف اُس خط سے ہوسکتا ہے جو ہمارے ایک عزیز دوست نے، گزشتہ سال امتحان میں اپنی ناکامیابی کے موقع پر ہمیں لکھا تھا۔ ہم اُس خط سے صرف چند اقتباسات یہاں درج کرتے ہیں، ورنہ یوں تو خط کا ہر لفظ حسرت و اندوہ کا ایک مجسم مرقع ہے، جسپر کوئی سنگدل بھی افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہمارے غم نصیب دوست کی داستان یہ ہے:۔

"...... آپ میری ناکامیابی پر مجھ سے ہمدردی فرماتے ہیں، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب مجھ ایسے بدقسمت کے ساتھ ہمدردی کرنے کا وقت نہیں رہا۔ بھائی میں اپنی امیدوں کا اُسی دن فاتحہ پڑھ چکا، جب گزشتہ سال والد صاحب قبلہ نے زبردستی میرے پیروں میں بیڑی[51] ڈال دی۔ بخدا مجھے پارسال ہی سے اپنی کامیابی کی طرف سے قطعی مایوسی ہوچکی تھی، لیکن یہ بھی کسی کا سخت اصرار تھا، جس نے ایک بار پھر مجھے قسمت آزمائی پر مجبور کیا، مگر اب تو مجھے یقین ہے کہ میری قسمت کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ ہوچکا۔ مرے پر سو دُرّے یہ کہ گزشتہ ماہ میں، قدرت نے میری وحشت دیکھکر، ایک بیڑی[52] کا اور اضافہ کردیا۔ لیجیے جو کچھ ہمت شاید باقی رہ گئی تھی، اب وہ بھی تشریف لے گئی۔ اب میرے لیے سوا اسکے اور کوئی کام نہیں کہ اپنی بدنصیبی پر بیٹھا ماتم کیا کروں ...... عجب مصیبت میں ہوں، نہ طالبعلمی کی زندگی ہی سے بخوشی مفارقت گوارا ہے، اور نہ جدید تکلفات سے رہائی کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔ میرا تو بس یہ حال ہے کہ ؎ غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را ؛ بلاے فرقتِ لیلےٰ و صحبت لیلےٰ ......

اس سے زیادہ مجھ غم نصیب کی داستان نہ پوچھو، بس یہ سمجھ لو کہ ؎ حصہ میں آگیا ہے دل مبتلا کے بخ ؛ دن رات میں غضب کے تردد بلا کے رنج ......"

---

[51] ہمارے دوست کی دو برس ہوئے، جب باوجود اُن کے متواتر اور شدید انکار کے شادی کردی گئی اور [52] گزشتہ سال مہ ایک لڑکی بھی اُنکے ہاں پیدا ہوئی۔

اب غور کرو کہ جب ہونہار نوجوانوں کی مٹی اس طرح خراب کی جائے گی، تو پھر ملک کی فلاح وبہبود اور اقتصادی ترقی کی کیا امید ہوسکتی ہے۔

بدقسمتی سے ہندوستان کی اقتصادی ترقی میں اسی قبیل کی بہت سی دیگر فضول رسومات بھی حائل ہیں (جن پر ہم آیندہ فرصت میں انشاءاللہ بحث کریں گے) اور افسوس ہے کہ ہنوز ہمارے اہل ملک نے اس طرف مطلق توجہ نہیں کی۔ اسکی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ابھی اس ملک میں مصلحانِ قوم کی کمی ہے، اور کچھ ہمارے یہاں سوسائٹی کی روایتی بے اتفاقی بلکہ اکثر اوقات شدید مخالفت۔ چنانچہ گزشتہ سال، جب جنوبی ہند کے مشہور ہندو ریفارمر آنریبل مسٹر شرینواسا شاستری آئی ممبر لجسلیٹو کونسل مدراس نے اپنے یہاں لوکل کونسل میں مشہور Post-puberty Hindu marraige bill پیش کیا (جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندو لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں، قبل سنِ بلوغ، گورنمنٹ قانوناً روک سکے) تو ہمیں یاد ہے کہ اکثر ہندو حلقوں میں میں اسکی شدید مخالفت کی گئی تھی۔ اسی طرح جب کسی مصلح قوم نے کسی فضول رسم کی اصلاح کی کوشش کی تو ہمیشہ بجائے کسی قسم کی تائید کے اُسے سوسائٹی کے طعن وتشنیع کے ہزآلود تیروں کا نشانہ بننا پڑا۔

چونکہ اس قسم کی رسومات کا مضر اثر ملک کی اقتصادی ترقی میں ہارج ہے، اس لیے ہمارے نزدیک اسکی بہتر صورت یہ ہے کہ ہمارے مصلحانِ قوم حکومتِ وقت کی مدد سے قانوناً انھیں موقوف کرائیں۔ جیسا کہ یورپ، امریکہ اور جاپان میں کیا گیا، جہاں لڑکے اور لڑکیاں بیس برس سے پیشتر کسی حالت میں شادی کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ اور ابھی ہمارے ملک کے مشہور روشن ضمیر فرماں روا ہز ہائینس مہاراجہ صاحب بڑودہ نے بھی اپنی ریاست میں اس قسم کی شادیاں قانوناً روک دی ہیں۔ اور اگر اسی قسم کا قانون ہندوستان میں رائج ہو جائے تو اس ملک کے لیے ایک برکتِ عظیم ہوگا۔

انیس احمد عباسی (کاکوری)

باغ ہستی سے سمجھاتے ہیں عدم کا رستہ　　صاف دوزخ سے دکھاتے ہیں ارم کا رستہ

خالی از لطف نہیں ہائے بتوں کی شوخی　　دیر سے مجکو بتاتے ہیں حرم کا رستہ

موسم برسات کا ساقی نامہ

کاسۂ آفتاب لا ساقی روح پرور شراب لا ساقی
کچھ عجب رنگِ بوستاں ہے آج لوٹتا دل ہے وہ سماں ہے آج
کالی کالی گھٹا جو چھائی ہے دل میں کچھ اور ہی سمائی ہے
بھینی بھینی پھوہار پڑتی ہے واہ کیا خوش گوار پڑتی ہے
خوب نکھرا ہے ہر گلِ رعنا پہنے ہے ہر شجر ہرا جوڑا
ہر کلی ہے نمونۂ قدرت ہے سجا باغ صورتِ جنت
کھِل رہا ہے کسی طرف گیندا موتیا ہے کہیں یہ ہے بیلا
نارَوَن کامنی کہیں چمپا ایک جانب کھِلا ہوا لالا
الغرض ہے عجب فضائے چمن پتے پتے پہ ہے غضب جوبن
ہے دُلھن سی بنی عروسِ بہار عطر میں ہے بسی عروسِ بہار
سروِ گلشن ہے یا قدِ دلبر زلفِ معشوق ہے کہ سنبل تر
عشقِ گل میں ہے نعرہ زن بُلبُل حسن و خوبی پہ اپنی محو ہے گُل
کون ہے جو نہیں شرابی ہے آنکھ نرگس کی بھی گلابی ہے
لہلہاتا چمن میں لالہ ہے مے سے لبریز یا پیالہ ہے
ہے جھما جھم برس رہا پانی ابرِ نیساں نے کی دُر افشانی
لڑکھڑاتی نسیم پھرتی ہے مست و بے خود شمیم پھرتی ہے
شوق میں بُلبُلیں چہکتی ہیں کلیاں کس لطف سے چٹکتی ہیں
عوضِ آب مے پلا ساقی چھاگلوں میں شراب لا ساقی
شوقِ بادہ میں دل ترستا ہے نور سحنا نوں پہ برستا ہے

رند میکش ہوں مجکو ڈر کس کا — محتسب کا فضول ہے خطرا
عفو پنہاں ہے جرم و عصیاں میں — صاف لاتقنطوا ہے قرآں میں
شیخ کو ناز زہد و طاعت پر — ہے بھروسا مجھے شفاعت پر
کام آئیں گے ساقیِ کوثر — بخشوائیں گے ساقیِ کوثر
دیر ہوتی ہے جلد لا ساقی — مئے کوثر مجھے پلا ساقی

ہمکوں نشہ میں صورتِ بلبل
سُن کے پڑتے ہو جیبِ دامنِ گُل

محمد اسمٰعیل حسن رسا ہمدانی

چھپکے کچھ پی لوں اگر بات نہ مانے ساقی — خبر پیرِ مغاں کو ہو نہ جانے ساقی
زاہدوں کو شئے تازہ نہ آئے گی سُرور — دے پرانی کہ ہیں یہ لوگ پرانے ساقی
رنگِ مستی نہ گیا درد و ثنا تفت میں بھی — کہ ہیں تسبیح میں انگور کے دانے ساقی
باغ میں قلقلِ مینا کی صدا ہو ایسی — بند ہو جائیں عنادل کے ترانے ساقی
چشمِ ساغر میں سمائے گی نہ اس دور کا رنگ — اُس نے دیکھے ہیں بہت اگلے زمانے ساقی
پی کے بڑھ جائے بہت پاکیِ طینت میری — اپنے دامن میں جو میرے لیے چھانے ساقی
دولتِ مے سے بھری رہتی ہے خموں میں میرے — کبھی خالی نہیں ہوتے یہ خزانے ساقی
اور دانہ کوئی جز رند کی قسمت میں نہیں — بس مقدر میں ہیں انگور کے دانے ساقی
اور ہے پیاس کے انکار سے زاہد کی غرض — دے ذرا سی اسے پانی کے بہانے ساقی
اب سنبھالو مجھے مدہوش ہوا جاتا ہوں — جھوم کر ناز سے اُٹھا ہے پلانے ساقی

لطف آئے گا بہت تجکو فضاؔ سے سُن لے
سیکڑوں عالمِ مستی کے فسانے ساقی

شیخ محمد عالیجاہ فضاؔ

خواجہ غلام الثقلین مرحوم

ایسے وقت میں جبکہ بے لاگ اور بے ریا کام کرنے والوں کی شدید ضرورت ہے، جبکہ قومی ترقی کے لیے ہر شعبے میں انسانوں کی تلاش ہے، جبکہ کام بہت ہیں اور کام کرنے والے کم، ایک صائب الرائے، معتدل مزاج، بے لاگ اور باخلوص کام کرنے والے کا اُٹھ جانا غضب ہے۔

بہت سے ایسے ہیں جو صرف ایک چک پر دستخط کر دینے سے دنیا میں یکایک نامور ہو جاتے ہیں۔ بہت سے ہیں جنھیں اتفاقاتِ زمانہ نے بڑا آدمی بنا دیا ہے۔ بہت سے ہیں جو محض نام و نمود کے لیے زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں اور شہرت یا نام حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور آخر بڑے آدمی بن جاتے ہیں۔ لیکن کم ہیں جو محض اپنی لیاقت، محنت اور خلوص کے ساتھ کام کر کے عزت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پائدار ہوتی ہے۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم اسی مظلوم اور چھوٹے گروہ میں سے تھے۔

وہ طالب علمی کے زمانے میں بھی اپنے مطالعہ اور وسیع معلومات کی وجہ سے ممتاز تھے، اور تمام طالب علم (سوائے بعض کھلنڈروں کے) اور پروفیسر انھیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یونین کلب میں اُن کی تقریروں کی آتش افشانی اور اخوان الصفا میں اُن کے مضامین کی فصاحت بیانی مشہور تھی۔ وہ اس قدر راست باز اور بے لاگ تھے کہ سچ بات کے کہنے میں کبھی کسی کی پروا نہیں کرتے تھے اور اس لیے بعض لوگ اُن سے خوش نہیں رہتے تھے، مگر اُن کی لیاقت اور سچائی کے سب قائل تھے۔ خود سرسیّد مرحوم انھیں محض اُن کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے۔ مگر اختلاف کرنے میں وہ اُن سے بھی نہ چوکتے تھے۔ حالانکہ اُن کے سامنے بڑوں بڑوں کے پر جلتے تھے۔ علی گڑھ کالج میں اُن سے پہلے اور غالباً اُن کے بعد بھی کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا، معلومات ایسے وسیع اور جو کام کرنے میں ایسا انتھک ہو۔ وہ پرلے درجے کے ذہین اور ذکی تھے۔ وہ ہمیشہ علمی معاملات پر گفتگو کرتے اور پالٹکس اور خصوصاً انگلستان کے سیاسیات سے انھیں ابتدا سے

بے انتہا دلچسپی تھی اور جس قدر اُنھیں اس سے واقفیت تھی، ہماری قوم میں شاید ہی کوئی اس قدر واقف ہو۔ وہ درحقیقت علی گڈھ کالج کے سپوت تھے لیکن مادرِ کالج کا برتاؤ اُنکے ساتھ ہمیشہ ظالمانہ رہا۔ کئی بار اُن کا نام پیش ہوا مگر وہ کبھی کالج کے ٹرسٹی منتخب نہ ہوئے[1]۔ اور حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اُنکے مقابلہ میں ایسے لوگوں کو ترجیح دی گئی۔ جن کا نام لکھنا بھی ہم اس صفحۂ کاغذ پر گوارا نہیں کرسکتے۔ کالج کے کارنامے پر یہ بڑا دھبا رہے گا۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ کبھی نچلے نہ بیٹھے۔ وہ کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ علاوہ بیشمار مضامین کے کئی رسالے اُن کی یادگار رہیں۔ ملک و قوم کی خدمت اُنکا نصب العین تھا۔ اور اسی جذبے نے اُن سے ریاست حیدرآباد دکن کی ایک معزز خدمت کو چھڑا کر میدانِ وکالت میں لا کھڑا کیا۔ یہاں اُنکی طبیعت کے اصل جوہر کھلے۔ وکالت کا پیشہ ایسا ظالم پیشہ ہے کہ وہ انسان کو کسی دوسرے کام کا نہیں رکھتا۔ لیکن وہ باوجود اس پیشہ کی مصروفیتوں کے ہمیشہ قومی کاموں میں پیش پیش رہے۔

کوئی پندرہ سال ہوتے ہیں کہ خواجہ صاحب ہی کی تحریک سے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چند صیغے الگ الگ قائم ہوئے۔ اصلاح تمدن کا صیغہ اُنکے سپرد ہوا۔ انھوں نے اپنے اس فرض کو جس مستعدی اور قابلیت سے انجام دیا وہ مخفی نہیں ہے۔ کانفرنس کے کئی صیغے تھے اور اُنکے بعض سکرٹری بھی اُن سے زیادہ نامور لوگ تھے، لیکن جیسا اصلاحِ تمدن کا صیغہ چمکا، وہ بات کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی۔ اُنھوں نے اپنے پرچے عصرِ جدید کے ذریعہ سے اصلاحِ تمدن پر بڑے بڑے پُر زور مضامین خود لکھے اور دوسروں سے لکھوائے، اور اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جگہ جگہ جا کر لکچر دیے اور تقریریں کیں اور مسلمانوں میں اصلاحِ معاشرت کی ایک ہل چل پیدا کر دی۔ لیکن افسوس کہ کچھ تو اُنکے تلوّن کی وجہ سے اور زیادہ تر کانفرنس کی مجبوری بے اعتنائی اور مالی دقتوں کی وجہ سے اُنھیں اس صیغہ کو خیرباد کہنا پڑا، اور اسکے بعد سے آج تک کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اس امانت کا بار اُٹھائے۔ اور اگرچہ صیغہ مرگیا لیکن اُس کا اثر اُسکی یاد اب تک باقی ہے۔

[1] ممبر کونسل ہو جانے کے بعد خواجہ صاحب ٹرسٹی بھی بنا لیے گئے تھے۔ ایڈیٹر

خواجہ صاحب طبعاً ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ اُن پر بعض اوقات ناکامیابی کا بہت بُرا اثر پڑتا تھا اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُنکی صحت خراب رہتی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک ناکامیابی کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے اور جلد پریشان ہوجاتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جس کام کو لیتے تھے اُس میں ہمہ تن منہمک ہوجاتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ جو جوش اور آگ اُن میں ہے وہی دوسروں میں بھی ہو، لیکن یہ کہاں ہوتا ہے، خصوصاً ایسے زمانے میں جہاں ہمیں پتھروں سے سر پھوڑنا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ مایوسی ہوتی ہے اور یہ مایوسی انھیں پریشان کردیتی تھی۔ چنانچہ انھیں ناکامیوں اور ناکامیابیوں نے اُنھیں ایک بار ترکِ وطن پر مجبور کیا۔ وہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرتے ہوئے ایران پہنچے، وہاں بھی وہ خاموش نہ رہے اور اُنھوں نے ملکی اصلاح کا ڈول ڈالا۔ وہاں کے مشہور لوگوں سے ملے، تقریریں کیں، اصلاحِ ملک پر بحثیں کیں۔ لیکن اُس وقت ایران کی حالت ہندوستان سے بھی بدتر تھی لہذا انھیں مجبوراً لوٹنا پڑا۔ اور اگرچہ وہ مایوس گئے تھے مگر وہ زیادہ مضبوط ہوکر آئے۔ اور کچھ ہی عرصے کے بعد اُنھوں نے دُگنی اور چوگنی قوت کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔

ایران جانے سے قبل مرحوم نے صوبۂ متحدہ کی کونسل کی ممبری کے لیے بڑے شد و مد سے کوشش کی تھی، لیکن اُسی سختی کے ساتھ اُنھیں ناکامیابی بھی ہوئی، اس کا اُن پر بڑا اثر ہوا۔ اور منجملہ دیگر وجوہ کے ایک یہ وجہ بھی ہندوستان سے کچھ دنوں کے لیے ہجرت کرنے کی ہوئی۔ لیکن دوبارہ جب اُنکا انتخاب ہوا تو اُنھوں نے اس قدر شوق، مستعدی اور جفاکشی کے ساتھ اس اہم کام کو انجام دیا اور اس نیابت کا حق اس خوبی سے ادا کیا کہ اس سے ثابت ہوگیا کہ صوبۂ متحدہ کے مسلمانوں میں اگر کوئی شخص کونسل کی ممبری کا حق رکھتا ہے وہ خواجہ صاحب ہی تھے۔ غالباً اسوقت اُنکے مخالفوں کو کچھ کم ندامت نہ ہوئی ہوگی۔ اس زمانے کا اُن کا بڑا کارنامہ مسئلہ سُود ہے۔ اس مسئلہ پر اُنھوں نے اس قدر جان توڑ کر محنت کی تھی کہ اُنکی صحت کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اگرچہ اس میں پوری کامیابی نہ ہوئی لیکن ایک روز یہ مسئلہ پاس ہوکے رہے گا، مگر اس کامیابی کا سہرا خواجہ صاحب مرحوم ہی کے سر ہوگا۔

اگرچہ خواجہ صاحب عقائد کی رُو سے پکے شیعہ تھے، لیکن اُن میں تعصب نہ تھا۔ وہ مسلمانوں

کی خدمت میں سُنی شیعہ کی مطلق تمیز نہ کرتے تھے اور سب کی خدمت کے لیے یکساں حاضر تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اگرچہ وہ شیعہ کانفرنس کے بنا و قیام میں شریک غالب تھے، مگر تھوڑے ہی عرصے بعد اُنھیں اُس سے کنارہ کشی کرنی پڑی۔

آخر آخر میں اُنکی طبیعت میں ایک خاص اعتدال پیدا ہو گیا تھا اور اُن میں وہ اضطراب اور پریشانی اور وہ ضد نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔ یہ اعتدال کچھ تو دنیا کے نشیب و فراز اور تجربوں نے پیدا کر دیا تھا اور کچھ کونسل کی ممبری نے۔ مگر پھر بھی وہ شمالی ہند کی زہریلی آب و ہوا سے نہ بچ سکے۔ اُن کی ساری کوشش اور خدمت مسلمانوں کی قوم کے لیے تھی اور وہ بھی شاید شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے۔ لیکن تاہم اُنکی نظر وسیع تھی اور وہ اُن تنگ دل مسلمانوں اور ہندوؤں کی طرح نہیں تھے، جن کے کاموں کی بنیاد نفسانیت پر ہوتی ہے اور جنھیں بلا لحاظ دوسرے کے ضرر کے اپنی ہی کامیابی کی دُھن ہوتی ہے یا جو دوسرے کے ضرر پر اپنی کامیابی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اس سے بری تھے۔ شاید یہ زمانہ انھیں گروہ بندیوں اور جتھوں کا ہے۔ شاید یہ پہلی منزل ہے، اور آج کی محدود کوششیں کل ہمیں اُس مقام پر پہنچا دیں جب یہ جتھوں اور گروہوں کی ناہمواریاں مٹ کر مساوات پیدا کر دیں گی۔

ملتیں جب مٹ گئیں اجزاے ایماں ہو گئیں

خواجہ صاحب کا ذوق علمی تھا۔ اُن کا مطالعہ طالب علمی سے لیکر آخر تک جاری رہا، لیکن چونکہ پہلی سی فرصت نہ تھی اس لیے مطالعہ کی بھی وہ شان باقی نہ رہی تھی مگر وہ ہمیشہ علمی مباحثوں میں بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ قلم اُن کا آخر دم تک نہ رُکا اور وہ برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ عصر جدید کو دوبارہ زندہ کیا۔ مگر افسوس کہ اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ انکی رایوں میں خاص بات ہوتی تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک ایسے شخص کے دماغ کا نتیجہ ہیں جو غور و فکر کا عادی ہے۔ آخر زمانے میں اُن پر مذہب کا رنگ بہت غالب آگیا تھا۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ اُن کے مطالعہ نے زمانے کا ساتھ نہ دیا ہو، یا صحت کی خرابی کچھ مساعد ہوئی ہو، یا یہ کہ مذہب کے عوامض اور

اسرار کی طرف اُنھوں نے خاص طور سے توجہ کی ہو۔ خیر کوئی وجہ ہو، اُن پر مذہب کا رنگ گہرا چڑھ گیا تھا اور اُن کے آخر زمانے کی تقریروں اور تحریروں کے فقرے فقرے سے مذہب کی بو آتی ہے۔

مرحوم کی زندگی پاک اور اُسکا دامن بیداغ تھا۔ وہ طالب علمی کے زمانہ سے آخر دم تک کام کرتا رہا۔ اُس نے خلوص اور جوش کے ساتھ اپنی قوم کی خدمت کی۔ صداقت اور جوش کے ساتھ اعتدال مزاج نے اُسے اصلاح کا زیادہ اہل بنا دیا تھا۔ اور اب اُس سے بڑی بڑی توقعات وابستہ ہوگئی تھیں۔ لیکن ایسے وقت میں جب کہ اُس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، اُس نے ہم سب کو داغ مفارقت دیا۔ م سے بے وقت موت آئی۔ یہ اُس کے کام کا زمانہ تھا۔ قوم کو ابھی اُس سے کچھ کام لینا تھا۔ لیکن اجل کے زبردست ہاتھ نے ساری اُمیدیں خاک میں ملادیں۔

بہرحال مرحوم کی زندگی عبرت آموز ہے اور جو لوگ قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اُنھیں اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

یہاں یہ بات بھی کچھ کم فکر کی نہیں کہ اُن لوگوں میں سے جو خاص اس عصر جدید کا نتیجہ ہیں، جس جس نے قوم کی خدمت کی وہ جوان ہی چل بسا۔ مسٹر تلانگ، مسٹر گوکھلے، ڈاکٹر ستیش چندر، خواجہ غلام الثقلین اور دوسرے بیسیوں نوجوان شباب میں نذر اجل ہوگئے۔

کیا یہ مسئلہ قابلِ غور نہیں ہے؟

عبد الحق

تخمیس

بر غزل عالیجناب مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ۔ شاد بالقابہم

ظلم سے تم کو جو فرصت نہیں ہوتی نہ سہی
غم سلامت ہے تو کیا غم مجھے شادی نہ سہی
نہیں ہوتے ہو اگر وصل پہ راضی نہ سہی
دردِ فرقت سے نہ ہو دل کو تسلی نہ سہی
گر نہیں لیتے خبر تم مرے دل کی نہ سہی

ہوس شیشہ و ساغر ہے نہ ہے خواہش مے
جز تری یاد کے بھاتی نہیں مجھکو کوئی شئے
خوش رہے تو یہی کرتا ہوں دعا پے در پے
نالۂ غم میں بھی لذت مجھے اب ملتی ہے

نہ سہی لب پہ مرے نغمۂ شادی نہ سہی

ساری دنیا تری الفت میں مری قائل ہے　　یہ نہ کہہ مجھ سے کہ چل تو بھی کسی قابل ہے
جس میں رہتا ہے تو مہان وہ میرا دل ہے　　عکس او شخص کی نسبت تو مجھے حاصل ہے
میری صورت تری تصویر سے اچھی نہ سہی

مدتوں سے ہوں جدائی میں تمہاری مضطر　　دل ہے سینے میں سلامت نہ ہے پہلو میں جگر
کیا کروں اس کو کہ آتا نہیں تم کو باور　　نہیں دیتے جو تسلی تو لگاؤ خنجر
یہ بھی منظور نہ ہو تم کو تو یہ بھی نہ سہی

عاشق روئے پُرانوار تو دل ہے اے قیس　　شکر کر طالب دیدار تو دل ہے اے قیس
اس کی صورت کا پرستار تو دل ہے اے قیس　　قابلِ جلوہ گہِ یار تو دل ہے اے قیس
گر نہیں اس میں ابھی جلوہ لیلی نہ سہی

آن کی آن میں دنیا مری شیدا ہو جائے　　چاند سورج کی طرح میرا بھی شہرا ہو جائے
پھر میں دکھلاؤں اگر قرب تمہارا ہو جائے　　ساتھ پارس کے جو لوہا رہے سونا ہو جائے
تم میں جو کچھ ہے نہیں مجھ میں وہ خوبی نہ سہی

گفتگو کرتے ہو مجھ سے جو چڑھا کر تیوری　　جانِ من پھرتی ہے میرے جگر و دل پہ چھری
پر سمجھتا ہوں کہ یہ شان ہے معشوقی کی　　تم ہو بانکے تو ادا بھی ہے تمہاری بانکی
تم اگر بات نہیں کرتے ہو سیدھی نہ سہی

عمر بھر میں نے کبھی چھوڑی نہ بھٹی تیری　　ہائے افسوس پسِ مرگ ذرا قدر نہ کی
لاش میخانہ سے کیوں پھینکدی ہاہر ساقی　　کوزہ و جام بنانے کی تو تھی خاک مری
اس کے بھی کام کی گر یہ نہیں مٹی نہ سہی

سُن کے باتیں تری جلتا ہے کلیجا تجھ سے　　فائدہ کیا مجھے جو میں کروں جھگڑا تجھ سے
راہ لے اپنی نہ رو شرع کا دُکھڑا تجھ سے　　معرفت علم لدنی کی کہوں کیا تجھ سے
واعظا گر تو سمجھتا نہیں معنی نہ سہی

جب سمجھتے ہو کہ اللہ کی مخلوق ہیں سب　　ہوش پھر مذہب و ملت سے تمہیں کیا مطلب
تم جو کہتے ہو کہ اچھا نہیں اس کا مشرب　　اس میں بھی شک ہے تمہیں کیا کہ نہیں بندۂ رب
خیر کافر ہی سہی شاد جو صوفی نہ سہی

سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی۔

نظرے خوش گزرے

ستمبر کا الناظر تیار تھا کہ بارش کے طوفان نے لکھنؤ اور مضافات پر تسلط کر لیا۔ ۳۰ اگست کو ظہر کے وقت سے پانی برسنا شروع ہوا تو کہیں پہلی ستمبر کو جا کر تھا۔ اس ۴۸ گھنٹے میں ۱۰ انچ سے زائد پانی برسا۔ ہر چند کہ یہ مقدار بارش بہت زیادہ نہیں۔ گو لکھنؤ میں اس اندازہ سے عموماً پانی نہیں برستا لیکن ہواؤں کی تیزی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد رُخ بدلنے کی وجہ سے اور تیز بوندیوں کے غیر معمولی وزن اور زور نے ایک حشر بر پا کر دیا۔ مکانات خام اور پختہ۔ نئے اور پرانے ہزاروں کی تعداد میں ڈھا گئے اور مکیں مال و اسباب کو دشنا بخیر "کھکر ما بسلامت" کی فکر میں ادھر سے اُدھر مارے مارے پھرتے تھے۔ گلی کوچوں میں ملبہ کی اور کشادہ سڑکوں پر مینھ کے پانی کی نادر شاہی حکومت تھی۔ غرضکہ جانے ازاں دنیائے رفتن کا عالم تھا۔ اسی حال میں سیکڑوں مرد و زن۔ بوڑھے اور بچے مرگ بے ہنگام کی بھینٹ چڑھے۔ ایک طرف بارش کی یہ کیفیت تھی دوسری طرف مقامی ندی گومتی جس کا نام اُسکی معشوقانہ رفتار کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے، سمندر کے دیوتا نائفن کے عشق میں سرشار ہو کر سیل ہائے اشک سے شمالی حصۂ لکھنؤ کی بربادی کا باعث بن گئی۔

بارش و سیلاب دونوں اپنی اپنی ستم انگیزیوں پر بجا طور سے فخر و ناز کر سکتے ہیں کہ اُنکی باہمی رقابت و حسد نے جس میں شاید مسابقت کی کوشش بھی شامل ہو، عروس البلاد ہندوستان کو اینٹ اور گارے کا ایک تودہ بنا دیا اور ہزاروں بندگانِ خدا کو بے خانماں کر دیا۔

ستم پر ستم یہ ہوا کہ ۱۰ ستمبر کو بارش کا ایک اور طوفان آیا جس میں دس گھنٹے کے اندر بارہ تیرہ انچ کے قریب بارش ہوئی۔ ان پے در پے آفات نے اس عرصہ میں کوئی بیس ہزار مکانات بیکار کر دیے اور تقریباً تو ے ہزار آدمیوں کو بے گھر بنا دیا ہے۔ اسکے ماسوا صدہا جانوں کے اتلاف اور کثیر المقدار مال و اسباب کے تباہ و برباد ہونے کی وجہ سے سارا لکھنؤ اسوقت ماتم کدہ بنا ہوا ہے اور نالہ و بکا، شیون و فغاں، آہ و زاری کے رنج پرور اور محن انگیز سُروں میں یہ صدا ہر کوچہ و برزن سے آرہی ہے کہ

دونوں نے مل کے خاک میں ہم کو ملا دیا

رنج وراحت، خوشی وغم، دُکھ اور سُکھ اگرچہ صبح وشام کی طرح ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں اور اُس مسلسل تبدیلی وتغیر کا مظہر اتم ہیں جو اس کائنات کے ہر جزو کل پر حاوی ہے۔ لیکن جس طرح طلوع سحر روشنی وحرارت کا منبع ہے یا نمود شام تاریکی وبرودت کا سرچشمہ اسی طرح آلام ومصائب کے صدور میں بھی دستِ قدرت کی حکمت ہائے بالغہ نظر آتی ہیں جو اربابِ فکر ودانش کے لیے حد درجہ سبق آموز ہوتی ہیں۔ لکھنؤ پر آج جو آفت ومصیبت آئی ہے یہ بھی بے نتیجہ واثر نہیں ہے۔ بے شک جو جانیں جانے والی تھیں گئیں، اور اب واپس آنے والی نہیں ہیں۔ اسباب املاک کو جو نقصان پہنچا کر بعض حالات میں شاید اُس کی بھی تلافی نہ ہو سکے۔ شریف عورتوں کی پردہ دری اور بے آبروئی اور اغنیاکی مجبوری ومعذوری کے افسانے بھی نسیًا منسیا ہو جائیں گے۔ لیکن خدائے دانا وبینا کی تنبیہات اس لائق نہیں کہ اُن سے چشم پوشی کی جائے اور تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس قسم کے انقلاب انگیز اور عبرت افزا واقعات ہمیشہ خواب آلود اور غفلت آگیں جماعتوں کی اصلاح وبیداری کے لیے صادر ہوتے ہیں۔ پس کیا یہ وقت اس کا نہیں ہے کہ ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور اپنے اعمال وکردار کی جانچ کریں اور توفیقِ الٰہی کے زیر سایہ اپنے حالات ومعاملات میں ایسا تغیر پیدا کرنے میں ہمہ تن ساعی ہوں جو ہمارے سروں سے ادبار ونکبت کو دُور کردے اور ہمارے مستقبل کو رات کی اندھیری سے نکال کر دن کی روشنی میں لے آئے۔ فتدبر۔

اس موقع پر ہم اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے اُس کمال فضل وکرم پر اظہار تشکر وامتنان اور اُسکی حمد وثنا خطا پوشی وبندہ نوازی کی حمد وصفت کیے بغیر نہیں رہ سکتے جس کے طفیل اس مصیبتِ عام اور ہنگامۂ عظیم میں ہم اپنے اہل وعیال اور اعزہ سمیت کلیتہً مامون ومحفوظ رہے۔ فالحمد للہ علی احسانہ۔

ناظرین المناظر کو یہ سُن کر بڑا قلق ہوگا کہ خواجہ غلام الثقلین جو تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اپنے

علم وفضل۔ خدماتِ قومی اور مساعیِ اصلاح کے لحاظ سے ممتاز ونمایاں تھے۔ اور اب کچھ عرصہ سے برابر علیل رہتے تھے۔ آخر کار انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خواجہ صاحب مرحوم کے متعلق جو خیالات مشفقی مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے مضمون میں ظاہر کیے ہیں اُن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُنکی وفات سے مسلمانانِ ہندوستان کی قومی زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ اور اُنکے اعزا و پس ماندگاں کے ساتھ ساتھ ساری قوم کے دلوں میں غم والم کے کیسے جذبات دَوڑ رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے لطفِ عمیم سے ہمیں اُن کا نعم البدل عطا کرے۔

گزشتہ نمبر میں ہمنے ناظرین کی خدمت میں توسیع اشاعت کے لیے جو اپیل شایع کیا تھا اُس میں برسبیل تذکرہ بعض معاصرین کا بھی ذکر آگیا تھا اور اُنکے متعلق اپنی واقفیت کی بنا پر جو کچھ لکھا گیا تھا اُسمیں کسی قدر تصیح درکار ہے۔ مثلاً رسالۂ زمانہ کے متعلق ہمیں شکایت تھی کہ فروری کے بعد سے ابتک نظر فروز نہیں ہُوا ہے۔ مگر ستمبر کے دَورانِ اشاعت ہی میں اُسکے جون تک کے پرچے ہمارے پاس آگئے۔ جس کو ہم بسا غنیمت جانتے ہیں۔ اور رسالۂ خاتون کے متعلق معاصر المیزان نے (جو شیخ عبداللہ صاحب کی نگرانی میں علی گڈھ سے نکلتا ہے) ایک نوٹ میں یہ ظاہر کیا ہے کہ اُسکی اشاعت کا ذمہ دار سرمایۂ قومی (یعنی کانفرنس کا شعبۂ تعلیم نسواں) نہیں ہے جیسا کہ ہمارا خیال تھا، بلکہ وہ شیخ عبداللہ کا ذاتی پرچہ ہے۔ اڈیٹر صاحب المیزان حال میں وطن آئے تھے اور اُنکی زبانی بھی معلوم ہوا کہ شیخ صاحب کے کثیر المشاغل ہونے کی وجہ سے اشاعت کا بروقت انتظام نہیں قائم رہتا۔ ہمارے دوست مسٹر دیا نرائن نگم کو بھی رسالہ زمانہ کے متعلق اسی قسم کی بلکہ اس سے زائد مجبوریاں ہیں۔ لیکن ہماری ناقص رائے میں یہ حالات کسی طرح تشفی بخش نہیں ہے۔ دل دادگانِ روشِ قدیم یا عامۃ الناس کے کاموں میں یہ بے ترتیبی اور بدنظمی چنداں قابل لحاظ نہ ہو، مگر تعلیم یافتہ جماعت خصوصاً اخبارات ورسائل کے اڈیٹر صاحبان کی روشن خیالی اور اصلاح پسندی کے لیے یہ نہایت بدنما داغ ہیں۔ وہ لوگ جن کی معاش کا اخبار ورسائل ذریعہ ہیں یا کم سے کم جو اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر کسی پرچہ کو جاری کرتے ہیں، اگر فرائض اخبار نویسی سے ناآشنا رہیں یا جان بوجھ کر اپنے

پیشہ کے اصول و اخلاق کو خیرباد کہیں تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں مگر جن اصحاب نے اس قسم کی تحریکات کو بربنائے ذوق علمی، شوق اصلاح یا خدمتِ قومی شروع کیا اور جاری رکھنا چاہتے ہوں اُنھیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہونا اور اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے پورا سازو سامان کرنا چاہیے۔

ناظرین اگر نہیں تو ہمارے وہ احباب کرام جنھیں الناظر کے ساتھ ابتدا سے ایک طرح کی دلچسپی رہی ہے۔ اور جنھوں نے ہر موقع پر ہماری ہمت افزائی فرمانے میں پوری فیاضی و محبت کا ثبوت دیا ہے، ضرور اس بات کے معلوم کرنے کے لیے بے چین ہونگے کہ ہماری اُس طولانی تحریر نے جس کا ابھی اوپر حوالہ دیا گیا تھا، کیا نتائج پیدا کیے۔ واقعات ہر چند کہ ہمت شکن اور افسوسناک ہیں مگر اُن کا اعادہ اطلاع عام کی غرض سے اور نیز اس بنا پر ضروری ہے کہ آیندہ ہم جو کچھ فیصلہ کریں اُس سے کسی قسم کی غلط فہمی اور بدگمانی نہ پیدا ہو۔

تمام ناظرین الناظر میں سے صرف دو صاحبوں نے ہماری اپیل کو اس قابل سمجھا ہے کہ اُس پر التفات فرمائیں اور اُنکی اس نوازش و کرم گستری پر ہم نہیں جانتے کہ کن الفاظ میں شکریہ ادا کریں۔

حکیم افتخار علی المتخلص بہ جگر اور اُنکے تلمیذ عزیز ماسٹر باسط علی باسط بسوانی

جن کے کلام سے ناظرین ہمیشہ کام آشنا ہوتے رہتے ہیں دونوں صاحبوں نے ہمیں اپنے مدعائے دلی کے حصول میں اس قدر مدد دی ہے کہ اول الذکر نے دو اور آخر الذکر نے ایک "پڑھنے والا" ہم پہنچایا ہے۔ اس رفتار کو دیکھتے ہوے یہ خیال خالی از مبالغہ نہ قرار پائے گا کہ ناظرین الناظر کی تعداد میں مناسب اضافہ کے لیے کم از کم ہمارے احباب کو اتنی مدت تک زحمتِ انتظار و صعوبت زندگی گوارا کرنا ہوگی کہ ہمارا کمسن جانشین سنِ رشد کو پہنچکر الناظر کی خدمت کے قابل ہو جائے۔ کیونکہ ہماری تو ایک چھوڑ دو زندگیاں بھی اتنی طولانی نہیں ہوسکتیں کہ موجودہ بے التفاتی کے اندازہ سے الناظر کے پڑھنے والوں کی تعداد کم سے کم پانچ ہی سو ہو جائے۔

بہرحال ناظرین سے شکایت کرنے کی اب بھی ہم کوئی وجہ نہیں رکھتے۔ البتہ آیندہ کے متعلق ہمیں سوچنا اور قطعی طور پر فیصلہ کرنا ہے اور غالباً آیندہ نمبر میں ہم احباب کو اپنے عندیہ سے مطلع کرسکیں گے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۷، ۸ جلد ۱۳ — یکم نومبر ۱۹۱۵ء

پہلی اُردو ایپک پویم (یا) رزمیہ نظم

یعنے

مُسلسل

واقعاتِ کربلا

از

مراثی میر انیس

مرتبہ

سید منظور علی علوی

قیمت عہ

ملنے کا پتہ :- سید منظور علی علوی - کوٹھی عنایت باغ - امین آباد - لکھنؤ
الناظر بک ایجنسی - کٹرۂ سید حسین خاں - چوک - لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

النّاظر

نمبر ۱۱ جلد ۱۳ — یکم نومبر ۱۹۱۳ء

فن پرواز کی تاریخ

مشرقی ممالک میں انسانی پرواز کا مسئلہ شروع ہی سے غیر ممکنات و لاطائل حرکات کے زمرہ ...

... میں ڈال دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے اس طرف کبھی کما حقہٗ توجہ نہیں کی گئی۔ جن حضرات نے التفات کیا بھی اول تو وہ خود اُسے مذاق و تفنن طبع کا ذریعہ سمجھتے رہے اور اگر اُنھوں نے اُس کو اس روشنی میں نہیں دیکھا بلکہ فن پرواز کو ممکن الوقوع سمجھا اور اپنا خیال اُسکے متعلق ظاہر کیا تو اُنکے معاصرین نے ضرور اُن کو مخبوط الحواس اور پاگل خیال کیا۔ اور اُنکی کوشش ورائے اس قابل نہ سمجھی گئی کہ کسی باوقعت کتاب میں درج کی جائے۔ چنانچہ ہندوستان میں کوئی مستند تذکرہ اس فن کے متعلق اسلاف کی آرا کا دستیاب نہیں ہوتا۔ شادی بیاہ، میلوں ٹھیلوں اور خوشی کے مواقع پر اکثر غبارے اُڑائے جاتے ہیں لیکن اسکا پتہ نہیں چل سکا کہ کس زمانہ سے یہ دستور رائج ہوا۔ قرائن تبلاتے ہیں کہ ہندوستان کے لحاظ سے یہ ایجاد بہت پُرانی نہیں۔

مغربی ممالک نے اس فن کے مستقبل کو نہایت اُمید بھری نظروں سے دیکھا اور کثیر التعداد بیش بہا جانیں اور بے انتہا روپیہ اسکی ترقی کی کوشش پر قربان کر دیا۔ چند نیک نفس حکما کی رائے تھی کہ اس فن کا

پوری دسترس ہو جانے سے انسان کو اپنے ابنائے جنس کے ہلاک و نیست کرنے کا اس قدر با اثر آلہ ہاتھ آجائے گا کہ اگر کسی اور خیال سے نہیں تو محض بقائے نسل کے خیال سے دنیا کی جملہ سلطنتیں اختلافات بین الاقوام کو آپس میں طے کر لینے، یا ثالثی کے ذریعہ رفع کرانے پر تیار ہو جائیں گی۔ معرکہ آرائی اور باہمی کشت و خون دنیا سے ہمیشہ کے واسطے ناپید ہو جائے گا۔ اور جنگ و جدل کا ناخوشگوار نظارہ تواریخ دیرینہ و افسانہ ہائے پارینہ میں سے اپنی جھلک دکھا کر انسانی امور میں اصولِ ارتقا کی حکمرانی کا ثبوت دیگا۔ لیکن اتفاق یا قسمت کی جگر خراش ستم ظریفی نے جہاں مرقومۂ بالا رائے کو محض اُن حکما کی نیک نفسی اور پاکیزہ طینتی ظاہر کرنے کی حد تک قائم رہنے دیا وہاں نفس رائے کی غلطی کو واقعات کی ناقابل تردید منطق سے پورے طور پر ثابت کر دیا۔

ہمارے مغربی بھائیوں نے اس فن کی ترقی پر جو گراں بہا قربانیاں کی ہیں ابھی تک اُن کا محض اتنا نتیجہ نکلا ہے کہ بجائے زمین کے آسمان پر سے بم اور گولے برسا کر معصوم بچوں اور بیگناہ عورتوں کی قیمتی جانیں بلا سبب خاک میں ملائی جاتی ہیں۔ بلکہ تدفین کی آخری اور پاک رسم ادا کرنے کے لیے جو قلیل فرصت و اطمینان ورثا کو درکار ہے اُس سے وہ چونکہ محروم رہتے ہیں اس لیے ان بدنصیبوں کا گوشت و پوست بھی طائران وحشت اور صحرائی درندوں کی ضیافت میں صرف ہوتا ہے۔ اور اُنکے عبادت خانے کتب خانے اور مکانات ناکردہ گناہ ایک آنِ واحد میں خاکستر بن جاتے ہیں۔

کیا اُس حکیم کی رائے واقعی صحیح ہے جو انسان کو فطرۃً [illegible] کہتا ہے اور یہ دلائل ثابت کرتا ہے کہ تعلیم و شائستگی خلقی بدی پر ایک قسم کی ہلکی پولش (Polish) یا صیقل کر دیتی ہے جو اغراض کی حقیقت نما کسوٹی کی ذرا سی رگڑ سے چھوٹ جاتی ہے اور اس طرح اصلیت اپنے ناخوشگوار وجود کو عملی پیرایہ میں ظاہر کر کے آئے دن ساری دنیا کو لاجواب کرتی رہتی ہے۔

کسی مطلب سے کیوں نہ ہو، اس میں شک نہیں کہ یورپ نے اس فن کو نہایت قدر کی نظر سے دیکھا اور اسکے طالبوں اور کاملوں کی شروع ہی سے قرار واقعی منزلت کی۔ یورپ کی خیالی دنیا میں اس فن کے ممکن ہونے کا وجود تیرھویں صدی سے معلوم ہوتا ہے۔ راجر بیکن (Roger Bacon) [illegible]

صدی میں اپنی رائے ظاہر کی کہ اگر ایک بہت بڑا باریک کرہ ایسا تیار کیا جائے کہ اُس میں ہوا یا بھاپ بھری جا سکے تو وہ ہوا پر اُسی طرح چکر لگا سکے گا جس طرح جہاز پانی پر تیرتا ہے۔ البرٹ آف سیکسنی (Albert of Saxony) نے اسی قسم کی رائے ۹-۱۳۶۶ء میں ظاہر کی تھی۔ لیکن خیالی میدان میں یورپ کیا، ساری دنیا کا کوئی ملک ہم سے سبقت نہیں لے جا سکتا۔ عیسوی صدی کے شروع ہونے سے بہت قبل ہندوستان میں اکثر رشی اور سونی، بلا ن پرجہن بجز روحی قوت کے کسی آگ یا بھاپ کا لگاؤ نہ تھا اُڑے اُڑے پھرا کرتے تھے۔ اور ہمارے زمانہ میں بھی بہت سے پیر ایسے ہیں جو مریدوں کی زبانوں کی قوت سے اب تک اُلٹے اُڑے پھرتے ہیں۔

جس طرح خیالی دنیا میں مغربی بھائیوں کو ہمارا لوہا ماننا چاہیے اُسی طرح علمی حیثیت سے ہم اُنکی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اُنکا طرز عمل بالکل جداگانہ ہے۔ وہ دنیا کو دار العمل سمجھتے ہیں اور اس خیال پر پورے طور سے کاربند ہیں جس کا ثبوت اُنکی دنیاوی زندگی زبانِ حال سے دے رہی ہے۔ چنانچہ جس وقت انسانی پرواز کا خیال اُن کے دل میں پیدا ہوا قریب قریب اُسی وقت سے اُس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی شروع ہو گئی۔ اس کوشش نے دو صورتیں اختیار کیں۔

(الف) کچھ لوگوں نے اس اصول کی بنیاد پر کہ تمام رقیق اشیاء میں سبک اور کم وزن چیزیں بھاری اور وزنی چیزوں کے اوپر آتی ہیں پس جو چیز ہوا سے ہلکی ہوگی وہ ہوا پر تیر سکے یا اُڑ سکیگی، مختلف تجربے کرنا شروع کیے۔

(ب) کچھ لوگ اُن اصولوں کے دریافت کرنے کی کوشش میں مشغول ہوے جنکے ذریعہ سے طیور اپنے جسم کو ہوا پر قائم رہ سکتے اور اُڑ سکتے ہیں۔

بنظر وضاحت ہم ان دونوں کوششوں کی ترقی کے مدارج علحدہ علحدہ بیان کریں گے۔ باوجودیکہ ابتدائی کوششوں سے قطع نظر کرکے گزشتہ صدی کے آخر میں دونوں کوششوں کے نتائج نے دوش بدوش ترقی کرنا شروع کی۔

(الف) فرانسس لانا (Francis Lana) نے شہر بریشیا (Brescia) میں ایک کتاب ۱۶۷۰ء میں شایع کی جس میں اس فن کو عملی صورت دینے کے متعلق بحث کی ہے۔ مصنف کی رائے

کے بموجب اگر ایک چوگوشیہ کشتی تیار کی جائے اور اُسکے چاروں گوشوں پر اُوپر کی طرف چار تانبے کے پتّر کے خول دار گولے (جن کا قطرہ ۲ فٹ ہو) لگا دیے جائیں اور کشتی کے درمیان میں ایک بادبان باندھ دیا جائے۔ بعد ازاں ان گولوں میں جن کے پتروں کی موٹائی صرف $\frac{1}{۲۲۵}$ انچ ہوگی، ہَوا نکال لی جائے اور پھر بھر دی جائے تو یہ کشتی اُڑنے لگے گی۔ کیونکہ گولوں کے اندر کی ہوا کا وزن کشتی اور بادبان وغیرہ کے وزن سے زیادہ ہوگا۔ لیکن اس منصوبے نے کبھی عملی صورت نہ اختیار کی اور نہ اپنے بدیہی نقائص کی وجہ سے وہ قابل عمل ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اول تو تانبے کے اتنے باریک پتّر کا اتنا بڑا گولا تیار ہونا ہی قریب قریب غیر ممکن ہے۔ علاوہ بریں بفرضِ محال اگر گولا بن بھی جائے تو ہَوا نکالنے کے عمل میں اُس کا ٹوٹ جانا لازمی ہوگا۔

اس رسالے کے شایع ہونے کے تقریباً ستّر برس بعد دو بھائیوں جوزف مائکل مانٹ گالفیر (Joseph Michel Montgolfier) اور جکیس ایٹن مانٹ گالفیر Jacques Etienne Montgolfier نے، جن کا زمانۂ حیات سنہ ۱۷۴۰-۱۸۱۰ء و سنہ ۱۷۴۵-۱۸۱۱ء تھا بادلوں کو ہوا پر اُڑتا ہُوا دیکھ کر خیال کیا کہ اگر کسی ہلکی چیز یا کُرہ میں بادل کے قسم کی بھاپ بھر دیجائے تو وہ بھی بادلوں کی طرح اُڑنے لگے گی۔ چنانچہ اُنھوں نے سنہ ۱۷۸۲ء میں نہایت ہلکے کاغذ کا بیگ یا تھیلا بنایا اور اُسکو دھویں بلکہ آگ کی بھاپ سے بھرا، جب وہ بالکل بھر گیا تو چھوڑ دیا۔ یہ بیگ اوپر اُڑ گیا۔ تھوڑے ہی روز کے بعد اُنھوں نے اس کا تجربہ حکام و عوام کے سامنے ۵ جون سنہ ۱۷۸۳ء کو بمقام انانی[1] کیا۔ اس مرتبہ غبارہ باریک کپڑے کا بنایا گیا تھا۔ اس کا دَور ۱۰۵ فٹ تھا۔ پھوس کی آگ کے دھویں سے اسکو بھرا گیا اور پورے طور سے بھر جانے پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ بہت دُور اوپر چڑھ گیا اور ۱۰ منٹ تک ہَوا میں رہنے کے بعد $\frac{1}{۲}$ ۱ میل کے فاصلہ پر گرا۔ اِس زمانہ کے طیارے اور زپلن کا مورثِ اعلیٰ یہی غبارہ تھا۔ آگ اسکے ساتھ نہ گئی تھی اس وجہ سے زیادہ دیر تک ہَوا میں نہ ٹھہر سکا۔ اور اندر کی ہَوا کے ٹھنڈے ہو جانے پر زمین کی طرف راجع ہُوا۔ چونکہ آگ کی مدد سے یہ غبارہ

---

[1] Annonay ملک فرانس میں لائنس سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر ایک شہر ہے۔

اوپر چڑھا تھا اس وجہ سے اسے آتشیں غبارہ کہیں گے۔ اس واقعہ کی شہرت تمام دنیا میں ہوگئی۔ دُور دُور سے لوگ تماشہ دیکھنے کو آئے اور موجدین کا نام زبان زد خاص و عام بن گیا۔ اس تجربہ نے سب سے بڑا فائدہ دنیا کو یہ پہنچایا کہ سائنس داں حضرات فن پرواز کی طرف متوجہ ہوگئے۔

پروفیسر سینٹ فانڈ (Professor Saint-Fond) نے پیرس میں تجربہ کے لیے چندہ جمع کیا۔ رابرٹ (Robert) نامی دو بھائی تھے جنھوں نے مسٹر جے۔ اے چارلس (J. A. Charles) کی نگرانی میں ریشمی کپڑے کا ایک غبارہ بنایا۔ چارلس کی تجویز کے مطابق بجائے بھاپ یا دھوئیں کے یہ ہائڈروجن گیس (Hydrogen Gas) سے بھرا گیا۔ ایسی گیس بھرنے میں بہت زحمت ہوئی اس وجہ سے کہ اُس وقت تک آج کل کے سے آلات ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ ۲۷ اگست ۱۷۸۳ء کو وہ اُڑایا گیا۔ قضاء الٰہی سے اُس وقت پانی برسنے لگا لیکن مینھ نے اُسکی اُڑان پر کچھ اثر نہ کیا اور وہ ۳۰۰۰ فٹ کی اونچائی تک چڑھ گیا۔ پون گھنٹہ ہوا میں رہکر ۱۵ میل کے فاصلہ پر گرا۔ جس جگہ گرا وہاں کاشتکار کام کر رہے تھے۔ وہ اُسکو دیکھکر اس قدر ڈرے کہ پہلے تو قریب جانے کی ہمت نہ کی اور بعد کو جب قریب پہنچے تو فوراً اُسے نوچ کر دھجی دھجی کر ڈالا۔ یہ غبارہ چونکہ گیس کے زور سے اوپر چڑھا تھا اس وجہ سے اسے ہوائی غبارے کے نام سے یاد کریں گے۔

مانٹ گالیفر (Montgolfier) جن کا اوپر ذکر آیا ہے اور تجربات کرنے پر مجبور کیے گئے۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک نہایت بھڑکیلے رنگ کے غبارہ کو آگ کی بھاپ سے بھر کر، بادشاہ ملکہ اور ایک جم غفیر کے روبرو ۱۹ ستمبر ۱۷۸۳ء کو اُڑایا۔ اس میں ایک بڑا پنجڑا لٹکا دیا گیا تھا جس میں ایک بھیڑ ایک مرغ اور ایک بطخ بند کر دیے گئے تھے۔ پرواز کی تاریخ میں یہی حضرات سب سے پہلے بزرگ تھے جنھوں نے ہوائی سفر کامیابی سے طے کیا۔ یہ غبارہ ۱۵۰۰ فٹ اونچا گیا اور ۲ میل کے فاصلہ پر جاکے گرا۔ اس کے ہوا میں رہنے کی مدت صرف ۸ منٹ تھی۔ تینوں جانور صحیح و سالم واپس آئے۔

سب سے پہلا انسان جو غبارے پر چڑھا اُس کا نام ڈی روزیر Jean François Pilatre De Rozier

تھا۔ اس نے آتشی غبارے کے نیچے ایک انگیٹھی لٹکا دی جس میں وہ برابر آگ کو ایندھن پہنچاتا جاتا تھا۔ تاکہ غبارہ کی بھاپ کم نہ ہونے پائے۔ اس طرح کا پہلا تجربہ اس نے ۱۵ اکتوبر ۱۷۸۳ء کو نہایت کامیابی کے ساتھ کیا۔ لیکن یہ مقید غبارہ تھا یعنی اس میں ایک بہت لمبی رسّی بندھی ہوئی تھی جو اسکو حتی الامکان ایک جگہ رہنے پر مجبور کرتی تھی۔ تیسرے یا چوتھے تجربے میں ڈی روزیر کے ساتھ ایک دوسرا شخص موسیٰ گراندڈی ویلیٹ (Gerond de Villele) بھی غبارے میں بیٹھ گیا اور دونوں نہایت کامیابی کے ساتھ واپس آئے۔ یہ دوسرا شخص تھا جس نے ہوائی سفر کیا۔

۲۱ نومبر ۱۷۸۳ء کو ڈی روزیر کے ہمراہ مارکوئس ڈی آرلینڈس Marquis de Arlandes . . . . نے آزاد غبارے پر سفر کیا۔ اس میں رسی وغیرہ کی کسی قسم کی روک نہ تھی۔ یہ غبارہ ۲۵ منٹ تک ہوا پر رہا۔ ۵۰۰ فٹ اونچا چڑھ کر ۹۰۰۰ گز کی دوری پر گرا۔ آزاد غبارے پر یہ پہلا سفر تھا جو بنی نوع انسان نے کیا۔ یہ بھی آتشی قسم کا غبارہ تھا۔

اسی سال سب سے بڑا آتشی غبارہ فلس [illegible] نامی ایک شخص نے شہر لائنس (ملک فرانس) میں تیار کیا۔ اس غبارے کا نام بھی فلس تھا۔ اس کا قطر ۱۰۰ فٹ اور اونچائی ۱۲۰ فٹ تھی۔ ۱۹ جنوری ۱۷۸۴ء کو وہ اُڑایا گیا۔ ۷ آدمی اسکی کشتی یا بارکش میں بیٹھے۔ ۳۰۰۰ فٹ اونچا ہوا لیکن صرف ۱۵ منٹ ہوا میں رہا اور گنبد میں خراش پڑ جانے کی وجہ سے اُتر پڑا۔

۱۵ جون ۱۷۸۵ء کو آتشی غبارے کا ایک ایسا تجربہ ہوا کہ اُس نے اُسکے نقائص کو ثابت کر دیا اُسکے بعد سے اس قسم کے غبارے کی پرواز قریب قریب بند ہو گئی۔ ڈی روزیر نے شہر بولن (واقع فرانس) سے انگلستان اُڑ کر جانے کی کوشش میں ایک نئی قسم کا غبارہ تیار کیا۔ یعنی بجائے ایک کے اُس میں دو گنبد لگائے۔ ۳۷ فٹ کے قطر کے ہوائی گنبد کے نیچے ایک چھوٹا آتشی گنبد لگایا جس کا قطر ۱۰ فٹ تھا۔ اسکی غرض یہ تھی کہ گیس کے بجائے صرف کو بچایا جائے۔ اُڑتے وقت ایک دوسرا شخص پے۔ اے رومین P. A. Romain نامی بھی اسکے ہمراہ ہو لیا۔ نہایت کامیابی کے ساتھ سفر شروع ہوا اور آدھ گھنٹہ تک غبارہ بازہبت اچھی طرح اُڑتے نظر آئے۔ یکایک غبارے سے شعلے اُٹھتے دکھائی دیے اور نہ معلوم کس وجہ سے

آگ لگ گئی۔ دونوں بادپیما ... ۲ فٹ کی بلندی سے زمین پر گرے۔ ڈی روزیر فوراً مرگیا اور رومین ۱۰ منٹ زندہ رہ کر جاں بحق تسلیم ہوا۔ عوام نے ان دونوں کے ساتھ بہت ہمدردی ظاہر کی اور ایک یادگار اُس جگہ بنادی جہاں یہ لوگ گر کر مرے تھے۔ یہ اب تک اُنکی ہمت اور جاں فروشی کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے موجود ہے۔ اس سانحے کا اثر تحقیقات کرنے والوں پر محض اتنا ہُوا کہ اُس نے آتشی غبارے کو ناکارہ ثابت کردیا۔ مگر وہ لوگ اِن دو قیمتی جانوں کے ضایع ہونے سے بددل ہوکر اپنی کوششوں سے دست بردار نہیں ہوے بلکہ تحقیقات کا بازار اُسی طرح گرم رہا۔ نقصان کو ضابطہ کی غلطی پر محمول کیا گیا۔ فن پرواز کے ناممکن الوقوع ہونے میں کسی کو مطلق شک پیدا نہ ہوا جس سے اُن اقوام کے زندہ اقوام ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

جے اے چارلس کی یہ تجویز کہ بجاے آگ کی بھاپ کے ہائڈروجن گیس غبارے کے گنبد میں بھری جائے شروع ہی سے بہتر خیال کی جانے لگی تھی لیکن چونکہ آتشی غبارے کو بربناے قدامت عوام کی نظروں میں کسی قدر فضلیت تھی لہذا اُسکے تجربے بھی برابر جاری رہے تا آنکہ ڈی روزیر کی افسوسناک موت نے آتشی غبارے کو تحقیقات کے میدان سے قریب قریب خارج کردیا۔

یکم دسمبر ۱۷۸۳ء کو چارلس نے ہوائی غبارے پر بمراہی رابرٹ دوسرا تجربہ کیا۔ اس غبارے کا قطر ۲ فٹ تھا۔ یہ ... ۲ فٹ بلند ہوا۔ ۲ گھنٹے ہوا میں رہ کر، ۲ میل کے فاصلے پر اُترا۔ رابرٹ کو اُتار کر چارلس فوراً ہی پھر ہوا پر چڑھ گیا۔ لیکن چونکہ بہت تیزی کے ساتھ چڑھا تھا اس وجہ سے کانوں کے پردے میں درد ہونے لگا۔ اور تھوڑی ہی دیر کے بعد اُتر آیا۔ اس غبارے میں کشتی یا بارکش جس میں وہ بیٹھا تھا جال کے ذریعہ سے گنبد میں آویزاں کی گئی تھی۔ یہ طریقہ نہایت مقبول ہوا اور زمانہ حال تک بارکش کو غبارے میں لٹکانے کا طریقہ قریب قریب بالکل ایسا ہی رہا۔

جن تجربات کا اوپر تذکرہ ہوچکا ہے یہ سب یورپ کے برِاعظم پر علی الخصوص فرانس میں ہوے تھے۔ انگلستان میں اگرچہ ۱۷۶۶ء میں ہنری کیونڈش (Henry Cavendish) نے یہ معلوم کرلیا تھا کہ ہائڈروجن گیس معمولی ہوا سے وزن میں بہت کم ہے یعنی معمولی ہوا اُس سے سات گنا بھاری ہے

لیکن کوئی تجربہ پرواز کے متعلق نومبر ۱۷۸۳ء کے قبل نہیں ہوا۔

امریکہ میں بھی مانٹ گلیفر مذکورۂ بالا کے تجربات سے اس فن کی طرف توجہ مبذول ہوئی اگرچہ امریکہ والے اس بات کے مدعی ہیں کہ اُن کے یہاں مانٹ گلیفر کی کامیابی کی خبر پہنچنے کے وقت تجربے ہو رہے تھے اور اُنھوں نے اس فن کو بلا اتباعِ تحقیقاتِ اہلِ یورپ حاصل کیا ہے۔ ممکن ہے کہ انکا دعوےٰ بالکل صحیح ہو لیکن اس واقعہ سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اُنکے یہاں سب سے پہلا تجربہ مانٹ گلفیر کے تجربہ کے بہت دنوں بعد ہوا ہے۔ ان لوگوں نے غبارے کی شکل یورپ کے مروجہ غبارے سے مختلف بنائی۔ ان کے غبارے کو اگر مشین کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر رٹن ہاوس Dr Rettenhouse اور ایف ہاپکنس (F. Hopkins) نے جو کہ انجمن فلسفیہ Philosophical Society واقع شہر فلاڈیلفیہ (Philadelphia) کے ممبر تھے ایک مشین تیار کی جس میں چھوٹے چھوٹے ۴۷ گنبد ایک پنجرہ نما بارکش میں اوپر کی طرف لگا دیے۔ ان گنبدوں میں ہائڈروجن گیس بھر دیا گیا۔ یہ مشین نہایت آسانی سے اوپر چڑھ گئی اور اُس رسی کے ذریعے سے جو اُس میں بندھی ہوئی تھی نیچے اُتاری گئی۔ اسکے بعد چند جانوروں کو پنجرے میں بٹھا لدیا گیا۔ یہ بھی اُڑ اُڑا کر صحیح و سالم واپس آئے۔ بالآخر ایک بڑھئی مسمیٰ جیمس ولکاکس (James Wilcox) کو کچھ روپیہ دیکر پنجرے میں بیٹھنے پر آمادہ کیا گیا۔ جب مشین ہوا میں پہنچ گئی تو وہ رسی جس میں مشین بندھی تھی کاٹ دی گئی۔ یہ مشین دس منٹ تک ہوا میں اُڑا کی۔ لیکن اُسکے دریا کی طرف رخ کرنے پر بڑھئی نے چند گنبدوں میں شگاف کر دیا جس سے گیس خارج ہوگئی۔ مشین زمین کی طرف رجوع ہوئی اور نہایت آسانی سے اُتر آئی۔

مانٹ گلفیر کے تجربے کے ۵ مہینہ بعد انگلستان بھی اس فن کی طرف متوجہ ہوا۔ نومبر ۱۷۸۳ء میں فرانسسکو ذمبیسی Francesco Zambeccari ایک اطالوی النسل باشندۂ لندن نے ایک ۱۰ فٹ قطر کا غبارہ ریشمی کپڑے سے بنایا۔ اسکا وزن ۱۱ پاؤنڈ تھا۔ تیاری کے بعد کئی روز تک عوام کو دکھلایا گیا۔ بعدۂ ۲۵ نومبر کو اسکا تین چوتھائی حصہ ہائڈروجن گیس سے بھر کر ایک بجے دن کو اُڑایا گیا۔ دو گھنٹے تک ہوا میں بہت اُونچائی پر قائم رہنے کے بعد لندن سے ۴۰ میل کے فاصلے پر اُترا۔ ۱۷۸۴ء میں ایک دوسرا

ہوائی غبارہ جس کا قطر ۵ فٹ کا تھا سنڈوچ سے ہوا پر چڑھا اور فرانس کے شہر فلنڈرس میں اُترا۔ ان دونوں مقاموں کا فاصلہ ۷۵ میل ہے۔ یہ پہلا غبارہ تھا جس نے انگلش چینل English Channel کو پار کیا۔ پہلا شخص جس نے اپنی جان عزیز کو، انگلستان میں فن پرواز کا شوق پیدا کرنے کی غرض سے، خطرے میں ڈالا اور غبارے میں بیٹھ کر اُڑا اس کا نام جے ٹائلر J. Tytler تھا۔ ۲۷ اگست ۱۷۸۴ء کو یہ تجربہ کیا گیا۔ غبارہ ہوا میں بہت اونچا گیا اور نصف میل کے فاصلہ پر اُترا۔ لیکن جس شخص نے اس فن کی بنا واقعی طور پر انگلستان میں ڈالی اس کا نام ونسنٹ لونارڈس Vincent Lunardi تھا۔ یہ شخص سفیر نیپلس (Naples) کا سکریٹری تھا۔ اس نے ایک غبارہ بہت جاں فشانی کے ساتھ تیار کیا جس کا قطر ۳۳ فٹ تھا۔ اس غبارے کا اتنا شہرہ ہوا کہ کہا جاتا ہے کہ بیس ہزار آدمی اُسے دیکھنے آئے۔ اُس کے بازوؤں میں پتوار اس امید پر لگائے گئے تھے کہ اُنکے ذریعہ سے غبارے کو اونچا نیچا کرنے میں مدد ملیگی۔ لیکن عملی تجربے نے قیاس کی غلطی کو ثابت کر دیا۔ علاوہ بریں ایک پتوار اُڑان کے شروع ہی میں ٹوٹ کر گر گیا۔ بقیہ ایک نے کسی قسم کی مدد نہ دی۔ ۱۵ ستمبر ۱۷۸۴ء کو اس غبارے میں گیس بھری گئی اور اُڑایا گیا۔ بادپیما نے اپنے ساتھ پنجرے میں ایک کبوتر ایک کتا اور ایک بلّی رکھ لی تھی۔ اُڑان کے شروع ہوتے ہی کبوتر اُڑ بھاگا۔ یہ غبارہ ہوا میں بہت اونچائی پر ڈیڑھ گھنٹے تک رہ کر بخیر و خوبی نیچے اُتر آیا۔ بلّی کو سردی سے متاثر ہو جانے کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ اور فوراً دوبارہ ہوا پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر قائم رہنے کے بعد ہسٹنڈن کے مقام پر اُتر آیا۔ اُس جگہ چند کسان کام کر رہے تھے وہ لونارڈس کو آسمان سے اُترتا دیکھ کر بہت خائف ہوے اور اسکے پاس آنے سے محترز رہے۔ پھر بمشکل سے ہر قسم کا اطمینان دلانے پر قریب آئے اور ضروری امداد کی۔

اس اُڑان سے لونارڈس کی بہت زیادہ قدر ہوئی۔ ہر گلی کوچہ میں اسی کا تذکرہ تھا۔ بہت سے معزز اشخاص و امرا نے اُس کی دعوتیں کیں۔ ہر طرح سے اُسکی قدردانی و ہمت افزائی کی کوشش کی گئی۔ اس تجربے کا بہترین نتیجہ یہ نکلا کہ انگلستان بھی اس فن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ۱۷۸۵ء میں لونارڈس نے متعدد تجربے گلاسگو اور دوسرے شہروں میں کیے۔

آئرلینڈ میں بھی ۱۷۸۵ء میں تجربہ شروع ہوا۔ پہلا شخص جس نے آبنائے سینٹ جارج کو غبارے پر عبور کرکے انگلستان پہنچنے کی کوشش کی اس کا نام کراسبی (Crosbie) تھا۔ مگر اسکی ہمت کو کامیابی کا تاج نصیب ہو سکا۔ کچھ مسافت طے کرنے کے بعد وہ غبارے سمیت سمندر میں گر گیا۔ بدقت جان بچی۔ لیکن شاباش اس جرأت و مردانگی پر کہ اس نے دوبارہ پھر کوشش کی۔ مگر اس مرتبہ غبارہ اوپر نہ اٹھ سکا۔ میگوائر Maguire نامی ایک شخص جو وہاں موجود تھا اس نے بلا اجازت کوشش کرنا شروع کی اور غبارے کو اڑانے میں کامیاب ہوا۔ اور خود بھی اس میں بیٹھ کر اڑا۔ اسکی آئرلینڈ والوں نے بہت قدر کی اور اس ملک کے صوبہ دار نے اسکو نائٹ کا معزز خطاب عطا کیا۔ اسکے بعد قریب قریب ۲۰ سال تک کوئی قابل تذکرہ کوشش آئرلینڈ میں نہیں ہوئی۔ یکم اکتوبر ۱۸۱۲ء کو جیمس سڈلر James Sadler نے آئرلینڈ سے انگلستان اڑکر جانے کی کوشش کی تجدید کی۔ لیکن اس بیچارے کا حشر بھی اپنے پیشرو کراسبی کا سا ہوا۔ ساحل انگلستان پہنچنے کے قریب تھا کہ ہوا مخالف نے آ لے پاؤں میں لیا اور ایک بدوست تھپیڑے نے سمندر میں مع غبارے کے گرا دیا۔ اسکے لڑکے نے اپنے باپ کی آرزو کو پورا کیا یعنی ۲۲ جولائی ۱۸۱۷ء کو آئرلینڈ سے اڑکر صحیح سلامتی انگلستان پہنچ گیا۔ واقعی ہونہار ایسے ہی ہوتے ہیں۔

۱۷۸۵ء میں ان کوششوں کا نتیجہ کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوا جو فرانس سے انگلستان تک اڑکر جانے کے متعلق کی جا رہی تھیں ڈاکٹر جیفریز Jeffries پیرس سے ۲۷ فٹ قطر کے غبارے پر روانہ ہوئے اور بخیر و خوبی انگلستان پہنچے۔ ۷ جنوری ۱۷۸۵ء کو ڈاکٹر جفریز مذکور اور جین پیر بلانچارڈ Jean Pier Blanchard انگلستان سے روانہ ہوئے اور بمقام گیلن کورٹ واقع فرانس میں اترے۔ روانگی کے تھوڑی دیر بعد غبارہ خود بخود مائل بزمین ہوا۔ لوگوں نے پہلے خیال کیا کہ بارکش کا وزن کم ہو جائے، اس میں جتنی چیزیں تھیں سب نیچے پھینک دیں۔ یہ ترکیب کارگر ہوئی اور غبارہ پھر مائل بہ ثریا ہوا۔ عرصہ تک اڑنے کے بعد فرانس کے قریب پہنچا تو پھر زمین کی طرف رجعت شروع ہوئی۔ ہلکا کرنے کی غرض سے بقیہ جتنی چیزیں بارکش میں تھیں وہ بھی پھینک دیں حتیٰ کہ کپڑے تک اتار کر پھینک دیے۔ یہ ترکیب از سر نو کارآمد ثابت ہوئی اور رجعت موقوف ہو گئی۔ اس غبارے کی ساخت میں دوسرے غباروں سے

اتنا فرق تھا کہ گنبد کے نیچے ایک کھلی ہوئی چھتری بند ھی تھی جو بارکش پر سایہ کیے ہوئے تھی ۔ اسکی غایت یہ تھی کہ اگر مشین بگڑ جاوے تو کشتی یا بارکش مع چھتری کے گنبد سے علٰحدہ کر دیا جانے گا۔ چھتری میں ہوا بھرنے کی وجہ سے بارکش کی رفتار زمین کی طرف بہت دھیمی ہو جاوے گی اور چوٹ لگنے کے خطرہ میں کسیقدر کمی ہو جائیگی۔

ڈاکٹر جفریز کی اُڑان کے وقت سے غبارے کے ذریعہ سے علمی تحقیقات بھی شروع ہوئی۔ اُسوقت تک اِن کوششوں اور جانفشانیوں کا کوئی علمی نتیجہ مرتب نہیں ہو سکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے مختلف اونچائیوں پر ہوا کے اجزا کے اختلاف۔ اُس میں حرارت و برودت وغیرہ کی کمی و بیشی کے متعلق تحقیقات کر کے نتائج قلمبند کر لیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُنھوں نے کوئی حیرت انگیز امر دریافت نہیں کیا۔ لیکن علمی تحقیقات کے واسطے ایک نیا راستہ معلوم کرنے کا فخر انھیں کو حاصل ہوا۔ اسکے بعد مختلف ممالک میں دیگر حضرات نے انکے قدم بقدم چلکر بہت ضروری اور قابل قدر امور ہوا کے کُرہ کے متعلق دریافت کیے جنکا تذکرہ آیندہ کیا جائے گا۔

اٹالیہ نے بھی دیکھا دیکھی اس فن کی طرف توجہ شروع کی سب سے پہلا غبارہ اس مُلک میں ۲۵ فروری ۱۷۸۴ء کو اُڑا ۔ ۲۰ منٹ ہوا میں رہ کر اُترآیا۔ ۱۷۸۴ء سے ۱۸۳۶ء تک محققانِ فنِ پرواز نے غبارے کے متعلق کوئی ایسی نئی یا غیر معمولی بات نہیں دریافت کی جس کا اثر اس فن کی آیندہ تاریخ پر پڑتا ۔ وقتاً فوقتاً تجربے ہوتے رہے بعض غبارے ہوا میں دیر تک قائم رہ سکے بعض کو ایسی کامیابی نہیں ہوئی۔ غرضکہ فی الجملہ کوئی اہم نتیجہ مرتب نہیں ہو سکا ۷ نومبر ۱۸۳۶ء میں وکس ہال گرین (Vaux Hull Green) نے ایک اتنی بڑی مشین تیار کی جسکے گنبد میں ۸۵۰۰۰ مکسر فٹ گیس کی گنجایش تھی۔ اسکا نام "ناسو غبارہ" تھا۔ تین آدمی، رابرٹ ہالینڈ Robert Holland، مانک میسن Monk Mason، چارلس گرین Charles Green اس میں بیٹھ کر اُڑے ۱۵ گھنٹے تک ہوا میں اُڑتے رہے اور ۵۰۰ میل کا سفر طے کیا۔ اسوقت تک کسی غبارے کو اسقدر کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ چارلس گرین جو اس غبارے کا مالک تھا اس زمانہ کے مشہور و نامور اُستادوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اسکے قبل ۱۸۲۸ء میں گرین صاحب نے اُڑان کے طریقہ میں ایک نئی جدت کا اظہار کیا تھا۔ یعنی غبارے کے بارکش میں مع گھوڑے کے سوار ہوئے اور زمین پر آنے کے وقت تک گھوڑے سے نہ اُترے۔

باقی آیندہ

محمد عبد الحق

مینا بازار

اکبرآباد میں جب عہدِ جہانگیر کا تھا — ہر جگہ ہند میں غل عدل کی زنجیر کا تھا
مست و مدہوش ہر اک بادۂ توقیر کا تھا — دَور اس دَور میں پیمانۂ تقدیر کا تھا

نہ ہوا کلفتِ دنیا کی نہ غم کے بادل
ہر طرف چھائے ہوئے ابرِ کرم کے بادل

وہ رعایا کو مسرت وہ زر و مال بہت — حال وہ حال کہ ہر حال میں خوشحال بہت
مٹ گئے مفسدہ پرداز و بد اعمال بہت — جتنے سرکش تھے وہ سب ہوگئے پامال بہت

کوئی فتنہ تھا تو وہ سبزۂ خوابیدہ تھا
سبزۂ عدل مگر سبزۂ بالیدہ تھا

شاہ نے پائی تھی بیگم وہ سراپا زینت — رشکِ صد مہر جبیں نور جہاں مہ طلعت
صدقے ایمانِ مسلماں کا وہ کافر صورت — نذرِ مستانہ ادا شیخِ حرم کی طاعت

خود تو پردے میں، مگر ایک جہاں دیوانہ
شمعِ فانوس میں بے چین ہر اک پروانہ

ایک بجلی تھی شجاعت کی جو وہ رشکِ پری — گر پڑی کوند کے جس فوج پہ وہ فوج ڈری
دستِ رنگیں میں چھری خون میں دشمن کے بھری — ایک عورت میں غرض جرأتِ صد مرد جری

عہ فیل ڈلوا دیا جمنا میں شکوہ و شاں سے
پوچھیے ہیبت بیگم کو مہابت خاں سے

قلعہ اُس عہدِ ہمایوں میں تھا رشکِ گلزار — کہ لگایا تھا شہنشاہ نے مینا بازار
شرفا اور امرا جتنے تھے با عز و وقار — آتی تھیں اُن کی بہو بیٹیاں سب پردہ دار

رکھ کے الماس زمرد کے نگینے کے ساتھ
اپنی دوکان کو سجتی تھیں قرینے کے ساتھ

خوب آراستہ بازار نظر آتا تھا — لعل و یاقوت کا انبار نظر آتا تھا
موتیوں کا جو کوئی ہار نظر آتا تھا — نگہِ حورِ جناں تار نظر آتا تھا

چیز بازار میں ہر شے سے جو تھی کم قیمت

عہ دیکھو جنگ مہابت خاں و نورجہاں بیگم تاریخ میں۔

کہتے تھے اہلِ نظر اُس کی دو عالم قیمت

جوہری شہر میں اک اہلِ دول رہتا تھا | گلشنِ حسنِ جوانی کا گُلِ رعنا تھا
غم یتیمی کا تھا اُس وقت سے جب بچہ تھا | چہرۂ مادرِ مشفق کو نہیں دیکھا تھا
اُن دنوں افسردہ دلی صبر کی بھی تاب نہ تھی
صدفِ حسن کا موتی تھا مگر آب نہ تھی

گھر میں آتی تھی جو ہمسائے کی کوئی عورت | تجربہ کار و کہن سال و سراپا برکت
جوہری کو جو بہت دیکھنے کی تھی حسرت | پوچھتا تھا کہ مری ماں کی تھی کیسی صورت
مسکرا کر وہ ضعیفہ تو یہی کہتی تھی
سچ تو یہ ہے تری ماں نورجہاں کی سی تھی

جوہری گھر میں وہ رکھتا تھا زنِ حور سرشت | سامنے جس کے پری زاد بھی اک شکل زشت
وہ بہارِ چمنِ حسن جوانی کہ بہشت | سجدہ کرتے تھے اُسے بت کی طرح اہلِ کنشت
نگہِ شوخ جدھر جائے کلیجہ مل جائے
چشمِ کافر میں وہ جادو جو پری پر چل جائے

وہ جو بازار زنانہ تھا بصد شوکت و شان | اُس میں جا کر وہ لگاتی تھی جواہر کی دکاں
جوہری نے کہا اک روز کہ اے مونسِ جاں | دل میں ہے آرزوئے دیدِ رُخِ نورجہاں
صورتِ قالبِ بےجاں ہوں میں جاں تک لے چل
اپنے ہمراہ کسی طرح وہاں تک لے چل

مسکرا کر کہا بیوی نے کہ سودا ہے تمہیں | جو کبھی ہو ہی نہیں سکتی وہ تمنا ہے تمہیں
ایسی جا خیر سے منظور تماشا ہے تمہیں | چلو یوں ہی سہی مر جاؤ جو مرنا ہے تمہیں
جان دو لاکھ عذابوں سے وہاں کیوں جا کر
سو رہو گھر ہی میں آرام سے ہیرا کھا کر

جوہری بات کوئی سوچ کے دلگیر ہوا | لگ گئی چُپ اُسے اس طرح کہ تصویر ہوا
سخنِ مونسِ جاں دل کے لیے تیر ہوا | عقل رکھتا تھا تو مائل سوئے تدبیر ہوا
تھی مئے شوق بہت جوش میں بے جوش ہوئی
یعنی اک بات تھی وہ خوابِ فراموش ہوئی

گزرے کچھ روز تو گھر میں کوئی عورت آئی — مسکراتی ہوئی با ناز و نزاکت آئی
پڑ گیا پانوں جہاں ایک قیامت آئی — فتنے اُٹھے یہی کہتے ہوے آفت آئی
حسن کے ساتھ غضب ناز و ادا کیا کہنا
اُس سے کہتی تھی جوانی کہ ترا کیا کہنا

دیکھ کر اُس کو زن جوہری ماہ لقا — خیریت پوچھ کے پہلو میں اُسے بٹھلایا
پھر یہ چپکے سے کہا تم کو نہیں پہچانا — نام لو اپنے بزرگوں کا پتا دو گھر کا
ہنس کے بولی نہ محبت مری برباد کرو
کبھی دیکھا تو نہیں مجھ کو؟ ذرا یاد کرو

بات مہمان کی سُن کر وہ بُتِ ترسائی — کچھ تو حیرت زدہ سی رہ گئی کچھ شرمائی
دیر تک سوچ کے یہ بات زباں پر لائی — مجھ کو دنیا کے بکھیڑوں نے کیا سودائی
میں تو بھولی تمھیں جو چاہو سزا دو مجکو
مہربانی ہو جو تھوڑا سا پتا دو مجکو

پہلے خاموش رہی وہ صنمِ فتنہ گر — آنکھ میں ڈال کے آنکھ اُس نے کہا پھر ہنسکر
اے مری راحتِ دل اے مری آرامِ جگر — دیکھ لے بھیس میں عورت کے ہے تیرا شوہر
طالبِ داد ہوں، کیوں کام کیا ہے کیسا
تو نہ پہچان سکی روپ یہ بھرا ہے کیسا

ساتھ لے چل مجھے اس بھیس میں مینا بازار — اب نہ شہزادی کی طرح آئے زباں پر انکار
راز یہ جانے گا کیا لاکھ ہو کوئی ہشیار — مان لے بات مری اے مرے دل کی مختار
ہاں مدد کر مری موقع ہے یہ کیسا اچھا
مسکرا کر کہا بیوی نے کہ اچھا اچھا

بعد کچھ روز کے دو پردہ نشیں مہ جبیں — خانۂ جوہریِ صاحبِ عزت سے چلیں
رنگ رخسار کا ہمرنگِ قبا سے رنگیں — حسن چمکائے ہوے اور بھی زیور کے نگیں
صورتِ درِ عدن تاجِ شہی تک پہنچیں
اے زہے بخت کہ بازارِ شہی تک پہنچیں

بیٹھیں دوکان کو تاجر کی طرح وہ سج کر — رکھے الماس سلیقے سے چنے لعل و گہر

قابل شاہ و شہنشاہ مرصع زیور　　رشکِ خورشیدِ جہاں تاب وہ تاجِ پُرزر
گنج تھا خسروِ پرویز کا اک افسانہ
ایک دوکان ذرا سی وہ جواہر خانہ
کیا کہوں گرمیِ بازارِ شہی کا عالم　　دیکھے رضواں تو یہ گھبرا کے کہے رشکِ ارم
بیویاں سیکڑوں ہر قوم کی باجاہ و حشم　　کوئی لڑکی کسی نواب کی کوئی بیگم
چند شہزادیاں کچھ عورتیں ایرانی بھی
بیاہتا ہند کی رانی بھی مہارانی بھی
سب دکانوں میں بصد ناز و ادا بیٹھی تھیں　　مثل تجار کے اموال چُنا بیٹھی تھیں
زیب و زینت سے سر فرش وہ یوں بیٹھی تھیں　　حوریں جنت کی سب اک بزم میں آ بیٹھی تھیں
کس طرح کھینچیے نقشہ ہے بڑی دشواری
قلمِ قدرتِ یزداں کی عجب گلکاری
پیچھے آئیں نقیبوں کی صدائیں پیہم　　با ادب باش کہ آتے ہیں شہنشاہِ ہمم
کوہِ فرِ کانِ حشم بحرِ سخا ابرِ کرم　　ظلِ سبحانی و غیرت دہِ کیخسرو و جم
شہر میں باپ دادوں کی بھی خوں ریزی کے
شیر بیشۂ تیموری و چنگیزی کے
آئے بازار پئے سیر وہ دو سرورِ واں　　ساتھ سلطان کے بیگم صفتِ بختِ جواں
مثلِ خورشید کے چمکا جو رخِ نور جہاں　　پیچھے بجھنے لگے شعلۂ رخسارِ بتاں
طاقتِ دید سوئے حُسنِ دل افروز کسے
تابِ نظارۂ اندازِ جہاں سوز کسے
خاتمِ مملکتِ حُسن کے تابندہ نگیں　　چال کچھ بڑھ کے قیامت سے قیامت ہی نہیں
مردے کہتے تھے کہ بے چین ہیں ہم زیرِ زمیں　　ناز و انداز میں پنہاں تو ادا میں تمکیں
قتل ہوں دونوں جہاں دیکھ کے بانکی سج دھج
بل پڑے ابرووں پہ تاج مرصع بھی کج
کیا ہو تعریف مناسب ہے مجھے چپ رہنا　　کیسی کیسی سجی ایک ایک دکاں کیا کہنا
لعل و یاقوت و زمرد کا جڑاؤ گہنا　　کچھ لیا کچھ نہ لیا غور سے دیکھا پہنا

بہر اظہارِ کرم رسمِ جہاں بانی سے
بات کر لی کسی بیگم سے کسی رانی سے

الغرض نورجہاں ایک دکاں پہ جاکر
سوچ میں پڑ گئی حیرت زدہ سی گھبرا کر
نیچی کر لی نگہِ شوخ ذرا شرما کر
بڑھ گئی آگے کہا شاہ سے یہ جھنجھلا کر
آج اک داغ بھی ان ماہ جبینوں میں ہے
ہو نہ ہو مرد کوئی پردہ نشینوں میں ہے

شاہ بولے کہ مری جان عبث ہے یہ خیال
مرد کیسا کہ فرشتہ کی نہیں ہے یہ مجال
اُڑ کے آئے کوئی طائر تو کیا جائے حلال
جھک کے دیکھے جو فلک اُس پہ چلے تیغِ ہلال
چشمِ نرگس بھی کسی آنکھ سے گر لڑ جائے
درۂ موجِ نسیمِ سحری پڑ جائے

مسکرا کر یہ کہا نورجہاں نے اے شاہ
بعد مدت کے پڑی مجھ پہ محبت کی نگاہ
ایک بجلی سی گری جان پہ اللہ گواہ
تاڑ لی جاتی ہے مشتاق کی آنکھوں سے چاہ
جانتی ہے وہی عورت جو خبر رکھتی ہے
نظرِ مردِ جواں اور اثر رکھتی ہے

سن کے یہ شاہ سراپا ہوا غصے سے لال
اور چہرے سے عیاں ہونے لگا جاہ و جلال
لب تو خاموش مگر دل میں تجسس کا خیال
ناخنِ فکر نے وا کی گرہِ امرِ محال
حکم خدامِ ادب کو دیا جلدی جاؤ
نہر اک نہر سے جمنا کی ابھی کھدواؤ

ڈیڑھ گز سے نہ کسی جا ہو زیادہ چوڑی
نصف گز بلکہ ذرا اس سے بھی ہو کم گہری
قلعہ کے درسے ہو دیوار کی حد تک بہی
صاف پانی بھی رواں اُس میں ہو جیسے موتی
بیچ میں نہر، ادھر قصر تو بازار اُدھر
حبشنیں بھی ہوں کھڑی کھینچ کے تلوار اُدھر

نوجواں - شیرژیاں - پیل دماں سب دوسو
حکم خفیہ اُنھیں حاصل نہ کھلا جو یک جو
صف بہ صف فوج اور اُس فوج میں تیغوں کی ضو
شکنیں ابروؤں کی موجِ لبِ نہرِ نو
رنگ ہیبت کا بھی چہروں پہ سیاہی کی طرح

گلی قاسم جان کے سوائے اور کہاں کی ٹکسال ڈھال سکتی تھی کہ

ساقی، شراب کے لیے فصلِ بہو نہیں	بہتر ہے جام زر سے پیالہ سفال کا

(مرزا کے دیوان میں بھی ایک مصرعہ اسی مضمون کا موجود اور مشہور ہے۔ جام زر سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے)

یا مثلاً	آبرو کیا پیرہن جیب بے گریباں رہ گیا	بارے آنسو بجھ گئے میرے کہ داماں رہ گیا

ہیں یہیں کے یہ بھی پھر اٹھا لے گئے	جو کیا تھا ہم نے یاں پیدا وہ سب یاں رہ گیا

کھائیں کیوں غم گر نہیں باقی نشانِ جوئے شیر	کیا وہ شیریں رہ گئی اس کا شبستاں رہ گیا؟

جو لوگ مرزا اور دلی کے اعلیٰ طبقے کی زبان سے لذت آشنا ہیں وہ اس آخری مصرعے کو:- کیا وہ شیریں رہ گئی اس کا شبستاں رہ گیا؟ پڑھتے ہی پکار اٹھیں گے کہ انکے سوائے یہ ترکیب اور طرز بیاں کہیں آ ہی نہیں سکتا۔

غزل دیگر:-

غم اس کا کیا کہ وہ دلّالہ پہ خفا ہوگا	نہ آئے گا مجھے پیغام! اور کیا ہوگا؟
بفرض دیں گے اگر وہ صلائے بخششِ عام	مجھے نہ حوصلۂ عرضِ مدعا ہوگا
گرے گا اوجِ ہوا سے مجھی پہ بن کر برق	یہ نالۂ شرر افشاں اگر رسا ہوگا
عدو کا تم سے جو جھگڑا اٹھا کیا تاب ٹا	مگر وہ قصہ مرا نقشِ مدعا ہوگا
تری گلی میں ہے آمد شدِ رقیب کا ذکر	ابھی تو کیا ہے یہ چرچا ہزار جا ہوگا
یہ عالم، آئنہ ہے تیرے روئے زیبا کا	وہ تو ہی ہوگا اگر کوئی دوسرا ہوگا
فقیر بن کے گیا واں تو کیا سوال کروں	مگر کہوں کہ بھلا کر ترا بھلا ہوگا

شراب و شاہد و مطرب سے کام رکھ ناظم
کسے خبر ہے کہ انجام کار کیا ہوگا

مقطع سے پہلے شعر کا مضمون خود مرزا کے ہاں بہت خوبی کے ساتھ اس طرح بندھا ہے:

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا	اور درویش کی صدا کیا ہے

اسی طرح یہ مضمون خاص مرزا کا تھا کہ

ہجومِ گریہ نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

معلوم ہوتا ہے اسی کو بے پروائی کے ساتھ ناظم کے ہاں یوں کہ دیا ہے :۔

آئے ہیں میرے گھر وہ مجھے دیکھنے کو جب
گر گرکے در بصورتِ دیوار ہو گیا

اشعار کے ان مقابلوں سے علاوہ اُس قول کے جو ہم فٹ نوٹ میں لکھ آئے، مولوی حالی مرحوم کا یہ قول بھی تائید پاتا ہے کہ مرزا صاحب جو شعر (خود اپنے لیے) لکھتے تھے اُن میں بڑی محنت اور جگر کاوی سے کام لیتے تھے۔

ناظم

کیوں خواہش کے مطابق دی مراد
جس نے بے خواہش ہمیں پیدا کیا

ہے لڑائی اب تو آؤ سامنے
صلح میں ہم سے بہت پردا کیا

کل بھی ہے نزدیک دیکھیں کیا کہے
آج جس نے وعدۂ فردا کیا

لڑ تو آیا اُس سے لیکن، ہمنشیں
دل میں کہتا ہوں کہ ناظم کیا کیا؟

دیگر

جوش کیوں مر گئے پر زخمِ کہن میں آیا
خوں کا دھبّا جو نظر میرے کفن میں آیا

کھل گئی بات کہ پروانے سے تھا لگاؤ
جب گداز جگر شمع لگن میں آیا

سرمہ و غازہ سے کیا حسنِ خداداد کو کام
فرق ناحق ترے بیساختہ پن میں آیا

ایک اور غزل اس قابل ہے کہ یہاں نقل کی جائے :۔

آج اُن سے پھر احوالِ دلِ زار کہوں گا
کہتے ہوئے ڈرتا ہوں یہ ناچار کہوں گا

غصّے میں کہا ہو کہ ہم اب کچھ نہ کہیں گے؟
گر آپ سُنیں گے تو میں سو بار کہوں گا

پہلے کہے دیتا ہوں تم آزردہ نہ ہونا
دلچسپ لطیفے بھی میں دو چار کہوں گا

جس آئینے میں جو نظر آجائے گا مجھکو
البتہ اُسے عکسِ رخِ یار کہوں گا

تم دیدۂ گریاں کو کہا کرتے ہو ناسور
میں ضد سے اسے 'ابرِ گہربار' کہوں گا

آوارۂ و سرگشتہ، مجھے کہتے ہو؟ اچھا!
میں بھی تمھیں بے مہر و ستمگار کہوں گا

گھر بیٹھے ہوئے تم جو کہو گے مجھے مجنوں　　میں تم کو نا ' لیلیٰ ' سر بازار کہوں گا؟
دن کو اگر آنا نہ ملے گا مجھے دَر پر　　مَیں رات کو آکر پسِ دیوار کہوں گا
دُکھتی کہوں، اور کرنہ سکو مجھ سے شکایت!　　اُس چشمِ فسوں ساز کو بیمار کہوں گا
تم چاند سے مکھڑے پہ کیا کیجیو نازش　　میں کاکلِ مشکیں کو شب تار کہوں گا

اُستادنے راہیں مجھے بتلائی ہیں ناظم
اب اور ہی انداز کے اشعار کہوں گا

غرض کہاں تک لکھا جائے۔ متعدد غزلوں میں شعر کے شعر ایسے ہیں جنھیں غالب کے سوا کسی اور کا کہنا دشوار ہے۔

مرزا صاحب کی ایک مشہور غزل کا مصرعہ ہے:

غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

ناظم کے ہاں بالکل یہی مضمون اس طرح بندھا ہے:

گر غمِ عشق نہ ہوگا غمِ دنیا ہوگا　　(صفحہ ۲۴)

یا ناظم کی ایک غزل: غیر سے دلدار خفا ہوگیا ؛ ناوکِ بیداد خطا ہوگیا۔) میں مصرعے کے مصرعے مرزا کی ایک غزل کے اشعار سے مشابہ ہیں:

ناظم۔　　قبلہ مجھے قبلہ نما ہوگیا
غالب۔　　قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
ناظم۔　　خامہ مجھے مہر گیا ہوگیا
غالب۔　　خارِ رہ کو ترے ہم مہرگیا کہتے ہیں

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ناظم کے ہاں اکثر وہی مضمون ایسی خوبی اور تازگی کے ساتھ نہیں بندھا ہو جو غالب کے ہم مضمون شعر میں نظر آتی ہے۔ پھر بھی بعض بعض شعر دیوان ناظم میں ایسے ہیں کہ اگر دیوان غالب میں ہوتے تو اُس کے اچھے شعروں میں شمار کیے جاتے۔ مثلاً:

ہجومِ غم سے ہوا تنگ حوصلہ دل کا　　زباں پہ دم بہ دم آئے نہ کیوں گلہ دل کا۔

فروغ، حُسن سے پاتا ہے خانوادۂ چشم — علاقہ عشق سے رکھتا ہے سلسلۂ دل کا

نہ دردِ رشک رہے گا نہ رنجِ پاسِ وفا
عدو سے کیجیے ناظمؔ سبا دلہ دل کا

مرزا کی مشہور غزل کا بے نظیر مطلع ہے:-

ستایش گر ہے زاہد جس قدر اس باغِ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

اسی زمین میں ایک غزل ناظمؔ کے ہاں بھی موجود ہے اور سراسر غالبؔ کی کہی ہوئی معلوم ہوتی ہے اسی کا یہ شعر مطلعِ بالا سے ٹکراؤ۔

قدح گردانیوں میں محو ہیں کوثر کو کیوں پوچھیں — وہ اک جامِ لبالب ہے ہمارے طاقِ نسیاں کا

گویا ایک ہی کیاری کے دو پودے، ایک ہی دریا کی دو شاخیں ہیں۔ اور گو غالب کا مطلع بہت بلند ہے پھر بھی ناظمؔ کا شعر معیارِ عام میں جانچا جائے تو بہت اچھے شعروں میں شمار کیا جائے گا۔ فقط

(باقی پھر کبھی) — سیّد ہاشمی (فرید آبادی)

غزل مولانا رضا علی وحشتؔ از کلکتہ

دل کے کہنے پہ چلوں عقل کا کہنا نہ کروں؟ — سخت حیران ہوں میں کیا کروں اور کیا نہ کروں

زندگی اپنی کسی طرح بسر کرنی ہے — کیا کروں آہ اگر تیری تمنا نہ کروں!

جلوۂ لالہ و گل سیر کے قابل ہی سہی — میں ترے چہرۂ زیبا کا تماشا نہ کروں؟

رات ذلت جو اُٹھائی ہے وہ کیا ہو لیگی — یہی بہتر ہے اب اس بات کا چرچا نہ کروں

مجلسِ وعظ میں کیا میری ضرورت ناصح — گھر میں بیٹھا ہوا شغلِ مے و مینا نہ کروں؟

مست ہے حال میں دل بے خبر مستقبل — سوچتا ہوں اسے ہشیار کروں یا نہ کروں

کس طرح حُسنِ زباں کی ہو ترقی وحشتؔ
میں اگر خدمت اردوے معلّٰے نہ کروں

یومنون بالغیب

سورۂ بقر میں ارشاد فرمایا گیا ہے الٓمّٓ ۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ الخ (ترجمہ) الٓم ۔ اس کتاب میں کچھ شک نہیں ڈرنے والوں (پرہیزگاروں) کے لیے ہدایت ہے جو اَن دیکھے پر ایمان لاتے ہیں ۔ الخ ۔ ان آیتوں میں پانچ صورتیں بیان کی گئی ہیں:

(الف) جو آنکھ سے اوجھل پر ایمان لاتے ہیں

(ب) درستی سے نماز ادا کرتے ہیں ۔

(ج) جو کچھ خدا نے دیا ہے اُس میں سے دیتے ہیں ۔

(د) اُس پر ایمان لاتے ہیں جو رسول عربی پر نازل کیا گیا ہے اور جو عربی رسول سے پہلے نازل کیا گیا تھا ۔

(ھ) آخرۃ پر بھی یقین رکھتے ہیں ۔

غیب اُسے کہتے ہیں جو آنکھ سے اوجھل ہو ۔ عام طور پر یہ قیاس کیا گیا ہے کہ اس آیت میں غیب سے وہ ذاتِ صمدی مُراد ہے جو با وجود ہونے کے نہ آنکھ سے اور نہ کسی اور حواس سے محسوس ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے بجز اسکے کہ عقل کہتی ہے کہ ایسی ذات ہے ۔ عبداللہ ابن عباسؓ اپنی تفسیر میں اسکے متعلق کہتے ہیں کہ

وَيُقَالُ الْغَيْبُ هُوَ اللهُ

مطلب یہ کہ پرہیزگار وہ ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں ۔ کیسے اللہ پر جو آنکھوں اور حواس سے مخفی اور اوجھل ہے ۔ فقرۂ یومنون بالغیب میں صراحتہً خدا کا نام نہیں لیا گیا بلکہ کلیہ کے رنگ میں یہ کہا گیا ہے کہ جو لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر غیب طاقتیں یا غیب ہستیاں اور کیفیات ہیں اُنکی ہستی پر ایمان لانا یا اُنکی ہستی کی بحیثیت ایک ہستی کے تصدیق کرنا ۔ یا اُن کا یقین کرنا ایمان داری یا پرہیزگاری کی سب سے پہلی علامت یا دلیل ہے ۔

اگرچہ سب یا اکثر مفسرین قرآن نے غیب سے مراد خدا بھی لیا ہے لیکن الفاظِ آیت اس امر کے مانع نہیں ہیں کہ خدا کے سوائے اور مغیبات کا بھی قیاس کیا جائے یا اور مغیبات بھی اس سلسلہ میں درجہ بدرجہ رکھے جائیں۔ قرآن مجید میں حشر و نشر اور زندگی ثانی دوزخ و بہشت وغیرہ کی بابت جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سب کچھ مغیبات میں ہی شامل ہے اگرچہ اُنکی مجازی نظیریں دنیا میں بھی برائے نام مل سکتی ہیں لیکن جو کیفیت اُنکی بیان کی گئی ہے وہ بہرحال اوجھل اوراَن دیکھی ہے۔ رُوح بھی ایک اوجھل اوراَن دیکھی طاقت یا ہستی ہے۔ اُسکی تمثیل اور نظیر یا مجازی عکس بھی موجودات میں نہیں پایا جاتا۔ وہ بھی مغیبات میں شامل ہے۔ اس صورت میں بمنشاے یومنون بالغیب آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ

غیبی سلسلہ میں اس قسم کی سب ہستیاں درجہ بدرجہ شامل ہیں اوراُن سب پر ایمان لانا علامت یا دلیل پرہیزگاری ہے۔

چونکہ ان سب میں سے ذات صمدی بوجہ اپنے علو اور لطافت کے بے نظیر، اوجھل اور عدیم المثل اَن دیکھی ہے اس واسطے اُسی کو مقدم رکھا گیا اور اُسی کے ایمان لانے پر اَور مغیبات کی بھی تصدیق موقوف رکھی گئی۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ غیب یا اوجھل پر ایمان کس طرح لایا جائے۔ کیونکہ جو شے دکھائی ہی نہیں دیتی نہ اُس کا احساس ہو سکتا ہے اُس پر ایمان لانا کیسے ممکن ہے۔ ایمان کا مفہوم ایقان و تصدیق ہے یہ صورت اُس وقت تک ہستی پذیر نہیں ہو سکتی جب تک کوئی شے یا کوئی وجود بوجہ احسن ادراک میں نہ آئے۔ ایک طرف ایک شے یا ایک ہستی اوجھل مانی جاتی ہے یہاں تک کہ اُس کا احساس بھی نہیں ہو سکتا۔ اور دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ

اُس پر ایمان لانا ہی دلیل ایمان اور پرہیزگاری کی ہے۔

قبل اسکے کہ ہم اس خدشہ کی بابت جواب دیں یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ غیب سے درحقیقت مراد کیا ہے اور غیبوبت کتنے اقسام کی ہے اور ہر قسم کی حد اور وسعت کیا ہے ؟

غیب سے مراد اوجھل اوراَن دیکھی یا لامعلوم کیفیت یا ہستی ہے۔ جو چیز یا جو شے نہیں دیکھی گئی

وہ بھی غیب ہے اور جو نہیں دیکھی جاسکتی وہ بھی سلسلۂ غیب میں داخل ہے۔

دنیا یا موجودات میں اشیا یا ہستیوں کی مندرجۂ ذیل صورتیں پائی جاتی ہیں

(الف)　جاننے کے قابل۔

(ب)　نہ جاننے کے قابل۔

(ج)　معلومہ۔

(د)　لامعلومہ۔

بہت سی ایسی ہستیاں اور اشیا رہیں کہ جو جاننے کے قابل ہیں اور ہیں اُن کا علم بھی ہے اور بہت سی ایسی ہستیاں بھی ہیں جو جاننے کے قابل تو ہیں لیکن وہ یا تو بہیئتِ مجموعی لامعلومہ ہیں اور یا بعض مراتب معلومہ اور بعض مراتب لامعلومہ۔ اور اکثر ہستیاں ایسی بھی ہیں جو جاننے کے قابل ہی نہیں۔ نہ اس وجہ سے کہ اُنکی ہستی نہیں یا وہ کوئی کیفیت نہیں رکھتیں بلکہ اس وجہ سے کہ یا تو ہم اُنھیں اپنی ادراکی حدود کے اندر جان نہیں سکتے۔ اور یا وہ جانی نہیں جاسکتیں۔

اس شق کی تمام ہستیاں لامعلومہ ہیں۔ نہ بحیثیت مطلق علم اور مطلق آگاہی کے بلکہ باعتبار کنہ اور حقیقت تامہ کے بھی۔ مطلق علم کی صورت میں ہم رُوح کے قائل ہیں لیکن کُنہ اور حقیقتِ تامہ کی جہت سے وہ لامعلومہ شق میں داخل ہے۔ قرآن مجید میں بھی روح کے سوال پر اس لہجہ میں باطلاق "قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی" جواب دیا گیا ہے۔

غیب یا او جھل اشیا، یا طاقتوں اور ہستیوں کی قسمیں یا صورتیں مندرجۂ ذیل ہوسکتی ہیں۔

(۱)　غیب عین۔

(۲)　غیب احساسی۔

(۳)　غیب ادراکی۔

(۴)　غیب عقلی۔

(۵)　غیب فطری۔

غیبِ عینی سے وہ مغیبات مراد ہیں جو احاطۂ نظر یا نورِ چشم سے دور اور اوجھل ہوں اگرچہ موجودات میں کوئی شے یا کوئی ہستی موجود ہی ہو لیکن ہم اگر اُسے خود نہ دیکھیں تو وہ ہمارے مقابلہ میں غیب ہے۔ شہر مکہ اگرچہ طبقۂ زمین پر موجود ہے لیکن ہماری نگاہوں سے غیب ہے۔ پس دیوار جو کچھ ہے اگرچہ موجود ہے لیکن ہم سے غیب ہے۔ جو کچھ کل گویا دوسری گھڑیوں میں ہونے والا ہے اگرچہ قوۃً موجود ہے لیکن فعلاً ہم سے غیب ہے۔

چونکہ ہم خدا کی ذات کو ان آنکھوں سے باعتبار ایک وجود اور ایک ہستی کے نہیں دیکھ سکتے یا نہیں دیکھتے اس واسطے کہا جائے گا کہ خدا ہماری آنکھوں سے غائب ہے اور وہ مغیبات عینی میں داخل ہے۔

اُسی غیب سے وہ مغیبات مراد ہیں جو بحیثیت علم ایک وجود کے بھی قابلِ احساس نہ ہوں یا بتصور عدمِ علم وجودِ احساس کے قابل نہ ہوں۔

ہم وجودِ زید کا عینی احساس کرتے یا کر سکتے ہیں اور وہ ان معنوں میں ہماری نگاہوں یا احساس نظری سے غیب نہیں لیکن زید کی اندرونی کیفیتیں نظری اور احساسی ادراک سے غیب ہمتی ہیں۔

غیبِ ادراکی وہ ہے جس کا ادراک یا تو ہم کر ہی نہیں سکتے اور یا وہ ادراک کے قابل ہی نہیں۔

غیب عقلی وہ ہے جو حیطۂ عقل سے ہی باہر ہو یا عقل کی وہاں تک رسائی نہیں اور یا عقل وہاں تک رسائی کر ہی نہیں سکتی۔

غیب فطری وہ ہے کہ فطرت میں بھی اُس کا کوئی نشان اور احساس نہ پایا جائے یا فطرت اُسکے ادراک اور احساس سے عاری اور قاصر ہو۔

قرآن مجید نے جن مغیبات پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے وہ مغیبات بلحاظ اپنی ہستی اور وجود کے مغیبات واقعیہ میں شامل نہیں ہیں کیونکہ اُنکا وجود اور ہستی موجود ہے بلکہ صرف اس وجہ سے کہ اُنھیں یا تو آنکھ دیکھتی نہیں اور یا دیکھ ہی نہیں سکتی۔ یا وہ احساس اور ادراک میں آتے نہیں یا آ نہیں سکتے۔ یا اُنھیں عقل معلوم نہیں کرتی یا کر ہی نہیں سکتی۔ یا اُنکی ودیعت فطرت میں نہیں ہوئی یا فطرت اُن تک

جوش ایک ایک طبیعت میں سپاہی کی طرح

آگیا آگیا بازار اُجڑنے کا وقت | آگیا آگیا اب قید میں پڑنے کا وقت
آگیا آگیا قسمت کے بگڑنے کا وقت | آگیا آگیا تقدیر کے لڑنے کا وقت
کیا خبر کون گرفتارِ بلا ہوتا ہے
چرخ چکّر میں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے

اٹھی بازار سے باناز و ادا ہر روپوش | راہ میں نہر نظر آئی تو جاتے رہے ہوش
ایک منہ ایک کا تکنے لگی حیران و خموش | اُتریں پانی میں سبھی اور اُتاری پاپوش
خادمہ سے کہا اُس پار کہ پہنا پہنا
راستہ گھر کا لیا پاؤں میں جوڑا پہنا

خانۂ جوہریِ شوخ سے دورِ رشکِ پری | زیب و زینت سے جو آئی تھیں بصد جلوہ گری
نہر تک ناز سے آئیں صفتِ کبکِ دری | مثل آہو کے زقند ایک نے شوخی سے بھری
کہ کے چپکے سے کہ تھوڑا سا یہ پانی کیا ہے
سوچ اے قوّتِ آغازِ جوانی کیا ہے

پھنس گئی سخت بلا میں وہ پہنچکر اُس پار | ایک نے مشکیں کسیں سب نے سنبھالے ہتھیار
روکے قیدی نے کہا آہ نہیں کوئی یار | خوب ذلت مجھے دی کیوں فلکِ ناہنجار
بیکسی تیرے سوا کون ہے غمخواروں میں
ایک گردن زدنی سیکڑوں تلواروں میں

قصر میں شاہ کا وہ تخت مرصع پہ جلوس | پاس بیٹھی ہوئی وہ نورجہاں رشکِ عروس
حبشنیں لائیں گنہگارِ سراپا افسوس | بند آنکھیں کیے اور جان سے اپنی مایوس
کھینچ کر تیغ جہانگیر بہت جھنجھلایا
ملک الموت نے گھبرا کے کہا میں آیا

رعد کی طرح گرج کر یہ کہا او کمبخت | تجکو آتی نہیں کچھ شرم و حیا او کمبخت
مجھ سے جاتا ہے کہاں بچ کے بھلا او کمبخت | زن ہے یا مرد ہے تو مجکو بتا او کمبخت
روکے قیدی نے کہا یہ ہمہ تن درد ہوں میں
صاف کہتا ہوں کہ عورت تو نہیں مرد ہوں میں

شہ نے فرمایا بگڑ کر کہ قضا ہے تیری
سب خطاؤں سے نرالی یہ خطا ہے تیری
جو کسی کو نہ ہوئی ہو وہ سزا ہے تیری
کہ جو کہنا ہے ذرا دیر بقا ہے تیری
سُن کے اس حکم کو مجرم بھی سنبھل کر بولا
اور کس شان سے تیور وہ بدل کر بولا

اے شہنشاہِ خطاپوش یں اک بد قسمت
بچہٗ جوہریِ صاحبِ مال و دولت
گود میں تھا کہ ہوئی ماں کی جہاں سے رحلت
ہوش آیا تو نہ دیکھی وہ مقدس صورت
عورتیں کہتی تھیں اُس سروِ رواں کو دیکھو
دیکھنا ماں کو جو ہو نورِ جہاں کو دیکھو

اب تو دنیا یں مجھے کوئی تمنا ہی نہیں
ہر گھڑی سر میں جو رہتا تھا وہ سودا ہی نہیں
جان لو۔ قتل کرو۔ کچھ مجھے پروا ہی نہیں
کیا اُسے خوف کسی کا جسے جینا ہی نہیں
بند ہو جائے مری آنکھ زباں کی صورت
دیکھنا کچھ بھی نہیں دیکھ کے ماں کی صورت

سُن کے یہ قصۂ غم تخت سے اُٹھی بیگم
دل سنبھالے ہوے ہاتھوں سے بچشمِ پُرنم
آہ بیٹھی ہوئی آواز تو اُکھڑا ہُوا دَم
جیسے اولاد کا صدمہ کوئی وہ رنج والم
پہلے کہتی رہی کچھ دیر وہ بیٹا بیٹا
پھر یہ لپٹا کے گلے سے کہا میرا بیٹا

حکم شاہی ہوا خُدّام کو جاؤ جاؤ
خلعتِ بیش بہا سامنے جلدی لاؤ
موتیوں کا کوئی کنٹھا بھی اسے پہناؤ
جوہری سے یہ کہا پاس ہمارے آؤ
جوہری آئیں جو سرکار میں تم پیش کرو
مال جو پیش ہو دربار میں تم پیش کرو

شاہ کی عقل رسا ذہن رسا کیا کہنا
جوہری نے بھی عجب کام کیا کیا کہنا
خوب بیگم نے بھی پہچان لیا کیا کہنا
کیا مسدس یہ لکھا واہ فضا کیا کہنا
بھر دیا رنگ طبیعت نے تو رنگیں ہے یہ
خوب گلدستۂ گلہاے مضامیں ہے یہ

شیخ محمد علی جاہ فضا

کلام ناظم اور اس کا تعلق غالب سے

نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور شعرا کے بڑے قدردان اور مرزا غالب مرحوم کے شاگرد تھے۔ اور اُن کا دیوان جو ۱۲۸۵ھ میں مطبع حسنی رامپور سے شایع ہوا، غالباً تمام وکمال مرزا صاحب مرحوم کا دیکھا ہوا ہے۔ اور یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ ناظم کے اکثر اچھے اور زباں زد اشعار خاص غالب کے کہے ہوے ہیں۔ چنانچہ اس شعر کے متعلق بھی

خوشی جینے کی کیا مرنے کا غم کیا ؟ ہماری زندگی کیا اور ہم کیا!

اسی قسم کی روایتیں مشہور ہیں۔ یہاں تک کہ مولوی حالی مرحوم نے کسی جگہ اسے غالب ہی کا بتایا ہے اور جب اُن سے دریافت کیا گیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ "مجھے تو ایسا ہی یاد ہے"۔ حالانکہ سب اسے ناظم سے منسوب کرتے ہیں اس اعتراف کے ساتھ کہ "اسے کہا غالب نے تھا مگر اپنے عالی رتبہ شاگرد کو دیدیا اور اب وہ ناظم ہی کا کہلائے گا"۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ آخری جزوِ روایت بھی کسی قدر تحقیق طلب ہے کیونکہ مولوی حالی کے مذکورۂ بالا قول کے علاوہ، جس مطبوعہ دیوانِ ناظم کا ہم نے اوپر ذکر کیا اُس میں یہ کہیں نہیں نظر آتا اگرچہ ممکن ہے کہ اُسکی ترتیب کے بعد یہ شعر مرزا نے ناظم کو دیا ہو۔ بہرحال اس میں شاید ہی کسی کو شک ہوگا کہ درحقیقت یہ شعر غالب کے دماغِ فلسفی اور زبانِ پُراثر کا میوہ ہے۔

ناظم کے اکثر اشعار کی نسبت ایسی خارجی شہادتیں مل سکتی ہیں کہ وہ (بقرائنِ متعدد) غالب کے ہیں اور خارجی شہادت سے ہماری مراد وہ سیاق اور طرزِ انشاپردازی ہے جو خاص غالب کا آفریدہ اور ترتیب دادہ ہے۔ اُن کی نادر ترکیبیں، خیالات کی بلندی اور پیرایۂ بیان کی دلکش تازگی وہ خصوصیات ہیں جو اُنکے کلام کو سب سے علیحدہ اور نمایاں کردیتی ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ صاحبانِ ذوق جنھوں نے غالب کا کلام غور سے مطالعہ کیا ہے اُن کے اشعار کو، بغیر قائل کا نام معلوم ہوے، بہ آسانی پہچان سکتے ہیں۔ اور یہی وہ خاص پہچان اور رنگ ہے جس کی بنا پر ناظم کے اشعار دراصل اُن کے اُستاد کے سمجھے جاتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ اور کوئی قطعی یا داخلی شہادت اس قسم کی میسر نہیں آسکتی کہ فلاں اشعار خود مرزا نے لکھکر

اُنھیں دیے تھے یا فلاں پر صرف اصلاحی صیقل کیا تھا"۔ البتہ ہمارے علم میں ایک ایسی بھی غزل (مطبوعہ دیوان ناظم) آئی ہے جس کی نسبت ایک معتبر عینی اور آنی گواہی ہمیں ملی۔ اور یہ واقعہ معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ نواب یوسف علی خاں صاحب نے مرزا سے فرمایش کی کہ کوئی بالکل نئی وضع کی غزل بھیجو جس کا پیرایۂ بیان اور رنگِ تغزل و مفہوم اُردو فارسی کے سارے شاعروں سے جدا ہو! اسکی تعمیل میں مرزا صاحب نے یہ غزل جو دیوان ناظم کے صفحہ ۸۸ و ۸۹ پر درج ہے۔ تیار کی:۔

میں نے کہا کہ دعویِ الفت مگر غلط؟ — کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط!
تاثیرِ آہ و زاریِ شب ہائے تار جھوٹ — آوازۂ قبولِ دعاے سحر۔ غلط
سوزِ جگر سے ہونٹ پہ بتخالہ۔ افترا — شورِ فغاں سے جنبشِ دیوار و در، غلط
ہاں سینے سے نمایشِ داغِ دروں دروغ — ہاں آنکھ سے تراوشِ خونِ جگر، غلط
آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجیے — عشقِ مجاز و چشمِ حقیقت نگر، غلط
بوس و کنار کے لیے یہ سب فریب ہیں: — اظہارِ پاک بازی و ذوقِ نظر، غلط
لو صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں! — احمق نہیں ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط
سینے میں اپنے جانتے ہو تم کہ دل نہیں؟ — ہم کو سمجھتے ہو کہ ہے اِن کی کمر غلط؟
کہنا ادا کو تیغ، خوشامد کی بات ہے. — سینے کو اپنے اُس کی سمجھنا سپر غلط
مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے نذر دی؟ — جانِ عزیز پیشکشِ نامہ بر۔ غلط
پوچھو تو! کوئی مرکے بھی کرتا ہے کچھ کلام! — کہتے ہو جان دی ہے سرِ رہ گزر غلط
ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا؟؟ — مرنے کی اپنے روز اُڑائی خبر غلط
آیت نہیں حدیث نہیں جس کو مانیے — ہے نظم و نثرِ اہلِ سخن سر بسر غلط!

یہ کچھ سنا جواب میں، ناظم ستم کیا
کیوں یہ کہا۔ کہ دعویِ الفت مگر غلط؟

یہ ساری غزل ہم نے اس لیے نقل کی کہ ناظم کا دیوان آج کل بہت کمیاب ہے اور غالبؔ ہمارے

اکثر ناظرین کی نظر سے نہ گزرا ہوگا۔ اس کے علاوہ ہمیں اُمید ہے کہ خود غزل کی خوبی اور دلکشی اس طوالت کی تلافی کر دے گی۔

الغرض ہمارے راوی فرماتے تھے کہ جب مرزا نے یہ غزل لکھی اور اپنے دو ایک با اختصاص اور عزیز شاگردوں کو سنائی تو وہ سب سر ہو گئے کہ اسے ہرگز رامپور نہ بھیجا جائے۔ لیکن مرزا نے آخر میں (ممکن ہے ایک لمبا سا سانس کھینچکر) یہی فیصلہ کیا کہ جن کی فرمائش پر اُسے لکھا تھا اُنھیں کو بھیج دیا۔[۱]

عجب نہیں اِن اُستاد و شاگرد کے بعض محرم راز اور اِسی قسم کے معاملاتِ داد و ستد سے آگاہ ہوں۔ لیکن جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں اس واقعے کے سوا، جس کی صحت میں ہمیں مطلق شبہہ نہیں ہے، ہمیں اور کوئی ایسی داخلی شہادت نہ مل سکی۔ البتہ بطور خود ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ ناظم کا وہ کلام اہلِ ذوق کے سامنے پیش کریں جس سے غالبیّت ٹپکی پڑتی ہے خصوصاً وہ اشعار، جو یا معنی یا الفاظ یا طرزِ بیان کے اعتبار سے اپنے اُستاد کے کلام سے ایک نمایاں مشابہت اور نسبت رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ مضمون اس کوشش کی پہلی قسط ہے جس میں دیوانِ ناظم کی ردیف [illegible] کے اشعار ہم نے چُنے ہیں۔ اگرچہ افسوس ہے کہ کچھ عدیم الفرصتی اور کچھ ایڈیٹر صاحب الناظر کے تقاضوں کی گھبراہٹ میں یہ کام جیسا جی چاہتا تھا ویسا سر انجام نہ ہو سکا۔

مطلع دیوان ہے کہ

محتاج نہیں قافلہ آوازِ درا کا
سیدھی ہے رہِ بتکدہ احسان خدا کا

اس میں بندش کی چُستی اور الفاظ کی خوبیِ نشست کے علاوہ ہمارا گمان ہے کہ مضمون بھی وہی ہے جسے مرزا نے ترقی دے کر ایک دوسرے لباس میں اس طرح جلوہ دیا ہے کہ

---

[۱] معلوم ہوتا ہے مرزا صاحب باوجود رعایت کے نواب صاحب کے ساتھ اتنی فیاضی نہیں برتتے تھے کہ اپنا بہترین کلام اُنکے حوالے کر دیں۔ اور شاید یہی سبب اُنکے شاگرد بھی مُصر تھے کہ ایسی اعلیٰ درجے کی غزل (خلاف عادت؟) نواب ناظم صاحب کو نہ دی جائے۔"

زنّار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال رہرو چلے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر

اور اسی طرح اس مضمون کی نسبت جو ناظم کے ہاں بہت پست اور سُست نظر آتا ہے کہ

عاشق ہوا اُس آفتِ جاں پر مرا ندیم جب خوب میرا محرمِ اسرار ہو چکا

یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ اُسی شراب کی تلچھٹ نہ ہو جو مرزا کی سقائی میں کچھ اور ہی شے نظر آتی ہے۔ فرماتے ہیں

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

گر اس شعر میں تو الفاظ اور مضمون سب ہی لڑ گئے ہیں (ناظم۔ صفحہ ۷، شعر ۲)

بسکہ بودا تھا تیرا عہدِ وفا گو بندھا پر نہ استوار ہوا

غالبؔ۔ تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

بے شبہہ غالب کے ہاں یہ مضمون ایک اور بل کھا کے زیادہ خوبی سے بندھا ہے، پر انہیں دونوں شعروں میں جو مماثلت ہے وہ ظاہر ہے۔

اس سے اگلی غزل جس کا مطلع ہے

بڑھتا گیا جو رشک تو اخلاص کم ہوا چھینا عدو نے دوست کو یہ کیا ستم ہوا

بار بار مرزا کا رنگ یاد دلاتی ہے۔ اور جب ہم اس شعر پر پہنچتے ہیں جو بیت الغزل ہے کہ

جاتی نہیں ہے سعی رہِ عاشقی میں پیش جو تھک کے رہ گیا وہی ثابت قدم ہوا

تو بُعدِ معنی کے باوجود خواہ مخواہ یہ شعر ذہن میں چکر لگانے لگتا ہے کہ

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُنکے علم ہوئے

اس سے آگے کی غزل بھی جس کے اکثر اشعار ذیل میں لکھے جاتے ہیں خاص غالبؔ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے بلکہ بعض دفعہ تو خیال گزرتا ہے کہ جس زمانے میں مرزا نے اپنی غزل

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

لکھی ہے۔ اُسی وقت اس غزل کو بھی سرانجام کیا ہے۔ ناظرین پڑھتے وقت غالبؔ کی مذکورہ غزل اپنے سامنے رکھیں۔ ناظم۔ صفحہ ۹

پھر حال کچھ اپنا بھی مجھے اچھا نظر آیا　　مدت میں بتِ آئینہ سیما نظر آیا
کس کس کا کروں رشک کہ اس راہ گزر میں　　ہر ذرّہ مجھے دیدۂ بینا نظر آیا
بیداد سے تو بہ اُنھیں کرتے ہی بن آئی　　جب بعد مِرے کوئی نہ مجھ سا نظر آیا
مجنوں کو کہاں حوصلہ تھا ضبط جنوں کا　　دل گھر میں ہُوا تنگ تو صحرا نظر آیا
شیطاں جو نہ تھا جوہرِ معنی کا شناسا　　آدم اُسے 'اک خاک کا پُتلا' نظر آیا

اگلی غزل کا مطلع ہے کہ

کیا قیامت کا دن بڑا ہوگا　　کچھ شبِ ہجر سے سوا ہوگا

اور مرزا صاحب فرماتے ہیں :-

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں　　شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

ناظم کا اسی غزل میں ساتواں شعر :

رشکِ اقبالِ غیر بیجا ہے　　تُو کسی کا کب آشنا ہوگا

ٹھیک اُسی دماغ کا پیش اُفتادہ نظر آتا ہے جس نے اِس شعر کو نظم کیا تھا کہ

رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے؟　　تمھاری طرزِ روش جانتے ہیں ہم کیا ہے!

یعنی آج اُس پر مہربان ہو تو کل خفا ہو جاؤ گے۔

ناظم　تو: آیا، پہ اجل وقت سے پہلے آتی　　آدمی اُس کی اگر اتنی تمنّا کرتا

یہ بھی مضمون مرزا کا ہے اور اس کو اُنھوں نے اور نازک پیچ و خم کے ساتھ ایک جگہ اس طرح لکھا ہے کہ

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے　　تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بُلائے نہ بنے

غالب کے مشہور شعر کا ایک مصرعہ

میں نہ اچھّا ہوا بُرا نہ ہُوا

ناظم کے ہاں ایک اور رنگ میں نظر آتا ہے :

اُنکو خیال تھا کہ سُنیں گے خبر کچھ اَور　　اچھا ہوا مریضِ محبت - بُرا ہوا!

۱　اس سے اگلی غزل کا پانچواں شعر ہے :

اے نوا سنج انا الحق ترا دعویٰ حق ہے　　لیک دستور نہیں قطرے کو دریا کہنا

اس مضمون کو مرزا نے طرح طرح سے اور جا بجا اُردو فارسی دونوں میں لکھا ہے مثلاً

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

لیکن یہ مضمون کچھ مرزا کے کلام سے اختصاص نہیں رکھتا۔ اَور اساتذہ کے ہاں بھی ہے۔

غزل کے آخری شعروں سے صاف صاف مرزا کا رنگ جھلکتا ہے اور مقطع سے پایا جاتا ہے کہ خود لکھنے والا بھی اس خیال سے خالی نہ تھا :۔

بارِ خلوت میں نہیں اور اگر بزم میں ، مَیں　　حالِ دل عرض کروں ، کہتے ہیں "تنہا کہنا"

سنگِ بارانِ حوادث کا (کہو) ابرِ سیاہ　　آسماں کو ہے غلط گنبدِ مینا کہنا

ق ۱　شعرا غم میں بھی خوش رکھتے ہیں اپنے دل کو　　ہے بڑی بات کو سَو رنگ سے اچھا کہنا

۲　جگرِ خستہ کو کہنا 'گُلِ خنداں' گا ہے　　چشمِ پرخوں کو کبھی 'ساغرِ صہبا' کہنا

کیوں نہ غالب کے ہوں اشراق کا قائل ناظم!

دُور سے جس نے سکھایا مجھے ایسا کہنا

مرزا کے قصیدۂ عید کی غزل میں ایک شعر ہے کہ

بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار　　دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

اسی قسم کے ایک مضمون کو ناظم کے اِس شعر میں (اگر یہ نہ اُس خوبی اور صنعت کے ساتھ) ادا کیا گیا ہے :۔

طلبِ بوسہ میں کیا چاہیے ناظم ابرام　　دے چکے دل جسے پھر اُس سے تقاضا کیا

مگر اس سے اگلی غزل کے دوسرے شعر میں معنی کیا الفاظ تک بلکہ ایک مصرعہ کا مصرعہ وہی ہے جو مرزا کے ہاں ہے:

ناظم۔　دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے　　تیر تیرا ہے تو پیکان میرا

غالب۔　دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے　　ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

مگر اس غیر معمولی توارد (؟) کے بعد تمام غزلوں میں مرزا کا رنگ اور زیادہ نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ بھلا یہ شعر

جا نہیں سکتی۔

اگر ہم اُنھیں دیکھ لیں یا اُنکا احساس کر لیں تو اُنھیں مغیبات نہ کہا جائے گا۔ یومنون بالغیب میں جو غیب کا اطلاق ہُوا ہے تو اُس سے وہی ہستیاں اور وہی وجود مراد لیے گئے ہیں جو موجود ہیں یا جن کی ہستی کسی نہ کسی حیثیت سے ہے۔ چاہے اُس تک ہماری رسائی ہو یا نہ ہو۔ اور کسی نہ کسی رنگ میں ہماری نگاہوں یا احساس اور ادراک یا عقل اور فطرت سے غیب ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید ہمیں اُن قوتوں اُن طاقتوں اور اُن ہستیوں پر ایمان لانے کی تاکید کرتا ہے جو موجود ہیں۔ جن کی ہستی تسلیم شدہ اور حق وقائم ہے۔ کیونکہ جس کی ہستی اور وجود بھی نہیں اُسپر ایمان لانے کے واسطے ہم کیونکر مکلف ہو سکتے ہیں۔

یومنون بالغیب میں قرآن مجید کے ماننے والوں یا دیگر مخلوق کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مغیبات پر پر ایمان لاؤ۔ درحالیکہ مغیبات کا کوئی وجود ہی نہ ہو تو یہ کس طرح حکم دیا جا سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآنی رنگ میں قرآن میں جس قدر مغیبات کا ذکر یا بیان مثل حشر و نشر و دوزخ و بہشت و رُوح کے کیا گیا ہے اُن سب کا وجود اور ہستی موجود ہے۔ اگر اُن کا وجود یا اُنکی ہستی موجود نہ ہوتی تو یہ نہ کہا جاتا کہ یومنون بالغیب، بلکہ یہ کہا جاتا کہ اُن چیزوں پر ایمان لاؤ جن کی کوئی ہستی ہی نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ تاویل درست اور صحیح نہیں تو پھر نعوذباللہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ

اعلےٰ جزوِ مغیبات وجود صمدی بھی فی الوقت موجود نہیں ہے۔ وہذا باطل

انسان جو ایمان مغیبات پر مکلف ہے تو یہ قانونِ قدرت اور اقتضاے فطرت سے بھی بعید اور خلاف نہیں۔ یہ ایک ایسا حکم اور ایسی جامع تعلیم دی گئی ہے کہ اس پر فطرتِ انسانی بھی ساکت ہے۔

ایمان یا ایمان لانا ایک مذہبی لفظ یا اصطلاح ہے۔ دراصل اس کا مفہوم دوسرے الفاظ میں دل کی وہ حالت وہ شانتی ہے جو ایک لاتبدیل اطمینان کے ساتھ کسی ہستی، کسی طاقت کا یقین رکھتی اور اُسکی عظمت، وقعت، موجودگی، تصرف، قدرت، منفعت، فیضان، اثر اور وسعت کے عملی رنگ میں مصدق اور معترف ہو۔

ایمان کے واضح معنی عمل کے بھی ہیں جس ایمان کے ساتھ عمل شامل نہیں وہ ایک عقیدہ یا ایک سادہ اعتراف ہے۔ ایمان وہی وقعت رکھتا یا محکم ہے جو اپنے ساتھ عمل بھی رکھتا ہو۔ قرآن مجید معاد اور معاشرت دونوں صیغوں کی بابت اصولی رنگ میں ہدایت بخشتا اور رہنمائی کرتا ہے۔ میری رائے میں (شاید وہ بعض کے نزدیک کوئی وثوق نہ رکھتی ہو) معاشرتی رنگ میں یومنون بالغیب کی وسعت نری ایمانیات ہی سے وابستہ نہیں ہے معاملات اور تمدن سے بھی اُس کا بڑا بھاری تعلق ہے۔ یہ آیۂ کریمہ ہمیں سکھاتی ہے کہ اگر ایک طرف ذاتِ صمدی اور خدائے واحد پر ایمان لاتے ہو تو دوسری طرف اُن طاقتوں اُن مواد اُن اسرار اُن تاثیرات پر بھی ایمان لاؤ، یعنی اُنکی حقیقت اور ہستی کا اعتراف کرو جو خدائے کریم اور مولائے حکیم نے اس کائنات کے ہر ایک فرد میں ودیعت کر رکھی ہیں۔ اور اس اعتراف اور معاشرتی ایمان کے بعد اُن تاثرات، اُن کیفیات، اُن عناصر سے کام بھی لو جو قدرت کا ذخیرہ اور حکمتِ الٰہی کا سرمایہ ہیں۔ اس ایمان لانے میں بزنگ معاشرتی ایک بڑا نکتہ رکھا گیا ہے۔ انسان اُس وقت تک کسی چیز کسی مادہ کسی عنصر کسی کیفیت سے کام لینے پر مستعد نہیں ہوتا جب تک سب سے اول اُسے اس کا یقین نہ ہو کہ اُسکی ہمت اُسکی ادراکی قوتیں اُس حالت میں مشتعل اور مستعد ہوتی ہیں جب وہ کسی شے اور کسی مواد کی حقیقت اور قیمت و تصرفات و آثار سے فی الجملہ آگاہ ہوتا ہے۔

اگر ہم خدا کی قدرتِ جامعیت کے قائل نہیں ہیں تو کس طرح اُسکی طاقتوں حکمتوں اور تصرفاتِ قادرانہ سے مستفیض ہونے کی کوشش کر سکتے ہیں اور کس طرح اُسکے ساتھ عابدانہ تعلقات پیدا کرنے سے اپنے روحانی مقاصد میں ترقی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نہیں جانتے کہ اشیاء کی ذات چند خواص بھی رکھتی ہے تو کس طرح اُنکی نسبتی تاثیرات اور تصرفات سے کام لے سکتے ہیں۔ اس اصول کے ماتحت ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ خدا نے جو کچھ اس کائنات میں مخفی قوتیں، مخفی آثار مخفی باتیں رکھی ہیں اُنپر ایمان لاؤ اور ایمان لانے کے بعد اُنپر توجہ اور غور کرو۔ اور یہ یقین کر لو کہ اس کائنات کی کوئی ہستی، کوئی وجود کوئی شے خالی از حکمت نہیں ہے۔ ہر ہستی، ہر چیز، ہر وجود مختلف حکمتوں مختلف آثار اور مختلف حقائق

اور کیفیات کا مخزن اور مصدر ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ تحریک کی گئی ہے کہ کائنات کے اسرار نسبتوں اور حقائق و کیفیات کے دریافت کرنے پر لگ جاؤ اور بذریعہ تدبر اور تفکر کے اُن مراحل تک پہنچ جاؤ جو علوم و فنون کے مراحل ہیں۔

اگر ہم یہ ایمان رکھتے اور یہ یقین لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کائنات میں صدہا نہیں ہزاروں، ہزاروں نہیں لاکھوں، لاکھوں نہیں کروڑوں، کروڑوں نہیں اربوں حکمتیں اور خوبیاں ودیعت شدہ ہیں تو ہمارے دل و دماغ میں خود بخود ایک لہر اُٹھے گی اور ہم خود بخود متوجہ ہوں گے کہ ہمارے اردگرد کیا کچھ بھر رکھا ہے اور یہ ہستیاں کیا کچھ اپنے اندر رکھتی ہیں اور ایک دوسرے میں کیا کچھ نسبت ہے اور اُن نسبتوں کے ملانے سے کیا کچھ نتائج نکلتے یا نکل سکتے ہیں؟ اس مرحلے پر پہنچکر ہم اُنھیں مراحل سے گزریں گے جو علوم و فنون اور تمدن کے مراحل ہیں اور جن سے خدا کی لاانتہا حکمتوں کا دروازہ کھُلتا ہے۔

ایمان کی نشانی یہ ہے کہ ہم اُس طاقت، اُس شے کی تلاش میں سرگرداں ہوں اور اُسے پانے کی کوشش کریں جس پر ہم ایمان لائے ہیں۔ کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہمارا ایمان کامل اور بالعمل نہیں ہوگا۔ ہمنے دینیات روحانیات میں بہت کچھ کوشش کی اور اب تک درپے ہیں لیکن تمدنی اور معاشرتی مراحل میں ہمارا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اور ہم نے سمجھ لیا کہ ہمارے واسطے صرف ایک ہی راہ کافی اور بس ہے اور اسی سے ہمارا اسلام مکمل ہو جاتا ہے۔ میری رائے میں یہ ایک خامی ہے۔ اگر ہمارے واسطے مذہبیات کی راہ لازمی ہے تو معاشرتی راہ بھی بہت کچھ وقعت رکھتی ہے اُسپر چلنے کی بھی ضرورت ہے۔ قرآن مجید خود کہتا ہے

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً

(ترجمہ) اے رب ہمارے تو دین اور دنیا دونوں میں ہماری سرخروئی کر۔

کیا یہ تعلیمی فقرہ ہمارے واسطے ایک اشارہ اور ایک ہدایت نہیں ہے اور کیا اس سے یہ سراغ نہیں ملتا کہ دونوں طرح سرخروئی لابدی ہیں۔ مانا کہ دنیا کی راہ یہیں ختم ہو جائے گی اور اگلی دنیا

میں اُس کا نشان بھی نہ ہوگا۔ لیکن کیا اس اشارے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہم جب تک اس دُنیا میں رہیں اُس وقت تک ہمیں اس راہ پر چلنے کی ضرورت ہے اور لازمی ضرورت ہے۔

اگر قدرت ہم سے معادن اعتراف چاہتی ہے تو معاشرتی اعتراف بھی لازمی ہے۔ خدائے قدوس نے اپنی حکمتوں کی بارش اس کائنات میں لاحاصل اور فضول نہیں کی ہے۔ اُن حکمتوں کا اعتراف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم عملی صورت میں اُنکی کیفیات اور مخفی طاقتوں سے آگاہ ہو کر اُن سے کام لیں اور عملی رنگ میں اُنکا اعتراف کریں۔

یہ کون سی منزل ہوگی؟ وہی جس کو دوسرے الفاظ میں سائنس اور حکمت کہتے ہیں۔ سائنس کیا ہے اور حکمت کیا ہے۔ اُن اسرار کا اظہار جو خدا کی کائنات میں پائے جاتے ہیں جو اپنے مُنہ سے ایک دوسرے رنگ میں بول رہے ہیں۔ کیا جو شانتی اور جو ایمان ایک سائنس داں کے دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے وہ اس آیت قرآنی کے ماتحت نہیں آتا، اور کیا یہ عمل ایمان بالغیب کی ایک ثمردار فرع نہیں ہے، اور کیا اس سے کوئی اور ایمان عملی رنگ میں زیادہ بارآور ہو سکتا ہے، اور کیا یہ ایمان معادن فرع کے واسطے بھی تروتازگی اور شادابی کا موجب نہیں ہے۔

یہ آیت کھُلے لیکن غور طلب الفاظ میں کیا اعلان کرتی اور کیا سکھاتی ہے؟ یہ کہ

ہم خدا کی قدرتوں پر ایمان لائیں۔

قدرت کے مخفی خزانوں سے مستفید ہوں۔

اشیاء میں جو نسبتیں اور تعلقات ہیں اُنکے جوڑ میل سے حکمتوں کا افشاء کریں۔

یہ ایمان رکھیں کہ خدا نے اشیاء اور کائنات میں بہت کچھ بھر رکھا ہے۔

اصل ایمان یہ ہے کہ ہم جس طرح خدا کی ذات پر ایمان لاتے ہیں اُسی طرح اُسکی حکمتوں پر بھی ایمان لائیں۔

ایمان صرف عقیدت ہی نہیں بلکہ اُس کا دوسرا رُخ عمل بھی ہے۔ نہ صرف عمل ہی بلکہ عملی کوشش اور عملی استقامت بھی۔

خدا صرف یہی نہیں چاہتا کہ اُسپر ایمان لایا جائے بلکہ اسکے ساتھ یہ بھی کہ اُسکی حکمتوں پر بھی ایمان لایا جائے۔

مصداق فانظروا کیف بدأ الخلق - فتدبر۔

سلطان احمد

ذکرِ عیش

کسے اُمید تھی یوں کارگر جذبِ نہاں ہوگا
دل اس پہلو میں اُس پہلو میں وہ آرامِ جاں ہوگا

تلافی رنجِ فرقت کی وصالِ دوست سے ہوگی
پھریں گے دن خداوند دو عالم مہرباں ہوگا

بلائے گردشِ دوراں سے بیخوف و خطر ہونگے
زمیں آرام دہ ہوگی فلک راحت رساں ہوگا

اِدھر وہ مہروش رونق فروزِ پہلوئے عاشق
اُدھر ماہ مبیں زینت فزائے آسمان ہوگا

اُدھر چھٹکے ہوئے تاروں کے جھرمٹ میں مہِ تاباں
اِدھر خود سیج پہ پھولوں کی وہ جانِ جہاں ہوگا

ضیا بار ایک ہی ساعت میں ہوں گے دو مہِ تاباں
وہ شب ہوگی کہ جس پر روزِ روشن کا گماں ہوگا

رہے گا رات بھر پیشِ نظر وہ خوش نما منظر
کہ ہوگی روح کو بالیدگی دل شادماں ہوگا

یہاں عجز و نیازِ عاشقانہ پیار کی باتیں
غرورِ دلبری و نازِ دلداری وہاں ہوگا

اِدھر ہر لحظہ عشقِ ناشکیبا داد کا خواہاں
اُدھر آمادہٗ بیدادِ حُسنِ بے اماں ہوگا

وہاں ہوگے غرورِ حُسن پر وہ جس قدر نازاں
کہیں اُس سے ہوا نازاں ہی قسمت پر یہاں ہوگا

زبانوں کا کریں گی کام دونوں سمت سے نظریں
کسی پہ خوبیِ قسمت سے کوئی مہرباں ہوگا

کبھی ہنس ہنس کے ذکرِ آغازِ ایّامِ محبت کا
کبھی رو رو کے انداز وہ شب فرقت بیاں ہوگا

کبھی ہوگی شکایت شکر کے پردے میں غفلت کی
کبھی ظاہر لبِ ظاہر شکوہٗ جورِ نہاں ہوگا

کبھی خوئے جفا پر دل ہی دل میں منفعل ہوں گے
کبھی ذکرِ وفا بھی طبعِ نازک پر گراں ہوگا

کشیدہ عشق سے ہوگا کبھی حُسنِ حیا پرور
کبھی دونوں میں باہم ارتباطِ جسم و جاں ہوگا

کبھی دونوں طرف اک آگ سی بھڑکی ہوئی ہوگی
کبھی اک شرم کا ہلکا سا پردہ درمیاں ہوگا

سرِ محبوب شانے پر محبت جوش زن دل میں
زبانِ صدق پہ شکرِ خدائے دو جہاں ہوگا

صدق جائسی

قبائے رنگیں

قصۂ ذیل اُسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کا ایک پُرلطف حصہ "جمیل وثمینہ" کے عنوان سے سالہائے سابق کے پرچوں میں ناظرین نہایت شوق بھری نگاہوں سے ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ جس میں مقدس سرزمین عرب کی ایک جمیلہ اور باسلیقہ خاتون "سمیّہ" اور اُس کے پاکباز عاشق "حسن" کی دلفریب حکایت سے شعرائے عرب کی قدر افزائی کے تذکرے ہیں۔ ایک ایک شعر پر ہزار ہزار دینار کا انعام۔ اہل عرب کے پاکیزہ اخلاق۔ تہذیب و تمدن اور ستھرے مذاق کو جس دلکش پیرایہ میں دکھایا گیا ہے وہ ناظرین کرام سے مخفی نہیں۔ اس پُرلطف ناول کا آخری سین نہایت درد انگیز تھا۔ طالبِ مطلوب، حُسنِ اتفاق سے ایک دشت بلاخیز میں ملتے ہیں اور وہاں سے اس آخری فقرے کے ساتھ۔ حور پیکر "سمیّہ" سے "حسن" جگر فگار رخصت ہوتا ہے "سمیہ۔ میں اپنی زبان سے جانے کا لفظ تو نہیں کہہ سکتی۔ ہائے میرا اضطراب فراق تو مجھے اور بھی مارے ڈالتا ہے" اتنا کہا اور زار و قطار رونے لگی"۔

وداع کا یہ حسرت ناک منظر "حسن" کے خرمنِ صبر کے ساتھ برقِ بلا کا کام کر جاتا لیکن حسن نے مردانہ خودداری و استقلال سے کام لیا اور فی امان اللہ کہہ کر سمیّہ کو رخصت کیا۔ دل میں جذبات کا دریا اُمنڈ آیا مگر

دمِ رخصت زباں کھل نہ سکی　　دل کی باتیں ہوئیں نگاہوں سے

ہم اپنے دوست مولوی جواد علی خاں عالی کے شکرگزار ہیں کہ اُنھوں نے پھر اس سلسلہ کو چھیڑ دیا۔ ناظرین الناظر و دیگر شایقین کی سہولیت کا لحاظ کرکے ہم نے "جمیل و ثمینہ" کو علیحدہ کتابی صورت میں شایع کر دیا ہے جس کی قیمت صرف ۳ ر ہے۔ جو حضرات اس قصہ کو شروع سے ملاحظہ فرمانا چاہیں ۳۰ر کے ٹکٹ بھیج کر منیجر الناظر بک ایجنسی سے طلب فرما سکتے ہیں۔

عرفجہ کی زبان سے سمیّہ کی غیر موجودگی یعنی اپنی خالہ کے یہاں ہونے کا ذکر سُن کر اُسکی غلط بیانی پر حسن حیران رہ گیا۔ غلط بیانی اُسکی تھی مگر غیرت سے اپنی ندامت کا ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ اُسے

یہ بھی خیال تھا کہ سمیہ اپنے اپنے باپ کی دروغ بیانی کے خلاف کہیں نکل نہ آئے۔ تو مفت میں اُسکو تو کم مگر مجھے بہت پشیمانی ہوگی۔ دونوں اپنی اندرونی خلش اور فکر میں تھوڑی دیر محو رہے۔ پھر عرفجہ کے اِن الفاظ نے طلسم خاموشی کو توڑا۔

"بیٹا! مکہ کی روانگی کا کب قصد ہے؟"

حسن۔ "میرا عزم جلد ہی جانے کا ہے۔ عجب کیا کہ آج ہی رات کو روانہ ہو جاؤں۔"

عرفجہ۔ میں بھی تمھارے جانے میں تعجیل کو پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ جس قدر جلد جاؤگے اُتنی ہی جلد واپس آسکوگے۔ اور پھر اُسی قدر جلد میں سمیہ کے بارِ عقد سے سبکدوشی حاصل کرسکوں گا۔ ظاہر ہے کہ ان اسباب کی تعجیل کی کس قدر ضرورت ہے۔"

عرفجہ کے یہ الفاظ معمولی نہ تھے جنھیں حسن معمولی توجہ سے سُنتا، مارے خوشی کے اُسے وجد آرہا تھا اور اُسکا دماغ عرش پر پہنچ گیا تھا۔ قیافہ شناسی کا حس بالکل زائل ہوگیا تھا، جس سے وہ عرفجہ کے خندۂ زیرِلب، اور اُسکی آنکھوں کی پتلیوں کی غدارانہ گردش، اور اُسکے خبیثانہ حرکات کا اندازہ کسی طرح نہ کرسکتا تھا۔ لیکن اس موقعہ پر اُسکی اس غفلت کو ہم حسن کے نقصانِ عقل یا خامیِ تجربہ پر محمول نہیں کرسکتے۔ بلکہ اسے ہم اُسکی عین نیک نفسی و پاکیزہ خوئی کا کمال سمجھتے ہیں۔ جس طرح وہ نیک ہے ویسے ہی ہر شخص کی بات پر وہ نیک ہی رائے قائم کرنا جانتا ہے۔ علاوہ ازیں سمیہ اُسکے احسان اور عرفجہ کے وعدۂ گزشتہ کی رُو سے اُسکے حق کی چیز تھی۔ اس لیے اُسکے متعلق دل خوش کن الفاظ سُن کر عرفجہ کے مکنوناتِ قلبی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بدگمانی کی اُسے کوئی وجہ بھی نہ تھی۔

بہرحال عرفجہ کے فرمودِ تعجیل پر اعتماد کرکے اُس نے جواب دیا۔

"انشاء اللہ العزیز میں تب کو ضرور روانہ ہو جاؤں گا۔"

عرفجہ۔ مکہ کے راستہ سے تو شاید تم واقف ہوگے۔ شہر کے کس دروازہ سے نکل کر جاؤگے؟"

حسن۔ راستہ سے میں واقف ہوں۔ باب ...... کی طرف سے جاؤں گا۔"

عرفجہ۔ بیشک اُسی طرف سے جانا۔ وہ ٹھیک راستہ ہے۔ مگر غروب کے وقت تم کو شہر سے

نکل جانا چاہیے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جاڑے سے محفوظ رہنے کا تمہارے پاس کافی سامان نہ ہوگا حالانکہ سردی سے احتیاط نہایت ضروری ہے۔"

حسن۔ نہیں۔ میرے پاس ایک نہایت دبیز عبا موجود ہے، جو سردی میں پورا کام دے جاتی ہے۔

عرفجہ (جس کے چہرہ سے خوشی کی بیاختہ جھلک نمایاں تھی جو پتہ دے رہی تھی کہ اُسے اپنے مقصد میں کامیابی کا راستہ مل گیا۔ خندۂ زیر لبی کے ساتھ) تم صاجزادے ہو۔ ہر شخص کو اپنے مرتبہ و عزت کا احترام لازم ہے۔ تم ایسے ذی وجاہت انسان کے لیے یہ نامناسب ہے کہ معمولی عبا تمہارے کندھے پر ہو۔ اور تم بازاروں سے گزر رہے ہو۔ لہذا اپنی حیثیت کے مناسب کپڑے کی ایک قباء یہاں سے لے لو۔ جسے اپنے کندھے پر بھی رکھ سکو۔ اور سردی کے وقت مزید احتیاط کام میں لاسکو۔"

یہ کہکر اُس نے دستک دی۔ بعد ہی ایک غلام آیا، جیسے اُس نے حکم دیا کہ "میرے حجرہ میں جو سبز قباء لٹکی ہوئی ہے، اُسے لے آؤ۔"

حکم کے ساتھ ہی غلام گیا۔ اور ایک اونی سبز قباء لے آیا، جسے عرفجہ نے اُسکے ہاتھ سے لیکر حسن کو دیا اور کہا۔

"لو۔ شام کے وقت اسی کو پہن کر سفر کرنا۔ اس سے جاڑے کی بھی پوری حفاظت ہوگی اور یہ تمھاری حیثیت و شان کے مطابق بھی ہے۔"

حسن نے قباء کو لے لیا۔ اگرچہ پہلے کچھ اُسکا قصد ہوا کہ عدم ضرورت کا اظہار کرکے معذرت کرے مگر اس بزرگانہ عنایت کے جواب میں باوجود عدم ضرورت انکار کو لیاقت و سعادت مندی، نیز وسعتِ تعلقات کی آرزو کے خلاف سمجھ کر رُک رہا۔ اور سلام شکریہ کیا۔ شام کے جانے کا چونکہ اُس نے قصدِ مصمم کرلیا تھا، اس لیے اب وہاں زیادہ ٹھہرنے کو بے موقع خیال کرکے اُس نے اجازت چاہی۔ پھر عرفجہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور وداعی کلمات کہکر وہاں سے روانہ ہوا۔

چلنے کو تو وہ چلا مگر قدم اس خیال سے نہ اُٹھتے تھے کہ گھر میں سمیہ کی موجودگی کے باوجود اُس سے اسکی ملاقات نہ ہوئی قیامت ہی تو ہے۔ آخر اِ دلِ ناداں کو اُس نے یوں سمجھایا کہ آج

لمحہ بھر کی ملاقات سے بجز پریشانی بڑھنے اور آتش شوق تیز ہونے کے کوئی حاصل نہ تھا۔ تجھے کہ جا کر واپس آنے کی دیر ہے، اُسکے بعد ایک غارت گر ایمان و دین تازہ آفریں کی نازبرداری تیرا مشغلہ صبح و شام ہوگا۔" دل سے یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بازار آگیا، یہاں پہنچ کر اُسے خیال آیا کہ تیر کمان خرید لے، کہ رات کا سفر ہے، قطاع الطریق اور رہزنوں سے بچاؤ کا بندوبست ضروری ہے۔ ایک جگہ پہنچ کر بوجہ ناواقفیت وہ ٹھہرا کہ کسی سے تیر و کمان فروشوں کی دوکان پوچھے۔ ایک مزدور سے جو دو ہی چار قدم پر چھوہارے کی گٹھلیاں[1] چُن رہا تھا، اُس نے پوچھا۔

"کیوں؟ یہاں کمان فروشوں کی دوکانیں کہاں ہیں؟"

مزدور: "آیئے۔ میں آپ کو دوکان بتاتا ہوں۔ آپ کو کیسے نیزے چاہئیں؟"

حسن: "اعلیٰ درجے کے مرلش تیر اور عمدہ کمانیں مجھے درکار ہیں۔"

مزدور: "میں آپ کو بہت اچھے کمان فروش کی دوکان پر لیے چلتا ہوں جس کے ہاں سے اچھا یہاں کہیں نہیں مل سکتا۔"

سُلیمان

یہ کہکر وہ آگے آگے چلا۔ حسن اُسکے پیچھے ہوا۔ یہ دونوں جب مدینہ کی انتہائے آبادی پر پہنچے تو وہاں ایک کمان فروش کی دوکان تھی جس کے قریب پہنچکر مزدور نے کہا کہ "یہاں خرید فرمائیے۔"

دوکان قرینہ کی تھی۔ ایک مدنی عرب دوکان پر بیٹھا تھا جس کے سامنے صدہا تیر، کمانیں اور ہر قسم کے نیزے وغیرہ ڈھیر تھے جن میں کسی کی پھڑ بانس کی تھی اور کسی کی لوچدار پہاڑی لکڑی کی۔ یہی عرب دوکان کا مالک تھا۔ حسن نے دوکان پر پہنچتے ہی مزدور کو ایک درہم بطور اُجرت دیا، وہ پلٹ گیا۔ دوکاندار نے لباس سے اُسے پہچانا کہ وہ شامی ہے، اور معزز سمجھ کر عزت و تکریم کے ساتھ اُس سے پیش آیا۔ بنچ اُسکے بیٹھنے کے لیے بڑھایا۔ حسن نے قباء کو جسے اب تک ہاتھوں پر لیے ہوے تھا،

---

[1] مدینہ میں جو لوگ بالکل محتاج اور مفلوک ہوتے ہیں وہ سڑکوں کی گٹھلیاں چنا کرتے ہیں جنھیں یا وہ خود بجائے لکڑیوں کے جلانے کے کام میں لاتے ہیں یا بیچ کر اُس سے اپنا آذوقہ بہم پہنچاتے ہیں ۱۲ مترجم۔

بیچ پر رکھ کر کمانوں کے ڈھیر کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا جس میں ترچھے اچھے نیزے ،امرش وغیرہ مرشش تیر اور عمدہ کمانیں تھیں۔ چند تیر اور کمان جو اُسے پسند آئے ۔اُس نے چھانٹ کر علیٰحدہ کر لیے اور پوچھا۔
"تمھارے یہاں ترکش بھی ہیں ؟"

نیزہ فروش "جی نہیں۔ ترکش موچیوں کے یہاں کی چیز ہے۔ کیونکہ وہ عام طور سے یا چمڑے کے ہوتے ہیں یا لکڑی کے ۔ اگر آپ ترکش لینا چاہتے ہیں تو میں ابھی ایک موچی کو بُلائے بھیجتا ہوں۔ وہ ہر قسم کے ترکش یہیں لے کر آئے گا اور آپ کو دکھا جائے گا۔"

حسن "نہیں۔ اُسکے بُلانے کی ضرورت نہیں ۔ میں خود وہیں چلا جاؤں گا۔"

اس کے بعد اُس نے جو نیزے منتخب کیے تھے اُنکی قیمت پوچھ کر اُسے دی اور موچی کی دوکان کو چلا۔ قبا بھولے سے اُسی جگہ رکھی کی رکھی رہی۔ نیزہ فروش رہنمائی کے لیے آگے ہُوا یہ اُسکے پیچھے۔ دوکان آگئی تو نیزہ فروش بتا کر چلا آیا۔

یہ دوکان اُس نیزہ فروش کی دوکان کی نسبت زیادہ وسیع اور قسم قسم کے مال سے بھری ہوئی تھی۔ دوکان دار کو ایک گاہک سے مخاطب دیکھ کر جو ایک ترکش طے کر رہا تھا حسن رُک رہا۔ یہ شخص نوجوان تھا اور لباس و وضع سے ذی وجاہت معلوم ہوتا تھا۔ حسن نے اُسے دیکھا تو وہ کچھ مانوس سا نظر آیا۔ حسن اُسے پہچانتا تھا مگر اُسے یہ یاد نہ تھا کہ کہاں دیکھا ہے؟ اُسکی گفتگو سے بھی بوئے اُنس آتی تھی۔ یہ اپنے حافظہ پر بار بار زور ڈالتا تھا مگر حافظہ کچھ کام نہ دیتا تھا۔ جوان عرب خریداری میں مصروف تھا کہ یکایک اُسکی نظر ہاتھ متحیر دوست کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ دیکھتے ہی متعجب ہو کر پکارا "حسن!" اسکے ساتھ ہی حسن کا اشتباہ بھی فوراً رفع ہو گیا اور اُس نے کہا۔ "اخاہ! پیارے سلیمان"

اس کے بعد دونوں نے نہایت گرمجوشی کا معانقہ کیا اور شوق و اشتیاق کی مخاطبت میں مصروف ہو گئے۔ خرید و فروخت کا خیال جاتا رہا۔ دوکان کے سامنے ایک بڑا پتھر پڑا تھا، جس پر دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔
سلیمان نے پوچھا "کیوں بھائی کہاں سے اور کب آئے؟"

حسن "میں دمشق سے آرہا ہوں اور کل شام کو یہاں پہنچا۔"

سلیمان "کچھ قیام کا ارادہ ہے؟"

حسن "نہیں۔ ٹھہرنے کا تو موقع نہیں۔ بس شام تک ہوں۔ رات کو چلا جاؤں گا۔"

سلیمان "نہیں، نہیں، یہ کیسے ممکن ہے۔ میں تمھاری زیارت کا ایک عرصہ سے مشتاق تھا جسے کئی سال گزر گئے۔ کوفہ کی ہماری آپ کی یکجائی کا سمان اکثر پیش نظر آجاتا تھا۔ اور اُس زمانہ کی یاد سے دل ہی دل میں گھنٹوں مزے لیا کرتا تھا۔ کیسے پیارے وہ دن تھے اور کیا مبارک زمانہ تھا۔ اگرچہ معرکۂ حرب و قتال ہر وقت سامنے گرم رہا کرتا تھا۔"

حسن "بیشک۔ تمھارے لیے وہ زمانہ بدیں حیثیت بابرکت تھا کہ تم جس جہتم بالشان مقصد کے لیے نکلے تھے اُس میں ویسی ہی عظیم فتح تم کو حاصل ہوئی۔ یعنی قاتلین امام حسینؑ کو تم نے چن چن کر تلوار کے گھاٹ اُتارا۔ جس میں شاید ابن زیاد والا خصوصی منظر بھی آپ کو نہ بھولا ہوگا۔"

سلیمان "بیشک! اُس منظر کو نہ میں بھولا ہوں نہ بھولوں گا۔ اور جب مشک کی خوشبو کبھی دماغ میں آجاتی ہے تو فوراً اُس واقعہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ کیونکہ جب ابن زیاد کی خبر ہمیں معلوم ہوئی تو مسرتِ مشاہدہ حاصل کرنے کے لیے ہم وہاں گئے، اُسکے قریب پہنچے تو بوے مشک سے گرد و پیش کی تمام فضا معطر ہو رہی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ صبح سے شام تک متعدد بار مشک کا بخور لیا کرتا تھا۔ اور استعمال بھی کرتا تھا۔ مگر ابن زیاد کے قتل کی مسرت سے بڑی اِس مسرت کا درجہ بدرجہا بڑھا ہوا تھا جو اُس ارجسِ ملعون کے قتل سے مجھے ہوئی جس نے جناب مظلوم کربلا کے تن سے آپ کا سرِ اقدس جدا کیا تھا۔"

حسن "یعنی شمر؟"

سلیمان "ہاں! میں نے اُس خبیث کی لاش کو صرف اُسکے سفید داغوں سے پہچان لیا تھا۔"

حسن "اگرچہ ان اذکار سے طبیعت کسی طرح سیر نہیں ہوسکتی۔ دل چاہتا ہے کہ بیٹھ کر یہی باتیں کرتا رہوں۔ مگر موقعہ اور حالت اسکی مقتضی نہیں کہ اس میں زیادہ وقت گزاری کی جاسکے۔ لہذا اس صحبت کو آیندہ موقع کے حوالہ کرکے اسوقت ختم ہی کرنا چاہیے۔"

سلیمان "نہیں بھائی! اتنا وقت مکان پر مل کر گزارو۔ کتنے انتظار کے بعد آج یہ موقعہ

نصیب ہُوا ہے، خدا جانے پھر کب .....!"

حسن قطع کلام کرکے کہ کہیں کوئی سُن نہ لے، اُٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے ایک ترکش پسند کرکے خریدی اور تیروں کو اُس میں رکھا اور سلیمان کو لیکر یہاں سے روانہ ہوا۔ قبا، کا اُسے اب بھی ہوش نہ آیا۔ کیونکہ قبا، کندھے پر لٹکا کر چلنا اُس کے خود کے لیے ایک خلافِ عادت امر تھا۔

دو بچھڑے ہوے دوست

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

حسن اور سلیمان کے آغاز تعارف کا مضمون لطف سے خالی نہیں۔ دواعی اور اسباب کار کی رُو سے اُسے ایک تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ جس کی روئداد یہ ہے کہ جب یزید کی خلافت کے لیے بیعت بالجبر کی جانے لگی تو کوفہ میں اُس کی بیعت کے انحراف کا ایک عام جوش پھیلا اور انھوں نے یک زباں ہوکر حضرت امام ہُمام کی جناب میں یہ عریضہ بھیجا کہ آقا کی تشریف آوری کے انتظار میں ہم لوگ گھڑیاں گن گن کر بسر کر رہے ہیں۔ حضور جلد سے جلد یہاں نزول اجلال فرمائیں کہ ہم لوگ اپنے حق سے ادا ہوں۔ اس بُلاوے پر جب وہ قافلہ سالار خاندان رسالت و پیشوائے جن و انس و ملائکہ ارضِ کوفہ ہُوا تو کوفیوں کا وہ متحدہ جوش جس کا عریضہ میں مذکور تھا۔ تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹ چکا تھا۔ موافقین و مخالفین کے کئی گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ مُنقاد اور بعد کو منحرف ہونے والے گروہ میں سلیمان اور اُس کا باپ دونوں تھے۔ بعد ازاں جب محشرستانِ کربلا میں اُس قیامت صغریٰ کا ظہور ہو چکا جس میں پھلا پھولا گلزارِ نبی سارا قلم ہو گیا تو ان لوگوں نے خجل اور پشیماں ہوکر توابین کی ایک جماعت قائم کی اور عصیانِ تخلف کے کفارہ کے طور پر قاتلین سے شہدائے کربلا کے خون کا قصاص لینے کو نکلے۔ اسکے بعد جب مختار ابن عبید ثقفی حضرت عبداللہ ابن زُبیر کی تبلیغ بیعت کرتا ہُوا ان کو ملا، تو توابین کا گروہ اُسکا شریک مقصد بن گیا۔ ان میں بھی باپ بیٹے سلیمان دونوں تھے۔ پھر اس متفقہ جماعت نے تمام سردارانِ لشکر یزید اور بانیانِ ظلم و جفا کو تہِ تیغ کیا۔

کامرانی و اقبال مندی کی رُونما ہوتے ہی حضرت مختار کو علی الاطلاق حکومت کے پر آرزو

خیال نے مست کر دیا، ستم یہ ہوا کہ اُدھر عبداللہ بن زبیر کو اُس روگردانی و خود مختاری کی خبر پہنچی اور وہاں سے مصعب بن زبیر برادر خُرد کے زیر کمان ایک لشکر اس مدعی جدید کا قلع قمع کرنے کو آ گیا۔ عظیم جدال و قتال کے بعد مختار قتل ہُوا۔ اُس کے لشکری بھاگے بھی، کچھ اسیر بھی ہوئے اور بہتوں نے آ کے خود سر اطاعت خم کر دیا، جن میں سلیمان باپ بیٹے بھی تھے۔ حسن مصعب کے لشکریوں میں پہلے سے تھا اس طریقہ سے جب دونوں یکجا ہوئے، تو اُن میں لطف و اتحاد بڑھ گیا، یہاں تک کہ سلیمان حسن کی خوبیوں کا دلدادہ بن گیا۔ اس کے بعد مصعب بن زبیر و عبدالملک بن مروان کی معرکہ آرائی نے پانسہ پلٹ دیا۔ مصعب کو شکست فاش ہوئی اور وہ قتل ہوا تو حسن تو عبدالملک کے ساتھ چلا گیا، اور سلیمان نے معہ اپنے باپ کے مدینہ جا کر اقامت اختیار کر لی۔

سلیمان اور حسن کو اسی افتراق کے بعد مدینہ میں آج ملنا نصیب ہُوا تھا، اسی وجہ سے سلیمان چاہتا تھا کہ حسن سے دل کھول کر باتیں کرے۔ چلتے چلتے جب سلیمان کے گھر کے قریب دونوں پہنچے تو سلیمان نے اُس سے اپنے گھر چلنے کی فرمائش کی اور کہا کہ والد آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

سلیمان نے جب اپنے والد کا ذکر کیا تو حسن کو بھی اُس کا خیال آیا اور کہا "میں آپ کے والد کو پوچھنا ہی بھول گیا تھا، اچھے تو ہیں؟ اور اُن کا مشغلہ کیا ہے؟"

سلیمان "آج کل طارق کی ماتحتی میں ہیں۔"

حسن "کیا اُنھوں نے بطیب خاطر اس تعلق کو اختیار کیا ہے؟"

سلیمان "میرے خیال میں تو بخوشی ہی اُنھوں نے قبول کیا ہے۔ اگرچہ میں ہمیشہ اس کے تعلق کے متعلق اپنی مخالفت کا اظہار کرتا رہتا تھا کہ کل جن پر ہم سیف آزمائی کرتے تھے آج اُنکی تابعداری ہمیں زیب نہیں دیتی، مگر اُنکی توجہ اس طرف نہ دیکھ کر میں خاموش رہا۔ ممکن ہے کہ ہمیں اُنکی کوئی پوشیدہ مصلحت بھی ہو۔"

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ سلیمان کا گھر آ گیا۔ مکان میں گئے۔ مگر سلیمان کا باپ مکان پر نہ تھا۔ پہلے اُن دونوں نے بیٹھ کر شام کا کھانا کھایا، پھر تھوڑی دیر تک والد سلیمان کا انتظار کیا۔ آخر انتظار سے

اتنا کر اُس نے کہا "اب مجھے جانا چاہیے۔ اس لیے کہ مجھے لیلی الاخیلیہ سے ملنا ضروری ہے۔ شاید دیر ہونے پر اُس سے ملاقات ممکن نہ ہو"

حسن کی غرض اس اضطرار اور عجلت سے یہ بھی تھی کہ شاید جاتے ہوئے راستہ میں ہمیہ سے ملاقات ہی ہو جائے، کیونکہ اُس کا مکان راستہ میں پڑے گا۔ اور خاتون محترم کے یہاں سے اُسکی واپسی کا یہی وقت ہو۔

سلیمان نے کہا اُس سے التواء سفر کے متعلق اصرار کیا، مگر اُس نے نہایت لجاجت سے معذرت کی، مجبوراً سلیمان نے کہا "اگر کسی طرح ٹھہر ہی نہیں سکتے تو چلو میں بھی تمھیں کسی منزل تک پہنچانے چلونگا بشرطیکہ تم اجازت دو تو عقیق تک میں بھی تمھارے ساتھ چلوں۔ اور شب بھر تمھاری یکجائی سے اور بہرہ اندوز ہو لوں"

حسن "بھلا اسے میں گوارا نہ کروں گا؟ آخر مجھے بھی تو روحانی لطف و مسرت حاصل ہو گی تمھاری معیت ...."

سلیمان "اچھا اب ملو گے کہاں؟ میں بھی تھوڑی دیر میں یہاں سے نکلوں گا"

حسن۔ "نہیں چلو ساتھ ہی۔ میں لیلی الاخیلیہ سے ملتا ہوا آتا ہوں اور تم سیدھے باب مدینہ کو چلو۔ جہاں ہم دونوں تھوڑے فصل سے مل جائیں گے"

سلیمان "تم کو باب مدینہ کا راستہ تو معلوم ہے؟"

حسن: "ہاں میں جانتا ہوں، وہی کمان فروش کی دوکان سے ہو کر راستہ ہے جہاں سے میں نے یہ تیر و کمان خریدے ہیں"

کمان فروش کی دوکان کا ذکر آتے ہی اُسے قبا یاد آئی۔ اور اُس نے کہا "اُہو! میں اپنی قبا تو اُسی کی دوکان پر بھول آیا۔ اب مجھے امید نہیں کہ وہاں جانے کا موقعہ بھی ملے"

سنتے ہی سلیمان نے کہا "تم مطمئن رہو، میں قبا لیتا ہوا آؤں گا۔ تمھیں وہاں جانے کی ضرورت نہیں" حسن نے اُسکا شکریہ ادا کیا اور گھر سے روانہ ہو کر دونوں اپنے اپنے راستہ پر پڑ لیے (باقی آئندہ) جواد علیخاں علی

جناب مولوی حکیم شیخ اکرام علی صاحب فاروقی حنفی مرحوم

حکیم صاحب موصوف سیتاپور کے رئیس اور محلہ شیخ سرائے میں سکونت پذیر تھے ــــ مرحوم کے والد کا نام شیخ احسان علی صاحب تھا۔ حکیم صاحب مغفور کے آباؤ اجداد ارباب تصوف میں شمار ہوتے تھے لیکن خدانے دنیاوی مال وجاہ سے بھی سرفراز کیا تھا۔ دربار شاہی میں مناصب جلیلہ پر ممتاز تھے۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی اور لکھنؤ کے دربار سے ان کے لیے جاگیریں اور وظائف معین تھے۔ حکیم صاحب مرحوم کا نسب نامہ حضرت خواجہ شیخ فریدالدین عطار کے واسطے سے امیرالمومنین فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ حکیم صاحب کا خاندان علم دوست اور باعمل تھا۔

حکیم صاحب کے والد ماجد صرف نو سال کی عمر میں باہر چلے گئے۔ لیکن آپ فطرتاً ایسے شائق علم تھے کہ اسی حالت میں آپ کلکتہ کو تحصیل علم کی غرض سے چلے گئے اور اپنے ذاتی شوق اور جفاکشی سے علم حاصل کیا اور کلکتہ کے مدرسۂ عالیۂ عربیہ میں جو اب بھی موجود ہے اور گورنمنٹ اسکی سرپرست ہے داخل ہوے اور وہاں کے نصاب کو نہایت محنت اور لیاقت سے ختم کیا اور سند حاصل کرکے دہلی گئے اور وہاں کے مشہور اور مستند علما کو امتحان دیکر سند حاصل کی اور دستار فضیلت سے سرفراز ہوے اور پھر وطن واپس آکر عقد کیا۔ بعد چندے سرکار انگلشیہ کو اپنی طرف سے دارالافتا قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ آپ کا انتخاب بحیثیت مفتی اجمیر شریف کے لیے تین سو روپیہ ماہوار پر ہوا۔ اور آپ نے اس نازک اور اہم کام کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔

حکیم صاحب کو اپنی خدمتِ مفوضہ کے انجام دینے کے بعد جو وقت ملتا وہ مریضوں کی دیکھ بھال اور ہدایات طبی میں صرف کرتے اور آپ کے دستِ شفا اور تشخیص کامل سے بیماروں کو صحت حاصل ہوتی۔ اتفاقاً آپ کے والد جو باہر چلے گئے تھے اور مفقودالخبر تھے انکو اپنے لائق فرزند کے حالات کی اطلاع ہوگئی۔ مگر قبل اس کے آپ کے والد نے کسی شخص کو متبنّٰی کر لیا تھا اور اس متبنّٰی کو یہ یقین ہوگیا کہ اب ان بچھڑے ہوے باپ اور لڑکے کے ملنے سے میری قدر نہ ہوگی۔ اس کمبخت نے انکو (حکیم صاحب کے والد کو)

زہر دے کر مار ڈالا۔ اور سب مال لے کر چلدیا۔ حکیم صاحب اپنے والد کے بلانے کے منتظر تھے، لیکن نیرنگی زمانہ نے ان کو اس جگر خراش سانحہ کی خبر سنائی۔ حکیم صاحب کو اس خبر وحشت اثر سے حد درجہ رنج و ملال ہوا۔ مگر بجز صبر کے کیا چارہ تھا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

الغرض حکیم شیخ اکرام علی صاحب مرحوم ایک عالم با عمل اور حد درجہ خلیق و منکسر تھے ۱۲۵۲ھ میں بمقام سیتا پور محلہ شیخ سرائے آپ نے ایک شاندار مسجد جامع تیار کرائی جو اب تک موجود ہے۔ آپ نے اخوان الصفا عربی کا ترجمہ سلیس اُردو میں حسب ہدایت ڈاکٹر گلگرسٹ صاحب کیا یہ ترجمہ بہت پسند اور مقبول ہوا اور کئی بار چھپا۔ نواب شمس العلما سید امداد امام صاحب پٹنہ نے اپنی مصنفہ کتاب کاشف الحقائق معروف بہ بہارستان سخن میں اس ترجمہ کی تعریف کی ہے۔

حکیم صاحب نے ۱۲۵۳ھ میں بمقام اجمیر انتقال کیا۔ آپ کا مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے اور ہر سال عُرس ہوتا ہے۔

سید الیاس حسین حنفی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۶ جلد ۱۳ یکم دسمبر سنہ ۱۹۱۵ء

مختصر رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ ستمبر و اکتوبر سنہ ۱۵ء (ضمیمہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

النّاظر

نمبر ۷۸ جلد ۱۳ یکم دسمبر سنہ ۱۹۱۵ء

مقدمۂ فلسفۂ اجتماع

مملکت فرانس کی کسی عدالت کے سامنے ایک مقدمہ درپیش ہے۔ جج کے گرد جوری حلقہ کیے ہوئے ہے۔ ملزم کی طرف سے پیروکار، مشہور و معروف فرنچ بیرسٹر میسو لاشاد ہے۔ وہ تقریر شروع کرتا ہے، ساتھ ہی جج اور ممبرانِ جوری متاثر ہونے لگتے ہیں۔ لیکن ایک خاص جوری اس عام کیفیت سے مستثنیٰ ہے۔ اُسے مقدمہ کے واقعات کی رتی رتی اطلاع ہو چکی ہے۔ وہ دل میں عہد کرکے آیا ہے، کہ وکلا و بیرسٹروں کی خطابت اُسے کسی طرح شاہراہِ انصاف سے منحرف نہ ہونے دیگی۔ مانا، کہ بریت جرم پر تقریر کرنے والا نہایت مشہور بیان بیرسٹر ہے، مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ وہ خود ذاتی طور پر ملزم کے مجرم ہونے کو متحقق کر چکا ہے، اور آج وہ ہرگز اپنے حسن عدل پروری کو وکیلانہ چرب بانی سے مغلوب نہ ہونے دے گا۔ لاشاد کی تقریر کو شروع ہوئے دس منٹ، پندرہ منٹ، بیس منٹ ہو چکے ہیں، اور تمام سامعین اُسکے زورِ بیان و فصاحت پر مرحبا و آفریں کہہ رہے ہیں، لیکن اُس جوری کا یقین و اثق اب بھی غیر متزلزل ہے، تا و اقفوں کا فریب میں آجانا ممکن ہے، لیکن اُسے کون نا واقف کہہ سکتا ہے۔ وہ ذاتی طور پر اس معاملہ کی تحقیق کرکے ملزم کے

تصفیہ وار ہونے کے نتیجہ پر پہنچ چکا ہے، اور اُسکے یقینِ کامل کو دُنیا کی کون سی زبان آوری شکست دیسکتی ہے؟ آدھ گھنٹہ ہوگیا۔ پینتیس، چالیس، یہاں تک کہ پورے پینتالیس منٹ گزر گئے، اور عہدِ راسخ، اب تک خطابیات کی حملہ آوریوں سے غیر مغلوب ہے۔ سیولاشاد کا جوشِ تقریر اب اپنے منتہائے شباب پر ہے، سامعین میں سے ہر شخص ہمہ تن گوش ہے، اور عدالت کے در و دیوار کے ساتھ حاضرین کے دلوں سے بھی اسکے موثر الفاظ کی صدائے بازگشت آرہی ہے، کہ بے شان و گمان دفعۃً وہ اپنی تقریر میں قطعِ کلام کرکے، حاکمِ عدالت سے مخاطب ہوکر کہتا ہے،

"براہ مہربانی، چپراسی کو حکم دیجیے، کہ سامنے کے دریچہ پہ پردہ چھوڑدے۔ ادھر سے دھوپ آرہی ہے جس سے فلاں جوری صاحب کو تکلیف ہورہی ہے"

یہ جملہ اک عملِ تسخیر تھا۔ عہد و پیمان، عزم و ثبات کا قلعہ بات کی بات میں مسخر ہوگیا۔ چہرہ پر سرخی کا آنا، لبوں پر خفیف مسکراہٹ کا نمودار ہونا، اور زبان کا شکریہ کے لیے کھلنا، آناً فاناً کا کام تھا۔ بالآخر چند منٹ کے بعد جب ملزم کی رہائی کا حکم سنایا گیا، تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اُس فرمانِ رہائی پر ان جوری صاحب کے بھی دستخط تھے۔

نفسِ بشری کی اثر پذیری و تلوّن کی یہ کیسی روشن مثال ہے!

یورپ کی بین الاقوامی صلح کانفرنس کی طرف سے ایک پادری صاحب ہندوستان کے ایک مشہور شہر میں بھی عقائدِ صلح و آشتی کی تبلیغ کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں، یہاں روزانہ شام کو کسی نمایاں مقام پر وہ صلح و آشتی، حلم و درگزر کی خوبیوں پر وعظ کرتے ہیں، اور غیظ و غضب کو دنیا کی سخت ترین لعنت سے تعبیر کرتے ہیں۔ سامعین انکی آزمایش کے لیے اثنائے تقریر میں انکو چھیڑتے رہتے ہیں، لیکن انکو کبھی اشتعال نہیں آتا۔ شدید ترین سخت کلامیوں کا جواب بھی وہ ہمیشہ خندہ روئی کے ساتھ دیتے ہیں۔ ایک عرصہ کے تجربہ کے بعد لوگوں کو یقین ہوجاتا ہے کہ پادری صاحب ایک پیکرِ حلم و متانت، اور مجسمۂ ضبط و تحمل ہیں۔ خاص معتبر و ثقہ اشخاص کا بیان ہے، کہ اُنھوں نے کبھی پرائیوٹ صحبتوں میں بھی اُنھیں

برہم یا چیں جبیں ہوتے نہیں دیکھا۔ یہی پادری صاحب جب ایک مرتبہ گھر میں کھانے پر بیٹھتے ہیں، تو ہندوستانی باورچی غلطی سے کھانے میں نمک زیادہ کردیتا ہے۔ پادری صاحب اُسے بلا کر فہائش کرتے ہیں۔ دوسرے دن اتفاق سے وہ پھر ویسی ہی غلطی کرتا ہے، پادری صاحب آج بھی اُسے فہائش کرتے ہیں مگر کسی قدر خشونت کے ساتھ۔ لیکن جب تیسرے دن، پادری صاحب، دن بھر کے تھکے ماندے رات کے وقت کھانے پر بیٹھتے ہیں، اور باوجود اپنی مکرر فہائش کے، پھر نمک زیادہ پاتے ہیں، تو فرطِ غضب سے کھانا اُٹھا کر پھینک دیتے ہیں، اور باورچی کو نہائی سخت سُست الفاظ سے یاد کرتے ہیں، بلکہ جب وہ سامنے سے ہٹ جانا چاہتا ہے تو اُسے مارنے دوڑتے ہیں۔
بعض دل لگی باز، پیکرِ متانت کی اس غیر متین حالت کو چھپ کر دیکھتے ہیں، اور پھر ایک گونہ تعجب کرتے ہیں۔

سقراط، یونانی فلسفہ کے نظامِ شمسی کا آفتاب ہُوا ہے۔ ارسطو، فلاطون، دیوجانس، ابیکوریس، جملہ اساطینِ فلسفہ نے، جن کے ذریعہ سے علم و حکمت کی روشنی آج تمام عالم میں موجود ہے، براہِ راست یا بالواسطہ علم کا پہلا جرعہ اسی ساقی کے دستِ کرم سے لیا تھا۔ علم و فضل کے ساتھ زہد و اتقا بھی اسکی گھٹی میں پڑا تھا۔ سارا یونان اسکی پاکبازی کا قائل تھا، دیانت داری، راست بازی، حلم، ضبطِ نفس، وغیرہ تمام محاسنِ اخلاق جو اخلاقیات کے عنوانات جلی ہوتے ہیں، سب اسکی ذات میں مجتمع سمجھے جاتے تھے۔ اسکے خاص رازداروں دوستوں کی متفق علیہ روایت ہے کہ اسکا قدم کبھی شاہراہِ اخلاق سے باہر نہیں پڑا۔ ان زبردست شواہد نے خود ہمیں اسکی معصومیت کا معتقد کردیا، اور ہمیں یقین آچلا، کہ خواہ کچھ ہو، مگر یہ ناممکن ہے، کہ سقراط کے قدم کو کسی شدید سی شدید تقویٰ شکن صحبت میں لغزش ہوسکے۔ لیکن دفعۃً اسی مرقع کا دوسرا ورق ہمارے سامنے کھُلتا ہے، اور ہمیں یہ تماشہ نظر آنے لگتا ہے، کہ اسپیسیا نامی ایک زنِ بازاری کے گرد اسکے حلقہ بگوشوں کا مجمع ہے[1] اور اسی حلقہ میں حضرتِ سقراط بھی موجود ہیں۔ ہم اس نظارہ کو اپنی نگاہ کا دھوکا تسلیم کرکے اسکی طرف سے

---

[1] چیمبرز، انسائیکلوپیڈیا کا مضمون نگار، عام مورخین کے خلاف، یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اسپیسیا زنِ بازاری نہ تھی۔ اسکا بیان اگر صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے، تاہم اسکی بدچلنی و آوارگی کے نہایت قوی اور تاریخی شواہد موجود ہیں۔

اپنا مُنہ پھیر لیتے ہیں، لیکن معاً دوسرا سین سامنے آجاتا ہے، کہ ایک دوسری آبروباختہ عورت ڈیوٹیما کی کی خلوت سرا گرم ہے، اور اس دربار کے حاشیہ نشینوں میں پھر سقراط کی صورت جلوہ گر ہے۔ ہم اب بھی حُسنِ ظن سے کام لیتے، لیکن تیسرا منظر اس سے بھی زیادہ بے پردہ ہمارے سامنے آموجود ہوتا ہے۔ ایک محفل نشاط برپا ہے، ایک نہایت خوشرو امرد ساقی گری کر رہا ہے، جام پر جام دورہ کر رہا ہے، اور جو شخص سب سے زیادہ شوق و بیتابی کے ساتھ اس ساقیِ ہوشربا (الکیابیڈیس نامی) کے ہاتھ سے جام لے رہا ہے، وہ وہی پیکرِ علم و فضل، وہی تمثالِ ورع و تقویٰ، وہی زاہدِ نفس کُش، جسکو دنیا سقراط کے نام سے پکارتی ہے!

کیا فطرتِ بشری کے تناقضِ عملی کی اس سے روشن تر نظیر کسی کے تصور میں آسکتی ہے؟-

---

سنہ ۹ ء میں اسلامی ہند کا ممتاز ترین عالم، پیغمبر اسلام کی خانگی زندگی کے متعلق ایک تصنیف شایع کرتا ہے، جسکی عبارت میں بعض مولویوں کو سوء ادب کی جھلک نظر آتی ہے، اور اس سے حاسدوں کی جماعت فائدہ اُٹھانا چاہتی ہے۔ اس اثنا میں یہ خبر مشہور ہوتی ہے، کہ اسی زمانہ میں، دہلی میں مولویوں کا جو جلسہ ہونے والا ہے، اُس میں اس کتاب کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی کوشش کی جائے گی، یہ خبر پھیلتی ہے، مگر اکثروں کو اسپر اس لیے یقین نہیں آتا، کہ اس جماعت میں بعض غیر متعصب آزاد خیال مولوی صاحبان بھی شامل ہیں، جو ہرگز اس تنگ خیالی کو جائز نہیں رکھ سکتے، خصوصاً وہ مشہور عالِم تو ہر حال میں اسکی مخالفت شدید کریگا، جسکی آزاد خیالی و وسیع المشربی ایک عالَم کو مسلّم ہے، جو رواداری کی ایک زندہ تصویر ہے، جس نے سیزدہ صد سالہ تاریخ اسلام کے چہرہ سے تعصب و عدم مسالمت کے ہر داغ کو ایک ایک کرکے دھونے میں اپنی عمر صرف کردی، اور جس نے ایک نہایت مبسوط و محققانہ رسالہ کے ذریعہ سے دنیا پر ثابت کردیا، کہ خلیفہ عمر فاروقؓ پر کتبخانۂ اسکندریہ کی بربادی کا الزام لگانا ایک بے بنیاد تاریخی غلطی کا ارتکاب کرنا ہے۔ لیکن واقعات کی رفتار اس حُسنِ ظن کو قائم نہیں رہنے دیتی۔ علما کی اس کمیٹی کی طرف سے ایک فتویٰ شایع ہوتا ہے، کہ اس کتاب کا مصنف کافر، اور اسکو برباد کردینا ہر مسلمان پر لازم۔ چنانچہ اسکی تعمیل میں اُس کتاب کی تمام جلدیں یکجا کرکے اُن میں علانیہ آگ لگادی جاتی ہے، اور ادب و انشا پردازی کا ایک ناقابلِ تقلید نمونہ، اور

نتہائے تحقیق و کاوش کا ثمرہ، چند منٹ میں تو دۂ خاکستر بن جاتا ہے۔ بالآخر جب اسکی تلاش ہوتی ہے، کہ

کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

تو یہ حقیقت رونما ہوتی ہے، کہ اس حزب المحرقین کے ایک رکن وہ مشہور فاضل بھی تھے جنکی زندگی کا مقصد وحید، مسلمانوں کو سالمت، تحمل، اور رواداری کا درس دینا تھا، مگر جنھوں نے اس کتاب کے "قتل نامہ" پر بلا جبر و اکراہ اور بطیب خاطر اپنے دستخط فرما دیے۔

جو لوگ حیاتِ نفسی کے حقیقی طریق کار سے ناواقف اور نفس بشری کی یکرنگی و یکسانیت کے معتقد تھے، وہ اس انکشاف سے محو حیرت ہو گئے۔

اگر کوئی شخص اپنے عالمِ رؤیا کا بالالتزام جائزہ لیتا رہے، تو اکثر اسے اپنا عکس اپنے سے اتنا مختلف نظر آئیگا، کہ خود اسے شناخت کرنے میں دقت ہوگی۔ ایک نہایت جری و جوانمرد سپاہی یہ خواب دیکھتا ہے، کہ اسکے گھر میں ایک چور گھس آیا ہے، جس سے وہ اس قدر خائف ہو گیا ہے کہ بجائے مدافعت کے، اسکا سارا جسم لرز رہا ہے۔ ایک نہایت بزدل اور استعمال اسلحہ سے ناواقف شخص کو خواب میں یہ نظر آتا ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں بہ کمال دلیری مصروفِ قتال ہے۔ یا پھر ایک نہایت متقی و پاکباز بزرگ، خواب میں، اپنے تئیں بعض سخت شرمناک افعال میں مبتلا پاتے ہیں۔ غرض اسی طرح ہم میں سے ہر شخص خواب میں، ایسی عجیب عجیب رتیں، ایسے عجیب غریب مناظر دیکھتا ہے، جو بیداری میں کبھی اسکے تصور میں نہ تھے اور بارہا اپنے تئیں ایسے افعال کا مرتکب پاتا ہے جنکے صدور کی طرف کبھی اسکا وہم و گمان بھی نہیں جاتا تھا۔

اسی طرح کے پیہم تجربات کے بعد یہ راز بالکل آشکار ہو جاتا ہے کہ انسان کی حیاتِ نفسی، حالاتِ بیداری، و خواب میں ایک دوسرے سے بالکل متبائن ہوتی ہے، اور ایک ہی شخصیت کے اندر بالکل مخالف و متضاد اجزا کام کرتے رہتے ہیں۔

حضرت مسیح کی ولادت کو ابھی تین صدیوں سے زائد زمانہ باقی ہے۔ یونانی تمدن و فلسفہ کا آفتاب

نصف النہار پر ہے۔ سکندر اعظم کی وفات کا واقعہ ابھی بالکل تازہ ہے۔ عین اسی زمانہ میں دارالحکومت یونان میں ایک عصمت فروش عورت فرائنی کی دلربائیوں کا چرچا پھیلنے لگتا ہے۔ اسکا حسن اس بلا کا تھا، کہ اُسوقت کے بہتر سے بہتر نقاش یا مصور کو جب کبھی مجرد حُسن و نزاکت کا مرقع تیار کرنا ہوتا، تو بجائے اپنی قوتِ تخییل پر زور دینے کے وہ حُسن و جمال کی اس تمثال مادی کا عکس اُتار لیتا۔ گویا نقاشوں اور مصوروں کی جماعت میں یہ ایک عقیدہ مسلّم تھا، کہ "حُسن و جمال" ایک ایسا اسم ہے، جس کا مُسمّیٰ تمام عالمِ مادی میں، بجز فرائنی کے جسم کے، اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر یہ فرائنی بایں دلربائی، اپنے عقائد کے لحاظ سے سخت بدمذہب تھی۔ اور صرف یہی نہیں، بلکہ اُسکی بدمذہبی متعدی تھی، جو اُسکے حاشیہ نشینوں کی جماعت کثیر میں سرایت کرتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ کچھ روز میں عاملین حکومت کو یہ صاف محسوس ہونے لگا، کہ اسکی وجہ سے سارے مُلک کی مذہبی و اخلاقی فضا مسموم ہوتی جارہی ہے، اور اس خطرہ کا سدباب کرنا چاہیے۔ یہ ارادہ کرکے فرائنی پر تخریب عقائد و اخلاق کی دفعہ عائد کرکے نہایت اہتمام سے مقدمہ چلایا گیا[1]، اور ایک ایسی عدالت میں پیش کیا گیا، جسکے تمام جج نہایت درجہ محتاط، مستقل مزاج، و انصاف پرست ہونے کے ساتھ اس قدر مُسن تھے، کہ کسی کو یہ احتمال بھی نہ تھا، کہ اُنپر جذبات کا جادو چل سکے گا۔ بہرحال مقدمہ پیش ہوا۔ بریتِ جرم کی طرف سے یونان کا مشہور ترین وکیل ہائپریڈیس تھا، جو ملزمہ کے خاص شیدائیوں میں تھا۔ اُس نے اپنی طلاقتِ لسانی کی پوری طاقت صرف کردی، مگر حقائق و واقعات کی سخت چٹان کے سامنے خطابیات کی موجیں بے اثر رہیں۔ جرم بالکل ثابت تھا، شہادت قطعاً غیر مشتبہ تھی۔ ججانِ عدالت کسی سخت سزا کا حکم دیا ہی چاہتے تھے، کہ دفعۃً فرائنی نے اپنے چہرہ کو بے نقاب کردیا، اور صرف اسی پر اکتفا نہ کی، بلکہ ساتھ ہی ایکبارگی اپنے جسم کا بالائی حصہ کمر تک عریاں کردیا[2]۔ اس ادا کے ظاہر ہوتے ہی ججانِ عدالت مبہوت ہوگئے۔ نگاہوں

---

[1] ناظرین کو یہ خیال رکھنا چاہیے، کہ یونانی قانون میں لامذہبی کی تلقین و اشاعت ایک شدید ترین جرم تھی، جسکی سزا اکثر حالتوں میں موت ہوتی تھی، سقراط اسی الزام میں شہید کیا گیا تھا۔

[2] بعض مورخوں نے بالائی حصۂ جسم کی عریانی کی قید نہیں لگائی ہے، بلکہ صرف اتنا لکھا ہے کہ "فرائنی نے دفعۃً اپنے تئیں برہنہ کردیا۔" مگر ہمنے اُن مورخوں کا تتبع کیا ہے، جنکی روایت ناظرین کو نسبتۃً کم مستبعد معلوم ہوگی۔

میں خیرگی پیدا ہوگئی، جذباتِ کشی انصاف پرستی، فرض شناسی، خوفِ رسوائی، دیانت داری کی متحدہ قوت نے ہتھیار ڈال دیے، اور معاًکل کبیر اہتن، محتاط، و معدلت شعار کرسی نشینانِ عدالت نے متفقہ طور پر ملزم کی رہائی کا حکم سنا دیا۔

نفس انسانی کی ان نیرنگیوں کے سامنے کیا دنیا کے کسی بڑے سے بڑے مضبوط و مستقل کیرکٹر کے شخص پر بھی اعتماد کامل کیا جا سکتا ہے؟

پیر مرد، عورت، بچہ، بلکہ کسی غیر مسلح جوان شخص پر بھی تلوار اٹھانا آئین سپہگری میں شدید ترین معصیت ہے۔ بیگناہوں اور کمزوروں پر حملہ کرنا صرف قزاقوں یا رہزنوں کا شیوہ ہے، جو فوجی نقطۂ نظر سے نہایت بزدلی کی علامت ہے، اور جو فنِ سپہگری کے لیے داغ ہے۔ لیکن باینہمہ جب جنگ شروع ہو جاتی ہے، تو کتنے سپاہی کتنے افسرانِ فوج، کتنے جنرل، اپنے تئیں اس طرزِ عمل سے بالاتر رکھ سکتے ہیں؟ جس کا انتساب ایک سپاہی کے نام کے ساتھ اسکی نہائی تحقیر ہے؟ رسالۂ ہٰذا زیرِ ترتیب تھا، کہ یورپ میں اس عظیم الشان جنگ کے چھڑنے کی خبر آتی ہے، جسکے ہولناک نتائج کا تصور ہی ہر امن پسند و عافیت دوست شخص کے لیے روح فرسا ہے۔ اس جنگ میں وہ قومیں شریک ہوتی ہیں، اور نہایت فخر کے ساتھ شریک ہوتی ہیں، جنھیں اپنے تمدن، شائستگی، و علم پر ناز تھا، اور جنکے فضل و کمال کے سامنے، قدیم مصر، یونان، و روم کے کارنامے بھی دب گئے تھے۔ انھیں مہذب و شائستہ اقوام کی فوجیں جس وقت قتل و خون کے اکھاڑے میں قدم رکھتی ہیں، تو انکی سفاکی، شقاوت، و سبعیت کے آگے، افریقہ کے وحشیوں کو بھی شرم آنے لگتی ہے۔ پھر یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ یہ فوجیں تمامتر ادنیٰ طبقہ کے افرادِ قوم پر مشتمل نہیں ہوتیں، بلکہ اکثر انکا مقدمۃ الجیش اُن بزرگانِ قوم سے مرکب ہوتا ہے، جو حالتِ امن میں علم و فضل کے دیوتا سمجھے جاتے تھے۔ جرمنی ساری دنیا کو تہذیب و تمدن کے درس دینے کا مدعی تھا، لیکن اسی جرمنی قہر و غضب کا عفریت بنکر اٹھتا ہے، اور لووین کے نہایت قدیم و مشہور کتبخانہ اور واجب الاحترام دار العلوم کو چشم زدن میں تودۂ خاکستر بنا دیتا ہے۔ ہیکل کو دنیا نے ہمیشہ اس حیثیت سے جانا، کہ وہ علم الحیات کے صدہا مسائل کا مکتشف، اور جرمنی کا ڈاروِن ہے، لیکن آج دفعۃً

یہ حقیقت بے نقاب ہو کر آتی ہے، کہ وہ شمشیر بکف میدانِ جنگ میں اپنے ابنائے جنس کو خون میں غسل کرتے دیکھ کر مسرور ہو رہا ہے۔ پروفیسر ونٹ ونسٹربرگ نے اپنی ساری عمر نفسیات کے مباحث میں صرف کر دی، اور واقعہ یہ ہے کہ آج اُن سے بہتر عالم اس فن کا تمام دنیا میں نہیں، لیکن اس موقع پر وہ اس قدر حواس باختہ ہوئے ہیں، کہ اپنی تمام قوت، لوگوں کو شرکتِ جنگ کی ترغیب میں صرف کر رہے ہیں۔ اناطول فرانس اسوقت فرنچ انشا پردازوں کا مسلم امام تھا، مگر جنگ کے شروع ہوتے ہی یہ نظارہ رونما ہوتا ہے۔ کہ اُسکی انگلیاں قرطاس و قلم کی جگہ، سیف و تفنگ سے کھیل کر رہی ہیں۔ انگلستان کا مشہور عالم کیمیائیات سر ولیم ریمزے، کل تک جرمن علمائے سائنس کی مدح و ثنا میں رطب اللسان تھا، مگر آج اُسے یہ نئی اکتشاف ہوتا ہے، کہ جرمن سائنس دانوں میں اجتہاد و اکتشاف کی مطلق قابلیت نہیں[۱]۔

کیا ان حالات سے یہ صریح نتیجہ نہیں نکلتا، کہ مہذب اشخاص ہمیشہ مہذب نہیں رہتے، اور معقول پسند افراد ہمہ وقت معقول پسند نہیں رہتے؟ علم و جہالت، آدمیت و سبعیت، تہذیب و وحشت میں صرف چند سکنڈ کا آگا پیچھا ہوتا ہے، اور دونوں کے حدود ایک ہی جسم کے اندر باہم متصل و پیوستہ رہتے ہیں۔

شریف خاندان کی باعصمت لڑکیاں، شرم و حیا کی تصویر ہوتی ہیں، انکی آنکھیں فحش الفاظ سے، اور انکے کان فحش الفاظ سے یکسر ناآشنا ہوتے ہیں۔ بلکہ اگر انکے دماغ میں بھی اتفاقاً کوئی ایسا تصور پیدا ہوتا ہے، جس میں کوئی بعید سا بعید پہلو بھی لذائذِ جنسی کا نکلتا ہو، تو وہ فرطِ حجاب و حیا سے جھجک اُٹھتی ہیں۔ لیکن یہی غیرت و ناموس کی پُتلیاں، جب اپنے تئیں اپنے شوہروں کے آغوشِ اختلاط میں دے دیتی ہیں، تو اُسوقت اُنکے جذباتِ شرم و حیا غیرت و حیا کو کیا ہو جاتا ہے؟ کیا اُنکو اسوقت کی نہتائی بیحیائیوں اور اپنے عام کیرکٹر میں کوئی تناقض نظر نہیں آتا؟ نہیں، مطلق نہیں۔

وہ فطرت کے اس قانون کے سامنے بے بس ہیں، کہ اختلافِ حالات کے ساتھ انسانی کیرکٹر کے رنگ لازماً بدلتے رہتے ہیں۔

۱۹۰۹ء کا ذکر ہے کہ فرانسیسی اخبارات میں ایک مقدمہ کی بظاہر نہایت حیرت انگیز روداد شایع ہوئی۔

---

[۱] سائنس مورخہ ۸ نومبر ۱۹۱۴ء

جسکے واقعات حسب ذیل ہیں :۔ ایک مقام پر کسی بچہ کی لاش پڑی ہوئی ملی۔ اتفاقاً ایک دوسرا لڑکا ادھر آنکلا، اور اُس نے بیان کیا، کہ یہ تو میرے اسکول کے فلاں دوست کی لاش ہے۔ اسپر اُسکی ماں کو خبر کی گئی، وہ آئی، اور لاش کو دیکھتے ہی چلائی، کہ یہ تو میرا بچہ ہے، پھر اس نے اُسکے جسم و لباس کو بغور دیکھ کر کہا، کہ "اسکی پیشانی پر جو نشان ہے، یہ خاص میرے بچہ کی شناخت ہے، معلوم ہوتا ہے کسی شقی نے اسے قتل کر ڈالا"۔ اسکے بعد اُس ماں کے بہنوئی کو اطلاع ہوئی، جس نے آکر بیان کیا، کہ "ہاں یہ میرا پیارا بھانجا ہے"۔ حاکم کو شاید اب بھی تسکین نہیں ہوئی، اُس نے مزید شہادت طلب کی، متعدد معزز گواہ پیش ہوے، اور سبنے بالاتفاق یہی گواہی دی، کہ یہی لڑکا ہے۔ انھیں گواہوں میں اُس لڑکے کے اسکول ماسٹر بھی تھے، جنھوں نے ایک بڑی شناخت یہ بتائی، کہ اُس لاش کے گلے میں جو تمغہ پڑا ہے، یہ وہی ہے، جو اس بچہ کو اسکول سے انعام میں ملا تھا۔ کیا کسی دعوے کی تائید میں، اس سے زیادہ قطعی الدلالۃ شہادت آسانی سے تصور میں آسکتی ہے؟ لیکن واقعاتِ مابعد نے ثابت کر دیا، کہ یہ تمام ذخیرۂ شہادت، خرافات تھا۔ جس لڑکے کی واقعتہً یہ لاش تھی، وہ پیرس کا تھا ہی نہیں، وہ بورڈو کا تھا، وہیں قتل کیا گیا، اور اُسکی لاش پیرس میں لاکر ڈال دی گئی۔ چنانچہ بالآخر ماں، خالو، اُستاد، کلاس فیلو، و دیگر معزز گواہوں میں سے سبنے، اپنی غلط شناسی کا اعتراف کیا۔

جن لوگوں کا یہ خیال تھا کہ کسی رائے پر بہت سے اشخاص کا متفق ہو جانا، اُسکی اصلیت و واقعیت کی دلیل ہے، وہ اس روداد کو پڑھ کر سوچ میں آگئے۔

صفحاتِ بالا میں ناظرین کو متعدد واقعات سے، جو تاریخ یا روزانہ زندگی کے مشاہدات سے ماخوذ ہیں، روشناس کیا گیا۔ لیکن کیا ان، بظاہر باہم غیر مربوط معلومات کے اندراج سے ناظرین کی محض تفریحِ طبع یا ضیافتِ ذوق منظور تھی؟ نہیں، انکا اصلی مقصد، متفرق مادی مثالوں کے ذریعہ سے ایک اہم ترین حقیقتِ نفسیاتی کو ذہن نشیں کرانا تھا، جس سے لاعلم رہ کر کوئی شخص انسان کی حیاتِ نفسی کے حقیقی طریقِ کار کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہم سے ہماری مراد ہیں عام عقیدہ کی تغلیط سے ہے، کہ

انسان کا کیرکٹر یا مزاج شروع سے آخر تک یکساں رہتا ہے۔ فطرت بشری کے متعلق جو خیالات عام طور پر شایع ہیں، اُن میں سے، اس سے زیادہ بعید از واقعیت کوئی دوسرا خیال نہیں۔ درحقیقت، نفس بشری کی تشبیہ مطلقاً کسی صاف سطح سے نہیں دیجا سکتی، جو یکسر ہموار ہو۔ وہ اگر سطح ہے بھی تو ایسی جو متعدد ناہمواریوں سے لبریز ہے۔ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ بجز اُن خصائص نوعی کے، جنکا ہر فرد بشر میں پایا جانا لازمی ہے، اور بجز اُن خصائص قومی کے، جنکا کسی خاص قوم کے تمام افراد میں موجود ہونا ضروری ہے، افراد کے خصائص ذاتی تمامتر موثرات خارجی کے تابع و محکوم ہوتے ہیں اور چونکہ یہ موثرات خارجی ہر لحظہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اس لیے نفس بشری بھی ایک مستمر تلوّن کی حالت میں رہتا ہے۔ البتہ چونکہ یہ تغیرات عموماً خفیف مدارج اور تدریجی رفتار کے ساتھ واقع ہوتے رہتے ہیں، اس لیے عام نظروں سے مخفی رہتے ہیں۔ مگر جب کبھی ماحول، یعنی گرد و پیش کے حالات میں کوئی غیر معمولی تغیر ہوتا ہے، تو اسکے ماتحت انسان کے مزاج و طبیعت میں بھی دفعۃً ایسا نمایاں انقلاب ہو جاتا ہے، کہ ہر شخص کی نظر اُسپر پڑنے لگتی ہے۔ یہ بے شبہہ سچ ہے کہ ہم اپنی روزانہ گفتگو میں ہر شخص کے ساتھ ایک خاص کیرکٹر یا اُفتادِ طبیعت کا انتساب کرتے ہیں. مثلاً فلاں نیک چلن ہے، فلاں بدمزاج ہے، فلاں دانشمند ہے، فلاں علم دوست ہے، لیکن اس سے ہماری مراد ہمیشہ یہ ہوتی ہے، یا یہ ہونی چاہیے، کہ فلاں شخص کا مزاج اس طرح کا صرف اوسطاً بلحاظ اکثریتِ حالات ہے، ورنہ نیک چلنی، بدمزاجی، دانشمندی، علم دوستی، وغیرہ میں سے ایک خصوصیت بھی ایسی نہیں، جسے کوئی شخص ہر حالت میں اور ہر موقع پر ملحوظ رکھتا ہو۔

اصل یہ ہے کہ انسان کی حیاتِ نفسی دو بالکل مختلف و متباین عناصر سے مرکب ہے۔ اسکا ایک پہلو وہ ہے، جسے ہم نفس شاعرہ یا نفس ذاتی سے موسوم کرتے ہیں، اور جسکے تحت میں وہ تمام کیفیات داخل ہیں، جن میں انسان اپنے پورے شعور و ارادہ سے پورا کام لیتا ہے۔ یہ شعبۂ نفسی، نظام عصبی کے مراکز اعلیٰ یعنی دماغ کا محکوم ہوتا ہے۔ اسی کے مقابل دوسرا عنصر، حیاتِ نفسی کا وہ ہے، جسے نفس نیم شعوری یا نفس تحت الذات کہہ سکتے ہیں۔ یہ اُن کیفیات پر مشتمل ہے، جن میں انسان محض شعور خفی سے کام

لیتا ہے، اور قوائے شعوری وارادی معطل رہتے ہیں، (مثلاً حالتِ خواب میں)۔ یہ شعبہ، نظامِ عصبی کے مراکزِ ادنیٰ یعنی نخاعِ مستطیل کا محکوم ہوتا ہے۔ حیاتِ انسانی جن افعال کے مجموعہ سے عبارت ہے، انسان اگر انکی تحلیل کرے، تو معلوم ہوگا، کہ اُنکا بیشتر حصہ اسی شعورِ خفی کی ماتحتی میں انجام پاتا ہے۔ افعالِ قسری[1]، افعالِ اضطراری[2]، افعالِ عادیہ[3]، کے علاوہ جذبات، احساسات، معتقدات، و محرکاتِ عمل، عموماً اسی نیم شعوریت یا نفسِ تحت الذات کے مظاہر ہوتے ہیں۔ اور انکے بعد جو کچھ باقی رہ جاتا ہے، وہ اعمالِ عقلی کا حصہ ہے، جو دماغ کا محکوم ہوتا ہے۔ لیکن پھر غور کرو، کہ ان تمام چیزوں کو حذف کرنے کے بعد، حیاتِ نفسی کا جزو باقی ہی کونسا رہ جاتا ہے؟ سوا اسکے اور کچھ نہیں، کہ مفرداتِ تحت الشعور میں، یعنی اُن اجزائے ذہنی میں، جو شعورِ خفی کے عناصرِ ترکیبی کا کام دیتے ہیں، ایک خاص نظم و ترتیب پیدا کی جائے۔ تو گویا شعور کا فریضۂ اصلی، تمامتر یہ ٹھہرتا ہے، کہ تحت الشعور کے مفرداتِ متفرق میں تنظیم و تنسیق پیدا کرے، اور دماغ کے وظیفۂ طبعی کا نچوڑ یہ ہے کہ وہ نخاع و نخاعِ مستطیل کے افعال و وظائف کی نگرانی کرتا رہے۔

اسکو زیادہ توضیح سے یوں سمجھنا چاہیے، کہ خارج سے جو تہیجات آ آکر ہر لحظہ نظامِ عصبی میں داخل ہوتے ہیں، اور جو شعورِ خفی کے مواد کا کام دیتے ہیں، وہ اکثر ایک دوسرے سے بالکل مختلف، بلکہ کبھی کبھی باہم بالکل متضاد و متناقض ہوتے ہیں۔ انکے تناقض کو اگر بدستور اسی حال پہ چھوڑ دیا جائے، تو انسانی زندگی دشوار کیا معنی، ناممکن ہو جائے۔ پس لازمی ہے کہ ان تناقضات کو رفع کیا جائے، اور شعورِ خفی کے عناصرِ متبائن کو ایک خاص نظام و ترتیب کے ماتحت لایا جائے۔ چنانچہ ایک خاص عضو، اسی مقصد کے لیے مخصوص ہے، اور اسکا نام دماغ ہے، جسکے وظیفۂ طبعی کو نفسیات کی اصطلاح میں وقوف، یا شعورِ عقلی کہتے ہیں۔ فرض کرو، کہ زید ایک شخص ہے، جسکے بعض افعال سے ہمیں تکلیف ہوئی ہے، اور بعض سے مسرت۔ تو ایسے شخص کو ہم اپنا

---

[1] مثلاً حرکتِ قلب، دورانِ خون، تنفس، اور معدہ، جگر، انتڑیوں وغیرہ کے حرکات۔

[2] مثلاً کھانسنا، چھینکنا، ہنسنا، آنکھ جھپک جانا، وغیرہ۔

[3] یعنی وہ افعال جنہیں ابتداءً ہمنے قصد و ارادہ سے اختیار کیا تھا، مگر اب وہ از خود ہمسے سرزد ہوتے رہتے ہیں، مثلاً ہم ایک خاص انداز سے چلتے ہیں، ایک خاص اسلوب نشست و برخاست کا رکھتے ہیں، ایک خاص لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔ اور یہ سب بربنائے عادت ہوتا ہے۔

محسن قرار دیں گے یا دشمن؟ نظام عصبی میں اسکے متعلق دونوں طرح کے تہیجات داخل ہو چکے ہیں، دونوں طرح کے نقوش قائم ہو چکے ہیں، اور شعور خفی میں اسکے بارے میں دو متضاد رجحانات پیدا ہو چکے ہیں۔ اب ایسے موقع پر، اکثریت کی بنا پر کوئی فیصلہ کرنا، اور اس شخص کی طرف خوشی یا ناخوشی کا کوئی ایک جذبہ متعین طور پر قائم کرنا دماغ کا کام ہے۔ یا مثلاً فرض کرو، کہ ایک شخص ہمارا بہت بڑا دوست و محسن ہے، جو شروع سے برابر ہمارے ساتھ دوستی کرتا رہا ہے، مگر اب ایک خاص وقت پر اسکی طرف سے ہمیں سخت تکلیف پہنچی ہے، ایسی حالت میں ہمیں دفعۃً اشتعال ہوتا ہے، اور ہم بے اختیار یہ چاہتے ہیں کہ اُسے کوئی نہایت شدید سزا دیں۔ یہ خواہش، یہ جذبہ، یہ ہیجان، ایک نیم شعوری یا نخاعی فعل ہے۔ لیکن ہم ہی میں ایک دوسری قوت ایسی ودیعت ہے، جو انجام کار خیال دلا کر ہمیں اپنے ارادہ کو قوت سے فعل میں لانے سے روکتی ہے۔ یہ قوت عقل یا شعور عقلی کی ہوتی ہے، اور اسی کا مستقر دماغ ہے[۵]۔ خلاصہ یہ، کہ ہیجات خارجی سے براہ راست متاثر ہونا، اور محرکاتِ عمل کو بجنسہٖ قبول کرنا، نظامِ عصبی کے مراکز اسفل، یا نخاعِ و نخاعِ مستطیل کا کام ہے، اور ان افعال کی ایک افسرانہ حیثیت سے نگرانی کرتے رہنا دماغ کا کام ہے۔

لیکن دماغ و نخاع کا یہ تعلق صرف ایک عام حیثیت سے بیان کیا گیا، جو بیداری کی حالت میں اوسطاً ہر فرد بشر کے ذہن میں پایا جاتا ہے۔ اور جس وقت تک یہ تعلق قائم ہے، اُسی وقت تک یہ کہنا درست ہے، کہ نفس اپنی حالتِ شاعرہ میں ہے۔ لیکن انسان کی زندگی میں ایسے مواقع بھی پیش آتے رہتے ہیں، جب تعلقات کی یہ ترتیب اُلٹ جاتی ہے: دماغ بجائے افسر و حاکم کے ماتحت و محکوم ہو جاتا ہے، اور وظائفِ نخاعی غلبہ و تصرف حاصل کر لیتے ہیں۔ اس تعلق معکوس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ کسی انسان کی سیرت و کردار کے متعلق، اسکے عام طرز زندگی کو دیکھ کر، ہمنے اوسطاً جو نتائج نکالے تھے، وہ باطل ہو جاتے ہیں؛ اُس سے جو توقعات

---

[۵] دماغ و نخاع کی ساخت، اور انکے باہمی تعلقات کو سمجھنے کیلیے ناظرین کو "فلسفۂ جذبات" کا باب دوم آخر تک پڑھنا چاہیے۔ یہاں اگر اُسکا خلاصہ بھی درج کیا جائے، تو موجب طوالت ہوگا۔ نظام عصبی کے مراکز اعلیٰ و اسفل سے یہ مراد ہے، کہ عصبی مادہ کے جو خلایا (زیادہ تر مدوّر) نظام عصبی کے سب سے بالائی حصہ یعنی دماغ کے اوپر کے ٹکڑوں میں ہوتے ہیں، وہ اعلیٰ مراکز عصبی کہلاتے ہیں، اور جو خلایا نسبۃً پست و زیرین قطعات، یعنی نخاع و نخاع مستطیل میں ہوتے ہیں، اُنھیں اسفل مراکز عصبی کہتے ہیں۔

قائم کیے تھے وہ غلط ثابت ہونے لگتے ہیں، اور خود وہ شخص اپنے تئیں جن مشاعر و افکار، احساسات و جذبات کا حامل سمجھتا تھا، اب وہ اس سے بالکل مختلف نظر آنے لگتے ہیں۔ اس قلبِ ماہیتِ ذہنی، اس استحالۂ نفسی کا بہترین نمونہ ہر شخص کو اپنے خوابوں میں مل سکتا ہے۔ دن بھر کی محنت و مشغولیت کے بعد، اعلیٰ مراکزِ عصبی کو یقیناً آرام کی حاجت ہوتی ہے، جسے دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیے، کہ وہ اپنے فرائض سے معطل ہو جاتے ہیں اور اُنکے ذرات دخلایا میں بجائے حرکت کے ایک طرح کا جمود آجاتا ہے، بس اسی کا نام نیند ہے۔ سو جانے پر، جب مراکزِ اعلیٰ کے فرائض معطل ہو جاتے ہیں، تو مراکزِ اسفل کو غلبہ و تسلط کا موقع مل جاتا ہے۔ اُس وقت انسان کی قوتِ فکر و عقل ماند ہو جاتی ہے، اب نہ وہ مآل اندیشی سے کام لے سکتا ہے، نہ کسی قانون یا اخلاق کا پابند۔ نتیجہ یہ ہوکہ وہ اپنے تئیں عجیب و غریب، بلکہ بعض مرتبہ سخت مضحکہ انگیز مناظر کا تماشا گاہ پاتا ہے۔ کبھی اُسے خواب میں یہ نظر آتا ہے کہ اُس نے اپنے عزیز ترین دوست کو قتل کر ڈالا ہے، کبھی یہ دیکھتا ہے کہ وہ خود قتل ہو گیا ہے، اور کبھی اپنے تئیں ایسے سخت اخلاق شکن مشاغل میں مصروف پاتا ہے، جنکی طرف عالمِ بیداری میں کبھی اُس کا خیال نہیں گیا تھا۔ سیرت (کیرکٹر) کا یہ غیر متوقع تغیر، یہ محیر العقول انقلاب، تمام تر معلول ہوتا ہے اسی دماغی تعطل اور نخاعی تسلط کا۔

مگر غلبۂ نخاعی کی یہ کیفیت، صرف عالمِ رویا پر موقوف نہیں، عالمِ بیداری میں بھی اسی طرح کی حالتیں ہم سب پر طاری ہوتی رہتی ہیں۔ شدید دہشت و ہراس کے عالم میں کس کے حواس بجا رہتے ہیں؟ سخت اشتعال کی حالت میں کون شخص اپنے آپ میں رہتا ہے؟ جوشِ عشق میں کس کی نظر انجام پر رہتی ہے؟ فرطِ غم میں کس کے ہوش ٹھکانے رہتے ہیں؟ اس قبیل کی کیفیات نادر الوقوع نہیں، بلکہ کثرت سے پیش آتی رہتی ہیں۔ ان سب میں مشترک یہ ہے، کہ انسان سے، اضطراراً ایسے افعال سرزد ہونے لگتے ہیں، جو اسکی عام سیرت کے بالکل منافی ہوتے ہیں، اور جن کے ارتکاب کا اُسکی ذات سے شان وگمان بھی نہیں ہوتا۔[1]

[1] "اپنے آپ میں نہ رہنا" "آپے سے باہر ہو جانا" "بیخود ہو جانا" "از خود رفتہ ہو جانا" اور اسی طرح کے دوسرے محاورات زبان میں شایع ہیں، اُن سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعۂ استحالۂ نفسی، عوام کے لیے بھی ایک غیر معلوم شے نہیں، البتہ یہ ضرور ہے، کہ اسکی اصل ماہیت اور اہمیت سے، بجز چند ماہرینِ فن کے اور کوئی باخبر نہیں۔

اس طرح کے شواہد سے اس حقیقت پر کافی روشنی پڑتی ہے، کہ سیرتِ بشری کی اوپری سطح کے نیچے بہت سے ایسے خصائص نفسی مخفی رہتے ہیں، جو سیرت نمایاں کے بالکل منافی ہوتے ہیں۔ معمولی حالات کے درمیان، یہ پردۂ خفا میں رہتے ہیں، لیکن جب کبھی کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ، کوئی ایسا قوی ہیجان رونما ہو جاتا ہے، جو اپنی اچانک تیزی و قوت سے عام نفسی توازن کو درہم و برہم کر دیتا ہے، اور نفس کے عناصر ترکیبی کے باہمی تعلقات کی فطری ترتیب اُلٹ دیتا ہے، تو یہ دبے دبائے جذبات اکبارگی نہایت خوفناک تیزی سے نکل پڑتے ہیں، اور اپنی نیرنگیوں سے دیکھنے والوں کو محوِ حیرت کر دیتے ہیں۔ اسفل مراکز عصبی کے سامنے اعلیٰ مراکز عصبی کی شکست، قوائے نخاعی کے مقابلہ میں قوائے دماغی کی سپرانگندگی، اور نفس تحت الشعور سے نفس شاعرہ کی مغلوبیت کا یہ ایک بالکل قطعی و لازمی نتیجہ ہوتا ہے، کہ نفس بشری کے جن خصائص پر ضعف و مجہولیت کا پردہ پڑا ہوتا ہے، وہ دفعۃً نمایاں ہو جاتے ہیں؛ جو نمایاں ہوتے ہیں، وہ دب جاتے ہیں؛ جس استعداد کا محض امکان ہوتا ہے، وہ قوت سے فعل میں آ جاتی ہے؛ جس شے کو ذرا پیشتر خاکستر سمجھا جاتا تھا، اسکے نیچے سے اکبارگی شعلے نکلنے لگتے ہیں؛ اور ہیئت مجموعی سیرتِ بشری کے خط و خال میں اس قدر عظیم الشان انقلاب ہو جاتا ہے، کہ ہر شخص کو خود اپنا عکس شناخت کرنا محال ہو جاتا ہے۔

تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہوتا ہے، کہ منجملہ دیگر اسباب کے، جو توازنِ نفس کو درہم و برہم کر دیتے ہیں اور سیرتِ بشری کی ہموار سطح کو شدت سے پُرشکن بنا دیتے ہیں، ایک خاص و اہم سبب، اجتماع، یعنی افراد کا جزوِ جماعت بننا ہے۔ نفسیاتِ اجتماع کی تفصیل تو آئندہ ابواب میں آئیگی۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ نفسیاتِ فرد یہ کیونکر نفسیاتِ جمعیہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یا بہ الفاظِ دیگر، کن کن شرائط کے جمع ہو جانے پر، نفسِ ذاتی کی قلبِ ماہیت ہو کر، اُس میں نفس اجتماعی کے خصائص پیدا ہو جاتے ہیں۔

نفس اجتماعی کی ماہیت اس سے زائد کچھ نہیں، کہ وہ نفس ذاتی ہی ہوتا ہے، جبکا توازن طبعی مختل ہو گیا ہے۔ اس اختلالِ توازن کے اسباب، جیسا کہ ڈاکٹر سیڈس نے بہ کمال دقت نظر تشخیص کیے ہیں، حسب ذیل ہوتے ہیں:۔

(۱) حرکاتِ ارادی کی تحدید - پہلا سبب، حالتِ اجتماع میں افراد کے اعمال و حرکات کا محدود ہو جانا ہے

اگر ہم اپنے نفس سے یہ سوال کریں، کہ کیا شے ہے جو ہم میں انفرادیت یا شخصیت کا احساس پیدا کرتی ہے؟ تو اسکا جواب صرف ایک ہو سکتا ہے، یعنی "ہماری نقل و حرکتِ ارادی"۔ فرض کرو، کہ ہم سے نقل و حرکتِ ارادی کی قوت سلب ہو جائے، ہم اپنے قصد سے نہ بات چیت کر سکیں، نہ چل پھر سکیں، نہ اپنی جگہ پر ہاتھ پیر کو جنبش دے سکیں، تو پھر کیا شے باقی رہ جائیگی، جو ہم میں یہ احساس پیدا کر سکتی ہے، کہ ہم مستقلاً ایک نفسِ ذاتی یا ایک مستقل شخصیت رکھتے ہیں؟ یقیناً کچھ نہیں۔ یا پھر اسی طرح، اگر نفسیاتِ طفولیت کا مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوگا، کہ بچہ میں جذبۂ انانیت[۱] ہمیشہ اسکی قدرت حرکتِ ارادی کے متناسب ہوتا ہے۔ یعنی جس وقت تک بچہ حرکاتِ ارادی پر قادر نہیں ہوتا، اُس میں شعورِ ذات پیدا ہی نہیں ہوتا، لیکن جوں جوں اُس میں نقل و حرکتِ ارادی کی قابلیت بڑھتی جاتی ہے، اُسی نسبت سے اُسے اپنی شخصیت کا احساس بھی زیادہ وضاحت، زیادہ تیقن اور زیادہ استحکام کے ساتھ پیدا ہوتا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ خود شعوری و حرکاتِ ارادی کا نشو و نما پہلو بہ پہلو ہوتا ہے؛ اور اگر کسی ذریعہ سے حرکاتِ ارادی محدود ہو جائیں، تو لازمی طور پر ہمارا شعورِ شخصی بھی ماند پڑ جائیگا، اور نفسِ ذاتی کی قدرتی ساخت و ترکیب میں اختلاط انگیز فرق واقع ہو جائیگا۔

دلیل کا پہلا مقدمہ ہو چکا، دوسرا مقدمہ، مشاہدہ کی اُس حقیقت پر مبنی ہے، کہ جماعت میں تحدیدِ حرکات

---

[۱] "انانیت" سے یہاں کبر و خود پرستی مفہوم نہیں، بلکہ اس سے مراد خود شعوری، یعنی نفس کے اُس احساس سے ہے، کہ وہ اپنا ایک مستقل و علحدہ ذاتی وجود رکھتا ہے۔ انانیت، شخصیت، شعورِ ذات، ایغوئیت، خود شعوری، یہ سب مرادف اصطلاحات ہیں۔ انانیت کی توضیح ہمنے "فلسفۂ جذبات" میں ان الفاظ سے کی تھی:۔

"شیر خوارگی میں بچہ کا شعور جس ناقص حالت میں ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اُس وقت تک وہ یہ بالکل نہیں سمجھتا، کہ وہ خود بھی کوئی ذاتی شخصیت رکھتا ہو، بلکہ سچ یہ ہے کہ سرے سے ذات یا شخصیت کا مفہوم ہی اسکی سمجھ سے باہر ہوتا ہے۔ البتہ جب اس دور سے نکلتا ہے، تب وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ مثل دیگر ہستیوں کے وہ بھی ایک مستقل قائم بالذات وجود رکھتا ہے اور یہ کہ دنیا کی دوسری ہستیوں کے مقابلہ میں اسکی ہستی قوی اکر دہ ہے۔ اس اپنی ذات، خودی، یا شخصیت کے شعور سے اس میں جو کیفیت جذبی پیدا ہوتی ہے، اسی کا نام جذبۂ انانیت ہے۔" (صفحہ ۱۹۰ - ۱۹۱)

ارادی کی خصوصیت بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا، کہ افرادِ جماعت کا شعورِ ذات، لامحالہ ناقص رہ جاتا ہے، اور اُنکے قوائے دماغی کا میدانِ عمل تنگ و محدود ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے کون شخص ایسا ہے، جو کسی اجتماعِ عظیم کا جزو ہو کر پوری آزادی کے ساتھ نقل و حرکت کر سکتا ہے؟ اور اگر نہیں کر سکتا، تو ماننا پڑے گا، کہ اسکی سطحِ دماغی پست ہو گئی ہے، اور عقلی حیثیت سے وہ اُس رتبہ پر نہیں رہا، جس پر وہ جزوِ اجتماع بننے سے پیشتر تھا۔ فطرتِ بشری کا یہ ایک ناقابلِ تغیر قانون ہے، کہ **اجتماع کی وُسعت اور افراد کی خودشعوری کے درمیان تناسبِ معکوس ہوتا ہے۔**

(۲) سکونِ خیال و یکسوئی۔ جماعت کی حیاتِ شاعرہ کا دوسرا بڑا دشمن، اُسکے افراد میں غیرمعمولی سکونِ خیال، مرکزیتِ توجہ، و یکسوئی کا پیدا ہو جاتا ہے۔

ناظرین میں سے جو لوگ خود مسمریزم و ہپناٹزم سے واقف ہیں، یا کم از کم جنھوں نے دوسروں پر یہ عمل ہوتے ہوئے دیکھا ہے، وہ اس نکتہ کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ ہپناٹزم کے عمل کے مختلف طریقے ہیں۔ بعض عامل، معمول کے جسم پر اُوپر سے نیچے کی طرف ہاتھ پھیرتے ہیں، بعض اُسکی نگاہ بوتام یا کسی اور چمکدار شے پر جماتے ہیں، بعض اپنی نگاہ اُسکی نگاہ سے لڑاتے ہیں، وغیرہ۔ لیکن ان سب طریقوں میں، بایںہمہ اختلاف، قدرِ مشترک یہ ہوتا ہے، کہ معمول کی توجہ اور تمام چیزوں کی طرف سے ہٹا کر کسی ایک خاص شے پر محدود کر دی جاتی ہے۔ تم نے خیال کیا ہو گا کہ عمل کرتے ہوئے عاملین اسکا بھی خاص اہتمام رکھتے ہیں، کہ کمرہ میں شور و غل نہ ہوتا ہو، اسکا بھی مقصد یہی ہے، کہ معمول کی توجہ منتشر نہ ہونے پائے۔ ایسے موقع پر نفسیات کی اصطلاح میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ یہ ہے، کہ تہیجاتِ درآور کا راستہ اس قدر رُک جاتا ہے، کہ وہ یا تو نظامِ عصبی مرکزی کے اُن قطعات تک پہنچتے ہی نہیں پاتے، جہاں پہنچکر حرکتِ عصبی، حالتِ شعوری میں تبدیل ہوتی ہے، یا اگر پہنچ بھی جاتے ہیں، تو خلایائے مرکزی میں وہ حرکات نہیں پیدا ہونے پاتیں، جو تکوینِ حالتِ شاعرہ کی مستلزم ہیں۔ غرض ہر صورت عامل اپنی قوتِ ارادی سے کام لیکر، معمول کی توجہ کو یکسو کر کے اسکا مرکز صرف اپنے احکام کو بنا لیتا ہے، اور اسکے سوا، خارج سے آنے والے تمام تہیجات کا دروازہ معمول پر بند کر دیتا ہے۔ اس یکسوئی خیال و مرکزیتِ توجہ کا جو اثر، معمول پر پڑتا ہے؛ جس کو رانہ اطاعت کے ساتھ وہ عامل کے تمام

احکام کی تعمیل کرتا ہے، بلکہ جس قطعیت کے ساتھ وہ عامل کے ہاتھ میں ایک ہیجان آلہ بن جاتا ہے، اُسکا تماشا ناظرین بارہا دیکھ چکے ہوں گے، اور اس سے یہ حقیقت اُنپر منکشف ہوگئی ہوگی، کہ یکسوئی خیال و مرکزیت توجہ، حیاتِ شاعرہ کے حق میں کس درجہ سمِ قاتل کا حکم رکھتی ہے۔

اب ذرا کسی اجتماعِ عظیم کا تصور کرو، اور دیکھو کہ اُس میں بھی اسی مرکزیت توجہ کا کس قدر سامان جمع ہوجاتا ہے۔ سامنے پلیٹ فارم پر ایک سحربیان خطیب تقریر کر رہا ہے، موضوعِ تقریر کسی مذہبی یا سیاسی ہیجان سے کام لیتا ہے۔ ہزاروں آدمی سامنے ہیں، لیکن خطابیات کی یہ سحرطرازی ہے، کہ ہزارہا متنفس میں اسوقت گویا ایک شخص بھی ذی روح نہیں۔ ہر شخص ہمہ تن گوش و ہمہ تن چشم ہے۔ ہر کان مقرر کی آواز کا استقبال کر رہا ہے، اور ہر آنکھ اُسکے چہرہ پر گڑی ہوئی ہے، شور وغل کا نام نہیں، سکون وخاموشی کا یہ عالم ہے کہ مکھی کی بھنبھناہٹ تک سنائی دیتی ہے۔ اور کُرسی کے ہٹانے یا کسی کو کھانسی آنے کا شور تو ناقابلِ برداشت معلوم ہوتا ہے۔ ہر قلب گویا مسحور ہے، اور ایک بودگی کے عالم میں کسی عجیب وغریب واقعہ کا منتظر و متوقع ہے۔ مشہور روسی انشاپرداز کونٹ ٹالسٹائے، ضمناً ایک موقع پر ایک مجمع کا مرقع ان الفاظ میں کھینچتا ہے:—

> ”مجمع پر ایک سکون کا عالم طاری تھا، اور ہر شخص گویا ایک دوسرے کو آگے کی طرف بلا قصد ڈھکیل رہا تھا، ایک دوسرے پر بلا پڑتا تھا، فضا آدمیوں کی کثرت سے مسموم ہوگئی تھی، سانس لینا دشوار تھا، حرکت کرنا محال تھا، اور ہر شخص کسی عجیب وغریب، کسی پُر اسرار، کسی عظیم الشان واقعہ کے انتظار میں تھا۔ غرض اس مجموعی حالت کا دیر تک قائم رکھنا ناممکن تھا۔ جو لوگ آگے کی قطاروں میں تھے، اور جو سب کچھ دیکھ اور سُن رہے تھے، اُنکی قطع یہ تھی، کہ مُنھ کُھلے ہوئے تھے، آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، اور اُن سے خوف وہیبت ٹپک رہی تھی۔ اس وضع سے کھڑے ہوئے یہ لوگ پشت والوں کے دباؤ اور دھکّوں کو روک رہے تھے“

غور کرو، یہ حالت بلحاظ سکونِ فکر، یکسوئی ذہن، و مرکزیتِ توجہ، اُس حالت کے کس قدر مشابہ و مماثل ہے جو عمل ہپناٹزم کے وقت، معمول کی ہوتی ہے۔ اور اسکا لازمی اقتضاء یہ ہے، کہ افراد کی جماعت کی حیاتِ نفسی

میں قوائے نخاعی، قوائے دماغی پر غالب آجائیں۔

(۳) سُریانِ تاثیر۔ جماعت کی حیاتِ شاعرہ کے قاطعات فہرست میں سب سے آخری، مگر سب سے جلی، عنوان اسکی اس خصوصیت کا ہے، کہ اُس میں ہر اثر غیر معمولی سرعت و قوت سے پھیل جاتا ہے۔

اسکے اثرات اس قدر واضح ہیں، کہ غالباً کسی تصریح کی بھی حاجت نہیں۔ شخصیت کا اقتضا یہ ہے، کہ ہر فرد اپنی اپنی ذات کے تناسب، فکر، احساس، و ارادہ سے کام لے، اور ہر مہیج سے اسی قدر متاثر ہو جتنا معمولی حالات کے درمیان اُسے انفراداً متاثر ہونا چاہیے۔ لیکن حالتِ اجتماع میں، شعورِ ذاتی کا یہ وصفِ امتیازی، مطلق نہیں قائم رہنے پاتا۔ حالتِ اجتماع میں ہر مہیج، اپنی عام و معمولی قوت سے سوگنی، ہزارگنی، لاکھ گنی، قوت حاصل کر لیتا ہے۔ جماعت کا ہر فرد جب نظر اُٹھاتا ہے، تو اُسے چاروں طرف ایسے ہی لوگ دکھائی دیتے ہیں، جو خود بھی اُسی طرح متاثر ہیں، اور اس سے اُس فرد کا تاثر بڑھا بڑھا جاتا ہے۔ گویا ایک عام و مشترک مہیج کے علاوہ، جماعت کا ہر فرد بجائے خود، باقی ماندہ افراد کے لیے مہیج کا کام دیتا ہے۔ اور اس طرح ہر فرد، مہیجِ اصلی کے علاوہ، صدہا ہزارہا، بلکہ بےشمار مہیجات سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ یہیں سے ڈاکٹر سیڈس نے اس کلیہ کی بنا ڈالی ہے، کہ جو جماعت جس قدر کثیر التعداد افراد پر مشتمل ہوتی ہے، اُسی تناسب سے اُسکے ہر فرد میں قوتِ تاثر بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اور یہ فوق الحد تاثر بداہتہً حیاتِ شاعرہ کے منافی ہے۔

کلیۂ مذکور کی توضیح مزید کے لیے ہم ایک مثال ڈاکٹر موصوف ہی کے صفحات سے نقل کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک جماعت ۱۰۰۰ افراد پر مشتمل ہے، جس پر ایک سحر بیان خطیب کوئی اثر ڈالنا چاہتا ہے۔ یہ بھی فرض کر لو کہ جو اثر اُس خطیب کو پیدا کرنا منظور ہے، اُسکی قوت کا درجہ ۵۰ ہے، اور حاضرین میں سے ہر فرد میں اُسکا صرف نصف ہی اثر پیدا ہو سکتا ہے۔ تو گویا خطیب، ہر فرد میں ۲۵ درجہ کا اثر پیدا کرتا ہے، اور ہر فرد خود اپنی جگہ ہر دوسرے فرد میں ½۱۲ درجہ کا اثر پیدا کرتا ہے۔ اس حساب سے خطیب کا پیدا کردہ اثر ہر فرد پر ۱۰۰۰ × ۲۵ یعنی ۲۵۰۰۰ درجہ کا ہوا، اور جو اثر ہر فرد نے دوسرے فرد پر پیدا کیا ہے، وہ ۱۰۰۰ × ½۱۲ یعنی ۱۲۵۰۰ درجہ کا ہوا۔ اب اگر جماعت کے مجموعی تاثر کا حساب کرنا چاہیں، تو افراد کی تعداد (یعنی ۱۰۰۰) سے اسے ضرب دیکر، اس میں اثر کا وہ درجہ جوڑ دیں، جو خود خطیب نے پیدا کیا ہے (یعنی ۲۵۰۰۰)۔ پس اس طرح

جماعت کے مجموعی تاثر کا شمار [۲۵۰۰۰ × (۱۰۰۰ × ۱۲۵۰۰)] یعنی ۰۰۰ ۵ ۲ ۵ ۱۲ ۳ درجہ تک پہنچ جاتا ہے !!

یہ لحاظ رکھنا چاہیے، کہ اس مثال میں افراد جماعت کی تعداد صرف ایک ہزار فرض کی گئی ہے۔ اس سے تم خود اندازہ کر سکتے ہو، کہ جو جماعت ہزاروں، لاکھوں، بلکہ کروروں افراد پر مشتمل ہوتی ہے، اسکے مدارج تاثر کا حساب لگانا کیا بڑے سے بڑے ریاضی داں کے لیے بھی دشوار نہیں؟

بیاناتِ بالا کا ماحصل ناظرین کے ذہن میں، شاید دفعاتِ ذیل کی صورت میں زیادہ محفوظ رہے: —

(۱) افراد کی سیرت، یا کیرکٹر، عبارت ہے اُنکے اُس کردار سے، جو خود شعوری شخصیت یا انفرادیت پر مبنی ہوتا ہے۔

(۲) انسانی زندگی میں ایسے موقع بکثرت پیش آتے ہیں، جب سیرت شاعرہ یا شخصیت لاشعوریت سے مغلوب ہو جاتی ہے۔

(۳) اسی مغلوبیتِ شعور فنا شخصیت کے باعث انسان سے اضطراراً ایسے اعمال سرزد ہونے لگتے ہیں، جو اسکی عام سیرت کے لحاظ سے نہایت حیرت انگیز، بلکہ بعض دفعہ اُس سے بالکل متناقض ہوتے ہیں۔ فرشتہ خود دفعۃً شرارتِ مجسم ہو جاتا ہے، دانشمند احمق بنجاتا ہے، اور پیکر متانت، عفریتِ غضب ظاہر ہونے لگتا ہے۔

(۴) اس تحت الشعور یا شعور خفی کی تکوین کا ایک نہایت اہم و نمایاں مظہر، نفوسِ انسانی کا حالتِ اجتماع میں ہونا ہے۔

اس اجتماع کے فلسفہ، یا زیادہ صحیح طور پر اسکے نفسیات کی تفصیل کرنا، صفحاتِ آیندہ کا فرض ہے۔

عبدالماجد

نظر کستی ہے اُنکی طُور کا جب نام آتا ہے
ذرا ہم بھی تو دیکھیں کون زیرِ بام آتا ہے

ترے کوچے میں ظالم ہم کو رہنا ہو گیا مشکل
زمیں کو بھی یہاں کی آسماں کا کام آتا ہے

اسیرانِ قفس پَر تولتے ہیں موسمِ گُل میں
نہیں معلوم کیا انکو خیالِ خام آتا ہے

بس اتنی بات ہے جسپر ہماری جان جاتی ہے
کہ اُنکے جاں نثاروں میں ہمارا نام آتا ہے

بہت صبحِ وطن کی یاد تڑپاتی ہے اے صفدر
نظر غربت میں جب ہم کو چراغِ شام آتا ہے

صفدر۔ مرزاپوری

سُکھی رہو

ایک مرتبہ چاندنی رات میں سری کرشن مہاراج بیٹھے ہوئے اپنے دل ہی دل میں باتیں کر رہے تھے۔

"میں خیال کرتا تھا کہ انسان کرۂ زمین پر نہایت ہی حسین مخلوق ہے، لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ یہ ایک کنول کے پھول کو جو ہوا کے جھونکوں سے ہل رہا ہے، میں دیکھ رہا ہوں وہ تمام جان دار ہستیوں سے کس قدر زیادہ خوبصورت ہے۔ اُسکی پنکھڑیاں ابھی چاند کی طرف کھُلی ہیں۔ وہ ایسا دلفریب ہے کہ میں اُس سے اپنی نگاہ نہیں ہٹا سکتا۔

ہاں، انسانوں میں انکے مشابہ کوئی چیز موجود نہیں۔ سری کرشن نے ایک آہ کے ساتھ ان الفاظ کی تکرار کی۔ لیکن ایک لمحے کے بعد وہ پھر سوچنے لگے۔

آخر کس لیے مجھ دیوتا کو، اپنے کلمہ کی قوت سے ایک ہستی نہ پیدا کرنا چاہیے جو انسانوں میں ایسی ہی ہو جیسا پھولوں میں کنول! اور جو انسانوں اور زمین کے لیے راحت اور خوشی ہو! کنول، ایک جان دار دوشیزہ کی شکل میں بدل جا اور میرے سامنے کھڑا ہو۔

پانی میں ایسی ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہوگئیں جیسی ابابیل کے پروں سے پیدا ہوتی ہیں، رات زیادہ روشن ہوگئی، چاند پوری روشنی سے آسمان پر چمکنے لگا، ننھی ننھی چڑیاں زور زور سے چہچہانے لگیں اور تھوڑی دیر کے بعد دفعتاً سب خاموش ہوگئیں۔ جادو پورا ہوگیا۔ سری کرشن مہاراج کے سامنے کنول انسانی شکل میں کھڑا تھا۔ یہ ایسی حسین شکل تھی کہ خود دیوتا کو بھی حیرت ہوئی اُس نے کہا:۔ تم پہلے تالاب کا پھول تھیں۔ اب میرے خیال کا پھول ہو، باتیں کرو! لڑکی نے ایسی آہستگی سے بولنا شروع کیا جیسے کنول کی پنکھڑیاں نسیم صبح کے جھونکوں سے بجتی ہیں۔

"سری مہاراج! آپ نے مجھ کو ایک جاندار ہستی میں تبدیل کیا ہے مجھے آپ کہاں رہنے کا حکم دیتے ہیں؟ یاد فرمائیے۔ مہاراج! جب میں پھول تھی تو ہوا کے تھپیڑوں سے ڈرا کرتی تھی اور اپنی پنکھڑیاں بند کر لیتی تھی، میں بارش اور جھکڑوں سے خوف کھاتی تھی، بجلی اور اُسکی کڑک سے مجھے دہشت ہوتی تھی۔

ہی سورج کی جلانے والی شعاعوں سے بھی ڈرا کرتی تھی آپ نے مجھے کنول سے انسان بنایا ہے اسلیے سابقہ فطرت قائم ہے اور اب میں زمین سے اور جو کچھ اُپر ہے اُس سے ڈرتی ہوں۔ تو مجھے کہاں رہنا چاہیے ؟"

سری کرشن نے ستاروں کی طرف نگاہ اُٹھائی ایک لمحہ تک کچھ سوچتے رہے۔ پھر پوچھا۔

"کیا تم پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہنا چاہتی ہو؟

سری مہاراج ! وہاں برف ہے ۔ اور سردی سے میں ڈرتی ہوں۔

اچھا .... مَیں تالاب کی تہ میں تمھارے لیے ایک بِلّور کا محل بنا دوں گا ۔

پانی کی گہرائیوں میں سانپ اور دوسرے عجیب الخلقت ڈراونے جانور پھرتے رہتے ہیں۔

سری مہاراج مجھے ڈر لگتا ہے ۔

تمھیں سُنسان بیابان پسند ہے ؟

سری مہاراج ، بیابانوں کو طوفانی ہواؤں کے جھکّڑ اور بجلی کے ڈراؤنے کڑکے وحشی جانوروں کی طرح پامال کرتے ہیں۔

تو تمھارے لیے کونسی جگہ تجویز کی جائے ؟ ہاں ایلورا کے غاروں میں سادھو رہتے ہیں ......

.... کیا دنیا میں سب سے الگ گفا میں رہنا چاہتی ہو ؟

وہاں اندھیرا ہے۔ سری مہاراج مجھے ڈر لگتا ہے ۔

سری کرشن ہاتھ سر پر رکھ کر ایک پتھر پر بیٹھ گئے اُنکے سامنے وہ دوشیزہ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

جب صبح کی شفق نے مشرق کی سمت آسمان کو روشن کرنا شروع کیا۔ تالاب کا پانی، تاڑ کے درخت اور بانس سنہری ہو گئے۔ گلابی بگلے، نیلے سارس اور سفید ہنس مل کر پانی پر، طاؤس اور مینائیں جنگل میں مل کر بولنے لگے اور اُنکے ساتھ ہی سیپ پر تنے ہوئے تاروں کی اور انسانی نغمہ کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ کرشن غور وخوض سے چونکے اور کہا۔

دیکھو والمیکی شاعر سورج کی ڈنڈوت کر رہا ہے۔

ذرا دیر کے بعد ارغوانی پردے سے جو چاندنی کے پھولوں کو ڈھانپے ہوئے تھے اُٹھ گئے اور تالاب سے قریب والمیکی نمودار ہوئے۔ شکلِ انسانی میں بدلے ہوئے کنول کے پھول کو دیکھ کر اُنھوں نے سارنگی بجانا بند کر دیا اور وہ سارنگی اُن کے ہاتھوں سے زمین پر پھسل پڑی، اُنکے ہاتھ کولوں پر گر پڑے اور وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ گویا سری کرشن نے اُنھیں درخت بنا دیا۔ دیوتا اپنی خاص مخلوق پر اس حیرت سے بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے۔

ہوشیار ہو، والمیکی اور زبان سے کچھ کہو۔ ! والمیکی بولے .... میں محبت کرتا ہوں...

صرف یہی لفظ اسے یاد رہا اور یہی وہ کہہ سکا۔ کرشن کا چہرہ یکایک چمکنے لگا۔

حیرت انگیز لڑکی! مجھے تیرے لیے مناسب جگہ دنیا میں مل گئی۔ شاعر کے دل میں جا کر رہ!

والمیکی نے پھر دوہرایا ...... میں محبت کرتا ہوں.....

قدرت والے کرشن کے ارادے نے لڑکی کو شاعر کے دل میں داخل کرنا شروع کیا۔ دیوتا نے والمیکی کے دل کو بھی بلور کی طرح شفاف بنا دیا تھا۔ وہ لڑکی اپنی مقررہ مقدس جگہ میں داخل ہو رہی تھی لیکن جیسے ہی اُسنے والمیکی کے دل کی گہرائی کو دیکھا تو اُسکا چہرہ زرد پڑ گیا اور دہشت چھا گئی۔ کرشن کو تعجب ہوا۔

شاعر کے دل میں بھی تم ڈرتی ہو؟

سری مہاراج، آپ نے مجھے کہاں رہنے کا حکم دیا ہے، مجھے اس ایک دل میں پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں، عجیب الخلقت جانوروں سے بھری ہوئی پانی کی گہرائیاں اور اندھیرا کی تاریک گپھائیں سب کچھ نظر آتی ہیں اس لیے سری مہاراج میں ڈرتی ہوں۔ دانشمند کرشن نے کہا۔

شکلِ انسانی میں تبدیل شدہ پھول اطمینان رکھو اگر والمیکی کے دل میں برف ہے تو تم موسم بہار کی گرم ہوا کے جھونکے بنکر اُسے پگھلا دیگا۔ اگر پانی کی گہرائی ہے تو تم اُس گہرائی میں موتی ہو جاؤ، اگر بیابان ہے تو تم اس میں آسودگی اور خوشی کے بیج بو دو، اگر اندھیرا کی تاریک گپھائیں ہیں تو تم ان تاریکیوں میں سورج کی شعاع ہو جاؤ۔

والمیکی شاعر نے جس نے پھر گویائی حاصل کر لی تھی اتنا اور اضافہ کیا اور سُکھی رہو۔

(ترجمہ)　　　محمد مہدی

صبح جسکی نہ ہوایسی تو کوئی شام نہیں

سہی گردِل بے عقل کو آرام نہیں — کہ ریاکار زمانہ سے مجھے کام نہیں
جس قدر کام ہیں اپنے وہ تصنّع آمیز — جذبۂ الفتِ صادق کا کہیں نام نہیں
کہتے سب کچھ ہیں مگر کرتے نہیں ایک بھی ہم — اُسپہ طُرّہ ہے کہ مستِ مئے گلفام نہیں
سیکڑوں کام مروّج ہیں خلافِ مذہب — مطلقاً جن کی کہیں روک نہیں تھام نہیں
مُصلحِ قوم ہی خودبین وغرض پرور ہیں — جنھیں پابندیِ اسلام میں آرام نہیں
ترکِ تعلیم و تعلّم سے ہے بنائے ادبار — اور یہ امر یقیں مَوردِ الزام نہیں
ابتدا ہی سے ہے تعلیم کی بنیاد خراب — کہ سمجھدار بھی تو واقفِ احکام نہیں
جنھیں معلوم ہے کچھ فلسفیِ صوم و صلوٰۃ — گویا فرض اُنپہ تو پابندیِ اسلام نہیں
سجدۂ نفل میں کیا لطف ملے گا اُن کو — ترکِ واجب ہی جنھیں موجبِ آلام نہیں
علم اک اسم ہے اور اُسکا مسمّٰی ہے عمل — جب مسمّٰی ہی نہ ہو اسم خوش انجام نہیں
نامسلمان مسلمان کہے جاتے ہیں — علما وہ ہیں جنھیں علم سے کچھ کام نہیں
ایک ہی دائرے میں جاہل و عالم جب ہیں — اس سے ظاہر ہے کہ یہ محرمِ اسلام نہیں
اپنے ناصح جو بنیں آپ تو کچھ کام چلے — آخری وقت ہے عہدِ ہوَسِ خام نہیں
ایک وہ ہیں کہ پڑے پھرتے ہیں دن بھر ملتے — ایک ہم ہیں کہ کسی سے ہمیں کچھ کام نہیں
ایک ہم ہیں کہ ہے راحت ہمیں تکلیفوں میں — ایک وہ ہیں کہ جنھیں عیش میں آرام نہیں
غیر کہتے ہیں موحد کے عوض میں مُشرک — شرم والوں کے لیے کیا یہی دشنام نہیں!

بھائیو! سمجھو! اور احباب کو سمجھاؤ بھی — میرے مضمون تو منت کشِ ایہام نہیں
خیر خواہانہ خیالات ہیں حبِ ادراک — دعوے فہم نہیں اور ہوس نام نہیں

ہمّت و تنکر و تحمل ہے کلیدِ اقبال — اُن سے کیا ہو جنھیں رونے کے سوا کام نہیں
جاگنے والے ہی سو بیٹھتے ہیں ہم بھی سوئے؟ — کہ بشر ہم بھی ہیں غیرت وہ انعام نہیں
ختم ہو گی یہ شبِ غم بھی پریشانی کیوں؟ — صبح جسکی نہ ہو ایسی تو کوئی شام نہیں
نیند سے خود ہی جگایا مجھے دق کر کر کے — اب جو مچلا ہوں تو کہتے ہیں کہ ہنگام نہیں

ہاں مسلمان جہاں بھر میں نظر آتے ہیں — ان سے مخصوص کوئی ملک نہیں نام نہیں
اور ہوتے بھی ہیں ہر روز مسلمان بہت — کششِ صدق سے تحریصِ مے و جام نہیں
ہر مسلماں کے سینے میں ہے وقعت اسکی — کون کہتا ہے کہیں عزتِ اسلام نہیں
ساری دنیا کا یہ مذہب ہے سب آئیں آئیں — نہ سہی لالہ رُخی جو صفتِ عام نہیں
عرب و شام ہی کا کس لیے یہ ہو رہتا — کیشِ تثلیث نہیں مذہبِ اصنام نہیں
تار برقی کا تعلق تو نہیں ہے لیکن — متفق دل سے ہیں دل حاجتِ ادغام نہیں
وہ مسلمان ہی کب ہیں انھیں دشمن سمجھو — جنھیں توحید کے احکام سے کچھ کام نہیں
دامنِ رحم میں لیتا ہے ہوا خواہوں کو — زجر و توبیخ و جفا شیوۂ اسلام نہیں
گندی نہروں سے کنارے ہیں مکدّر لیکن — وسطِ دریا میں تکدّر کا کہیں نام نہیں
یہ کہیں ہو کہ نو آموز بھٹک جاتے ہوں — غلطی اُنکی مگر مشترکِ عام نہیں
وقتِ ادبار تو اچھے بھی بُرے بنتے ہیں — کیا یہی ضابطۂ گردشِ ایام نہیں
ٹھوکریں کھائیں اُجالے میں تو ملزم ٹھہریں — اور اندھیرے میں جو گر جائیں تو الزام نہیں
مصری بنتی ہے نمک کانِ نمک میں سیفیؔ — اچھے معدے کو غذا موجبِ اسقام نہیں
مہ و خورشید سے کچھ نفع نہیں اندھوں کو — کہ بُرے ہم ہیں برا مذہبِ اسلام نہیں
پستی قوم ہے کیوں باعثِ وحشت احباب — کیا کسی کی یہ سحر خاتمۂ شام نہیں

سید حسین سیفی سیدری

ہاجرہ کی کامیابی

مولوی فرید الحق سیتاپور کے ایک پُرانے وکیل تھے، جو نہ صرف اپنی ہم پیشہ جماعت میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے بلکہ شہر کے عوام وخواص میں بھی آپ کی بہت عزت کی جاتی تھی کیونکہ مولوی صاحب ہر شخص سے، خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا کیوں نہ ہو، نہایت حُسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ آپ کا وطن خاص قصبۂ مخدوم پور ضلع لکھنؤ تھا لیکن اب سیتاپور کو آپ نے اپنا مستقل جائے قیام بنا لیا تھا۔ مولوی صاحب نے اولاد کے شوق میں یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں، جن میں دو بیویاں تو بغیر کوئی اولاد چھوڑے بے نشان اُٹھ گئیں البتہ تیسری بیوی سے ایک لڑکی ہاجرہ ہوئی، لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد یہ تیسری بیوی بھی دِق کے موذی مرض میں مبتلا ہوئیں اور آخر کو اسی کا شکار ہوگئیں۔ اب اگرچہ مولوی صاحب کا سن پچاس سے متجاوز تھا لیکن اولادِ نرینہ کی آرزو میں آپ نے چوتھی شادی اپنے خاندان کی ایک بیس سالہ بیوہ لڑکی سے کی، لیکن بدقسمتی سے اس مرتبہ بھی مایوسی ہوئی اور بجز ایک لڑکی فاخرہ کے کوئی دوسری اولاد نہ ہوئی۔ اگرچہ اس بیوی نے اپنے سن رسیدہ شوہر کا ساتھ آخر وقت تک دیا اور اس عرصہ میں اشتہاری و غیر اشتہاری کوئی دوا ایسی نہ تھی جو بیچارے مولوی صاحب نے استعمال نہ کی ہو، لیکن افسوس کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ بھلا سوکھی ہوئی کھیتیاں کہیں سینچنے سے سرسبز ہو سکتی ہیں۔

(۱)

ہاجرہ کی عمر اس وقت ۱۴ سال ہے۔ اس نے اگرچہ پُرانے طرز کے بموجب گھر ہی پر اُستانی سے تعلیم پائی لیکن اپنی ذہانت اور اُستانی کی قابلیت سے اس نے بہت کچھ حاصل کر لیا تھا؛ یہی نہیں کہ اس نے معمولی طور سے کلام مجید اور اُردو کی چند مذہبی کتابیں پڑھ لیں بلکہ اُس نے فارسی کی بھی کئی کتابیں پڑھیں اور پھر تو اسے کتب بینی کا اس قدر شوق ہُوا کہ اُردو کے مشہور مصنفین کی شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہو جو اسکے مطالعہ سے نہ گزری ہو۔ ہاجرہ کی خوش قسمتی سے اس کا چچازاد بھائی نعیم بھی سیتاپور گورنمنٹ ہائی اسکول میں اپنے چچا مولوی فرید الحق کے زیر نگرانی تعلیم پاتا تھا۔ نعیم ہی کی ترغیب سے ہاجرہ کو مطالعہ کتب کا شوق ہوا۔ حُسنِ اتفاق

سے اُسکی سوتیلی ماں سیدہ بھی اس مذاق سے بالکل بے بہرہ نہ تھی۔ بلکہ اکثر ہاجرہ سے ناول یا اور کوئی کتاب لیکر فرصت کے اوقات میں پڑھا کرتی تھی۔

مولوی فرید الحق پُرانی وضع کے سختی سے پابند تھے۔ ہاجرہ کا یہ شوق اُنھیں دل سے ناپسند تھا لیکن اس خیال سے کہ نئی روشنی کی نوجوان بیوی کے جذبات کو ٹھیس نہ لگ جائے، مجبوراً خاموش رہتے تھے۔ ہاجرہ نے اس خداداد موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ سوتیلی ماں سے وہ اس قدر شیر و شکر ہو گئی کہ آخر انھیں بھی اس سے اس قدر محبت ہو گئی کہ وہ اسکی ہر بات خوشی سے منظور کرتیں۔ اب ہاجرہ نے ماں کے نام سے مختلف اُردو رسالے اور کتابیں منگانا شروع کیں اور "سیدہ" کے نام سے اُس نے تہذیب النسواں اور دوسرے رسالوں میں مختلف مضامین بھی چھپوائے۔ غرضکہ اس پردہ میں اُس نے اپنے علمی ذوق و شوق کو خوب ترقی دی۔ کتب بینی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسکے خیالات میں آزادی پیدا ہوئی اور اُس نے محسوس کیا کہ اُسکی زندگی ایک ایسے دائمی قیدی کی زندگی ہے، جسے رسم پردہ کے دیوتا نے بلا وجہ ایک ایسے قیدخانہ میں جھونک دیا ہے، جہاں قیدی کے لیے بجز بچہ کشی، شوہر نوازی، غیبت پرستی اور کاہلی کے کوئی دوسرے اہم فرائض نہیں اور اگر اسکے بعد بھی فرصت ملے تو ڈلی کاٹا کرے یا کم از کم لیٹے لیٹے پلنگ کے بان توڑا کرے۔

ایک روز ہاجرہ اپنے کمرے میں لیٹی مخزن پڑھ رہی تھی کہ اُسی وقت سیدہ بھی آکر وہیں بیٹھ گئی اور ہاجرہ سے بولی۔

سیدہ - ہاجرہ۔ کوئی اچھا ناول ہو تو دینا۔ جی گھبرا رہا ہے۔ سوچتی ہوں کوئی اچھی کتاب دیکھوں تو شاید دل بہل جائے۔ یہ تمھارے ہاتھ میں کون کتاب ہے کیا اس ہفتے کا تہذیب آگیا؟"

ہاجرہ۔ میرے پاس تو مولانا شرر کے چند ناول ہیں اگر آپ نے نہ دیکھے ہوں تو ان میں سے جو پسند کیجیے دیکھیے۔ یا یہ مخزن دیکھیے اس میں آج نعیم بھائی کا ایک دلچسپ مضمون آزادیِ نسواں پر چھپا ہے اسکو پڑھیے"۔

سیدہ - کیا لکھا ہے؟

ہاجرہ - مثلاً یہی کہ عورتوں کو جدید تعلیم دی جائے اور پردے کی اصلاح کی جائے۔

سیّدہ - تو مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو میم صاحب بنایا جائے، نعیم کے انھیں خیالات سے تو تمھارے ابا جان ناراض رہتے ہیں -

ہاجرہ - ابا جان پر کیا موقوف ہے، جتنے پُرانے زمانے کے لوگ ہیں سب ہی پُرانی لکیر کے فقیر ہیں - اب چاہے اس ضد سے کیسا ہی ملک و قوم کو نقصان کیوں نہ پہنچے - یہ بھی کچھ ضرور نہیں کہ میم ہی بنایا جائے تب ان باتوں کی اصلاح ہو اور عورتیں تعلیم پا سکیں -

سیّدہ - جب پردہ ہی نہ رہا تو پھر میموں میں اور ہم میں فرق ہی کیا رہا - ایسی تعلیم کو دور ہی سے سلام ہے -

ہاجرہ - تو یہ تو کوئی نہیں کہتا کہ ہم پردہ بالکل اُٹھا دیں، ہاں اس میں اصلاح تو ضرور ہونا چاہیے اب بھلا آپ ہی بتائیے کہ اس میں کیا ہرج تھا جو ابا جان میرے زنانہ مدرسہ میں داخل کرانے پر راضی نہیں ہوے کہ اُس میں چونکہ اکثر بے پردگی ہو جانے کا خوف ہے اور یہ اُنکی رسوائی کا باعث ہوگا لہذا میرا مدرسہ میں پڑھنا مناسب نہیں - حالانکہ وہی سید احمد صاحب وکیل نے اپنی لڑکی سرور کو داخل کرا دیا پھر آخر اُنکی کونسی رسوائی اور بدنامی ہوئی اور کس نے اُنھیں سوسائٹی سے اُٹھا دیا ؟

سیّدہ - وکیل صاحب کی بھلی کہی - وہ تو علیگڈھ کے پڑھے ہوے ہیں - وہاں کے لوگوں کو پردہ کا اتنا خیال کب ہے - بلکہ تمھیں اُس روز کہتی تھیں کہ علیگڈھ کے اکثر بیرسٹروں اور وکیلوں کی بیویاں شام کو بے پردہ گاڑی پر سیر کرنے نکلتی ہیں -

ہاجرہ - ہاں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے - سڑکوں پر تو بے پردہ نہیں پھرتیں یا جلسوں میں مَردوں کی بغلوں میں تو نہیں بیٹھنے جاتیں - یہ پردہ بھی کس کام کا کہ عورتیں ہر وقت چار دیواری کے اندر بند رہیں کمبختوں کو کسی وقت کی ٹھنڈی ہوا بھی نصیب نہ ہو -

سیدہ - مگر ہمیشہ سے تو یہی رواج ہے - پھر آخر ہم میں شرافت کب رہی جب ہم بھی کمینی عورتوں کی طرح مُنہ کھولے باہر نکلنے لگے ؟

ہاجرہ - ہمیشہ سے تو مسلمانوں میں ایسا پردہ نہیں تھا - عرب میں کس روز عورتیں مکانوں میں بند

سی گئیں؟ یہ کہیے کہ ہندوستان میں آکر مسلمانوں نے یہ پردہ ایجاد کیا اور انصاف یہ ہے کہ انھیں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں نے بھی انکی نقل کی۔ جیسے بہت سی فضول رسوم مسلمانوں نے ہندوؤں کی اختیار کیں

سیّدہ۔ تو اس سے نقصان ہی کیا ہوا بلکہ ہر طرح فائدہ ہی ہُوا۔ یہ پردہ ہی ہے کہ جسکی وجہ سے یہاں کی عورتوں میں میموں کی طرح بدچلنی نہیں پھیلتی۔

ہاجرہ۔ نقصان تو اتنے ہیں کہ جن کی کوئی حد نہیں۔ ابھی اسی مضمون میں نعیم بھائی نے لکھا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں صرف ڈھاکہ میں دو ہزار لڑکیاں وضع حمل کی حالت میں مرگئیں، اور دو لاکھ جو ان کنواری لڑکیوں میں بیس ہزار بھی ایسی نہ تھیں جن کو توانا و تندرست کہا جا سکے، اور ان میں اسی فیصدی پردہ نشین تھیں۔ اب بتائیے کہ اگر زندگی نہ رہی تو پردہ لیکر کوئی چاٹے گا۔ میرے نزدیک کمینوں کی عورتیں ہم سے ہزار درجہ بہتر ہیں کہ وہ خوش و خرم زندگی تو بسر کرتی ہیں۔ اُن میں یہ روگ تو نہیں کہ آج سر میں درد ہے، کل ٹانگوں میں ٹیس ہے، کسی کو ضعفِ معدہ کی شکایت ہے کوئی کھانسی اور بخار میں مبتلا رہتا ہے، اور کسی کو آٹھویں دسویں غش آنے کی بیماری ہے۔ غرض ہزاروں طرح کے وہ نئے امراض، جن کا کبھی نام بھی نہیں سُنا تھا، آج اُنھیں بھگتنا پڑتا ہے۔

سیّدہ۔ تو کہو ہمارے بزرگ سڑی دیوانے تھے جو اُنھوں نے پردہ قائم کیا۔ آخر اُس زمانے میں بھی تو پردہ تھا پھر کیا اُسوقت بھی یہ بیماریاں تھیں؟ یہ بیماریاں کچھ پردے کی وجہ سے نہیں ہیں یہ ہم سب کے اعمال کا نتیجہ ہے۔

ہاجرہ۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سڑی دیوانے تھے لیکن پھر انسان تھے کچھ فرشتہ نہ تھے۔ بیشک اُس زمانے میں بھی پردہ تھا لیکن وہ ابتدائی حالت تھی۔ اب جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے، پردے کا اثر ظاہر ہوتا جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ اُس زمانہ میں مسلمانوں میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوے مگر آج کوئی بھی ویسا پیدا نہیں ہوتا بلکہ روز بروز زوال ہورہا ہے۔ اگر واقعی یہ بداعمالیوں کا نتیجہ ہے تو یورپ والوں سے تو ہمارے اعمال ہزار درجہ اچھے ہیں۔ پھر وہ کیوں ان بیماریوں سے محفوظ ہیں؟۔

سیّدہ۔ تو کہو ہم اپنا مذہب چھوڑدیں؟ یہ مطلب ہے؟

ہاجرہ - آپا - آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں - مذہب چھوڑ دینے کی تو کوئی بات ہی نہیں - یہ تو صرف زبانی بحث ہے کہ پردے سے واقعی فائدہ پہنچتا ہے یا نقصان؟ مذہب کا لحاظ تو اُسوقت کرنا ضروری ہو جب ہم واقعی اصلاح پر طیّار ہو جائیں -

سیدہ - ہاں تو پردے سے ہمارے ملک اور ہماری قوم کو اور کیا نقصانات پہنچتے ہیں -

ہاجرہ - دیکھیے یہ ایک موٹی سی بات ہے کہ آج دنیا کی جس قدر بڑی قومیں ہیں مثلاً یورپ امریکہ اور جاپان وغیرہ، کہیں بھی پردے کا رواج نہیں ہے، اور نہ چینیوں کی طرح عورتیں لنگڑی کرائی جاتی ہیں - اب ہندوستان کو لیجیے - یہاں مسلمانوں میں پردے کا رواج سختی سے ہے - یہی وجہ ہے کہ مسلمان ہر صوبے میں، حتیٰ کہ جہاں اُنکی آبادی زیادہ بھی ہے، ہندوؤں سے ہر حیثیت سے پیچھے ہیں، اور خود ہندوؤں میں بنگال اور مدراس کے ہندو، جن کے یہاں پردے کا رواج بہت کم ہے، اپنے دوسرے ہمقوموں سے بدرجہا بڑھے ہوے ہیں، بمبئی کے پارسیوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ نہیں، لیکن آج جیسے خوشحال وہ ہیں ہندوستان کی کوئی قوم نہیں ہے - یہ سچ ہے کہ اُنکی اخلاقی حالت اچھی نہیں، لیکن اس سے اُنکی قومی ترقی پر کیا بُرا اثر پڑتا ہے، یورپ میں ہزاروں برس سے بے پردگی ہو لیکن وہ روز بروز ترقی کر رہا ہے -

سیدہ - اسی سے تو اُنکے یہاں بدچلنی اور آوارگی بھی زیادہ ہے - ایسی تہذیب سے تو ہم باز آئے، اللہ ایسی تہذیب سے بچائے - جہاں میاں جائیں بی بی بھی دُم کی طرح ساتھ ہیں - یہ موئی کوئی تہذیب میں تہذیب ہے -

ہاجرہ - خیر یہ اپنی اپنی معاشرت ہے، اُنھیں یہی تہذیب پسند ہے، وہ آپ کی تہذیب پر اسی طرح حقارت سے ہنستے ہیں - اب اس کا فیصلہ خود زمانہ کر دے گا کہ کون تہذیب ترقی کرتی ہے اور کسے زوال ہوتا ہے -

سیّدہ - تو کہو جب تک بیبیاں گلی کوچوں میں ماری ماری نہ پھریں گی قوم ترقی نہیں کرے گی؟ - ہاں خوب یاد آیا یہ جو سُنتے ہیں کہ مسلمانوں نے کسی زمانے میں بڑی ترقی کی تھی تو کیا اُنکی بیویاں بے پردہ رہتی تھیں؟

ہاجرہ - اسکی وجہ سُنیے - اول تو وہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا، مسلمان نئے مذہب کے جوش میں

بھرے ہوئے تھے۔ ملکوں کو فتح کرتے چلے گئے۔ جیسا کہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ ایک پُر جوش آدمی دس برابر والوں پر حاوی ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ اُس زمانہ میں مسلمانوں میں اس قدر سختی سے پردے کا دستور بھی نہ تھا، بلکہ مسلمان تو جس جگہ گئے وہیں کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ یہ تو جیسے جیسے پردہ زور پکڑتا گیا ویسے ہی مسلمان کمزور ہوتے گئے، یہاں تک کہ آج یہ حالت ہے کہ جس ملک کو دیکھیے مسلمانوں کو وہاں تباہ و برباد ہی پائیے گا۔

ہاجرہ کی اس آزادانہ تقریر سے سیّدہ کے ماتھے پر شکن پڑ گئی، اور سخت ناگواری کے لہجے میں بولی۔

سیدہ۔ اچھا بیٹا میرے سامنے ایسی باتیں نہ کہو۔ تم اپنے زمانے میں جو چاہے سو کرنا۔ خدا نہ کرے کہ شریف زادیاں میموں کی طرح آوارہ پھرنے کو زندہ رہیں۔

یہ کہکر سیّدہ ناراضی کے ساتھ اپنی جگہ سے اُٹھی کہ چلی جائے لیکن ہاجرہ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"میری آپا۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ ایک بات اور سُن لیں پھر آپ جتنا چاہیں مجھ پر غصّہ کر لیں۔"

سیّدہ بیٹھ گئی۔

ہاجرہ۔ دیکھیے آپا۔ بُرا نہ مانیے گا۔ اگر آج پردہ نہ ہوتا تو کیا آپ ابّا جان کے سے بوڑھے آدمی کے ساتھ شادی کرتیں؟ اُن سے بہتر ہزاروں ملتے۔ ماشاء اللہ آپ صورت شکل میں سو بچاس میں اچھی ہیں، اور سچ پوچھیے تو آپ کا سِن بھی اُسوقت کچھ نہ تھا۔

ہاجرہ کے اس باموقع فقرے نے سیّدہ کے غصے کو بالکل دھیما کر دیا، اُسے اپنی واقعی غمناک حالت کا احساس ہوا۔ اور دل ہی دل میں ایک آہ سرد کھینچ کر تھوڑی دیر وہ خاموش رہی، حقیقت میں ہاجرہ کے اس بااثر جملے نے اُسے قائل کر دیا، اب معقولیت کے لہجے میں اُسے تسلیم کرنا پڑا کہ

سیّدہ۔ یہ تو سب صحیح ہے لیکن ہمارے مذہب کی تعلیم تو یہ ہے کہ بے حیائی اور بے پردگی سے بچو۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے اگر پردہ نہ رہا۔

ہاجرہ۔ نہیں تو ابکی کوئی سمجھدار رائے نہ دے گا کہ ہم آزادی سے میموں کی طرح گھومیں لیکن اسمیں کونسا ہرج ہے اگر ہم اپنے باپ، چچا، بھائی یا کسی دوسرے عزیز کے ساتھ بے پردہ سیر و تفریح یا کم ازکم سفر کی حالت میں جا سکیں۔ اور اس میں تو ذرا بھی نقصان نہ تھا اگر ابّا جان مجھے لڑکیوں کے مدرسے میں

پڑھنے کی اجازت دے دیتے۔

سیّدہ۔ میں نے تو اُن سے کہا تھا مگر اُنکو سخت ناگوار ہُوا۔ ہاں سنو۔ پہلی مئی سے تمھارے ابّاجان کا ارادہ ہے کہ دو تین مہینے لکھنؤ میں رہ کر وہاں کے حکیموں سے اپنے گٹھیا کے درد کا علاج کرائیں۔

ہاجرہ۔ یہ تو بہت اچھا ہے۔ یہاں مَردوں میں کوئی تیمار دار بھی نہیں ہے۔ وہاں یہ بھی فائدہ ہو کہ نعیم بھائی ہر وقت موجود ہوں گے۔ اُسوقت تک اُنکا کالج بھی بند ہو جائیگا " ہاجرہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ سیّدہ یہ کہکر اُٹھ بیٹھی " فاخرہ کو دوا پلانا ہے رات سے اُسے بھی حرارت ہے " اور چلی گئی۔

(۲)

سائرہ، منشی منظور الحق کی لڑکی تھی، جو مولوی فرید الحق کے چچازاد بھائی ہوتے تھے۔ اور سیتاپور ہی میں ملازم تھے، انکا مکان مولوی صاحب کے مکان سے بالکل ملحق تھا، حتیٰ کہ ایک گھر سے دوسرے گھر میں جانے کو کھڑکی لگی ہوئی تھی۔ اپنی تمام ہمجولیوں میں ہاجرہ کو سائرہ سے بہت زیادہ محبت تھی اور ویسی ہی سائرہ کو ہاجرہ سے الفت تھی۔ ایک روز ہاجرہ تہذیب النسواں پڑھ رہی تھی کہ سائرہ ہنستی ہوئی آئی اور جلدی سے اخبار چھین کر سامنے تخت پر پھینکدیا۔ سائرہ کی اس حرکت پر اُسے بہت غصہ معلوم ہُوا لیکن اُسکا ناخوشگوار اثر اُسکے چہرے تک محدود رہا زبان سے اُس نے صرف اسی قدر کہا

ہاجرہ۔ سائرہ، میں کہتی ہوں کہ آخر تمہیں کب تمیز آئے گی؟ اب تمھارا سن ماشاءاللہ ایسا نہیں ہے کہ یہ شرارتیں تمھیں زیب دیں۔ یہ بھی بھلا کوئی مذاق میں مذاق ہے کہ پڑھتے سے اخبار چھین کر پھینکدیا۔ ہنسی مذاق جا سے ہو تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔

سائرہ۔ توبہ بہن، تو اتنی ناک بھویں چڑھانے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے تو ہنسی میں اخبار تمھارے ہاتھ سے لیلیا۔ (اخبار اُٹھا کر) لو اپنا اخبار لو۔ کچھ میں اسے نگل نہ جاتی۔ پھر تم اسے دیکھ سکتی تھیں۔

ہاجرہ۔ یہ اُلٹا غصّہ بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ذرا تم ہی سوچو کہ اگر تم کوئی کام بڑے اشتیاق اور دلچسپی سے کر رہی ہو اور میں بیچ میں پھاند پڑوں تو کیا تمھیں ناگوار نہ ہوگا؟ اُس وقت تم آئی تھیں تو میں خود ہی اخبار رکھ دیتی۔ چھین کر پھینکنے کی کیا ضرورت تھی؟

سائرہ۔ تو ان موے کاغذکے پرزوں میں کونسی دولت جڑی تھی، جسے تم بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں؟

ہاجرہ۔ ہاں میرے لیے تو ان میں دولت تھی، اگرچہ تمھاری نگاہ میں وہ کاغذکے پرزے تھے۔

سائرہ (طنزیہ لہجے میں) اچھا تو شاید کوئی چک یا نوٹ ہے۔ توبہ۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا۔ اچھا اب اسے صندوقچے میں رکھ لو۔

ہاجرہ۔ اب تم اسے چک سمجھو یا نوٹ، لیکن میرے لیے تو اسوقت اسکی قدر نوٹ اور چک سے بھی زیادہ ہے، بلکہ میرے نزدیک تو انسان کے لیے ہر وہ چیز، خواہ وہ کیسی حقیر اور بے قیمت کیوں نہ دولت ہی ہو، جس سے اُسے کوئی روحانی مسرت پہنچے۔ اب چاہے یہ سونے چاندی کے سرخ و سفید سکے ہوں یا کسی کتاب کے چند ورق، بشرطیکہ اُسکے پڑھنے سے کچھ حظ حاصل ہو۔ اگر غور کرکے دیکھو تو دولت کا مقصد بھی بالواسطہ یہی ہے کہ اُس سے انسان کو مسرت اور لطف زندگی حاصل ہو۔ پھر بتاؤ کہ دولت میں اور عیش و عشرت کی دوسری چیزوں میں فرق ہی کیا ہے۔ اب یہ اپنی اپنی پسند ہے کوئی بستر پر پڑے پڑے عیش کی کروٹیں لینے میں لطف حاصل کرتا ہے، کسی کا دن بھر کام کاج ہی میں دل لگتا ہے۔ یا بہن بُرا نا تو تو میں کہوں کہ تمھیں زیور پہننے کا بہت شوق ہے، لیکن مجھے زیور سے اتنا اُنس نہیں جتنا میں اپنی کتابوں کو عزیز رکھتی ہوں۔

سائرہ۔ اچھا بہن۔ تم اچھیں ہم بُرے۔ بس اب تو خوش ہو۔ رہا زیور تو اسکو میں کیا سب ہی لڑکیاں پسند کرتی ہیں، ایک نیا جہان سے نرالی طبیعت تمھاری ہے۔

ہاجرہ۔ نہیں میں یہ نہیں کہتی کہ میں تم سے اچھی ہوں، میرا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنی اپنی پسند ہے، تمھاری طبیعت کو زیور زیادہ بھاتا ہے، اور کسی کو سادگی زیادہ مرغوب ہو۔ غرض اسی طرح ہر ایک کی طبیعت مختلف ہے۔ اور یہ مت کہو کہ مجھے زیور پسند نہیں بلکہ مجھے بھی زیور سے ویسی ہی الفت ہے جیسی تمکو، فرق اتنا ہو کہ تمھیں یا اور بہت سی لڑکیوں کو چاندی سونے کا نمائشی زیور بہت اچھا معلوم ہوتا ہے، اور میں عورت کے باطنی زیور کو اُسکا حُسن اصلی سمجھتی ہوں۔ میرے نزدیک عورت ہزار حسین ہو اور زیورات سے بھی مرصع ہو، لیکن اگر وہ جاہل، بدسلیقہ، یا بیوقوف ہے تو اُس کا یہ تمام نمائشی حُسن بیکار ہے۔ وہ اُسی وقت تک اچھی

معلوم ہوگی، جب تک وہ خاموش، پتھر کی ایک خوبصورت مورت کی طرح بیٹھی رہے، کیونکہ ادھر اسکی زبان کھلی اور وہ تمام نمایشی حُسن مٹی میں مل گیا۔ اصلی چیز تو حُسنِ سیرت ہے نہ کہ حُسن صورت۔ اگر ہم اپنے ہی خاندان اور قصبے میں دیکھیں تو سیکڑوں مثالیں ایسی ملیں گی کہ بیوی بدصورت ہے لیکن میاں دل و جان سے اُن پر فدا ہیں یہ کیوں؟ محض اس لیے کہ بیوی کی سیرت میں کوئی ایسا حُسن ہے، جو شوہر کو دل سے پسند ہے۔

سائرہ (ہاجرہ کے گلے میں باہیں ڈال کر) اچھا پیاری بہن، مَیں قائل ہوگئی۔ اب جھگڑے کو جانے دو۔ اللہ قسم میرے سَر میں درد ہونے لگا۔ ہم تو تمھیں اچھی سی خوش خبری سُنانے آئے تھے، کہاں سے کمبخت اخبار کے جنجال میں پھنس گئے۔

ہاجرہ۔ وہ کیا خوشخبری ہے جلدی کہو۔

سائرہ۔ اگلی عید کے مہینے میں اکبر بھائی کی آمد ہے۔

ہاجرہ۔ کسی نے اُنھیں بُلایا ہے یا یوں ہی سیر و تفریح کے لیے؟

سائرہ۔ سیر و تفریح کرنے نہیں، بلکہ تمھاری محبت کھینچ لائے گی، اور پھر وہ تمھیں یہاں سے کھینچ لے جائیں گے، اب سمجھیں؟

ہاجرہ۔ تم یوں ہی بیٹھے بیٹھے جھوٹھ گڑھا کرتی ہو، یہ بھی اُسی دن کی ایسی بات تو نہیں ہے کہ خواہ مخواہ میرا دل دہلا گئیں، سچ مچ مَیں دن بھر پریشان رہی۔ وہ تو کہو آپا نے رات کو باتوں باتوں میں کہدیا کہ شب برات کے مہینے میں ابا جان کا ہرگز قصد نہیں۔

سائرہ۔ نہیں اُس دن تو ہنسی کی بات تھی، آج تو اللہ قسم جب باجی تمھارے یہاں سے رات کو واپس گئی تھیں تو کہتی تھیں کل تمھارے ماموں جان کا خط فرید چچا کے نام آیا ہے اُس میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہ اکبر بھائی کے کام سے جس قدر جلد ہوسکے فراغت کرنا چاہتے ہیں، اور عید کے مہینے میں شاید کوئی بڑی تعطیل بھی ہے۔ چلو اچھا ہے۔ اور ہاں لو یہ یاد ہی نہ رہا۔ بہن تمکو مبارک ہو اب مٹھائی کھلاؤ، اگلے سال تو اکبر بھائی انٹرنس پاس ہوگئے اور ماشاء اللہ گوالیار میں [illegible] روپے کے ملازم بھی ہوگئے۔

ہاجرہ۔ کچھ نسیم بھائی کا بھی حال معلوم ہوا؟ انھوں نے بھی تو اس سال ایف۔ اے کا امتحان دیا تھا۔

سائرہ۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ تمھیں اُنکی کیا فکر ہے، تمھارے میاں پاس ہوگئے، اللہ نے کئی سال کی محنت ٹھکانے لگائی۔

ہاجرہ۔ واہ وہ میرے بھائی ہیں، مجھے فکر ہی نہ ہو، اُمید تو ہے کہ وہ ضرور پاس ہو ہونگے اب تک تو خدا کے فضل سے نعیم بھائی برابر پاس ہوتے رہے۔

سائرہ۔ اچھا سچ بتاؤ۔ یہ خبر سُنکر تم بہت خوش ہوئیں یا کم؟

ہاجرہ۔ بہت اور کم کیا۔ نوکری سے تو مجھے ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی، میں نے تو ایک مرتبہ آپا سے بند بند کہدیا تھا کہ وہ اپنی طرف سے ابّا جان سے کہیں کہ وہ ماموں جان کو لکھنؤ لکھیں کہ کم از کم بی اے تو ضرور پاس کرنا چاہیے۔ پھر معلوم نہیں کیا ہُوا۔ اب اگر نوکری کی خبر صحیح ہے تو دو ہی باتیں ہیں، یا تو ابا جان نے ماموں جان کو کچھ لکھا نہیں اور یا یہ کہ اُنکے لکھنے کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ کیا اسکے متعلق بھی آپا نے چچی سے کوئی تذکرہ کیا تھا؟

سائرہ۔ ہاں یہ بھی کہتی تھیں کہ شاید اکبر بھائی کی صحت ایسی نہیں ہے کہ وہ آیندہ پڑھ سکیں۔ اور یہی تو یاد پڑتا ہے کہ تم نے بھی ایک مرتبہ کہا تھا۔

ہاجرہ۔ ہاں جب بڑے دن کی تعطیل میں نعیم بھائی لکھنؤ سے آئے تھے تو کہتے تھے کہ انھیں زیادہ کتابیں دیکھنے سے تکان معلوم ہوتا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ سچ ہے یا جھوٹ۔ اچھا تو پھر ابا جان کی کیا صلاح ہے، کچھ آپا کی باتوں سے پتہ چلتا تھا؟

سائرہ۔ سُنا ہے کہ تمھارے ابّا جان بھی کچھ کچھ راضی ہیں۔ بہتر تو ہے۔ اب ماشاءاللہ تمھارا بھی سولھواں سترھواں سال ہے، پھر کیا بڑھاپے میں شادی ہوگی۔ رہا آگے پڑھنا، سو وہ بھی اچھی نوکری کی غرض سے ہوتا ہے۔ سو روپے مہینے کی جگہ کچھ کم نہیں ہے اور قسمت اچھی ہو تو ایف اے۔ بی اے سب برابر ہیں۔ بڑی بات یہ کہ جان ہے تو جہان ہے، صحت سب سے مقدم ہے۔

ہاجرہ۔ صحت اچھی نہ ہونے کا تو سب بہانہ ہے۔ پڑھنے لکھنے کا اُنھیں شوق ہی کب تھا۔ پار سال ہی جب وہ بارہ فیل ہوئے ہیں تو پڑھنا چھوڑے دیتے تھے وہ تو کہو ماموں جان کی زور ازوری سے اس سال

بھی پڑھا۔ اور اسکول کی پڑھائی پر کیا موقوف ہے انہیں کبھی کسی قسم کا علمی مذاق نہ تھا۔ نعیم بھائی کہتے تھے کہ اُنکے کمرے میں سوا دو چار بیہودہ ناولوں کے اور کوئی سنجیدہ مذاق کی کتاب ہی نہیں۔ ہاں دلچسپی کا ہے سے ہے، بس پانچ بجے شام سے رات کے نو دس بجے تک امین آباد اور چوک کی سیر سے۔ قسمت ہے کیا ہوتا ہے قابلیت بھی تو ہونا چاہیے۔ ورنہ سو نہیں دو سو کی جگہ مل گئی تو کیا۔

سائرہ (مذاق میں) بہن اُن سے جہاں تک پڑھا گیا پڑھ چکے، اب جو کچھ کسر باقی رہ گئی ہو وہ تم پوری کر دینا، آخر تمنے جو قابلیت پیدا کی ہے کس دن کے لیے، اور چوک امین آباد کی سیر لکھنؤ میں کون نہیں کرتا، تم مل جاوگی تو یہ شوق بھی پورا ہو جائے گا۔

ہاجرہ۔ سائرہ۔ تم ان باتوں کو مذاق سمجھتی ہو اور میرے لیے یہ خون کے گھونٹ ہیں۔ کیا کروں زمین سخت ہے اور آسمان دُور۔ تم ہی بتاؤ جب طبیعتوں میں اختلاف ہو تو زندگی کا کیا لطف ہے؟

سائرہ۔ پھر کیا کیا جائے۔ اللہ قسم بہن وہ تو تمھارے اوپر دل و جان سے فدا ہیں اور تمھارا یہ حال ہے۔ پھر کیا تمھاری مرضی وہاں کرنے کی نہیں ہے؟

ہاجرہ۔ اُنکے فدا ہونے کی بھلی کہی، چوک کی کسبیوں پر بھی تو وہ فدا ہیں، پھر مجھ میں اور اُن میں فرق ہی کیا رہا۔ وہاں کرنے نہ کرنے کے متعلق تو میں اپنی زبان سے ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی آئندہ دیکھا جائے گا۔ ہاں اماجان کو خدا بہشت نصیب کرے یہ اچھا نہیں کیا کہ بچپنے ہی سے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈالدیں۔ نہ معلوم یہ ٹھیکرے کی منگنی کس قرآن و حدیث میں لکھی ہے۔ اسلام نے تو کہیں اسکی تعلیم نہیں دی۔ نہ اسمیں بجز نقصان کے کوئی فائدہ ہے۔ لاکھوں لڑکیوں کو ماں باپ کی اس جہالت کی بدولت کوفت ہوکر دق ہوگئی لیکن اسپر بھی والدین کی آنکھ نہیں کھلتی اور وہ اسی رستے پر اندھا دھند چلے جا رہے ہیں۔ ہندوستان سے خدا جانے یہ بیہودہ رسمیں کب اُٹھیں گی۔ کیا تماشا ہے کہ جن کو عمر بھر ایک ساتھ زندگی بسر کرنا ہے وہ تو کسی حساب میں نہیں، حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے کی صورت و سیرت سے بھی واقف نہیں ہوتے، ماں باپ زبردستی خود ہی نسبت کر دیتے ہیں، پھر وہ آیت و حدیث ہے، ہزار لڑکے لڑکی کی مرضی نہ ہو مگر کچھ شنوائی نہیں۔

سائرہ - بہن، ماں باپ پیدا کریں، پالیں پوسیں، اُن کا اولاد پر کچھ حق ہی نہیں؟ اور ماں باپ کو کچھ اولاد سے عداوت تو ہوتی نہیں کہ وہ لڑکی یا لڑکے کو بُری جگہ جھونک دیں، اپنے نزدیک وہ اچھی ہی جگہ دیکھکر کرتے ہیں آئندہ لڑکی لڑکے کی قسمت ہے۔ آخر ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔

ہاجرہ - ماں باپ تو فطرۃً اولاد کی پرورش پہ مجبور ہیں ورنہ فرائضِ نسل کا سلسلہ منقطع ہو جائے اور نظامِ عالم بالکل برباد ہو جائے۔ لیکن اُنکا حق تسلیم کرلینے سے بھی تو یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اولاد پر ہر طرح جا و بیجا جبر کرنے کے مجاز ہیں۔ یہ کون سی محبت ہے کہ اولاد کو زبردستی عمر بھر کے لیے کلفت میں ڈال دیں۔ مَیں یہ نہیں کہتی کہ وہ عداوت سے ایسا کرتے ہیں لیکن غلطی ضرور کرتے ہیں اور اسی کی اصلاح ہونا چاہیے۔ اور ہمیشہ کا تو تذکرہ ہی نہیں کرو۔ بہت سی باتیں پُرانے زمانے میں رائج تھیں مگر اب نہیں ہیں، یا بہت سی ایسی باتیں ہیں جو پہلے نہ تھیں مگر اب وہ ہماری زندگی کا ضروری جُزو ہو گئی ہیں، مثلاً پچاس برس پہلے شادی بیاہوں میں سیکڑوں رسومات ہوتی تھیں اور ہزارہا روپیہ برباد کیا جاتا تھا لیکن اب رفتہ رفتہ یہ باتیں اُٹھتی جاتی ہیں، یا ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ انگریزی پڑھنا کفر سمجھا جاتا تھا، لیکن اگر آج لڑکے انگریزی نہ پڑھیں تو مانگے بھیک بھی نہ ملے۔ بس اسی طرح ہر بات زمانے کے مناسبِ حال ہوتی ہے۔

سائرہ - تو اب بچپنے کی منگنی اس زمانے کے لیے موزوں نہیں ہے؟

ہاجرہ - نہیں یہ بیہودہ رسم تو کسی زمانے کے لیے بھی موزوں نہیں کہی جا سکتی۔ تمہیں بتاؤ کہ زندگی بھر کا نباہ تو لڑکی لڑکے کو کرنا ہے، ماں باپ کو دخل در معقولات کی کیا وجہ ہے؟ ماں باپ ہمیشہ بیٹھے بھی نہیں رہیں گے کہ ہر وقت بیچ میں پڑا کریں۔ پھر اگر طبیعتوں میں اختلاف ہُوا تو وہ مصیبت اور کُڑھن اُنھیں کو جھیلنا ہوگی یا انکے والدین کو۔ یہ رسم تو میرے خیال میں ہمارے بزرگوں نے کسی فائدے کی غرض سے نہیں اختیار کی بلکہ وہی ہندوؤں کی دیکھا دیکھی، جیسے اور فضول رسومات مسلمانوں میں رائج ہو گئیں ویسے ایک یہ بھی۔

ہاجرہ کی ان پُرزور دلیلوں سے سائرہ دل میں تو ضرور قائل ہو گئی لیکن بات بنانے کے طور پر وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ اتنے میں گھر کی ماما نے کھڑکی سے آواز دی "بٹیا چلو کھانا نکالو، تمہارے ابّا جان

انتظار کر رہے ہیں، کچہری کی دیر ہوئی جاتی ہے" سائرہ اُٹھ کر اپنے گھر چلی گئی اور ناجرہ نے فاخرہ کی قمیض اُٹھالی اور اُسکے سینے میں مشغول ہوگئی۔

(۳)

مولوی فریدالحق کے دردِ گٹھیا میں اِس قدر ترقی ہوئی کہ آخرکار اُنھیں لکھنؤ کا قصد کرنا پڑا۔ مولوی صاحب نے زنانی سواریوں کے خیال سے ساڑھے گیارہ بجے رات کی گاڑی کو ترجیح دی۔ زنانی سواریوں کے ساتھ مکان سے رخصت ہونے میں جیسی دیر ہوجایا کرتی ہے، یہی اتفاق مولوی صاحب کو بھی پیش آیا۔ گاڑی چھوٹنے میں صرف دس منٹ باقی تھے جب سواریاں اسٹیشن پہنچیں۔ جلدی سے ٹکٹ خریدے گئے اور بہزار دقت سواریاں زنانے درجے میں بھردی گئیں۔ لیکن ابھی اسٹیشن کے باضابطہ لٹیروں سے پیچھا چھڑانا تھا، بدبختی سے مولوی صاحب میں جہاں ہزار خوبیاں تھیں وہاں صرف اس قدر عیب بھی موجود تھا کہ "حساب جو جو اور بخشش سو سو" پر اس سختی سے عمل کرتے تھے کہ پھر خواہ چمڑی جائے لیکن یہ گوارا نہ تھا کہ دمڑی جائے۔ قلیوں کی لالچی قوم بھلا وکیل صاحب کی قانونی جرح اور دلیلوں سے کب قائل ہونے والی ہے، اگرچہ انکے دونوں اردلی کے ملازموں نے بھی اپنی سخت زبانی اور نمائشی تحکم و اقتدار سے انکی کافی تائید کی۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب ان بدمعاشوں کو چکاتے ہی رہ گئے اور اُدھر گاڑی نے سیٹی دی اور بہت جلد مع اُنکے پردہ نشیں ساتھیوں کے آنکھوں سے غائب ہوگئی۔ اب کیا ہوسکتا تھا۔ چند منٹ تک تو بچشم حسرت وہ گاڑی کی طرف دیکھتے رہے، پھر قریب ہی بنچ پڑی تھی بیٹھکر سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ کوئی دوسرا نا محرم مرد بھی عورتوں کے ساتھ نہ تھا۔ دونوں نوکر بھی، جن پر کچھ اطمینان ہوسکتا تھا کہ سواریوں کو کسی قدر مدد دے سکیں گے، مولوی صاحب کے ساتھ تھے۔ ٹکٹ بھی اُنھیں کے پاس تھے۔ بس اگر اس مایوسی اور پریشانی میں کوئی بات اطمینان کی ہوسکتی تھی تو وہ یہ امیدِ موہوم تھی "نعیم کو دو چار روز پیشتر خط لکھا تھا، شاید اسٹیشن آغا میر پہ ڈولیاں لیکر آگئے ہوں"۔ لکھنؤ کی دوسری گاڑی آٹھ بجے صبح کو جاتی تھی۔ بہرحال مولوی صاحب نے اسٹیشن ماسٹر لکھنؤ اور سندیلی کے نام تار تو دے ہی دیا کہ فلاں درجے کی زنانی سواریوں کے ٹکٹ میرے پاس ہیں۔

زنانی سواریوں میں ہاجرہ، سیدہ اور دو مامائیں تھیں، فاخرہ بچہ تھی۔ ان بیچاریوں کو یہ معلوم تھا کہ مولوی صاحب مع اپنے دونوں ملازموں کے قلیوں کے دامِ حرص و آز میں پھنس کر سیتاپور ہی میں رہ گئے۔ دو تین اسٹیشنوں تک تو سواریوں نے انتظار کیا کہ شاید کوئی خبر لے، مگر جب کوئی نہ آیا تو مجبوراً ایک ماما کو جب گاڑی رکی تو اسٹیشن پر بھیجا کہ پلیٹ فارم پر جا کر ملازمین کو آواز دے۔ کمبختی سے خادمائیں بھی وہ کہ جنھوں نے ریل پر سفر کرنا کیسا، کبھی ریل گاڑی کو دیکھا بھی نہ تھا۔ دو میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ گاڑی سے نیچے قدم اٹھائے، خیر بڑی مشکلوں سے ایک ہمت کرکے نیچے اتری اور جرأت کرکے دو چار قدم آگے گئی تھی کہ دور سے گارڈ کو آتے دیکھا، اب تو خوف و دہشت سے بدن کانپنے لگا۔ دس قدم بڑھی تھی تو بھاگ کر بیس قدم پیچھے چلی گئی۔ کبھی کسی انگریز سے سامنا ہوا نہ تھا، وہ تو صاحب لوگوں کو دور ہی سے دیکھ لینے کی عادی تھی۔ اور یہی نہیں بلکہ ہر کوٹ پتلون اور ہیٹ لگانے والے کو فرنگی رعب و جلال کا مجسم دیوتا سمجھتی تھی۔ گارڈ انجن کی طرف جا رہا تھا۔ یہ اسی طرف بھاگی بھی، اب جو صاحب کو اپنی طرف آتے دیکھا تو مارے ڈر کے اپنے درجے کا بھی ہوش نہ رہا، اور جلدی سے ایک درجہ کھلا تھا اس میں گھس گئی۔ دس منٹ تک تو ہوش و حواس بالکل ہی گم رہے، دل بانسوں اچھل رہا تھا۔ اتنی دیر میں گاڑی بھی چھوٹ گئی۔ اب درجے میں دیکھا تو بجز چند اجنبی غیر جنس صورتوں کے اور کوئی نہ تھا۔ اپنے درجے کی فکر ہوئی لیکن چلتی گاڑی سے کیونکر اترے، اول تو گر پڑنے کا خوف دوسرے بڑی بات یہ کہ فرنگی نما بھوت کے نگل جانے کا خوف۔ مجبوراً قہر درویش بجان درویش اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ ادھر ہاجرہ اور سیدہ پریشان ہوئیں۔ انکو یقین ہوگیا کہ وہ اسٹیشن ہی پر رہ گئی، اب دوسری ماما کو بھیج نہیں سکتیں کہ کہیں اسکا بھی وہی حشر نہ ہو۔ اور وہ ذات شریف خود بھی اتنی ہمت نہ رکھتی تھیں۔ فاخرہ پیاس سے بیتاب، لیکن پانی کون لائے، ماما صاحبہ درجے سے باہر بھی سر نہ نکال سکتی تھیں کہ کہیں کوئی فرنگی جھونٹے پکڑ کر نیچے نہ کھینچ لے فاخرہ شدتِ تشنگی سے مرغ بسمل ہو رہی تھی۔ آخر ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو ہاجرہ ماں کی اجازت سے برقع پہن کر نیچے اتری اور سقے سے پانی لے کر واپس آگئی۔ صبح ہوتے گاڑی ڈالی گنج کے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ اب نئی مشکلات کا باب کھلا۔ یہ سب کو معلوم تھا کہ لکھنؤ جانا ہے، لیکن یہ کوئی نہ جانتا تھا کہ

آغا میر کی ڈیوڑھی کے اسٹیشن پر اُترنا ہے۔ یہ بھی اطمینان ہو گیا تھا کہ نوجی صاحب سیتاپور ہی میں ہیں، گو مسافروں کو اُترتے دیکھا اور اُن سے ماما نعیبن نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ لکھنؤ آگیا۔ سیّدہ اور ہاجرہ اس اُمید پر کہ یہ لکھنو کا اسٹیشن ہے، نعیم موجود ہوگا، گاڑی پر سے اُتر پڑیں اور پلیٹ فارم پر نعیم کا انتظار کیا۔ ٹکٹ بھی پاس نہ تھے کہ پھاٹک تک جانے کی جرأت ہوتی۔ اب گاڑی چھوٹ گئی مگر نعیم کا پتہ نہیں۔ تھوڑی دیر میں ایک فرنگی فیشن ہندوستانی بابو کی نظراں برقعہ پوشوں پر پڑی۔ وہ قریب آیا تو اب اُس سے بات کون کرے۔ انگریزی فیشن دیکھ کر نعیبن کی گھگھی بندھ گئی۔ بابو صاحب بھی کوٹ پتلون کے طفیل میں نیم ولایتی بنے ہوئے تھے۔ ان لاچار اور مجبور پردہ نشینوں کو دیکھ کر اور شیر ہو گئے، لگے اپنی انگریزیت کی نمایش کرنے۔

ٹکٹ بابو۔ وِل تُم لوگ یہاں کیوں بیٹھا ہے؟ گاڑی چھوٹ گیا پلیٹ فارم سے ہٹ جانے۔

ٹکٹ بابو کے اُس سوال پر پہلے تو سب خاموش رہے لیکن جب اُس نے دوبارا یہی سوال کیا تو ہاجرہ نے کہا "ہم لوگوں کے ٹکٹ سیتاپور میں رہ گئے، آپ جو کرایہ بتائیں ہم ادا کردیں"۔ اب تو صاحب بہادر کو تحکم کا کافی موقع مِلا، ہتھیلی ہی کھُجلانے لگی۔ سیّدہ کے جسم کو حرکت ہوئی اور زیور کی کھڑک سے بابو صاحب کو یقین ہو گیا کہ یہ پردہ نشیں عورتیں ضرور کسی دولتمند گھرانے کی ہیں، اب یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح کوئی بھاری رقم وصول کرنا چاہیے۔ فوراً کرخت لہجے میں آپ بولے۔

ٹکٹ بابو۔ وِل، ہم نہیں جانتا کہ تمھارے ٹکٹ سیتاپور میں رہ گئے۔ تُم کو جرمانہ دینا ہوگا۔ چلو مسافر خانے میں ہم تمھارا تحکیکات کرے گا۔

یہ کہکر ایک قُلی کو پکارا کہ اسباب اُٹھائے۔ عورتوں کا دل ہی کتنا، سیّدہ مارے خوف کے کانپنے لگی، اُسے دو قدم چلنا بھی دُوبھر تھا۔ ہاجرہ سے آہستہ سے کہا کہ صاحب کو ایک اشرفی دیدی جائے شاید یہ مہربان ہو جائیں۔ مگر ہاجرہ نے اطمینان دلایا کہ نہیں ابھی اس میں جلدی نہ کرنا چاہیے، مسافرخانے میں پہنچکر دیکھا جائے گا۔ غرض اُفتاں و خیزاں ٹکٹ بابو کے پیچھے پیچھے چلیں، وہاں مسافرخانہ کہاں اسٹیشن کے پھاٹک پر لاکر بٹھا دی گئیں اور ٹکٹ بابو صاحب اسٹیشن ماسٹر کے درجے میں چلے گئے کہ اُنھیں بھی راضی کرکے اس قیمتی شکار سے پورا نفع اُٹھائیں۔

نعیم آغا میر کی ڈیوڑھی کے اسٹیشن پر معہ ڈولیوں کے گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی گاڑی رکی اُس نے تمام درجوں کو تلاش کیا لیکن کسی کا پتہ نہ تھا، دفعتًا اُس کی نظر انجن کے قریب ایک درجے پر پڑی تو دیکھا کہ جُمیا ایک کونے میں سکڑی بیٹھی ہوئی ہے۔ جُمیا نے نعیم کو دیکھا تو کچھ حواس درست ہوے اور جان میں جان آئی۔

نعیم۔ ارے تو روتی کیوں ہے؟ اور سواریاں کہاں ہیں؟

جمیا (رو کر) نعیم بھیّا، سواریاں تو کسی اسٹیشن پر رہ گئیں میں نگوڑی اس ریل میں بیٹھی چلی آئی۔

نعیم۔ اچھا گاڑی سے جلدی اُتر۔ ٹکٹ تیرے پاس ہے؟

جُمیا نیچے اُتر کر پلیٹ فارم پر آئی تو معلوم ہوا کہ ٹکٹ بھی نہیں ہے اور مولوی صاحب بھی سیتاپور ہی میں رہ گئے۔ خیر نعیم نے اسٹیشن ماسٹر سے کہا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کا تار آگیا ہے ٹکٹ سب کے اُنھیں کے پاس ہیں۔ ادھر سے اطمینان ہوا تو اب دوسری سواریوں کی فکر ہوئی۔ جُمیا سے پوچھا کہ سواریاں اس گاڑی میں نہیں بیٹھی تھیں؟

جُمیا۔ نہیں۔ وہ تو اور گاڑی میں تھیں، میں اس گاڑی میں چلی آئی۔ میں تو مولوی صاحب کو ڈھونڈھنے گئی تھی وہاں اس گاڑی میں بیٹھ گئی۔

نعیم (کچھ سوچ کر) کیا سواریاں سیتاپور میں گاڑی پر سوار نہیں ہوئی تھیں؟

جمیا۔ نہیں وہاں تو سوار ہوئی تھیں۔ پھر وہ تو اُسی گاڑی پر بیٹھی رہیں میں اِس پر چلی آئی۔

نعیم۔ تو وہ اپنی گاڑی سے نہیں اُتریں؟

جمیا۔ نہیں بھیّا وہ اُسی پر بیٹھی رہیں۔" یہ کہ کر جُمیا رونے لگی۔ خیر نعیم نے اُسے تسکین دیکر ڈولی میں بٹھایا اور کہاروں سے کہا کہ اسے مکان لیچلو۔ خود مسافروں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دو پردہ نشیں عورتیں ڈالی گنج اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اُتر کر بیٹھ گئیں۔ مزید تفتیش سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی مرد بھی اُنکے ہمراہ نہ تھا۔ فورًا اسٹیشن کے باہر آیا اور گاڑی لیکر ڈالی گنج روانہ ہوگیا۔ نعیم جیسے ہی اسٹیشن کے پھاٹک پر پہنچا تو دیکھا تینوں پردہ نشیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور اسٹیشن ماسٹر

اور تار بابو کھڑے کچھ دریافت کر رہے ہیں۔

نعیم کو دیکھتے ہی ہاجرہ کی زبان سے بے اختیار نکل گیا "نعیم بھائی تو آگئے" سیدہ کو یہ مصیبت کبھی جھیلنا نہ پڑی تھی، وہ تو زار و قطار رو رہی تھی۔ ہاجرہ بھی پریشان تھی۔ نعیم نے اسٹیشن ماسٹر سے سارا قصہ بیان کیا، اُس نے بذریعہ تار اسٹیشن ماسٹر آغا میر سے اُسکے بیان کی تصدیق کرائی اور سواریاں خدا خدا کر کے مکان پہنچیں۔ اسباب میں دیکھا گیا تو فاخرہ کے زیور کا صندوقچہ غائب اور ہاجرہ کی کتابوں کا بکس نذارد۔ اُسی دن سہ پہر کو مولوی صاحب بھی لکھنؤ پہنچ گئے۔

(۴)

مولوی فرید الحق کو لکھنؤ آئے ہوئے بیس روز ہوگئے۔ ایک روز عشرت بیگم (اکبر کی ماں یعنی ڈپٹی مشتاق علی صاحب کی بیوی) مولوی صاحب کو دیکھنے آئیں تو ہاجرہ کی شادی کا بھی تذکرہ چھیڑا۔

عشرت بیگم۔ بھائی، پھر آپ نے اکبر کی شادی کے بارے میں کچھ جواب نہ دیا۔ میں چاہتی تھی کہ اگلی عید کے مہینے میں اس سے فراغت ہو جاتی تو اچھا تھا۔ پھر اُدھر بقرعید میں ہم سب لوگ بھوپال چلے جائیں گے اور وہ گوالیار چلا جائے گا۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہی اچھا ہوگا کہ پہلے اس کام سے فرصت کر لی جائے۔

مولوی صاحب۔ مجھے یہ سُن کر بہت خوشی ہوئی کہ مشتاق میاں کی خدمات دو سو کی ترقی کے ساتھ بھوپال منتقل کر دی گئیں۔ تمھیں مبارک ہو کہ اکبر بھی ماشاء اللہ سو روپئے کا ملازم ہوگیا۔ ہاں پرسوں جب وہ آیا تھا تو مجھے تمھارے خط کا بھی خیال آیا۔ اس عرصے میں میں اپنی صحت کی طرف سے ایسا پریشان رہا کہ جواب نہ دے سکا۔ اکبر کے بی۔ اے تک نہ پڑھ سکنے کا مجھے افسوس ہے۔

عشرت بیگم۔ بھائی خوشی تو ہم سب کی بھی یہی تھی کہ اب ماشاء اللہ وہ انٹرنس پاس ہوگیا ہے، ایف۔ اے۔ بی۔ اے بھی پڑھے اور پھر ولایت بھی پاس کرے مگر ڈاکٹروں نے منع کیا کہ اسکا دماغ اس قابل نہیں کہ زیادہ پڑھنے لکھنے کی محنت برداشت کر سکے۔ اور خان بہادر صاحب کی بھی یہی رائے ہوئی کہ اب پڑھنا چھڑا دیا جائے بلکہ اُنھیں کی سفارش سے وہ گوالیار میں نوکر بھی ہوگیا۔

مولوی صاحب۔ خان بہادر صاحب کون ؟

عشرت بیگم۔ وہی خان بہادر محمد حسین صاحب، جو گوالیار میں ناظم ہیں اور پہلے یہاں صدر اعلیٰ تھے

مولوی صاحب۔ ہاں وہ۔ میں سمجھ گیا۔ اچھا میں گھر میں اسکے متعلق مشورہ کرلوں تو پھر تمھیں جواب دوں۔

عشرت بیگم۔ تو اب کس دن تک میں آپ کے جواب کا انتظار کروں۔ میں کہتی تھی کہ جلدی آپ کی مرضی معلوم ہو جاتی تو میں شادی کا بندوبست شروع کر دیتی۔

مولوی صاحب۔ بس میں آج کل میں مشورہ کرکے پرسوں نرسوں تک تمھارے پاس خط بھیج کر اطلاع دونگا۔

تھوڑی دیر کے بعد عشرت بیگم وہاں سے اُٹھ کر اندر آئیں اور رخصت ہوکر اپنے گھر چلی گئیں۔

شب کو جب سیدہ مولوی صاحب کے یہاں گئیں تو ہاجرہ کے عقد کا ذکر چھڑا۔

مولوی صاحب۔ آج عشرت ہاجرہ کی شادی کا تقاضا کرتی تھیں، اُنکو اصرار ہے کہ آیندہ عید کے مہینے میں اس کام سے فراغت کر دی جائے۔ کیونکہ اسکے بعد اُن لوگوں کا بھوپال چلے جانے کا ارادہ ہے۔ مشتاق میاں کا اب وہیں تبادلہ ہو گیا ہے۔

سیدہ۔ ہاں پہلے اُنھوں نے مجھی سے اس قصّے کو چھیڑا تھا مگر میں نے اُن سے کہدیا کہ میرا اسمیں کون اختیار ہے، جو سب کی مرضی ہوگی وہی میری۔

مولوی صاحب۔ خیر اُنکے سامنے تو یہ کہکر ٹال دیا۔ لیکن اب بتاؤ کہ اس معاملے میں واقعی تمھاری کیا رائے ہے۔ میرے نزدیک تو اچھا ہے جس قدر جلد اس فرض سے سبکدوشی ہو جائے بہتر ہے۔

سیّدہ۔ بس یہی میری مرضی ہے، اب خود ہاجرہ سے دریافت کرنا چاہیے کہ اُنکی مرضی بھی ہے یا نہیں

مولوی صاحب۔ اُس کی مرضی کیوں نہ ہوگی۔

سیّدہ۔ سیتاپور میں ایک روز سائرہ کی آپا کے سامنے اسکا تذکرہ ہوا تھا۔ تو وہ کہتی تھیں کہ ہاجرہ تو سرے سے وہاں کرنے ہی پر کچھ خوش نہیں ہیں، اور ایک روز خود میرے سامنے ہاجرہ نے ماموں کے

گھر کی اتنی برائی کی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ نسبت اُنکی مرضی کے خلاف ہے۔

مولوی صاحب - وہ اسی طرح بکا کرتی ہے۔ اُسکی مرضی لینے ہی کی کیا ضرورت ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہاجرہ میں روز بروز آزادی اور بیباکی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ یہ شادی اور بیاہ کے معاملے میں اس کا دخل دینا کیا معنے؟

سیدہ - یہ کچھ ہاجرہ کے لیے نئی بات نہیں، آج کل کی سب ہی لڑکیوں میں آزادی اور بیباکی ہو یہ تو اب مشکل ہے اگر کوئی چاہے کہ اس زمانے کی لڑکیوں کی طبیعت بھی ویسی ہی ہو جائے جیسی چالیس پچاس برس اُدھر لڑکیوں کی تھی۔ دوسرا انصاف تو یہ ہے کہ بیاہ کے معاملے لڑکی لڑکے کی مرضی مقدم بھی ہونا چاہیے کیونکہ عمر بھر نباہ اُنھیں کو کرنا ہوتا ہے۔ ہاجرہ کی طبیعت کچھ دنیا جہان سے نرالی نہیں۔

مولوی صاحب (کچھ سوچ کر) تو آخر مرضی نہ ہونے کی کیا وجہ؟ اکبر میں کونسی برائی ہے اب تو وہ سو روپے کا ملازم بھی ہو گیا۔ انٹرنس پاس ہے یہ بھی نہیں کہ انگریزی نجانتا ہو۔ شتاق میاں بھی اب پانسو کی جگہ پر جا رہے ہیں۔ یہ نسبت بھی اُنھیں مرحومہ نے (ہاجرہ کی ماں) کی تھی، اور اُنکی یہی وصیت تھی کہ ہاجرہ اُنکے بھائی کے یہاں ہو۔ اگر یہ بھی نسہی تو پھر خاندان میں کوئی دوسرا لڑکا کہاں ہے؟

سیدہ - اکبر کی برائی بھائی تو اُنھوں نے میرے سامنے کبھی نہیں کی، ہاں اپنے ماموں کے یہاں کی بُرائی اکثر کی کہ عجب بھوہڑ کارخانہ ہے، ذرا عاقبت اندیشی نہیں، ماشاء اللہ اتنی آمدنی ہے مگر خود ٹکے کی جائداد پیدا نہیں کی، وہی باپ دادا کی سو سوا سو روپے مہینے کی جائداد، پھر خدا کے فضل سے چار لڑکے بھی ہیں اور لڑکی بھی ابھی کنواری بیٹھی ہے۔ یہی باتیں سوچ کر شاید ہاجرہ کو پس وپیش ہو۔

مولوی صاحب - پس وپیش کچھ نہیں اُسے خبط ہے۔ بیکار نا سمجھی کی باتیں کرتی ہے۔

سیدہ - خیر جیسی تمھاری خوشی ہو۔ جب اُنکی ماں بہشتن کی بھی یہی مرضی تھی تو پھر اُسکے خلاف کیوں کیا جائے جو اُنکی روح کو صدمہ ہو۔

مولوی صاحب - بس عید ہی میں مناسب ہے۔ میں کل عشرت کو یہی لکھ دونگا۔ (کچھ دیر خاموش رہکر) ہاں آج حکیم صاحب نے اطمینان دلایا ہے کہ اب تم بالکل اچھے ہو۔ دو چار روز کے بعد

میں تمہیں سیتاپور جانے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ ...... اور میں نے حکیم صاحب سے اُسکی نسبت بھی کہا تھا۔

سیّدہ - میں نہیں سمجھی - تم تو مجھ سے بجھولتے ہو - کاہے کی بابت کہا تھا؟

مولوی صاحب - اچھا، قریب آکر سُنو ...... میں نے کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ فاخرہ کے کوئی بھائی بھی ہو جاتا، تو اُنھوں نے اپنے یہاں کُشتہ بنوا دینے کو کہا ہے، اور جب تک وہ طیّار ہو کچھ گولیاں دی ہیں کہ صبح و شام ایک ایک گولی کھا لو اور اُس پر سے ایک گلاس گائے کا دودھ بھی پی لیا کرو - یہ بھی کہا تھا کہ ہر چالیسویں دن ایک مُسلّم مرغ کی یخنی بھی دو وقتہ پیا کرو۔

سیدہ - اُونھ - حکیم لوگ یوں ہی باتیں بناتے ہیں - یہ بھی روپیہ اینٹھنے کے گُر ہیں۔

مولوی صاحب - نہیں وہ ایسے معمولی حکیم نہیں ہیں - بڑے مشہور اور تجربہ کار طبیب ہیں۔ یہی دیکھ لو کہ آج جو گولیاں اُنھوں نے دی تھیں وہ میں نے دونوں وقت استعمال کیں، تو میں آج اپنے میں زیادہ توانائی اور چُستی پاتا ہوں۔

سیدہ (مسکراکر) اسی سے آج چہرے پر رونق بہت ہے۔

مولوی صاحب - ہنسی نہیں، واللہ روز کے بہ نسبت آج میں اپنے میں بہت فرق پاتا ہوں۔

سیّدہ کو ہنسی آگئی۔

سیدہ - ارے یہی تو کہتی ہوں کہ آج رنگت ہی کچھ اور ہے۔

مولوی صاحب - نہیں ..... سچ ..... تم پھر ..... ہنستی کیوں ہو ..... کیا بات ہے؟

اب سیدہ کے جسم کی ہر حرکت، اور اُسکے یاقوتی ہونٹوں کی ہر جنبش مولوی صاحب کے سمندِ وحشت کے لیے تازیانوں سے کم نہ تھی، قلب کی حرکت گھڑی کی سوئی سے بھی زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ ضعیف ہڈیوں کا ڈھانچہ، جذباتِ لطیفہ کے بحرِ متلاطم خیز کو نہ دبا سکا، تمام جسم میں رعشہ پیدا ہو گیا، بالآخر جنسِ نازک کی فطرتی دلربائی اور اسکی مقناطیسی کشش نے اُنکے خود ساختہ زُہدِ خشک پر کامل غلبہ حاصل کر لیا - پھر تو باسی کڑھی میں ایسا اُبال آیا کہ خلوت کا دروازہ بند ہو گیا۔

* * * * * * * * *

(۵)

لکھنؤ میں مولوی فریدالحق کے مکان سے ملحق ایک پنجابی صاحب بھی رہتے تھے۔ اُنکی لڑکی سلیمہ اکثر ہاجرہ کے پاس آکر بیٹھا کرتی تھی۔ ایک روز سلیمہ اور ہاجرہ بیٹھی باتیں کررہی تھیں کہ جمیا نے آکر کہا "اکبر میاں آتے ہیں، بِٹیا ہٹ جاؤ"۔ ہاجرہ اور سلیمہ دالان سے اُٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئیں۔ اسی دالان میں دوسری طرف پلنگ پر سیّدہ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر میں اکبر اندر آیا، اور جس پلنگ پر سیّدہ بیٹھی ہوئی تھی وہیں آکر بیٹھ گیا۔ اتفاق سے اسی وقت نعیم بھی آگیا اور برابر والے پلنگ پر بیٹھکر فاخرہ کو گود میں لیکر کھلانے لگا۔

سیدہ۔ کہو اچھے رہے، اللہ اُس روز باہر آئے اور اندر نہ آئے، میں دیر تک انتظار کرتی رہی۔

اکبر۔ جی ہاں پُھپھی معاف کیجیے گا، اُسدن مجھے فرصت نہ تھی، ایک ضروری کام سے ایک دوست کے یہاں جانا تھا، اس وجہ سے اندر نہ آسکا۔

سیدہ۔ توبہ، تو پھر اُن سے مل کر آئے ہوتے، یا بعد کو مل لیتے۔ یہ کون آنا کہ ڈھیلا سی چھو کر بھاگے۔

اکبر۔ اچھا اب آج اُسکے بدلے میں آگیا، اب تو آپ خوش ہیں؟

سیدہ۔ تمھیں نوکری مبارک!" (اکبر نے جھک کے تسلیم کی، ہاجرہ اندر سے دیکھ رہی تھی اُسے اکبر کی یہ حرکت سخت ناگوار ہوئی۔ نعیم کو بھی ہنسی آئی مگر کچھ بولا نہیں۔ سیّدہ بھی مسکرا دی مگر اسنے اپنے چہرے کو جلد سنجیدہ بنا لیا۔) ہاں تو اب گوالیار کا کب تک قصد ہے؟

اکبر۔ ارادہ تو پرسوں ہی کا تھا لیکن اُس دن اتوار ہے، اور یکشنبہ کو مغرب کی طرف سفر نہ کرنا چاہیئے

نعیم۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ " اکبر نعیم کی ہنسی دیکھ چکا اور اُس سے سخت ناراض تھا۔

اکبر۔ اب تم سے بکواس کون کرے، تمھارے دماغ میں تو انگریزی بھری ہوئی ہے، تم ان مذہبی باتوں سے کیا واقف۔

نعیم۔ اچھا تو یہ مذہبی بات ہے؟

اکبر۔ اور نہیں تو کیا میری ایجاد ہے، سب ہی ایسا کرتے ہیں۔ جمعہ، اتوار کو ہمیشہ سے پچھم کا سفر منحوس سمجھا جاتا ہے۔

نعیم ۔(مذاقیہ لہجے میں) اگر یہ صورت ہے تو دھوکے سے بھی نہ جانا، نوکری کا معاملہ ہے اور تمھیں تو شگون ماننا بھی چاہیے، ہندو ریاست کے ملازم ہو کر جا رہے ہو، اور ہندوؤں میں ان باتوں کا بہت لحاظ ہوتا ہے۔

سیدہ نے جمیعہ کو پکارا کہ پان دے جائے۔ وہ جلدی پان دھو کر لائی اور بولی" بی بی دیر ہوگئی تنبولی کہیں گیا تھا، اور آج بی بی امین آباد میں نہ معلوم کون بڑا صاحب آ رہا ہے، جھنڈیاں لگائی جا رہی ہیں، تنبولی کوئی بھلا سا نام بتاتا تھا۔"

اکبر۔ ہاں آج جب میں امین آباد سے آ رہا تھا تو کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ کوئی مسٹر گوکھلی ہیں وہ آج آئیں گے۔

سیدہ ۔ یہ کہیں کے شاہزادے ہیں یا کوئی بڑا لاٹ ؟

اکبر۔ ہاں شاید ولایت کے کوئی شاہزادے ہیں، مجھے اچھی طرح معلوم نہیں، یہ میاں نعیم سے پوچھیے یہ اشتہار (اخبار) رسالے بہت دیکھا کرتے ہیں، انھیں اسکی خبر ہوگی" نعیم فاخرہ کو کھلانے میں ایسا مشغول تھا کہ اُس نے یہ بات سُنی ہی نہیں۔

سیدہ ۔ نعیم، یہ گوکھلی کون ہیں، جن کے آنے کی بڑی طیاریاں ہو رہی ہیں؟

نعیم ۔گوکھلی نہیں، یہ ہندو ہے اس کا نام مسٹر گوپال کرشن گوکھلے ہے۔ یہ کوئی دولتمند آدمی نہیں ہے مگر پھر بھی ہندوستان میں سب سے بڑا شخص ہے۔ آج ہندوستان اور انگلستان دونوں جگہ اسکی خداداد قابلیت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے، کسی شاہزادے کو بھی یہ عزت حاصل نہیں ہے جو مسٹر گوکھلے کو حاصل ہے، ایثارِ نفسی اور حُبِ قومی کا مجسم نمونہ ہے۔ گورنمنٹ میں بھی اسکی کچھ کم قدر و منزلت نہیں ہوتی، اور ہندوستانی تو گوکھلے کی پرستش کرتے ہیں۔ آج قیصر باغ میں اُنکی تقریر ہوگی۔ (اکبر سے مخاطب ہو کر) چلو گے؟ چھ بجے شام کو جلسہ ہے۔

اکبر ۔مجھے فرصت نہیں کہ تمھاری طرح گھوما کروں۔ جلسے میں کیا دھرا ہے بجز وقت ضائع کرنے کے!!

نعیم کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اکبر اُٹھا اور جلدی سے باہر چلا گیا۔

کمرے کے اندر ہاجرہ اور سلیمہ کی گفتگو بھی دلچسپی سے خالی نہ تھی۔

سلیمہ - بہن، ان میں تمھارے میاں کون ہیں؟

ہاجرہ اکبر کی حماقتوں سے ناراض تو تھی ہی، بولی

ہاجرہ - میرے میاں تو ابھی کوئی نہیں، ایک ان میں میرے چچازاد بھائی نعیم ہیں اور دوسرے میرے ماموں کے لڑکے۔

سلیمہ - تو پھر پردے میں چھپ کے کیوں بیٹھیں، جب جانتے کہ باہر ہی بیٹھی رہتیں۔ اچھا تمھارے منگیتر سہی، اب تو راضی ہو۔

ہاجرہ - یہ بھی ایک فضول رسم ہے کہ لڑکی لڑکے سے چھپا کرے۔

سلیمہ - بہن یہ تو تمھارے یہاں کچھ بری رسم نہیں۔ شرمیلی دولھن ہی تو اچھی بھی معلوم ہوتی ہے

ہاجرہ - اچھی کیا معلوم ہوتی ہے۔ دُلھن تو کونے میں چھپی بیٹھی ہے کوئی خوبصورتی اور حُسن کیا دیکھے گا۔ یہ بھی خوب شرم ہے کہ لڑکی کوٹھری میں بند کرکے سڑائی جائے۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دولھا کے گھر چوری کی ہے جو اُس سے مُنھ چھپاتی ہے۔ یہ شرم کس کام کی کہ نہ میاں بیوی کی صورت سیرت سے آشنا نہ بیوی میاں سے۔ ہمارے یہاں تو دولھا دُلھن کی شادی ایسی ہوتی ہے جیسے ڈھابلی میں بند کرکے کبوتروں کا جوڑا لگایا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ سب فضول رسمیں مَردوں کی قائم کی ہوئی ہیں اور انکا ہمیشہ سے یہ خاصہ ہے کہ کسی طرح عورتوں کو محکوم اور مجبور رکھا جائے، آزادی کی ہَوا بھی نہ لگنے پائے۔ خیر اسکا نتیجہ بھی یہ ہے کہ اُنسے جو اولاد ہوتی ہے وہ بھی ویسی ہی بزدل اور فطرۃً محکوم طبیعت پیدا ہوتی ہے۔

سلیمہ - اچھا بہن ہوگا۔ لو کہاں کی بات کہاں پہنچی، بولو تمھارے ماموں کے لڑکے کون ہیں؟

ہاجرہ - وہ جو لکھنؤ انگھنتا اور کامدانی کی ٹوپی پہنے ہوئے آپاکے پاس پلنگ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

سلیمہ۔ کچھ خشخشی ڈاڑھی بھی ہے۔ اور وہ جو کوٹ پتلون اور ترکی ٹوپی پہنے بیٹھے ہیں، تمہارے سگے چچا زاد بھائی ہیں؟ یہ کیا کرتے ہیں؟

ہاجرہ۔ ہاں وہ میرے حقیقی چچا کے لڑکے ہیں۔ یہاں کیننگ کالج میں بی۔ اے کے درجے میں پڑھتے ہیں۔

نعیم اگرچہ صورت شکل میں اکبر سے اچھا نہ تھا، لیکن جدید فیشن کے لحاظ سے نئی روشنی کی لڑکیوں کے لیے اکبر سے کہیں زیادہ اس میں دلربائی تھی۔ سلیمہ نے اگرچہ دل سے نعیم ہی کو پسند کیا۔ لیکن ہاجرہ کی دل شکنی کے خیال سے اُس نے ظاہرا اکبر ہی کو ترجیح دی۔ تاہم اپنے دلی خیالات کو نہ چھپا سکی۔

سلیمہ۔ ماشاءاللہ تمہارے میاں صورت شکل میں بہت اچھے ہیں، مگر چچا کے بیٹے کو چھوڑ کر تمہارے ابا جان نے ماموں کے یہاں تمہاری منگنی کیوں کی؟ کیا اُنکی پہلے سے کہیں ہو گئی تھی؟

ہاجرہ۔ نہیں اُنکی ابھی تک کہیں نہیں ہوئی۔ میرے ساتھ اسوجہ سے نہیں کی گئی کہ چچی جان ہمارے خاندان کی لڑکی نہ تھیں۔ پھر بھلا ایک کم ذات کے ساتھ میں بڑی ذات رات والی کیسے ہو سکتی تھی؟ یہ بھی عجیب بات ہے کہ یوں تو ہم مسلمان دُنیا کو دھوکا دینے کی غرض سے بہت دعوے کرتے ہیں کہ سب کلمہ گو بھائی بھائی ہیں، کسی میں کوئی فرق نہیں۔ پھر کوئی پوچھے کہ یہ ذات پات کی بندش کیسی؟ اسلام نے تو مساوات کی تعلیم دی ہے، پھر یہ شیخ، سید، مُغل، پٹھان کی تفریق کیوں ہے؟ ہندوستان میں تو اس خصوصیت سے ذات پات کی پابندی مسلمانوں میں کیجاتی ہے، کہ ماں کی طرف سے بھی لڑکے کا خاندان دیکھا جاتا ہے حالانکہ اور مسلمان مُلکوں میں اگر کچھ خیال کیا جاتا ہے تو وہ باپکے حسب نسب کا، نہ کہ ماں کے۔ بس جیسے ہندوں میں برہمن، کایستھ اور کھتری وغیرہ ہیں اسی طرح مسلمانوں نے بھی اپنے یہاں مختلف فرقے قائم کر لیے۔

سلیمہ۔ ہمارے یہاں پنجاب میں اس کا زیادہ لحاظ نہیں کیا جاتا تمہارے یہاں اگر ایسا ہے تو کچھ ہرج نہیں۔

ہاجرہ۔ ہاں سُنا ہے کہ تمہارے یہاں اتنی سخت پابندی نہیں، اسی سے تمہارے یہاں کے لوگوں کی صحت بھی اور جگہ کی نسبت بہت اچھی رہتی ہے۔ آج کئی روز ہوے، تب نعیم بھائی نے ایک کتاب دی تھی

اس میں انھیں خاندانی شادیوں کے متعلق بھی بحث تھی اور لکھا تھا کہ یورپ امریکہ کے بہت سے ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ ایک ہی خاندان میں اگر برابر آپس میں شادی ہوتی رہے تو اولاد روز بروز کمزور اور کند دماغ پیدا ہوتی رہے گی اور آخر کو وہ خاندان مٹ کر تباہ ہو جائے گا۔ اور یہ تو خود میں نے اپنے قصبے میں بھی دیکھا ہے کہ کئی خاندان، جن میں ہمیشہ آپس ہی میں شادی بیاہ ہوتا رہا، آخرکار تباہ و برباد ہو گئے خیر اس کتاب میں تو اسکے بہت سے سبب لکھے ہیں لیکن غور سے دیکھو تو یہ بات تو صاف سمجھ میں آتی ہے کہ جب تک سب خاندان الگ الگ رہیں گے، خوشحالی ناممکن ہے، بغیر اتحاد اور اتفاق کے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ مثل مشہور ہے کہ ایک چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا، یہ غلط نہیں ہے۔ لیکن کمبختی سے ہمارے یہاں تو ہر رسم پتھر کی لکیر ہو گئی ہے کہ کسی طرح مٹائے نہیں مٹتی، خواہ اس سے کیسا ہی نقصان کیوں نہ ہوتا ہو۔

سلیمہ۔ اگر ایسے ہی نقصان ہوتے ہیں تو یہ رسم خود اُٹھ جائے گی۔ دیکھو آجکل لڑکوں میں بی اے اور ایم اے کی بہت تلاش ہے اور لڑکیوں میں پڑھی لکھی اور صورت شکل کی اچھی لڑکی سب ڈھونڈھتے ہیں، پھر ایک خاندان میں سب کا مطلب کیسے حاصل ہو سکتا ہے، اور میں نے تو سنا ہے کہ یہاں بھی ویسا ہی ہوتا جاتا ہے، جیسا ہمارے یہاں؟

ہاجرہ۔ ہاں، اکثر مثالیں ایسی ہوئی ہیں مگر میں تو کہتی ہوں کہ خدا کرے سب جگہ ایسا ہی ہو جائے‘‘ (سلیمہ ہاجرہ کا مطلب سمجھ گئی اور اُسے ہنسی آ گئی۔)

شام ہو گئی تھی، تھوڑی دیر میں سلیمہ رخصت ہو کر اپنے مکان چلی گئی، ہاجرہ بھی دالان میں جا کر بیٹھ گئی اور نعیم سے باتیں کرنے لگی۔

(۶)

ہاجرہ کی شادی کو چار مہینے ہو گئے۔ ایک قدامت پرست سسرال میں بھلا ایک آزاد اور جدید بہو کی کیا قدر ہو سکتی تھی؟ خواہ وہ کیسی قابل اور سمجھدار کیوں نہ ہوتی۔ ہاجرہ کو بھی انھیں مشکلات کا سامنا ہوا۔ بدبختی سے شوہر بھی ایسا ملا، جو ہر حیثیت سے بیوی کا بالکل ضد تھا: ہاجرہ انتہا درجے

کی سمجھدار اور ہوشیار، اکبر پلے سرے کا بیوقوف اور گٹھل؛ ہاجرہ نہایت سنجیدہ اور نیک، اکبر سخت تلون مزاج اور غصہ ور۔ بیوی جدید فیشن کی دلدادہ، میاں قدامت پرستی کے نشے میں مست، بیوی آزاد اور بیباک، میاں ماں باپ کے محکوم اور انکی گردش ابرو کے غلام؛ ہاجرہ نے جس قدر علم حاصل کیا تھا، وہ علم کی غرض سے، میاں نے جو کچھ پڑھا تھا وہ بھلا دینے کے لیے! بیوی شادی کا فلسفہ اور مقصد کچھ اور سمجھتی تھی، میاں کے اغراض اس سے بالکل مختلف؛ وہ شادی کو تمام دنیاوی مسرتوں اور دلچسپیوں کا پیش خیمہ سمجھتی تھی، یہ صرف حظِ نفسانی کے پورا کرنے کا ایک ذریعہ؛ اُسکے نزدیک زندگی کے مقاصد بہت اعلیٰ تھے، اسکے خیال میں بہت ہی ادنیٰ۔ غرض ہاجرہ اور اکبر کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق۔ ایک کی نظر عرشِ اعلیٰ پر تھی تو دوسرے کی نگاہ تحت الثریٰ پر، پھر آپس میں محبت ہونے کی کون صورت تھی؟ نتیجہ یہ ہُوا کہ چار ہی مہینے میں ہاجرہ کو سسرال والوں سے نفرت ہوگئی۔ خود اکبر کو اگرچہ ابتداءً ہاجرہ سے کوئی لاگ یا رنجش نہ تھی بلکہ ایک حد تک وہ اس سے پیار اور محبت کرتا تھا۔ لیکن ہاجرہ کو شروع ہی سے اُسکی حماقتوں اور بیوقوفیوں کی وجہ سے اُسکی صحبت سے اُلجھن اور وحشت پیدا ہوگئی، جیساکہ عام قاعدہ ہے کہ ایک بیوقوف شخص کی صحبت سے عقلمند آدمی کو بجز کلفت اور پریشانی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اکبر صرف چھ مہینے گوالیار میں رہا۔ اس عرصے میں کئی بار افسروں اور ماتحتوں سے لڑا، آخرکار استعفا دیکر سیتاپور چلا آیا۔ ہاجرہ پہلے تو گوالیار کی نوکری سے کچھ خوش نہ تھی لیکن شادی کے بعد، جب اُسے اکبر کی بددماغی اور بدمزاجی کا پورا اندازہ ہوگیا، تو اب وہ اسے غنیمت سمجھنے لگی کہ کم ازکم اسی بہانے سے وہ اُسکی جہالتوں سے محفوظ رہ کر، اپنے علمی ذوق وشوق کو بلا کسی قسم کی مزاحمت کے پورا کر سکے گی، اسی لیے اُسے اکبر کا گوالیار سے واپس چلا آنا سخت ناگوار ہوا۔ شب کو جب اکبر اندر گیا تو ہاجرہ نے نوکری چھوڑنے کی وجہ پوچھی۔

اکبر۔ اونہہ، مجھے اس نوکری کی پرواہ کیا ہے، چھوٹے میاں (یعنی باپ) بھوپال میں اس سے بڑی نوکری دلادیں گے۔

ہاجرہ۔ ہاں وہ دلادیں گے اور تم اسی طرح پھر چھوڑ دینا، جیسے یہ اچھی خاصی نوکری چھوڑ دی۔

اکبر۔ (تمسخر کرکے) ہمیں جاہلوں کیسی، تم یہاں بیٹھی تھیں تمہیں کیا معلوم کہ کن جاہلوں سے سابقہ پڑا تھا۔

دن بھر تو کام کرتے کرتے سر اُٹھانے کی مہلت نہ ملتی تھی، اور پھر ذرا سی خرابی ہوئی اور ہیودوں نے سارا الزام مجھی پر لگا دیا، سبھوں نے میرے خلاف ایکا کر لیا تھا، میری تو کوئی نہ سنتا اور اُن بدمعاشوں کی بات کو سب مان لیتے، پھر میں کچھ سٹری دیوانہ تو تھا نہیں کہ نہ سمجھتا۔

ہاجرہ۔ بس اسی بات پر چھوڑ دیا کہ وہ لوگ خلاف تھے یا کوئی اور وجہ بھی تھی؟

اکبر۔ اور کوئی وجہ نہیں۔ وہاں تعصب بھی زیادہ ہے، کوئی مسلمان وہاں ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اور جو اُن سے مل جائے وہ البتہ جم سکتا ہے، بس انھیں پاجیوں نے آپس میں سازش کر کے افسر اعلیٰ سے شکایت کر دی کہ جو کچھ کام خراب ہوتا ہے وہ اکبر علی کی وجہ سے، اور سنتا ہوں کہ کچھ رشوت بھی دی اسپر اُس بیہودہ نے مجھے لکھا کہ "تمھارا دماغ صحیح نہیں، تم کام خراب کرتے ہو، اور تم یہ کرتے ہو اور تم وہ کرتے ہو" اور نہ معلوم کتنے جھوٹے الزام لگائے۔

ہاجرہ۔ افسر اعلیٰ بھی ہندو ہی تھا یا کوئی انگریز؟

اکبر۔ نہیں تھا تو مسلمان ہی، ہیں اودھ کا رہنے والا ہے، مولوی امجد علی نام ہے۔ دیکھنے میں تو بڑا مقدس اور نمازی مگر بڑا خبیث ہے، کسی کی کچھ سنتا ہی نہیں۔ میں نے بھی خوب ہی صلواتیں سنائیں، مردود یاد کرے گا۔ واللہ چپراسی اگر روک نہ لیتے تو پھر بغیر مارے چھوڑتا بھی نہیں، پھر دیکھا جاتا۔

ہاجرہ۔ ضرور مارا ہوتا۔ پھر تو ترقی بھی ہو جاتی، اور ریاست میں نام بھی خوب ہوتا۔

اکبر۔ (بگڑ کر) بیشک مارتا اور نہیں تو کیا اُسکی گالیاں سنتا؟ تم بھی اُلٹا میرے ہی اوپر الزام لگانے لگیں، کیا تمھاری خوشی تھی کہ میں پڑے پڑے اُن کمینوں کی جوتیاں کھاتا؟

ہاجرہ۔ میری خوشی کیوں ہونے لگی۔ جیسا کرتے ویسا پاتے، اور جوتیوں تک تو نوبت پہنچ ہی گئی تھی، یہ بھی کہو مولوی صاحب کی شرافت کہ انھوں نے چپراسیوں کو اسکا حکم نہیں دیا۔

اکبر (بہت ہی غصے میں) مجال تھی اُس حرام زادے کی جو ایسا کہتا، کون کمبخت اپنے کو شریف کہتا اگر اُسی وقت گُدّی کے راستے اُسکی زبان نہ کھینچ لیتا، اور تم . . . .

ہاجرہ۔ تمھاری شرافت تو تب ہی ظاہر ہوتی۔ اکبر کے غصے کی اب کوئی انتہا نہ تھی، بدن کانپنے لگا

اور بہت ہی غضبناک آواز سے بولا۔

اکبر۔ دیکھو تم ہمیشہ مجھے اسی طرح برا بھلا کہا کرتی ہو، میں بہت طرح دیتا ہوں، لیکن ایک دن میں خدا کی قسم پھوپھا صاحب سے تمھاری شکایت کروں گا۔ مجھے بھی ٹال ٹال کے کوئی سڑی سودائی سمجھ لیا ہے کہ جب دیکھو میرے پیچھے پڑی رہتی ہو، کیا میں تمھارے گھر کا کوئی غلام ہوں کہ تمھاری باتیں سُنا کروں" یہ کہہ کر اکبر اُٹھا کہ باہر چلا جائے، مگر ہاجرہ نے یہ دیکھ کر کہ وہ غصّے میں بدحواس ہو رہا ہے نہ معلوم کیا حرکت کر بیٹھے، جلدی سے اُسکا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اچھا تو اب جاتے کہاں ہو، جو کچھ شکایت کرنا ہو، سویرے پر اُٹھا رکھو، اسوقت سب سو رہے ہیں"

اکبر نے جھنجھلا کر ہاتھ چھڑا لیا اور یہ کہکر کمرے کے باہر چلا گیا کہ "میں اسی وقت بھوپال جاتا ہوں، یہاں نہیں رہوں گا" لیکن پھر خود ہی کچھ سوچ کر واپس آیا اور علیٰحدہ پلنگ پر لیٹ رہا اور ہاجرہ بھی خاموش اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ لیکن رات بھر کسی کو نیند نہ آئی، اکبر کو غصہ کی وجہ سے اور ہاجرہ کو اس خیال سے کہ دیکھیے صبح کو یہ کیا حماقت کرتا ہے۔

سویرے جب دونوں اُٹھے تو ہاجرہ نے ارادۃً اپنے چہرے کو بہت بشاش بنا لیا۔ لیکن اکبر کے چہرے کا متغیر رنگ اب بھی اُسکے اندرونی غصّے کا پتہ دے رہا تھا۔

ہاجرہ (مُسکرا کر) کہو کیا ارادہ ہے؟ مجھ سے بہت ناراض ہو؟

اکبر۔ میں آج شام کی گاڑی سے بھوپال چلا جاؤں گا۔ یہاں تمھاری صلواتیں سُننے کو تھوڑی بیٹھا رہوں گا" اکبر جوتے پہننے لگا کہ باہر چلا جائے۔

ہاجرہ۔ اچھا مُنھ ہاتھ دھو لو پھر باہر جانا" یہ کہکر جلدی جلدی پان بنانے لگی۔ اکبر جب ہاتھ مُنھ دھو چکا تو ہاجرہ نے پان پیش کیا، اکبر نے پان کھانے سے انکار کیا، ہاجرہ نے زبردستی پان منھ میں دے دیا۔ یہ اکبر کی آتش غضب کے ٹھنڈا کرنے کا پہلا چھینٹا تھا، جس کا فوری اثر اکبر کے چہرے پر ظاہر ہوا لیکن اب تک مُنھ سے کچھ نہیں کہا۔

ہاجرہ۔ مُمانی جان نے عرصے سے کوئی خط نہیں لکھا، کچھ معلوم ہے ماموں جان کے کھانسی بخار

کا اب کیسا حال ہے؟" اکبر اب بھی خاموش رہا صرف سر ہلا دیا۔

ہاجرہ۔ توبہ، تو زبان سے کچھ بولو، مردوں کو زیادہ غصہ زیب نہیں دیتا۔

اکبر۔ کیا کہوں۔ بھوپال میں سب خیریت ہے۔

ہاجرہ۔ اور ماموں جان علاج کرنے لکھنؤ کب تک آئیں گے؟

اکبر۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ میرے پاس اُنکا کوئی خط نہیں آیا، شاید نومبر میں آئیں۔

ہاجرہ۔ تو اب مُنھ نہ پُھلاؤ ہنس کے باتیں کرو، اس طرح مُنھ بنانے سے سر میں درد ہونے لگے گا (جلدی سے گلاس میں شربت بناکر) اچھا لو یہ پی لو تو غصہ اُتر جائے۔

اکبر نے گلاس پینے سے پس و پیش کیا، ہاجرہ نے گلاس مُنھ سے لگا دیا۔ اب تو اکبر میاں نے ہزار ضبط کیا، لیکن آخر مسکرا ہی دیے۔ مسکراہٹ کے ساتھ ہی غصے کا جن شیشے میں اُتر گیا، اور ہاجرہ نے پالا مار لیا۔ پھر تو ہاجرہ کے گلابی ہونٹوں کی شیرینی سے خوب ہی ناشتہ کیا، بالآخر اس شراب کے نشے میں ایسے مست ہوئے کہ شبِ گزشتہ کے غصے کی تمام تلخی اور ترشی کا مزا بالکل بھول گئے، حتٰی کہ یہ بھی یاد نہ رہا کہ "بھیا صاحب سے بیوی کی شکایت کرنا ہے!"

اُسی روز شام کو ڈپٹی مشتاق علی صاحب کا تار آگیا کہ میری صحت اچھی نہیں، میں لکھنؤ آتا ہوں، تم فوراً لکھنؤ پہنچکر گھر کا انتظام کرو۔ اکبر اکیلے آتے اور رہا تیسرے روز صبح کو لکھنؤ روانہ ہوگیا۔ ہاجرہ خوش ہوئی کہ اس بہانے سے جان چھوٹی۔ صرف دو دن رہا لیکن یہ دو دن بھی ہاجرہ کے لیے دو ہزار دنوں سے کم نہ تھے۔ اُسکی موجودگی میں مکان اُسکے لیے قید خانہ ہوگیا، اب اُسے مخلصی ہوگئی، اکبر بھی بیوی سے کچھ ناراض نہیں گیا۔ اُسکی طبیعت تو چکنے گھڑے کی سی تھی کہ پانی پڑا اور بہہ گیا۔ ہاجرہ کی باتوں کا کچھ یوں ہی سا خیال اُس کے دل میں باقی رہ گیا تھا۔ (باقی آیندہ)

انیس احمد عباسی (کاکوری)

بڑھ بڑھ کے گھٹا ہوں نئی کلیوں کے لیے — تن تن کے جھکا ہوں نونہالوں کے لیے

پیسا مجھے گردشِ زمانہ نے تو کیا — سُرمہ میں بنا ہوں آنکھ والوں کے لیے

صفدر مرزاپوری

فطرت کا فوٹو

میرے ایک دوست ہیں، اُنکو پوسٹیج اسٹامپ[1] جمع کرنے کی لت ہے۔ البم[2] بھری پڑی ہے۔ روئے زمین کا کوئی متمدّن مقام ایسا ہوگا، جس کا ٹکٹ اس میں نہ ہو، رنگ رنگ اور قطع قطع کے۔

میرے ایک اور دوست ہیں ـــــ پھلواری کے رسیا۔ جا کر دیکھو تو الغاردوں گملہ رکھا ہے: جا بجا پام کے نادرے۔ صدہا قسم کے کروٹن، کولین، نیپ، پنزی۔ دروں میں قمقموں کی جگہ فرن لٹک رہے ہیں۔ کمرے کے اندر باہر، اوپر نیچے، طاقوں پر، میزوں پر کونسی جگہ ہے جہاں سبزہ نہیں

میرے تیسرے دوست کو تصویریں جمع کرنے کا شوق ہے۔ وہ تصویروں والے پوسٹ کارڈ نہیں ہوتے ہیں؟ جن پر مشہور عمارتوں، سینریوں، اور طرح طرح کی تصویریں بنی ہوتی ہیں، گڈکے گڈ انکے پاس موجود ہیں۔ کوئی دیکھنے آئے تو سارے دن دیکھا کرے، اور دوسرے دن کے لیے باقی بچ رہیں۔

میرے چوتھے دوست فوٹوگرافر ہیں۔ اُنکے گلے میں ہینڈ کمرہ ہر وقت پڑا رہتا ہے۔ میں نے اس بندۂ خدا کو کبھی اس بارِ گردن سے خالی نہیں دیکھا۔ رات ہو، دن ہو، جب دیکھو، کمرے کا تسمہ گلے میں آڑا پڑا، چلے آتے ہیں۔ آخر ایک منہ پھٹ سے نہ رہا گیا، کہہ بھاگا: "خصت: دن ہو تو خیر، رات کو جو یہ چمگادڑ گلے میں پہنائے پھرتے ہیں، تو بتائیے کہ رکعت کا ثواب؟" چمگادڑ کی پھبتی چھا گئی۔ کمرے پر چمگادڑ جیسا کالا چمڑا چڑھا ہوا تھا۔

"بھئی، کیا کہوں" فوٹوگرافر صاحب جھینپ کر بولے، "کیا بتاؤں ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ کمرہ گلے میں پڑا نہیں ہوتا، تو طبیعت الکسائی الکسائی رہتی ہے، جیسے بید ہاتھ میں رکھنے والے کے ہاتھ میں بید یا چھڑی نہ ہو تو عجب کھویا کھویا سا لگتا ہے، بس یہی حال میرا ہے۔"

ان کے ہاں جا کر دیکھیے تو کئی الماریاں البموں سے ڈٹ رہی ہیں، اور دیواروں اور میزوں پر

---

[1] خط پر لگانے والے ٹکٹ۔ [2] ایک کتاب جس میں تصویریں وغیرہ جمع کیجاتی ہیں۔

جو تصویریں لگی ہیں سو الگ۔ جہاں کسی صورت یا سینری سے سامنا ہوا، سٹ سے اکسپوز[1] دے لیا: کوئی عمارت دیکھی جھٹ پٹ تصویر کھینچ لی۔ کمرہ اپنے گلو میں، ڈارک سلائڈز[2] کا توبڑا نوکر کے گلے میں، میلوں ٹھیلوں، تماشوں میں ایسے پھرتے تھے جیسے پولیس چور کی تلاش میں، یا چور مال کی: ادھر دیکھ، اُدھر تاک، یہاں آ، وہاں جا "پائے" کی طرح کسی جگہ قرار نہ تھا۔ اتفاق سے انکا عرف بھی "پائے" تھا: پیارے میں سے "ے" کو تفریق کر دو تو "پائے" ہی باقی رہتا ہے۔

مجھے بھی ایک خبط ہے — ٹکٹوں کا نہیں، پھلواری کا نہیں پوسٹ کارڈوں کا نہیں، فوٹو گرافی کا نہیں، ہاں فوٹوگرافی کا۔ مگر ایسی فوٹوگرافی نہیں، جیسے میرے دوست کی۔ میں بھی تصویر لینے کے موقعوں کے تاک میں لگا رہتا ہوں، مگر صورت کی نہیں، سیرت کی۔ ظاہر کی نہیں، باطن کی جسم کی نہیں روح کی۔ میں بھی اپنی بغل میں ایک فوٹوگرافک کمرہ دبائے پھرتا ہوں — یہ میرا دل ہے اس کا لینس[3] ایکسریز[4] سے کہیں زیادہ زوردار ہے۔ یہ گوشت پوست کو توڑ کر دل کے اندر کا چور دریافت کرلیتا ہے۔ میرا سنسیٹو پلیٹ[5]، میری نوٹ بک ہے، جس کو جان کے ساتھ جیب میں رکھے پھرتا ہوں۔ دل کے کمرے سے نوٹ بک کے پلیٹ پر تصویر اُتار کر، فوٹوگرافروں کی طرح گھر لے آتا ہوں، اور جس طرح وہ ڈارک روم[6] میں جا کر ڈیولپ[7] کیا کرتے ہیں، اُسی طرح میں بھی اپنے اکیلے کمرے میں کیا کرتا ہوں۔

سفر میں، ایسی تصویریں اتارنے کا موقع مل ہی جاتا ہے — اَو بدا کر۔ چنانچہ سُنیئے:

ایک اسٹیشن پر اسی تاک جھانک میں کھڑا تھا کہ ایک اجنبی شخص کے یہ الفاظ سنکر کان کھڑے ہوے — یہ اُس نے اپنے ایک دوست سے کہے تھے:

"ارمان! تم نے کچھ اور بھی سُنا۔ گڑا ہوا مردہ پھر اُکھڑا۔ وہی نا، جسے پولیس نے رفع دفع کر دیا تھا کسی نے..." (پست آواز سے کہا) "کسی نے سپرنٹنڈنٹ سے جا لگایا کہ حضور اخفائے واردات ہوا ہے، پولیس نے خون کا مقدمہ چالان نہیں کیا۔"

---

[1] تصویر اتارنا عکس لینا [2] فریم جس میں تصویر کھینچنے والا شیشہ لگایا جاتا ہے [3] عکسی شیشہ جو فوٹوگرافک کمرہ کے سامنے کی جانب لگا رہتا ہے [4] کرہ جس سے جسم کے اندرونی امراض دریافت کئے جاتے ہیں [5] شیشہ جس پر تصویر اترتی ہے۔ [6] اندھیرا کمرہ [7] شیشہ کو دواؤں میں ڈال کر عکس کو نمودار کرنا۔

یہ سنکر میں وہی سمجھا، جو یہ پڑھ کر آپ سمجھے ہوں گے۔ یعنی: پولیس نے لوا کر قتل عمد کا کیس کہیں چھپا ڈالا ہوگا، "خودکشی" "مقتول کا چوروں کے ہاتھ سے مارا جانا" یا کچھ اور پردہ پوشِ حقیقت عبارت، روزنامچے میں بھر دی ہوگی۔

قاعدہ ہے جب جانی بوجھی بات پر واقفکار گفتگو کرتے ہیں، تو درمیان سے بہت سی باتیں چھوڑتے چلے جاتے ہیں، بیکار جان کر۔ اسی طرح کی گفتگو اُن دونوں کی تھی، کچھ تو میری سمجھ میں آیا اور کچھ خاک نہ سمجھا۔ انھیں کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ آج ہی چالان ہے، اسی ٹرین سے مجرم جا رہا ہے۔ یہ سُن کر میں دل کو فوکس[1] میں کر مستعد کھڑا ہوگیا کہ کب وہ آئے اور کب میں فوٹو لوں۔

شاید کوئی تہوار تھا—— ہندوؤں کا۔ ٹکٹ بٹنے کی کھڑکی پر مسافروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوے تھے۔ وہ دھکا پیل تھی کہ معاذ اللہ۔ باہر تو باہر اندر ٹکٹ بابو کے کمرے میں بھی مسافر کچاکچ بھرے ہوے تھے۔ تِل رکھنے کی جگہ نہیں۔ پلیٹ فارم پر بھی مسافروں کے غٹ کے غٹ ٹھوکونے سے کھوا چھلتا تھا، تھالی پھینکو تو سروں ہی سر پر چلی جائے—— اس میں بالکل مبالغہ نہیں بلکہ میرا ملازم گھس پِل کر ٹکٹ لایا۔

اتنے میں ایک جانب کچھ غیر معمولی غل سا ہوا۔ معلوم ہوا کہ وہی مجرم آرہا تھا۔ وہ آیا کمسن سیں بھیگتی، ہاتھ میں ہتکڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں نہ تھیں۔ سب انسپکٹر اور سات سپاہی ساتھ تھے بشرے سے شرافت، لباس سے ریاست ظاہر۔ صدمے کا پہلا بھبوت منھ پر ملا ہوا تھا، اشکِ حسرت آنکھوں میں بھرے ہوے، ہر نظر آہِ دلدوز، ہر حرکت کربِ جگر پاش۔ ساتھ ساتھ بھائی تھا۔ ہر دم تسکین و دلاسا دیتا تھا۔ سچ ہے کسی کو کسی کے دل کی کیا خبر۔ بے وقت لگے اُس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے، انکا جواب اُس نے یا تو خاموشی سے دیا، یا سر کے اشارے سے یا مجبوراً زبان سے، دو لفظوں میں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اُسے چھیڑے۔ جی پر بنی تھی، کیسی بول چال، اور کہاں کی بات چیت۔ جو الگ تھلگ تھے، اُنکی نسبت تو وہ اپنے تئیں دھوکا دے سکتا تھا کہ وہ اُسکی مصیبت

[1] کمرہ کی دھونکنی کا آگے پیچھے ہٹا کر صاف عکس لینا۔

کے تماشائی نہیں، لیکن جو آ آکر اُسے گھیرتے، کھود کھود کر حال پوچھتے، اور سوالات سے ستاتے تھے۔ وہ تو گویا اُسکے گناہ کو برہنہ دیکھتے تھے۔ وہ اُسکے دشمن تھے، اُنکو وہ معاف نہیں کرسکتا تھا۔ بہت سے سوالات میرے دل میں بھی تھے، مگر اُسکی ترشروئی کو دیکھ کر دل کے دل ہی میں رہے۔ اس سے کچھ پوچھنا گچھنا اُسپر صریح ستم تھا۔ میں خاموش رہا اور دل کی دلیلوں پر قناعت کی۔

ٹرین آکر کھڑی ہوئی۔ پولیس مین ملزم کو لیکر ایک طرف چلے۔ میرا ملازم گاڑی میں اسباب رکھ کر مجھے دیکھتا پھرتا تھا۔

میں دل سے باتیں کرتا ہوا اپنے کمپوزٹ کے پاس پہنچا۔ اس میں تین مسافر بیٹھے تھے: ایک سن رسیدہ شریف صورت آدمی، ایک جوان عورت، جس کا بناؤ سنگار، وضع قطع، ساری سج دھج کسبیوں کی سی تھی، مگر معلوم ہوتی تھی آسودہ حال اور دل چلی، اس لیے کہ سکنڈ کلاس میں سفر کررہی تھی، نہیں تو ہمنے اچھی اچھیوں کو تھرڈ ہی میں جوتیاں چٹخاتے دیکھا ہے۔ بہت ہوا انٹر میں بیٹھ گئیں، لیکن اکثر کرکے تو تیسرے ہی میں بیٹھتی ہیں ——— جیسی روح ویسے فرشتے۔ یہ عورت امیری ٹھاٹھ رکھنے کے علاوہ، نک سک سے بھی درست تھی۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، گول چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، جُٹی بھویں، ستواں ناک، پتلے پتلے لب، بھرے بھرے بازو، چوڑا چھاتا، سڈول بدن؛ عمر بہت ہوگی تو کوئی پندرہ سال کی ہوگی، مگر آپ جانیں "عیش" کی زندگی، عورت ذات جھٹی پڑتی تھی۔ پر افسوس اس زندگی کے طور طریق نے مُنھ کا سارا نور صیور اُڑا دیا تھا، دیدہ ہوائی، بیکل بوٹی، ذرا دیر نچلی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ ویسے ہی مزاج کی بھی چھچھوری اور اِترونی معلوم ہوتی تھی: اُسے اپنی جیب تجنی اور زیوروں کے دیکھنے سے فرصت ہی نہ تھی۔ اسکے ساتھ ایک بڑھیا عورت تھی، مگر وہ جو کہتے ہیں مُنھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، ستھرے بھترے سے۔ نائکہ ہوگی۔ جوڑا تو یہ بھی بڑی بھڑک کا پہنے تھی، مگر اس عمر پر کچھ اُوپری اوپری سا لگتا تھا۔

درجے میں بیٹھ کر میں نے نوکر سے چائے منگوائی، وہ اُدھر گیا، میں نوٹ بک نکال، کچھ یادداشت ٹانکنے لگا۔ اس سے فراغت پائی تھی کہ چائے آئی، میں نے پیالی ہاتھ میں لی، اور اپنے ہمسفروں پر

نظرِ ثانی کی۔ جوان عورت کا پھول سا تازہ کھلا ہوا چہرہ، بڑھیا نائکہ کے مرجھائے ہوئے گال، اور سکڑا ہوا چنٹ دار دہانہ، اس بہار و خزاں کے منظر سے محظوظ ہو کر میری نظر اُن بڑے میاں پر پڑی۔ وہاں تو طرفہ تماشا دکھائی دیا۔ بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ کبھی کمانِ ابرو کھنچتی تھی، کبھی نیچے اُتر آتی تھی، کبھی گاڑی کے فرش کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جاتا، کبھی بالکل آنکھیں میچ لی جاتیں، کبھی اوپر سے بھویں، اور نیچے سے مُنہ سکوڑ کر، نیم باز آنکھوں سے کھڑکی کی طرف اس طرح دیکھتے جیسے کوئی کسی باریک چیز کو دیکھتا ہے۔ میں تاڑ گیا کہ ہو نہ ہو، یہ حضرت بیں بسوے تو شاعر ہیں، کوئی مضمون اُتر رہا ہے۔ چہرے کا سارا اُتار چڑھاؤ، اسی کا فوکس ہے۔ اتنے میں ریفریشمنٹ روم سے بیرا آیا، اور چائے کا سامان لے گیا، وہ لے کر گیا ہی تھا کہ میں نے جو اُنکی طرف مُڑ کر دیکھا تو انگشتِ شہادت کو حرکت تھی۔ شاید شعر کی چول بٹھانے میں مدد لی جا رہی تھی۔ یکایک یہ حرکت متعدی ہوئی: اور انگلیوں کو حرکت ہوئی، پورے پنجے کو ہوئی، یہ لیجیے سمو چا ہاتھ، میدانِ سخن میں صفائی کے ہاتھ دکھانے لگے۔ اس تماشے کی محویت سے مجھے اتنی مہلت نہ تھی کہ میں اُنکو مجنون یا مسخرہ سمجھتا۔

انجن نے سیٹی دی۔ ٹرین بھق بھق کرتی روانہ ہوئی۔ میں شاعر صاحب کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں، مجھے جو اس طرح ایک ماں اُنکی طرف دیکھتے دیکھا، تو بائی صاحب کی شامتِ اعمال، خود بھی اُدھر دیکھنے لگیں۔ دیکھنا تھا کہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ نائکہ نے نوچی کو گھور کر دیکھا اور کچھ بڑبڑائیں۔ بڑے میاں چونک پڑے۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ بل نہ تھے دل کے پیچ و تاب کا عکس تھا۔ مضمون کا خونِ ناحق ہو جانے سے بڑے جز بز۔ یہ خیر ہوئی کہ فکرِ سخن میں ہنسی کی آواز کانوں میں نہیں گئی، نہیں تو خدا جانے کیا آفت توڑتے۔ انکا وہی حال ہوا، جیسے کوئی کسی سوتے کو جھنجھوڑ کر جیب نہیں جاتا ہے، اور جاگنے والا جانتا ہے کہ میں آپ سے آپ جاگا ہوں۔

"ریل کے سفر میں فکرِ سخن کرتے خوب بنتا ہے" میں بڑے میاں سے مخاطب، بغیر کسی تمہید بول اُٹھا۔

"قلی را دلی می شناسد" بڑے میاں نے حیرت زدہ آنکھوں، اور تعجب آمیز لہجے کے ساتھ کہا، اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا ـــــــ اُنہیں میری "غیب دانی" پر حیرت تھی، اور مجھے اُنکی "حیرت" پہ تعجب۔

اسکے بعد وہ آپ کہاں سے آتے ہیں، کہاں جاتے ہیں؟ نام؟ نشان؟ معاش؟ آمدنی؟
ان ضروری سوالات کے جوابوں سے جب فرصت ہو تو میں نے کہا: "حضرت پھر کچھ کلام سنائیے"
شاعر صاحب نے خوب جھوم جھوم کر کلام سنایا "شاعر" ہی تخلص بھی کرتے تھے۔ اُنکے شعر سنکر، اُستادانِ
سخن کے اُن مضامین کے شعر جو مجھے یاد آجاتے تھے، میں بھی سنا دیتا تھا، جس پر ہر مرتبہ اُنکو توارد کا
گمان ہوتا تھا، حتیٰ کہ بعض شعروں میں تو اس غضب کا توارد ہوا، کہ قافیہ ردیف کو چھوڑ کر، الفاظ کے
الفاظ ہم [illegible] ناسخ، میر، سودا کے کلام سے لڑ گئے۔ اب تو اُنکی شیخی کرکری ہونے لگی۔

پیارے خیالو! تم ہمکو دھوکا دیتے ہو، اور ہم کس مزے سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ وہ تمھارا
لے میں باہیں ڈالکر کہنا "قسم ہے جو تمھارے سوا، کسی اور کسے پاس گئے ہوں" جادو کا اثر رکھتا ہے،
ن، نہیں کہ ہم تم کو جھوٹا جانیں اور تمھاری دوشیزگی اور اچھوتے پن کا یقین نہ کریں ممکن نہیں۔
عبرت! اسی ٹرین کے کسی دوسرے کمپارٹمنٹ میں وہ خون کا ملزم تھا۔ اُس کمپارٹمنٹ میں
باسکوت پاس ہوگا۔ یہاں شعر و سخن کی یہ چہل پہل!

دوسرے اسٹیشن پر قیدی اُتار لیا، اُسکے چہرے پر ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ، وہ
ے کمپوزٹ کی طرف سے ہو کر گزرا۔ میں نے دیکھا، کہ اُسکو دیکھ کر بائی جی کا مُنھ فق ہوگیا۔ اسکی
وجہ؟ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔ ذرا صبر کیجیے۔

قیدی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا، کہ میری توجہ کے دوسرے دعویدار پیدا ہوئے۔ یہ
رنگیلے نوجوان تھے ـــــ بیفکرے۔ اسٹیشن پر اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ اس گاڑی
ب، اُس میں تاک۔ صورت سوال تھی۔ آخر بائی جی نے انکی خواہشات کی دعوت کرہی دی۔
لیا تھا۔ بھوکے کو سخی داتا اور سخی داتا کو بھوکا ملا ـــ لوہے کو مقناطیس، اور مقناطیس کو لوہا ملا۔
ے کو پانی اور پانی کو پیاسا ملا، آگ کو پھوس اور پھوس کو آگ ملی، بجلی کو کنڈکٹر* اور کنڈکٹر کو بجلی
طالب کو مطلوب اور مطلوب کو طالب ملا، مختصر یہ کہ بائی جی کو یہ میاں رنگیلے اور اِن میاں جی کو

* وہ دھات جس میں بجلی دوڑ سکے مثلاً تانبا۔

ادھر ان میاں رنگیلے کو بائی جی ملیں۔ لگے چکر لگانے، ادھر اُدھر ٹہلے، اور پھر وہیں آ موجود۔ انکے چکر دل کو دیکھ کر میرا سر چکرانے لگا۔ بس جیسے پروانہ نہیں ہوتا ہے کہ اول اول شمع کی لو کے پہلو میں نہیں آتا، دور دور سے بڑے بڑے چکر لگایا کرتا ہے پھر رفتہ رفتہ دائرۂ گردش تنگ ہوتا جاتا ہے —— نزدیک اور نزدیک۔ پھر پاس سے بلائیں لینا، پھر بھڑ سے بھُن جھلس کر شمع کے قدموں پر گر پڑتا ہے۔

مگر یہ کیا؟ یہ چل کہاں دیے۔ انکی طبیعت والے شخص کو گاڑی چھوٹنے تک تو یہیں رہنا چاہیے تھا، قاعدہ تو یہی کہتا ہے۔ شاید اس سے زیادہ ضروری کام ہو۔ ممکن ہے ہوا پانچ منٹ، چھ منٹ، سات منٹ آٹھ — وہ دیکھیے وہ آ رہے ہیں۔ بھلا وہ کہیں جانے والے ہیں۔ آئے، اور درجے کے پاس کھڑے ہو گئے۔ بائی جی بھی کچھ بحال سی ہو گئیں۔ انجن کی سیٹی! ایں یہ تو اندر گھسے آتے ہیں۔ اوہو، میری عقل پر کیسے پتھر پڑ گئے، اب میں سمجھا، یہ اُس وقت جو گئے تھے، تو ٹکٹ ہی لینے گئے تھے۔ اللہ رحم کرے!

ابوالاثر - بہزاد

نہ بیقرار ہو آتا ہے یار راہ میں ہے
تری قسم وہ دل بیقرار راہ میں ہے

خیالِ شوخیِ چشم نگار رہے مد نظر
رفیق ساتھ بہت ہوشیار راہ میں ہے

تم آتے جاتے اُسے پائمال کرتے ہو
وہ خوش نصیب تھا جسکا مزار راہ میں ہے

قرار منزلِ الفت میں کس طرح آئے
ہمارے ساتھ دلِ بیقرار راہ میں ہے

چلے تو ہیں درِ جاناں سے ہم خفا ہو کر
پر اپنے دل پہ نہیں اختیار راہ میں ہے

عزیز دفن کریں لاش بے نماز پڑھے
قیامِ راہ ہمیں ناگوار راہ میں ہے

چلا ہوں کوچۂ جاناں کو دل کا چھوڑ کے ساتھ
مجھے کسی کا نہیں اعتبار راہ میں ہے

اُسی گلی میں ہمیں بھی عزیز دفنائیں
قدم قدم پہ جہاں اک مزار راہ میں ہے

چمن کی سیر کو آتا ہے وہ گلِ رعنا
بہار آئی ہے رنگِ بہار راہ میں ہے

جو بیخودی میں چلا ہوں سوئے درِ جاناں
میں دیکھتا ہوں جدھر کوئے یار راہ میں ہے

کڑی ہے عشق کی منزل بھرا ہے دندے دل
یہ بوجھ ہمکو بہت ناگوار راہ میں ہے

نکل کے گھر سے اُسے دیکھ لے اے ظالم
ملیاں ترا جگرِ دل فگار راہ میں ہے

حکیم جگر صدیقی